A. P. STATE ESSENTIAL COMMODITIES CORPORATION

Regd Office : 11-5-468/11-III, Red Hills, Hyderabad

The Corporation was set up by the Government of ...adesh with the following objects amongst others :-

(I) To serve the common man and the middle class ... the essential commodities like Rice, Wheat, Sugar ... Oils etc.

(II) A.P.S.E.C.C. is also supplying through its Annapurna ... Canteens high quantity of eatables at low cost - ... 0. 35 Ps., Vada Plate : 0. 55 Ps , Upma Plate : 0. 50 Ps ... : 0. 40 Ps.. Tea : 0. 30Ps., Vegetable Biriyani : ... Laddu : 0. 50 Ps., Tomato Bath : 0. 60Ps.

AND

FULL MEALS - Rs. 1.50.

(III) The Corporation has taken up wholesale distribution ... and Wheat in all the Districts in the State under public ... bution system.

... A.P.S.E.C.C. is marching ahead and needs your co-op... and patronage.

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

سالنامہ
جنوری ۱۹۸۲ء

جلد ۱۵
شمارہ ۱

ایڈیٹر:
سید مصطفیٰ کمال

مجلسِ ادارت:
حمایت اللہ
منظور احمد
مسیح انجم

مجلس مشاورت:
راجندر سنگھ بیدی
بھارت چند کھنہ
خواجہ عبد الغفور
نریندر لوتھر
مجتبیٰ حسین

مینجر: سمیع جلیل

مہمان کارٹونسٹ: عزیز حیدرآبادی (مقیم کراچی)

سالانہ: انفرادی: ۲۵ روپے
لائبریری: ۳۰ روپے
بیرون ہند: ۹۰ روپیہ

فی پرچہ: ۵ روپے

طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چار کمان، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲
بائنڈنگ: محمدیہ بک بائنڈنگ ورکس، پرانی حویلی، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

خط و کتابت کا پتہ: شگوفہ، ۳۱ مجرد گاہ، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

اِس تھیلی کے چٹے بٹے

فہرست

چُورن (نظمیں)

عزیز بقلم عزیز کارٹونسٹ

دکن کا یہ سپوت ہے، سب کا عزیز ہے
ملنے کی، دیکھنے کی، سمجھنے کی چیز ہے
اندر کے آدمی کو کسی بھی لباس میں
پہچاننے، پرکھنے کی اس کو تمیز ہے
سنجیدگی بھی اس کی طبیعت میں ہے مگر
ہونٹوں پہ ہے ہنسی تو زباں پر "پلیز" ہے

طالب خوندمیری

Aziz
Hyderabad
24 Jan 1982
کنہیا لال کپور
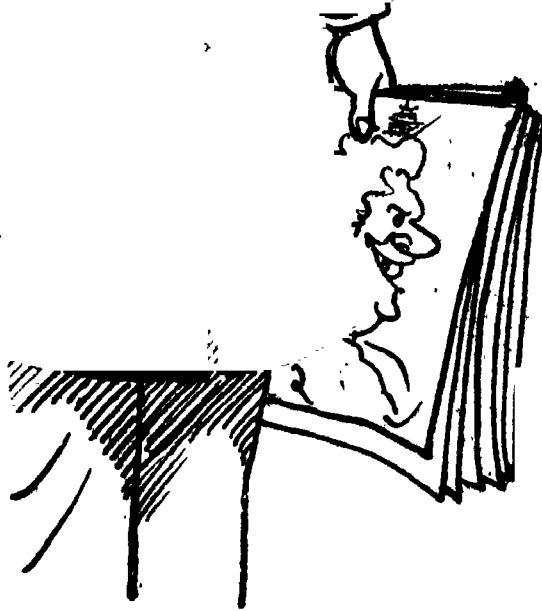
AZIZ
۲۲ جنوری سنہ ۱۹۸۲ء
حیدرآباد
نریندر لوتھر
فکر تونسوی

بھارت چندکھنہ

Aziz
۲۴ جنوری سنہ ۱۹۸۴ء
حیدرآباد

حمایت اللہ

یوسف ناظم

خواجہ عبدالغفور

۲۵ جنوری ۱۹۸۶ء
حیدر آباد

سلیمان خطیب
پاگل عادل آبادی
Aziz
۲۴/جنوری ۱۹۸۲ء
حیدرآباد
سعادت علی

مستقبل کا مزاح نگار
مجتبیٰ حسین
مسیح انجم
Aziz
۲۲ جنوری سنہ ۱۹۸۳ء
حیدرآباد
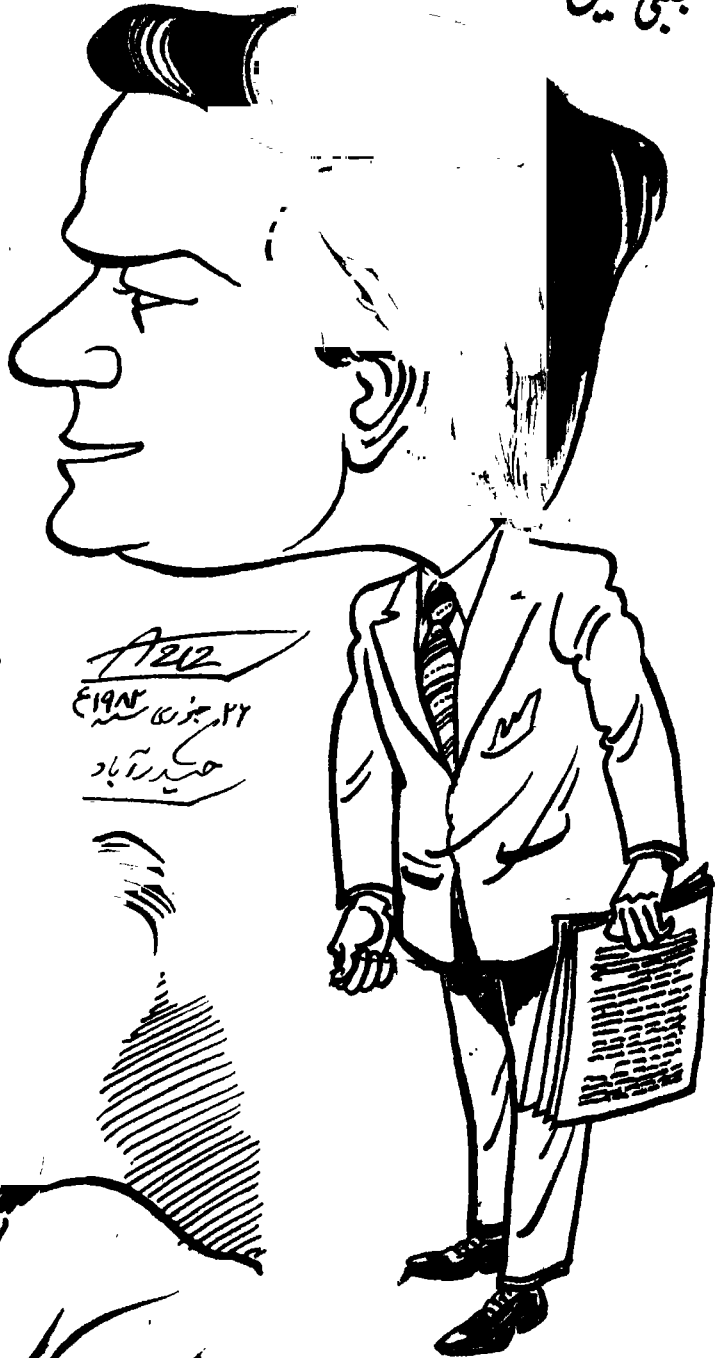
وجاہت علی سندیلوی   منظور احمد
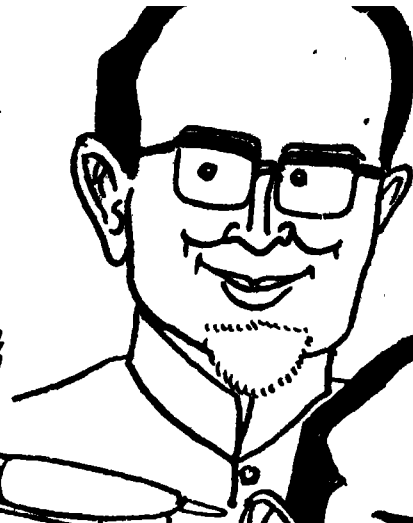
۱۵ جنوری سنہ ۱۹۸۳ء
حیدرآباد
برق آشیانوی
طالب خوندمیری
اسمٰعیل ظریف
جوہر سیوانی
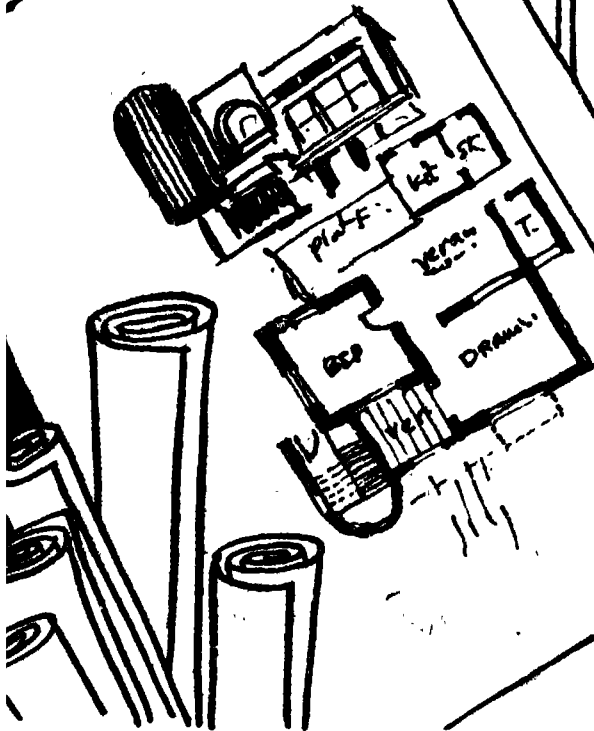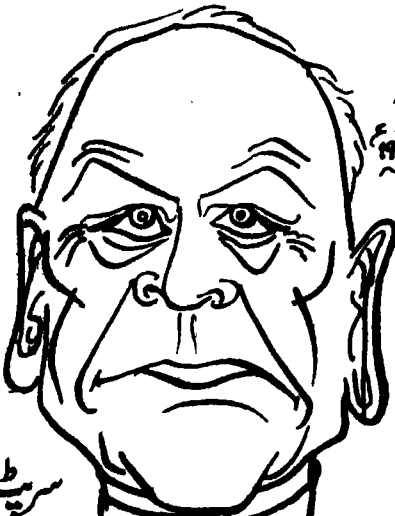
Aziz
۲۵ جنوری ۱۹۸۲ء
حیدرآباد
سرمیٹ حیدرآبادی
عاتق شاہ
برہان حسین
پرویز یداللہ مہدی
Aziz
۲۶ جنوری ۱۹۸۲ء
حیدرآباد
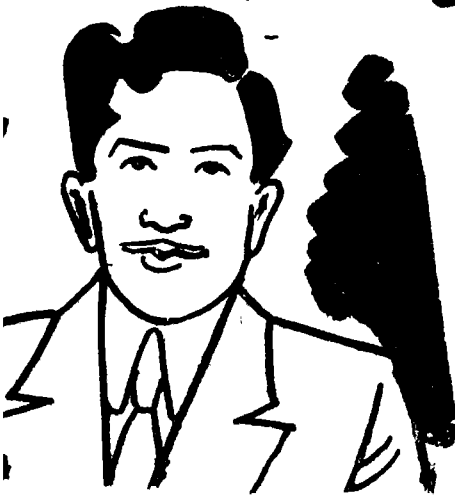
رشید الدین
ڈاکٹر حبیب ضیاء
مدیرِ "شگوفہ"
ایم اے حنّان
محمود سلیم
(خوش نویس شگوفہ)
۲۶ جنوری ۱۹۸۲ء

پھر ملیں گے ... اگر ــ خُدا لایا

سالنامہ حاضر ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ملک کے اہم طنز و مزاح نگاروں کی تخلیقات اس خصوصی شمارہ کے ذریعہ پیش ہو سکی ہیں۔ اس کے لئے ادارہ اپنے قلمی معاونین کا ممنون ہے۔ قلم کاروں کے کیریکیچر بین الاقوامی شہرت یافتہ پاکستانی کارٹونسٹ عزیزؔ صاحب نے بنائے ہیں جو ۳۳ سال کے بعد اپنے وطن حیدرآباد آئے ہیں۔ خوش فکر و خوش گو (بلکہ خوش گلو بھی)، خوش لباس و خوش مزاج۔ حیدرآباد کے سچے عاشق، روایت پرست، پکّے مذہبی، خلوص و محبت کا پیکر، مجرد گاہ کے چوکیدار جیب سے لے کر حکومت آندھرا پردیش کے سکریٹری جناب نریندر لوتھر اور وزیر لیبر جناب وینکٹ سوامی تک یکساں محبت، خلوص اور گرمجوشی سے ملاقات و معانقہ کرنے والی شخصیت، عزیز بھائی، زندہ دلی کی منفرد مثال ہیں۔ ان سے جب میں نے سالنامہ کا ٹائیٹل بنانے کی درخواست کی تو دوسرے دن حسب وعدہ دفتر پہنچ گئے۔ برش، رنگ و کاغذ اپنے بچپن کے ساتھی اور مشہور آرٹسٹ سعادت علی خاں سے حاصل کیا اور حیرت انگیز طور پر ایک ہی گھنٹہ میں سرِ ورق ڈیزائن کر دیا۔

میری گزارش پر انھوں نے مزاح نگاروں کے کیریکیچر اور مضامین کے لیئے تصویریں لیتھو کے مسطر پر بنانا قبول کیا جس کے لیئے سراپا سپاس ہوں۔ ظاہر ہے کہ مسطر پر نہ تو نوک پلک سنوارے جا سکتے ہیں اور نہ لیتھو کی بلیٹیں عزیزؔ بھائی کے فن کا آئینہ بن سکتی ہیں۔ عزیزؔ بھائی نے بیشتر کیریکیچرز تصویریں سامنے رکھ کر بنائے ہیں۔ صاحبِ تصویر سے اُن کی ملاقات نہیں ہوئی۔

ناظرین سے التماس ہے کہ ان مجبوریوں کو پیشِ نظر رکھیں۔ مَیں دیرینہ کرم فرما نیشنل پریس کے مالک جناب اعظم علی کا شکرگزار ہوں کہ موصوف کی دلچسپی کی وجہ سے بہ عجلت ممکنہ اچھی طباعت کا اہتمام ہو سکا۔

مصطفیٰ کمال

عزیز کارٹونسٹ

مسیح انجم

آپ سے ملئے ! آپ ہیں عزیز کارٹونسٹ ! جن کسی کو تکلف عزیز ہو اور جو اپنے آپ کو سینت سینت کر رکھنے کے عادی ہوں وہ عزیز صاحب سے ہرگز نہ ملیں خبردار ! ہوشیار ! پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی !

دو دن پہلے تک وہ میرے لئے عزیز صاحب تھے۔ لیکن اب وہ میرے لئے عزیز بھائی ہیں، اور میں ان کے لئے " ارے مسیح ! ارے مسخرے ! ارے داڑھیال ! -------- ! ان کے آگے اور بھی " وغیرہ، وغیرہ " قسم کے خطابات ہیں۔ لیکن ان کے اظہار کی ہمارا لٹریچر اجازت نہیں دیتا یوں بھی ہمارا لٹریچر اتنا دم دار کہاں کہ وہ خلوص کے خطابات کا متحمل ہو سکے !؟ وہ تو صرف پنج حرفی سرکاری خطابات کا متحمل ہے۔ یہ بات بد دیانتی پر محمول ہو گی اگر میں عزیز بھائی کے خطابات کا تذکرہ نہ کروں۔ کنایتاً آپ کو صرف اتنا بتا دوں کہ وہ خطابات " ONLY FOR ADULTS " کی تعریف میں آتے ہیں۔

عزیز بھائی واقعی اسم بامسمّیٰ ہیں۔ وہ بہت بڑے کارٹونسٹ ہیں۔ لیکن دیکھنے میں وہ کارٹون نہیں دکھائی دیتے۔ ان سے پہلی ملاقات فائن آرٹس اکیڈمی کے کمرے پر ہوئی۔ وہ سجدے سے سر اٹھا رہے تھے کہ میں (شیطان) وہاں پہنچا۔ ان کے چہرے پر ایک عجیب قسم کی معصومیت تھی۔ ایک ایسی معصومیت جو شیطان کے تائب ہونے پر نظر آتی ہے۔ نماز ختم کی، دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ کچھ وظیفہ بھی پڑھا۔ دو چار پھونکیں بھی ماریں۔ اور

پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔ سر سے جوں ہی دوپلی ہٹائی، میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ اور میر حسن کی مثنوی سحر البیان کا یہ مصرعہ بے اختیار یاد آ گیا: ع کہ "ہے" چاندنی ہر طرف غش پڑی! کچھ اس بے تکلفی سے ملے کہ بس مزا آ گیا۔ تکلفات کے سارے پردے چاک کر دئیے۔ صرف چٹاخ سے ایک بوسہ لینا باقی رہ گیا تھا۔ عشرت بھائی کے قول پہ ایمان لانا ہی پڑا کہ "شیطان نمازی ہو گیا ہے"! یقین نہ آئے تو میں عزیز بھائی کی پیشانی "IDENTITY CARD" کے طور پہ پیش کر سکتا ہوں۔

تعارف کے بعد یقین ہی نہ آیا کہ وہ بہت بڑے آرٹسٹ ہیں۔ ان سے مل کر خوشی تو ضرور ہوئی لیکن حلیہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی۔ آخر کچھ تو اپنا حلیہ آرٹسٹوں کا سا بنا لیا ہوتا۔ کم از کم بال ہی بڑھا لئے ہوتے یہ بھی نہ ہو سکا تو داڑھی ہی بڑھا لی ہوتی، ناخن ہی بڑھا لئے ہوتے۔ اگر یہ سب لغویات سمجھتے ہوں تو کم از کم لباس ہی کچھ اس قسم کا زیب تن کیا ہوتا کہ جس سے "بوکرٹا" کی سی بُو آئے۔ اور دور سے ہی لوگ بو سونگھ کر کہہ اٹھیں کہ "آرٹ کا جھونکا تو دیکھ لیا۔ اب آرٹسٹ کو دیکھنے کی کیا ضرورت ہے؟" ابھی عزیز بھائی میں اتنی بے خودی نہیں آئی کہ خود فراموشی کو اپنے اوپر لادلیں اور ننگے پیر نکل پڑیں۔ وہ اتنے با طہارت اور باوضو رہتے ہیں کہ آرٹ کے توسط سے آرٹسٹ سے ملنے والے مداحوں کو مایوسی نہیں ہوتی۔ بلکہ ان سے ملنے کے بعد مداح یہی کہے گا: "ایک بار دیکھا، دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے"۔

عزیز بھائی کا مقصدِ حیات وہی ہے جو "اٹلانٹک چارٹر" میں درج ہے۔ وہ ہمیشہ "ورلڈ پیس" WORLD PEACE کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ انھیں بڑی آسانی سے "ادارہ اقوام متحدہ" کا معزز رکن نامزد کیا جا سکتا ہے۔ ویسے وہ اپنی ذات میں خود ادارہ اقوام متحدہ" ہی ہیں۔ ان میں وہ ساری خامیاں اور خوبیاں ہیں جو "ادارہ اقوام متحدہ" کی جُز لائینفک سمجھی جاتی ہیں۔

وہ کوئی ۳۳ برس کے بعد کراچی سے حیدرآباد دکن آئے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ اب حیدرآبادی نہیں رہے؟ وہی وضع قطع، وہی چال ڈھال۔ وہی شیروانی۔ وہی ڈھیلا پاجامہ۔ وہی قدیم ہیرکٹ اسٹائل وہی بول چال۔ وہی لب و لہجہ، نہ تصنع نہ بناوٹ ——— "ارے نکورے! ارے مارتوں رے! ارے کاں مر گیا تھا رے، اس کی ماں کا پوٹا ماردوں!" وغیرہ وغیرہ۔ اب بھی وہ "پکے" حیدرآبادی ہیں اور اتنے پکے کہ ۳۳ برس کا طویل عرصہ گذرنے کے باوجود بھی وہ یہاں کی ریاستی سرکاری زبان "تلگو" اردو والوں سے زیادہ اچھی بول لیتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ تذکیر و تانیث میں گڑبڑ کر کے لوگوں کی جنس بدل دیتے ہیں۔ ان کو اتنی رعایت ملنی ہی چاہیئے۔ وہ اس لئے کہ جب یہاں کے لوگ بیرون ملک جا کر اپنے وطن کو بھول جاتے ہوں، مادری زبان بھول جاتے ہوں، حتیٰ کہ ماں کو تک بھول جاتے ہوں تو "Second Language" میں تذکیر و تانیث کی غلطی کرنا اتنا اہم نہیں جبکہ خود اہلِ زبان، سرکاری زبان میں بے شمار املا کی غلطیاں کر جاتے ہیں۔

مجھے عزیز بھائی کی "تلگو دانی" پہ حیرت ہوتی ہے۔ اگر اتنی ہی تلگو اردو والے اور اتنی ہی اردو

تلگو والے سیکھ لیں تو لٹریچر نہ سہی، کم از کم ایک دوسرے کی گالیاں تو سمجھ پائیں گے۔ خیر یہ تو ایک "پیراگراف معترضہ" تھا۔ میں عزیز بھائی کے "پکے حیدرآبادی" ہونے کا ذکر کر رہا تھا۔ بلاشبہ ان کی ذات میں ایک خالص حیدرآبادی چھپا ہوا ہے۔ حیرت کا مقام تو یہ ہے کہ حیدرآباد والے بدل گئے۔ لیکن وہ نہیں بدلے خدا عزیز بھائی کو سلامت رکھے۔ آمین! ان سے حیدرآباد کی شناخت باقی ہے۔

جب سے وہ حیدرآباد آئے ہیں، دو کام بڑی باقاعدگی کے ساتھ انجام دینے لگے ہیں۔ پہلا یہ کہ دیرینہ رفیقوں اور مداحوں سے باتیں کرتے کرتے اچانک رو دینا۔ اور دوسرا یہ کہ دوسرے ہی لمحے میں زوردار قہقہہ لگانا۔ اور قہقہہ بھی ایسا کہ سارا جسم ہنس پڑے۔ مجھے اس قسم کے قہقہے سے بڑا ڈر لگتا ہے جس میں ہنسی کے ساتھ ساتھ ساری کائنات کا کرب پوشیدہ ہو۔ اور ایسا "مجسّم قہقہہ" ایک سچا کارٹونسٹ اور ایک سچا مزاح نگار ہی لگا سکتا ہے۔ عزیز بھائی نے اب تک "مجسّم قہقہوں" کی سنچری مکمل کرلی ہے اور دوسری سنچری کی طرف رواں دواں ہیں۔ ان کی شخصیت کو ابھارنے میں ان کی عینک کو بھی بہت بڑا دخل ہے وہ کچھ اس قسم کی عینک لگاتے ہیں کہ آنکھ بھی ماری جائے تو کسی کو پتہ نہ چلے۔ اور آنسو بھی بہہ نکلیں تو کوئی دیکھ نہ سکے۔

وہ ایک تیسرا کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دینے لگے ہیں۔ ان کے ٹائم ٹیبل میں "وقفہ برائے نماز" کے علاوہ "وقفہ برائے آہ وگریاں در مقامات جامعہ عثمانیہ" بھی شامل ہیں۔ وہ تو مصطفےٰ کمال صاحب ہی کا حوصلہ تھا جو انھیں جامعہ عثمانیہ سے کھینچ لائے۔ ورنہ عزیز قلندر وہیں دھونی رمائے بیٹھا رہتا!

عزیز بھائی ایک ممتاز کارٹونسٹ ہیں۔ وہ لکیروں کے جادوگر ہیں۔ آرٹ کے معاملے میں وہ لکیر کے فقیر نہیں۔ وہ اس سلیقے اور ہنرمندی سے برش کا اسٹروک لگاتے ہیں کہ ان کے برش سے نکلی ہوئی ہر لکیر پتھر کی لکیر بن جاتی ہے۔ میں نے انھیں اسٹروک لگاکر پھر اسے مٹاتے نہیں دیکھا۔ وہ لکیر کو زبان عطا کرنے کی بھرپور قدرت رکھتے ہیں۔

وہ ایک سچے مسلمان کی طرح اپنا ہر اسکیچ ۷۸۶/۹۲ سے آغاز کرتے ہیں۔ اس طرح عزیز کارٹونسٹ نے "اسکیچ آرٹ" کو دائرہ اسلام میں شامل کیا ہے۔ اب تک انہوں نے کتنے اسکیچس کو مشرف بہ اسلام کیا مجھے نہیں معلوم۔ وہ ایک سچے مسلمان کی طرح ۷۸۶/۹۲ لکھ کر یہ اعتراف کرنا چاہتے ہیں کہ "میری چشم گنہگار نے جو کچھ دیکھا اسے لکیروں میں مقید کیا۔ اس سے آگے مجھے کچھ نہیں معلوم" ۷۸۶/۹۲ ان کا کوئی ٹریڈ مارک نہیں اور نہ کوئی ٹریڈ سیکرٹ۔ وہ تو صرف ان کا عقیدہ ہے۔ اور عقیدہ ہی ایک سچے فنکار کی پہچان ہے!

میرے دل کو جلایا جی ماٹھی مِلا

(دکنی)

حمایت اللہ

میرے دل کو جلایا جی ماٹھی مِلا
میرے میں کیا کمی تھی جو لایا اُسے
ہو کو جاؤ شیخ سدّو کا سایا اُسے
سر پو سوکن کو لایا جی ماٹھی مِلا
لایا ڈم پوٹلی کو بسایا اُسے
دل پو آرا چلایا جی ماٹھی مِلا

اس کو فیشن کے کپڑوں کی میکسی بنی
پاؤں پیذب بنے اور ٹھسی بنی
اس کو کھیوے کی چولی بھی ساڑی بنی
لا کو گلسر پنایا جی ماٹھی مِلا

ذرا ادھلی ادھمڑی تو ہرنی کتے
پھاڑی گجگوں کے آنکھیاں توشیرنی کتے
تھر کی گھوڑے کی صورت تو مورنی کتے
اس کو کیسا پٹایا جی ماٹھی مِلا

بولو اب کیا مزا میرے جینے میں ہے
دل کو ٹھنڈک تو اب زہر پینے میں ہے
خواہشاں بچھواں بن کو سینے میں ہے
یہ وقت کیسا آیا جی ماٹھی مِلا

پورے کمرے میں لائیٹاں سجائی تھی میں
گورے ہاتھوں کو مہندی لگائی تھی میں
میرے بستر پو پھولاں بچھائی تھی میں
جا کو واں مرکو آیا جی ماٹھی مِلا

آج کھائیں گا میرے ساتھ جب میں سُنی
اچھے کھانوں سے دستر پو کھانے چُنی
لال دستر پو دھاگوں سے پھولاں بنی
نوی کو ساتھ لایا جی ماٹھی مِلا

بن بُلائے آئی سو آئی اور مٹکتی سو نیں
اور وہ جانا مرگ کو لٹکتی سو نیں
پاؤں نھنی کے ویسا پٹکتی سو نیں
پیچ چکروں میں آیا جی ماٹھی مِلا

اپنے کپڑوں کو چپ چپ جھٹک رہیئے ان
لاڈ میں آ کو کیسا بھٹک رہیئے ان
جمٹی لے کو مرد کو کھٹک رہیئے ا[illegible]
کیا بُلا کو بسایا جی ماٹھی مِلا

ان کو کھٹکی سو وہ مُنہ سڑو اے خدا
جمٹی توڑی سو ہاتھاں جھڑو اے خدا
اس کی مرگی کے دَورے پڑو اے خدا
اس سے ادمی میرا اَب چھڑو اے خدا
ان مرنگی تو کلمہ اَڑو اے خدُ[illegible]
اس کی منڈی پو چوراں کھڑو اے خد[illegible]
آنگ پو الٹی سوجن چڑو اے خد[illegible]
پاپ چکروں میں آیا جی ماٹھی [illegible]

ان کی اور ایک شادی کراؤں گی میں
ہرنی مورنی کا دھپڑا بناؤں گی میں
میری سوکن پو سوکن کو لاؤں گی [illegible]
میرا دل ضد پو آیا جی ماٹھی [illegible]

فکر تونسوی

ایڈیٹر کی مصیبت

مشہور ادبی جریدہ "شمکان" کے مدیر محترم نے ایک رائٹر کو مندرجہ ذیل خط لکھا:

قبلۂ ادبِ عالیہ!

ادبی روایات کو ایک مرتبہ پھر آگے بڑھانے کے لیے ہم نے یہ انقلابی فیصلہ کیا ہے کہ اپنے جریدہ "شمکان" کا ایک سالنامہ شائع کیا جائے جس سے ادب کو اس کی عروجی منزل تک لے جایا جائے کہ اس کے بعد نہ کوئی عروج باقی رہے نہ منزل ــــ ہمارے اس مجتہدانہ ارادے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے یہ قریب قریب ناممکن ہے کہ آپ کی نگارشات اس میں شامل نہ ہوں۔ استدعا ہے کہ یہ خط ملنے کے پندرہ دن بعد اپنی نگارش ارسال کردیں۔ اس چیز کو اپنی نوٹ بک میں ضرور نوٹ کرلیں کہ اگر آپ کی نگارش موصول نہ ہوئی تو ہم سالنامہ کی اشاعت ہی نہیں کریں گے بلکہ اپنے ماہنامے "شمکان" کو ہی بند کردیں گے۔

امید ہے آپ اپنی کھانسی سمیت بخیریت ہوں گے۔ احتیاطاً کھانسی کی تیر بہدف دوا کا ایک پارسل علاحدہ ڈاک سے ارسال کر رہے ہیں۔ آزمانے کی ضرورت نہیں، کھانے کی ضرورت ہے۔ میں اور میری بیوی دونوں استعمال کرتے ہیں جبھی تو اتنا عظیم ادبی رسالہ شائع کیے جارہے ہیں۔

آپ کے افسانے کے لیے ایک جوابی لفافہ بھی منسلک ہے جس پر پوسٹل ٹکٹیں بھی لگی ہوئی ہیں۔

آپ کا خادم
خادم حسین خادم

رائٹر کا جواب ——

مسٹر خادم حسین خادم (بیوی سمیت)!

گرامی نامہ موصول ہوا جس میں شاید آپ ٹکٹوں والا لفافہ رکھنا بھول گئے۔ یہ غفلت شعاری اور کوتاہ اندیشی اکثر ادبی رسائل کو لے ڈوبی ہے —— کیا آپ کا رسالہ ادبی ہے؟

"شمکان" —— آپ کے جریدے کا نام سن کر میری معلومات میں مزید اضافہ ہونا تھا۔ چنانچہ معلومات میں مزید اضافہ کرنے کے لیے ایک مستند لغات پوری کی پوری کھنگال ڈالی۔ یہ لفظ پوری لغات میں غائب تھا۔ سچ مچ آج کل بڑی غیر ذمے داری سے لغات چھپ رہی ہیں۔

آپ مجھے افسانہ نگار سمجھتے ہیں یا شاعر —— تشریحاً تحریر کیجئے۔

کھانسی کی دوا بھی موصول ہوئی۔ گزشتہ سال بھی آپ نے بالکل ایسی ہی دوائی کا ڈبہ ارسال کیا تھا۔ جو ابھی تک ہمارے گھر میں پڑا ہے۔ محفوظ و محجوب۔ ہم نے اس کا استعمال اس لیے نہیں کیا کیونکہ اسے صرف کھانسی زدہ حضرات ہی استعمال کرتے ہیں اور یوں بھی ادبِ عالیہ اور کھانسی میں کوئی نسبی رشتہ نہیں ہے۔

معلوم ہوتا ہے آپ نے کسی غلط آدمی کو بھیجا ہے۔ خط بھی، کھانسی کی دوا بھی ——

آپ کا

دردمند آفندی

ایڈیٹر کا جواب ——

حضورِ انور آفندی صاحب!

بڑی رقت آمیز ندامت کے ساتھ ٹکٹوں والا جوابی لفافہ ارسال ہے۔ اکنالیجمنٹ رسید بھی منسلک کر دی ہے —— یہ میرے سالے (اصلی سالے) چپڑاسی کی غفلت شعاری ہے۔ اُسے ہم نے ملازمت سے علاحدہ کر دیا ہے۔ میری بیوی اس علاحدگی پر بُرا مان گئی تو میں نے اسے طلاق کی دھمکی دے دی۔ جس پر وہ خاموش ہوگئی۔ ادبِ عالیہ روایت میں جو بھی اڑچن ڈالے گا میں اس کا قلع قمع کر کے رکھ دوں گا۔ ادب کے مقابلے پر بیوی کیا چیز ہے؟ جیسے بغیر سڈول بازوؤں کے مقابلے پر چوڑیاں ——

"شمکان" کا مفہوم تو خود مجھے معلوم نہیں۔ ڈکشنری کو کیسے معلوم ہوگا اور میں تو اس امر میں یقین رکھتا ہوں کہ ادب اگر مفہوم کے بغیر ہو۔ یعنی مفہوم کسی عمیق گہرائیوں میں کہیں نہ کہیں سانس لے رہا ہو۔ تو اسے ہی ادبِ عالیہ کہا جاسکتا ہے —— ویسے یہ نام مجھے خواب میں سجھائی دیا تھا۔ میں نے خواب کو حقیقت میں بدل دیا۔ چنانچہ آپ کی آگاہی کے لیے عرض ہے کہ ہمارے

گاہک؛ ہمارے جریدے کی نگارشات کو اتنے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں کہ وہ پرواہی نہیں کرتے، نہ نام کی نہ مفہوم کی۔

بلکہ گزشتہ دنوں ایک گاہک نے تو ہمیں یہاں تک لکھ دیا کہ آپ کے پرچے کی نگارشات میری قطعاً سمجھ میں نہیں آتیں۔ مگر اس کے باوجود یہ سوچ کر پڑھ جاتا ہوں کہ اس میں ضرور کوئی مفہوم ہوگا۔ گاہک کی نا دور اندیشی پر جو ادب تخلیق کیا جاتا ہے اس کا بھی کوئی مفہوم ہوتا ہے۔ تخلیق کا نہیں، قاری کی نا دور اندیشی کا مفہوم۔ معذرت خواہ ہوں کہ کھانسی کی دوا ہم نے آپ کے والد محترم کے لیے ارسال کی تھی آپ کے لیے نہیں ــــــــ

احتیاطاً پھر عرض کر دوں کہ سالنامہ صرف آپ کی تخلیق نہ آنے کے باعث رُکا ہوا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ آپ افسانہ نگار بھی ہیں اور شاعر بھی بلکہ ہمیں تو یہاں تک علم ہے کہ آپ افسانہ، نظم سے بہتر لکھتے ہیں اور نظم افسانے سے بہتر۔

ایک گستاخی کی جراءت کر رہا ہوں کہ کیا آپ کی محترمہ بیوی صاحبہ بھی ادب تخلیق کرتی ہیں ــــ اگر ہاں ــ تو وہ افسانہ، نظم، انشائیہ، تنقید، جو کچھ بھی لکھتی ہیں ــ انہیں شائع کر کے ہمیں دوہری مسرت ہوگی۔

خادم ادب
خادم حسین خادم

خادم حسین خادم کے نام ــــــــ

جناب دوہرے خادم صاحب!

امید ہے آپ یہ سُن کر خجالت محسوس نہیں کریں گے کہ میرے والد صاحب پانچ سال پہلے انتقال فرما چکے ہیں۔ یعنی آپ کی کھانسی کی پہلی شیشی موصول ہونے سے تین سال پہلے آپ کا خط مجھ سے پہلے میری بیوی نے پڑھ لیا تو مشتعل ہو گئی۔ ــــــــ بغیر معقول وجہ کے مشتعل ہونا اس کی خصلت میں ہے لیکن زندگی میں پہلی مرتبہ وہ ایک معقول وجہ پر مشتعل ہوئی۔ اور اس اشتعال کا سبب خادم حسین خادم ایڈیٹر "شمکان" ہے۔

آگ بگولا ہو کر مجھ سے کہنے لگی "ارے یہ سالا خادم کا بچہ تو وہی شخص ہے (اس نے ایڈیٹر نہیں کہا، شخص کہا) جسے میں نے اپنے عالم دوشیزگی میں ایک غزل ارسال کی تھی تو اُس نے جواب دیا تھا کہ ہم اپنے پرچے "شمکان" میں ہمیشہ حسین چیزیں شائع کرتے ہیں لہذا ہم آپ کا فوٹو شائع کر رہے ہیں، غزل نہیں۔

اور پھر آپ کا وہ خط اُس نے میرے سامنے پیش کر دیا۔ وہ خط کیا تھا۔ ایک طمانچہ تھا۔ ادب و تہذیب کے رخساروں پر۔

جب تک آپ میری بیوی کے اس استعمال کے لیے کوئی سچا یا جھوٹا بیان صفائی پیش نہیں کریں گے اس وقت تک اپنے سالنامے کی اشاعت کو روکے رہیئے ۔ اور یوں بھی تو آپ میری تخلیق کے بغیر سالنامہ شائع نہ کرنے کا عہد کر چکے ہیں ۔

جوانانِ جرأت مند کو اپنے عہد کا پابند رہنا چاہیئے ۔ ویسے عہد توڑنے سے پہلے ایک اور راستہ بھی ہے ، خودکشی کا ۔

اور کہیئے ، کیا حال چال ہے ۔ آپ کے ہاں موسم کیسا ہے ۔ میرے شہر میں تو ہر وقت بادل چھائے رہتے ہیں ، اگرچہ برستے نہیں ۔ آپ کے شہر میں بادلوں کا کیا رول ہے ؟

آپ کا

درد مند آفندی

اور ایڈیٹر نے لکھا :

محترم و مکرم و معظم آفندی صاحب !

آپ کے والد صاحب کے انتقال پر افسوس ہوا مگر کیا کیا جائے ، موت سے مفر نہیں میرے اپنے والد صاحب گزشتہ سال انتقال کر گئے ۔ خدا آپ کے والد صاحب مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے ۔ ہم نے اپنے والد صاحب کے متعلق بھی جوارِ رحمت کی دُعا کی تھی نجانے قبول ہوئی کہ نہیں ۔

اگر آپ کی محترمہ بیگم کا اسم شریف نجم آراء صاحبہ ہے تو یہ مذبوح حرکت واقعی ہمارے رسالے میں ہی سرزد ہوئی دراصل یہ ناشائستہ حرکت میرے بیٹے نادم حسین کے ہاتھوں سرزد ہوئی ۔ جب میں غیر ممالک کے دورے پر تھا ـــــ یہ نالائق بیٹا ! آج کل عرب ممالک میں شاید راج مستری کا کام کرتا ہے اور عبرت ناک سزا پا رہا ہے ۔ میں نے اُسے عاق کر دیا ہے ۔

محترمہ نجم آراء صاحبہ سے معذرت خواہ ہوں اور اُنہیں اپیل کرتا ہوں کہ وہ اپنی غزل بھی بھیجیں اور فوٹو بھی ۔ دونوں اپنے پورے حُسن سے شائع کروں گا ۔ اور اطلاعاً عرض ہے کہ اب تو سالنامہ اس وقت تک شائع نہیں کروں گا جب تک ان کی تخلیق "غزل" اور خدا کی تخلیق "فوٹو" موصول نہیں ہوں گی ۔

سالنامہ آپ دونوں کا منتظر ہے ۔ ہمارے شہر کے بادل تک منتظر ہیں ۔ جو گرجتے تو ہیں مگر اُس وقت تک نہیں برسیں گے ، جب تک آپ دونوں کی تخلیقات موصول نہیں ہوں گی ۔

خادم حسین خادم

بیگم آفندی کا خط :

ابے او خادم کے بچّے ، بروزن سوّر کے . . . . !

کل آپ کے رسالے "شمکان" کا سالنامہ مارکیٹ میں دیکھا۔ مگر اس میں نہ میری غزل تھی نہ فوٹو! ـــــ اور آپ ادبِ عالیہ کو اس کی عروجی منزل پر لے جانا چاہتے تھے۔ لگتا ہے جس طرح آپ کو اپنے رسالے "شمکان" کے مفہوم کا علم نہیں اسی طرح "عروج" کے مفہوم سے بھی بے بہرہ ہیں اور

ع بے بہرہ ہے وہ شخص جو معتقدِ میر نہیں

یعنی میری غزل کا نہیں۔

شاید آفندی صاحب کا افسانہ آپ کو نہیں مل سکا تو آپ نے انتقاماً میری چیزیں بھی شائع نہیں کیں۔ ادبِ عالیہ کے مقابلے پر آپ نے انتقامِ عالیہ سے کام لیا۔ مگر آپ کی معلومات میں اضافہ کے لیے عرض ہے کہ ہمارے گھر میں دو آفندی رہتے ہیں۔ ایک میرے خاوند ہیں جو ادیب اور شاعر وغیرہ نہیں ہیں۔ قالینوں کا کاروبار کرتے ہیں اور وہ گزشتہ تین مہینے سے امریکہ گئے ہوئے ہیں ـــــ آپ کے جتنے خط موصول ہوئے۔ آہ! وہ پڑھ ہی نہیں سکے۔

اور دوسرا آفندی! وہ تو مشہور شاعر اور ادیب ضرور تھا مگر وہ ہمارا کرایے دار تھا۔ گزشتہ دو تین ماہ سے وہ یہ شہر ہی چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔ ہمارا ڈیڑھ ماہ کا کرایہ اس پر ابھی تک ـــــ واجب ہے۔

میری غزل اور فوٹو اگر آپ شائع کر دیتے تو میں یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتی کہ چلو ڈیڑھ ماہ کا کرایہ وصول ہُوا۔ مگر آہ! آپ نے میری غزل شائع نہ کر کے قارئین کو ادبِ عالیہ سے محروم کیا۔ اور ہمیں ڈیڑھ ماہ کے کرایہ سے ـــــ

مگر آپ نے تو ببانگِ دہل عہد کیا تھا کہ آپ جناب آفندی کے افسانے کے بعد سالنامہ ہی شائع نہیں کریں گے ـــــ کیا آپ عہد شکن ہیں یا دروغ گو؟ اور یا دونوں۔

آپ کی : بیگم آفندی

رضا نقوی واہی

شعرستان سے شاعروں کا اغوار

[یہ نظم شاعر کی طویل نظم 'شعرستان' کا تازہ ترین باب ہے۔ شاعروں نے اپنی ذمہ داریوں سے بچنے اور ناقدینِ شعر کے حملوں سے محفوظ رہنے کے لیے، ایک ہوم لینڈ کی مانگ کی، جسے حکومت نے مان لیا۔ لیکن شاعروں کے مکمل اِنخلا سے ناقدوں کو بیروزگاری کا سامنا کرنا پڑا۔ تنقید ان کا پیشہ تھا، مگر جب شاعر ہی نہیں رہے تو یہ کاروبار ٹھپ پڑ گیا۔]

شاعروں کو ارضِ شعرستان سے چوری چھپے
ناقدینِ شعر اور اسمگلروں کے درمیاں
طے ہوا، اہلِ سخن اسمگل ہو کر آئیں گے
ارضِ شعرستان میں تھے یوں تو وہ کوڑی کے تین
ملک کے اندر جو اک مدت سے وہ ناپید تھے
گاہک اور تاجر، سبھی کے واسطے یہ کاروبار
پہلے بنوائے گئے مضبوط پھندے اور جال
جٹ گئیں اسمگلروں کی ٹولیاں جی جان سے
مختلف ترکیب استعمال کی جانے لگی
ٹوکروں میں بھر کے آئیں جیسے تازہ مچھلیاں
جو بھی شاعر تھا، بچارہ بے سر و سامان تھا
ناقدوں کا جھنڈ تھا ساحل پہ تا حدِ نظر
سامنے نظروں کے خود پھنس کر شکار آ ہی گیا
دیدی اُجرت، مول تول اسمگلروں سے بے کئے
آہنی پنجروں میں سب کو بند کر کے لائے گھر
گٹھریاں اشعار کی قبضے میں لینے لیں پھر
سرد تھی جو آگ دل میں مشتعل ہونے لگی
پھر تو قصابوں سے بھی فن اُن کا آگے بڑھ گیا

اپنے آبائی وطن میں گھیر لانے کے لیے
ایک خفیہ عہد نامے کی ہوئیں تیاریاں
ناقدوں کے درمیاں، سب نقد بکتے جائنگے
بہرِ نقادِ سخن لیکن تھے اُبجاؤ زمین
پست ہو کر رہ گئے تھے ناقدوں کے حوصلے
ساتھ لے آیا منافع کے مواقع بے شمار
تاکہ آسانی سے ہو اِغوائے اصحابِ کمال
مال بر آمد ہوا ڈھیروں سخن کی کان سے
شاعروں کی کھیپ شعرستان سے آنے لگی
یونہی ساحل سے لگیں اہلِ سخن کی کشتیاں
مالِ دنیا میں اگر کچھ تھا تو بس دیوان تھا
ان کی بانچھیں کھل رہی تھیں شاعروں کو دیکھ کر
"عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا"
ایک اک ناقد کے حصے میں کئی شاعر پڑے
تاکہ ان کے بھاگ جانے کا رہے مطلق نہ ڈر
خامۂ خونخوار مدت سے تھا ان کا منتظر
خوئے ناقد گرگگی میں منتقل ہونے لگی
کاٹ چھانٹ اس کی ہوئی فوراً جو ہتھے چڑھ گیا

ہائے جس کے ڈر سے وہ بھاگے تھے شعرستان میں
لگ گئی وہ جونک پھر اہلِ سخن کی جان میں

واہی

اغوا شدہ شاعروں کا حشر

مختلف اقسام کی ہوتی ہیں جیسے مچھلیاں
ارضِ شعرستان میں بھی یوں ہی قسمِ شاعراں

بلکہ اہلِ شعر کی اقسامِ بے ہنگام سے
"ٹوٹی دریا کی کلائی، زُلف اُلجھی بام سے"

ناقدوں نے ملک میں جب سب کو اغوا کر لیا [۱]
ایک اک شاعر کا سختی سے قرنطینہ ہوا

باؤ ڈاٹا غور سے ہر فرد کا دیکھا گیا
مختلف درجوں میں حسبِ حیثیت باٹا گیا

اک طرح کے شاعروں کو ایک کٹہرے میں رکھا
[۲] بونڈڈ لیبر کی صورت سخت پہرے میں رکھا

کھل گیا ہر چڑ رہنے پر ناقدوں کا ورک شوپ
کھیت میں تنقید کے اُگنے لگا بمپر کروپ

ہر شکاری نے چُنا اپنا پسندیدہ شکار
اور لگا کرنے قلم سے اپنے تابڑ توڑ وار

لگ گئے شب خونیوں کے ہاتھ اربابِ جدید
دوسروں کی عام نقادوں نے کی مٹی پلید

شعر کہنے کے عوض ملنے لگی روٹی انھیں
لیکن اتنی ہی کہ بھوکے رہ کے مرنے سے بچیں

شاعروں میں چند اک قسمیں مگر ایسی بھی تھیں
جن پہ بھولے سے بھی اُٹھتی تھی نہ چشمِ ناقدیں

قطعۂ تاریخِ رحلت لکھنے والے شعر گو
رات دن رہتے تھے قبرستان میں مصروف جو

یا کہ جو گاتے تھے بزمِ شعر میں قوالیاں
چند غزلیں، وہ بھی چوری کی، تھیں جن کا حرزِ جاں

آ کے ہندستان میں یہ سب یتیمانِ سخن
ہو گئے صیدِ زبونِ کس مپرسی دفعتاً

وقت وہ تھا، ملک میں، شاعر ہو یا اس کا کلام
دونوں ہی لفظوں سے نامانوس تھا ذہنِ عوام

جا بسے تھے جب سے شعرستان میں اہلِ سخن
ملک سے ناپید تھی ہر ایک شعری انجمن

مجلسیں تعزیح سازوں کی کہیں جمتی نہ تھیں
"سب کی سب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں"

ایسے میں جلتے کہاں وہ نار چ گلنے کے لیے
اور اپنے پیٹ کا دوزخ بجھانے کے لیے

کوئی ناقد بھیک بھی دینے کو آمادہ نہ تھا
حد یہ ہے، نقاد جی بھی ان کا دلدادہ نہ تھا

سب کہاں، کچھ، جنگلوں میں جا کے حیواں ہو گئیں
"خاک میں، کیا صورتیں ہوں گی، کہ پنہاں ہو گئیں"

طالبؔ خوندمیری

قطعات

"بے فیض نیتا"

اُن سے ہم نے آج تک پایا بھی کیا　　اُن کے منصوبوں کا سرمایا بھی کیا
صرف وعدوں پر بھروسہ کیا کریں　　ریت کی دیوار کا سایا بھی کیا

○

"شہر حیدرآباد کی نذر"

دُور سے یہ گھر بھی دلکش تھا مگر　　پاس سے دیکھا تو کیا دھوکا ہوا
"ایں عمارت تا قیامت پائیدار"　　گرتی دیواروں پہ تھا لکھا ہوا

○

"سلسلۂ شب"

تیس۳۰ برسوں سے زیادہ ہو گئے　　رُخ نہیں پلٹا مگر حالات کا
ہم کو آزادی مِلی تھی رات میں　　سلسلہ باقی ہے اب تک رات کا

○

"اُردو کی فصل"

اپنے ہی دیس کی یہ کہانی ہے دوستو　　یہ بات تو کسی کے لیے بھی نئی نہیں
اُردو زباں کی فصل سیاسی زمین میں　　بوئی گئی ضرور ہے لیکن اُگی نہیں

اور پھر
یوں ہوا کہ
ایک دن ہم اچانک
بیمار ہو گئے۔ ایک زمانہ
تھا جب ہم بڑے اہتمام
کے ساتھ بیمار ہوا کرتے تھے۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ایک
نامی گرامی ڈاکٹر ہمارے فیملی ڈاکٹر
ہوا کرتے تھے۔ ایسے وضعدار ڈاکٹر تھے کہ
ہمارا ہی علاج کرتے کرتے اس دنیا سے رخصت
ہو گئے۔ خدا جنت نصیب کرے ایسی میٹھی اور مزیدار
دوائیں دیا کرتے تھے کہ صحت مند ہونے کو جی نہیں چاہتا تھا۔
وہ مر گئے تو احساس ہوا کہ ایک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے۔ ان کی جگہ
اب جو ہمارے نئے فیملی ڈاکٹر آئے ہیں ان کا یہ حال ہے کہ وہ ہماری بیماریوں سے اور ہم ان کے
علاج سے کبھی متفق نہیں ہوتے ـــــ

جب بھی وہ ہمارے علاج کے معاملے میں بے بس ہو جاتے ہیں تو ایک سیدھا سا مشورہ دیتے ہیں کہ مکمل آرام کرو۔
حالیہ بیماری میں انھوں نے مکمل طور پر آرام کا مشورہ کچھ اس زور و شور سے دیا کہ ہمارے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ارشاد ہوا کہ
پلنگ سے نیچے نہ اترو اور تھوڑی دیر کے لیے بیٹھنا چاہو تو آرام کرسی پر بیٹھو۔ عام کرسی پر ہرگز نہ بیٹھو۔
ہم نے سمجھایا "حضور! ہمارے پاس کئی قسم کی کرسیاں ہیں۔ اقتدار کی ایک کرسی بھی ہے جس پر بیٹھ کر ہمیں بے حد
آرام آتا ہے لیکن آرام کرسی نہیں ہے۔ فی الحال ہم بیمار ہیں۔ دواؤں کے اخراجات کے علاوہ آپ کی فیس بھی دینی ہے ایسے میں
ہم آرام کرسی خریدنے کا بوجھ کیسے برداشت کر سکتے ہیں؟"

بولے " میں طب کا ڈاکٹر ہوں، معاشیات کا ڈاکٹر نہیں ہوں کہ آپ کے معاشی مسائل کا حل بھی تلاش کروں۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ آپ کے لیے آرام کرسی ضروری ہے۔ اگر مرض پیچیدہ ہوگیا تو میں ذمہ دار نہیں ہوں گا۔
جب بھی ہمیں کوئی مشورہ دیا جاتا ہے تو ہمارے دوست خواجہ محی الدین مقام واردات پر ضرور پہنچ جاتے ہیں۔ ڈاکٹر کا مشورہ سن کر بولے " آپ آرام کرسی کی فکر نہ کریں۔ میرے بھائی نے بہت عرصہ پہلے یوروپ سے ایک آرام کرسی میرے لیے بھیجی تھی یہ میرے گھر میں جوں کی توں رکھی ہوئی ہے۔ یہ تمہارے کام آجائے تو اس سے مجھے بے حد خوشی ہوگی "۔
ہم نے کہا " بدیشی اشیاء سے یوں بھی ہمارا جی گھبراتا ہے، بیٹھنا ہی ہو تو کیوں نہ ہندوستانی آرام کرسی پر بیٹھا جائے "۔
بولے " بھیا! اس میں میری بھی ایک مصلحت ہے۔ اس آرام کرسی کی فولڈنگ ہی کچھ ایسی ہے کہ میں نے جب بھی اسے کھولنے کی کوشش کی تو وہ اور بھی پیچیدہ ہوگئی۔ میں نے آرام کرسی کے ساتھ بڑی زور آزمائی کی ہے لیکن یہ میرے لیے اب بھی ایک ایسا عقدہ ہے جس کا کھلنا مشکل ہے۔ سنا ہے کہ ضرورت ایجاد کی والدہ محترمہ ہوتی ہے اور اب چونکہ تمہیں آرام کرسی کی ضرورت ہے، مجھے یقین ہے کہ تمہاری بیماری کا سہارا لے کر ہم دونوں اپنا دماغ لڑائیں تو یہ کرسی کھل جائے گی۔
چنانچہ خواجہ صاحب دوڑے دوڑے اپنے گھر گئے اور منٹوں میں آرام کرسی مذکور کو اٹھا لے آئے۔ آخر جلدی کیوں نہ آتے، انھیں اپنی آرام کرسی کھلوانی تھی اور ہمیں اخراجات سے بچنا تھا۔ کرسی کو بغور دیکھا تو یوں لگا جیسے کرسی نہ ہو کسی پینٹنگ کا فریم ہو۔ البتہ اس فریم کے اطراف کچھ اسکریو تھے، کچھ پیچ تھے اور نہ جانے کیا کیا تھا۔ یہ کرسی نہ صرف کسی ماڈرن پینٹنگ کا فریم لگتی تھی بلکہ خصلت میں خود ماڈرن پینٹنگ سے کم نہ تھی۔ کیونکہ یہ پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ اس آرام کرسی کا الٹا کیا ہے اور سیدھا کیا ہے۔ خواجہ صاحب سے اس معاملہ میں استفسار کیا تو بولے۔
" بھیا! میں اس کرسی پر اپنی عقل کا کافی استعمال کر چکا ہوں۔ جتنی عقل تھی وہ خرچ ہو چکی ہے، تم ذہین آدمی ہو، اپنے دماغ کا استعمال کرو "۔
ہم نے کہا " خواجہ صاحب! ہم نے زندگی بھر کرسیوں کو حاصل کرنے کے لیے بڑی ذہانت کا استعمال کیا ہے۔ چنانچہ ہماری ذہانت کی وجہ سے ہی ہمیں بڑی بڑی کرسیاں ملتی رہی ہیں لیکن اس کرسی پر تو ہمیں صرف آرام کرنا ہے اس کے لیے اپنی ذہانت کو کیوں ضائع کریں "۔
مگر انسان تجسس کا مارا ہوا ہے۔ ہم نے صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ اگر یہ پینٹنگ کا فریم نہیں آرام کرسی ہے تو پھر یہ اندازہ لگانے کی کوشش شروع کر دی کہ یہ آرام کرسی کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں ختم ہو جاتی ہے۔ بہت الٹا پلٹا کچھ سجھائی نہ دیا۔ کچھ پیچ کھولے، کچھ مارا پیٹا۔ بات نہ بنی تو خواجہ صاحب سے کہا کہ وہ آیۃ الکرسی پڑھ کر کرسی کے ایک ڈنڈے کو پکڑ کر کھینچیں اور ہم دوسرے ڈنڈے کو کھینچتے ہیں۔ پورے دو گھنٹے تک ہم دونوں آرام کرسی کے پیچھے اپنے آرام کو حرام کرتے رہے۔ جب ہم پسینے میں شرابور ہوگئے اور سانس پھولنے لگا تو ڈاکٹر کا مشورہ یاد آیا کہ ہمیں آرام کرنا ہے۔
ہم نے تھک ہار کے خواجہ صاحب سے کہا " خواجہ صاحب! اصل میں آپ جسے آرام کرسی سمجھ رہے ہیں وہ آرام کرسی نہیں ہے، کوئی اور چیز ہے۔ آپ خواہ مخواہ ہی اس شیشے میں سے آرام کرسی کو برآمد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اگر اہل یورپ ایسی کرسیوں پر آرام کرتے ہیں تو یہ ان ہی کو زیب دیتا ہے "۔
خواجہ صاحب بولے " میرا بھائی کبھی غلطی نہیں کرتا۔ اس نے میرے لیے آرام کرسی ہی بھیجی ہے مگر مشکل یہ ہے کہ اس کا

پرچۂ ترکیبِ استعمال نہیں بھیجا۔ تم تو جانتے ہو کہ ہم لوگ پرچۂ ترکیب استعمال کے بغیر زہر بھی کھانے کی اہلیت نہیں رکھتے
ابھی ہم یہ بات کر ہی رہے تھے کہ آرام کرسی میں سے کسی اسپرنگ کے لچکنے کی آواز آئی اور آرام کرسی ایک انگڑائی لے کر مگرمچھ کی طرح منہ کھول کر کھڑی ہوگئی۔

خواجہ صاحب نے فرطِ مسرت میں اچھل کر کہا " بھائی صاحب! مبارک ہو، آرام کرسی کھل رہی ہے۔ اب آپ آرام ہی آرام کریں۔ تھوڑی سی اب کھل گئی ہے بقیہ بھی کھل جائے گی۔"

ہم نے غور سے دیکھا۔ سچ مچ اس شئے میں سے آرام کرسی کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ خواجہ صاحب نے پھر کچھ زور لگایا اور آرام کرسی بالآخر اس پوزیشن میں آگئی کہ ایک آدمی اپنی پیٹھ کو موڑ توڑ کر اس میں اُلٹا گھس سکے۔

وہ بولے " اب تم اس کرسی میں گھس کر بیٹھ جاؤ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔"

ہم نے کہا " کرسی تمہاری ہے، پہلے تمہیں آرام کرنا چاہیے۔"

وہ "پہلے آپ، پہلے آپ" کے چکر میں پڑنا چاہتے تھے لیکن ہم نے خواجہ صاحب کو فولڈ کرکے آرام کرسی میں پھنسا دیا اگرچہ خواجہ صاحب کی شخصیت ۴۵ درجہ کا زاویہ بنا چکی تھی مگر پھر بھی ان کی شخصیت آرام کرسی میں سما نہیں رہی تھی۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ آرام کرسی کے منہ میں پہنچ گئے اور بڑی دیر تک وہاں آرام کرتے رہے۔ وہاں آرام کرنے پر وہ مجبور تھے کیونکہ آرام کرسی انھیں اپنے چنگل سے آزاد کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ آرام کرسی میں پڑے پڑے بولے "یوروپی آرام کرسی کی خوبی یہ ہے کہ اس میں آدمی آرام کرنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔ یقین مانو اب اگر تم مجھے اس کرسی میں سے نہیں نکالوگے تو میں زندگی بھر یہیں آرام کرتا رہ جاؤں گا۔

غرض اس آرام کرسی کو ہمارے آرام کے قابل بنانے کے لیے خواجہ صاحب کو دو تین دن تک محنت کرنا پڑی۔ وہ روز ہمارے گھر آکر اس آرام کرسی پر خوب محنت مشقت کرتے۔ بالآخر ایک دن ہم اس پر بیٹھنے میں کامیاب ہوگئے مگر اس پر بیٹھنے کے لیے ایک خاص مشق کی ضرورت تھی کیونکہ آرام کرسی ہمیں اوپر اُچھالتی تھی اور ہم اسے نیچے دباتے تھے۔ جتنی دیر بیٹھتے کرتب دکھاتے تھے۔

چونکہ ایک یوروپی آرام کرسی کو کھولنے کے لیے دو ایشیائی ذہنوں نے محنت کی تھی اس لیے ہمیں یقین تھا کہ اس کے کچھ پُرزے ضرور ٹوٹ گئے ہیں۔ اس کا ثبوت ہمیں یوں فراہم ہوا کہ پہلی بار جب خواجہ صاحب اس آرام کرسی پر سواری کرکے اُترے تو ان کی نئی پتلون پھٹ چکی تھی۔ بعد میں اس پر سواری کے لیے ہماری باری آئی تو ہم نے احتیاطاً پُرانی پتلون پہنی اور حسبِ استطاعت اپنی پتلون پھڑوا کر وہاں سے اُٹھے۔ اس کے بعد ہم دونوں نے اس پر بیٹھنے کے لیے ایک ایسا آسن دریافت کیا جس میں کپڑے تو نہ پھٹتے تھے البتہ جسم کے کسی نہ کسی حصہ پر نیل پڑ جاتے تھے۔

اس آرام کرسی کی ایک اور خوبی یہ تھی کہ اس پر جب تک آدمی بیٹھا رہتا اس میں سے "چوں چوں" کی آوازیں آتی رہتیں۔ ہم نے خواجہ صاحب سے کہا " بھئی! میوزیکل چیئرز کے بارے میں اب تک صرف پڑھا تھا، اب دیکھنے کا موقع بھی مل رہا ہے۔

خواجہ صاحب نے شرما کر اپنی کرسی کی تعریف قبول کی۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم چار پانچ دنوں تک اس کرسی کے حدودِ اربعہ کا پتہ چلانے میں اتنے مصروف رہے کہ بیماری کا احساس ہی نہ رہا۔ جب یہ کرسی کسی قدر بیٹھنے کے قابل

ہوگئی تو ہمیں احساس ہوا کہ ہم بیمار ہیں۔ بیماری کو بڑے جتن کے ساتھ پھر سے جوڑنا شروع کیا۔

ادھر خواجہ صاحب کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ کیونکہ ان کی آرام کرسی کھل چکی تھی۔ جب بھی کوئی ہماری مزاج پرسی کے لیے آتا تو خواجہ صاحب بڑے فخر کے ساتھ اس کا تعارف اپنی کرسی سے کراتے تھے۔ ہماری بیماری کی خصوصیات کی طرف تو ان کا دھیان جاتا ہی نہ تھا۔ ہردم اپنی کرسی کی خصوصیات کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ ہمیں محسوس ہونے لگا کہ اب یہ کرسی ہماری شخصیت کے لیے خطرہ بنتی جارہی ہے۔

ہم نے خواجہ صاحب سے کہا" خواجہ صاحب! آپ تو جانتے ہیں کہ ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔ ہم بیمار ہیں اور اسی لئے فطری طور پر ہماری یہ خواہش ہے کہ یہاں آنے والے ہماری ذات اور ہماری بیماری میں دلچسپی لیں مگر آپ ہر آنے والے کی توجہ اپنی کرسی کی جانب مبذول کروالیتے ہیں۔ لوگ ہماری مزاج پرسی نہیں کرتے آپ کی کرسی کی مزاج پرسی کرتے ہیں۔ یہ بات ہمارے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔

خواجہ صاحب بولے" بھیا میری یورپی آرام کرسی اگر تمہاری شخصیت پر غالب آتی جارہی ہے تو میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں"۔

دوسرے دن ڈاکٹر صاحب ہمارے معائنہ کے لیے آئے تو ہم نے انھیں بیٹھنے کے لیے خواجہ صاحب کی آرام کرسی پیش کی۔ ڈاکٹر صاحب کو اس آرام کرسی پر بیٹھنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ لہٰذا وہ اس پر اسی طرح دھڑام سے بیٹھ گئے جیسے دیگر آرام کرسیوں پر بیٹھا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کرسی کے کچھ پرزوں نے بغاوت کردی اور جو کرسی اب تک کھلی ہوئی تھی وہ ڈاکٹر صاحب پر اچانک بند ہوگئی۔ خواجہ صاحب اور ہم انھیں آرام کرسی کے شکنجے سے آزاد کرانے کے لیے دوڑے۔ بڑی جستجو کے بعد ڈاکٹر صاحب کو آرام کرسی کے منہ میں سے نکالا گیا۔ پھر انھیں پلنگ پر لٹایا گیا۔ ان کی نبض کی رفتار دیکھی گئی۔ بلڈ پریشر چیک کیا گیا۔

اس واقعہ کے بعد سے اب ہماری صحت ٹھیک ہے کیونکہ ڈاکٹر صاحب موصوف ہمارے فیملی ڈاکٹر نہیں رہے البتہ خواجہ صاحب کی کرسی اب بھی بند ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ ہم پھر بیمار ہوں اور ان کی آرام کرسی کھل جائے مگر اب صرف خواجہ صاحب کی آرام کرسی کے لیے ہم بیمار ہونا پسند نہیں کرتے۔

اس سارے ڈرامہ کا ایک ناخوشگوار اثر ہم پر یہ ہوا ہے کہ اچھی بھلی آرام کرسی بھی دکھائی دے تو اس پر نہیں بیٹھتے۔ ■■

چند عناصر اربعہ

یوسف ناظم

چار عناصر اربعہ
بہت مشہور ہیں اور دنیا کے سارے ممالک، خواہ
ان کے پاس کتنے ہی اسلحہ کیوں نہ ہوں اور دنیا کی ساری قومیں خواہ ان میں سب کے
سب دانشور کیوں نہ ہوں ان عناصر کا لوہا مانتی ہیں ۔ لیکن آگ، مٹی، پانی اور ہوا کے علاوہ بھی چند عناصر اربعہ ہیں جن
کے بغیر انسانی زندگی مکمل نہیں ہوتی ۔ آدمی جو خیر سے اشرف المخلوقات ہے اور جس کی جنس ان دنوں وقتاً فوقتاً بدلتی رہتی ہے،
ابتدائے آفرینش ہی سے محتاج واقع ہوا ہے ۔ محتاج کے علاوہ وہ مجبور بھی ہے اور ہمارے ایک بڑے شاعر نے اس بارے میں ایک شعر
بھی کہا ہے جو یقیناً آپ کو یاد ہوگا ۔ (اس شعر کو یہاں نقل کرنا ایسا ہی ہوگا جیسے کسی محفل میں دس بیس دفعہ کا سنا ہوا لطیفہ بیان
کرکے لوگوں سے ہنسنے کی توقع رکھنا) ۔ یہ آدمی کی محتاجی ہی ہے جو اسے انسان بنائے ہوئے ہے ، ورنہ اس کے فرشتہ ہو جانے میں
کوئی کسر نہ رہ گئی تھی ۔ (یوں کچھ مورخ فرشتہ بھی ہوئے ہیں) ۔

ان چار عناصر میں سے آدمی نے اپنی مساعی جمیلہ کی وجہ سے دو عناصر اربعہ پر پوری طرح قابو پالیا ہے ۔ آگ اور مٹی آجکل آدمی جب
جی چاہے اور جہاں جی چاہے آگ لگا سکتا ہے ۔ یہ آگ دیا سلائی کی محتاج نہیں ہوتی، یہ منہ زبانی لگائی جاتی ہے اور عیدگاہ کو قتل گاہ
میں منتقل کیا جا سکتا ہے ۔ اس طرح آدمی کی مراد بر آتی ہے اور وہ آباد و شاد رہتا ہے ۔ کسی گاؤں میں جا کر ایک دو درجن انسانی
زندگیوں کو خاک میں ملا دینا اس سے بھی زیادہ آسان کام ہے (یہ کام اصل میں کھیل کی تعریف میں آتا ہے) ۔ آدمی کو غالباً پانی اور ہوا
پر ابھی تک پوری طرح قابو حاصل نہیں ہوا ہے ۔ تاہم پانی کے معاملے میں اسے تھوڑی بہت کامیابی
حاصل ہوئی ہے اور اب وہ پچھلے زمانے کے آدمیوں کی طرح بات
بات پر شرم سے پانی پانی نہیں ہو جاتا

یہ بھی کچھ کم کامیابی نہیں ہے۔

خاک و باد اور آب و آتش کے علاوہ جن عناصر سے ہمیں روزانہ دوچار ہونا پڑتا ہے ان کی فہرست بہت لمبی ہے (شیطان کی آنت اس سے چھوٹی پائی گئی ہے) ان عناصر میں سے ایک دودھ بھی ہے۔

(۱) دودھ — ہر بڑے شہر میں دودھ، ملک ڈیری سے فراہم کیا جاتا ہے۔ یہ وہی جوئے شیر ہے جو فرہاد اپنے زمانے میں شروع کرنا چاہتا تھا۔ ملک ڈیری اسی کے تصور کی تصویر اور اسی کے خواب کی تعبیر ہے۔ ملک ڈیری کا دودھ دُور سے دیکھنے میں بالکل دودھ معلوم ہوتا ہے۔ سفید رنگ کا یہ دودھ آنکھوں کو طراوت بخشتا ہے۔ اور جی چاہتا ہے گھنٹوں اس کی طرف دیکھتے رہئے۔ (لیکن مناظرِ قدرت سے لطف اندوز ہونے کا اتنا وقت کسی کے پاس نہیں)۔ یہ دودھ اب اونچی قیمت پہ بکنے لگا ہے۔ اور اسے اب صرف وہی لوگ خرید سکتے ہیں جنھیں اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہوتی۔ اب دودھ بوتل خریدیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے، وائٹ ہارس کی بوتل خرید رہے ہیں۔ دولتمند اور متمدن قوموں سے اسی طرح آنکھ ملائی جاتی ہے۔ اس قسم کے عناصر کی قیمتیں اونچی ہوں تو یہ قومیں ہمیں ہم چشموں میں شمار کرتی ہیں۔ اس دودھ کے استعمال سے نہ تو گلے میں سوجن ہوتی ہے نہ آنتوں میں سوزش (گلے میں اگر سوجن پیدا بھی ہوتی ہے تو اس کی وجہ دودھ کی خرابی یا نقص نہیں بلکہ اس پانی کی گھٹیا کوالٹی ہے جو میونسپلٹی فراہم کرتی ہے۔ میونسپلٹی جب فلٹر کیا ہوا پانی مہیا کرنے لگے گی، کسی کے بھی گلے میں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ اور جب بھی گلے سے کوئی آواز نکلے گی، ایسا معلوم ہوگا کوئی شعلہ سا چمک گیا ہے)۔ اس دودھ کو آٹھ دس یا زیادہ سے زیادہ بارہ پندرہ بار خوب اُونٹا کر پیا جائے تو اس سے گلا کھلتا ہے اور ساتھ میں قسمت بھی کھلتی ہے۔ کئی لوگ یہی دودھ پی کر آکاش وانی کے اے کلاس موسیقار بن گئے ہیں۔ رہا آنتوں کی سوزش یا پیچش کا معاملہ تو ان تکالیف سے ملک ڈیری کے دودھ کا کوئی تعلق نہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ تکالیف بھیل پوری اور پاؤ بھاجی کے متواتر استعمال کی وجہ سے لاحق ہوتی ہیں۔ بھیل پوری میں پوری اور پاؤ بھاجی میں پاؤ سوزش بخش اور پیچش کُن عناصر ہیں۔ ملک ڈیری سے فراہم کیا ہوا دودھ تو ان امراض کا سدّباب کرتا ہے، یہ علاج بالمثل ہے۔ یہ دودھ بالکل خالص دودھ ہوتا ہے۔ اس میں نہ تو مکھّن کی ملاوٹ ہوتی ہے نہ بالائی کی آمیزش۔ کتنے ہی لوگوں نے اس دودھ سے بالائی حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن ان کی ایک نہ چلی۔ کتنوں ہی نے اس دودھ سے دہی بنانے کی فکر کی اور تھک کر بیٹھ گئے۔ یہ ہیر پھیر کا دودھ ہوتا ہی نہیں۔ یہ صرف دودھ ہوتا ہے۔ اسے بس یوں ہی پینا چاہئے چائے میں اس کا ذائقہ بگڑ جاتا ہے (چائے کی پتّی بدمزہ ہوتی ہے)۔ یہ دودھ میٹھا بھی نہیں ہوتا اور ذیابیطس کے مریض بھی اسے بلاتکلّف استعمال کر سکتے ہیں۔ اس میں شک نہیں، اکثر بچّے اس دودھ کے مقابلے میں سادہ پانی زیادہ شوق سے پیتے ہیں لیکن بچوں کی پسند بھی کوئی پسند ہوتی ہے۔ اصل قضیہ یہ ہے کہ جب سے لالی پاپ بننے شروع ہوئے ہیں بچوں نے دودھ پینا ہی چھوڑ دیا ہے۔ بچے یہ دودھ پی کر جس کی بھی گود میں بیٹھے ہوں اسے فوراً ہی تر و تازہ کر دیتے ہیں۔

ملک ڈیری سے دودھ بوتلوں میں فراہم کیا جاتا ہے اور کبھی کبھی ان بوتلوں میں جھینگر یا کوئی مُردہ چوہیا بند ہو جاتی ہے لیکن یہ اشیاء ملک ڈیری کی ملکیت نہیں ہوتیں۔ کچھ لوگ اپنی بوتلوں میں یہ چیزیں رکھ کر وہاں بھیج دیتے ہیں اور ملک ڈیری میں امانت میں خیانت کرنا نہیں سکھایا جاتا۔ یہ چیزیں جوں کی توں واپس کر دی جاتی ہیں اور ان کے مالک چند نجی وجوہات کی بنا پر انھیں پہچاننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ بعض وقت گرم کرنے پر دودھ پھٹ بھی جاتا ہے۔ کوئی حرج نہیں۔ اس کا میٹھا اچھا بنتا ہے اور اکثر صورتوں میں تو بچوں کو دودھ پھاڑ کر ہی پلانا پڑتا ہے۔ ڈیری سے پھٹا پھٹا یا دودھ آجائے تو اور کیا چاہئے۔ کچھ لوگوں کو ملک ڈیری کا دودھ پی کر چھٹی کا دودھ یاد آجاتا ہے۔ یہ کارِ ثواب ہے اور ان کے اعمال نامے

میں ضرور اس کا اندراج کیا جائے گا۔

(۲) چائے ـــــ چائے بھی عناصر اربعہ کے رتبے کی مستحق ہے۔ اس کا دخل ہر جگہ ہے جو لوگ کوئی اور مشروب پینے کی صلاحیت یا اہلیت نہیں رکھتے چائے پی کر جیسے تیسے زندگی گزار لیتے ہیں۔ یہ بھی ایک قسم کی نیکی ہے۔ کسی ریلوے اسٹال پر یا کسی چھوٹے موٹے ہوٹل میں آپ کو گدلے رنگ کی کوئی سیال شئے دکھائی دے تو سمجھ جائیے یہ چائے ہے' اسے پیجئے تو اس کے جوہر کھلتے ہیں۔ ہر جگہ اس کا ذائقہ الگ ہوتا ہے۔ کہیں کسیلا تو کہیں میٹھا۔ نرم دل سے نرم دل آدمی جو کسی بات پر منہ نہیں بناتا' چائے پی کر ضرور منہ بناتا ہے۔ (چائے میں اتنی تاثیر ہوتی ہے) یہ مشروب ایک خاص قسم کی پتی سے بنتا ہے اور اسے چائے کی پتی ہی کا نام دیا جاتا ہے (آپ چاہیں تو اسے پتہ بھی کہہ لیجئے)۔ چائے کی پتی ان دنوں کے فیشنل ایبل زراعتی علاقوں یعنی گرین بیلٹ میں نہیں اُگا کرتی۔ اس کے کھیت نہیں باغ ہوتے ہیں۔ (کھیت اور باغ میں منصب کا فرق ہے)۔ چائے کی پتی اب بُرادے کی شکل میں بھی ملنے لگی ہے۔ یہ نرم ریت کی طرح ہوتی ہے اور اس میں چائے کی پتی کے علاوہ سب کچھ ہوتا ہے۔ چائے کے بُرادے کو ہوٹل مکسچر کہا جاتا ہے۔ (سرکاری دواخانوں میں جو مکسچر تیار کیا جاتا ہے وہ بھی کچھ اسی قسم کا ہوتا ہے اور مریض اس کے اتنے عادی ہو جاتے ہیں کہ یہ ان سے چھوٹتا ہی نہیں)۔

ہر آدمی' چائے کا لازمی طور پر پابند ہوتا ہے اور اب تو آدمی کو چاہے وہ سوئے یا نہ سوئے بیڈ ٹی ضرور چاہئے۔ جو لوگ بیڈ ٹی نہیں پیتے دن بھر سست رہتے ہیں (جماہیاں بھی لیتے ہیں) یہ بیڈ ٹی انگریزوں کی یادگار ہے۔ جاتے وقت وہ اپنا بوریا بستر تو ساتھ لیتے گئے' چائے یہاں رہ گئی۔ بیڈ ٹی بالکل خانگی چیز ہے، اس میں کوئی شریک نہیں ہوتا۔ اس لئے بیڈ ٹی پارٹی نام کی کوئی ٹی پارٹی رواج نہیں پا سکی۔ ہاں شام کی چائے نوشی بطور تقریب منعقد کی جا سکتی ہے۔ اور اس میں کسی مہمان خصوصی کو بھی مدعو کیا جا سکتا ہے۔ (یہ آسانی سے مل جاتا ہے)۔

چائے عام طور پر پیالی میں پی جاتی ہے اور ہر پیالی کے ساتھ طشتری ضرور ہوتی ہے چاہے وہ الگ رنگ کی کیوں نہ ہو کئی دنوں تک یہ طشتری یوں ہی بیکار رہی۔ اس کا مصرف اب سمجھ میں آیا ہے۔ جب بھی کوئی دکاندار اپنے گاہک کی خدمت میں چائے پیش کرتا ہے۔ نصف پیالی چائے طشتری میں منتقل کر کے اسے تھما دیتا ہے۔ پیالی کی چائے خود پیتا ہے اور اس میں بھی تھوڑا بہت منافع کما لیتا ہے کیونکہ پیالی میں جو چائے ہوتی ہے عام طور پر مقدار میں نصف سے کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے' نسبتاً گرم بھی ہوتی

جس گھر سے صبح سویرے چائے کے برتنوں کے پھینکے جانے اور ٹوٹنے کی آوازیں آئیں سمجھ لیجئے کہ اس گھر میں زندہ دل میاں بیوی رہتے ہیں اور شانہ بہ شانہ زندگی گزار رہے ہیں۔

(۳) ہلدی ـــــ معلوم نہیں ہلدی جیسی معمولی چیز کس طرح ترقی پا کر اتنے اونچے درجے پر پہنچ گئی۔ اپنی ہم شکل اور ہم جنس اشیاء کے مقابلے میں اس کا اتنا سارا عروج حیرت ناک ہے۔ آدمی کی غذا کے اور بھی بیسیوں اجزائے ترکیبی ہیں جو ہلدی سے زیادہ خوش رنگ اور خوش خصال ہیں لیکن آدمی کی نظر انتخاب پڑی تو ہلدی کی گانٹھ پر پڑی اور یہ باورچی خانے سے نکل کر شادی خانے تک جا پہنچی (گانٹھ کی پوری نکلی)۔ شادی کے سفر میں پہلا قدم ہلدی ہی ہے۔ ہلدی کی رسم کی تکمیل کے بغیر شادی محدود گیتوں کا کرکٹ میچ معلوم ہوتی ہے۔ سب لوگ مقتل کو ہلدی ہی کے راستے جاتے ہیں۔

(۴) روپیہ ـــــ یہ مصنوعی عناصر اربعہ ہے۔ اسے کھانے کی چیزوں میں اس لئے شمار کیا جاتا ہے کہ آدمی جتنا بھی روپیہ کماتا ہے کھا لیتا ہے۔ کم پڑتا ہے تو وہ اسے کمانے کی دوسری ترکیبیں آزماتا ہے۔ کچھ لوگ اس کے لئے ترکِ وطن بھی کرتے ہیں' اور کچھ ترکِ وطن تو نہیں کرتے لیکن وطن سے باہر ان کی آمد و رفت ذرا زیادہ ہی ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مشرقی اور مغربی جرمنی کی سرحد

پر آمد و رفت کے لئے جو پل بنا ہے اس پل سے ایک شخص روزانہ صبح سویرے سیکل پر مشرقی جرمنی سے مغربی جرمنی جایا کرتا تھا۔ پولیس کا عملہ اس کی تلاشی لیتا تھا اور اس کے پاس سے کوئی چیز برآمد نہیں ہوتی تھی۔ اس طرح کئی مہینے گزر گئے۔ آخر ایک دن' ایک پولیس آفیسر نے اس سے پوچھا' میاں آخر تم کس چیز کی اسمگلنگ کرتے ہو' ہم اتنے دن سے تمہیں دیکھ رہے ہیں تم کوئی چیز ساتھ لے ہی نہیں جاتے؟" شخص مذکور نے جواب دیا' میں روزانہ ایک نئی سیکل اسمگل کرتا ہوں۔ جس سیکل پر جاتا ہوں وہ مغربی جرمنی میں چھوڑ آتا ہوں (اگر یہ لطیفہ ہے تو ہم اسے واپس لیتے ہیں)۔

روپیہ کمانے سے پہلے دینیات اور اخلاقیات کی کتابیں پڑھنی ترک کر دینی چاہئیں۔ ان کے مطالعہ سے آمدنی متاثر ہوتی ہے۔

سویرے کی سیر

نریندر لوتھر

کسی پارٹی میں ایک شخص نے ڈینگ ماری "میں نے آج سے سگریٹ پینا چھوڑ دیا ہے۔" پاس ہی کھڑے ہوئے اس کے ایک دوست نے للکارا:
"واہ اس میں کیا بڑی بات ہے؟ میں نے تو کئی بار سگریٹ پینا چھوڑا ہے ——!"

ابھی تک ہماری سیر کا بھی کچھ یہی حال تھا۔ ہم نے کئی بار سیر کرنا شروع کیا۔ لیکن چھ روز کے بعد وہ ختم ہوجاتی تھی۔ گزشتہ بیس برسوں میں، ہم نے کم از کم چالیس بار یہ کوشش کی ہے لیکن ہر بار ناکامی ہوئی۔ گرمیوں میں سیر کرنا شروع کیا تو پسینہ چھوٹنے لگا۔ سردیوں میں کوشش کی تو ٹھٹھرنے لگے۔ خزاں میں یہ نیک ارادے زرد پتوں کی طرح جھڑ گئے۔ موسم بہار میں تہیہ کیا تو اپنے موڈ اور چمن کے اطوار میں کوئی مطابقت نہ پائی —— نتیجتاً ہم ابھی تک کبھی بھی دس پندرہ دن سے زیادہ لگاتار سیر نہیں کر پائے۔ لیکن انسان ہمت نہ ہارے اور کوشش کرتا رہے تو کیا کچھ نہیں کر سکتا۔ اس سال ہمارا ریکارڈ پینتالیس دن تک پہنچ گیا ہے اور ہمیں ایسا لگتا ہے کہ اب یہ عادت پکی ہوگئی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ میں سے کوئی ہونہار لوگ اس شاندار مثال کی تقلید کرنا چاہیں گے اور ہونا بھی ایسا ہی چاہئے۔ آخر اچھی عادتیں اور نیک چلن اس طرح ہی پھیلتے ہیں۔ لیکن ہم یہ وارننگ دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ یہ کام آسان نہیں۔ اس کے لئے بلند ارادے، ہمت اور بردباری کے علاوہ پلاننگ بھی ضروری ہوتی ہے ——

دوکام بیک وقت کرنا آسان نہیں اس لئے ہم نے اس بار سیر کرنے کی مہم میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے دفتر سے دو ماہ کی چھٹی لے لی۔ اگر دفتر جانے کا ڈر لگا رہے تو انسان پوری لگن سے سیر کی طرف رجوع نہیں ہوسکتا۔ آج کل ہم تڑکے اُٹھتے ہیں، سیر کرنے جاتے ہیں۔ سیر سے تھک کر واپس آتے ہیں اور پھر اطمینان سے سوجاتے ہیں۔ اس طرح اپنی کھوئی ہوئی نیند پوری کرلیتے ہیں۔ کیونکہ ہمیں دونوں باتوں کا تجربہ ہے۔ اس لئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ دفتر کے مقابلہ میں گھر میں سونا کہیں بہتر ہے۔ دفتر میں تو کوئی نہ کوئی آپ کو ڈسٹرب کردیتا ہے۔ اگر آپ کسی کو اپنے کمرے کے اندر نہ بھی آنے دیں تو بھی لنچ ٹائم ہوجاتا ہے، یا پھر جب آپ خراٹے لے رہے ہوں تو دفتر میں چھٹی ہوجاتی ہے لیکن گھر میں تو آپ آرام سے سوسکتے ہیں اور کم از کم دن کے وقت تو آپ کو کوئی ڈسٹرب نہیں کرتا۔

خیر سیر شروع تو کردی لیکن اس کی باقاعدہ عادت کیسے پڑی؟ ہمیں باقاعدگی کی ترغیب ان نظاروں سے ملی جو اس بار ہمیں سیر کرتے وقت دیکھنے کو ملے۔ آج تک ہم سڑکوں پر سیر کرنے کی کوشش کرتے رہے لیکن اس بار ہمیں سیر کے لئے ایک پارک مل گیا۔ دلی میں ایسے کئی پارک سرکار نے بنائے جہاں سیر بڑی اچھی طرح کی جاسکتی ہے۔ ایک ایسے ہی پارک کے پاس ہمیں گھر مل گیا۔ پس ثابت ہوا کہ باقاعدہ سیر کے لئے ایک پارک کا ہونا بہت ضروری ہے۔ بہتر تو یہ ہے کہ آپ ایک عدد پارک خرید ہی لیں اگر آپ کے پاس اتنا پیسہ نہ ہو تو پارک کے نزدیک ایک عدد گھر خرید لیں۔ اگر اس میں بھی کچھ دقت ہو تو پارک کے نزدیک ہی مکان کرایہ پر لے لیں۔ اگر اتنا بھی نہ کرسکیں تو کسی طریقہ سے پارک تک پہنچنے کا انتظام کریں۔ کار، اسکوٹر، سائیکل پر اگر آپ اپنی ٹانگوں پر ہی وہاں پہنچیں گے تو وہاں تک پہنچتے پہنچتے ہی آپ کی سیر ختم ہوجائے گی۔

صبح کی سیر صرف امیر یا متوسط طبقہ کے لوگ کرتے ہیں۔ غریب لوگ اس وقت کام پر جاتے ہیں۔ اس لئے انھیں سیر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس لئے اگر آپ امیر بننا چاہتے ہیں تو سویرے کی سیر شروع کر دیجئے۔

سُنا ہے کہ سیر سے صحت اچھی رہتی ہے لیکن ہم نے سیر کرنے والوں کی خرابیٔ صحت بھی دیکھی ہے اور سیر نہ کرنے والے بھی صحت مند لوگ دیکھے ہیں۔ اس لئے اس دعویٰ کا کوئی ثبوت نہیں، لیکن سائنس دان کہتے ہیں کہ ان کے پاس ثبوت ہے، انھوں نے چند خرگوشوں کو کچھ عرصہ کے لئے روز سویرے سیر کروائی، ان کی صحت بہتر ہوگئی۔ پھر ان کی سیر بند کردی، اس سے ان کی صحت گرگئی۔ ہمیں خرگوش بڑے اچھے لگتے ہیں، کتنے بھولے، پیارے اور ڈرپوک ہوتے ہیں جو بات خرگوشوں کو راس آتی ہے، وہ ہمارے لئے بھی ٹھیک ہوتی ہے۔ اس لئے ہم نے یہ ثبوت منظور کرلیا۔

سیر اکیلے کی جاسکتی ہے یا دوستوں اور ہمسایوں کے ساتھ یا بیوی کے ساتھ — یا پھر کتّے کے ساتھ۔

جو لوگ دوستوں کے ساتھ سیر کرتے ہیں وہ سیر کم اور خوش گپّیاں زیادہ کرتے ہیں۔ اس سیر کے دوران تازہ خبریں، حالات حاضرہ پر تبصرہ اور سیاسی اور نجی پیشین گوئیاں بڑی اُونچی آواز میں کی جاتی ہیں۔ اور بڑی دور دور تک سُنی جاسکتی ہیں۔

اگر خاوند اور بیوی اکٹھے سیر کو جائیں تو جہاں خاوند کے صرف پاؤں چلتے ہیں وہاں بیوی کے پاؤں کم اور زبان زیادہ چلتی ہے، قدرتی بات ہے۔ بے چاری کو تمام رات خاموش سونا پڑتا ہے۔ صبح ہونے پر مرد سب سے پہلے آنکھ کھولتا ہے اور عورت زبان۔ سیر میں خاوند کو یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اگر وہ بیوی کی باتیں نہ بھی سُنے تو بھی بیوی درختوں اور جھاڑیوں سے مخاطب ہوسکتی ہے۔ اور اسے یہ بھرم رہتا ہے کہ اس کی باتیں سُنی جارہی ہیں۔ اس لئے بیوی کی خوشی کے لئے سیر ایک مفید چیز ہے، ہم نے بیگم کو اس شرط پر اپنے ساتھ سیر کے لئے لے جانا شروع کیا کہ وہ سیر کے دوران خاموش رہیں گی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہفتہ کے بعد انھوں نے سیر کرنا چھوڑ دیا۔ کہنے لگیں کہ آپ تو ہواخوری کرتے ہیں اور میں گھٹن سے مرتی ہوں۔

کتّوں کے ساتھ سیر کرنے والوں کو دیکھ کر یہ پتہ لگانا مشکل

ہوتا ہے کہ مالک کون ہے اور کون کس کو سیر کروا رہا ہے۔ کتا صاحب
وجگہ جگہ روکتا ہے، تیز تیز آگے نکلنے کی کوشش کرتا ہے یا سست
فتاری سے پیچھے رہ جاتا ہے کبھی وہ یک دم رک جاتا ہے۔ گھاس
یے پتے یا پتھر یا کسی کھمبے کو سونگھنا شروع کر دیتا ہے اور ایک جگہ چن کر
ی کے گرد گھومنا شروع کر دیتا ہے۔ پھر وہ ایسے اطمینان سے وہاں
یک جاتا ہے گویا منزلِ مقصود مل گئی۔ اس وقت کتے کا مالک اپنی
نفت چھپا کر بڑی بے نیازی سے دوسری طرف دیکھنا شروع کر
یتا ہے کہ اس بدتمیز جانور سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ ہم نے کئی بار
یسے اٹکے ہوئے صاحبوں کو "اوورٹیک" کیا ہے۔

لیکن سیر پر کتے کو ساتھ رکھنے میں ایک خاص شان
ہوتی ہے، اس سے صاحبی کی توثیق ہوتی ہے۔ ایک شخص جو روز
چھا بھلا اکیلا سیر کو آتا تھا دیکھا دیکھی ایک دن ایک کتے کو ساتھ
گھسیٹ لایا۔ اس کے ایک دوست نے بڑی معصوم حیرانی کے ساتھ
دچھا "گدھے کو سیر کرانے لائے ہو؟" اس شخص نے بڑے فخر سے کتے
ی طرف دیکھا اور پھر جواب دیا: "یہ گدھا نہیں کتا ہے کتا" ۔۔۔!
دوست نے اسے اگنور کرتے ہوئے کہا "میں تم سے نہیں اس کتے
سے سوال پوچھ رہا ہوں"

کچھ لوگ تیز تیز سیر کرتے ہیں، کچھ لوگ چہل قدمی کرتے
یں۔ کچھ بڑی مشکل سے چل پاتے ہیں۔ سیر کی قسم کی طرح سیر کرنے
الوں کی پوشاکیں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ ایک صاحب گویا ویلڈن سے
درگ کے ساتھ میچ کھیل کر آ رہے ہیں۔ دوسرے پٹوڈی کے ڈمی لگتے
یں۔ تیسرے صاحب اتنے گرم کپڑے پہنے ہوئے ہوتے ہیں گویا
سائبیریا جا رہے ہیں اور ان کے ساتھ چند نوجوان صرف نیکر اور بنیان
یں ہی دیکھے جا سکتے ہیں۔ کچھ لوگ اتنے انفارمل کہ نائٹ سوٹ میں
سلیپر گھسیٹتے گھسیٹتے چلے آتے ہیں۔ ایک زمرہ ایسے لوگوں کا ہے جو دھوتی
ور کرتے میں ہی نکلتے ہیں۔ ملک کی آزادی کے بعد یہ پوشاک ہر جگہ ہر
وقع پر بلا جھجک پہنی جا سکتی ہے۔

عورتیں تو خوب سج دھج کر سیر کو نکلتی ہیں۔ ہمارے ایک
دوست کی بیوی صرف اس لئے سیر کرنے نہیں آتیں کیونکہ ان کا
خاوند ان کے لئے سیر والوں کی پوشاکیں لا کر نہیں دیتا۔ بھلا ایک ہی
ڈریس میں وہ روز روز کیسے سیر کر سکتی ہیں؟ مسز کھنہ کیا کہیں گی؟

چند خوش مذاق خواتین اچھی پوشاک کے علاوہ عطر اور سینٹ
وغیرہ لگا کر سیر کرتی ہیں۔ یہ جو کہتے ہیں کہ پھولوں میں خوشبو ہوتی ہے
تو یہ انہی کے دم سے ہے۔ جدھر سے گزرتی ہیں بھینی بھینی مہک چھوڑتی
جاتی ہیں ورنہ آج کل پھولوں میں وہ مہک کہاں جس کا ہمارے غزل گو
شاعر ابھی تک چرچا کئے جاتے ہیں۔ کوئی ان میں سویرے سیر کرنے گیا ہے۔

پارک میں صبح کے وقت ایک فیشن پریڈ ہوتی ہے جو شہر
کے بڑے بڑے ہوٹلوں میں ہونے والی پریڈوں سے کہیں بہتر ہوتی ہے۔

کئی لوگ پارک میں سیر کرنے کی بجائے قسم قسم کی ورزشیں
کرتے ہیں۔ اکھاڑے والی ورزشیں، یوگا، جاگنگ کئی قسم کی کسرتیں
وہاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ادھیڑ عمر کے آٹھ دس عورتوں اور مردوں کا
ایک "کوایجوکیشنل" گروپ ہے۔ وہ پہلے تو اچھلتے ہیں اور کودتے
ہیں اور پھر مل کر زوردار قہقہہ لگاتے ہیں۔ انھیں بے ڈھنگے پن سے
کودتے دیکھا تو ہم نے سمجھا کہ شاید پاگل خانے سے کچھ پاگل لوگوں کو
چہل قدمی کیلئے لایا گیا ہے پھر ان کے قہقہے سنے تو لگا کہ ہمارا مذاق اُڑاتے
ہیں حالانکہ ہم بالکل صحیح طریقے سے سیر کر رہے تھے اور ہماری ڈریس بھی
مناسب تھی۔ ایک سینئر سیر کرنے والے نے ہمیں بتایا کہ یہ نارمل لوگ
ہیں اور کود کود کر جسم کی اور قہقہے لگا کر پھیپھڑوں کی ورزش کرتے ہیں۔
یہ ورزش ان لوگوں کے لئے مفید ہے جن کی زندگی میں ہنسی کی کمی ہو
اور قہقہے لگانا بھول گئے ہوں۔ ایک دن ان سے کچھ فاصلہ پر
کھڑے ہو کر ہم نے بھی ایک قہقہہ لگایا۔ ہمیں یہ دیکھ کر بڑی حیرانی اور
خوشی ہوئی کہ ہم بھی ابھی تک قہقہہ لگا سکتے ہیں۔

ان "خالص" سیر کرنے والوں کے علاوہ کچھ لوگ ایسے ہوتے
ہیں جو سیر کے بہانے کچھ ضروری کام بھی کر لیتے ہیں۔ کئی ڈبو قسم کے
خاوند بیویوں کے پہلو سے اُٹھ کر اپنی ماؤں کی یاد میں "مدر ڈیری" کے
بوتھ پر کھڑے پائے جاتے ہیں۔ چند لوگوں کو آلو اور پیاز کے ڈھیروں کو

اُلٹ پلٹ کرتے دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ بے چارے چاہے جتنی بھی کوشش کریں گھر پہنچنے پر ضرور ان کی مرمت ہوگی کہ اتنی خراب اور مہنگی سبزی کیوں لائے ہو۔

ایک صاحب ہیں جو چیونٹیوں کو ڈھونڈتے رہتے ہیں جہاں بھی انھیں چیونٹیوں کا کارواں ملتا ہے، وہ اپنے تھیلے میں آٹا نکال کر ان پر پھینکتے جاتے ہیں۔ ہم نے سوچا کہ اس طرح شاید وہ ثواب کمانا چاہتے ہیں۔ لیکن پتہ چلا کہ وہ راشن کے آٹے سے چیونٹیوں کو مارنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایک دوسرے صاحب پارک کی دیوار کے ساتھ بڑی دیر تک لگے سسکیاں لیتے رہتے ہیں۔ ہم نے انھیں یہودی سمجھا لیکن غور سے دیکھا تو وہ سردار صاحب نکلے غالباً اپنے ناکردہ گناہوں پر پچھتاوا کرتے رہتے ہیں۔

ان لوگوں کے علاوہ ایک طبقہ "قدرت پرستوں" کا ہوتا ہے۔ یہ لوگ پو پھٹنے سے پہلے ہی اپنی سیر ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر اندھیرے میں غور سے دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ عموماً ان لوگوں کے ہاتھوں میں ایک پرانا ٹوٹا ہوا ڈبہ یا برتن ہوتا ہے۔ موقع ملتے ہی یہ لوگ درختوں کے پیچھے یا جھاڑیوں کی اوٹ میں غائب ہو جاتے ہیں۔ پھر نمودار ہوتے ہیں تو منہ میں لکڑی کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے جسے چبانے کی وہ ناکام کوشش کرتے ہیں۔ ان کا یقین ہے کہ لکڑی کو چبانے کی کوشش میں جو دانت بچ جائیں وہ نہایت مضبوط ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ باقی کے سیر کرنے والوں سے بازی لے جاتے ہیں۔ واپس گھر پہنچنے تک یہ لوگ دو بٹا تین تیار ہوتے ہیں۔ کیا کیا جائے کہ کچھ لوگ زندگی کی اس تفریح میں بھی کچھ نہ کچھ مفید، ناجائز اور کارآمد پہلو نکال ہی لیتے ہیں۔

ہمیں اب لگاتار سیر کرتے ہوئے پینتالیس روز ہو گئے اب ایسا لگتا ہے کہ ہمیں سیر کی عادت سی پڑ گئی ہے۔ اب جوں ہی مرغ بانگ دیتا ہے، بستر میں ہمارے پاؤں ہلنے شروع ہو جاتے ہیں۔ ہم سوچتے ہیں کہ آج کون سے نظارے کس قسم کے لوگ دیکھنے کو ملیں گے سیر سے اگر صحت بہتر نہ بھی ہو تو یہ جو مفت کا تماشہ دیکھنے کو ملتا ہے یہ کچھ کم بات نہیں۔ غالب بھی صرف "تماشائے اہلِ کرم" دیکھنے کے لئے کئی بار صبح سیر کرنے جاتے تھے۔ اب ہمارے اشتیاق کا یہ حال ہے کہ کئی بار ساری ساری رات نیند نہیں آتی اور بار بار ہم فیض کی طرح پوچھتے رہتے ہیں کہ ؏

اے دل کب رات بسر ہوگی

وجاہت علی سندیلوی

پیروی مقدمے کی

آج کل کی

دنیا اپنی بے پناہ تیز رفتاری اور گاہے چین اور گاہے
چناں والی نیرنگیوں کے باوجود ہر ہر قدم پر مقابلے اور مجادلے کا ایک
میدان ہے اور چھوٹے سے چھوٹا کام بھی خواہ وہ دیا سلائی جلانا یا ناک پر
سے مکھی اُڑانا ہی کیوں نہ ہو ایک فن کا درجہ حاصل کر چکا ہے اور اونچے اور پہنچے ہوئے فن کاروں کا
مطالبہ کرتا ہے ـــــ مقدمہ بازی انسان کی گھٹی میں پڑی ہے اور وہ ایک طرح سے ان کی ایک ایسی لازمی
عادت یا مجبوری بن چکی ہے جس کے بغیر اس کا وجود ہی ادھورا رہ جاتا ہے۔ خود جائیے یا سمن اور وارنٹ
کی تعمیل میں جائیے کچہری جائیے غرض مقدمہ بازی کی زحمت اور مشقت سے بچنا محال ہے ـــ

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
مرنے سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

اس شعر میں اگر مقدمہ بازی کو غم سمجھ لیجئے اور اس کے علاوہ اس کو سمجھا ہی کیا جا سکتا ہے تو کسی حد تک میرا مفہوم واضح ہو جائے گا۔
آج کل کے زمانے میں جبکہ آئے دن ٹرینیں دریائیں پھاندرہی ہیں اور بسیں کھڈوں میں گر رہی ہیں یہ تو تصور کیا جا سکتا ہے کہ کوئی صاحب
قبرستان جانے سے بچ جائیں لیکن یہ حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آتا کہ وہ کچہری جانے سے کس طرح بچ سکتے ہیں۔ انصاف کی تقسیم تو
وہیں ہوتی ہے اور انصاف کس کو نہیں چاہئے ـــ ؟

مذہبی روایتوں کے بموجب سب سے پہلا مقدمہ حضرت آدم پر چلا تھا۔ اپنے اناڑی پن سے انھوں نے ایک ایسے صلاح کار کے مشورے سے اپنے مقدمے کی پیروی کی جو انھیں بڑی سے بڑی سزا دلوانے یعنی کالے پانی عرفِ عام میں اس عالم فانی میں بھجوانے کے لئے پہلے ہی سے اُدھار کھائے بیٹھا تھا۔ چنانچہ بے چارے مقدمہ ہار گئے اور اتنی سخت سزا پاگئے کہ اب تک ان کی اولاد بھی اس سزا کو بھگت رہی ہے اور وہ ختم ہونے ہی کو نہیں آتی۔ اسی قسم کی روایتوں کے بموجب قیامت کے روز سب سے آخری مقدمہ حضرت آدم کے صلاح کار اور ان کی اولاد کے یار و مددگار خود شیطان پر چلے گا۔ مقدمہ کے نتیجہ کے متعلق پیشتر سے کیا پیشین گوئی کی جا سکتی ہے البتہ یہ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ملزم کو بہترین قانونی ذہانتوں کی امداد ضرور حاصل ہوگی کیونکہ ملزم نے ان کی اعانت کرنے میں کچھ بخل نہیں کیا ہے۔ اس روایتی پہلے اور آخری مقدمے کے درمیان تو بس مقدمے ہی مقدمے ہیں اور بنی نوع انسان کی یہ ساری زندگی ایک نہ ختم ہونے والا مقدمہ بن کر رہ گئی ہے۔ ملزم اور مدّعا علیہ، وکیل اور گواہ بدلتے رہتے ہیں لیکن مقدمہ بدستور قائم رہتا ہے۔

مقدمہ کی پیروی کرنا اور اس انداز سے کرنا کہ حق و باطل کا امتیاز ختم ہو جائے اور کسی نہ کسی طریقے سے آنکھوں میں دُھول جھونک کر اپنا مقدمہ جیت لیا جائے۔ اخلاقاً کچھ بھی ہو واقعتاً ایک فن اور بہت نازک فن ہے۔ یہ سمجھ بیٹھنا کہ مقدمہ گواہ اور ثبوت سے جیتا جاتا ہے ایسا خیال ہے جیسے یہ سوچنا کہ محض لغت کو زبانی یاد کر کے کوئی شخص کامیاب شاعر یا ادیب بن سکتا ہے۔ جس طرح ادب کی روح الفاظ میں نہیں بلکہ ان کے استعمال میں مضمر ہوتی ہے بالکل اسی طرح مقدمہ کی کامیابی کی کنجی ثبوت کے انبار میں نہیں پیروی کی چابک دستی میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ ؎

بے جا بولتا ہے مسیحا کے ہاتھ میں، کے مصداق اچھی پیروی ایک کمزور مقدمہ میں بھی جان ڈال دیتی ہے۔

جس طرح مہلک امراض کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ علاج سے زیادہ تیمار داری کی حاجت ہوتی ہے۔ اسی طرح پیچیدہ مقدموں کے لئے کہا جا سکتا ہے کہ ثبوت کی فراہمی سے زیادہ پیروی کی اہمیت ہوتی ہے۔ گواہ اور ثبوت کی تلاش، انھیں ڈھونڈھ نکالنا یا پیدا کرنا یعنی تالیف کے ساتھ تصنیف بھی کرنا اور پھر ان کو کانٹ چھانٹ کر یا نمک مرچ لگا کر اس انداز اور سلیقے سے پیش کرنا کہ "یہ سب سچ ہے اور سچ کے علاوہ کچھ بھی نہیں" بس ایک ہوشیار پیروکار ہی کے کام ہوتے ہیں۔ وکیل مقدمہ کی موٹر کا ڈرائیور ضرور ہوتا ہے، لیکن موٹر کی اصلی طاقت اس کے انجن میں ہوتی ہے۔ اور یہ انجن پیروکار ہی ہوتا ہے۔ گرگ باراں دیدہ قسم کے پیروکار وکیل کو جرح اور بحث تک سکھانے کی کوشش کرتے ہیں اور اکثر اس کی فیس میں کتر بیونت کرنے اور حصّہ بٹا لینے سے بھی نہیں چوکتے۔

کچھ بے چارے مقدمہ بازوں کو "آیا نہیں لایا گیا ہوں" کے مصداق مقدمہ بازی میں مجبوراً مبتلا ہونا پڑتا ہے۔ یہ میاں پوت قسم کے لوگ مردہ بدست زندہ بن کر کچہری جاتے اور وہاں وکیل سے لے کر چپراسی تک اور خصوصاً بے ساختہ دلالوں اور خود ساختہ پیروکاروں کے تختۂ مشق بنتے ہیں۔ یہ ڈرے سہمے، منہ لسورتے ہوئے جاتے اور بلبلاتے، کان پکڑے واپس آتے ہیں۔ اور زندگی کا بڑا حصہ مقدمہ بازی میں گنوانے کے بعد بھی اس کے حروفِ تہجی سے بھی بے بہرہ رہتے ہیں۔ البتہ کچھ لوگوں کو مقدمہ بازی کے داؤ پیچ، اُتار چڑھاؤ، ہاؤ ہو، لم چیخ، چرب زبانی اور سخن سازی، حملہ کرنے کے گر اور وار بچانے کے سلیقے میں پہلے دلچسپی اور شوق اور پھر رفتہ رفتہ مشق اور مہارت پیدا ہو جاتی ہے اور پھر خواہ اپنا مقدمہ ہو یا کسی دوسرے کا، بلکہ کسی دوسرے کا ہو تو زیادہ بہتر ہے کیونکہ نئے تجربات کسی دوسرے ہی کے کاندھے پر بندوق رکھ کر زیادہ جرأت سے کئے جا سکتے ہیں۔ یہ پیروکار بن کر مقدمہ میں اتنا محو اور مستغرق ہو جاتے ہیں جتنا کہ کوئی شاعر فکرِ سخن میں یا کوئی عاشق تصورِ محبوب میں بھی نہیں ہوتا۔ ایسے ہی لوگ اپنے چمتکاروں سے فن کار بن کر مقدمے کی پیروی کو ایک فن بنا دیتے ہیں۔

ہمارے قصبہ میں ایک بہت پہنچے ہوئے مقدمہ باز رہتے تھے

نکہ وہ قریب قریب قصبہ کے ہر اہم مقدمہ میں کسی نہ کسی فریق
ر وکار یا مختارِ عام یا خاص ہوتے لہٰذا وہ اپنے اصلی نام کی بجائے
، اپنے لقب منشی جی سے پکارے جاتے ۔ ان کے دو کارنامے یقیناً
ریکارڈ کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ ایک تو یہ کہ وہ اکاون سال تین مہینے
تیس دن متواتر بلا ناغہ جس روز بھی کچہری کھلی تھی کچہری ضرور گئے
تیٰ کہ کچہری ہی نہیں جہاں وہ اپنی آخری علالت کے دوران ڈولی
تے ان کا انتقال بھی ہوا تھا ۔ آندھی، پانی، اولے اور طوفان کا تو
) کیا اس طویل عرصہ میں اگر خود ان کے گھر میں کوئی تقریب ہوئی تھی
) قریب ترین عزیز مرگیا تھا تو بھی وہ گھر والوں کی نظریں بچا کر
؛ چھپاتے کچہری کا ایک چکر ضرور لگا کر وہاں کی خیر و خبر لے آئے تھے۔
دوسرا عالمی ریکارڈ والا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے چھ سَو سے
ہ مقدمات میں گواہی دی تھی ۔ ان کا یہ کارنامہ بھی قابلِ ذکر ہے
ہ اپنی وصیت کے بموجب کچہری کے پیچھے ایک ایسے کھیت کے
ے دفن کئے گئے جس کے حدود کے تعین کے لئے وہ ایک فریق
جانب سے مقدمہ لڑ رہے تھے ۔ اور اس طرح ان کی قبر زبردستی
رچین کی طرح حدِ فاصل بن گئی تھی ۔ فریقِ مخالف نے اس خیال
۔ کہ مرگئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا، منشی جی کے جسدِ خاکی کو
نامناسب نہیں سمجھا اور ان کے مرنے کے بعد فتح کی ہوئی زمین
بخوشی دست بردار ہوگیا تھا ۔ میں نے منشی جی کو تو نہیں دیکھا
۔ ان کی قبر کی زیارت ضرور کی ہے ۔ وہ مروجہ طریقہ کے بموجب
دکھن ہونے کی بجائے پورب پچھم ہے ۔ شاید غنیم کی یلغار روکنے
لئے یہ زاویہ زیادہ موزوں تھا ۔

منشی جی مقدمات کے متعلق ہر کام نقد اُجرت پر کرتے
ا "کاغذات کا حصول، گواہوں کی فراہمی، تحریری ثبوت کی تصنیف
لیق خود بطور گواہ پیش ہونا، دوسرے فریق کے گواہوں کو ورغلانا
، خلاف ثبوت کو غت ربود کرنا وغیرہ وغیرہ ۔ ان کا مقولہ تھا
چاہے موت پر بھروسہ کرلو لیکن کسی مقدمہ کے فیصلے یا محبوب
، وعدے پر کبھی تکیہ نہ کرو ۔ چنانچہ وہ اپنا معاوضہ مقدمہ کے فیصلے
کا انتظار کئے بغیر بے مروّتی سے وصول کرلیتے ۔ لیکن ایک دفعہ خود
انھوں نے اپنے اس مقولے کی خلاف ورزی کی تھی اور اس کی سزا بھی
پائی تھی ۔

ایک تاجر کے انھوں نے کئی مقدمے بطور مختارِ خاص کئے
تھے ۔ بے چارا لاولد تھا اور بیوی بھی مرچکی تھی ۔ منشی جی نے اُسے اس
کے مرنے سے دس سال پہلے ہی سے اپنا شکار بنانے کے لئے منتخب
کرلیا تھا ۔ چنانچہ انھوں نے اپنے حسبِ منشا ثبوت فراہم کرنا بھی
شروع کردیا تھا ۔ اس کا انتقال ہوا تو منشی جی نے ایک عورت کو جس
سے پہلے سے کہی ہوئی تھی اس کی بیوہ بنا کر پیش کردیا ۔ بہت معتبر
زبانی ثبوت کے علاوہ تحریری ثبوت میں نہ صرف نکاح نامہ شادی
کے دعوت نامے، دعوتِ ولیمہ کے کارڈ، نیوتے کی فہرست، مبارکباد
کے تار اور خطوط مرحوم کے محبت نامے بلکہ وہ دستاویزیں بھی پیش
ہوئیں جس میں مرحوم نے اپنی زوجۂ ثانیہ کے نام سے جائدادیں خریدی
تھیں ۔ منشی جی نے اس مقدمہ پر کئی ہزار روپے اپنے پاس سے صرف
کئے اور بالآخر مقدمہ جیت لیا ۔ البتہ ان کو یہ حادثہ ضرور پیش آگیا
کہ آٹھ لاکھ کی جائداد پا جانے کے بعد مفروضہ بیوہ نے منشی جی سے
عہدِ محبت توڑ کر ایک دوسرے شخص سے شادی کرلی ۔ منشی جی نے
اس کے خلاف ثبوت اکٹھا کرنا اور بنانا شروع کردیا تھا لیکن افسوس
کہ موت نے مہلت نہ دی اور ہزاروں مقدموں کی مسلیں کھلوانے
والے کی خود مسل داخل دفتر ہوگئی ۔

اعجاز وارثی

دولت کا نشہ

نشہ دولت کا ہوا ہے جب سے رمضو پر سوار
بن گیا ہے صحن دل میں آدمیت کا مزار

مستقل عرش معلیٰ پر فروکش ہے دماغ
حاضر خدمت ہیں ہر دم فون، شوفر اور کار

آتے ہی اسم گرامی کی مرمت کا خیال
اک مقامی روزنامہ میں چھپا یہ اشتہار

من کہ رمضو ابن فیضو ساکن شہر فلاں
آج سے کرتا ہوں میں رمضان خاں نام اختیار

موٹے کرتے، بنڈی اور تہمد کو کہہ کر خیر باد
زیب تن کرتے ہیں اب بُش شرٹ، پتلون اورازار

مُفلسی کے عہد کی یاد و علامت سے گریز
سابقہ احباب، رشتہ داروں سے ملنے میں عار

حد یہ ہے بچوں کی اماں کو بھی چلتا کر چُکے
عقد میں ہے آج کل اک نازنین گل عذار

خوب دیکھے بھالے ہیں لیکن ڈھٹائی دیکھئے
کرتے ہیں اب اپنا پشتینی رئیسوں میں شمار

یوں پٹھاتے رہتے ہیں بیچارے ہمسایوں پہ رعب
چائے اور کھانے پہ جب دیکھو ڈٹا ہے تھانہ دار

عام لوگوں میں تو گردن اکڑی رہتی ہے مگر
پیش حکام احقر و ہیچ و حقیر و خاکسار

دور رہتے ہیں تقاضائے بشریت سے مگر
صحبت بد ضع ان کو باعث صد افتخار

سال آئندہ ارادہ ہے حجاز پاک کا
وہ بھی کچھ بہر خطاب اور کچھ برائے کاروبار

علم کا ذکر آتے ہی ارشاد فرماتے ہیں آپ
"جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں پڑھے لکھے ہزار"

چاپلوسوں کا لگا رہتا ہے مجمع اردگرد
دیگ یہ خود ہیں تو کفگیر اور چمچے بے شمار

ناچ گانے کا اگر چندہ ہو تو سو دو سو نقد
خیر کے کاموں میں روپیہ ایک اور وہ بھی اُدھار

ہر گھڑی، شام و سحر زر کی طمع، دھوکہ فریب
ہو گئی نذر معائب زندگی مستعار

دیکھئے کیا گل کھلائے آگے یہ مال حرام
آج کل زوروں پہ ہے اسمگلنگ کا کاروبار

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

تلاشِ روزگار

ں باپ نے زرِ کثیر خرچ کرکے ہمیں پڑھایا
اسے توقع کی جاتی تھی کہ ہم بڑے ہوکر کوئی
ہی سی ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب
ہوجائیں گے اور باقی ماندہ زندگی بڑے
رام سے گزرے گی۔ خدا خدا کرکے وہ روزِ
عید آیا کہ اخبارات نے ہمارے بی۔ اے
ں کامیاب ہونے کی خبر شائع کی۔ ہر طرف
ے مبارکباد کا شور بلند ہوا۔ ہم بھی اپنے
پ کو پہلے سے زیادہ معتبر اور باشعور
سمجھنے لگے۔ دوستوں نے ہمارے مستقبل
ے پینتیس سالہ پلان کے لیے تجویزیں پیش
یں۔ ایک صاحب نے مشورہ دیا کہ سب
ے اچھی ملازمت پولیس کی ہے۔ اگر
ہ ملازمت مل جائے تو پو بارہ، رعب
ا رعب، اختیار کا اختیار اور پھر جائز اور
اجائز آمدنی۔ بے شمار — ہم اس
لازمت کے لیے درخواست دینے پر آمادہ
ہی ہوئے تھے کہ ایک اور دوست آئے اور فرمانے لگے کہ
میاں کس چکر میں پڑ گئے۔ پولیس کی بھی کوئی ملازمت ہے
افسرانِ بالا تو ہر قسم کے ناجائز کام کرلیتے ہیں اور اگر داؤ
ٹھیک نہ بیٹھے تو خود پیچھے ہٹ جاتے ہیں اور سارا بوجھ
ماتحت کی گردن پر ڈال دیا جاتا ہے اور پھر یہ ملازمت
ہے بھی تو چوبیس گھنٹے تیس دن بارہ مہینے کی۔ پولیس
والا ہر وقت ڈیوٹی پر سمجھا جاتا ہے۔ کبھی فسادات کی روک
تھام کے لیے گولی چلانا کبھی پھولاں دیوی کا تعاقب کبھی شہر
کے غنڈوں، بھڑووں سے جھگڑا۔ ایک لمحہ بھی تو چین سے
نہیں گزرتا۔ اس دوست نے کچھ اس موثر انداز سے اپنی
دلائل پیش کیں کہ ہم بھی قائل ہوگئے۔ بیان کو جاری رکھتے
ہوئے اسی دوست نے مجسٹریٹ بننے کی تجویز پیش کی اور
اس نوکری کے محاسن بیان کرتے ہوئے کہا کہ تھانیدار تو
کیا انسپکٹر جنرل پولیس بھی اگر مجسٹریٹ کی عدالت میں
پیش ہو تو اسے مجسٹریٹ کو باوردی سلام کرنا پڑتا ہے
پولیس والے لاکھ جھوٹے سچے مقدمات بنا کر لائیں
مجسٹریٹ کا حکم اللہ میاں کے حکم کی طرح آخری ہوتا ہے

مجسٹریٹ اگر چاہے تو کروڑپتی کو قیدِ بامشقت کی سزا دے کر جیل میں بھیج دے۔ مجسٹریٹ کے اختیارات کی کوئی حد نہیں ہے
اس دوست کی باتوں میں بھی وزن تھا اور ہم ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ مجسٹریٹی حاصل کرنے کے لیے پہلا قدم کس طرح اٹھایا جائے
کہ اتنے میں ایک اور صاحب آگئے اور فرمانے لگے کہ آپ کن الجھنوں میں پڑ گئے۔ مجسٹریٹی بھی کوئی نوکری ہے۔ صبح دس بجے
عدالت میں پہنچو اور شام کے پانچ بجے تک PW_1 اور PW_2 ہی ہوتا رہے۔ ملزمان کو سزا دی جائے تو شور بپا ہوا کہ مجسٹریٹ
سفاک اور بے رحم ہے۔ بری کیا جائے تو رشوت کے الزامات لگیں اور پھر سوشیل زندگی کا تو بالکل ہی خاتمہ ہوجائے۔
نہ کسی سے مل سکو نہ کسی کو گھر پہ بلا سکو۔ اس سے تو بہتر ہے کہ رشی کیش میں ایک آشرم کھولا جائے۔ ہندوستان میں آنکھ
کے اندھوں اور گانٹھ کے پوروں کی کوئی کمی نہیں۔ بس۔ ایک دفعہ نام نکلنے کی دیر ہے۔ یورپ، امریکہ، چین، جاپان
اور نہ معلوم کہاں کہاں سے چیلوں کے میلے لگ جائیں گے۔ بے شمار چڑھاوا چڑھے گا آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام اور
پھر مزے کی بات یہ ہے کہ نہ کام نہ دھندا۔ صبح و شام گھنٹے آدھ گھنٹے کے لیے بھاشن اور درشن دینا ہی کافی ہوگا۔

ابھی اس مسئلہ پر غور کیا ہی جا رہا تھا کہ ایک اور صاحب تشریف لے آئے اور فرمانے لگے کہ یہ سب بکواس ہے
معاش کے لیے سب سے اچھا پیشہ سیاست ہے اور پھر لیڈر بننے میں کوئی محنت بھی نہیں کرنی پڑتی۔ صرف ضمیر اور
احساس، دیانت داری اور راست گوئی کو خیرباد کہنا پڑتا ہے۔ شروع شروع میں یہ کچھ نامناسب سا نظر آئے گا،
لیکن جب تاجر، دکاندار، کالا دھندا کرنے والے، نوکری کے متلاشی، راشی سرکاری ملازم، سمگلر، پرمٹ حاصل
کرنے والے اور کوٹا الاٹ کرانے والے آپ کے پیچھے گھومیں گے اور آپ کی ہر "خدمت" کرنے میں ایک دوسرے
سے سبقت لینے کی کوشش کریں گے تو آپ کو پتہ چلے گا کہ اس دور میں سیاست سے بڑھ کر مفید اور کوئی پیشہ
نہیں ہے اور اس میں داخلہ ہونے کے طریقے بھی نہایت آسان ہیں۔ پہلے کسی مرضی یا واقعی مسئلہ کو لے کر (اگر
فرضی ہو تو بہتر ہوگا) بھوک ہڑتال رکھیے بلکہ یہ اعلان کیجیے کہ مرن برت رکھ رہا ہوں۔ رات کے سناٹے میں یخنی
اور انگور کا رس چلتا رہے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اوّل تو دو چار دن میں کوئی اللہ کا بندہ آسکے گا ورنہ
(اخبارات میں تو مشتہری ہو ہی چکی ہوگی) آپ یہ کہہ کر کہ آپ کو غیب سے صدا آئی ہے کہ مرن برت توڑ دو
برت توڑ دیں۔ ایسا کرنے سے آپ کی "روحانیت" میں بھی فروغ ہوگا۔ اس کے بعد ایک آدھ الکشن لڑ لیجیے
اوّل تو خدا کامیابی دے گا ورنہ چندہ تو مل ہی جائے گا اور ہارنے کی صورت میں بھی آپ کی مالی حالت سدھر جائے گی
بس ایک بار آپ سیاست کے میدان میں آگئے تو اس پیشہ سے ریٹائر ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوگا۔

نوٹ: ہم نے یہ ساری دلیلیں سن لی ہیں اور غور کر رہے ہیں کہ کون سا پیشہ اختیار کریں۔ ■■

غریبوں، دردمندوں، بیکسوں کو
زبردستی کا سالِ نو مبارک!

صبح و شام، شب و روز، ماہ و سال سب ہی بدلتے رہتے ہیں۔ نیا سال ایک نیا پیام لاتا ہے ایک نیا چیلنج، نئی امیدیں نئی کامرانیوں کی نوید، تقدیریں بدلنے کی تدبیریں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ہر سال نیا سال آتا ہے اور اپنی عمر پوری کر کے چلا جاتا ہے اور کچھ بھی نہیں ہوتا ؎

نیا سال ہر سال آتا رہے گا
نیا سال ہر سال جاتا رہے گا
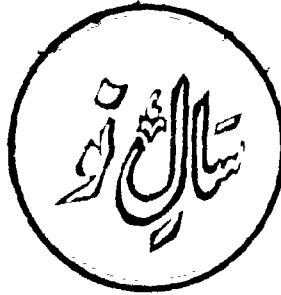
اور کچھ ہوتا ہے تو بس یہی کہ تین سو پینسٹھ دن کے بعد جنتری کے بارہ مہینوں کے بارہ صفحے پھاڑ دیئے جاتے ہیں اور تمام کا تمام کیلنڈر اور پوری کی پوری ڈائری بدل دی جاتی ہے۔ شاید اسی لئے حکیم مشرق بھی، مشرق و مغرب کا موازنہ کرتے ہوئے کہہ گئے ہیں ؎

وہاں دگرگوں ہے لحظہ لحظہ، یہاں بدلتا نہیں زمانہ

وہ لوگ جو جیتے ہوئے دنوں کو اور ماہ و انجم کی گردش کو اور گردش ایام کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے اپنے تاثرات کا اس طرح اظہار کرتے ہیں۔

دیر میں یا حرم میں گذرے گی
زندگی ہے تو غم میں گذرے گی

حالانکہ خدا نے انسان کو عقل و دانش اتنی عطا کی ہے کہ نہ صرف دنیا بلکہ ماورائے دنیا اور دنیا کے ساتوں طبق اس پہ روشن ہوتے جاتے ہیں اور افلاک کے تارے اس کے قدموں پہ جھکتے جاتے ہیں، لیکن حضرت انسان ہیں کہ سال نو میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کو جاننے کے لئے بڑے ہی بے چین رہتے ہیں

چنانچہ کسی نے نجومی سے اپنے مستقبل کے بارے میں پوچھا تو اس نے علم نجوم، قیافہ شناسی اور ہاتھ کی لکیروں سے اسے بتایا کہ آپ اپنی عمر کے چالیسویں سال تک دکھ درد غم والم سے بدحال اور پریشان رہیں گے مصیبتیں آپ کی زندگی کو اجیرن کر رکھیں گی۔ اس پر اس نے کچھ امید کی کرن دیکھ کر پوچھا میری عمر کے چالیسویں سال کے بعد کیا ہوگا؟ نجومی نے کہا "ہوگا کیا خاک، آپ ان کٹھنائیوں کے ایسے عادی ہوجائیں گے کہ مصیبت مصیبت نہ رہیگی۔ یاسیت اور قنوطیت کے جذبات بہت سوں کے دلوں میں ایسے گھرے ہوتے ہیں کہ وہ خود پچھلی ناکامیوں اور حسرت بھری یادوں کا مدفن بن جاتے ہیں اور وہ غم واندوہ کے سمندر میں ڈوب جاتے ہیں، برخلاف اس کے بہت سارے لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنے دکھ درد سے بھرے ماضی کو پس پشت ڈال کر آگے امید بھری نظروں سے دیکھتے ہیں اور انہیں شاندار کل اور خوبصورت مستقبل کی روشنی دکھائی دیتی ہے۔ ایسے جیالے اور امید بھرے انسان اپنے موڈ اور تاثرات کو سالِ نو کے موقع پر ان الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں۔

تیری آمد سے ہیں اے نوروز شاداں خاص وعام
اہلِ دنیا کے لئے ہے تو مسرت کا پیام

اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ انسان جو سوچتا ہے بڑی حد تک وہی ہوتا ہے اور بسا اوقات اس کی تقدیر بدل جاتی ہے محض تدبیر سے نہیں بلکہ اس کی سوچ اور اس کی تمناؤں اور دعاؤں سے بھی، غلط فہمیاں خوش فہمیوں سے بدل جاتی ہیں۔ چنانچہ ایسے لوگ کہتے ہیں۔

نئی امنگ نئے حوصلے نئے ارماں
میں سالِ نو کیلئے نذرِ شوق لایا ہوں

ان کے لئے زمین وآسمان رنگین ہیں اور وہ دیکھتے ہیں کہ

شفق کے پردوں میں لپٹی لپٹائی صبح نو رونما ہو رہی ہے
افق پہ لمحہ بہ لمحہ کرنوں کی اک کمان تنتی جارہی ہے

خمریات میں ڈوبے ہوئے انسان حقیقی مجازی یا معنوی اعتبار سے اپنا مستقبل اس طرح دیکھتے ہیں اور ان کی تمنائیں اور امنگیں ان الفاظ میں ظاہر ہوتی ہیں۔

ساقیا آگیا ہے سال نیا چاہیئے اب تو ہم کو مال نیا

وِش یُو ہیپّی نیو اِیَر ....!

برق آشیانوی

سال میں تین موسم ہوتے ہیں
اس لئے سال میں تین نئے سال آتے ہیں ایک
نیا سال اُگادی کے مہینے سے شروع ہوتا ہے، دوسرا
سال محرم کے مہینے سے شروع ہوتا ہے اور تیسرا سال
ماہِ جنوری سے شروع ہوتا ہے۔ البتہ حکومتِ
آصفیہ حیدرآباد کے دور میں سال میں چار
نئے سال ہوتے تھے۔ اس چوتھے نئے
سال کا نام فصلی ہوتا تھا جس کو تبرک
کے طور پر بعض اخباروں میں اب بھی باقی
رکھا گیا ہے ـــــ اول الذکر دونوں
دیسی سال ہیں۔ اور ابھی ہم نے اپنے دیس کی
چیزوں کی قدر کرنا نہیں سیکھا ہے۔ اس لئے
کسی دیسی سال کو نیا سال منانا ہماری شان کے خلاف
ہے۔ ہماری شان تو اسی میں ہے کہ ہم بدیشی سال
کو اپنا سال یا یوں کہئے کہ "اپنا مال" سمجھ کر نیا سال
منائیں۔ ہمارے سرکاری دفاتر میں افسروں
سے لے کر کلرکوں تک ہر شخص اپنا دیسی لباس
پہن کر آفس میں کام کرنا کسرِ شان سمجھتا ہے۔ ان
شان اسی میں ہے کہ یا تو سوٹ پہن کر جائیں یا پتلون اور شرٹ
زیبِ تن کر کے جائیں۔ البتہ چپراسیوں میں اپنے دیش سے
کچھ محبت پائی جاتی ہے (وہ بھی ان چپراسیوں میں
جن کو "یونیفارم" نہیں دیا جاتا) جنھوں نے کسی
نہ کسی دیسی قسم کا لباس پہن کر اپنے دیش کی
روایات کو قائم رکھا ہے مثلاً پاجامہ،
دھوتی، قمیص، کُرتہ وغیرہ۔ کوئی بدیشی
سیاح ہمارے ملک کے کسی آفس کو آجائے
تو ان کو باہر دیکھ کر سمجھتا ہے کہ وہ ہندوستان کے
اندر ہے اور جب آفس کے اندر داخل ہو جاتا
تو سمجھتا ہے کہ وہ پھر ہندوستان کے باہر آگیا ہے
اور مغربی ممالک کے آفس میں موجود ہے
ملا بجرالیہودے نے یہ سن کر فرمایا' میاں! تم

باہر اسٹول پر بیٹھتے ہیں یا پھر اسٹول بھی میسر نہ ہو تو کھڑے رہتے ہیں یا فرش زمین پر بے تکلفی کے ساتھ بیٹھتے ہیں تب تک اپنی روایات کو قائم رکھتے ہیں. ذرا ان کو ترقی دے کر کلرک بنا کر دیکھو پھر یہ بھی پتلون اور بش شرٹ یا سُوٹ میں نظر آئیں گے۔"

چپراسیوں کے علاوہ ایک اور طبقہ ہے جو بہت اونچا ہوتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ یہ دفاتر میں کام کرنے والے ہر فرد سے اونچا ہوتا ہے اس طبقہ کو اپنے دیس کے لباس سے بہت محبت ہے حتیٰ کہ وہ چرخے سے کاتے ہوئے سوت کے کپڑے پہنتا ہے۔ چنانچہ کسی بدیسی ممتاز مہمان کے استقبال کے لئے ایرپورٹ پر پوری استقبالیہ کمیٹی کے ارکان دیسی لباس میں ملبوس نظر آئیں گے۔ لیکن ایرپورٹ کا پورا اسٹاف بدیشی لباس پہنے ہوئے دکھائی دے گا۔ ملا جبرالیہود نے پھر ایک پتے کی بات کہی کہ :

" میاں اسٹاف تو ڈپارٹمنٹ کا ملازم ہوتا ہے اور ملازمت غلامی ہے۔ اس لئے آج تیس سال سے زیادہ عرصہ آزادی کے بعد گزر جانے کے باوجود ان کے ذہنوں سے غلامی نہیں نکلی ہے۔ وہ ابھی تک یہی سمجھ رہے ہیں کہ ہم انگریزوں کے غلام ہیں۔ اگر کوئی انھیں کچھ سمجھانے کی کوشش کرے تو اُلٹے وہ سمجھا دیتے ہیں کہ صاحب آفس میں ہم دن بھر انگریزی میں لکھتے اور بولتے ہیں۔ جب بولنے اور لکھنے کو غلامی نہیں سمجھا جاتا تو پھر لباس پر کیوں اعتراض کیا جاتا ہے؟"

یہی نہیں بلکہ وہ اونچے لوگ جو ایرپورٹ پر موجود رہتے ہیں اگرچہ لباس دیسی پہنے ہوئے ہیں لیکن زبان انگریزی بولتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی دلّی کا ہے تو کوئی کلکتہ کا، کوئی پنجاب کا ہے تو کوئی تامل ناڈو کا کوئی کرناٹک کا ہے تو کوئی یوپی کا یا آندھرا کا۔ اب اگر یہ اپنی دیسی زبان میں گفتگو آپس میں کرنا چاہیں تو کوئی ایک بھی دوسرے کی بات سمجھ نہیں پائے گا۔ چنانچہ ان لوگوں نے آپس میں سمجھوتہ کر لیا ہے کہ اپنی وہی انگریزی اچھی جو ہر شخص بول اور سمجھ سکتا ہے۔ اس لئے ایرپورٹ پر تمام "اعلیٰ" شخصیتیں انگریزی میں گفتگو کرتی ہیں۔ ان کی مجبوری یہ ہے کہ ابھی راشٹر بھاشا کا نام دے لیا گیا ہے، لیکن ملک میں ابھی تک یہ عام نہیں ہو سکی۔ اس لئے کہ خالص ہندی یا یوں کہئے کہ شدھ ہندی جو آل انڈیا ریڈیو سے بولی جاتی ہے اس کو عوام کا تو کیا ذکر خود سربراہانِ مملکت نہیں سمجھ سکتے۔ جس وقت کوئی بڑے رہنمائے ملک ہندی میں تقریر کرتے ہیں تو حاضرین میں سے مرد آپس میں ایک دوسرے سے اپنی اپنی دلچسپی کے لحاظ سے موزوں و مناسب موضوع پر گفتگو کرنے لگتے ہیں۔ اور عورتیں اپنے بچوں کو رونے کے لئے آزاد چھوڑ دیتی ہیں۔ البتہ جب کوئی انگریزی میں تقریر کرتا ہے تو لوگ مقرر کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اور عورتیں اپنے بچوں کے منہ میں قدرتی یا مصنوعی نیپل دے دیتی ہیں تاکہ بچے خاموش ہو جائیں، اور وہ تقریر سُن سکیں۔ یہاں ہمارا ذہن ایک اور مسئلے پر بھی غور کر رہا ہے۔ وہ یہ کہ کسی مقرر کی تقریر سے لوگ بیزار معلوم ہوں تو مقرر کے منہ میں نیپل دے دیا جائے تو کیسا رہے گا۔ بہرحال اس طریقے کو آزمانے کے بعد ہی اس کا بہتر نتیجہ معلوم ہو سکے گا۔ غرض زبان کا مسئلہ ابھی تک کھٹائی میں ہے چنانچہ کیا خوب کہا ہے ؎

کوئی پنجابی، کوئی پشتو کوئی ہندی کہے ۔۔۔ کوئی بنگالی کوئی تامل کوئی کنڑی کہے
کوئی گجراتی کوئی تلگو کوئی سندھی کہے ۔۔۔ زندہ دل ہر شخص ہو سب کی سُنے اپنی کہے
اپنی اپنی بولیاں ہوں اک زباں کوئی نہ ہو

نتیجہ یہ کہ ہم اپنی وضع قطع سے مولانا بلکہ علامۃ العصر برق آشیانوی نظر آنے کے باوجود جب تامل ناڈو کے ایک خطّہ کے کسی دوست کو نئے سال کی مبارکباد کا کارڈ بھیجتے ہیں تو انگریزی کارڈ روانہ کرتے ہیں۔ اس لئے کہ وہاں کوئی شخص بھی اردو یا ہندی لکھنا پڑھنا نہیں جانتا۔ بعض لوگ تو ایسے بھی ہیں کہ اُردو یا ہندی میں بات تک کرنا نہیں جانتے حتیٰ کہ گھروں میں بھی بلا لحاظ مذہب و ملت تامل میں بات چیت کرتے ہیں۔ اگر تامل سے ہٹے تو پھر ٹوٹی پھوٹی انگریزی بول لیتے ہیں۔ حتیٰ کہ میلاد النبیؐ کے جلسہ میں تامل میں تقریریں ہوئیں تو سوائے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے تمام تقریر تامل میں ہوئی اور جب آخر میں ہم نے اُردو میں تقریر شروع کی تو نصف سے زیادہ حاضرین بلا تکلف اُٹھ کر چلے گئے۔ اور ہم یہ سمجھ کر

جولوگ بیٹھے رہے تو ہماری تقریر سُننے کے لئے نہیں بلکہ تین یا چار پیالیاں چائے کی پی لی تھیں اور نیند اُڑ جانے کی وجہ سے آپس میں ہنسی مذاق میں مصروف تھے۔ البتہ منتظمین جلسہ ہمیں اس لئے بھگت رہے تھے کہ کرایہ آمد ورفت اور قیام وطعام کے علاوہ جو نقد نذرانہ پیش کیا گیا تھا وہ چیز کیا جائے۔ ملّا جبرالیہود نے یہ سُن کر کہا:

"میاں بات دراصل یہ تھی کہ جو لوگ بیٹھے تھے وہ جلسہ
کے انتظامات کی آخری رسومات انجام دینے یعنی
ٹھکانے لگانے کے لئے بیٹھے تھے۔"

بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ ایک صاحب جو ریاست کے ایک تعلقہ میں مقیم ہیں اپنے بچے کو تلگو زبان کے ذریعہ تعلیم دلوا کر خوش تھے کہ ہم نے حکومت کے احکام کی تعمیل میں بچے کو تلگو سے تعلیم دلوائی ہے۔ لڑکا میٹرک میں درجہ اول میں کامیاب ہوا سوائے انگریزی کے دیگر تمام مضامین میں ستّر فی صد سے زیادہ نمبرات لئے تھے۔ جب وہ ٹکنیکل ایجوکیشن حاصل کرنے کی غرض سے صنعتی تعلیم کے اعلیٰ سے اعلیٰ اور ادنیٰ سے ادنیٰ ادارے میں درخواست دے کر انٹرویو میں حاضر ہوا تو اس لئے سلکٹ نہیں ہوا کہ وہ انگریزی میں کمزور ہے۔

اب اعلیٰ سے اعلیٰ اور ادنیٰ سے ادنیٰ طبقے کے لوگ بھی اپنے بچوں کو تلگو یا اُردو میڈیم سے تعلیم دلوانے کی بجائے اعلیٰ سے اعلیٰ اور ادنیٰ سے ادنیٰ انگلش میڈیم کے اسکولوں میں تعلیم دلوا رہے ہیں۔ وہ رہنمایانِ قوم وملت جو اسٹیج پر تقریریں کرتے ہیں کہ اپنے بچوں کو اُردو یا تلگو میڈیم سے تعلیم دلوائیں ان کے بچّے مشن اسکولوں میں تعلیم پاتے ہیں۔ اگر اس میں کوئی استثنیٰ ہے تو اس سے کلیہ نہیں بنتا۔

آخر میں ہم قارئین شگوفہ کو ہمارے اُردو مضمون کے ختم پر انگریزی نئے سال کی، مبارکباد انگریزی میں پیش کرتے ہیں:

HAPPY NEW YEAR
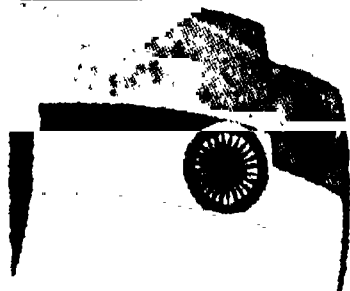
آئیے ایک منصفانہ معاشرتی نظام کے لئے
مل جل کر کام کریں۔ یہ مشترکہ نصب العین
باہمی تعاون اور سخت محنت سے ہی
حاصل ہو سکتا ہے۔

سری ہری اینڈ سنز
دی فیمس ہیئر ڈریسرس

سڑک سے گزرتے وقت دکانوں پر آویزاں کیے ہوئے سائن بورڈ پر کی تحریریں پڑھنا ہماری عادت
ہ۔ طالب علمی کے زمانے میں بلیک بورڈ پر کی تحریریں پڑھا کرتے تھے۔ تعلیم سے فارغ ہوئے تو NO VACANCY
جائداد خالی نہیں) کے بورڈ پڑھنے کو ملے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ملازمت کی تلاش میں داڑھی، مونچھ اور سر کے
ل کچھ اس طرح بڑھ جاتے ہیں کہ آدمی اور ریچھ میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے یا یوں سمجھئے کہ ایک اچھا خاصا
دمی بگڑا ہوا شاعر دکھائی دینے لگتا ہے اور بگڑے شاعر سے پھر انسان بننے کے لیے آپ کو کسی ہیر کٹنگ سیلون کا
رُخ کرنا پڑتا ہے۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ عقیقے سے لے کر اس دارِ فانی سے کوچ کر جانے تک ہر انسان کو قسم قسم کے حجاموں سے
سابقہ پڑتا ہے۔ (یہاں حجاموں سے مراد وہ لیڈر نہیں جو قوم کی اصلاح کے بہانے ملکی سیاست میں داخل ہو کر ساری
م کی حجامت کر دیتے ہیں۔ بلکہ یہاں حجام سے مراد وہ شخص ہے جو آپ کا شیو کر کے آپ کے چہرے کو خوبصورتی عطا
رتا ہے) چنانچہ ہر شخص حجام کے حضور میں پہنچ کر یہ عرض کرنے پر مجبور ہے کہ " نائی مہاراج ! ذرا بال کاٹ دیجئے
شیو بنا دیجئے "!۔

چاہے آپ اپنے گھر پر کتنی ہی بار بلیڈ سے شیو کریں، لیکن بال ترشوانے کے لیے، سال میں ایک بار ہی سہی
جام کے آگے آپ کو اپنا سر جھکانا ہی پڑے گا۔ ابھی ایسا کوئی آلہ ایجاد نہیں ہوا جس کی مدد سے آپ خود اپنے بال
شوالے سکیں۔ اگر کوئی اس قسم کا آلہ ایجاد ہوتا تو سب سے پہلے اس کو حجام ہی درآمد کرتا تاکہ وہ اپنے بال خود
پ کاٹ لے سکے جس طرح ایک آرٹسٹ اپنا سلف پورٹریٹ بناتا ہے۔ ہم گنجوں کی بات نہیں کرتے۔ وہ اکیلے کو

ان کی حجامت تو قدرت بہت پہلے ہی بنا چکی ہوتی ہے۔ ہم ان لوگوں کی بات کرتے ہیں جو بال بھی رکھتے ہیں اور بچے بھی اور ایک عدد بیوی بھی۔

ہمارے حجام کا نام سری ہری ہے اور ہم اس کی دکان کا سائن بورڈ بیس سال سے پڑھتے چلے آ رہے ہیں:

سری ہری اینڈ سنس، دی فیمس ہیر ڈریسرس

اس سے پہلے وہاں کوئی بورڈ نہ تھا۔ بلکہ سری ہری کا باپ نرہری (آنجہانی) فٹ پاتھ پر ایک چلتے پھرتے قسم کا ہیر کٹنگ سیلون ایک چھوٹے سے بیدر بکس میں لیے بیٹھا کرتا تھا۔ وہ اپنے گاہکوں کے گھر پر بھی جایا کرتا اور سر مونڈنے، بال تراشنے، شیو کرنے اور باتیں بنانے کی فیس کے علاوہ وزیٹنگ فیس بھی وصول کیا کرتا تھا ــــ ہمارے دادا جان اُس کے فن کے بڑے دلدادہ تھے۔ کیوں نہ ہوں؟ قدامت پسند بزرگ جو ٹھیرے۔ وہ قدیم کلاسیکل لٹریچر پڑھا کرتے تھے اور کلاسیکل شاعری پسند فرماتے تھے۔ جب وہ اپنے حجام سے اپنا سر منڈوالتے تو کچھ اس مزے سے آنکھیں بند کیے بیٹھے رہتے جیسے ان کے سر پر اُسترا نہ پھرایا جا رہا ہو بلکہ ملائم انگلیوں کی پوروں سے گدگدایا جا رہا ہو!

ایک بار ہمارے لمبے لمبے بال اُن سے دیکھے نہ گئے۔ فوراً حجام کو حکم دیا کہ "اِس ریچھ کے بال مونڈ دو"۔ ــــ بس حکم کی دیر تھی۔ ہمارے سر پر اُسترا چلنے لگا۔ "دن میں تارے نظر آنا" کسے کہتے ہیں' ہماری سمجھ میں آ گیا۔ ورنہ اس سے پہلے تو ہم اس محاورے کو صرف جملوں میں استعمال کیا کرتے تھے۔ اس روز نہ صرف دن میں تارے نظر آئے تھے بلکہ پلکوں پر بھی چمکے تھے۔ پھر یکے بعد دیگرے ٹوٹے بھی تھے۔

ایک اور موقع پر "مکرر ارشاد" کی نوبت آئی تو ہم نے گھر سر پر اُٹھا لیا۔ تب حجام نے ایک ایسی چال چلی کہ سانپ بھی نہ مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ اس نے ہمارے سر پر آرٹ کا مظاہرہ کیا۔ اس نے ہماری تالو پر اُسترے سے ایک ♡ (پان) بنایا۔ آئینے میں پان کے اس ڈیزائن کو جو دیکھا تو ہم حجام کی فری ہینڈ ڈرائینگ کے قائل ہو گئے ــــ جوں ہی تالو کو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا لگی تو ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے سر کے بیچوں بیچ ایرکنڈیشنڈ پلانٹ نصب کیا گیا ہو!

اب ہمارا سر ایک اچھی خاصی "منی آرٹ گیلری" میں تبدیل ہو گیا تھا۔ چنانچہ ہم آرٹ کے اس نادر نمونے کو بتانے کے لیے ایک دوست کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اُس نے ہماری آرٹ گیلری میں اس شاہکار آرٹ کو ملاحظہ فرمانے کے بعد یوں اظہارِ خیال کیا:

"پان تو ٹھیک ہے! البتہ چونے اور کتھے کی کمی ہے۔ اگر اجازت ہو تو چاند ماری کے ذریعہ اس کی تلافی کر دوں!"

اس سے پہلے کہ وہ ہماری تالو پر زور دار دھپّا رسید کر کے باضابطہ چاند ماری کا آغاز کرتا، ہم فوراً وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے اور گھر پہنچ کر پہلا کام یہ کیا کہ سر پر ٹوپی اوڑھ لی۔ اس طرح ہم نے اپنی آرٹ گیلری پر NO EXHIBITION کا غلاف چڑھا دیا۔

لیکن اس کے باوجود ہم اس شاہکار آرٹ کی نمائش کو کسی طرح روک نہ سکے۔ وہ اس لیے کہ

چند ہی گھنٹوں میں ہمارے دوستوں میں یہ خبر عام ہوگئی کہ ہمارے سر پر "چاند" نمودار ہوا ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ ہماری آرٹ گیلری زبردست رش لینے لگی۔ دوست احباب کا سیلاب تھا کہ تھمتا نہ تھا۔ بعض دوستوں نے تو آرٹ کے اس ڈیزائن کے عنوانات بھی تجویز فرمائے تھے۔ کچھ عنوانات یاد رہ گئے ہیں۔

ایک نے عنوان دیا تھا "نائی کا آٹوگراف"

دوسرے نے کہا تھا "پان کا بکّہ"

تیسرے دوست نے ہماری تالو پہ بالائی کی پرت جمی دیکھ کر خالص دکنی میں عنوان تجویز کیا تھا "ملائی کا ڈوبا"

اس BARBARIN ART کے توسط سے ہماری والدۂ محترمہ نے بھی ہمارے دماغ کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا۔ وہ ہماری تالو پہ کبھی خشخاش کی پٹی ڈالتیں تو کبھی بالائی کی دبیز پرت جماتیں تاکہ دماغ کو تراوٹ پہنچے اور آگے چل کر ہمارا شمار ذہین طالب علموں میں ہو۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بار ٹوپی کے نہ اوڑھنے کی وجہ سے چیل ہمارے سر پر سے بالائی کی پرت جھپٹ لے گئی تھی اور جاتے جاتے ہماری تالو پر سراغ رسانی کے لیے اپنے ناخنوں کے نشانات بھی چھوڑ گئی تھی۔ اس ہوائی حملے کے بعد سے تو ٹوپی کے بغیر باہر نکلنا خطرے سے خالی نہ رہا تھا۔ جیسے جیسے دن گزرتے گئے ہماری تالو پر پھر سے بال اُگ آئے اور آرٹ کا وہ نادر نمونہ آثارِ قدیمہ میں تبدیل ہوکر آہستہ آہستہ بالوں کے جھنڈ میں یوں غائب ہوگیا جیسے سرے سے ہی اُس کا وجود نہ ہو۔ یہ تھا ہمارے بچپن کے دور کے نائی کا کارنامہ!

اب جو ہمارا نائی ہے، وہ ہمارا ہم عمر ہے۔ اس کو ہم اس وقت سے جانتے ہیں جب وہ ہمارے ساتھ پڑھتا تھا۔ آٹھویں جماعت تک وہ ہمارا کلاس میٹ بھی رہ چکا ہے۔ ہماری داڑھی اور مونچھوں کو قبل از وقت برآمد کرنے میں اسی کا ہاتھ رہا ہے۔ اس قسم کے دستی مشاغل سے لڑکوں کو واقف کرانا اس کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ چنانچہ اس کی ایسی ہی "خارج از نصاب" سرگرمیوں کو دیکھ کر اس کے باپ نے اسے اسکول سے نکال کر ہیر کٹنگ سیلون میں کام پہ لگا دیا (اُس زمانے میں اس قسم کی سرگرمیاں خارج از نصاب تصور کی جاتی تھیں جبکہ موجودہ زمانے میں اس قسم کی سرگرمیاں "داخل در نصاب" تصور کی جاتی ہیں) اِدھر ہم اعلیٰ ثانوی کی جماعتوں میں کتابیں پڑھتے رہے۔ اُدھر وہ ہیر کٹنگ سیلون میں لوگوں کے چہرے پڑھتا رہا۔ ہم نے امتحانات میں پرچے لکھ لکھ کر صفحات کالے کر ڈالے اُدھر اس نے سیلون میں گاہکوں کے سروں اور چہروں پر پرچے لکھے۔ ہم نے ہائی اسکول سے کالج میں داخلہ لیا۔ تو اس نے اپنا ایک ذاتی ہیر کٹنگ سیلون قائم کیا: "سری ہری اینڈ سنس، دی فیمس ہیر ڈریسرس"۔

جب ہم کالج سے نکلے تو ہمارے ایک ہاتھ میں قلم تھا تو دوسرے ہاتھ میں سند۔ تو اُدھر اُس کے ایک ہاتھ میں اُسترا تھا تو دوسرے ہاتھ میں بُرش۔ ہم نے ایک دکیل سے گَون مانگ کر تصویر کھنچوائی تو اُدھر اس نے اپنے سیلون کو آئینوں اور فلمی کیلنڈروں سے سجایا۔ ہم اپنی تصویر میں "بیچلر آف آرٹس" کی ڈگری لیے خواہ مخواہ مسکرا رہے تھے۔ تو اُدھر وہ اپنے گاہکوں کو کیو میں کھڑے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ مختصر یہ کہ:

ہم تو فقط دوات و قلم چاٹتے رہے

جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ ہمارے حجام کا نام سری ہری ہے۔ وہ بڑا باتونی ہے۔ ویسے آپ ہماری اس بات سے ضرور متفق ہوں گے کہ ہر نائی باتونی ہوتا ہے۔ چراغ حسن حسرت نے اپنے مضمون میں ایک باتونی

حجام کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ شیو بناتے وقت حجام نے مجھے ڈراؤنے قصے سنائے۔ جب انھوں نے اس سے پوچھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ "جناب! ڈراؤنے قصے سنانے سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں چونکہ آپ کی داڑھی اُسترے کی گرفت میں نہیں آرہی ہے، اس لیے بالوں کو کھڑے کرنے کے لیے ڈراؤنے قصے سُنا رہا ہوں تاکہ اُنھیں مونڈنے میں آسانی ہو!"

لیکن ہمارا حجام تو باتیں بنانے میں منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ اُس کی زبان قینچی سے کہیں زیادہ چلتی ہے۔ ہمارا بس چلے تو اُس کے مُنہ میں سرجری کے ذریعہ ایک ہمہ مقصدی قسم کی قینچی لگوا دیں تاکہ باتوں کے ساتھ ساتھ قینچی بھی اپنا کام کرتی رہے لیکن مشکل یہ ہے کہ طِب میں ابھی اس قسم کی سرجری ایجاد نہیں ہوئی ہے۔ ایک بار اس نے ہمارے چہرے پر برش سے صابن کا ڈبل کوٹ پھیرتے ہوئے باتوں کے رُخ کو حجامت سے ادب اور شاعری کی طرف موڑ دیا:

"صاب! بُرا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں! یہ شاعر لوگ اپنے بال اتنے کیوں بڑھاتے ہیں؟"

ہم نے کہا "یہ سوال مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟ ان ہی سے کیوں نہیں پوچھ لیتے!"

وہ بولا "کیا عرض کروں صاب! وہ لوگ تو ادھر کا رُخ ہی نہیں کرتے! اور آپ تو جانتے ہیں صاب کہ بال ہماری امانت ہیں اور اس بوجھ کو اٹھائے ہوئے پھرنا سراسر ناانصافی اور زیادتی ہے۔ اس بوجھ کو ہلکا کرنے کا موقع نائی کو سال میں کم ازکم چھ بار تو ملنا چاہیئے۔!"

یہ سنتے ہی ہم فوراً اپنے بارِ امانت کی جانب متوجہ ہوئے جو مسلسل چھ ماہ سے اٹھائے چلے آرہے تھے۔ جب ہم نے اپنے دو چار سفید بالوں کی جانب سری ہری کی توجہ مبذول کروائی تاکہ وہ انھیں جڑ سے اُکھاڑ پھینکے۔ تو اس نے کام سے بچنے کی خاطر ہمیں یوں ٹرخا دیا کہ "صاب! آپ ان کو مت چھیڑیئے۔ اگر آپ ان کو اکھاڑ پھینکیں گے تو ان کے بھائی بند ناراض ہو کر وہ بھی سفید ہوجائیں گے۔" لیکن جب ہمارا اصرار بڑھتا ہی گیا تو اس نے وہ بال کچھ اس طرح اکھاڑ پھینکے کہ بال کے ساتھ کھال بھی نکل آئی۔

مگر جناب ہمارے نائی میں ایک خاص وصف یہ ہے کہ وہ نشہ کی حالت میں کبھی اُسترے اور قینچی کو ہاتھ تک نہیں لگاتا۔ وہ اپنے ہتھیاروں کا پرستش کی حد تک احترام کرتا ہے چنانچہ موقع پاکر ایک دن ہم نے اس سے پوچھ ہی لیا کہ "سری ہری! تم نشہ کی حالت میں لوگوں کی حجامت کیوں نہیں بناتے؟"

وہ بولا "نشہ کی حالت میں کسی گاہک کے چہرے پر معمولی زخم بھی آجائے تو میری اچھی خاصی حجامت ہوجائے گی میں کوئی شاعر تو ہوں نہیں کہ پی کر کلام سناؤں اور داد بھی پاؤں! مجھے میرا فن عزیز ہے۔ مجھے یہ منظور نہیں کہ میرے فن پر حرف آئے اور شراب بدنام ہو!"

یہ ایک نفسیاتی معاملہ ہے کہ ہر شخص اپنے مخصوص نائی سے ہی شیو بنوانا اور بال ترشوانا پسند کرتا ہے اور ہر نائی انسان کی اس کمزوری سے پوری طرح باخبر رہتا ہے۔ اب آپ اس کو ہماری کمزوری پر محمول کیجئے یا وفاداری پر یا وضعداری پر کہ ہم سری ہری کے سیلون کے سوا کسی اور سیلون کا رُخ نہیں کرتے۔ ہماری مونچھیں ہمیں سری ہری کے سیلون کو کھینچ لے جاتی ہیں۔ وہ ہماری اس کمزوری سے بخوبی واقف ہے کہ ہماری مونچھوں کا

اسٹائل کسی اور سیلون کا رُخ نہ کرنے دے گا۔ اگر کبھی گھر پر شیو کرنے کی نوبت آ بھی جائے تو ہم اُسی آؤٹ لائن پر بلیڈ چلاتے ہیں جو سری ہری کی ڈیزائن کی ہوئی ہیں۔ حد ہوگئی ہم اپنے بچوں کو تک سری ہری کے سیلون پر لے جاتے ہیں اب تو باقاعدہ طور پر "اُدھار کھاتہ" بھی کھل گیا ہے اور سری ہری کی حیثیت، ایک فیملی باربر (FAMILY BARBER) کی سی ہوگئی ہے۔ چنانچہ ہم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو اپنے نائی کا اُدھار چکاتے ہیں۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ سری ہری جو کچھ حجامت کے بارے میں اپنے لڑکوں کو سکھاتا ہے اس کا آموختہ وہ ہمارے لڑکوں کے سروں پر کرواتا ہے۔ اور ہم یہ موقع محض اس لئے فراہم کرتے ہیں کہ آخر مروّت بھی تو ایک چیز ہے!!

کیا کہیئے

اسماعیل ظریف

گھر میں اک سر پھری ہے کیا کہیئے
کرکری کرکری ہے کیا کہیئے

دوست بھی نمبری ہے کیا کہیئے
دوستی دوستی ہے کیا کہیئے

ان کو پکچر میں جب سے دیکھا ہے
بے کلی بے کلی ہے کیا کہیئے

تہہ میک اپ کی فریب ہے لیکن
دلکشی دلکشی ہے کیا کہیئے

دل چرا کر وہ چل دیئے باہر
دلبری دلبری ہے کیا کہیئے

نامہ بر بن گیا رقیب آخر
عاشقی عاشقی ہے کیا کہیئے

وہ جو انجان سے ہیں محفل میں
بے رُخی بے رُخی ہے کیا کہیئے

راز کی بات کھل گئی آخر
ڈائری ڈائری ہے کیا کہیئے

آج کل اُن کے گھر کا رستہ بھی
اک رخی اک رخی ہے کیا کہیئے

مُرغ غائب ہوا پڑوسی کا
مولوی مولوی ہے کیا کہیئے

میز پر ڈش نہیں ہے میٹھے کی
طشتری طشتری ہے کیا کہیئے

وقت پر بس کبھی نہیں ملتی
بے بسی بے بسی ہے کیا کہیئے

سرِ تسلیم خم نہ ہو کیونکر
نوکری نوکری ہے کیا کہیئے

خود کو سب کچھ سمجھ کے بیٹھے ہیں
گمرہی گمرہی ہے کیا کہیئے

رفتہ رفتہ مریں گے سب لیکن
خودکشی خودکشی ہے کیا کہیئے

جی میں جو آئے بک رہا ہے ظریفؔ
شاعری شاعری ہے کیا کہیئے

تضمین برغزلِ غالبؔ

رشید عبدالسمیع جلیل

کالج کے پیچھے پیار کی سوغات چاہیے
دفتر کے بازو بیتِ رقومات چاہیے
گھر کے قریب کورٹ حوالات چاہیے
"مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے
بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے"

ہے مہربان باپ بھی اک اور شخص پر
بوسوں کی اُتری چھاپ بھی اک اور شخص پر
پھینکے ہیں گرم بھاپ بھی اک اور شخص پر
"عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر
آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے"

باقی ہے کچھ تمیز کسے بود و ہست کی
اب تو کمر بھی ٹوٹ گئی تیرے مست کی
خندق پہ کر نظر کہ جہاں میں نے جست کی
"دے داد اے فلک دلِ حسرت پرست کی
ہاں کچھ نہ کچھ تلافیٔ مافات چاہیے"

غالبؔ کے مشورے پہ عمل کر کے سرسری
مقبول ہو چکے ہیں بفضلِ ہنروری
کرتے ہیں دوستوں کے لیے روز مخبری
"سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے"

بیگم سے ارتباط ہے کس روسیاہ کو
سسرال اک رباط ہے کس روسیاہ کو
شادی سے انبساط ہے کس روسیاہ کو
"مئے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے"

خوشحال اک طرف ہیں تو غمگین جُدا جُدا
پیادے الگ الگ ہیں تو فرزیں جُدا جُدا
گلفام چیدہ چیدہ ہیں گلچیں جُدا جُدا
"ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جُدا جُدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے"

من تو شدم درست مگر تو نہ من شدی
شوہر ہوں پھر بھی مجھ کو سمجھتی ہے گاؤدی
میکے چلی گئی تو گجر دم ہے گُدگُدی
"سر پائے خُم پہ چاہیے ہنگام بے خودی
رُو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے"

کمپونڈ کے طواف میں پوشیدہ ہے نجات
اندر کوئی گھسے تو ملے دائمی حیات
پینے کا حوصلہ ہو تو ساقی ہے کائنات
"یعنی بہ حسبِ گردشِ پیمانۂ صفات
عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیے"

نسبت ہے عاشقی سے قیام و رکوع کو
ہے ربط رونمائی سے وقتِ طلوع کو
نشّہ ہے خوب وصل سے محلِ وقوع کو
"نشو و نما ہے اصل سے غالبؔ فروع کو
خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے"

ایک تبسم

شفیقہ فرحت

اگر آپ نے عنوان سے یہ
اندازہ لگایا ہے کہ یہاں کسی دبی تبسم
کے خاندان کا شجرہ بیان کیا جائے گا
یا ان کی سرو قامتی، نرگسی آنکھوں، اور
ہونٹوں کے گلابوں کی تعریف میں قصیدہ
لکھا جائے گا یا ان کے کلام پر تبصرہ
مع مثالوں کے ہوگا تو آپ کا یہ خیال
دوسرے تمام خیالوں کی طرح غلط یعنی خام
ہے۔ یہ وہ تبسم ہے جسے قدرت نے
ہونٹوں کا مکان الاٹ کر رکھا ہے (جو آج

کل پگڑی زیادہ ہونے کی وجہ سے اکثر
بے گھر، بے در، بنا پھرتا ہے) اور جس سے
شاعر کلیوں میں جان ڈالنے کا کام لیتے
ہیں تو کبھی بجلی گھر بنا کر پانچ ہزار کلوواٹ
کی بجلی تیار کرتے ہیں اور روح کو جگمگاتے
ہیں یا عاشق کو پھانسی دیتے ہیں اور کبھی
تھری ڈی فلموں کا، کہ بقول ان کے

؎

اک تبسم اس قدر جلووں کی طغیانی کے ر

پرانی باتوں کو چھوڑیئے کہ وہ بہت خوبصورتی اور صفائی سے زمانے کے صندوق میں پیک کر کے رخصت کر دی گئیں لیکن اس دور جدید میں بھی مسکراہٹ (مذکر و مونث دونوں) جوں کی توں فرنٹ پر ڈٹی ہوئی ہیں۔ اس کے خلیل خان اور خلیل خاں اب بھی پل شان و شوکت سے فاختائیں اور غبارے اڑایا کرتے ہیں۔ اس کی فیمن میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ یہ آج بھی ایک بلنک چیک ہے۔ تھری ناٹ تھری کی بھری بندوق بلکہ ایٹم بم۔ اگر آپ طلسمی دنیا جدید شوق سے پڑھتے ہوں اور اس پر اتنے ہی ذوق سے ایمان رکھتے ہوں تو اسے سلیمان کی انگوٹھی کہہ لیجیے جو ہر بگڑا کام بنا دیتی ہے اور بنا کام بگاڑ دیتی ہے۔

دنیا کی تمام اہم چیزوں کی طرح اس کی بھی بہت سی قسمیں ایجاد کر لی گئی ہیں۔ اور اگر ریسرچ اسکالرس نے بھی اس طرف توجہ دی اور AUTHER STUDIES کے لئے غیر ممالک کا دورہ کرتے رہے تو یقیناً اس میں اس درجہ ترقی ہو گی کہ باقاعدہ ڈپارٹمنٹ قائم ہو جائے گا اور بے شمار کتابیں لکھی جائیں گی۔ فی الحال تو آپ یہاں اس کی صرف چند قسمیں بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیے اور جواب میں مسکرائیے۔ اور جی چاہے تو مسکراہٹ کی ایک تصویر راقم الفضل لیباریٹری میں بھیج دیجیے تاکہ یہ بتایا جا سکے کہ یہ مسکراہٹ کس برانڈ کی ہے۔

نمبر۱۔ یہ سیدھی سادی ہنسی یعنی SIMPLE SMILE ہے۔ یہ وہ بنیادی مسکراہٹ ہے جو عام طور پر بچوں کے ہونٹوں پر پائی جاتی ہے۔ اسی لئے اسے BABY SMILE کہتے ہیں۔ ویسے کبھی کبھی بڑے بھی اس کا استعمال کر لیتے ہیں۔ اس وقت جب وہ کسی چیز کو دیکھ کر واقعی یعنی سو فیصدی خوش ہوتے ہیں۔ مثلاً ترقی کا آرڈر۔ دشمن کی ٹوٹی ٹانگ۔ گرما گرم کباب کی پلیٹ۔ یہ مسکراہٹ صحت کے لئے انتہائی مفید مانی گئی ہے۔ اس میں ہر زبان کی اے، بی، سی سے لے کر ایکس، وائی، زیڈ تک کے وٹامن شامل ہیں۔ شکر ہے کہ ابھی تک ٹیکس کی نظرِ عنایت سے بچی ہوئی ہے اور اس کا بھی شکر کہ کسی سیٹھ جی نے اس کے بے شمار فوائد سے متاثر ہو کر اس کا کارخانہ (جہاں مسکراہٹ شیشیوں میں پیک کی جاتی) نہیں کھولا ——!

یہ عمدہ ٹانک ہی نہیں بہترین بیوٹی لوشن بھی ہے جس سے چہرے کی دمک اور آنکھوں کی چمک میں پلک جھپکتے اضافہ ہوتا ہے۔ اتنی ساری خوبیوں کے باوجود اس کا استعمال فیشن ایبل اور انٹلکچوئیل طبقوں میں کم ہوتا جا رہا ہے اور اسے پتلون کے بڑے پائنچوں کی طرح آوٹ ڈیٹڈ سمجھا جانے لگا ہے۔

نمبر۲۔ چیک بیک مسکراہٹ یعنی وہ مسکراہٹ جس سے چیزوں کی قیمت چکائی جاتی ہے۔ جیسے انٹرنیشنل مارکیٹ میں اسٹرلنگ بیلنس ہر وقت گھٹتا بڑھتا رہتا ہے اور اس کے مطابق چیزوں کے دام گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں۔ اسی طرح اس مسکراہٹ کی قیمت بھی گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ اور سونے کی طرح الگ الگ مقامات پر قیمتیں بھی الگ الگ ہوتی ہیں۔ ریسرچ DEPT قائم کئے بغیر یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ اس کی PURCHASING POWER یعنی قوت خرید کتنی ہے۔ لیکن اتنا ضرور سنا ہے کہ اس سے جان و مال۔ تاج و تخت اور دلوں تک کے سودے ہو جایا کرتے ہیں۔

نمبر۳۔ TELEGRAPHIC مسکراہٹ اگر کسی کو مبارکباد کا تار دینا ہو تو اب لمبی چوڑی دعا لکھنے کی ضرورت نہیں بس نمبر دے دیجیے۔ تار گھر والے اس نمبر سے منسوب مخصوص پیغام خود لکھ دیں گے۔ کچھ یہی حال اس مسکراہٹ کا بھی ہے۔ کسی نے آپ کو تحفہ دیا آپ اسے قبول کر کے مسرت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں اور تحفہ کی تعریف بھی تو صرف مسکرا دیجیے دینے والا کسی

FORMALITIES کا نمائندہ ثابت ہوگا۔ کسی کام کی داد دینی ہے کسی کی شان میں قصیدہ پڑھانا ہے۔ یہ اور اسی طرح کے وہ تمام کام اسی مسکراہٹ نمبر ۳ سے جو تار کی طرح مختصر ہے پورے ہو جائیں گے۔

نمبر ۴ تنقیدی مسکراہٹ شاعر کلام سنا رہا ہے شعر آپ کو پسند آیا۔ اس کی زمین و آسمان۔ زبان و بیان۔ تخیل اور ندرت قسم کی باتوں کی تفصیلی تعریف کے بجائے صرف مسکرا دیجئے۔ لیجئے یہ ایک تبسم تنقیدی زاویے کی حیثیت اختیار کر گیا۔

نمبر ۵ ڈپلومیٹک یا سیاسی مسکراہٹ۔ یہ برانڈ خاص سیاسی اور بین الاقوامی حلقے کی چیز ہے۔ یہ طلائی اور موتیوں والے کشتوں کی طرح نازک اور انمول ہے۔ مقدار میں ذرا سی کمی بیشی قیامت برپا کر سکتی ہے اس کی ترکیب استعمال کی تفصیلات حکومت کی طرف سے شائع کی جاتی ہیں اور خوراک کے پیمانے بھی حکومت ہی کے مقرر کردہ ہیں اور یہ دونوں چیزیں ہر ملک کے سرکاری خزانے میں محفوظ ہوتی ہیں۔ اس مسکراہٹ کے مختلف انداز اور مقدار دیکھنا چاہیں تو کسی سفارت خانے میں دی جانے والی دعوت کا کارڈ کسی نہ کسی طرح حاصل کر لیجئے (خواہ وہ مسکراہٹ کے چیک ہی سے کیوں نہ ہو) اور پھر دیکھئے تماشا!

عزت مآب سفیر صاحب اپنے حوالی موالیوں کے ساتھ استقبال کے لئے کھڑے ہیں۔ میزبانی کا بِلّا ہلکی سی مسکراہٹ کی شکل میں ہونٹوں پر لگا ہے دور سے اس ملک کے سفیر آتے ہوئے دکھائی دیئے جس سے میزبان ملک کے تعلقات انتہائی خراب ہیں یکلخت وہ مسکراہٹ جس کی لمبائی اب تک صرف پاؤ انچ تھی کھنچ کر پوری ½ ا ہوگئی اور اس کی لمبائی چوڑائی میں اس وقت تک ایک ملی میٹر کا بھی فرق نہیں ہوتا جب تک ان سفیر صاحب کی پیٹھ مڑ نہیں جاتی اور پیٹھ مڑتے ہی وہ مسکراہٹ پھر پاؤ انچ کی رہ گئی پھر اس ملک کے نمائندے آئے جس کی دولت اور طاقت سے میزبان بے حد مرعوب ہیں (بلکہ یوں سمجھئے کہ ان کی اور ان کے ملک کی زندگی کی باگ دوڑ انھیں کے ہاتھوں میں ہے ——!) تو یہ مسکراہٹ ہونٹوں کے کناروں کو توڑ کر ایک کے بجائے دو انچ تک پھیل گئی (اور اگر ممکن ہوتا تو انچ کے بجائے فٹ اور گز کے پیمانے استعمال کئے جاتے ——!) اور اس میں کچھ بے ساختگی اور خود ساختگی کا رنگ پیدا ہو گیا ——!!

اور جب اس کے وزیر (جو غلطی سے مہمانِ خصوصی بھی تھے) تشریف لائے۔ جس سے باقاعدہ اعلان جنگ تو نہیں ہوا لیکن تعلقات خاصے سرد ہیں (صرف نہ ہونے کے باوجود) تو پھر مسکراہٹ سکڑ سکڑ کر ½ ہوگئی۔ (ان سے کم اجازت کا کوڈ کی رو سے نہیں تھی ——!) غرض کہ اس مسکراہٹ کی لمبائی چوڑائی رنگ روپ سے کسی ملک کی داخلی اور خارجی پالیسی، دوستی اور دشمنی، محبت اور نفرت، سب کا اظہار ہوتا ہے۔

نمبر ۶ مشکل کشا مسکراہٹ

اس مسکراہٹ کا تعویذ بھی ہزاروں بلاؤں سے محفوظ رکھتا ہے (پانچ آنے یا پانچ نئے پیسے تک خرچ کئے بغیر ——!!) مثلاً دفتر دیر سے پہنچے یا حسب معمول کوئی کام الٹا سیدھا کر دیا یا سرے سے کیا ہی نہیں

تو مسکراہٹ کا تعویذ باندھ کر ایک مجاہدانہ، رندانہ، عاشقانہ شان چلئے سوئے محفل۔ اوّل تو "تعویذ" کی برکت سے جاتے ہی کامیابی ہوگی یعنی سرکار کی تیوریوں کا ایک آدھ بل لاسیڑھی اتر جائے گا اور ڈانٹ پھٹکار کے بجائے وہ کافی سے تواضع کریں گے اور بہت رازداری سے مستقبل کے پلان سے آپ کو باخبر کریں گے۔

اگر خدا نخواستہ مقابلہ ذرا سخت ہوا اور یوں پہلے ہی حملے میں رام ہونے کے بجائے انھوں نے کچھ

لعائی جب بھی گالیاں کھاتے ہوئے بے مزہ نہ ہوں خواہ لب ان کے شیریں ہوں یا نہ ہوں۔

اس تعویذ کو کچھ اور انلارج کیجئے اور ڈٹے رہیئے میدان میں کیسا ہی سخت جان کیوں نہ ہو ذرا سی دیر میں میدان کی بستری آپ کے نام کرو اکے بھاگ کھڑا ہوگا۔

نوٹ:۔ اس مسکراہٹ کو بعض لغات میں حماقت آمیز مسکراہٹ کہتے ہیں اس کی موجودگی میں آپکا آبائی وطن جونپور نظر آتا ہے۔

نمبر ۴۔ پھول کھلتا ن مسکراہٹ جو خود بھی فٹ بال یا باسٹر کی طرح گول ہے ابھی ہے ابھی غائب اور دوسروں کی عقل کو بھی لول بنا دیتی ہے۔ اقرار کرنا ہے تو مسکرائیے انکار کرنا ہے تو مسکرائیے (صرف زاویہ بدل کر) تعریف میں مسکرائیے اور طنز میں مسکرائیے راحت میں مسکرائیے اور رنج میں مسکرائیے کچھ ہو نہ ہو بس ایک مسکراہٹ ضرور ہو جسے خود آپ بھی نہ سمجھ سکیں۔

نمبر ۵۔ نقاب پوش مسکراہٹ۔ جی تو چاہتا ہے اس کی نقاب کشائی نہ کروں اس لئے کہ یہ اپنے پٹارے کا آخری اور سب سے بیش قیمتی گہر ہے۔ پٹارا ہی خالی ہو گیا تو تماشا کس کے بل بوتے پر دکھایا جائے گا اور دوسرے یہ کہ اسی تبسم سے جو معنی خیز بھی ہے ایک عالم کا بھرم قائم ہے اور بقول کسے ؎

بھرم کھل جائے گا ظالم تری باریک بینی کا
اگر اس خندۂ دنداں نما کا زیر و بم نکلا

باریک بینی یعنی عقل اندر چھپی ہوئی ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ کتنی ہے۔ یہی کہ نہیں نقاب کا حسن اس کی چک دمک کسی ہاتھ کو آگے نہیں بڑھنے دیتی۔ اسے ڈھول سے بھی تشبیہ دی جا سکتی ہے کہ اوپر سے بند اور اندر سے پولم پول اُس کا سہارا نہ ہوتا تو اب تک ہزاروں عقل کے کتنے صنم کدے ویران ہو جاتے۔

وہ صاحب جو آپ سے خاصے بزرگ ہیں آپ سے کچھ فرما رہے ہیں اور آپ ہمہ تن تو خیر نہیں ہاں نصف تن گوش بنے حرام مسند پھانسے بیٹھے ہیں۔ پہلا جملہ پھر سے اُڑ گیا۔ ابھی آپ دوسرا جملہ قید کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ حضرت کے فاتحانہ انداز سے ظاہر ہو گیا کہ وہ تیسرا جملہ شاید بیت الغزل ہے داغ چکے ہیں اور جواب طلب نظروں سے آپ کو دیکھ رہے ہیں اور جب آپ یہ بھی نہیں جانتے کہ اس آخری جملہ میں انھوں نے بیٹے کی شادی کی تاریخ سنائی ہے یا اپنے درد گردہ کا نیا نسخہ تو ہوں۔ ہاں بھی نہیں کی جا سکتی نہ ان کی کوتاہی کا اظہار ممکن ہے نہ اپنی بے لبی کا ایسے میں بس آپ خندہ زیر لب نقاب بن کر آپ کی مدد کرے گا۔

"یا یہ کہ بحث کرتے کرتے جناب الف نے شریان بے سے پوچھا۔" اچھا بتاؤ اس کا کیا مطلب ہے" اور آپ کے جوتوں اور چپلوں تلے سے زمین نے سرکنے کی کوشش کی کیوں کہ ظاہر ہے آپ بھی گول ہیں ضابطے کی رو سے چہرے پر ہوائیاں اڑنی چاہیں لیکن ہوائی اڑی اور عقل و دانش و قابلیت کا سارا بھرم ہوا ہوا۔

اس لئے منہ پھاڑے دانت نکوسے۔ بیوقوفوں کی طرح جس تس کا منہ تکنے کے بجائے ایک معنی خیز مسکراہٹ ہونٹوں پر سے آئے اور بہت غور سے فریقین کی باتیں سنئے حاضرین کو خدا شک نہ ہوگا کہ آپ کتنے فٹ پانی میں ہیں۔

محفل میں بہت دیر سے زبان کی کٹ کٹ ہو رہی ہے جملے اچھالے جا رہے ہیں اور چوٹے چھکے مار رہے ہیں۔ اتفاقاً ایک

نہیں جا سکتا۔ اور نہ شکست کا اعتراف کیجئے کہ معاملہ ناک کا ہے۔

صرف مسکرائیے لیکن خاص ادا سے کہ ہر خاص و عام آپ کی عقل اور سمجھ اور سنس آف ہیومر پر دل ہی دل میں (اور موقعہ ہو تو آپ کے اشارے پر ہا واز بلند بھی) وجد کراتے ـــــ!

جدید ترین تجربات سے یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ یہی مسکراہٹ خدوخال کے عیوب کی بھی پردہ پوشی انتہائی اگر نسک انداز میں کرتی ہے۔ مثلاً اگر دانتوں کا قد و قامت ایسا ہے کہ دیکھنے والا پریشان ہو کر سوچنے لگے کہ آخر کھانے کے دانت کہاں ہیں تو انہیں ہر وقت اسی مسکراہٹ کے فریم میں جڑوائے رکھئے۔ اللہ برکت دے گا۔

لیکن اس برے وقت سے ڈریئے جب مسکراہٹ مشکل کشا کے بجائے مشکل کشاں بن جائے۔ آپ کسی کو دیکھ کر عادتاً مسکرائیں اور وہ گلے کا ہار ہاتھ کی گھڑی (بہ لحاظ موقع و محل) بن جائے اور آپ اپنی جان سے بیزار سنیاس لینے کا پروگرام بنائیں یا آپ کی مسکراہٹ کے جواب میں کوئی ہتک عزت کا دعویٰ کر دے اور جیل نہ سہی عدالت کی سیر تو کرا ہی دے ـــ ▲

سیٹھ حشمت نے لیٹے لیٹے آواز دی۔
"شاہد میاں! کیا وہ اشتہار چلا گیا" شاہد میاں نے جواب دیا "ابھی تو وہ تیاری کے مراحل میں ہے" سیٹھ حشمت ناراضگی سے بولے۔ "نہ جانے کب سے یہ تیاری کے مراحل میں ہے۔ اشتہار نہ ہوا اچھا خاصہ انکوائری کمیشن ہوگیا۔ بھئی جاؤ ذرا شنّن میاں کو تو بلا لاؤ"

شنّن میاں کے سامنے کاغذات کا ڈھیر لگا ہے وہ ان میں اس قدر غرق ہیں کہ شاہد میاں کے بار بار بلانے پر بھی ان کے انہماک میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب انہیں جھنجھوڑ کر سیٹھ صاحب کا پیغام دیا گیا تو وہ چونکے اور کاغذات کا پلندہ لئے ہوئے آئے۔ سیٹھ حشمت نے پوچھا "کیوں میاں! ابھی وہ اشتہار نہیں گیا؟" شنّن میاں پہلے تو جھنجھلائے پھر اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے "داداجان! یہ اشتہار اگر آپ خود ہی تصنیف فرمائیں تو ناچیز کی گلو خلاصی ہوگی"

شنّن میاں! آپ نے اردو ادب میں ایم اے کیا ہے، آپ سے اچھا مضمون اور کون بنا سکتا ہے"

داداجان کے اس جواب سے شنّن میاں خوش ہونے کی بجائے جلے بھنے لہجے میں بولے "اس وقت تو مجھے اردو میں ایم اے کرنے کا اس قدر افسوس ہے کہ بیان نہیں کرسکتا۔ ریاض میاں کو ناشتہ پانچ بجے چاہیئے۔ دردانہ کو دس بجے بیڈ ٹی بستر میں چاہیئے۔ رات کی شفٹ میں کام کرکے معراج میاں رات کے گیارہ بجے آتے ہیں۔ انہیں تازہ اور گرم ڈنر چاہیئے۔ کسی کو نمک کم چاہیئے تو کسی کو زیادہ اور کسی کو بالکل ہی نہیں چاہیئے۔ ناشتہ لنچ اور ڈنر کے اوقات سب کے جداجدا ہیں۔ اس پہ طرّہ یہ کہ ہر ایک کی پسند متضاد ——— اب بھلا بتایئے کہ ایسا باورچی جو اپنے فن میں یکتا ہونے کے ساتھ ساتھ فجر سے تہجد تک باورچی خانہ کی زینت بنا رہے ہمیں کہاں سے ملے گا؟"

سیٹھ حشمت نے اپنے پوتے کی غداری کو نامنظور کرتے ہوئے کہا۔ شنّن میاں! اب باورچی کے بغیر ہمارا زندہ رہنا مشکل ہو گیا ہے۔ اسے ہر قیمت پر گھر بلاؤ، جب تمہارا اشتہار چھپے گا تو دیکھنا ہندستان کے کونے کونے سے باورچی اس شہر میں آئیں گے۔ اور سب سے اچھا ہیرا ہمارا مطلب باورچی ہم چن لیں گے۔ ہم اسے اتنی اچھی تنخواہ اور سہولتیں دیں گے کہ وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ بس اب یہ سب تم پر چھوڑا جاتا ہے کہ کسی قسم کا اشتہار چھپاتے ہو۔

اب شنّن میاں کے سامنے ہاں کرنے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہ تھا۔ خاندان کا ہر فرد اپنی پسند اور ناپسند کی فہرستوں کے ساتھ اُن کا سر الگ کھا رہا تھا۔ اب شنّن میاں تھے اور ان کے سر میں اشتہار کا سودا۔

آخر خدا خدا کرکے وہ دن بھی آ گیا۔ جب خاندان کے سب افراد کے سامنے شنّن میاں اپنا تصنیف کیا ہوا اشتہار جو اخباروں میں چھپ کر آ گیا تھا پڑھ کر سنا رہے تھے۔

یہ اشتہار غور سے پڑھئے ضرورت ہے، باورچی کی۔!!

ہمیں ایک قابل، ایماندار، محنتی اور نفسیات کی شُدبُد رکھنے والا باورچی درکار ہے، قابل ہونا اس لئے ضروری ہے کہ اسے بہت سے ناقابلِ قبول مرحلوں سے گذرنا پڑے گا۔ ایمانداری کی شرط یوں کہ سارا باورچی خانہ آپ کی تحویل میں ہوگا اور حساب طلب کرنے کی فرصت کسی کو نہیں، محنتی اس لئے کہ سورج طلوع ہونے سے قبل پکوان کا جو سلسلہ شروع ہوگا، اس کا آدھی رات تک جاری رہنے کا قوی امکان ہے۔ نفسیات سے واقفیت اس لئے ضروری ہے کہ افرادِ خاندان کھانے کی نفسیات سے واقف نہیں ہیں۔ اُن کی شکم پُری کے ساتھ ساتھ اس طرف بھی خیال کرنا ہوگا۔ مثلاً مچھلی کے ساتھ دودھ پینے کی عادت کو روکنا وغیرہ وغیرہ۔ اگر طب میں بھی کوئی دخل ہو تو اس سے نادر قابلیت متصور کیا جائے گا۔ گھر کے کچھ لوگ آج کل کے فیشن ایبل امراض میں مبتلا ہیں۔ یعنی ہائی بلڈ پریشر، لو بلڈ پریشر شکر کی بیماری، ہائپر ایسی ڈیٹی اختلاجِ قلب وغیرہ، ان کے لئے کم نمک یا بلا نمک کی ابلی ہوئی غذائیں تیار کرنا ہوں گی شکر والی غذائیں اور تُرش چیزوں کے قاب اور ڈونگے ان کے سامنے ہرگز نہ لائے جائیں ورنہ ان پہ ٹوٹ پڑیں گے اور یہ باورچی کی نااہلی سمجھی جائے گی۔ کچھ لوگ تلا ہوا گوشت پسند کرتے ہیں تو کچھ ایسے بھی ہیں جنہیں تیل اور گھی سے نفرت ہے وہ بس اُبلی ہوئی غذائیں کھاتے ہیں۔ کھانا پکاتے وقت ہر ایک کی پسند اور ناپسند کا خاص طور پر خیال رکھا جانا ضروری ہے

ناشتہ کا آغاز ریاض میاں سے ہونا چاہئیے۔ انہیں صبح پانچ بجے مکئی کے دلیہ میں گھی اور دہی ملا کر کھانے کی عادت ہے۔ معراج میاں صبح کی ورزش کے بعد ایک لیٹر دودھ میں آدھے درجن انڈے پھینٹ کر لیتے ہیں، شاہ نواز کو سورج طلوع ہوتے وقت بھیگے ہوئے چنوں میں شہد ملا کر کھانا مرغوب ہے، فائزہ کو صبح سات بجے نیم برشت انڈوں کے ساتھ مسکہ لگے ہوئے توست چاہئیں۔ امیرِ خاندان سیٹھ حشمت ناشتہ میں روزنہ دیسی گھی میں تلے ہوئے ایک عدد پراٹھے کے ساتھ ڈھائی سو گرام مرغ کے گوشت کا قیمہ کھاتے ہیں۔ سورج بھلے ہی مغرب سے نکل جائے لیکن ان کے اس معمول میں فرق نہیں آ سکتا۔ جبکہ بیگم حشمت زرد جوار کی بے نمک روٹی اور بغیر شکر کی چائے سے ناشتہ کرتی ہیں ڈاکٹر فرزانہ چونکہ ڈائٹنگ کرتی ہیں۔ اس لئے ان کا ناشتہ صرف سوپ پر مشتمل ہے جبکہ ان کے شوہر ممتاز میاں کو ناشتہ میں ایک عدد بھیجہ دو انڈوں کا آملیٹ اور حیدرآبادی کھچڑی کے ساتھ املی کا اچار اور پاپڑ پسند ہیں، عشرت بیگم

گوشت سے اللہ واسطے کا بیر ہے اور ان کے میاں سبزی اور دال سے اتنے ہی متنفر ہیں۔

نیمہ مسور کی دال کی شیدائی ہیں جبکہ دوسرے سب اسے سخت ناپسند کرتے ہیں۔ تہمینہ کو ٹماٹر گوشت دو پیازہ مچھلی کے سوا اور کچھ نہیں چاہیئے۔ کسی کو دودھ اور جلیبی کا ناشتہ مرغوب ہے تو کچھ لوگ ناشتہ میں جنوبی ہند کے لی سانبر اور ڈوسا پسند کرتے ہیں۔ بعض حضرات تو صرف چائے ہی پر اکتفا کرتے ہیں لیکن چائے کی پسند بھی جدا ا ہے، کوئی لمسا یا لالا سا چائے پسند کرتا ہے۔ تو کوئی نیلگری، کوئی بروک بانڈ کا ریڈ لیبل پسند کرتا ہے۔ تو کسی کو تاج محل ہیئے، آج کل حویلی میں دارجلنگ کی برآمد کی جانے والی چائے کا بھی چلن ہو چلا ہے۔ ناشتے کے اوقات صبح پانچ بجے سے دن کے گیارہ بجے تک ہوں گے، اس کے بعد لنچ کی تیاری شروع ہوگی۔

لنچ میں ہمہ اقسام کے پکوان ضروری ہے، ناشتے والی فہرست میں دیئے گئے کھانوں سے اندازہ لگا کر ہر ایک ، پسند اور ناپسند کا خیال رکھنا بھی باورچی کی عمل داری میں شامل ہے، ذائقہ بدلنے کے لئے کبھی کبھی چین کی لذیذ شیں بھی بنانا ہوں گی، کیونکہ تاج میاں ستار میاں اور درّانی غیر ملکی کھانے بے حد پسند کرتے ہیں۔

ڈنر کا اہتمام باورچی کی قابلیت کا نچوڑ ہوگا۔ کیونکہ گھر کے بیشتر افراد ڈنر پر اس ڈش کو دیکھنا پسند نہیں کرتے پچھلے سات دنوں کے اندر میز پر سجائی گئی ہو۔ اس طرح ایک قسم کے پکوان ایک ہفتے کے بعد ہی دوبارہ پکایا سکتا ہے۔ ایک ہفتہ کے دوران قسم قسم کی ڈشیں اس خوش خوراک خاندان کی صحت کی ضامن ہیں، کھانے کے ات ہر ایک کے مختلف ہیں اور ہر کوئی تازہ اور گرم غذا پسند کرتا ہے۔ خاص طور پر معراج میاں اور الطاف میاں رات کے گیارہ اور بارہ کے درمیان کھانے کی عادت ہے، اس طرح ہمارے لائق باورچی کی تان جو صبح پانچ بجے اٹھتی ہے۔ رات کے بارہ بجے کہیں جا کر ٹوٹتی ہے۔

مرّوجہ کھانوں کے علاوہ خانساماں یا ٹیلر میں نئے نئے کھانے ایجاد کرنے کی صلاحیت بھی ضروری ہے۔ ٹھوں میں شاہی ٹکڑے، فیرنی، خوبانی کا میٹھا۔ کسٹرڈ، فروٹ سیلڈ وغیرہ پرانے ہو چکے ہیں ان کی جگہ نئے نئے میٹھے بنانے کا فن بھی باورچی کو آنا چاہیئے۔ مثلاً مچھلی کا حلوہ، گوشت کی فیرنی، نیم چڑھے کریلے کا میٹھا وغیرہ۔

گھر میں مہمانوں کی ریل پیل رہتی ہے، ان کی خاطر و مدارات میں انکی پسند اور ناپسند کا خیال رکھنا ضروری ہے، لیکن کچھ بن ئے مہمان بھی آجاتے ہیں، ایسے غیر ضروری مہمانوں کے لئے کچھ خاص قسم کے پکوان ضروری ہوتے ہیں، جتنا جلدی ایسے مہمان پڑاؤ ہوڑ کر بھاگ کھڑے ہوں گے اتنا ہی باورچی کی قابلیت کا لوہا مانا جائے گا۔ گھر کے کچھ افراد لکڑی کی دھیمی آنچ پر پکا ہوا کھا ند کرتے ہیں اور کچھ لوگوں کو گیس کے چولھے پر پکی ہوئی غذائیں مرغوب ہیں، باورچی کو چاہیئے ہر دو فریقین کے جذبات کا خیال رکھے۔

چنے گئے باورچی کو منہ مانگی تنخواہ ملے گی، سال میں ڈھائی مہینے کی تنخواہ بونس کے طور پر دی جائیگی، رہنے کو کوارٹر ملے گا اگر یماری کثرتِ خوراک کی وجہ سے نہ ہو تو مفت علاج کی سہولت بھی مہیا ہوگی اور بھی ایسی آسانیاں فراہم کی جائیں گی جو کسی اہی باورچی کو بھی نصیب نہ ہونگی۔ جلدی کیجئے، گیا وقت ہاتھ نہیں آتا۔ اس اشتہار کو غور سے پڑھنے کے بعد آپ کو اگر ھوڑا سا بھی گمان ہو جائے کہ یہ تمام خوبیاں آپ میں موجود ہیں تو یقین کیجئے کہ آپ ہی ہمارے انمول اور نایاب باورچی ہیں، فوراً رابطہ قائم کریں۔"

▲ ———————

مختار یونس

سینما اسکوپ قوالی

عورت : کیسے بے شرم ہیں مرد یہ آج کے ان کو حلوہ کھلانا غضب ہوگیا
دھیرے دھیرے کڑھائی لگے چاٹنے ان کو انگلی چٹانا غضب ہوگیا

مرد : جو سِل پہ پیس سکیں نہ مصالحہ سالن کا انھیں ہے ناز مسلّم ہمیں کھلائیں گے
کلائی دیکھو تو اسٹو تلک جلا نہ سکے اور اس پہ دعویٰ کہ ہم کو یہاں جلائیں گے
فریب و مکر میں شیطان کی ہیں یہ نانی
بھرائیں اپنے میاں سے یہ عمر بھر پانی
بڑا عجیب ہے دستور ان کے میکے کا وہاں پر اُن کو وہ پٹّی پڑھائی جاتی ہے
کہ شادی بعد یہ حوّا کی بیٹی میکے میں میاں سے روٹھ کے غصّے سے بیٹھ جاتی ہے
خطا ہماری ہے جو ہم نے اِن سے بیاہ کیا
بُرا کیا جو حسینوں کو واہ واہ کیا
بھول ہم سے ہوئی اِن کے درارے گئے اِن سے شادی رچانا غضب ہوگیا
کھاتے تھے کچّا پکّا تو اچھے تھے ہم اب تو کُکر بتانا غضب ہوگیا

عورت : ہمارے کھانے میں کیڑے نکالنے والو بگھار دو دال او کشمنی بگھارنے والو
ہمارے ہاتھ کی روٹی سے تجھ کو نفرت ہے سنبھال چکّی و چولھا جو تجھ میں ہمت ہے
اے بے حیا ذرا سُن دنیا مجھ کو کہتی ہے اناج ملتا ہے راشن میں جب یہ رہتی ہے
اگر دوکان پہ بیٹھوں تو مال کھپ جائے اگر مکان پہ بیٹھوں تو تو، تڑپ جائے
جو فلم میں رقص کرے تو بہار ہے عورت مگر جو بیوی بنے تو بخار ہے عورت
یہ مرد چاہیں تو ہوٹل میں بیٹھ سکتے ہیں سیاسیات پہ یہ اول فول بکتے ہیں
مرد قوالی و فلم دیکھا کریں
میرا تھیٹر میں جانا غضب ہوگیا

○

بدیسی مال

ڈاکٹر حبیب ضیاء

آج کل بدیسی مال کی بڑی دھوم
ہے ۔ اس کی فہرست بہت طویل ہے ۔ امریکن جارجٹ کی نفیس ساڑیاں
جینس، ٹیپ ریکارڈرس، کیمرے، ٹو اِن ون، کیسٹ، واٹر کولرس، گرائنڈرس
بادام، نمکین، پستے وغیرہ ـــــ بدیسی مال میں سب سے سستا مال وہ ہے جو ۴۵ سال سے
اوپر ہوتا ہے ۔ یہ صرف ایک چودہ یا پندرہ سالہ غریب لڑکی کو دے کر خریدا جاتا ہے ۔ آج کل اس کی بہت مانگ
ہے۔ ایک آدھ ایسا بھی ہوتا ہے جو بغیر کسی سہارے کے چل بھی نہیں پاتا۔ اس کے ساتھ عموماً اس کا وفادار دلال یا پھر پہلی بیوی
کا سب سے بڑا بیٹا ہوتا ہے۔ خریداری میں یہ تنہا نہیں آتا، اپنے ساتھ دو ہزار روپے، دو چار میکسیاں، ایک سستا ٹیپ ریکارڈر
[illegible]ساس کے لئے ایک پرس ضرور لاتا ہے۔ یہی وہ چیزیں ہیں جن کی بدولت ایسا بدیسی مال ہاتھوں ہاتھ خریدا جا رہا ہے۔ دھندے باز
جس طرح، ایک ہی زمین کو چار مختلف لوگوں کے ہاتھوں فروخت کر کے روپے بٹورتے ہیں۔ اسی طرح یہ بدیسی مال بھی ایک ماہ کے مختصر
[illegible]میں چار گھروں میں خریدا جاتا ہے، تیرہ، چودہ، پندرہ اور سولہ سال کی مختلف لڑکیوں کو دے کر۔ دیس میں بکنے کے بعد یہ مال
[illegible] بیویوں کو بدیس لے جاکر اچھے داموں بیچ دیتا ہے۔ یہ کبھی ختم نہ ہونے والا چکر ہے ـــــ کسی گھر کا کوئی فرد جب بدیس جاکر
[illegible]یک سال بعد واپس آتا ہے تو اُس کے رنگ ڈھنگ ہی کچھ اور ہوتے ہیں ۔ اُس کے پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے۔ ایک دور
وہ بھی ہوتا ہے۔ جب کہ وہ خاندان کے سبھی افراد کے پاس، خلوص سے ملنے جاتا ہے۔ بدیس سے واپسی پر جب اُسے آنے کیلئے
اصرار کیا جاتا ہے تو "دیکھوں گا" اور "کوشش کروں گا" کے سوائے، اُس کے پاس دوسرے الفاظ نہیں ہوتے۔ سنیما
خریداری، تفریح اور بے تکلف دوستوں سے ملاقات کیلئے وہ وقت سنبھال کر رکھتا ہے۔ وہ جب ایرپورٹ پہنچتا
ہے تو اُس کے استقبال کیلئے گھر کے وہ افراد بھی پہنچ جاتے ہیں جو اُس کے یہاں رہنے تک اُس سے
مسلسل لڑتے جھگڑتے تھے، یا اُس کے بیروزگار اور نکمے ہونے پر طعنے دیا کرتے تھے۔ ایک
آس، ایک ہوس سی ہوتی ہے کہ بدیس سے کیا آیا ہے۔ ہر کوئی چاہتا
ہے کہ بس پورا مال وہی سمیٹ لے۔

گھر پہونچنے کے بعد دور کے قریبی رشتہ دار بھی منہ کھولے بیٹھے رہتے ہیں۔ اور جب سوٹ کیس اُن کے سامنے نہیں کھلتے تو وہ خاندان بھر میں بیچارے آنے والے کی شکایتیں شروع کر دیتے ہیں۔
بدیس سے آنے والا اپنے گھر والوں کے علاوہ دور کے ان قریبی رشتہ داروں کے لئے بھی کچھ نہ کچھ لاہی لیتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے اعلیٰ ظرف ہونے کا مکمل ثبوت دیتا ہے۔ لیکن وہ مال گھر ہی میں لوٹ لیا جاتا ہے وہ لاکھ سمجھاتا ہے کہ یہ پینٹ پیس تو میں نے گوری آپا کے شوہر کے لئے خاص طور سے لیا تھا۔ اس پر گھر کے سارے افراد ٹوٹ پڑتے ہیں اور ہم آواز ہو کر کہتے ہیں "گوری آپا کے کالے شوہر! اُن کی صورت تو دیکھو، اتنا قیمتی پینٹ کا کپڑا، یہ پاؤڈریال والا پن تھا دو، خوشی سے پھولے نہ سمائیں گے۔
بدیسی مال میں سب سے زیادہ اہم وہاں کا روپیہ ہے۔ اس کی جتنی قدر کمانے والوں کے پاس ہے اتنی ہی ناقدری اور بے دردی سے متعلقین خرچ کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک لڑکے کا ذکر ہے جس نے بدیس سے ماں کو نرم لہجے میں خط لکھا تھا کہ وہ کافی مصیبتیں اٹھا کر روپیہ بھیج رہا ہے اس لئے جہاں تک ہوسکے فضول خرچی سے احتراز کرے۔ اس پر ماں بہت چراغ پا ہوئیں۔ انہوں نے جواب میں لکھا "کیا تم سمجھتے ہو کہ میں بے دردی سے روپیہ خرچ کر رہی ہوں، یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ اپنے محلہ میں ہر کاج میں نعیمن کا مجرا ہوتا ہے۔ چھوٹے کی نام رکھائی میں بھی وہ آئی تھی۔ مہنگائی بڑھ گئی ہے۔ قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ اس دفعہ نعیمن نے تین سو کے بدلے پانچ سو لئے۔ یہ تو مزدوری خرچ تھا۔ اس کو کیسے روک سکتی تھی۔ اور ہاں! ترکاریاں وغیرہ بھی تو کافی مہنگی ہو گئی ہیں۔ اس سال تمہیں دو مرتبہ میتھی سکھا کر میں نے بھیجی تھی۔ ادرک، لہسن بھی پاؤ کیلو زیادہ تھا۔ میں ایک ایک پائی کا حساب لکھتی ہوں۔ گذشتہ جب تم آئے تھے بھنڈی کی فصل نہیں تھی۔ پھر بھی میں تمہاری خاطر آٹھ دن میں ایک مرتبہ پاؤ کیلو بھنڈی مزدور منگواتی تھی۔ بہرحال آئندہ ماہ سے ایک ہزار کی بجائے دو ہزار روپے بھیجا کرو، تنگ دستی سے بیزار آ چکی ہوں۔
کمانے والا جب بدیس واپس جاتا ہے تو اس کے سارے سامان پر قبضہ کر لیا جاتا ہے۔ قیمتی سوٹ کیس اور ایر بیگ لے کر معمولی سوٹ کیس اور ایر بیگ دے دیئے جاتے ہیں۔ بریف کیس بھی چھین لیا جاتا ہے، وہ جب دبی زبان سے پاسپورٹ اور دیگر اہم کاغذات کے گم ہونے کا اندیشہ ظاہر کرتا ہے تو والدہ صاحبہ غصے میں فرماتی ہیں "کیا بریف کیس کے بغیر کام نہیں چلتا؟ پاسپورٹ، ویزا اور دوسرے کاغذات رکھنے کے لئے میں نے تین چار پالی تھن کے بیگ بھی تو دیئے ہیں۔ پانچ سو بیگ بیچوں تو ایک پلاسٹک کی بکٹ آتی ہے
عام طور پر بچوں کے کھیلنے کے لئے گڑیاں، بال، بیٹ اور اسی قسم کے کھلونے ہوتے ہیں، لیکن ایک گھر میں ہم نے دیکھا کہ چھوٹے بچے کے ہاتھ میں قیمتی ٹو اِن ون ہے اور وہ پوری طاقت سے اُسے پٹک رہا ہے، چاروں طرف کیسٹ بکھرے پڑے ہیں۔ بچہ مسلسل ضد کر رہا تھا۔ ماں نے تمام کیسٹ دے دیئے۔ یہ لے لے مہدی حسن یہ اقبال بانو، اچھا اچھا تجھے رونا لیلیٰ چاہیئے۔ بچے نے سارے کیسٹ اٹھا کر پھینک دیئے اور ٹیپ ڈیک

ی طرف شرارت بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔

تازہ واقعہ ہے۔ ایک جگہ ہم عید ملنے گئے۔ شیر خرمے اور پان سے خاطر ہوئی، کچھ دیر بعد ایک
یعف خاتون بڑا سا شیشہ لے کر ہماری طرف آگے بڑھیں اور ہم پر انڈیلنے کی کوشش کرنے لگیں۔ ہم
نے دونوں ہاتھوں سے شیشے کو پیچھے ڈھکیل دیا۔ اور گڑگڑا کر کہا "آپ کو خدا کا واسطہ مجھے کیروسین ڈال
کر نہ جلایئے، پورا جہیز لائی ہوں۔ گنگال بھی ہے، اور ویسے میں آپ کی بہو بھی نہیں ہوں۔"
یہ سن کر وہ صاحبہ پیار بھرے لہجہ میں بولیں، ڈرو مت بیٹی! نہ میں تمہاری ساس ہوں اور نہ یہ کیروسین
اشیشہ، یہ تو باہر سے آیا ہوا سینٹ ہے۔ ہمیں گذرا ہوا سال یاد آگیا۔ اسی گھر میں ہم عید ملنے گئے تھے۔
یزبان نے عطر کی شیشی کو پیچھے چھپاتے ہوئے ایک روئی کے پھائے میں سے آدھا پھایا نکال کر ہمارے
تھ میں تھما دیا تھا۔ گھر جا کر ہم نے عطر کی شیشی کو میز پر سے ہٹا دیا۔ کیونکہ سینٹ کا شیشہ دیکھنے کے بعد
ہ تو اس کی پر نواسی لگ رہی تھی۔

بادام یہاں بھی ملتے ہیں لیکن بدیسی بادام کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ یہاں دو گرام، چار گرام خریدے
اتے ہیں، باہر سے دو کیلو، چار کیلو آتے ہیں۔ جتنی زیادہ مقدار میں آتے ہیں اتنا ہی انھیں لوگ جتن سے
چھپا کر رکھتے ہیں۔ ایک جگہ ہم ملنے گئے۔ صاحب خانہ نے چار بادام گن کر طشتری میں رکھے اور ہمارے آگے
بڑھاتے ہوئے پوچھا "یہیں کھاؤ گی یا گھر لے جاؤ گی؟ ہم نے بادام کو صرف چھو کر یہ کہتے ہوئے طشتری
نھیں دے دی، کمبخت بہت مقوی ہیں۔ چھونے سے ہی کافی طاقت آگئی ہے۔ آپ انھیں سنبھال کر ڈبے
ں رکھ دیجئے۔ صاحب خانہ خوش ہوگئیں۔ فخریہ انداز میں کہنے لگیں۔ یہ کوئی معمولی بادام نہیں، باہر سے آئے ہیں
ں نے اب تک جتنے لوگوں کو پیش کئے، سبھوں نے یہی مشورہ دیا کہ یہ ڈبے میں ہی رکھے جانے چاہئیں۔"

باہر سے آنے والے میک اپ کے ڈبے بھی منفرد نوعیت کے ہوتے ہیں۔ شوہر یا بھائی کے پاس سے
یا ہوا بدیسی میک اپ کا ڈبہ پا کر خواتین اپنے وجود کو بھول جاتی ہیں۔ ڈبہ لے کر گھنٹوں آئینے کے سامنے
بیٹھی رہتی ہیں۔ لیکن خدا کی قدرت دیکھئے کہ بیشتر خواتین ان چیزوں کے صحیح استعمال سے بالکل ناواقف رہتی
ں، نتیجہ یہ ہے کہ جب وہ میک اپ کر کے باہر نکلتی ہیں تو نیک اور پارسا لوگوں کی نظریں بھی خود بخود ان پر پڑ ہی
اتی ہیں۔ پپوٹوں پر لگنے والا رنگ ہونٹوں پر لگا رہتا ہے جو چیز پلکوں کے لئے ہوتی ہیں، اُسے آنکھوں میں
بھر لیتی ہیں۔ مفت کا مال، ہوتا ہے اس لئے پوڈر کا استعمال بھی، نہایت فراخ دلی سے کرتی ہیں۔ بے پردہ
ہونا معیوب ہے، اب اس میک اپ کو دیکھے گا کون؟ اس مقصد کے لئے برقعے کے نقاب کے لئے نائیلان
کی باریک ترین جالی آرڈر دے کر باہر سے منگوائی جاتی ہے۔

بہر حال، بدیس کی ہر چیز کا اپنا علاحدہ مقام ہے۔ دیسی مال خواہ کتنا ہی عمدہ اور نفیس، کیوں نہ ہو بدیسی
کو لوگ ترجیح دیتے ہیں۔ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ دیسی مال پر بدیسی مہر دیکھ کر منہ مانگے دام دیکر خریدتے ہیں
دراپنی کم عقلی اور غلامانہ ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ▲

ایم اے حنان

بارے ادباء کا کچھ بیاں ہو جائے
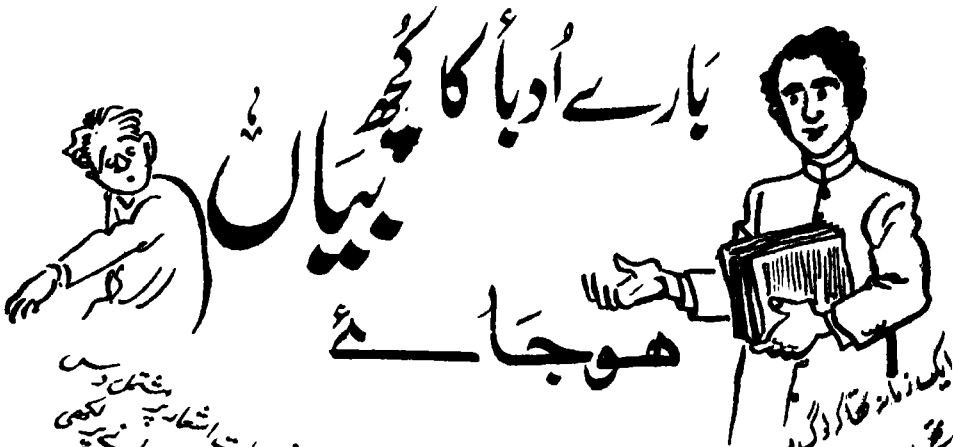
ایک زمانہ تھا کہ لوگ صرف اپنے شاعر دوستوں سے گھبراتے تھے۔ سرِ راہ نظر آجائیں تو صرف اُن کے دیدار کو کافی سمجھ کر اُسے "وصال" کی منزل تک پہنچنے نہ دیتے۔ اور انھیں ایک بار جی بھر کر دیکھ لینے کے بعد پناہ لینے کے لئے کسی قریبی گلی میں گھس جاتے — کیونکہ انھیں اس بات کا اچھی طرح علم تھا کہ بظاہر معصوم اور بے ضرر معلوم ہونے والے ان شاعر صاحب کے بطن سے یکایک مصیبتیں نازل ہونی شروع ہوں گی اور دیکھتے ہی دیکھتے کالی گھٹاؤں جیسی سیاہ زُلفوں کی اوٹ سے "اشعار" کی غضبناک گرجتی بجلیاں اُن کے خرمنِ جسم وجاں پر بے تحاشہ گرنے لگیں گی۔ اور گھنٹوں "مطلع" صاف ہوتا نظر نہ آئے گا۔ اس پر ستم یہ کہ انھیں "آہ"، "آہ" کرنے سے باز رکھ کر "واہ واہ" کہنے پر مجبور کیا جائے گا۔ پھر جلسے کا بل بھی انھیں ہی ادا کرنا پڑے گا۔ لیکن آج کل شاعروں کے علاوہ ادیبوں سے بھی منہ چھپانے

کی نوبت آگئی ہے۔ کہاں پانچ سات اشعار پر مشتمل دس پندرہ نظمیں اور غزلیں اور کہاں چاول کے دانے پر لکھی جانے والی تحریر میں باون باون، فل اسکیپ صفحات پر محیط افسانے اور مقالے۔۔! بھاگ کھڑے نہ ہوں گے تو کیا انھیں سماعت فرمائیں گے۔ وہ بھی بیشتر نامکمل اور ادھورے۔ مثلاً کسی مضمون کا عنوان سالِ گزشتہ سے زیرِ تجویز ہے تو کسی کا ڈھونڈ لانا باقی ہے اور کسی افسانے میں "تشبیہ" کا انتظار فرمایا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ کسی میں کلائمکس کا ۲۵ سے، اور کسی مقالہ کے ڈیڑھ سو عنوانات میں سے ہمیں کسی موزوں عنوان کا انتخاب کرنا ہے بلکہ نہ صرف ایک موزوں عنوان، اُسے چھپوانا بھی ہے۔ ادب کے ان بے لوث خدمتگاروں سے راہ چلتے ہوئے ہم ہرگز منہ نہ چھپاتے اگر وہ صرف ایک آدھ ضخیم ناول کے دو چار افسانے سنا دیتے، اور دو تین تہائی والی کہانیوں کا "ٹریجڈیہ" تمت بالخیر تک پہنچا دیتے اور بتانے پہ ہی اکتفا کرتے، بلکہ ہمیں

ان کا آدھی رات کو تشریف لاکر کلام سُنانا اور اگلی صبح دفتر پہونچ کر سرکاری کام میں مزاحمت پیدا کرنا بھی ایک حد تک قبول تھا۔ لیکن جب سے وہ اپنی صدارت یا اعزاز میں جلسہ منعقد کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں، ہمیں روپوشی ہوجانے ہی میں عافیت نظر آتی ہے۔

کیونکہ آج کل گرانی کافی بڑھی ہوئی ہے۔ معمولی سے معمولی شئے کی قیمت آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔ اب آپ ہی کہیئے کہ تین روپے فی کیلو پیاز کھانے کا شرف ہم سے قبل کسی قوم یا نسل کو حاصل ہوا ہے؟ شاید یہ وہ اعزاز ہے جو بادشاہوں کو نصیب نہ ہوسکا۔ ادھر سپلائنگ کمپنی والوں نے بھی سامان کے کرائے کافی بڑھا دیئے ہیں۔ چھوٹے لاؤڈ اسپیکر کا کرایہ بھی ہماری دسترس سے باہر ہوچکا ہے اور پھولوں کے ہار کا پہنا دینے کا رواج تو ابھی شروع ہی نہیں ہوا ہے۔ اس میں اب تک صرف اتنی ترقی ہوئی ہے کہ ایک ہار سے دو چار افراد کی گُل پوشی کی جارہی ہے۔ اور یہ سہولت بھی صرف اُن جلسہ گاہوں تک محدود ہے جہاں عقبی دروازہ لگا ہو، ان حالات میں ہم کوئی جلسہ وغیرہ منعقد کرنے کی غلطی کیسے کرتے۔

لیکن اس طرح آخر کب تک مُنہ چھپاتے پھرتے اور کس کس سے؟ بالآخر ایک دن سرتسلیم خم کرنا پڑا "کہیں ٹھیس نہ لگ جائے اِن آبگینوں کو" اور ایک ایسے ادیب کے اعزاز میں جلسہ کے انعقاد کا اعلان کر دیا جو یک عرصہ سے ہمیں دِق کر رہے تھے۔ اور اس بات کا خدشہ پیدا ہوگیا تھا کہ اگر جلسہ نہ کریں گے تو ضرور ہمیں "دق" ہوجائے گا۔ لیکن پرستاران اردو کی بے حسی ملاحظہ فرمائیے کہ جلسہ کے دن سوائے الکٹریشن، سپلائنگ کمپنی کے آدمی، ہمارے اور صدر صاحب کے، کسی نے بھی شرکت کی زحمت گوارا نہ کی۔ البتہ ہماری آمد سے قبل دو گنز ار قسم کے حضرات جلسہ گاہ میں پہلے ہی سے موجود تھے۔ لیکن جب انہوں نے بھی ادبی اجلاس کا نام سُنا تو احتراماً فوری اُٹھ کر باہر چلے گئے دراصل وہ مشاعرہ کے دھوکہ میں تشریف لائے تھے۔

سامعین کی فراہمی ہمارے لئے ایک مسئلہ بن گئی تھی۔ ایک تو دسمبر کی سخت سردی اور یخ بستہ ہوائیں دوسرے اجتماع۔ اور رشیالین کی چہل قدمی کا وقت، ادھر گلی کے آوارہ کتے ببر شیر کی طرح اکڑتے پھر رہے تھے پھر بھی ہم نے ہمت کر کے محلہ کا ایک گشت لگایا۔ لیکن جب کوئی سامع دستیاب نہ ہوا تو دو چار شرفا کے گھروں پر دستک دیدی۔ لیکن کسی نے بھی ہماری آواز پر لبیک نہیں کہا۔ صرف مسکرا کر دروازے بند کر لیئے۔

سچ پوچھیئے تو اس نازک موقع پر پڑوس میں ہونے والی "تسمیہ خوانی" نے ہماری آبرو رکھ لی، اور جگ مگ جگمگ کرتی شیروانیوں میں ملبوس ننھے فرشتوں کی آمد سے 'محفل سخن' میں بہار آگئی۔ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم نے بھی فوری جلسہ کی کارروائی کا آغاز کر دیا۔ اس خوف سے کہ کہیں ہماری ذراسی تاخیر ایک ادبی جلسہ کا پیش خیمہ نہ بن جائے۔ اب ادیب صاحب مضمون سُنانے میں پس و پیش کرنے لگے۔ پھر خود ہی سنبھل گئے اور لہک لہک کر مضمون سنانا شروع کر دیا۔ ادھر بچوں نے اظہار مسرت میں جلد بازی سے کام لیتے ہوئے مضمون کے اختتام سے قبل ہی تالیاں بجانا شروع کر دیا۔ انہوں نے کچھ دیر توقف کیا۔ لیکن جب تالیوں

کا شور ختم ہوتا نظر نہ آیا تو مجبوراً مضمون کو نامکمل چھوڑ کر ان نونہالوں کی خوشیوں میں شامل ہو گئے۔ لیکن انھیں تسلی نہ ہو سکی، کیونکہ بقول ان کے جلسہ "چلڈرنس ڈے" میں تبدیل ہو گیا تھا۔ حالانکہ دو بزرگ حضرات آخری وقت تک جلسہ گاہ میں موجود تھے۔ یہ اور بات ہے کہ موجود رہتے ہوئے بھی انہوں نے حیرت انگیز طور پر اپنے آپ کو جلسہ کی کارروائی سے قطعی بے تعلق رکھا۔ چنانچہ ایک صاحب شدید کھانسی اور اخراج بلغم سے برسر آزمار ہے۔ اور دوسرے صدر صاحب کی اجازت کے بغیر اپنی مشہور نظم "خراٹے" سنانے لگے۔

اس واقعہ کے ازالہ اور اپنے کامل تحفظ کے لئے ایک اور محفل کا انعقاد ضروری ہو گیا تھا۔ ویسے اب ہمیں ادبی جلسے منعقد کرنے کا خاصہ تجربہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس کی روشنی میں ہم نے اس "الوداعی اجلاس" کو شہر کی خوبصورت اور posh لوکیالٹی "بنجارہ ہلز" میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ سوچ کر کہ لوگ کافی تعلیم یافتہ اور خوشحال ہیں مشاعرے اور ادبی محفلوں کی اہمیت اور اُن کے آداب سے کما حقہ واقفیت بھی رکھتے ہیں، چنانچہ شاندار "Gathering" ہونے کے امکانات تھے۔ صرف راستہ ذرا خطرناک تھا جس کا ہم نے پوری ایمانداری کے ساتھ تذکرہ کیا ساتھ ہی یہ بھی عرض کر دیا کہ خبردار! آتے وقت کوئی قیمتی چیز ہرگز اپنے ساتھ نہ لیتے آئیں۔ بلکہ اس قسم کی محفلوں کے لئے مختص لباس فاخرہ زیب تن کرنے کے بجائے فقیرانہ و قلندرانہ حال میں تشریف لائیں تو زیادہ افضل ہے۔ کیونکہ ادھر اکثر رات کے وقت راہروؤں کو چاقو کی نوک پہ لوٹ لیا جاتا ہے!

جلسہ کے آغاز کے لئے نو بجے کا وقت مشتہر کیا گیا تھا۔ لیکن جب صدر صاحب ساڑھے گیارہ بجے کے بعد بھی تشریف نہ لائے تو ذرا تشویش ہوئی۔ پھر آخر ہوا بھی وہی جس کا ہمیں خدشہ تھا۔ چنانچہ منتظمین جلسہ سے قبل چند نامعلوم افراد نے اُن کے اعزاز میں استقبالیہ ترتیب دیدیا تھا۔ اور ادیب ہونے کے ناطے مارپیٹ سے احتراز کرتے ہوئے صرف پانچ روپے وصول کر کے چھوڑ دیا گیا۔ ان سے قبل جلسہ میں حصہ لینے آئے دو، چار ادیب اور شاعر علی الترتیب پانچ اور دس روپیوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ لیکن صدر صاحب اتنے حواس باختہ اور گھبرائے ہوئے تھے کہ زبان سے الفاظ ادا نہیں کر پا رہے تھے۔ ایسے میں کیا خاک مضمون سناتے اور صدارتی خطبہ پڑھتے! چنانچہ زندگی میں پہلی بار جلسہ کی کارروائی کا آغاز کرنے کے بجائے اس کے ملتوی کر دیئے جانے کا اعلان کرنا پڑا۔ جس سے معزز سامعین کی ایک کثیر تعداد سخت مایوس ہو گئی۔ لیکن یہ تو سراسر ہماری غلطی تھی جو اس ملتویہ جلسہ کو ہم نے "کرفیو" کے دن مقرر کر دیا۔ اور وہ بھی بلا سوچے سمجھے شرکت کے لئے گھر سے نکل پڑے۔ لیکن یہ اجلاس بھی ہمیں تاریخ مقررہ سے ٹھیک تین ماہ بعد کرنا پڑا۔ اگرچہ کہ وہ صرف تین دن کے لئے اندر گئے تھے۔ لیکن پولیس والوں کی ابتدائی تفتیش صحت کے لئے اتنی مضر ثابت ہوئی کہ ڈاکٹروں نے انھیں تین مہینے تک بستر سے اٹھنے نہ دیا۔ حیرت تو اس بات کی ہے کہ ان واقعات کے بعد بھی وہ اس قسم کی محفلوں سے قطعی متنفر نہ ہوئے اور اپنی صحتیابی کی خوشی میں کچھ "برپا" کرنے کو کہہ رہے ہیں!! ▲

خدا مغفرت کرے چچا مرحوم بھی کیا خوب آدمی تھے' یوں تو کوئی خاص پڑھے لکھے نہ تھے لیکن خدا کی قسم جو بات کرتے لاجواب کرتے۔ اگر کچھ پڑھ لکھ بھی لیتے تو کیا عجب کہ آج افلاطون اور ارسطو کے ساتھ نام آتا۔ لیکن یہ بھی قسمت کی ستم ظریفی ہے کہ جب تک زندہ رہے کسی نے قابل اعتنا نہ سمجھا اور جب وہ ہم میں نہیں رہے تو سب کو احساس ہوا کہ واقعی وہ بھی کیلکال کے آدمی تھے۔ ہر صاحب کمال کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔

لیکن اس خاکسار بھتیجے نے تو ہمیشہ ہی ان کی قدر کی۔ جس وقت وہ ہم میں تھے اس وقت بھی اور اب جبکہ وہ پردہ کر گئے تب بھی' یوں تو ان کی ساری باتیں ہی اعلیٰ پائے کی تھیں' جنھیں آج بھی فریم کر کے رکھا جا سکتا ہے۔ لیکن انھوں نے دم آخر جو خاص بات ہمارے کان میں کہی تھی وہ تو لاکھوں میں ایک تھی۔ اب بھی جب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں تو مرحوم کی عقل و ذہانت کی دل ہی دل میں داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مرتے دم تک ہمارا یہی خیال تھا انھیں واقعی خدا بچا دے تو الگ ورنہ بن چچا ہی کے دنیا سے اٹھ لیے۔ کتنا دلسوز منظر تھا' ان کے آخری لمحات کا' سارا گھر رنج و الم میں ڈوبا ہوا تھا۔ کوئی چچا کی پرانی فلسفیانہ باتیں دہرا کر غمگین تھا۔ (جو انہوں نے بغیر فلسفہ پڑھے ہی کہی تھیں) کوئی اس لئے سوگوار تھا کہ وہ دنیا میں بغیر جوڑے کے ہی پیدا ہوئے تھے اور بغیر جوڑے کے ہی دنیا سے جا رہے تھے۔ لیکن چچا جان مرحوم کی اور بات کے تعلق ہی سوچ رہے تھے۔ ان کے چہرے سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ کوئی بہت ہی اہم گتھی سلجھا رہے ہیں۔ آخر ہم

سے نہیں رہا گیا اور ہم پوچھ ہی بیٹھے "کیا سوچ رہے ہیں آپ چچا جان"؟

"بیٹا میں یہ سوچ رہا ہوں کہ دنیا سے جاتے ہوئے ایک ایسی بات کہوں جو تمہیں زندگی بھر کام آئے"۔

ہمارے تو یہ سن کر رونگٹے ہی کھڑے ہو گئے کہ پتہ نہیں چچا جان پردہ غیب سے کیا ظہور میں لانے والے ہیں جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔ منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں، چہرے پر ایک رنگ آنے اور ایک جانے لگا۔ ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑ گئے۔ منہ سے ایک لفظ نکلنا مشکل ہو گیا۔ اب تو تمام گھر والے بڑے ہی پریشان ہوئے اور بیمار کو چھوڑ بھلے چنگے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

لیکن ہم نے سب کو یقین دلایا کہ کوئی خاص بات نہیں۔ دراصل چچا جان دنیا سے جاتے ہوئے ایک چہیتے بھتیجے کو ایک خاص بات کہنے والے ہیں اس لئے ہمارا یہ حال ہو گیا، اور کوئی خاص بات نہیں۔ اتنے میں چچا جان نے بھی ذرا سنبھالا لیا اور تازہ ہوا کے ایک جھونکے نے جوان کے دماغ کی رگوں کو جھنجھنایا تو انہوں نے ہمیں نزدیک بلا کر کہا

"دیکھو بیٹا ہم تو اب جا رہے ہیں، لیکن جاتے جاتے ایک بات کہے دیتے ہیں۔ وہ یہ کہ شادی کرنا تو کسی گریجویٹ اور کمانے والی لڑکی سے کرنا ورنہ عمر بھر کنوارے رہنا"۔

اُف کتنے پتے کی بات کہی تھی انہوں نے، پہلے تو ہم چچا جان (جو تھوڑی ہی دیر میں مرحوم ہونے والے تھے) کی ذہانت کی داد دیتے رہے، جنھوں نے عین دنیا سے پردہ کرتے وقت اپنے بھتیجے کو اتنی کام کی بات بتائی۔ ہم جتنا اس جملے پر غور کرتے رہے، اتنا ہی اس کی گہرائی میں اترتے چلے گئے، مسلسل سوچتے رہنے کے بعد بھی ہم اس کی بلاغت کی تہ کو نہ پہونچ سکے اور ہمیں اعتراف کرنا ہی پڑا کہ واقعی ان کی کہی ہوئی بات کی تہہ کو کوئی پہونچا ہے اور نہ پہونچ سکتا ہے۔

گھر والوں نے ہم سے بہترا پوچھا کہ چچا جان نے ہمیں کیا کہا لیکن ہم نے کسی کو بھی یہ بات نہیں بتائی، چچا جان کے پُر رونق چہرہ سے بھی یہ پتہ چل رہا تھا کہ وہ اس بات سے مطمئن ہیں کہ ہم ان کی کہی ہوئی بات کسی سے نہیں کہہ رہے ہیں تھوڑی ہی دیر میں چچا جان کی حالت غیر ہو گئی۔ ہم نے گھبرا کر ڈاکٹر کو بلانے کی سوچی۔ لیکن چچا جان نے ہاتھ کے اشارہ سے روک دیا۔ ہماری سمجھ میں آج تک یہ بات نہیں آئی کہ جو چیز ہمارے دل میں تھی اسے چچا جان نے کیسے جان لیا تھا۔

آخر چچا جان نے ایک ہچکی لی۔ ہم تو سمجھے کہ یہ آخری ہچکی ہے۔ لیکن چچا جان پھر سنبھل گئے اور بڑی ہی کوشش کے بعد ہماری طرف دیکھ کر نہایت ہی نحیف و ناتواں آواز میں کہا کہ "بیٹا میرے قول کا خیال رکھنا ورنہ قبر میں بھی میری روح کو سکون نہیں ملے گا"۔ اتنا کہنے کے بعد چچا جان نے آنکھیں بند کر لیں اور ہمیں ان کے نام کے آگے ہمیشہ کے لئے لفظ "مرحوم" بڑھا دینا پڑا، گھر کے سارے لوگ تو ان کے آخری سفر کے انتظامات میں لگ گئے لیکن ہم چچا جان مرحوم کے اسی قول کے بارے میں سوچتے رہے جسے ہمیں پورا کرنا تھا۔ ہماری ساری آنے والی زندگی کا اسی پر انحصار تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارے گھر والے ہمیں کندہ ناتراش سمجھ کر چھوڑ بیٹھے تھے لیکن خدا بہتر جانتا ہے چچا جان مرحوم کبھی ہماری ذات سے ناامید نہیں ہوئے، ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ کارخانہ قدرت میں کوئی چیز بیکار نہیں پیدا کی گئی۔ ہر چیز کام کی ہے بشرطیکہ تم اس میں افادہ تلاش کرو۔ جب چچا مرحوم ہمارے بارے میں ایسے نادر خیالات کا اظہار کرتے تو گھر والے الٹے ان ہی کو صلواتیں سناتے کہ خواہ مخواہ بچے کو بگاڑ

رہے ہیں۔ آج جب کہ چچا مرحوم ہمارے درمیان نہیں ہیں ان کی نصیحتیں ہمیں بے تحاشہ یاد آتی ہیں۔ کتنے خلوص سے وہ کہا کرتے تھے : " بیٹا صبح نو بجے سے پہلے نہیں اٹھنا چاہیئے۔ صبح کی ہوا بڑی ٹھنڈی ہوتی ہے "۔

" رات میں بارہ بجے سے پہلے نہیں سونا چاہیئے کیونکہ عموماً بڑے لوگ ایسا ہی کرتے ہیں "۔

" زیادہ وقت گھومنے پھرنے میں گذارنا چاہیئے کیونکہ گھر میں بیٹھنے سے صحت خراب ہوتی ہے "۔

" کام کم اور آرام زیادہ کرنا چاہیئے کیونکہ ہر چیز کا ایک حق ہے اور جسم کا حق یہ ہے کہ اسے آرام پہونچایا جائے "۔

جس وقت چچا مرحوم حیات تھے ہم ان نصیحتوں کی طرف کوئی دھیان نہیں دیتے تھے لیکن آج جبکہ وہ ہم میں موجود نہیں ہیں، ہمیں ان کی اہمیت کا احساس ہو رہا ہے۔ سچ ہے جب تک کوئی چیز پاس رہتی ہے اس کی کوئی اہمیت نہیں رہتی لیکن جب وہ چیز ہم سے چھن جاتی ہے تب اس کا احساس ہوتا ہے۔

دراصل وہ ہماری شادی کسی گریجویٹ اور کماؤ لڑکی سے کرانے کے اس لئے خواہاں تھے کہ انھیں معلوم تھا کہ ہم زندگی میں کوئی تیر نہ مار سکے تھے۔ اور ایک پڑھی لکھی اور کماؤ لڑکی سے شادی کر کے وہ ہماری زندگی بنا دینا چاہتے تھے۔ اس کا انھیں اچھی طرح احساس تھا کہ ہم صرف نان میٹرک ہیں اور زندگی بھر میٹرک کامیاب نہیں کر سکتے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں ہمیں صفائی کے محکمہ میں داروغہ بنا دینے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ شہر کے میئر سے لیکر صفائی کے چپراسی تک سب سے ملے لیکن ہماری قسمت میں صفائی کا داروغہ بننا نہ لکھا تھا، سو وہ ہم نہ بنے، لیکن کیا ہوا جو ہم صفائی کے داروغہ نہ بن سکے۔ بیکاری کے داروغہ تو تھے۔ اس عہدہ پر سب ہی منصرم امیدوار آتے ہیں لیکن ہم بھی ایک مستقل نکلے، چونکہ ہماری طبیعت میں قناعت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اس لئے بیکاری کے داروغہ بن کر بھی مطمئن رہے اور آج بھی مطمئن ہیں۔

لیکن چچا مرحوم ہمارے اس عہدہ سے مطمئن نہیں تھے، اسی لئے انہوں نے بہت سوچ بچار کے بعد یہ رائے دی تھی کہ ہمیں کسی گریجویٹ لڑکی سے جو کماؤ بھی ہو شادی کر لینا چاہیئے، اس طرح وہ کمائے گی اور ہم کھائیں گے، مرد کا درجہ بہر طور عورت سے بڑا ہوتا ہے، چاہے مرد کمائے عورت کھائے یا عورت کمائے مرد کھائے، بات ایک ہی ہے، چھری پر خربوزہ گرے یا خربوزہ پر چھری گرے کٹنا بہرحال خربوزہ کے مقدر میں ہے۔

لیکن اب جبکہ چچا مرحوم کو اس دنیا سے گذرے ایک عرصہ ہو گیا اور ہماری عمر بھی چالیس سے متجاوز ہو گئی نہ ہمیں کوئی گریجویٹ لڑکی ملی اور نہ اس سے ہماری شادی ہو سکی۔ جب شادی ہی نہیں ہوئی تو بچوں کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے آئندہ بھی دور دور تک ایسے کوئی امکانات نہیں پائے جاتے، لیکن کیا ہوا جو ہم اب تک شادی نہ کر سکے یہی کیا کم ہے کہ کنوارے رہ کر ہم چچا مرحوم کی روح کو سکون تو پہونچا رہے ہیں ——— ویسے کسی گریجویٹ لڑکی سے شادی نہ کر کے ہم یوں بھی مطمئن ہیں کہ کسی ایسی لڑکی سے ہماری شادی ہو جاتی تو یہ بھی عین ممکن تھا کہ ہم چولھا پھونکتے اور وہ دفتر جاتی ہم ترکاری کاٹتے اور وہ ریڈیو سنتی ہم کپڑے دھوتے اور وہ دیوان خانے میں بیٹھی اپنی سہیلیوں سے گپیں ہانکتی، یہ بھی ممکن تھا کہ وہ سنیما دیکھنے جاتی اور ہمیں گھر کی نگرانی کرنی پڑتی، پھر اس کا بھی امکان تھا کہ وہ کوئی بھدی، کالی موٹی ہوتی یا اس کے چہرے پر بدنما داغ ہوتے یا چہرے پر موٹے شیشے کی عینک لگی ہوتی کیونکہ گریجویشن کرنے تک کسی لڑکی کی یہی حالت ہو سکتی ہے اسلئے اب ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہم جو لنڈورے رہ گئے اس میں بھی قدرت کی کوئی حکمت چھپی ہوئی ہے ▲

محمد برہان حسین

بڑی بھول کی محبت کر کے

تیس پینتیس سال
پہلے کی بات ہے۔ فلم انمول گھڑی زوروں
پر چل رہی تھی۔ اس فلم میں نورجہاں کا مشہور گانا تھا "آواز دے
کہاں ہے"۔ ایکدن شہر میں یہ خبر پھیلی کہ کسی شو میں جب نورجہاں نے صدا لگائی
"آواز دے کہاں ہے" تو کسی نے چیخ کر جواب دیا 'سات آنے والے میں ہوں' بڑے چچا نے سنتے ہی کہا
"یہ میرا لڑکا مسعود جنگ ہوگا" نام مسعود علی تھا لیکن اُس زمانہ میں ایک مشہور وزیر تھے مسعود جنگ' اسی مناسبت
سے مسعود علی کو بھی لوگوں نے مسعود جنگ بنا دیا تھا۔ گو مسعود جنگ نورجہاں کے عاشق تھے لیکن اس کے علاوہ انہوں نے
درجنوں عشق کئے تھے لیکن سب کے سب ناکام ہر دم ٹھنڈی آہیں بھرتے بھرتے منہ ریفریجریٹر بن چکا تھا' بلکہ
دوست احباب رمی کھیلنے بیٹھتے اور گرمی محسوس ہوتی تو مسعود جنگ کو بلا لیتے اور اُن کی کسی معشوقہ کا ذکر چھیڑ دیتے
مسعود جنگ اتنی ٹھنڈی آہیں بھرتے کہ سارا کمرہ ٹھنڈا ہوجاتا تھا۔ لیکن اس زمانہ میں اتنی بڑی تعداد میں عشق کرنا مسعود
جنگ کا ہی کارنامہ تھا ورنہ لوگ دل ہتھیلی پہ لئے پھرتے تھے کہ کسی کو دیدیں تو کوئی لینے والا نہ تھا
عورتیں پردہ میں چھپی رہتی تھیں۔ یا پھر پردہ پر (سینما کے) نظر آتی تھیں۔
ایسے پُر آشوب زمانہ میں اگر کسی آدمی کو کوئی لڑکی نظر
آجاتی تھی تو وہ خدا کا شکر ادا کر کے فوراً
اس پہ عاشق ہوجاتا تھا

اور رات ہونے کا انتظار کرتا۔ رات ہوتے ہی وہ کھانا وغیرہ کھا کر صحن میں تخت بچھا کر سفید قسم کا فرش کرتا اور بڑے بڑے گاؤ تکیے لگا کر ٹیکے سے بیٹھ جاتا اور اختر شماری (تارے گننا) شروع کر دیتا۔ بیچ بیچ میں نیند کے غلبے سے سر ڈھلک جاتا۔ چند راتیں اس طرح گذارنے کے بعد وہ شاعری شروع کر دیتا تھا۔ گو اس دوران محض ایک بار دیکھا ہوا چہرہ اس کی یادداشت میں گڈمڈ ہو جاتا لیکن مجبوری تھی عشق ہو چکا تھا، اس لئے اس کی یاد میں غرق رہتا تھا۔ آجکل کی طرح نہیں کہ آپ کھڑکی میں سے تازہ ہوا نوش کرنے کے لئے کھڑے ہیں کہ سامنے گھر کی کھڑکی دفعتاً کھلی اور ایک لڑکی نظر آئی۔ بیک گراؤنڈ میں ریکارڈ بج رہا ہے۔

مٹھو میاں آج میں جوان ہو گئی ہوں .... گُل سے گلستان ہو گئی ہوں۔

لیکن مسعود جنگ کا معاملہ دوسرا ہی تھا ابھی تک انھیں کسی لڑکی نے دراصل مٹھو میاں کہہ کر مخاطب ہی نہیں کیا تھا۔ اس لئے ان کا عشق صرف ایکٹرسوں سے چلتا تھا۔ نورجہاں کی فلم کسی سینما میں لگی کہ دوسرے دن مسعود جنگ پٹیوں میں لپٹے ملتے۔ لوگوں نے کہا بھی کہ بھئی یہ رہ کے ٹکٹ کے لئے سر پھٹول کرتے رہو گے تو ایک دن جاں بحق تسلیم ہو جاؤ گے بڑے درجوں کے ٹکٹ لیا کرو۔ مگر ان کا جواب تھا بڑے درجے بہت پیچھے ہوتے ہیں وہاں سے نورجہاں صاف نظر نہیں آتی کیا کریں۔ ایک دن مسعود جنگ نے حقارت سے کہا' ارے تو نوجوان سے اب صرف جوان رہ گیا ہے اور تو نے عشق نہیں کیا "۔

یہ سن کر ہم نے آہستہ آہستہ مدھوبالا کی فلمیں دیکھنی شروع کیں اور اس کا ذکر ہاکی کے سینئر کھلاڑی فرید اللہ خاں سے کیا تو وہ برہم ہوئے۔ " ارے گدھے تو فٹبال' ہاکی کھیلتا ہے تیرتا ہے اب اس عشق کیلئے وقت کہاں سے نکالے گا۔ یہ محبت کا کھیل فل ٹائم ورک ہے اور پھر تجھ سے مدھوبالا سے عشق کرنے کس نے کہا' اپنے سے بڑی عمر کی عورت سے عشق کرتے شرم نہیں آئی۔

یہ سن کر ہم نے عشق کرنا ملتوی کر دیا اور فٹبال ہاکی میں جی جان سے لگ گئے ہم خوب کھیلتے اور رات کو بے ہوش سو جاتے اُدھر مسعود جنگ ایک نئی محبوبہ کے عشق میں رات رات بھر تارے گنتے اور دن میں آہیں بھر بھر کر لوگوں کو بتاتے ایک دفعہ غلطی سے ایک فلکیات کے طالب علم کے سامنے انہوں نے کہہ دیا کہ " صاحب ساری رات تارے گنتے گذری " یہ سنتے ہی اس نے کاغذ قلم منگوا کر آسمان کو برجوں میں تقسیم کر کے بتا دیا کہ کس حصہ آسمان میں کتنے تارے ہیں اور کل ملا کر کتنے ہیں " اس کے بعد سے مسعود جنگ نے تارے گننے بند کر دیئے اور دو پتے کم کر کے patience کھیلنا شروع کر دیا تاکہ کبھی گیم مکمل ہی نہ ہو۔

ایک دن مسعود جنگ نے مجھے ایک لڑکی کی تصویر دکھائی۔ پھولے پھولے گالوں والی گول صورت کی ہم نے کہا " ارے کیا فٹبال کی طرح پھولا ہوا چہرہ ہے " مسعود جنگ غصہ میں آ گئے' ارے گدھے ایسے نہیں یوں کہتے ہیں۔ وہ کیا کنول کی طرح کھلا چہرہ ہے۔ ایک اور تصویر بتائی۔ تصویر کالی کالی سی تھی لیکن لڑکی کی آنکھیں چمک رہی تھیں ہم نے کہا " اوہ کیا ڈینجر لائٹ کی طرح چمک رہی ہیں اس کی آنکھیں۔

اس پر مسعود جنگ نے آہ بھر کر کہا " واہ آنکھیں ہیں جیسے مئے کے پیالے بھرے ہوئے۔ اس لڑکی کا بڑا دھوکہ ہوا۔ ہم اس سے میجر گوئل کی لڑکی سمجھ کر عشق کرتے رہے۔ وہ بعد میں ان کی ماما خواجہ بی نکلی۔

مسعود جنگ کی ایک محبوبہ گانے کی شوقین تھی اور شاید صرف اچھے گانے والوں سے ہی عشق لڑاتی تھی مسعود جنگ نے ہم سب سے کہا کہ کم از کم ایک گانا انہیں سکھایا جائے تاکہ وہ اُسے سنا کر اس کے دل جیتنے کی فوج میں شامل ہو سکیں۔ اس زمانہ میں شہر میں ہر دوسرا آدمی سہگل کی آواز میں گاتا تھا۔ ہر محلہ ہر گلی اپنا محمد رفیع، مکیش ہوا کرتا تھا جیسے شرفو میاں خیر سے کڑوے صاحب کی گلی کے مکیش کے ٹائٹل ہولڈر شرفو میاں نے کہا " بھئی مسعود جنگ! آپ سیکھنے کی عمر اتنی دور چھوڑ آئے ہیں، جتنی دور انسان پتھر کے دور کو چھوڑ آیا ہے، پھر بھی آپ یہ کر سکتے ہیں کہ اس لڑکی کے سامنے بیٹھ کر ہونٹ ہلاتیے میں بیک گراؤنڈ گا دوں گا" مسعود جنگ نے کہا " میری ہر محبوبہ تم دوستوں کی نااہلی کی وجہ سے دوسری پارٹی کے ہاتھوں چلی گئی۔ مسعود جنگ کا گانا سیکھنے کا کوشش ناکام رہا۔ شرفو میاں نے طے کیا " جھوم جھوم کے ناچو آج " تو آسان اور سیدھا گانا ہے اور مسعود جنگ شاید سیکھ لیں۔ شرفو میاں نے گاکر پہلا مصرعہ پڑھایا۔ جھوم جھوم کے ناچو آج، ناچو آج، تو مسعود جنگ نے کہا جوہوم جوہوم کے ناچو آج،

شرفو میاں نے لاکھ سمجھایا کہ جھوم ہے جوہوم نہیں لیکن مسعود جنگ وہی جوہوم جوہوم کہتے رہے اور کوشش ناکام ہوگئی۔

مسعود جنگ کا ایک عشق ٹیلیفون تک بھی چلا۔ یہ لڑکی اردو فلمی ادب کی دلدادہ تھی، وہ جب بھی ٹیلیفون کرتی، شرفو میاں، مسعود جنگ بن کر بات کرتے۔

وہ کہتی مسعود! زندگی پیار کی دو چار گھڑی ہوتی ہے۔

شرفو میاں کہتے۔ چاہے تھوڑی سی ہو یہ عمر بڑی ہوتی ہے

وہ کہتی، لیکن 'بدنام محبت کون کرے اور عشق کو رسوا کون کرے۔

اور پھر تیرا کام ہے جلنا پروانے

غلطی سے میر کا مصرعہ پڑھا جینے میں ہے تیری رسوائی

شرفو میاں نے کہا، اور اگر مر کر بھی چین نہ پایا تو کدھر جاؤ گے

وہ پوچھنے لگی " یہ کس فلم کا ہے "

شرفو میاں نے گھبرا کر کہا " خدا کرے کہ حسینوں کے باپ مر جائیں

ہمارے واسطے میدان صاف کر جائیں

لیکن ایک دن اس محبوبہ نے ٹیلیفون پر مسعود جنگ کو اپنی شادی کی دعوت دی اور گلی ملنگ ٹوڈی کا یہ معرکہ کا شعر پڑھا:

میرے محبوب میری شادی میں آنا دیکھو

نئی محبوبہ کو بھی ساتھ میں لانا دیکھو

آخر مسعود جنگ کے عشقیہ Career کا کلائمکس آپہنچا۔ ایک لڑکی نے مسعود جنگ سے فرمائش کی کہ وہ اُسے رات گھر سے بھگالے جائیں۔ ہم سب نے منع کیا بھی اس لڑکی کے سارے خاندان کے افراد ہیوی ویٹ ہیں یہ لڑکی بھی شادی کے بعد ہیوی ویٹ بن جائے گی۔ مگر مسعود جنگ نہ مانے۔ ادھر کسی طرح لڑکی کے باپ کو پتہ چل گیا تھا۔ اُس نے اس خوبصورت لڑکی کی جگہ اپنی ایک بدصورت لڑکی کھاگنے کے اسٹارٹنگ پائنٹ پر رکھدی۔ مسعود جنگ اسے بھگالے گئے۔ باپ نے تیار پولیس کی مدد سے انہیں دھرلیا۔ اندھیرا تھا مسعود جنگ نے کہا 'میں اس لڑکی سے شادی کرونگا۔ اسی وقت قاضی فراہم ہوا اور شادی ہوگئی۔ اب جو روشنی میں دیکھتے ہیں تو 'ہائے لٹ گیا' کے نعرہ کے سوا اور کیا ہوتا۔

اب یہ حال ہے کہ مسعود جنگ اپنی بیوی کے ساتھ دعوت میں جاتے ہیں تو بیرا کہتے ہیں "آپ اپنی ماتاجی کو ادھر بٹھا دیجئے۔ بیچے ان کی کوئی بات نہیں مانتے کہ اتنی بڑی غلطی کرنے والے کی عقل پہ بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔

دوست احباب گھر پر نہیں جاتے چونکہ معمولی سی بات پر ان کی بیوی نے مسعود جنگ اور ان کے دوست فقیر شیر کو گھر سے باہر پھینکدیا تھا۔ مسعود جنگ کا کوفت اور افسوس میں یہ حال ہے کہ ایک دفعہ جانماز پر بیٹھے تسبیح پھیر رہے ہیں غور سے سنا تو درود شریف کی بجائے نادانستہ طور پر "محبت کی بڑی بھول کی' محبت کی بڑی بھول کی" پڑھ رہے ہیں۔ ▲ !!

غزل

سید معراج الدین احمد ۔ حیدرآباد

نفع سب غیروں کی خاطر ہے ضرر میرے لیے
دشمنوں کے واسطے ہندسے صفر میرے لیے

عاشقی میں جوتیاں کھانے کی عادت پڑگئی
گالیوں میں اب نہیں کوئی اثر میرے لیے

گھاٹ کا رکھا، نہ گھر کا اس گرہستی نے مجھے
بند رہتا ہے ہمیشہ میرا گھر میرے لیے

کم نہیں ہوتا کسی تدبیر سے دیوانہ پن
ہیں پریشان شہر بھر کے ڈاکٹر میرے لیے

کاتب تقدیر کو بھی تھا مجھی سے اختلاف
ہر جگہ کا لکھ دیا پیدل سفر میرے لیے

○

جنس میں انقلاب دیکھا ہے

جوہر سیوانی

عالم انتخاب دیکھا ہے
طاقتوں کا شباب دیکھا ہے

ہم نے شہزادیٔ سیاست کو
جابجا بے حجاب دیکھا ہے

بعد آزادیٔ وطن میں نے
کچھ عجیب انقلاب دیکھا ہے

ق

باربردار جو تھا دھوبی کا
اس کو عزت مآب دیکھا ہے

علم ناکام جس جگہ ہے وہیں
جہل کو کامیاب دیکھا ہے

ایک مصرع جو کہہ نہیں سکتا
اس نے شہرت کا خواب دیکھا ہے

بورڈ کے امتحان میں میں نے
کچھ انوکھا حساب دیکھا ہے

ق

نو رچشموں کو بے دھڑک لکھتے
رکھ کے آملگے کتاب دیکھا ہے

پاس ہونا تھا عشق میں جس کو
اس کو خانہ خراب دیکھا ہے

زن نما مرد بنتے جاتے ہیں
جنس میں انقلاب دیکھا ہے

اشک زن سے بجھا جلال مرد
آگ کو زیر آب دیکھا ہے

دل حاسد کو بزم میں جوہر
جل کے ہوتے کباب دیکھا ہے

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی

چیف منسٹر شری ٹی انجیا

ملک میں سب سے زیادہ ہتھ کرگھے آندھرا پردیش میں ہیں جن کی تعداد ۶ لاکھ ہے تقریباً تیس لاکھ افراد کا دارومدار اس صنعت پر ہے۔ حالیہ برسوں میں ہینڈلوم صنعت کی تیار کردہ اشیاء اور ان کی فروخت کے اعتبار سے یہ صنعت بہت آگے نکل چکی ہے۔

ریاست میں ہینڈلوم کی سالانہ پیداوار اور پانچویں پنچسالہ منصوبے کے اختتام یعنی سال ۸۰-۱۹۷۹ء تک اسّی کروڑ روپے کی متاثر کن مالیت تک پہونچ گئی ہے۔ مقدار کے اعتبار سے سالانہ پیداوار ۳۲۰ ملین میٹر تک پہونچ گئی ہے۔ ہینڈلوم صنعت کو کوآپریٹیو شعبہ کے تحت بننے کے کام کو اولین فوقیت دی گئی اور اس طرح ۲٫۲۸ لاکھ ہتھ کرگھے کو کوآپریٹیو شعبے کے تحت لئے گئے ہیں جس کی بدولت دور دراز دیہاتوں میں پھیلے ہوئے بشیتر بافندوں کو باقاعدہ طور پر مالی اور خام اشیاء کی سربراہی میں سہولت ہو گئی، چھٹے پنچسالہ منصوبے کے دوران مزید ایک لاکھ ہتھ کرگھوں کو کوآپریٹیو شعبے کے تحت لے لیا جائے گا۔

کاروباری سرمایہ اور مارکٹ سہولتوں کی عدم دستیابی کی وجہ سے بے کار پڑے ہوئے تقریباً ۱٫۷۵ لاکھ لومس کو پھر سے کارکرد بنانے کی تجویز ہے، چھٹے پنچسالہ منصوبے کے دوران اس مقصد کے لئے ۵۰۰ لاکھ روپیے مختص کئے گئے ہیں۔ پرائمری ویورس سوسائیٹیوں کے سرمایہ حصص کی رقم ۷۶-۱۹۷۵ء میں ۱۳۹ لاکھ روپیے سے بڑھ کر سال ۸۱-۱۹۸۰ء تک ۵۹۵ لاکھ تک پہونچ گئی ہے۔ ریزرو بنک کی جانب سے قرضوں کی سہولتوں میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے، یعنی یہ رقم سال ۱۹۷۵ء میں ۱۵۸ لاکھ روپیے سے بڑھ کر سال ۱۹۸۱ء میں ۸ کروڑ روپیے تک پہونچ گئی ہے۔ پرائمری سوسائیٹیوں کو مارکٹ کی سہولتیں پہونچانے کیلئے اپکس ویورس کوآپریٹیو سوسائیٹیوں کی امداد بھی کی جاتی ہے۔ چھٹے پنچسالہ منصوبے کے دوران اس مقصد کیلئے ۲۰۰ لاکھ روپیے منظور کئے گئے ہیں۔ اپکو کے تحت جملہ ۲۳۴ کپڑے کی دوکانیں اور ۵ ہینڈلوم ہاؤز کام کر رہے ہیں۔ اپکو کے کاروبار اندرون و بیرون ریاست ۷۶-۱۹۷۵ء میں ۶۷۴ لاکھ روپیے سے بڑھ کر ۸۱-۱۹۸۰ء میں ۲۲۳۲ لاکھ روپیے تک پہونچ گئے ہیں۔

(سلسلہ صفحہ ۸۴ پر)

بھارت چند کھنہ

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

پندرہ اپریل سنہ ۱۹۸۱ء کی شام کو بیوی اور میں تیسری
بہ ہندوستان سے کنیڈی ہوائی اڈے پر اترے۔ ریاست نیوجرسی
شہر نیوپراویڈنس میں ہمارے قیام کے پہلے تیس دن کچھ ایسی
ری سے گزر گئے جیسے حیدرآباد کی راتوں میں اس شہر نگاراں کے مچھر
سدِ خون کا اعلان اور تکمیل کر کے سونے والوں کو ہوشیار رہنے کا
ندلیہ دیتے ہوئے گزر جاتے ہیں ——————

سترہ اور اٹھارہ مئی کی درمیانی رات ہم سب گھر والے [سوائے
دو بچوں کے جو نو بجے سُلا دیئے گئے تھے] ٹیلی ویژن
پر خبریں دیکھ اور سُن کر بارہ بجے اپنے اپنے
بستروں میں پڑ گئے۔ بستر میں پڑ کر
جب مجھے کچھ بے چینی
سی محسوس ہوئی
تو میں
نے اُٹھ کر دو گھونٹ پانی پیا اور نیند کو بلانے کے لئے سگریٹ کے تین
چار زور دار کش بھی لگائے کہ یہ نسخہ میرا آزمودہ تھا، مگر یہ رات کچھ
نئی قسم کی رات تھی۔ نیند لانے اور گھبراہٹ مٹانے کی میری ہر کوشش
رائیگاں ہوئی۔ بے چینی، بے چینی سے بڑھ کر دم گھٹنے کی کیفیت میں
پہنچ گئی اور پھر مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے میری چھاتی پر کوئی
ہاتھی بیٹھ گیا ہے۔ اور باوجود اس کے کہ ہندوستانی فلموں میں دل کا
دورہ پڑنے والوں کی طرح میں نے واویلا مچاتے ہوئے،
لڑکھڑا کر کسی میز کا سہارا لیتے ہوئے میز کے ساتھ
خود کو نہیں گرایا یا سیڑھیوں پر سے لڑھکتے
ہوئے میں نچلی منزل پر نہیں جا
پہنچا تھا۔ گھر والے میری
کیفیت سے
پوری

طرح آگاہ ہو چکے تھے۔ میرے داماد ڈاکٹر بریشن نے تو ایمبولنس کے لئے بھی فون کر دیا تھا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ شاید آپ چاریہ بصورت جو بلا اطلاع دیئے تشریف لے آئے ہیں اور میری چھاتی پر بیٹھے روایات کے مطابق میری جان قبض کر رہے ہیں کہ اتنے میں ایمبولنس گھر کے دروازے پر آ کھڑی ہوئی پانچ منٹ کے اندر اندر مجھے اسٹریچر پر لٹا کر ایمبولنس میں پہنچا کر آکسیجن دیتے ہوئے ایمبولنس گھر کے نزدیک ترین ہسپتال (OVER LOOK) پہنچ رہی تھی۔ یہاں خصوصیت سے جو بات قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ دم لینے میں دشواری محسوس کرنے کے آدھ گھنٹہ میں ہسپتال کے INTENSE CARE وارڈ میں ان تمام ضروری احتیاطی تدابیر اور علاجوں سے فیضیاب ہو رہا تھا جو قلب کا دورہ پڑنے والے مریضوں کے لئے ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ گلوکوز اور آکسیجن نے ایک گھنٹہ میں میری کایا پلٹ دی تھی۔

جب صبح ہوئی تو رات کا واقعہ افسانہ معلوم ہوتا تھا۔ میں یہ سوچنے لگا تھا کہ ممکن ہوا تو اگلے دن گھر جانے کی اجازت مل جائے گی۔ میری حالت میں حیرت انگیز تبدیلی دیکھ کر ڈاکٹر بھی حیران تھے۔ دن کے بارہ بجے کے قریب حاجاتِ ضروریہ سے فارغ ہو کر جب میں بستر پر لیٹا تو یکلخت سانس لینے کی ہمواری اور مسلسل یکسانیت میں کچھ ایسی برہمی پیدا ہوئی کہ رات والا واقعہ اس کے مقابلے میں محض ایک ابتدائی ریہرسل معلوم ہوتا تھا۔ مگر اس حملہ کو بھی گلوکوز اور آکسیجن کی فراہمی نے پھر سنبھالا دیا۔ رات آرام سے گزری۔ طبیعت ذرا سنبھلی تو میں پھر ہوائی قلعے تعمیر کرنے لگا اور گھر جانے کی اسکیمیں بنانے لگا۔

دراصل میں نے اپنے لئے ایک بیوقوفوں کی جنت بنا رکھی تھی جس میں مجھے پورا پورا یقین اس بات کا تھا کہ میں سوائے عارضۂ قلب کسی بھی دوسری بیماری کا شکار ہو سکتا تھا۔ اور جو کچھ دو مرتبہ ہو چکا تھا وہ محض ایک فلوک (FLUKE) تھا۔ ایسا سمجھنے کی وجہ یہ تھی کہ میں نے اپنی زندگی کے پچھلے ۲۵ سالوں میں دن میں صرف ایک مرتبہ کھانا کھایا۔ مرغن غذاؤں سے احتراز کیا اور اچھی خاصی ورزش جاری رکھی تھی۔ اس کے علاوہ پابندی سے دس بجے رات سے پہلے سو جانے کے سنہری اصول پر بھی عمل کیا تھا اور پھر مجھے خون کے دباؤ کی شکایت کبھی نہیں ہوئی تھی اور میرا جسم بھی بھاری نہیں تھا اور گزشتہ چار پانچ سال سے وزن بڑھا نہیں تھا۔

بہرحال ڈاکٹر فیری ماہرِ قلب دوسرے دن مجھ سے ملے اور امریکی طرزِ مخاطبت کے مطابق "ہائے" کہہ کر میرے پلنگ کے پاس بیٹھ گئے۔ کہنے لگے کہ مجھ سے کچھ کہنا ہے "ہائے" کے جواب میں "ہا" اور "آہ" سے مل کر پیدا ہونے والی نحیف سی آواز میرے منہ سے نکلی اور میں نے ان کو ارشاد فرمانے کے لئے کہا۔ ڈاکٹر فیری نے بتلایا کہ کل میرے قلب پر ایک نہایت زبردست حملہ ہوا تھا مگر خوش قسمتی سے میرے دل کو ناقابلِ مرمت نقصان نہیں پہنچا تھا۔ اس لئے پہلی بات تو یہ ہے کہ تم آئندہ کبھی بھی سگریٹ نہیں پیو گے۔ اور دوسری یہ کہ ہمارے دل کا آپریشن کیا جانا ضروری ہے۔ میں نے جواباً عرض کیا کہ آپریشن کے بارے میں وہ میرے داماد اور لڑکی سے بات کر لیں۔ البتہ سگریٹ نوشی میں از خود چھوڑ چکا ہوں۔ اور اس طرح نکوٹین کی دیوی سے جس کی پرستش ہم چالیس پینتالیس سال سے کر رہے تھے ہم نے مجبوراً اور بادلِ ناخواستہ ناطہ توڑ دیا۔

ڈاکٹر فیری نے یقیناً میرے داماد اور لڑکی سے آپریشن کے بارے میں بات کر لی ہوگی کیونکہ سوال محض آپریشن کرنے کی اجازت لینے کا نہیں تھا بلکہ ہسپتال میں رہنے اور آپریشن کے اخراجات کی ادائیگی کا تھا۔ اور اس آپریشن کروانے میں کم از کم بیس ہزار ڈالر کے مصارف یقینی تھے۔ اور ڈالروں کے تعلق سے میری مالی حالت ویسی ہی خوار و زار تھی جیسی میرے دل کی۔ اس وقت امریکہ میں اگر کسی اعتبار سے میری حالت اعلیٰ درجہ کی تھی تو وہ صرف دل کے مریض کی حیثیت سے تھی۔

اس کے بعد دو مرتبہ مجھے آپریشن کا بکرا بنایا گیا۔ پہلی مرتبہ ایک کالے صاحب

شام کے آٹھ بجے کے قریب میرے پاس
آئے اور "ہائے" کہہ کر نام دریافت کیا' اور
اس بات کا اطمینان کر لینے کے بعد کہ میں
میں ہی یعنی "کا بانہ" تھا کہنے لگے کہ وہ مجھ کو
کل کے آپریشن کے لئے تیار کرنے کے لئے
آئے تھے۔ ایک پولی تھین کے تھیلے میں سے
انھوں نے پلاسٹک کا سیفٹی ریزر نکالا' اور
اس سے میری رانوں وغیرہ کے بال کاٹے اور
شب بخیر کہہ کر چلے گئے۔

دوسرے دن CARDIAC
CORONARY یا CATHETERIZATION
ANJIOGRAM کے طریقے کے ذریعہ
دل سے لگی نالیوں میں ایک نہایت باریک
ٹیوب ڈال کر وہ تین صحیح مقام دریافت
کئے گئے جہاں خون کے جانے کے راستے
تنگ ہو گئے تھے۔ دل میں خون رگوں کے
ذریعہ آتا ہے اور نالیوں کی راہ واپس جسم
میں جاتا ہے۔ ہمارے بزرگوں نے یہ بالکل
صحیح فرمایا ہے کہ انسان کے ہر ایک مکمل
سانس لینے میں دو موقعے ایسے آتے ہیں'
جب وہ مر سکتا ہے۔ یعنی ایک اس وقت
جب اندر لیا ہوا سانس باہر نہ جائے اور
دوسرے اس وقت جب باہر گیا ہوا
سانس واپس نہ آئے۔ یہ آپریشن اوورلک
ہسپتال میں ہوا۔

اس کے بعد مجھے اسرائیل میڈیکل
سنٹر ہسپتال میں منتقل کر دیا گیا کیونکہ اوور
لک ہسپتال میں OPEN HEART SURGERY
کا انتظام نہیں تھا۔ چار پانچ دن تک
مختلف ڈاکٹروں نے مجھے اس زاویۂ نظر سے
پرکھا کہ آیا آپریشن کے لئے مجھ میں کوئی
خامی تو نہیں تھی۔ آپریشن کی تاریخ مقرر کی
گئی اور ایک مرتبہ پھر مجھے آپریشن کے لئے تیار
کیا گیا۔ اس مرتبہ جسم کو
بالوں سے نجات دلائی گئی۔ ماہر حجامت
نے جاتے ہوئے نہ صرف شب بخیر کہا بلکہ
خوش قسمتی کی دعا سے بھی نوازا۔

دوسرے دن آپریشن کرنے کی اجازت
حسب معمول تحریراً مجھ سے بھی حاصل کی گئی'
تاکہ اگر مریض آپریشن کی تاب نہ لا سکے اور
ملکِ عدم کو آپریشن کی میز پر ہی سے رخصت
ہو جائے تو سرجنوں کے خلاف عدالتی چارہ جوئی
نہ کی جا سکے۔ مجھے یہ بتلایا گیا تھا کہ "دل کھول کر"
آپریشن کا طریقہ گو اب عام ہے۔ پھر بھی کامیابی
کا اوسط نوے فیصد ہے۔

آپریشن سے پہلے کی رات میں نے خط
لکھنے کے پیڈ پر احتیاطاً ایک نوٹ لکھ دیا'
جس کے پڑھنے کی ضرورت آپریشن کے بعد
محسوس نہیں کی گئی۔ یہ کوئی ایسا نسخہ نہیں تھا
جو سینہ بہ سینہ بزرگوں سے ہم تک پہنچا
تھا بلکہ یہ ایک قسم کی آخری تحریر ہو سکتی تھی جس
کا مضمون یہ تھا:

" اگر میں کل آپریشن کی میز پر اپنے کیفر کردار
کو پہنچ جاؤں تو مجھے اس کا کوئی افسوس نہ
ہوگا کیونکہ میں ایک مکمل زندگی گزار چکا ہوں
جس کا سب سے قابلِ ذکر کارنامہ یہ ہے
کہ میں کسی کا ایک پھوٹی کوڑی کا بھی مقروض
نہیں ہوں۔ میری آخری خواہش یہ ہے کہ
میرے چلے جانے کا کوئی غم نہ کرے' اور
میرے جسدِ خاکی کو جس قدر جلد ہو سکے بغیر
کسی کا انتظار کئے' راکھ بنا کر گھر سے نزدیک
ترین دریا میں بہا دیا جائے۔"

جب سے میں بیمار ہوا ہوں میری
بیوی' داماد اور لڑکی نے ہر اعتبار سے جس
قدر ممکن ہو سکتا تھا' میری جتنی خدمت
کی ہے اس کو بیان کرنا ممکن نہیں۔ میرے
لئے یہ بھی ناممکن ہے کہ زندگی کے جس مرحلے
میں اب میں ہوں' ان کی انتھک خدمت
بے پناہ محبت' خلوص اور توجہ کا کوئی صلہ
دے سکوں۔ اس کا صلہ ان کو اوپر دیا جائے
گا۔ کیونکہ یہ کسی انسان کے بس کی بات نہیں
سچ تو یہ ہے کہ انسانوں سے اس قسم کا ایثار
دیکھ کر اب تو جی چاہتا ہے کہ ایک دفعہ
دل کا دورہ پڑے تاکہ اس قسم کی محبت
نچھاور ہونے کا مزہ پھر سے اٹھا سکوں۔

مجھے اس بات کا بھی بے حد افسوس
ہے کہ میں نے گزشتہ دو مرتبہ امریکہ جاتے
اور میری صحت کا بیمہ کرا دیئے جانے کے
باوجود بیمار نہ ہو کر اپنے سخت جان ہونے
کا ثبوت فراہم کر کے ایک طرح سے اپنے
داماد اور لڑکی کو ایسا دھوکہ دیا کہ اس مرتبہ
وہ ہماری صحت کا بیمہ کروانے پر رقم صرف
کرنا نامناسب سمجھ کر ایسی کیفیت میں پہنچ
گئے ہیں جس میں بھاری مالی صرفہ ناگزیر ہو گیا

میرے رخصت ہونے کے بعد
میرے پھٹے پرانے کپڑوں، ٹوٹے پھوٹے
برتنوں اور دیگر حقیر چیزوں کی مالک بلا
شرکتِ غیرے میری بیوی ہوگی۔"

دوسرے دن آپریشن ہوا اور
چھ گھنٹے تک ہوتا رہا جس کا مجھے کچھ بھی
علم نہیں۔ مجھے بتلایا گیا کہ دورانِ آپریشن
دل کی حرکت بند کردی جاتی ہے مگر دل
کا کام مشینوں کے ذریعہ جاری رکھا
جاتا ہے۔ بہرحال بعد میں معلوم ہوا کہ
سب کچھ ٹھیک ہوا اور کوئی بات
خلافِ توقع نہیں ہوئی۔ میں سوچتا ہوں
کہ اگر روح کوئی چیز ہے تو یہ اس وقت
کہاں تھی۔ جب دورانِ آپریشن دل کی
حرکت بند کردی گئی تھی؟ شاید آپریشن
تھیٹر کے کسی کونے میں دُم دبائے دبکی بیٹھی
ہوگی اور نتیجہ کی منتظر۔۔!

بہرحال ہم تقریباً تین ہفتہ تک
دو ہسپتالوں میں رہے۔ اس دوران
بہت سے ماہرانِ اعضائے جسمانی نے
ہمیں ٹھوک بجا کر پرکھا مگر ایسا کرنے سے
پہلے وہ احتیاطاً میرے خون کا نمونہ ضرور
حاصل کرلیتے تھے۔ اس طرح اکیس دنوں
میں کم از کم چودہ مرتبہ ایسا ہوا کہ کوئی نرس
صبح صبح ہی آجاتی اور اس بات کا یقین
ہوجانے کے بعد کہ میں "کاہانہ" ہی ہوں،
فوراً ایک فیتہ میرے بازو پر باندھ کر
کچھ ایسی پھرتی سے خون ٹیوبوں میں بھر کر
لے جاتیں کہ آخر آخر میں تو مجھے ایسا محسوس
ہونے لگا کہ شاید میرا یہ خون بیچا جاتا ہے
بس یوں سمجھئے کہ ان نرسوں کا ؎

ان کا شیوہ تھا کہ ملتے ہی بہانہ کوئی
خون لینے کا وہ گھڑ لیں فسانہ کوئی

آج کل تیمار داری کچھ ایسی ہمہ گیر قسم
کی ہو رہی ہے کہ میں ٹھیٹھ حیدرآبادی محاورے
کے مطابق "کاٹھ کا سامان" بن کر رہ گیا ہوں۔
جس کو بعض اوقات ایسی شئے بھی سمجھا
جاسکتا ہے جو:۔
"کام کا نہ کاج کا۔ دشمن اناج کا" بن
گیا ہو۔

دل کھول آپریشن کروانے کے بعد میں
ان چند نصائح پر پہنچا ہوں کہ:

(ا) گاڑھے خون پسینہ کی کمائی پر فخر کرنا
سخت نادانی ہے کہ گاڑھا خون کسی حالت
میں بھی دل کو گوارہ نہیں ہوتا۔

(ب) اس آپریشن کے بارے میں یہ بھی
سوچتا ہوں کہ اس پر کئے گئے مصارف
سے شاید بھاگتے چور کی لنگوٹی کے طور
پر میرے داماد اور لڑکی کو انکم ٹیکس
کی ادائیگی میں کچھ کمی ہوجائے۔

(ج) اور بالآخر ؎

چار دن گر زندگانی اور ہے
فیس اطباء تم کو پانی اور ہے

عوض سعید

"نعیم زبیری"

میری زندگی میں حادثوں کا ہمیشہ بڑا دخل رہا ہے۔ نعیم زبیری کی دوستی بھی ان ہی حادثوں میں سے ایک ہے۔ پہلی ملاقات پر جب میں نے چائے پیش کی تو وہ طشتری پھوڑ بیٹھا۔ دوسری دفعہ کپ اُس کے ہاتھ سے چھُوٹ گیا۔ میں نے سوچا۔ عجیب ہونق آدمی سے سابقہ پڑا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ حضرت مراسلہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ افسانہ نگار بھی ہیں۔ اور آئے دن کپ اور ساسر پھوڑنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔

اب مجھے موصوف کے حدودِ اربعہ کو سمجھنے میں آسانی ہوگئی۔ ایک دن وہ عجیب و غریب انداز میں میرے پاس آیا۔ اس وقت وہ سرتاپا اسرار آدمی لگ رہا تھا۔

"میں نے ایک ادبی انجمن قائم کی ہے: ارتقائے ادب۔"

"اچھا تو پھر ـــــ"

"پھر کیا۔ چند تمہیں بھی آنا ہوگا۔" وہ یہ (Adjective) اس بے تکلفی سے کہہ گیا کہ میں اس کے چہرے کو حیرت سے تکتا ہی رہا۔ پھر اس نے بڑی ڈھٹائی کے ساتھ ان شاعروں اور ادیبوں کے نام گنوائے جو میرے حافظہ میں دور دور تک نہ تھے۔

"یہ کون لوگ ہیں۔؟" میں نے اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کی نیت سے پوچھا۔

"یہی لا یعنے میٹ اللہ قریشی، محمود الحسن اور مرزا طغرل بیگ اور کون؟"

"تب تو تمہاری انجمن میں شریک ہونا ہی پڑے گا۔"

میرے اس جواب پر اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "ظاہر ہے۔"

اور میں بڑی دیر تک اس "ظاہر ہے" کے مزے لوٹتا رہا۔

ارتقائے ادب کے دو چار جلسے میں نے بھی اٹنڈ کئے۔ کچھ نہیں تو میں نے وہاں ایک خاص بات یہ دیکھی کہ ایک صاحب کونے میں بیٹھے ہمیشہ "نے" کی غلطی نکالا کرتے تھے جن کا تعلق یوپی سے تھا۔ اور وہ شائد غلطی سے دکن میں پیدا ہو گئے تھے۔ ان کی پیدائش کے اس چھیلے سے فائدہ اُٹھا کر وقتاً فوقتاً ہم نے بھی اپنی گرامر کچھ درست کرلی۔ لیکن یہ علاحدہ بات ہے کہ وہ ہمیں قواعد سکھاتے سکھاتے خود اپنی زبان بھول بیٹھے۔ اور اس طرح ثوابِ جاریہ کا یہ سلسلہ اچانک ٹوٹ گیا۔

اپنی انجمن کا دیوالیہ نکالنے کے بعد وہ مدتوں خوش خوش اس طرح پھرتا رہا جیسے دو جہاں کی نعمتیں اسے اچانک میسر آگئی ہوں۔ ان دنوں نعیم اپنی ساری حماقتوں کے باوجود مجھے عزیز تھا اور آج بھی اپنی خوبیوں اور خامیوں سمیت وہ میرا سب سے قریبی یار ہے۔

شروع شروع میں، میں نے اسے ایک یوں ہی سا افسانہ نگار سمجھ رکھا تھا۔ لیکن ایک دن اچانک کسی نے کہا کہ وہ عوامی مصنفین کے جلسے میں اپنی تازہ کہانی سُنا رہا ہے۔ میں نے سوچا۔ وہ بھی اَور افسانہ نگاروں اور شاعروں کی طرح ریل کا پہیئہ ضرور جام کرے گا۔ کیونکہ ۵۲ - ۵۴ء تک اَدب کا کچھ یہی عالم تھا۔ لیکن جب اس نے ہانپتے کانپتے اپنی کہانی "بیڈ نمبر 26" ختم کی تو مجھے احساس ہوا کہ یہ کم بخت تو آگے چل کر بہت سوں کا بیڑہ غرق کردے گا۔ لیکن نعیم کی یہ شرافت تھی کہ اس نے اپنا ہی بیڑہ غرق کرلیا۔ اور رفتہ رفتہ لوگ بھول گئے کہ نعیم زبیری نام کا کوئی افسانہ نگار بھی کبھی حیدرآباد میں ہوا کرتا تھا۔

وہ کہانی جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے وہ "بریت لڑی" میں شائع ہوئی تھی۔ وہ مدتوں 'بریت لڑی' کا پرچہ ہاتھ میں تھامے حیدرآباد کی سڑکوں پر گھومتا رہا لیکن پھر بھی لوگ یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوئے کہ وہ کہانی نام کی کوئی چیز بھی ہے۔ پھر کچھ ایسا ہوا کہ اس نے پے در پے ہلکی پھلکی فارمولا ٹائپ کہانیاں بھی لکھ دیں جو مقامی روزناموں اور گمنام پرچوں میں چھپتی رہیں۔

نعیم کا خیال ہے کوئی پرچہ خراب نہیں ہوتا۔ لکھنے والا خراب یا اچھا ہوسکتا ہے۔ چنانچہ اس کے لکھنے اور چھپنے کا ایک طویل سلسلہ اسی استدلال کو صحیح ثابت کرنے ہی میں گذر گیا۔ نعیم پھر ایک بار گمنامی کے غار میں جا چھپا اور صرف مقامی ادیب بن کر رہ گیا۔ اس جلے خواہ مخواہ یہ احساس اُبھرتا ہے کہ وہ کبھی شہرت کا حامل بھی رہا ہو۔ شہرت سے تو وہ ہمیشہ کوسوں دور رہا ہے۔ نعیم نے شروع ہی سے اگر معیاری پرچوں کی طرف توجہ کی ہوتی تو اُس نے آج گمنامی کی برکتوں کو یوں دو دو ہاتھوں لوٹا نہ ہوتا۔

ایک دن میرے اصرار پر اس نے اپنی کہانی "شکست" اَدبِ لطیف کو بھجوائی۔ مرزا ادیب نے لکھا کہ شکست ایک اعلیٰ درجے کی تخلیق ہے۔ لیکن یہ لکھ کر اُنہوں نے ادبِ لطیف کی ادارت ہی چھوڑ دی۔ اور ادبِ لطیف دوسروں کے قبضے میں چلا گیا اور اس طرح نعیم پھر ایک بار مارا گیا۔ اور شکست کی اشاعت کسی معیاری پرچے کی بجائے ایک معمولی سے پرچے میں ہوگئی۔

شکست کی اشاعت کے بعد اس کے ایک قاری نے باغِ عامہ سے گذرتے ہوئے نعیم کو دیکھ کر ایک ہانک لگائی — "نعیم بھائی، کہانی پسند آئی۔"

پتہ نہیں، اپنے اس اکلوتے قاری کی تعریف سے وہ آج تک کیوں شرمندہ ہے۔ کبھی کبھی وہ پُر لطف انداز میں یہ بھی کہتا ہے۔ زمانہ ہو گیا ہے۔ نعیم بھائی کہانی پسند آگئی کہہ کر سیکل سے اُلٹے منہ گر جانے والا قاری بھی اب ڈھونڈوں نہیں ملتا۔

پھر کافی عرصہ گذر جانے کے بعد میں نے اسے ورغلایا کہ "اوراق" کے لئے وہ ڈاکٹر وزیر آغا کے نام ایک کہانی داغ دے۔ پہلے

ٹال مٹول کرتا رہا۔ پھر جب میرا اصرار بڑھا تو اس نے کہانی بھجوادی۔ اور جب وزیر آغا نے مہینوں گذر جانے کے بعد بھی کوئی جواب نہیں دیا تو وہ نہ مایوس ہی ہوا اور نہ اُداس۔

لیکن ایک دن اچانک میرے پاس "اوراق" کا افسانہ نمبر آیا تو اس میں اس کی کہانی بھی شامل تھی۔ ایک دن ملاقات ہونے پر میں نے جب اس سے پوچھا۔ "نعیم کیا تمہارے پاس بھی "اوراق" آیا ہے؟"

اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "اوراق تو نہیں مبین خاور قمی کا انگار سے ضرور آیا ہے۔"

"کیا اس میں بھی تمہاری کہانی شامل ہے؟" میں نے شرارت سے پوچھا۔

میری شرارت کو بھانپتے ہوئے اس نے کہا۔ "مذاق چھوڑو۔ پہلے یہ بتاؤ اوراق میں میری کہانی شامل بھی ہے یا نہیں۔"

پھر میں نے جب گھر پہنچ کر اسے اوراق کا افسانہ نمبر دکھایا تو وہ کچھ بوکھلا سا گیا۔ میں نے پہلی بار نعیم کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک دیکھی۔

"مردود وہ پرچہ مجھے دے دو۔"

کافی ستانے کے بعد میں نے اس کے ہاتھ میں اوراق تھما دیا۔ جس میں میری بھی کہانی شامل تھی۔ لیکن شائد بعد میں نعیم بھائی 'کہانی پسند آئی' کہنے والے قاری نے اُسے ہتیا لیا اور کسی کباڑے کے ہاں اُسے فروخت کر دیا۔

مجھے حبیب نگر والا وہ تنگ اور تاریک کمرہ آج بھی یاد ہے۔ جہاں اُسے میں نے کئی بار خون اُگلتے دیکھا تھا۔ اُسے دِق تھی اور وہ دِق کے تیسرے اسٹیج پر بھی اس طرح مطمئن تھا جیسے اُسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اب تو وہ کچھ اتنا بھلا چنگا ہو گیا ہے کہ آپ اس سے بہ آسانی ہاتھا پائی کر سکتے ہیں۔

دوستی کے باب میں اس کے سوچنے کا انداز اور رویہ عام شرفاء سے بالکل جُدا ہے۔ مہینوں بعد بھی اگر آپ اس سے ملیں تو آپ سے یہ نہیں پوچھے گا کہ تم اب تک کہاں روپوش تھے۔ اس کی اس سرد مہری سے اُلٹا کر اگر اس کا کوئی ساتھی خدا حافظ کہنے کے لئے ہاتھ بڑھا دے تو وہ فوراً اسے خدا حافظ کہہ دے گا۔ خواہ وہ شخص اس کا محسن ہی کیوں نہ ہو۔

اس کے قریبی دوست پدما راؤ کو بھی اس سے یہی شکایت ہے کہ خدا حافظ کہنے پر وہ مروتاً بھی کبھی یہ نہیں کہے گا۔ "ابھی تو آپ آئے ہیں، کچھ دیر رُک جائیے۔" ایسے وقت اس کا لمبا ہاتھ اور لمبا ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو وہ اپنے ساتھی کو رخصت کرتے ہوئے انگلیوں کی بجائے کہنی سے بھی کام لیتا ہے، اور اپنے اس عمل کو اس نے "اضطراری کیفیت" کا نام دے رکھا ہے۔

اس کے دوستوں کا حلقہ کافی وسیع ہے۔ اِن میں تعلیم یافتہ بھی ہیں اور اَن پڑھ بھی۔ شریف بھی ہیں اور حد درجہ بدمعاش بھی نعیم دوستی کے معاملہ میں کچھ اتنا چالاک ہے کہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کس قماش کے ساتھی کو زیادہ عزیز رکھتا ہے۔

وہ ریس نہیں کھیلتا ۔ شراب نہیں پیتا۔ عشق نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ پان تک نہیں کھاتا۔ ہاں سگپاری ضرور کھاتا ہے۔ بلکہ پھانکتا ہے۔ اگر آپ پلیٹ بھر سپاری بھی اس کے سامنے رکھ دیں تو اسے "گرین پیس" سمجھ کر کھا جائے گا۔ وہ ایسے ہی گھر میں زیادہ دیر بیٹھ سکتا ہے جہاں اچھی چائے کے ساتھ سپاری بھی اسے کھانے کو ملے۔

چائے بھی اس کی کمزوری ہے۔ کھانے سے اُسے کوئی خاص رغبت نہیں۔ اچھی پتی کی بنی ہوئی چائے کا وہ دیوانہ ہے۔ اس سلسلہ میں اسکی دیوانگی کا یہ عالم ہے کہ اگر اسے یہ علم ہو جائے کہ ناگپور میں کسی چائے ڈیلر کے پاس ایک نئی اور قیمتی پتی آئی ہے تو وہ بے اختیار وہاں بھی پہنچ جائے گا۔ خواہ اسے قرض ہی لینا کیوں نہ پڑے۔

وہ لائف انشورنس کی افادیت کا بھی قائل ہے۔ اپنی پالیسی کو "Mature" ہونے کی منزل تک پہنچانے سے پہلے ہی ایک گمبھیر مانس کے ساتھ چپکے سے چندہ فنڈ میں شامل ہو جاتا ہے۔ اور ہر اج کے موقع پر بولی دینے والوں میں سب سے اونچی اسی کی آواز ہوتی ہے۔ ان تمام اُلجھنوں کے باوصف اس کے ہاں اسکوٹر بھی ہے۔ وہ ایسے ساتھیوں کو ضرور لفٹ دیتا ہے جن کے ہاں کن وینس نہ ہو۔ وہ تو اس معاملہ میں اتنا شریف ہے کہ راستے میں اپنے دھوبی کو پیدل جاتا دیکھ کر بھی وہ لفٹ دینے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا۔ خواہ اس کے سر پر کپڑوں کا انبار ہی کیوں نہ ہو۔

بیکاری کے دنوں میں کبھی وہ صحافت سے بھی وابستہ رہا۔ ایک ہفتہ وار پرچے کی ادارت بھی کی۔ پبلشر کا بیڑہ غرق کرنے کے بعد صحافت سے اچانک ناطہ توڑ لیا۔ نئی کتابیں خریدنا اور 'عالمِ کڑکی' میں اُنہیں پڑھ کر فٹ پاتھ پر بیٹھنے والے کسی بھی کباڑیے کو اونے پونے داموں بیچ دینا اس کا ایک خاص مشغلہ ہے۔ اس لئے اس کے بک شلف میں آئے دن کتابیں گھٹتی رہتی ہیں۔ نعیم کتابوں کے سلسلے میں حد درجہ غیر ذمہ دار ہے۔ اس لئے اگر وہ کبھی آپ سے کوئی کتاب مانگے اسے ہرگز نہ دیجئے۔ اگر مانگی ہوئی کتاب پر ڈسٹ کور نہ ہو تو اس کی بدصورتی کو ڈھانکنے کے لئے وہ کوئی خوبصورت سا کور چڑھا دے گا، تو آپ خوش ہو جائیں گے کہ نعیم کتنا معقول آدمی ہے۔ ایک ماہ بعد اس کے بک شلف میں وہ کتاب نہ ہوگی۔ پوچھنے پر وہ اطمینان سے کہے گا۔ تمہاری کتاب میرزا صاحب لے گئے ہیں۔ واضح رہے کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ بیشتر صورتوں میں تو اسے یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ اس کے شلف سے کون کتاب اُٹھا لے گیا ہے۔ ورنہ ذاتی طور پر وہ بڑا ایماندار واقع ہوا ہے۔ وہ آپ سے اپنی کسی بھی کتاب کا مطالبہ نہیں کرے گا۔ خواہ آپ اس کتاب کو ردّی ہی میں کیوں نہ بیچ دیں۔ بہرحال نعیم ایک ٹپکل آدمی ہے۔

ڈریسنگ کے باب میں نعیم بڑا قدامت پسند واقع ہوا ہے جیسے فیشن کی دنیا نے اسے چھوا تک نہ ہو۔ لیکن صفائی کا بڑا خیال رکھتا ہے۔ خواہ بُشرٹ کی جگہ وہ کوئی چغہ ہی پہنا ہوا کیوں نہ ہو۔ کسی وقت ٹینوپال کا اشتہار معلوم ہوتا تھا۔ اب اس نے ایجنسی بدل دی ہے۔ جب وہ بھانت بھانت کے عجیب و غریب کپڑے اپنے جسم سے لپٹائے ہوئے سڑکوں پر نظر آتا ہے تو لوگ اسے ٹورسٹ سمجھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

اُدب کے سلسلے میں وہ بڑا کومیٹیڈ ہے اس لئے شدید مایوسی کے عالم میں بھی وہ گرتے پڑتے اندھیرے کو بھی اُجالا ہی سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ شائد اس لئے میں نے کبھی اُسے گہری سوچ میں ڈوبا ہوا نہیں پایا —— مشورہ دئے بغیر وہ ایک منٹ بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس کے ملنے والوں میں بعض بھلے مانس ایسے بھی ہیں کہ اگر وہ مخالف سمت سے سڑک پار کر بھی رہا ہو تو چیختے ہوئے کہیں گے نعیم بھائی آپ سے کچھ سلاح کرنا ہے۔ ایسے وقت وہ اپنے اسکوٹر کی رفتار کو تیز کرنے کی بجائے بریک لگا دیتا ہے اور اس کا چہرہ پھول کی طرح کھل اُٹھتا ہے۔

وہ دواؤں اور پرہیز کے باوجود اکثر بیمار رہتا ہے۔ ایسے وقت اگر اس کا کوئی قریبی یار اس سے مشورہ کے لئے اچانک گھر آجائے تو اس کی بیماری آناً فاناً جاتی رہتی ہے۔

بحیثیت افسانہ نگار وہ ادبی حلقوں میں کم جانا پہچانا جاتا ہے۔ جس کا اظہار اس نے اپنی کتاب کے پیش لفظ میں بڑے تیکھے انداز میں کیا ہے۔ کہیں کہیں بعض سخن گسترانہ باتیں بھی ایک خاص تناظر میں آگئی ہیں۔ جو نعیم کی جدید ادب سے بے خبری کی غماز ہیں۔ اس کے باوصف وہ کئی مشہور افسانہ نگاروں پر بھاری پڑتا ہے۔

نعیم بیک وقت ایک اچھا افسانہ نگار بھی ہے اور ایک بہت بڑا یونین لیڈر بھی۔ بحیثیت یونین لیڈر وہ آسمان ہواؤں میں اڑتا رہتا ہے۔ وہ آج مدراس میں رہتا ہے تو کل دلّی میں۔ یونین اس سے چلتی ہوئی ہے یا وہ اس کا اسیر ہے [illegible] تک پہنچنے کی بھی کسی نے کوشش نہیں کی۔

نعیم کی شخصیت کی سب سے بڑی اور ہولناک خرابی یہی ہے کہ وہ بیچ کے پُل صراط پر بھی بغیر ڈگمگائے گذر جاتا ہے۔ وہ اپنے اس وصف کے باعث اپنے ساتھیوں میں معتوب بھی ہے اور عزیز بھی۔

اپنی بے شمار خامیوں اور خوبیوں سمیت مجھے نعیم بہت عزیز ہے اور نعیم کوئی آج کا دوست بھی نہیں ہے۔ ربع صدی سے وہ میرا تعاقب کر رہا ہے۔ زیادہ صحیح تو یہ بات ہے کہ میں ہی اس کی دلفریب، عجیب و غریب شخصیت کا اسیر ہوں۔ نعیم سے ملنے اور اُسے خواہ مخواہ گالیاں دینے میں مجھے بڑا مزہ آتا ہے اور کبھی کبھی جب وہ آپ جناب' پر آجاتا ہے تو مجھے کوئی دوسرا ہی نعیم زبیری لگتا ہے اور اس سے ملنے اور بات کرنے میں وہ لطف محسوس نہیں ہوتا۔ لیکن وہ جلد ہی اپنے اس خول سے باہر آجاتا ہے۔ دراصل یہی وہ نعیم زبیری ہے جو میرا برسوں کا یار ہے ——— !!

— —

پرویز یداللہ مہدی

حسابِ دوستاں در نصابِ دل

اس سے پہلے کہ میں "نصابِ دل" اور شاعرِ نصابِ دل کے بارے میں کچھ عرض کروں اپنے بارے میں باہوش و حواس یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ادب کے معاملے میں، میں بالکل بے ادب ہوں۔ البتہ میرے نام کے ساتھ تین عدد مجموعوں کی جو تہمت لگی ہوئی ہے اس سلسلے میں اتنا ہی عرض ہے کہ لک بائی چانس ۔ (by chance) کیا نہیں ہو جاتا۔ کبھی کبھی فلوک (Fluke) میں روپے کی قیمت گھٹانے کیلئے چرڑے کا سکہ چلانے والا بہشتی بھی ایک دن کا سلطان بن جاتا ہے۔ اس سکرے بلکہ کھردرے اعتراف کے ساتھ ایک بات اور صاف کردوں۔ کبھی کبھی نیکی اور نیک قوموں پر آزمائش کی غرض سے اللہ تعالیٰ طرح طرح کی بلائیں مسلط کردیتا ہے ٹھیک اسی طرح جب سنجیدہ شاعروں و ادیبوں کی آزمائش مقصود ہوتی ہے تو اوپر والا ان نیچے والوں کے پیچھے طنز و مزاح نگاروں کو لگا دیتا ہے لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے میں نصابِ دل کے خالق کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھ جیسے "غیر نصابی" شخص سے گھبرانے کی قطعی ضرورت نہیں۔ بلکہ گھبراہٹ تو مجھے ہو رہی ہے۔ میری نام نہاد ادبی شخصیت کے ڈیرے میں اس وقت بڑی کھلبلی مچی ہوئی ہے۔ تاریخ میں آپ نے "طوائف الملوکی" کی اصطلاح یقیناً پڑھی ہوگی۔ میں اس وقت اندرونی طور پر اسی اصطلاح سے دوچار ہوں اور پھر نصابِ دل کے بارے میں مجھ جیسا کم علم بلکہ "لاعلم" شخص بھلا کس منہ سے کچھ کہہ سکتا ہے جس کے بارے میں خود اُردو ادب کے ادنیٰ و اعلیٰ تمام جراحِ سخن، حضرات میں اختلافِ رائے پایا جاتا ہو۔ کچھ حضرات میرے بارے میں بھرپور دلائل کے ساتھ کہتے ہیں کہ میں کچھ خاص "پڑھا لکھا" نہیں ہوں، جبکہ کچھ حضرات کا خیال ہے کہ میں "پڑھا" زیادہ ہوں اور "لکھا" کم، اور کچھ کی رائے ہے کہ میں "پڑھا" بہت کم ہوں لیکن "لکھا" ضرورت سے زیادہ ہوں۔

ویسے ان تمام حضرات کی آرا سے قطع نظر اسکول سے کالج تک کا میرا ریکارڈ، خود یہ بتاتا ہے کہ میں نے ہمیشہ "خارج از نصاب" سرگرمیوں میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا ہے۔ ایسا مستند "خارج از نصاب" شخص "نصابِ دل" کی شاعری اور شاعر دونوں کا حساب کتاب بھلا کس برتے پر لے سکتا ہے۔ ویسے بھی میں ایک "خارجی شخص" ہوں میرا نام اب سے اکیس برس پہلے حیدرآباد کے "ملکی" رجسٹر سے خارج کیا جا چکا ہے اور نصابِ دل کے شاعر کو یقیناً میری اس خارجی حیثیت کا علم تھا۔ میرے درد کا اندازہ تھا اسی لئے شاعرِ درد مند نے اس خارج از نصاب شخص کو "داخلِ نصاب" کرکے اس کے زخموں پر دوستی اور پیار کا مرہم رکھنے کی کوشش کی ثبوت

کیلئے نصابِ دل' میں تفصیلات والے صفحہ پر ترتیب واہتمام والی سطر ملاحظہ فرمائیے یکّی روشنائی میں میرا بھی نام چمکتا نظر آئے گا۔ قارئین با تمکین کہتا ہوں سا سچ کہ جھوٹ کی عادت ہے کہ مجھے ' نصابِ دل میں یوں تو صرف نام کی حد تک میرا نام داخلِ نصاب کیا گیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں بھی میری حیثیت خارجی ہی ہے۔ یہاں مجھے اپنے ایک شناسا کا واقعہ یاد آرہا ہے، موصوف بڑے باذوق آدمی ہیں، ہر ادبی محفل میں مستقل سامع کی حیثیت سے شرکت فرماتے ہیں۔ ایک روز اچانک ملے اور ایک مجموعہ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ حضرت آپ تو بڑے "کھل وادی" نکلے۔ چپکے ہی چپکے " انڈر گراؤنڈ " ادب تخلیق کرتے رہے اور اب اچانک مجموعہ باہر لاکر پڑھنے والوں کو شاک ٹریٹمنٹ (Shock Treatment) دینے کی کوشش کر رہے ہیں ــــ لیکن جب میں نے کتاب کا سرورق دیکھا تو کہیں بھی موصوف کا نام نظر نہیں آیا۔ انہوں نے شائد میری حیرت کو بھانپ لیا تھا فوراً کتاب کھول کر تفصیلات والا صفحہ سامنے رکھ کے ترتیب واہتمام والی سطر پر فخر سے انگلی رکھ دی جہاں موصوف کا نام یکّی روشنائی میں یوں مسکرا رہا تھا جیسے گرم توے کے پیندے پر چنگاریاں جھلملاتی ہیں ــــ کچھ عرصہ بعد موصوف کا نام ایک اور مجموعے میں بھی ڈیوٹی انجام دیتا نظر آیا ــــ اس بار مجھ سے رہا نہ گیا۔ ان سے اس طرح اپنے نام کو داخلِ مجموعہ کروانے کی ترکیبِ استعمال دریافت کی تو ہنس کر بولے۔ "بہت آسان نسخہ ہے پہلے یہ پتہ لگائیے کہ کس شاعر یا ادیب کا مجموعہ عنقریب شائع ہونے جا رہا ہے۔ اگر پہلے سے صاحب سلامت ہوئی تو مرحلہ بہت آسان ہے۔ البتہ ملاقات نئی نئی ہو تو فوراً تعلقات بڑھائیے۔ خوب ملئے جلئے، اس کی ہر کاوش، ہر تخلیق کو سراہئے چاہے شاعر بے لگام نے اپنے کلام بلاغت نظام میں مُجھّے ہی کیوں نہ بُجھّے ہوں۔ جی کھول کر داد دیجئے اور بری ہی سہی، پھر دیکھئے بدلے میں آپ کا نام ترتیب واہتمام کی فہرست میں نظر نہ آئے تو میرا نام بدل دیجئے ــــ !! " یہاں میں نے اس واقعہ کا ذکر خاص طور سے اس لئے کیا تاکہ بات صاف ہو جائے کہ نصابِ دل کے ترتیب واہتمام والے نصاب میں اپنا نام داخلِ نصاب کروانے کی خاطر میں نے موصوف کے مذکورہ بالا نسخہ کا استعمال ہرگز نہیں کیا بلکہ جھوٹ موٹ کی واہ واہ تو دور' میں نے اکثر سچ مچ کی " آہ آہ " کو بھی سینے میں دبائے رکھا ــــ حالانکہ شاعرِ نصابِ دل سے میری دوستی کوئی جمعہ جمعہ آٹھ دن کی نہیں بلکہ ہماری دوستی کا اکاؤنٹ ۷۰ء کے اوائل میں کھلا اور بفضلِ ربی ابھی تک اسے بند کرنے کی نوبت نہیں آئی، روز بروز اس میں کھاتے میں خلوص بڑھتا ہی رہا۔ دعا کیجئے کہ اس "خاکے" کے بعد بھی یہ اکاؤنٹ اسی طرح چلتا رہے۔ گیارہ برس پہلے کی وہ شام مجھے ابھی تک یاد ہے جب عزیز دوست سید مصطفیٰ کمال مدیر "شگوفہ" نے جیلرز کوارٹرس کی سیڑھیوں کے پاس شام کے جھٹپٹے میں جھٹپٹے رنگت والے ایک نوجوان سے میرا تعارف کروایا۔ " یہ رشید عبدالسمیع جلیل ہیں، نوجوان شاعر اور میرے شاگرد ــــ! " لفظ شاگرد پر میں نے بجائے شاگرد کے استاد کو گھور کے دیکھا اور سوچا یہ مصطفیٰ کمال پاشا عرف شگوفہ جمال پاشو" کب سے صفی اورنگ آبادی

- پہلی بار منگنی کی انگوٹھی پہن کر آنے والی نوجوان حسینہ سے، ایک تجربہ کار دفتر کی ساتھی خاتون نے کہا۔ " مبارک ہو، مگر میری یہ نصیحت یاد رکھو۔ ہمیشہ شوہر سے اپنے حقوق منوایا کرو۔ جب میری شادی ہوئی تھی، میں نے ایسا ہی کیا اور اپنے شوہر سے شراب اور سگریٹ نوشی ترک کروادی تھی۔ "

نوجوان حسینہ نے پوچھا۔ " کیا وہ واقعی شراب اور سگریٹ ترک کر چکے تھے ــ ؟ "

معمر خاتون نے جواب دیا۔ " یہ تو مجھے صحیح طور پر نہیں معلوم، کیونکہ اس دن کے بعد سے آج تک اُن سے ملاقات نہ ہو سکی۔ "

ہو گئے ، حضرت کو شاعری سے کوسوں کا واسطہ نہیں اور شاگرد بنا رکھا ہے ایک شاعر کو۔ کمال صاحب نے غالباً میری اس غلط فہمی کو بھانپ لیا تھا مسکرا کر بولے — "شاعری کے میدان میں سمیع صاحب میرے نہیں شاذ تمکنت صاحب کے شاگرد ہیں۔ البتہ یہ کالج میگزین کے مدیر اعلیٰ ہیں اور طباعتی اُمور کے سلسلے میں اکثر مجھ سے بڑے فدویانہ انداز میں رجوع فرماتے ہیں۔ اس لئے اس معاملے میں میرے شاگرد کہلائے جا سکتے ہیں —!" اس تشریح کے بعد کمال صاحب نے روئے سخن اس رو سیاہ کی طرف کیا —— "ان کا نام تو آپ نے ادبی غیر ادبی، معیاری غیر معیاری، فلمی علمی، جنسی غرض ہر قسم کے رسائل و اخبارات میں بارہا پڑھا ہوگا —— پرویز یداللہ مہدی۔ خوب چھپتے ہیں، توقع ہے کہ آئندہ خوب لکھنے بھی لگیں گے۔ ——!"

کمال صاحب کو جائز و ناجائز جواز پیش کرنے اور دور کی کوڑی کو قریب کی، قریب کی کوڑی کو دور کی ثابت کرنے میں کمال حاصل ہے۔ آدمی بھی باکمال ہیں اور مدیر بھی باکمال ——— میں نے اس دوران میں محسوس کیا کہ نوجوان شاعر رشید عبدالسمیع جلیل کا ہاتھ بجو تواز کارروائی کی ابتدا کے ساتھ ہی مصافحے کی غرض سے میری طرف بے ساختہ بڑھ گیا تھا اسی طرح اٹینشن ہے تو میں نے فوراً مصافحہ کرتے ہوئے کہا — "پہلی ملاقات میں لوگ عموماً یہ طرحی مصرع الاپتے ہیں 'بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کے' لیکن میں پہلی ہی ملاقات میں اس مصرع پر گرہ لگانے کا قائل نہیں ، یہ بات تو آنے والا وقت ہی بتاتا ہے کہ ہمیں کسی سے مل کے واقعی خوشی ہوئی تھی یا نہیں ———!" میرے اس شوشے پر سمیع نے پوری قوت سے میرا ہاتھ دبانے کی کوشش کرتے ہوئے فرمایا — "اگر یہ بات ہے تو میں ابھی آپ کو اس بات کی ضمانت دیتا ہوں کہ مجھ سے مل کر آپ کو یقیناً خوشی ہوگی کیونکہ خوش ہونے کے معاملے میں، میں آپ کا ہم خیال ہوں —!"

میں نے شرارتاً کہا — "اگر آپ کو اپنی ضمانت ضبط کروانے ہی کا شوق ہے تو سچ مچ مجھے آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔" اس چہرے پر سمیع کی جھینپی جھینپی رنگت کچھ اور جھینپ سی گئی۔ شرمانے کا یہ جھینپا جھینپایا ہوا انداز صرف سمیع ہی کا حصہ ہے۔ یہ انداز، یہ کیفیت مجھے گلناری قسم کی حسیناؤں میں بھی قال قال ہی نظر آئی۔ سمیع کی اس ادا سے لطف اندوز ہوتے ہوئے میں نے آگے کہا — "مجھے دراصل آپ کی شخصیت سے زیادہ آپ کا نام پسند آیا۔ حلقۂ احباب میں میرے ہم جثہ بھی ہیں اور ہم عصر بھی لیکن نام کی طوالت کے معاملے میں آپ پہلے آدمی ہیں جو میرے ہم پلہ ثابت ہوئے ورنہ اب تک میرا نام کسی چھوٹی بحر کے لنڈورے مصرع کی طرح تھا۔ تنہا تنہا، اُداس اُداس لیکن آج آپ سے مل کر لگ رہا ہے جیسے شعر مکمل ہو گیا —!" سمیع نے اسی طرح جھینپتے ہوئے لقمہ دیا — "واہ — پھر ایک بار آپ کا خیال میرے خیال سے ٹکرا گیا —!" — "اگرچہ کہ سائیکل اور ہوائی جہاز کا آپس میں ٹکرانا ممکنات میں سے ہے۔" میں نے جملہ کسا وہ سر تسلیم خم کرکے بولے۔ "ذرہ نوازی ہے آپ کی جو میرے خیال کی پرواز کو ہوائی جہاز سے تشبیہ دی ورنہ یہاں تو من آنم کہ من دانم والا معاملہ ہے ——" میں نے سنجیدگی سے پوچھا — "کیا شہر میں آپ کی تیل کی دکان ہے —؟"

"نہیں تو —!" سمیع نے حیرت سے کہا — "یہ خیال آپ کو کیسے آیا —؟"

عرض کیا ۔ "ابھی آپ نے فارسی میں کوئی سخن گسترانہ بات کی تھی نا ۔۔۔" میرے اس اشارے پر سمیع نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ اور ہماری پہلی ملاقات قہقہے کی اس مضبوط ڈور میں بندھ گئی ۔۔۔!!

اگلی ملاقات میں، میں نے سمیع کو راز کی یہ بات بتائی ۔ "ادبی حلقوں میں طویل نام اکثر بحث کا موضوع بن جاتے ہیں۔ اس کی تازہ مثال میرا نام ہے۔ جب بھی میرا کوئی مضمون چھپتا ہے یار لوگ یوں اس پر تبصرہ فرماتے ہیں، یہ مضمون دراصل تین مزاح نگاروں نے مل کر لکھا ہے۔ ایک کا نام پرویز ہے دوسرے کا یداللہ اور تیسرے کا مہدی ۔ لہٰذا اگلا گر اپچھلا ہشیار کے مصداق اس سے پہلے کہ لوگ آپ کے نام کی طوالت کی ٹانگ کھینچیں آپ یہ مشہور کر دیجئے کہ رشید آپ کے والد بزرگوار کا نام ہے، عبدالسمیع آپ کا ذاتی نام اور جلیلؔ آپ کے فرزند ارجمند کا نام اس طرح کریڈٹ کسی اور کو نہیں جائے گا گھر میں ہی رہے گا ۔" میرے اس زرّیں مشورے پر سمیع بجائے اس کے کہ میرا شکریہ ادا کرتے حیرت سے بولے ۔ "آپ تو دو تہائی غائب داں معلوم ہوتے ہیں ۔۔۔!" اس "دو تہائی" کے انکشاف پر میرے غرقِ حیرت ہونے کی باری تھی ۔ سمیع نے میری دو تہائی غائب داں ہونے کی وضاحت کچھ اس طرح فرمائی ۔ "آپکی بات میں دو تہائی سچائی ہے، رشید واقعی میرے والد بزرگوار کے نام کا ایک جُز ہے اور عبدالسمیع میرا اپنا نام۔ اب رہا میرے نام کا آخری جُز جلیلؔ ..... " سمیع اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ میں نے اُن کا جملہ اُچک کر کہا ۔ "یہ غالباً آپنے کچی عمر میں بطورِ تخلص کے خود ہی رکھ لیا تاکہ آگے چل کر شاعری اگر سچ مچ لوہے کا چنا ثابت ہوئی تو استاد شاہ حضرت فصاحت جنگ جلیلؔ مانک پوری کے غیر مطبوعہ کلام پر ہاتھ صاف کر کے حقِ تخلص ادا کیا جاسکتا ہے" اس شرارت آمیز تشریح پر سمیع نے ایک زوردار قہقہہ لگایا جو قہقہہ کم اور "ٹھٹھہ" زیادہ تھا۔ قہقہے کے معاملے میں سمیع "سولو" (Solo) کے بجائے "کورس" کے قائل ہیں۔ قہقہے لگانے ہوں یا لٹانے ہوں دونوں صورتوں میں جی کھول کر فیاضی کا مظاہرہ کرتے ہیں، میرا خیال ہے زندگی کے نام پر فریب کھانے والے ہی زندگی سے بھرپور قہقہہ لگا سکتے ہیں اور جو زندگی کا ہر سکھ کالے دھن کی طرح آہنی تجوریوں میں مقید کر لیتے ہیں۔ ان کی زندگی سے قہقہے ہمیشہ کیلئے رخصت ہو جاتے ہیں۔ اور بے چارے اُردو شاعر کے پاس آہنی تجوری تو دور، اس کے مختصر سے گھر میں تجوری کا نقشہ تک رکھنے کی جگہ نہیں ہوتی ۔۔۔ شاعر سمیعؔ کا سرمایہ اس کا حساس دل، بیدار ذہن اور گردشِ دوراں کی نظر سے چھپا کر چند بھرپور قہقہے ہی ہیں، بس باقی اللہ اللہ خیر صلّا ۔۔۔!!

ہر زندہ اور فعّال فنکار کی طرح سمیع شعر و ادب میں جمود کے ہرگز قائل نہیں لیکن عمر، صحت اور حُلیے کے معاملے میں جمود پر پورا پورا یقین رکھتے ہیں۔ چنانچہ پچھلے گیارہ برسوں میں نہ تو ان کی صحت بہتر ہوئی ہے نہ جُثّہ گھٹا بڑھا ہے اور نہ ہی عمرِ رواں کا، کارواں آگے بڑھتا محسوس ہوا ہے۔ گویا ان معاملات میں سمیع نے کامیابی سے خود پر "جمود" طاری کر رکھا ہے۔ یہ آج بھی ہو بہو ویسے ہی ہیں جیسے پہلی ملاقات کے وقت تھے وہی کھِچڑی رنگت، وہی چھریرا بدن، ویسی ہی داڑھی جسے داڑھی کے بجائے صرف آثار کہنا درست ہوگا، کسی نمائشی جدید شاعر کی تجریدی غزل کی طرح ابہام آلودہ داڑھی، الفاظ کا سلسلہ تو موجود مگر شعریت معدوم، مفہوم نامعلوم۔ اس پر غضب یہ کہ جس روز یہ اپنی داڑھی ترشوا کر آتے ہیں

مجھے ان کے چہرے پر کسی ٹائپ شدہ درخواست کی تیسری کاربن کاپی کا گمان ہوتا ہے ۔!

سمیع ایک دیندار گھرانے کے چشم و چراغ ہیں اس لئے اپنی خاندانی روایات کو محفوظ رکھتے ہوئے حتی المکنہ شرعی حدود میں رہنے کی کوشش کرتے ہیں، ازدواجی دائرے میں تو صرف ایک ہی بیوی پر قناعت کئے ہوئے ہیں لیکن شاعری کے میدان میں وہ، دو مورچے سنبھالے برسوں سے خوبی کے ساتھ "ڈبل ایکٹنگ" کرتے چلے آرہے ہیں، جس سنجیدگی کے ساتھ یہ سنجیدہ شاعری کرتے ہیں اس سے کہیں زیادہ سنجیدگی بلکہ رقت کے ساتھ مزاحیہ شاعری فرماتے ہیں بلکہ کبھی کبھی ان کی یہ سنجیدگی، رنجیدگی کی حدود میں داخل ہوجاتی ہے اور ان کی شاعرانہ "رقت"، دوسروں کو "دقت" میں ڈال دیتی ہے تاہم ان کی یہ رنجیدہ سنجیدگی، نہ تو کسی وحشت کا نتیجہ ہے اور نہ ہی یہ محرم میں پیدا ہوئے ہیں بلکہ یہ تو بڑی ہی مسکین قسم کی سنجیدگی ہے۔ دراصل سمیع بڑے ہی حلیم الطبع آدمی ہیں، کبھی کبھی تو میرا جی چاہتا ہے انہیں رشید عبدالسمیع کی جگہ رشید حلیم الطبع کہوں۔ ویسے انہیں حلیم الطبع کہنے سے یہ مُراد ہرگز نہیں کہ ان کی طبعِ رواں' رمضانی حلیم' کی محتاج ہے۔ ان کی طبعِ رواں تو معمولی چائے کی پیالی پر "رواں رواں" ہوجاتی ہے، چائے سمیع کی کمزوری ہے اور اس کمزوری نے جہاں ان کی شاعری کو زورِ بیاں عطا کیا ہے وہیں انہیں جسمانی طور پر خاصا کمزور کر دیا ہے۔ البتہ سمیع جب چائے نہیں پی رہے ہوتے سگریٹ پیتے ہیں اور جن لمحوں میں سگریٹ نہیں پیتے ناقدریٔ زمانہ پر آنسو پیتے ہیں اور جب آنسو نہیں پی رہے ہوتے، دنیا کے مکر و فریب اور اپنی سادگی و سیدھے پن پر خون کے گھونٹ پیتے ہیں اور جس گھڑی پینے کے یہ بہانے بھی میسر نہیں آتے تب یہ اپنی اس محرومی کے غم میں غصہ پیتے ہیں۔ گویا پینے کا یہ سلسلہ، سلسلہ در سلسلہ چلتا رہتا ہے ــــ!!

سمیع شخصی طور پر جس قدر بکھرے ہوئے ٹوٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔ روایات کی پاسداری کے معاملے میں اتنے ہی اٹوٹ اور اٹل انسان کے روپ میں سامنے آتے ہیں، یہ ان مخلص لوگوں میں سے ہیں جو ایک بار کسی کے ہوجاتے ہیں تو عمر بھر اسی کے رہتے ہیں۔ مرزا غالب نے خود اپنے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ جس پہ مرتے تھے اُسے مار کے رہتے تھے' یہ بات سمیع پر بھی آسانی کے ساتھ چسپاں کی جاسکتی ہے۔ سمیع کی وفاداری بلا شرط استواری کی ایک ادنیٰ سی مثال ان کے حجام کے توسط سے پیش ہے، آپ تو جانتے ہی ہیں حضرت حجام اپنے اوزاروں اور ہتھیاروں کی مدد سے آدم کی اولاد کو آدمیت کے جامے میں رکھ کر سوسائٹی پر کتنا بڑا کرم فرماتے ہیں۔ بڑے بڑے استادانِ سخن جو اپنی سخن ناشناس قینچی سے اچھے اچھوں کی شاعری کی اصلاح فرمادیتے ہیں، ایک انگوٹھا چھاپ حجام کے آگے بغرضِ اصلاح زانوئے ادب تہہ کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں ــــ سمیع برسوں سے ایک ہی حجام کے آگے "زانوئے حجامت" تہہ کرتے چلے آرہے ہیں۔ حالانکہ اِن دنوں سمیع کے غریب خانے اور ان کے مخصوص حجام کے اصلاح خانے کے بیچ اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا کہ مدسِ حالیؔ اور کلام ندا فاضلی کے بیچ ہے۔ ایک مرتبہ میں نے ان سے پوچھا ۔ "آپ مہینے میں دو مرتبہ پابندی سے اتنا فاصلہ طے کرکے اس مخصوص حجام کے پاس یقیناً اس لئے حاضری دیتے

٭ مسافروں سے بھری ہوئی ایک بس میں خواتین کا ایک ہجوم داخل ہوا۔ ظاہر ہے کہ بس میں جگہ نہ تھی، اس لئے سب کے سب کھڑے ہونے پر مجبور رہے۔ کنڈکٹر نے دیکھا کہ نشست پر بیٹھا ہوا ایک مسافر سو رہا ہے۔ اس نے سوچا کہ مسافر کو جگا دیا جائے ورنہ وہ اپنی منزل کھو دے گا۔ جب کنڈکٹر اس کو جگانے لگا، تو مسافر نے جواب دیا "جناب میں سو نہیں رہا ہوں۔"

کنڈکٹر نے سوال کیا "تو پھر تمہاری آنکھیں بند کیوں ہیں؟"

مسافر نے ایک آنکھ کو نیم وا کرتے ہوئے جواب دیا۔ "جناب میں خواتین کو جلوت میں دیکھنا پسند نہیں کرتا۔"

■■

ہیں کہ آپ کا حجام نہایت جدید طریقے سے اصلاح بناتا ہے۔ سمیع بولے ——— "بالکل نہیں! — بلکہ "جدید یہ" ہونا تو دور میرا حجام "ترقی پسند" بھی نہیں ہے' وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ حجامت کے دوران اگر سنسنی خیز واقعات سنائے جائیں تو آدمی کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس طرح محنت بھی کم لگتی ہے اور بال بھی جڑ سے صاف ہو جاتے ہیں —!"

میں نے حیرت سے پوچھا ——— پھر آپ ایسے غیر سائنٹفک حجام کے پاس کس لئے جاتے ہیں؟ بولے ——— میرے حجام کے پڑوس میں مسیح انجم صاحب کا مکان ہے' اور رونگٹے کھڑے کرنے کا ذریعہ مسیح انجم صاحب انجام دے کر حجام کا کام آسان کر دیتے ہیں —!

میں نے تعجب سے کہا۔ مگر مسیح صاحب تو مضامین لکھتے ہیں' ان کے مضامین میں طنز و مزاح ہوتا ہے سنسنی وڈرا کر رونگٹے کھڑے کرنے والی باتیں نہیں ہوتیں —!

سمیع بولے ——— "آپ کی بات صحیح ہے لیکن جس دن مجھے حجامت بنوانی ہوتی ہے۔ میں مسیح صاحب سے ان کا کوئی مضمون نہیں سنتا بلکہ فرمائش کر کے ان سے سنسنی خیز ہیجان انگیز لطیفے سنتا ہوں!!"

اردو میں شاعری کو بطور پیشے کے اختیار کر کے مرزا غالب جیسے استاد سخن کو قرض کی مئے پی کر روٹی کی جگہ فاقہ مستی پر قناعت کرنی پڑی تو بعد والے شاعروں کی کیا ہستی' چنانچہ پچھلی ربع صدی سے سمجھدار شاعروں نے شاعری کو صرف شوق کے خانے میں رکھ کر پیشے کے خانہ میں مزدوری یا ملازمت کا اندراج کروا کے دو وقت کی روٹی کا مسئلہ تو کسی طور حل کر لیا ہے تاہم شاعروں کی ایک پلٹن آج بھی متبرک کے طور پر ایسی باقی ہے جن کی زندگی "مطلع" سے شروع ہو کر "مقطع" پہ دم توڑ دیتی ہے۔ شعرائے کرام بھی چونکہ حضرت آدم کی آل اولاد ہیں اس لئے ان سے مطلعوں اور مقطعوں کے علاوہ بیوی اور بچوں کا سرزد ہونا بھی فطری امر ہے سمیع کا تعلق شاعروں کے اسی گروہ سے ہے چنانچہ پیشے کے سلسلے میں سمیع نے ملازمت کو پسند فرمایا' یہ بھی سرکاری ملازمت کی مشینری کے ان ہزاروں کل پرزوں میں سے ایک ہیں جن کی "اوور ہالنگ" اور "آئیلنگ" کے تعلق سے ارباب مجاز ہمیشہ بے نیاز رہتے ہیں نتیجتاً یہ کل پرزے کلکلاتے اور کلبلاتے ہوئے خدمت کے لائق رہتے ہیں اور نہ ہی ان کی زندگی میں کوئی حسن باقی رہ جاتا ہے۔ سمیع کے پیشے اور شوق میں بڑا تضاد ہے' شوق انہیں شاعری کا ہے جس میں لطافت ہے نزاکت ہے جبکہ پیشے کے اعتبار سے یہ اکاؤنٹنٹ ہیں اور اس شعبے میں ظاہر ہے حساب کتاب کا گورکھ دھندہ ہے جس میں دو اور دو ہمیشہ چار ہوتے ہیں' تین یا پانچ نہیں جبکہ شاعری میں دو اور دو چار کبھی نہیں ہوتے ہمیشہ تین یا پانچ ہوتے ہیں بلکہ ہوتی ہے اور اکثر تو دو اور دو کا حاصل صفر ہی ہوتا ہے

اپنی روزمرہ زندگی میں سمیع جس قدر بدنظمی اور افراتفری کا مظاہرہ کرتے ہیں شاعری میں اتنے ہی نظم وضبط کے پابند دکھائی دیتے ہیں' بحور' اوزان' عروض' میٹر' لیٹر' گز' انچ وغیرہ پر ان کی نظر کافی گہری ہے شاعری کی نوک پلک سے اس قدر واقفیت کی وجہ غالباً یہی ہو سکتی ہے کہ انہیں شاعری کا ذوق ورثے میں بھی ملا ہے

جہیز میں بھی اور سلامی میں بھی۔ ورثے میں اس طرح ان کے والد بھی شاعر ہیں، جہیز میں یوں کہ ان کے خسر بھی شاعر ہیں اور سلامی میں ایسے کرشاذ مملکت ان کے سسرالی رشتہ دار ہوتے ہیں۔ گویا بائیں بازو اور دائیں بازو دونوں طرف شاعری کی خیر خیریت کو کوئی خطرہ نہیں ہے بلکہ ہر دو طرف راوی " فاعلاتن ہی فاعلاتن" لکھتا ہے۔ شاعری کو میں دیگر فطری تقاضوں میں سے ایک سمجھتا ہوں البتہ یہ فطری تقاضہ صرف شوق کی حد تک اچھا معلوم ہوتا ہے اپنی حدود کو تجاوز کر جانے کے بعد یہ اچھا خاصا شوق " طوق " بن جاتا ہے اور سمیع نے آغاز شاعری ہی سے اپنے حدود شوق متعین کر لیئے ہیں۔ چنانچہ کسی ماہر مکہ باز کی طرح " باکسنگ رنگ " سے باہر نہیں نکلتے حدود میں رہ کر سننے والے کی سماعت کو اپنی شعریت سے معطر کرتے رہتے ہیں۔

سمیع نے غالباً میرا یہ قول اپنی گرہ میں باندھ رکھا ہے کہ ہر صاحب سمجھ شخص میں تھوڑا فرشتہ، تھوڑا شیطان اور تھوڑا شاعر ضرور موجود رہتا ہے، فرق صرف تناسب کا ہوتا ہے چنانچہ سمیع اپنے سامع کے اندر کے شاعر کو اس کے فرشتے اور شیطان کے آرام میں خلل ڈالے بغیر جگا لیتے ہیں، یہی وجہ ہے جو میں نے آج تک کسی کی زبانی یہ شکایت نہیں سنی کہ سمیع کو زبردستی شعر سنانے کا ہوکا ہے۔

اگلے وقتوں میں سنا ہے لوگ نیکی کرکے دریا میں ڈال دیا کرتے تھے" لیکن آج نیکیوں کے سلسلے میں تقریباً ہر شخص دیوالیہ ہو چکا ہے اس لئے لوگ اب بھول کر بھی دریا کا رخ نہیں کرتے صرف شاعر حضرات بزرگوں کی اس روایت کو تھوڑے سے رد و بدل کے ساتھ زندہ رکھے ہوئے ہیں یعنی نیکی کی جگہ شاعری کرکے دریا کی بجائے اسے مشاعرے میں ڈال آتے ہیں لیکن سمیع اس معاملے میں بھی کنجوسی کا مظاہرہ کرتے ہیں یہ چونکہ بنیادی طور پر شہری بھی امن پسند ہیں اور شاعر بھی اس لئے " مشاعروں " میں بھی انہیں " لوٹ مار " بالکل پسند نہیں دراصل یہ " مشاعرہ لوٹ " قسم کے شاعروں کی فوج میں شامل ہو کر اپنی فکری شاعری کی توہین کرنا نہیں چاہتے تاہم مشاعروں میں مدعو کئے جانے پر شریک ضرور ہوتے ہیں۔ طنز و مزاح میں تو انہوں نے کل ہند مشاعرے بھی پڑھے ہیں۔ لیکن کچھ اس طرح بھرآئے ہوئے لہجے میں کلام سناتے ہیں، جیسے کسی یتیم خانے کے لئے چندے کی اپیل کر رہے ہوں۔ ایک اور بات جو میں نے خاص طور پر نوٹ کی وہ یہ کہ ڈائس پر پہونچتے ہی ان کے ہاتھ مشینی انداز میں پشت پر پہونچ جاتے ہیں اور ادھر مطلع ارشاد فرماتے ہیں، ادھر انگلیاں اس طرح حرکت میں آجاتی ہیں جیسے دل ہی دل میں کسی قسم کا ورد جاری ہو گیا ہو، میں نے ایک مرتبہ اس حرکت کے تعلق سے ازراہ مذاق کہا " کلام سنانا شروع کرتے ہی تم اپنی انگلیوں پر غالباً معاوضے کی رقم کا حساب کتاب شروع کر دیتے ہو کہ اس میں سے بیوی بچوں کے لئے کیا خریدو گے۔ دوستوں کو ہوٹل لے جاکر نہاری کلیجے کھلاؤ گے یا صرف چائے پر ٹرخا دو گے۔ قرض خواہوں کی لمبی فہرست میں سے کسی کا تقاضا ناقابل برداشت ہو گیا ہے۔ کتنی رقم اس میں سے دے سکو گے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس تشریح پر سمیع نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولے ۔ نہیں یہ بات نہیں ہے ! میں نے

بے ساختگی سے کہا "اگر یہ بات نہیں ہے تو ضرور تم منھ زور سامعین کو ہوٹنگ سے باز رکھنے کے لئے عملیات کے سہارے تسخیر قلوب سامعین کا ورد کرتے ہوں گے۔ اس وضاحت پر شرما کر جھینپ گئے جیسے میں نے ان کے دل کا چور پکڑ لیا ہو۔ رشد و ہدایت کے سلسلے سے متعلق ہونے کا کم از کم اتنا فایدہ تو آدمی کو اٹھانا چاہیئے۔ سمیع نے اگرچہ شاعری کا اوڑھا ہوا نہیں ہے یعنی نہ ان کے بال بے تحاشہ لمبے ہیں نہ سر شام یہ کسی بار یا "کیا وٹنڈ" کا رخ کرتے ہیں اور نہ ہی رکشے میں لد واکر بہ واپسی ٹیپ گھر کی طرف روانہ کئے جاتے ہیں۔ غرض یہ کہ تمام ظاہری اوصاف شاعرانہ سے محروم ہونے کے باوجود سمیع ایک ایک انچ شاعر ہیں' ان کے پاس شیروانی تو نہیں ہے لیکن شاعری کے لئے درکار پریشانی کا وافر اسٹاک ہمیشہ موجود رہتا ہے البتہ ان تمام اوصاف حمیدہ و غیر حمیدہ سے متصف ہونے کے باوجود یہ خود کو شاعر کم اور مفکر زیادہ سمجھتے ہیں یا کم از کم اپنے ملنے جلنے والوں پر یہی ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ اپنی اس کوشش کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کیلئے انہوں نے "پولیٹیکل سائینس" سے ایم اے بھی کیا لیکن جب ان کی یہ "پالیٹیکس" بھی ناکام ہوگئی تو انہوں نے اپنی آنکھوں کو کانچ کے فریم میں قید کر لیا۔ مگر کانچ کی آنچ بھی لوگوں کے انداز فکر پر چڑھی بے حسی کی موم کو پگھلا نہیں سکی بلکہ الٹا عینک کے اضافے کے بعد یہ مفکر کم اور متفکر زیادہ نظر آنے لگے ہیں۔

زندگی ہو یا شاعری سمیع ہر معاملے میں آہستہ روی کے قایل ہیں انہوں نے غالباً بعض محاوروں کو غلط ثابت کرنے کا بیڑہ اٹھا کر چبا لیا ہے' محاورہ ہے کل کرے سو آج کر' آج کرے سو اب' اسے غلط ثابت کرنے کیلئے سمیع اب کا کام تب پر اور آج کا کام کل پر ٹالتے رہتے ہیں۔ اگر انہیں کہیں دس بجے پہونچنا ہوتا ہے تو یہ کوشش ضرور کرتے ہیں کہ دس بجے ہی مقام مطلوبہ پر پہونچ جائیں' فرق صرف دن اور رات کا ہو جاتا ہے' دن کے دس بجے کا وقت طے ہو تو یہ رات کے دس بجے ضرور پہونچ جاتے ہیں' ایک مرتبہ یہ بمبئی آئے ہوئے تھے۔

واپسی رات کی مینار ایکسپریس سے ہونے والی تھی میں دفتر سے سیدھا بمبئی وی۔ ٹی پہونچ گیا' ساری ٹرین کھنگال ڈالی بلکہ کئی بار آموختہ بھی کیا۔ لیکن حضرت کا کہیں سراغ نہ ملا۔ بالآخر ٹھیک دس بجے ٹرین روانہ ہوگئی' میں تھک ہار کر جیسے ہی پلیٹ فارم سے باہر نکلا حضرت سے مڈبھیڑ ہوگئی میں نے طنزیہ لہجے میں کہا ۔۔ ارے سمیع صاحب تعجب ہے تم جیسا لیٹ لطیف ٹرین کی روانگی سے چوبیس گھنٹے قبل کیسے پہونچ گیا؟ وہ حیرت سے بولے "چوبیس گھنٹے قبل میں کچھ سمجھا نہیں ۔۔!" میں نے وضاحت کی' آج کی ٹرین تو اب سے پانچ منٹ پہلے روانہ ہوچکی اب اگلی ٹرین کل رات دس بجے روانہ ہوگی اور اس حساب سے تم پورے چوبیس گھنٹے پہلے اسٹیشن پہونچ گئے ہو۔ وہ بڑی سنجیدگی سے بولے "چوبیس گھنٹے پہلے نہیں بلکہ پورے چوبیس گھنٹے لیٹ! مجھے اصل میں اس ٹرین سے جانا تھا جو کل یہاں سے روانہ ہوچکی ہے۔

شاعر کی حیثیت سے ادبی دنیا میں قدم رنجہ فرمانے میں تو یہ اس قدر لیٹ ہوئے کہ ان کے ساتھ

شاعری کا آغاز کرنے والے دو چار شاعر تو ہمیشہ کے لئے لیٹ ہو گئے یعنی مرحوم ہو گئے بیشتر برسوں چھپ چھپ کر مشقِ سخن کرتے رہے۔ جیسے شاعری نہیں کوئی غیر شرعی حرکت کرتے رہے ہوں' اور چھپنے چھپانے کی طرف بہت بعد میں توجہ کی بقول خود ان کے ۵۷ء یا ۵۸ء میں باضابطہ شاعری شروع کی لیکن یہی روشنائی میں چھپنے کا سلسلہ ۷۰ء کے آس پاس شروع ہوا گویا سب سے چھپ کر یہ اپنی شاعری کی پرورش و پرداخت کرتے رہے اور جب شاعری کی ننھی سی کونپل پہلے گل اور پھر گلستان ہو گئی تب اس کی ادبی حیثیت "آنکنے" کے لئے بڑے فخر سے مارکیٹ میں لیئے آئے۔ اور اب تو خیر سے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے اپنے شعری گُل بوٹوں کو گلدستے کی شکل میں یکجا کر کے مجموعے کی صورت میں لے آئے ہیں۔ اب آگے آپ کا کام ہے اس "سعادت" کا سواگت کیجئے یا درگت بنائیے لیکن جہاں تک میری ناچیز رائے ہے میں سمجھتا ہوں رشید سمیع جلیل کا "نصاب دل" آپکو دیگر شعرائ کے شعری نصاب سے یوں مختلف لگے گا کہ یہ ایک ایسے شاعر کا مجموعۂ کلام ہے ـــــ جسے روایت کے دامن پر جدت کے نقش و نگار بنانے کا فن آتا ہے۔ نظم و غزل سے انہیں یکساں لگاؤ ہے اور ہر دو اصناف کے آداب و آہنگ نے ان کے کلام کو توازن و ترنم سے آشنا کیا ہے "

یہ وزن دار کلمات یہ باوقار رائے 'نصاب دل' کے سرورق کے 'فلیپ' پر موجود ہے البتہ اس کے نیچے نام لکھا ہے " شاذ تمکنت" اسے کتابت کی غلطی مت سمجھئے یہ سچ مچ شاذ صاحب کی رائے ہے البتہ اس سلسلہ میں میں اتنا کہنے کی جسارت کرتا ہوں کہ ہو بہو یہی رائے سمیع کی شاعری کے بارے میں میرے ذہن میں بھی ابھری تھی مگر افسوس اظہار کے معاملے میں شاذ صاحب مجھ سے بازی لے گئے' میرے ساتھ المیہ یہ رہا ہے کہ اچھی بات جو مجھے کبھی کبھار ہی سوجھتی ہے اسے کوئی نہ کوئی اڑا لے جاتا ہے اور اس بار شاذ و نادر سوجھنے والی میری یہ رائے چونکہ شاذ تمکنت اڑا لے گئے' اس لئے میں اپنی رائے محفوظ رکھنے پر مجبور ہوں ویسے ایمان کی بات تو یہ ہے کہ ہم دونوں کی عافیت بھی اسی میں ہے ـــ !●

کرگس سہسوانی

بیگم کی قبر پر

تیرے بن ہو گیا ویران مرا رنگ محل
اب خیالوں میں بھی رہتی ہے ہر دم ہلچل
یوں ہے میدان محبت کا سراسر چٹیل
جیسے آیا ہو مقدر کی لکیروں میں خلل

حال یہ ہے کہ نہ ساغر ہے نہ کوئی بوتل
میری مرحوم غزل اے مری مرحوم غزل

کبھی اطلس، کبھی مشروع، کبھی لایا مخمل
کبھی ٹیکا، کبھی جھومر، کبھی لایا پایل
کبھی مکھی، کبھی مچھر، کبھی مارے کھٹمل
تو نے سمجھا کبھی جوکر، کبھی سمجھا پاگل

گھر میں جس وقت گھسا تو نے دکھائی چپل
میری مرحوم غزل اے مری مرحوم غزل

کبھی سرخی، کبھی سرمہ، کبھی مسّی لایا
کبھی کرتا، کبھی جمپر، کبھی ساری لایا
کبھی لڈو، کبھی پیڑا، کبھی برفی لایا
ہو سکا جیسے ترے واسطے ٹی۔ وی لایا

پھر بھی ہر طور سے سمجھا مجھے تو نے کھٹمل
میری مرحوم غزل اے مری مرحوم غزل

بات تو بات مرا حال نہ پوچھا تھا کبھی
پاس اپنے نہ محبت سے بٹھایا تھا کبھی
میری خوشیوں کو نہ پروان چڑھایا تھا کبھی
یاد یہ بھی نہیں آتا کہ ہنسایا تھا کبھی

ہیں نگاہوں میں منقش تری پیشانی کے بل
میری مرحوم غزل اے مری مرحوم غزل

گھر میں رہتی تھی تو کرتی تھی فقط چیخ و پکار
بند کرنے میں بھی آنے نہ دیا مجھ کو قرار
ایک دن بھی نہ پڑھا چین سے میں نے اخبار
دے کے بچے کو مری گود میں چل دی بازار

آج بازار گئی لوٹ کے تو آئی تھی کل
میری مرحوم غزل اے مری مرحوم غزل

تھپ تھپا کر ترے بچوں کو سلایا میں نے
ہاتھ منہ اُن کا ہمیشہ ہی دُھلایا میں نے
دودھ شیشی سے کبھی گڑیا کو پلایا میں نے
خاک میں اپنی جوانی کو ملایا میں نے

چین لینے نہیں دیتے ترے آٹھوں ہیمبل
میری مرحوم غزل اے مری مرحوم غزل

تونے مجھ کو نہ کبھی پیار کے قابل سمجھا
منتیں کرنے پہ اکثر مجھے ڈانٹا ڈپٹا
اور بھولے سے جو تجھ پر کبھی ناراض ہوا
پیار سے تونے مرے گال پہ تھپڑ مارا
میرے رخسار پہ اب بھی ہیں کئی تاج محل
میری مرحوم غزل اے مری مرحوم غزل

"موڈ" تیرا نہ کسی طور سے بدلا مجھ سے
سحر و شام رہا تیرا، تو جھگڑا مجھ سے
اپنے دل کو نہ کبھی تونے ہلایا مجھ سے
ناز و نخرے کا ترے بھوت نہ اترا مجھ سے
تیرے ماتھے پہ ہمیشہ ہی رہے سیکڑوں بل
میری مرحوم غزل اے مری مرحوم غزل

لاکھ چاہا کہ کسی طور سے چھوٹے پیچھا
مشورہ مجھ کو وکیلوں نے یہ ہر بار دیا
نان نفقے کا اگر کر دیا اس نے دعویٰ
"لے" تمہاری سبھی ہو جائے گی اس کی بیٹا
اس کو چھوڑا تو ہر اک شکل میں آئے گا خلل
میری مرحوم غزل اے مری مرحوم غزل

اب در و بام پہ حسرت سے نظر جاتی ہے
شامِ غم سخت اذیت میں گزر جاتی ہے
گھر کے سب کام بس اک خادمہ کر جاتی ہے
چھوٹا بچہ یا تری تصویر سے ڈر جاتی ہے
اجنبی کوئی نہ ہو جائے کسی دن گھائل
میری مرحوم غزل اے مری مرحوم غزل

خود کو سمجھا تھا کہ میں جنسِ گراں ہوں اب بھی
تیغ و شمشیر ہوں یا تیر و سناں ہوں اب بھی
دشت و کہسار میں اک آبِ رواں ہوں اب بھی
پوپلی ہو کے سمجھتی تھی جواں ہوں اب بھی
ساٹھ سالہ پہ نہ چھوٹا ترا مستی کا چلن
میری مرحوم غزل اے مری مرحوم غزل

عمر بھر گھر میں رہی میرے حکومت تیری
لڑنے بھڑنے کی نہ چھوٹی کبھی عادت تیری
مجھ پہ اک دن بھی نہ ہو پائی عنایت تیری
دیکھنے کو نہ ملی مرنے پہ صورت تیری
مجھ کو ملتا نہیں دنیا میں کہیں تیرا بدل
میری مرحوم غزل اے مری مرحوم غزل

تیرے بن گھر مرا سنسان ہے جنگل کی طرح
شور اس میں نہیں اب بھاگڑا دنگل کی طرح
بیڑیاں بھی تو کھنکتی نہیں چھاگل کی طرح
قریہ قریہ پھرا کرتا ہوں میں پاگل کی طرح
زندگی آج بھی ماضی کی طرح ہے بےکل
میری مرحوم غزل اے مری مرحوم غزل

جاڑے میں / مجیب الرحمٰن بزمی

کیا کہوں حال چال جاڑے میں
ہے طبیعت نڈھال جاڑے میں
نزلہ، کھانسی، زکام کا چکر
گھر بنا ہسپتال جاڑے میں
اب تو فیشن میں نر بھی ناری بھی
پہنا کرتے ہیں کھال جاڑے میں
منجمد ہو گئی ہے ٹھنڈک سے
آرزوئے وصال جاڑے میں
شاعری برف بن گئی بزمی
منجمد ہے خیال جاڑے میں

کنہیا لال کپور

حال پوچھنے والے

مرزا غالب نے ایک شعر میں اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ اگر وہ بیمار پڑیں کوئی ان کا حال پوچھنے نہ آئے اور اگر مرجائیں کوئی ان کا ماتم نہ کرے ان کے ہر ایک شعر میں ایک نکتہ ہوتا ہے۔ اس شعر میں دو نکتے ہیں۔ پہلا یہ کہ بیمار کو اتنی تکلیف بیماری سے نہیں اٹھانی پڑتی جتنی ان سے جو اس کا حال پوچھنے آتے ہیں۔

دوسرا مرنے والے کا ماتم کرنا فضول ہے اس سے مرحوم کو کوئی راحت نہیں ملتی۔ البتہ ہمسایوں کی نیند خواہ مخواہ حرام ہوتی ہے۔ ہمارا اپنا تجربہ ہے اگر کوئی شخص تیمار داری کے لئے نہ آئے تو بیماری جیسا کوئی عیش نہیں۔ بیمار شخص پلنگ پر لیٹ کر سوچتا ہے کہ کل تک وہ بھلا چنگا تھا۔ آج اُسے کیا ہوگیا اور سوچتے سوچتے فلسفی بن جاتا ہے۔ جسمانی طور پر وہ کمزور مگر روحانی طور پر تندرست نظر آتا ہے۔ اس کی بیوی اور بچے اس کے جائز اور ناجائز ناز اُٹھانے کی حامی بھرتے ہیں۔ مگر یہ سب اُس وقت ہوتا ہے جب اُس کے رشتہ دار اور دوست اس پر نظر عنایت کریں، ہوتا یہ ہے کہ جونہی آدمی بیمار پڑتا ہے۔ اس کی بیماری کی خبر کسی دلچسپ افواہ کی طرح فوراً پھیل جاتی ہے۔ اب جسے بھی دیکھو وہ بیمار کے گھر پر دھاوا بول رہا ہے اور آتے ہی شکایت کرتا ہے۔ "کمال کر دیا آپ نے کل سے بیمار ہیں۔ ہمیں خبر تک نہ کی"۔ بیمار دل ہی دل میں کہتا ہے، اگر آپ کو خبر کر دی جاتی تو آپ کیا کر لیتے۔ اس تمہید کے بعد بیمار پرسی کی جرح

کی جاتی ہے۔ جیسے وہ بیمار نہ ہوا ہو۔ اُس نے کسی سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہو "پرسوں تو آپ بالکل تندرست تھے یہ یک لخت نمونیا کیسے ہوگیا" ذرا اس سوال پر غور فرمائیے۔ گویا نمونیا نے کے لئے کوئی خاص معیاد مقرر ہے۔ بیمار مری ہوئی آواز میں جواب دیتا ہے "بس یونہی قابو میں آگئے" تیمار دار کڑک کر کہتا ہے: "ذرا کھل کر بولئے' آپ پر تو ایک ہی دن میں [illegible] عالم طاری ہوگیا۔ بھلا نمونیا بھی کوئی مرض ہے جس سے آپ اتنا ڈر رہے ہیں" لیجئے اور سنئے' نمونیا کوئی [illegible] ہی نہیں۔ جو ڈاکٹر اسے مرض کہتے ہیں۔ وہ سر پھرے ہیں۔

اگلا سوال ہوتا ہے "کس حکیم کا علاج کرا رہے ہیں"؟ بیمار حکیم کا نام بتاتا ہے' تیمار دار چیخ کر کہتا ہے۔ وہ حکیم نہیں موت کا فرشتہ ہے۔ اس کے بارے میں تو کہا جاتا ہے۔ گھر میں قدم پیچھے رکھتا ہے۔ اور بیمار کا جنازہ پہلے نکلتا ہے" اس کے بعد یہ سوالات کئے جاتے ہیں "بخار کتنے ڈگری ہے۔ کھانسی زیادہ تو نہیں آتی؟ بلغم میں خون تو نہیں آرہا؟ جسم میں کہاں کہاں درد ہوتا ہے؟ خوراک کیا لے رہے ہیں؟ کب تک ٹھیک ہو جائیں گے؟ ایسے بھلے مانس مریض کی خبر نہیں لینے آتے اس کا دماغ چاٹنے آتے ہیں۔ اس لئے جب رخصت ہوتے ہیں وہ اطمینان کا سانس لیتا ہے کہ نمونیا رہے یا جائے' یہ نمونیا سے بھی بڑی بلا تو ٹلی!

پھر وہ تیمار دار ہوتے ہیں جو مریض کو ڈرا ڈرا کر اس کی جان نکال لیتے ہیں۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی کہتے ہیں۔ "ارے آپ کتنے کمزور ہو گئے ہیں۔ پہچانے بھی نہیں جاتے' اتنا سا منہ نکل آیا ہے۔ یہ بیٹھے بیٹھے کیا ہوگیا ہے آپ کو؟" مریض آہستہ سے کہتا ہے "دل کا دورہ پڑا ہے۔

وہ کرسی سے اچھل کر فرماتے ہیں "دل کا دورہ! یہ تو بڑا خطرناک مرض ہے۔ ہمارے ماموں کو بھی دل کا ہی دورہ پڑا تھا۔ بیچارے دو دن نہ کاٹ سکے۔ دیکھئے رشتہ داروں کو بذریعہ تار مطلع کر دیا ہے نا دل کی بیماری کا کیا بھروسہ بجانے کس وقت دل کی حرکت بند ہو جائے"۔

ایسے تیماردار مریض کا حال پوچھنے نہیں آتے' اسے جلد از جلد عدم آباد میں بھجوانے کے لئے آتے ہیں۔ کچھ اور حال پوچھنے والے اس قسم کے ہوتے ہیں کہ بیمار کا بے رونق چہرہ دیکھتے ہی ان کے اپنے چہرے پر رونق آجاتی ہے اور جب انہیں پتہ چلتا ہے بیمار ساری رات تڑپتا رہا ہے یا اسے بالکل نیند نہیں آئی' ان کی باچھیں کھل جاتی وہ دن میں چار چار دفعہ پوچھنے آتے ہیں۔ اب بیمار کا کیا حال ہے۔ اور انہیں دیکھ کر بیمار کو اس دیہاتی عورت جس کی بھینس رات کے وقت سخت بیمار ہو گئی اور جس کی ہمسائی ہر آدھ گھنٹہ کے بعد پوچھتی تھی: بہن اب بھینس کا کیا حال ہے جب رات کے دو بجے ہمسائی نے بارھویں بار بھینس کا حال پوچھا تو اس عورت نے کہا "بہن تم آرام سے سو جاؤ بھینس بیمار ضرور ہے لیکن مرے گی نہیں جس امید پر تم جاگ رہی وہ پوری نہیں ہو گی۔ کچھ لوگ حال پوچھنے کے بہانے بیمار کے مرض کی تشخیص کرنے آتے ہیں۔ ان کا پیشہ دکاندار یا کلرکی ہوتا ہے لیکن شغل شمشان کو آباد کرنا ہوتا ہے' بلڈ پریشر کے مریض کو فصد کھلوانے کا مشورہ دیں گے۔ ہسٹریا کے مریض کو کسی جن بھوت نکالنے والے سادھو کے پاس لے جانے کے لئے کہیں گے۔ موتیا بند ٹھیک کرنے کیلئے کسی ایسے نسخہ کو استعمال کرنے کی صلاح دیں گے' جسے آنکھوں میں ڈالتے ہی بینائی جاتی رہے گی ▲

سلیمان خطیب ★

سرِ دیوار بیٹھے تھے پسِ دیوار بیٹھے ہیں
وظیفہ پڑھتے رہتے ہیں وظیفہ خوار بیٹھے ہیں

ابھی ہم نے محفل میں شعر
یہ پڑھا ہی تھا کہ ایک صاحب نے لفظ "وظیفہ خوار" پر پُر زور
احتجاج فرمایا ارشاد ہوا' "وظیفہ خوار" ــــ "ذلیل و خوار" کے مترادف لفظ ہے۔ یہ ہماری
کھُلی توہین ہے۔ الفاظ واپس لئے جائیں۔ وظیفہ خوار کی بجائے وظیفہ یاب استعمال کیا جائے۔ ہم جیسے کم یاب
در نایاب لوگوں کے لئے وظیفہ یاب موزوں ترین لفظ ہے۔ میں نے دیکھا کہ بولنے والا شخص ایک جھکی ہوئی
کمان تھا' جیسے پرانی قبر سے کوئی مردہ اُٹھ کر آیا ہو۔ یا ڈوبتا ہوا شخص گہرے کنویں سے بول رہا ہو۔

کبھی کرسی پہ بیٹھے تھے سرِ مغرور تھے ہم بھی
پڑے ہیں آج قدموں میں سرِ بازار بیٹھے ہیں

حضرات! ۳۵ سال آنکھ جھپکتے گزر گئے ہم پچپن⁵⁵ سال کے ہو گئے' پانی محل[1] چھوٹ گیا۔ ہم کو
وظیفہ کی سعادت نصیب ہو گئی۔ بارہ سو سے تنخواہ گھٹ کر چار سو ہو گئی۔ ہم قلابازی
کھا گئے' وظیفہ کیا ہوا۔ ایک قیامت آ گئی' زلزلہ آ گیا' ہر چیز
گرتی ہوئی نظر آنے لگی۔ ہم ایک دن ضعیف ہو گئے بلکہ نحیف
ہو گئے' دنیا کی نظر میں حقیر فقیر ریت پر کی لکیر ہو گئے' ہوا
میں تحلیل ہو گئے۔ حرفِ غلط کی طرح مٹ گئے ہیں۔ ہمارا دنیا
کے پردے پر کوئی وجود ہی نہیں ہے' انسان چاہے تو قطب مینار سے گرے
چار مینار سے گرے' مگر کسی کی آنکھوں سے اتنا نہ گرے کہ اٹھایا نہ جا سکے۔ وظیفہ ملتے ہی

---

[1] سرکاری رہائش گاہ جس کا نام خود مصنف نے تجویز کیا تھا۔

ہم خوش ہو گئے ۳۵ سال کی غلامی سے آزادی ملی' چلو آج دن بھر آرام سے سو جائیں گے۔ ۵۵ سال کی تھ
دور کریں گے۔ مگر بیوی چیختی' چلاتی دندناتی خواب گاہ میں داخل ہوئی (خواب گاہ اس لئے کہ اس میں ہم کو
اکثر ڈراؤنے خواب نظر آتے ہیں اور گاہ گاہ ہی نیند آتی ہے) "ارے اٹھو بھی عمر تمام اونگھتے گذرا
اب کیا گنتی کے چار دن سوتے گذارو گے۔ سونے کا وقت گیا۔ کام کرو۔ کام — بازار جاؤ۔ سودا سلف
لاؤ میں نے نوکر کی چھٹی کر دی ہے۔ ماما کا حساب بے باق کر دیا۔ دھوبی کو کپڑے نہیں جائیں گے۔ کپڑ
خود ہی دھو۔ استری کرلو' کل سے بچے گھر میں جھاڑو لگائیں گے۔ تم برتن صاف کرو۔ میں کھانا پکاؤ
بچوں کو اسکول جانا ہے۔ ان کا وقت خراب مت کرو۔ ہو سکے تو دیوان خانہ خود ہی صاف کرلو۔ او
ہاں یہ امیرانہ ٹھاٹ چھوڑ دو' مرغی نہ انڈا' ہفتہ میں ایکبار نان ویجیٹرین پکے گا۔ باقی دنوں میں کھٹی دا
میٹھی دال' کھڑی دال' ماش کی دال' چنے کی دال' مونگ کی دال' کھچڑا' چکولیاں' سوکھی روٹی کے ٹکڑ
امباڑے کی بھاجی' ماٹھ کی بھاجی' پیاز کی پتی' بھنڈی کی کڑھی' دن میں دو دفعہ جوار کی روٹی پکے گی۔ شا
میں صرف ایک وقت چاول پکیں گے سمجھے جناب؟ آپ کو وظیفہ ہو گیا ہے۔ ہاں کبھی کبھار منہ کا مزا بد
کیلئے میں دسترخوان پر السی کی چٹنی' پودینہ کی چٹنی' تل چٹنی' کاریلے کی چٹنی' کھوپرے کی چٹنی' آم کی چٹنی' ب
کی چٹنی' لیمو کی چٹنی' ٹماٹے کی چٹنی' مرچی کی چٹنی رکھ دونگی' اس سے ہاضمہ بھی اچھا ہوتا ہے۔ اور پیٹ صاف
میں کل سے چائے بند کر دوں گی۔ چائے سے ہزار بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ پچاس روپیہ کا دودھ ہوتا ہے' دس
کلو شکر ہوتی ہے۔ اب وظیفہ ہو گیا ہے۔ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاؤ۔ اچھا آج بچی کو اسکول چھوڑ آؤ' شام
جاکر لالو۔ نوکر نہیں آئیگا۔ عزیز از جان بیوی کے اس فرمان مبارک کے بعد ہم بے ہوشی اور نیم بے ہوش
کی حدود میں داخل ہو گئے۔ پہلی دفعہ یہ احساس ہوا کہ ہم کو وظیفہ ہو گیا ہے۔ ہم سماج اور سوسائٹی کی نظروں
بالکل نالائق اور بیوی کی نظروں میں نکمے ہو چکے ہیں۔ ہم آنکھیں ملتے جمائیاں لیتے درانڈے میں آئے۔ قا
اکڑوں بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ ہم کو دیکھ کر زیر لب مسکرایا اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں۔ نہ روایتی فوجی سلوٹ نہ
نہ دعا' پھر جیب سے بیٹھے بیٹھے ایک کاغذ کا پرزہ نکال کر ہماری جانب بڑھا دیا۔ ہم نے پوچھا جمعدار صاح
(درآغالیکہ وہ تھرڈ کلاس چپراسی ہے) یہ رقعہ کس لئے لائے ہو میں یوں بھی آپ کی ہر خدمت کے لئے حا
ہوں' قاسم نامعقول اپنی بجھی ہوئی بیڑی پھر جلاکر بولا "میری خدمت کیا صاحب اب اپنی فکر کرو" پانی محل
چھوڑو یہ اسکا ہیج نوٹس ہے اس میں نوسے صاحب آریں" میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ اندر سے
شرفن بی (مالن) آئی بولی ارے قاسم مانٹی ملے! تیری قبر پو دھتورا اُٹھو کیڑے پڑ پڑ کو مرو نمک حرام
آئیو تو اٹھا تک نئیں تو کیا کرینگا تیری انکھیاں کو چربی آئی۔ بیٹھ کو بھکا بھک بیڑی پی رائے صاب کے جوتیو
طفیل میرا بیٹا نوکر ہوا۔ تیرے سر پو علیؑ کی تلوار گریگی تو ڈھیلا گھلے نا دھلیگا۔ کھڑے قد سے پٹ کر کو مر
قاسم صاحب ایک دم بلبلے پڑ گئے۔ جیسے بھیگا ہوا پاپڑ۔ ٹیڑھے میڑھے کھڑے ہو کر بولے' میں کیا کرو

خالہ حکم سرکار کا۔ کام تابعدار کا ——

ہم مکان کی تلاش میں نکل گئے۔ کیونکہ "خطیب کاٹیج" ابھی زیر تعمیر تھا۔ پچاس، پچاس روپیہ کے مکان قطعی پسند نہیں آتے تھے۔ ایک کمرے میں زندگی کیسے بسر ہو؟ اور مکانات بھی گندگی کی آماجگاہ تھے۔ ماحول انتہائی گرے ہوئے لوگوں کا، درگاہ روڈ پہ ایک مکان پسند آیا۔ مکاندار صاحب نے مکان دینے سے صاف انکار فرما دیا۔ بلکہ یہ ضرب بھی لگائی کہ میں کسی وظیفہ خوار کو اپنا مکان دینا پسند نہیں کرتا، یہ میرے مکان کی توہین ہے۔ آپ کا وظیفہ ہی کیا اور آپ دیں گے کیا؟ "جنت" کا کرایہ تین سو روپیہ ہے، دوگے؟ میں منھ کھول کر رہ گیا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر چلے گئے۔

ایک دن محبوب پاشاہ سے ملاقات ہوئی۔ بولے خطیب صاحب بارہ امام کا عاشور خانہ خالی ہے اس کے پیچھے دو کمرے ہیں۔ سامنے ورانڈہ ہے۔ پردہ کھینچ کر زندگی گذار لو، محرم کے چالیس دن خالی کرنا پڑتا ہے کہیں چلے جانا۔ نل سے پانی لالو۔ ضرورت کے لئے جنگل میں جاؤ، ورنہ اتنے کم وظیفہ میں مکان ملنا مشکل ہے۔ خود مکان آدھا وظیفہ کھا جائیگا۔ آپ کیا کھائیں گے۔ ہوا کھائیں گے؟ بھئی طمطراق چھوڑو

ع　شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

شیر علی صاحب اہلکار کو وظیفہ ہو گیا۔ وہ ایک ہوٹل میں ملے کہنے لگے۔ میں جامع مسجد کے کمرے میں رہتا ہوں۔ دو بچے بیوی اور میں۔ چار آدمی۔ پیش امام صاحب کو (۱۵) روپیہ دیدیتا ہوں۔ کام نکل جاتا ہے تم یتیم خانہ چلے جاؤ وہاں بھی ایک کمرہ خالی ہے۔ مینجر کے ہاتھ میں کچھ رکھ دو کام نکل جائیگا۔ مگر یہ سن کر میرا تو دم نکل گیا۔ ہم پٹنہ (عظیم آباد) کے مزاحیہ مشاعرہ میں گئے تھے واپسی پر معلوم ہوا کہ ہماری بیوی ایک ہفتہ کے اندر "خطیب کاٹیج" میں منتقل ہو گئی ہیں۔ دو کمروں کو انہوں نے رہنے کے قابل بنالیا ہے، باتھ روم بھی تیار ہے۔ ائے بیوی تیرا نام حسن سلیقہ ہے۔ میرا کام صرف وظیفہ ہے۔ ایک روز ہم نے دیکھا کہ ہمارے کرم خوردہ پتلونوں کی مرمت ہو رہی ہے پرانے بش شرٹ پر مختلف رنگوں کے بٹن ٹانکے جا رہے ہیں بعض پتلونوں کے پائینچے نیچے اوپر ہو گئے ہیں کسی پتلون کو گھٹنوں پر پیوند ڈالا گیا ہے۔ ہم کو سمجھایا گیا کہ آج کل جدید فیشن میں Cow Boy کی طرح نئے کپڑوں پر بھی پیوند کاری کی جاتی ہے اس سے سوسائٹی میں مقام بہت بلند ہو جاتا ہے۔ ہم کو یہ معلوم کرکے انتہائی خوشی ہوئی۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ اب ہم بیوی کے ہاتھ میں ایک کھلونا بن گئے ہیں وہ جس طرح چاہتی ہے کپڑے پہنا کر باہر نکال دیتی ہے۔ دو ایک اچھے جوڑے شادی بیاہ کی تقاریب کے لئے رکھ چھوڑے ہیں۔ وہ بھی پھول کی طرح احتیاط سے پہنے جاتے ہیں۔ پھر تہہ کرکے رکھ دیئے جاتے ہیں۔ کفایت شعار بیوی کی تجویز ہے کہ اسکوٹر نکال دی جائے۔ پٹرول کا خرچ سو روپیہ ماہانہ آتا ہے جو ناقابل برداشت ہے، ہم پرانی سیکل خرید لیں۔ اسکوٹر پورٹیکو میں صرف نمائش کے لئے رکھ جائے۔ مہینہ میں ایک آدھ دفعہ کسی تقریب کے موقع پہ نکالی جاسکتی ہے یا اس اسکوٹر کو فروخت کرکے

چھوٹے موٹے قرض ادا کئے جاسکتے ہیں۔ لہٰذا ہم نے ایک سکنڈ ہینڈ بائیسکل لی، بائی سیکل پہ بیٹھنے کی بھرپور مشق کی، نتیجے کے طور پر آج تک ہاتھ، پاؤں کا علاج ہو رہا ہے۔ بن بریک کی سیکل اتار سے جو نکلی تو ایک مولانا کے دو شانے میں گھس کر رک گئی۔ مولانا اس وقت ڈھیلا سوکھا رہے تھے۔ پھر ہماری اس قدر مرمت ہوئی کہ ہم بے ہوش ہوگئے۔ اس روز سے آج تک کسی کے پاس آنا جانا بند۔ ملنا ملانا بند۔ ہوٹل بند۔ سینما بند۔ سیر سپاٹے بند، شادی بیاہ وغیرہ میں شرکت بند، قوالیاں بندیوں بھی ہر جگہ پیسہ چاہیئے اور ہمارے پاس پیسہ بند۔

اب ہم سے بہت کم لوگ ہاتھ ملاتے ہیں کم بات کرتے ہیں۔ بلکہ ہم کو اچھوت سمجھتے ہیں۔ دوست احباب آنکھیں چراتے ہیں، آنکھ بچا کر نکل جاتے ہیں۔ شاید آنکھیں اسی لئے ہوتی ہیں۔

دو بچے نویں کلاس میں ہیں ایک بچی تیسری کلاس میں ہے جن کو وظیفہ کے معنی معلوم نہیں نہ مکان کی گرتی ہوئی معاشی حالت معلوم ہے، وہی ٹھاٹ باٹ ہیں۔ ہم اُن کو معلوم کرنا بھی نہیں چاہتے، بیوی کا خیال ہے کہ اس سے بچوں کی نفسیات پہ خراب اثرات مرتب ہوتے ہیں (اگر چہ ہمارے دماغ پہ خراب اثرات مرتب ہوتے رہیں) وظیفہ کی زندگی عجیب زندگی ہے یہ موت وحیات کی کشمکش کی زندگی ہے۔ ہمارے ساتھیوں میں رحمت علی سال بھر سے پنشن کے تختے بنا رہا ہے ایک دن وہ خود تختہ پہ چلا جائے گا۔ مگر اس کا تختہ منظور ہوکر نہیں آئیگا۔ دفتر کا ہیر پھیر ہی ایسا ہوتا ہے۔ رجب خاں پہلوان تیس سال سے وظیفہ لے رہے ہیں اور ڈنڈ پیل رہے ہیں۔ انشاء اللہ اور بیس سال تک وظیفہ لیں گے۔ تین بیویوں اور اکیس بچوں کے باوجود صحیح وسالم ہیں چوتھی کی تلاش ہے۔ شاید یہ آخری دلہن سہرا بھی باندھیگی اور ان کی قبر پہ چادر بھی چڑھائیگی۔ انشاء اللہ۔

میرے پاس مدقوق رام نارائن آتے ہیں بے چارے گھُل گھُل کر آدھے رہ گئے ہیں۔ گنتی کی سانسیں سینے میں رہ گئی ہیں۔ انھیں شکایت ہے ان کا وظیفہ غلط بیٹھا ہے۔ گریجوٹی کی رقم ابھی تک نہیں ملی، فاقوں کی نوبت آگئی ہے۔ ابھی دو لڑکیوں کے ہاتھ پیلے ہیں۔ قرض خواہ الگ جان کھاتے ہیں۔ ہر ماہ وظیفہ کی صف میں نظر آتے ہیں میں ہر ماہ سوکھے ہوئے بدن، خمیدہ بدن، کھانستے کھنکارتے، حزن محو کتے بدن، ہڈیوں کے ڈھیر ٹھریوں کے انبار، خشک انسانوں کے ملبہ میں کھڑا ہوجاتا ہوں۔ ہنس ہنس کر میں ہر سوکھے ہوئے بانس سے ہاتھ ملاتا ہوں، تڑ تختے ہوئے بمبو سے گلے ملتا ہوں۔ ہر بیٹھا ہوا بانس کھلکھلا کر ہنستا ہے۔ بالکل کھوکلی ہنسی بتیسی ڈھیلی ہوکر ہونٹوں پہ سرک آتی ہے۔ آنکھوں کے ڈھیلے ڈھلک کر نیچے گرنے کے قریب ہوتے ہیں، ہر بار سوچتا ہوں ممکن ہے یہی آخری ملاقات ہو اور کل یہ شمع بھی جھلملا کر گل ہوجائے، مگر جب تک سانس ہے آس ہے

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

(حضرت سلیمان خطیب مرحوم کا غیر مطبوعہ اور آخری مضمون)

رؤف خیر

خوش خبری

آؤ بچو! —— کھاؤ مٹھائی
بھول گئے؟ پھر پہلی آئی
اپنا اپنا حِصہ لے لو
ارے ارے اتنا مت دوڑو

کاجو کا میٹھا کس کس کو؟
ریحان، فرحان اور نرگس کو!
سلمٰی! کیوں کرتی ہو بلوہ
آؤ —— لے لو تم یہ حلوہ

کوئی نہ اسلم کو چھیڑے
اس کا حصہ ہیں یہ پیڑے
ڈبّو ہنس دو، غصہ چھوڑو
آؤ تم یہ لڈّو لے لو
ہاں راگی تم کیا کھاؤ گے؟
جیلی سے دِل بہلاؤ گے!
نازی اِتنا غل نہ مچاؤ
باقی جو کچھ ہے لے جاؤ

بیگم! —— اب یہ سمجھاؤ تو
ہم کیا کھائیں، بتلاؤ تو
(پاس آکر بیگم کہتی ہیں)
"چھوڑو بھی یہ کیاؤں میاؤں
اِک خوش خبری اور سناؤں؟!"

غزل

محمود نشتر

وہ تیر لگے ہے قد تو تلوار لگے ہے
اُس کی نگہہ شوخ تو بھرمار لگے ہے
اُس نے جو کیا پیر کو اتوار کا وعدہ
اُس روز سے ہر دن مجھے اتوار لگے ہے
گردن کو ہلانے کی ادا بھی ہے نرالی
اقرار لگے ہے نہ تو انکار لگے ہے
میک اپ سے جو چہرہ نظر آیا ترو تازہ
حالات سے گرتی ہوئی دیوار لگے ہے
سب ہاتھ میں اُس کے ہے بنائے کہ بگاڑے
لیڈر تو مجھے قوم کا اوتار لگے ہے
کم بخت مری جیب سدا رہتی ہے خالی
شاپنگ کو ہر وقت وہ تیار لگے ہے
یکساں ہے مرے واسطے پستی کہ بلندی
پیتا ہوں تو سب کچھ مجھے ہموار لگے ہے
ظاہر میں ولی جو ہے وہ باطن میں ہے شیطان
ہر شخص یہاں مجھ کو اداکار لگے ہے
سمجھا تھا کبھی عشق کو میں وادیٔ کشمیر
اب تو وہ مجھے وادیٔ پُرخار لگے ہے
نشتر کوئی مشکل نہیں معشوق سے ملنا
ماما ہی مگر بیچ کی دیوار لگے ہے

مجاہدین آزادی کی خدمت میں ہمارا ہدیہ تشکر

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی

ہماری جدوجہد آزادی اس اعتبار سے منفرد حیثیت کی حامل ہے کہ دنیا کی تاریخ میں پہلی بار بیرونی حکمرانوں کے خلاف عدم تشدد اور عدم تعاون کے ہتھیاروں سے لڑی گئی۔ مجاہدین آزادی کی ایک کثیر تعداد نے مادر وطن کو بیرونی تسلط کے چنگل سے آزاد کرانے کے لئے اپنی زندگیاں وا دیں لگا دیں۔

ہندوستان کے عوام نے آنے والی کئی نسلوں تک گاندھی جی، جواہر لال نہرو، ولبھ بھائی پٹیل، سبھاش چندر بوس، ڈاکٹر پٹابھی سیتا رامیا، گوپال کرشنیا، ناگیشور راؤ، ماڈاپتی ہنمنت راؤ، بی۔ سامبا مورتی، سوامی رامانند تیرتھ، چلا پورم کیشو راؤ، بورگل رام کرشنا راؤ، کلوری سبا راؤ، کونڈہ وینکٹ رنگا ریڈی جیسے دیگر بہت سارے محسنان وطن کی خدمات عزیزہ کو جذبہ تشکر کے ساتھ یاد رکھیں گے۔

جاری کردہ :- ناظم اطلاعات و تعلقات عامہ حکومت

D.I.P.R (59)

پاگل عادل آبادی

★

ھزل

ہنس کے مجھ کو پھنسائے جیسا ہے
"کانچ گوری" لگائے جیسا ہے
آج کل کی یہ نمبری اولاد
سر پہ طبلہ بجائے جیسا ہے
کھٹی چیزوں میں جی ہے بیگم کا
پھر نیا گل کھلائے جیسا ہے
اُن کی جیبوں میں ہے کئے جنّت
چار سجدے لگائے جیسا ہے
نانی ڈمپل کپاڈیہ بن رہیں
نانا "بربی" دکھائے جیسا ہے
بن گیا پیٹ مقبرہ اُن کا
مال مُردوں کا کھائے جیسا ہے
بارہ بچوں کے بعد اے پاگل
کیا پلاننگ کرائے جیسا ہے

چیف منسٹر شری ٹی - انجیا

ہم اِن مجاہدین
ازادی کی خدمات
اور قربانیوں کی
یاد تازہ کر رہے
ہیں، آیئے ہم اس
بات کا عہد کریں
لہ ہم ان کے بتلائے
ہوئے راستے پر چلتے
ہیں گے۔
اور خود کو ان
ا صحیح جانشین
ثابت کریں گے

○

ندھرا پردیش

داؤد اشرف اور کچھ بیان اپنا کے آئینے میں

عاتق شاہ

ادھر دس پندرہ برسوں میں جو نام اردو کے ادبی اسکرین پر ابھرے ہیں، ان میں داؤد اشرف کا نام بھی ہے۔ مخدوم ایک مطالعہ کی اشاعت کے فوری بعد داؤد اشرف کی طرف بہت سی ادبی شخصیتوں کی نظریں اٹھیں۔ لیکن کچھ کہے بغیر چپ ہو گئیں۔ کیونکہ پہلی یا دوسری یا تیسری کتاب کی اشاعت پر اظہار خیال کرنا یہاں کی ادبی تہذیبی روایت کے خلاف ہے اور یوں بھی چھوٹوں کو ابھی سے منہ نہیں لگانا چاہیئے۔ اس ادبی روایت پر اردو کے پیشہ ور اور نام نہاد نقاد سختی سے عمل پیرا ہیں۔ شاید اس لئے بھی کہ کہیں ان کی دکان بند نہ ہو جائے ـــــ اس کے علاوہ داؤد اشرف نے بھی وہ طریقہ اختیار نہیں کیا جو چھوٹے ذہن اور ظرف کے نقاد پڑھنے والوں کی توجہات اپنی طرف منعطف کرنے کے لئے میر کو معمولی غالب کو دوسرے درجہ کا اور اقبال کو متعصب اور مسلمانوں کا شاعر قرار دے کر ادب سے خارج کر دیتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ داؤد اشرف نے اپنے آگے پیچھے نہ بینڈ باجے بجوائے اور نہ کرائے کے ادبی چمچوں کا ایک جلوس نکالا۔ اور نہ کتاب کی رسم اجرا کی تقریب منعقد کی' اور نہ خود کے خریدے ہوئے پھولوں کے ہار دوسروں کے ہاتھوں پہنے، اس لئے داؤد اشرف کو وہ مقام نہ مل سکا جس کا وہ صحیح معنوں میں مستحق ہے۔ اسے میں داؤد اشرف کی ناکامی نہیں سمجھتا۔ بلکہ سرکس میں کام کرنے والے ان بھانڈوں کی ناکامی سمجھتا ہوں جو ادب کی رسی پر چلنے کی کوشش کر رہے ہیں' آج نہیں تو کل ان کی سمجھ میں آجائے گا کہ ادب اور سرکس کے کرتبوں میں بڑا فرق ہے

شائستگی اور توازن

داؤد اشرف کی تحریروں کی نمایاں خصوصیت ہے حیرت ہوتی ہے کہ اس نوجوان ادیب اور نقاد نے اپنی چھوٹی سی ادبی عمر میں یہ فن کہاں سے سیکھا۔ ویسے ایک بات داؤد اشرف کے تعلق سے بتا تا چلوں تو شاید غلط نہ ہوگا اور بڑی حد تک میرے اس سوال کا جواب بھی مل جائے گا اور وہ یہ کہ داؤد نے سو فیصد ادبی ماحول اور علمی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ داؤد کے والد مرحوم حیدرآباد کے مشہور روزنامہ صبح دکن کے جائنٹ ایڈیٹر اور اخبار تنظیم کے ایڈیٹر تھے۔ اور جن کے ایڈیٹوریل اپنے متوازن لب و لہجے اور بے باکی کی اپنی آپ مثال ہوتے تھے۔ سرکاری حلقے جن پر سنجیدگی سے غور کرتے تھے، اور ساتھ ساتھ عوام یہ محسوس کرتے تھے کہ یہ ان کے دل کی آواز ہے، علی اشرف مرحوم نے بغیر کسی مصلحت اور سمجھوتے کے صحافت کے معیار کو اونچا کیا۔ اور جرنلزم کے پیشے کو وقار بخشا۔ صحافی کے علاوہ علی اشرف مرحوم کی ایک اہم ادبی حیثیت تھی۔ اور وہ حیثیت تھی ایک شاعر کی جسے عوام اور خواص یکساں طور پر پسند کرتے تھے۔ چنانچہ علی اشرف کا پہلا شعری مجموعہ "نقش امروز" شائع ہوکر مقبول ہوا، اور جس کا مقدمہ جوش ملیح آبادی نے لکھا۔ داؤد اشرف اس گھر کا چشم و چراغ ہے جہاں حیدرآباد کے ادیب شاعر اور دانشور جمع ہوتے تھے۔ یہی نہیں ہندستان کی بڑی بڑی ادبی شخصیتیں علی اشرف مرحوم کے گھر آتی تھیں۔ جو ان دنوں لکھنے پڑھنے والوں کے لئے ایک ادبی مرکز بن گیا تھا۔ اس تفصیل کا مقصد یہ ہے کہ داؤد اشرف نے آنکھ کھولتے ہی اپنے آس پاس بڑی بڑی شخصیتیں دیکھیں۔ یہی نہیں بلکہ اُسے ان دانشوروں، شاعروں ادیبوں کی گود میں کھیلنے کا موقع ملا۔ اور ان سے غیر شعوری طور پر اس نے وہ سب کچھ سیکھا جو آج اس کی متوازن شخصیت کا ایک جز ہے۔

اس پس منظر میں اگر میں داؤد اشرف کے تعلق سے یہ کہوں کہ ادب اس کی گھٹی میں نہیں بلکہ خون میں شامل ہے تو شاید غلط نہ ہوگا۔ داؤد اشرف نے اپنے والد علی اشرف سے صحافت کا سلیقہ سیکھا۔ اور بات کہنے کا انداز، وہ شعر تو نہیں کہتا لیکن اپنی تحریروں میں اس نے جس نزاکت کو برتا ہے وہ نثر میں شاعری نہیں تو اور کیا ہے

"اور کچھ بیان اپنا" داؤد اشرف کی وہ تازہ تصنیف ہے جسے میں اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کر رہا ہوں، اس میں سات مضامین شامل ہیں۔ پہلا مضمون محمد قلی کی شخصیت اور شاعری سے شروع ہوتا ہے، اور پھر اس تصنیف کا خاتمہ "مخدوم - چند یادیں" پر ہوتا ہے۔ اس بیچ میں اس ترتیب کے ساتھ غالب کا حسن طلب اور حسن اعراض - مخدوم ایک ادھورا مطالعہ ترجمہ اور اس کی اہمیت، اقبال اور تصور وطنیت، ڈاکٹر زور اور ان کے تحقیقی کارنامے اور اردو کی ایک بے بدل شخصیت، برج موہن دتاتریہ کیفی شامل ہیں۔ داؤد اشرف نے ہر موضوع کے ساتھ انصاف ہی نہیں کیا بلکہ اس دور کا یا شاعر کے کارناموں کا چشم دید گواہ بن گیا۔

اور یہ بہت بڑی بات ہے، نقاد صرف جج کے فرائض انجام نہیں دیتا، بلکہ اسے پولیس ڈاگ بھی بننا پڑتا ہے اگر وہ جج کی کرسی پر بیٹھے رہے تو اس کا امکان ہے اور بڑی حد تک ہے کہ غلط رپورٹ اور غلط واقعات کی روشنی میں وہ کوئی غلط فیصلہ کر بیٹھے، اس لئے ادب کے نقاد کو پولیس ڈاگ کی طرح فن کار کے پیچھے پیچھے دوڑنا ہی نہیں پڑتا بلکہ اس عہد کے گلی کوچوں اور ناپسندیدہ مقامات پر جانا پڑتا ہے۔ جہاں جہاں سے فن کار گذرا اور اس

کے لئے بڑے حوصلے اور ظرف کی ضرورت ہے اس مقام پر تنقید تخلیق کا درجہ حاصل کر لیتی ہے' اور مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی حاصل ہوتی ہے کہ داؤد اشرف نے اپنے انداز میں یہ مہم سر کی ہے۔

اپنے ہر مضمون میں داؤد اشرف نے اپنے نقطۂ نگاہ کو قاری کے سامنے بہت ہی واضح طور پر لکھا ہے' اور اس طرح رکھا ہے کہ قاری سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے' ورنہ دوسرے نقادوں کی طرح اس کے لئے یہ آسان بات تھی کہ اپنی رائے کو مسلط کرتا یا فرمان جاری کرنے کی کوشش کرتا۔ یہ داؤد کی صرف ادبی ایمانداری نہیں بلکہ اس کے باشعور ہونے کی واضح دلیل ہے۔

اُردو کی ایک اہم شخصیت پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کے علمی اور ادبی کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے داؤد نے یہ بھی بتایا کہ کس طرح اردو دنیا نے اپنے روایتی انداز میں انھیں بھلا دیا۔ لیکن آخر میں داؤد نے قاری کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے وہ کہتا ہے "اردو والوں کی اس بارے میں غفلت پنڈت کیفی کے ساتھ ناانصافی تو ہے ہی لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کی کوتاہی کے سبب اردو لسانیات اور تحقیق کے ارتقا کی کہانی بھی ادھوری رہ جائے گی۔

دوسرے الفاظ میں داؤد اشرف ہم سب سے یہ کہہ رہا ہے کہ اگر آپ نے پنڈت کیفی کو بھلا دیا تو اس میں کیفی کا اور ان کے خاندان کا کوئی نقصان ہونے والا نہیں ہے بلکہ الٹا ہمارا نقصان ہے' کیونکہ کیفی اردو لسانیات کی ایسی کڑی تھے جسے ملائے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔

اس کے علاوہ کتاب کے آخری حصے میں وجہی' حالی' مجاز اور مخدوم پر لکھے ہوئے چند ریڈیائی مضامین کو شامل کیا گیا ہے جن میں ہر شاعر اپنے دور اور عہد میں سانس لیتا ہوا' قاری کے سامنے ابھر کر آتا ہے۔

اس خوبصورت مجموعے پر میں داؤد اشرف کو مبارکباد دیتا ہوں اور ساتھ ہی مدیر "شگوفہ" جناب مصطفےٰ کمال کو بھی جنھوں نے اس کتاب کو بڑی نفاست کے ساتھ اپنے ادارے شگوفہ پبلیکیشنز سے شائع کیا۔ یقین ہے کہ مصطفےٰ کمال ایسی ہی عمدہ کتابیں ہم سب کو پڑھنے کے لئے دیتے رہیں گے اور اردو کا یہ کارواں بڑھتا ہی رہے گا لیکن شرط یہ ہے کہ آپ کتاب خرید کر پڑھیں ▲

یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوتا ہے کہ لوگ اپنی کتاب پڑھوانے کے لئے کیسے کیسے انوکھے طریقے استعمال کرتے ہیں۔ محمد برہان حسین نے اپنی کتاب "چند کلیاں نشاط کی" پڑھوانے کے لئے مجھے تاکا بروقت تاکا، ایسے میں جب کہ وظیفہ حسن خدمت پر علحدہ ہوئے۔ بمشکل ایک ماہ کا عرصہ گذرا تھا اور بقول چچا اسد اللہ سعید وظیفہ کے بعد پہلا مہینہ بڑا سخت ہوتا ہے اور میں خودساختہ مصروفیات میں مبتلا ہونے یا ان کو اپنے اوپر طاری کرنے کی کوشش میں تھا کہ محمد برہان حسین نے اپنا تیر اس انداز سے پھینکا کہ ٹھیک نشانے پر لگا۔ انہوں نے مجھ سے خواہش کی کہ میں ان کی کتاب کی رسم اجراء انجام دوں۔ اولاً میں نے روایتی انداز سے معذرت کی لیکن جلد ہی اس اہم ذمہ داری کو اردو کی بڑی خدمت سمجھتے ہوئے ویسے ہی قبول کرلیا جیسے رسم اجراء انجام دینے والی اردو کی بڑی شخصیات آئے دن قبول کیا کرتی ہیں میں نے بھی ایسے کئی تیر پھینکے تھے اور سب ٹھیک نشانے پر لگے تھے۔ آج محمد برہان حسین کا تیر نشانہ پر لگا تو مجھے ایسا لگا کہ یہ تیر گویا میں نے ہی پھینکا تھا، اب تو مجھے محمد برہان حسین کی قابل قدر کتاب "چند کلیاں نشاط کی" پڑھنی ہی تھی، اور نہ صرف پڑھنی ہی تھی بلکہ آپ تمام حضرات کے سامنے یہ ثابت بھی کرنا تھا کہ میں نے کتاب پڑھی ہے، اس لئے میں جو کچھ کہوں گا ٹھیک ٹھیک کتاب ہی سے کہوں گا اور کتاب سے ہٹ کر کچھ نہیں کہوں گا۔ وہی ورق الٹے تھے کہ مجھ پر یہ انکشاف

ہوا کیا ئنسہ پر اُردو میں ایک کتاب لکھی ہے۔ اور کائنات کے نام سے پی یل۔ بھٹناگر کی کتاب The Universe کا اُردو ترجمہ کیا ہے جس کی اشاعت ترقی اُردو بورڈ دہلی کی جانب سے ہونے والی ہے۔ اب آپ ہی غور فرمائیں کہ ان کی حقیقت نگاری اور مزاح نگاری کے درمیان خطِ فاصل کہاں اور کیسے کھینچا جائے اور یہ کہ ان کے پڑھنے والے ان کی حقیقت نگاری کو مزاح یا مزاح نگاری کو حقیقت سمجھ بیٹھیں تو قارئین کا اور اردو ادب کا کیا حشر ہو۔

دوسرے یہ کہ سائنس کے عنوانات پر اُردو میں اتنا کم لکھا گیا ہے جو نہ ہونے کے برابر ہے' یہ اچھے بھلے اسی کام میں لگے رہتے اور اسی پر اپنی پوری توجہ اور صلاحیت صرف کرتے تو اُردو کا کیا نقصان ہو جاتا۔ اردو مزاح نگاری کے لئے مجتبیٰ نہ بھی ہوتے تو طالب خوندمیری' رشید الدین اور خواجہ عبدالغفور کافی تھے اور اردو ادب پھر بھی زندہ رہتا۔ اس بارے میں یہ نہیں کہ انہیں کسی نے ٹوکا نہیں۔ جیسا کہ خود لائق مصنف نے لکھا ہے شفیق الرحمٰن' پطرس' شوکت تھانوی اور کپور کی تحریروں سے ان کو آواز آتی رہیں کہ " تم بھی لکھا کرو خراب اور اچھا دونوں قسم کا مزاح اُردو میں ہونا چاہئیے۔ اب اس کا کیا علاج کہ ان تحریروں کے لطیف اشارے کو یہ پا نہیں جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے نہ پا سکے جو شخص اپنے سسر اور بیوی کو اس بنا پر روپوش مزاح نگار مانے کہ وہ اس کی مزاحیہ تحریروں سے محظوظ نہیں ہوتے اس سے اور کیا توقع کی جا سکتی ہے۔

غرض مزاح نگاری نہ کرنے کے تمام مشوروں کو بالائے طاق رکھ کر محمد برہان حسین نے اپنی ضد پوری کی اور کئے جا رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں مصطفےٰ کمال نے تو کمال کر دیا اور ایک نیا شگوفہ کھلایا۔ اب اس کو ان کی شرارت کہیں یا نری شرافت کہ جب برہان حسین کی مزاح نگاری کی تعریف و توصیف سے اپنے آپ کو عاجز پایا تو اپنی ذہانت خاص کو کام میں لاتے ہوئے کہا " اگر مجھے دوسرے آبگینوں کے ٹھیس لگ جانے کا ڈر نہ ہوتا تو میں تمہاری ضرور تعریف کرتا۔

البتہ ان کے کزن بمبئی کے مشہور آرٹ ڈائرکٹر یم جی معین الدین نے صورت حال کا جائزہ نہایت ہوشیاری سے لیا اور دیانت داری سے کام لیتے ہوئے کتاب سے اپنا تعلق ایسے قائم کیا ع

جیسے کوئی دھار پیتا ہو اُلٹی تلوار کی

اور کتاب کا ٹائیٹل اس کڑی شرط پر تیار کیا کہ انہیں کتاب پڑھنے پر مجبور نہ کیا جائے گا اور اس طرح کتاب کا ٹائیٹل بنا کر ہاتھ کی صفائی تو کم بتائی مگر صفائی کے ساتھ مابین دفیتن سے چھٹکارا حاصل کر لیا لیکن میں نے ایسی کوئی شرط نہیں لگائی۔ میں نے کتاب پڑھی اور اس سے اتنی واقفیت حاصل کر لی کہ محمد برہان حسین بھی اپنی نشاط کی کلیوں سے اتنے واقف نہیں جتنا میں ہوں۔ آپ میں سے اکثر نے تو کتاب پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کی اور یقین ہے کہ نہیں کریں گے۔ اس لئے آپ سے اس کا تعارف کرواتا چلوں۔

علامہ اختر زیدی نے تعارف کی ذمہ داری اپنے سر لی ہے اور یہ کہا ہے کہ طنز و مزاح میں خیال آرائی اور مضمون آفرینی کی گنجائش کم ہی ہے' میرے خیال میں یہ بات درست نہیں ہے۔ مزاح نگاری اردو ادب کی اتنی اہم اور مشکل صنف ہے کہ اس میں خیال آرائی اور مضمون آفرینی کی قابلیت کے بغیر قدم ہی نہیں

رکھا جاسکتا۔ علامہ اختر زیدی نے تعارف میں اس توقع کا بھی اظہار کیا ہے کہ ادب میں برہان حسین کے موجودہ مقام سے اس امر کا یقین ہے کہ اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ اس کے بعد برہان حسین نے صورت گراں عرف محسنان کے عنوان سے انوکھے انداز میں حرف سپاس لکھا ہے۔

کتاب چودہ مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ فہرست میں پندرھویں مضمون کا نشان سلسلہ لکھ دیا گیا تھا لیکن فاضل مصنف کو مضمون لکھنے کی فرصت نہ مل سکی اس لئے یہ مضمون عالم وجود میں نہ آسکا۔

جو مضامین عالم وجود میں آچکے ہیں سب اچھے ہیں۔ برہان حسین کو مزاح سے دلچسپی اور لگن ہے ان کے اس مجموعہ سے توقع کی جاسکتی ہے کہ ان کی مزاحیہ نگاری ترقی کرے گی۔ میں اس ادبی کاوش پر ان کو مبارکباد دیتا ہوں اور مجھے اس کتاب کی رسم اجرا انجام دینے کا موقع دیا گیا اس کے لئے ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ★★

"آؤ! اُردو سیکھیں"

(تبصرہ) ——— : از ابوالفہیم وحید علی خاں

اُردو کی بقا اور ارتقا کے سلسلے میں بڑی بڑی باتیں سننے میں آتی ہیں کہ اُردو کو دوسری سرکاری زبان بنایا جائے وغیرہ وغیرہ جبکہ ستم ظریفی یہ ہیکہ اردو نوشت وخواند سے ہماری دو تین نسلیں بے بہرہ ہو چکی ہیں خصوصاً شمالی ہند میں تو یہی ہوا ہے۔ جب نچلے درجوں میں ہی اُردو تعلیم کی طرف کوئی توجہ نہ ہو تو اعلیٰ درجوں میں اس کا انتظام کرنے اور یونیورسٹی یا کالج قائم کرنے کا کوئی حاصل نہیں جب اردو میں درخواست لکھنے والے ہی نہ ہوں تو دوسری سرکاری زبان بنانے کا حاصل کیا ہے۔ افسوس کہ اُردو کی ابتدائی تعلیم کے سلسلے میں اب تک کسی نے توجہ نہیں کی اُردو اکیڈیمیاں ادیبوں اور شاعروں کی کتابوں کی اعانت اور انعامات دینے کے کام سے آگے نہ بڑھ سکیں، البتہ اب ندھرا پردیش اردو اکیڈمی نے نصابی کتابوں کی تدوین کا کام شروع کیا ہے ابتدائی اردو تعلیم کے اس اہم کام کی طرف سب سے پہلے اسماعیل میرٹھی جیسے عالم نے توجہ کی تھی اس کے بعد ترس اللہ کا اللہ ہے، شیخ چاند کا بولتا قاعدہ اس سلسلے کی ایک اہم کوشش تھی جسے سامنے رکھ کر حیات اللہ انصاری صاحب نے اسی قسم کا ایک قاعدہ بنانے کی کوشش کی۔ یہ تمام کوششیں نصابی کتابوں کی حد تک تھیں۔ مزہ تو یہ ہیکہ آج تک ایسا کوئی معاون نصاب ترتیب نہیں دیا گیا جیسا کہ انگریزی اور دوسری زبانوں میں پایا جاتا ہے جسے عرفِ عام میں "ورک بک" کہتے ہیں، ابوالفہیم وحید علی خاں صاحب غالباً پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس کام کا بیڑہ اٹھایا اور پہلی جماعت سے لیکر ساتویں جماعت تک ایک معاون نصاب ترتیب دیا ہے، جس کا دوسرا حصہ ہمارے ہاتھوں میں ہے جس کی خوبی یہ ہیکہ مروجہ درسی کتابوں کو پیشِ نظر رکھ کر اسے ترتیب دیا گیا ہے، زیادہ تر ذخیرۂ الفاظ اسی جماعت کی درسی کتاب سے لیا گیا ہے، چنانچہ اس کتاب میں جو مختلف مشقیں کرائی گئی ہیں ان سے خود بخود درسی اسباق کا اعادہ ہو جاتا ہے اردو تحریر میں حرفوں کی جو شکست و ریخت ہوتی ہے وہ طالب علم کے لئے بڑی پریشانی کا باعث ہو سکتی جسکے نتیجہ میں صرف کی کافی حد تک قلب ماہیت ہو جاتی ہے چنانچہ مشقوں کے ذریعہ اس مشکل کو کافی آسان کیا گیا ہے، پہلے الفاظ سکھائے گئے ہیں جن میں حرفوں کے جوڑ نہیں ہوتے بلکہ الگ الگ لکھے جاتے ہیں۔ جیسے دادا، آداب، آم اور بیشتر ایسے الفاظ جمع کئے گئے ہیں جو اس عمر کے بچوں کے شب و روز استعمال میں رہا کرتے ہیں۔ پھر یہ سمجھایا گیا ہے کہ الفاظ کے شروع میں، درمیان میں اور آخر میں آئیں تو کیا شکل اختیار کرتے ہیں جیسے س، ساگ، رسول اور آس میں کس طرح لکھا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ، تقریباً تمام حروف تہجی کو اسی طرح سمجھایا گیا ہے، واقعی یہ ایک ایسی کوشش ہے جو اردو تعلیم میں کبھی نہیں کی گئی اس سلسلے میں اگرچہ بعض ثقیل الفاظ بھی جیسے تجمیع، وقیع اور مشروع بھی بتلائے گئے ہیں جو اس عمر کے بچے کی سمجھ سے بالاتر ہیں اس کے علاوہ تصویروں اور سوال و جواب کے ذریعہ بھی بہت سے الفاظ ذہن نشین کرانے کی بڑی کوشش کی گئی ہے۔

ابوالفہیم صاحب نے صرف اس سلسلہ کا حصہ دوم ہی شائع کیا ہے توقع ہے کہ باقی حصے بھی جلد منظرِ عام پر آئیں۔ اُردو تعلیم کے سلسلہ میں "ورک بکس" کا یہ سلسلہ ایک انقلابی اقدام کی حیثیت رکھتا ہے۔ اہل اردو اور بالخصوص اردو اساتذہ کے لئے امید ہیکہ یہ نئے سال کا بہترین تحفہ ثابت ہو۔

——— (م۔)

خرافات

مراسلے

پیارے شگوفہ باز!

س مرتبہ آپ کے خط میں "عشق" اپنی حدِ مقدار سے کچھ
تھا۔ اس لئے ایک نہایت ہی ہلکی پھلکی چیز بھیج رہا ہوں۔
میں خطرہ یہ ہے کہ فکر تونسوی اس میں سے کم جھلکے گا۔
ن زیادہ!
اب لکھنے سے اوب سا چکا ہوں۔ صرف کبھی کبھی تقاضائے
نان پورے کر لیتا ہوں ورنہ وہ شخص تو مر گیا جس کا نام فکر تونسوی
۔

فکر تونسوی، نئی دہلی

پچھلے تین چار مہینوں سے شگوفہ مل رہا ہے۔
بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے۔
شکریہ قبول فرمائیے۔ پرچہ بہت دلچسپ اور نشاط انگیز
ہم بوڑھوں کے لئے ایسی چیزیں ٹانک کا حکم رکھتی ہیں۔
رگوں میں خون سرد ہو جائے اور دنیا میں دلچسپی کم ہو جائے
یز بھی مسرت خیز ہو، ممدِ حیات ہوتی ہے۔

مالک رام، نئی دہلی

شگوفہ" ملا۔ واقعی آج کل کی صبر آزما فضا میں پابندی سے
نکالنا اور پھر اپنے مخصوص معیار سے بڑے دل گردے کا
ہے۔ میری تجویز ہے کہ آپ اس میں کچھ عنوانات کا اضافہ
شلاً: یوں بھی ہوتا ہے READER DIGEST کے عنوان
LIFE IS LIKE THA کی طرح اور اس میں لکھنے
لیے قارئین کو دعوت دیجئے۔ دلچسپ خبریں بھی انگریزی اخبارات

(خصوصاً غیر ملکی) سے ترجمہ کر کے دیجئے اور لطیفوں کے لیے نہ
صرف جگہ بڑھایئے بلکہ قارئین کو بھی مدعو کیجئے۔

وجاہت علی سندیلوی

● ڈسمبر کے شگوفہ میں "چوروں کا کنونشن اور احمد حسین حیات
کا "ضرورت ہے" بہت ہی جاندار ہیں۔

لیاقت علی حیدرآباد

● مچھروں نے بہت سوں کو کاٹا - کئی خطوط مل رہے ہیں۔
اس کا سہرا آپ کے سر جاتا ہے۔ مچھروں کی کانفرنس کے انعقاد
میں آپ کا جریدہ پلیٹ فارم کی حیثیت رکھتا ہے۔

رؤف خوشتر گلبرگہ

بے بس و معذور افراد کے ساتھ دست تعاون

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی

معذورین کے بین الاقوامی سال کے دوران آندھرا پردیش نے جسمانی طور پر معذور افراد کے لئے خاص طور پر ایک فینانس کارپوریشن کے قیام کے ذریعہ دوسری ریاستوں پر سبقت حاصل کر لی ہے۔ ریاستی حکومت کی جانب سے کئے گئے دور رس اقدامات حسب ذیل ہیں:

- سال رواں کے دوران ۳ کروڑ روپے کے خرچ سے جسمانی طور پر معذور افراد کے لئے فلاحی پروگراموں کا آغاز
- سال ۸۲-۱۹۸۱ء کے دوران ۷ لاکھ روپے کی لاگت سے مصنوعی اعضاء کی فراہمی، تعلیمی، علاج و معالجے کی سہولتیں فراہم کی گئیں۔
- ملازمتوں کیلئے تحفظات کی مدت میں مزید دس سال کی توسیع کی گئی۔
- جسمانی طور پر معذور افراد کے فایدے کے لئے حیدرآباد، کریم نگر، میدک اور وجے واڑہ میں ٹریننگ کم پروڈکشن سنٹرس قائم کئے جائیں گے
- خود روزگار پروگرام کے تحت تین ہزار روپے تک کی مالی امداد فراہم کی جائے گی۔
- ذات پات اور جہیز جیسی سماجی برائی کے شکار افراد کی امداد پر حکومت آندھرا پردیش خصوصی توجہ دے رہی ہے۔

(جاری کردہ)

ناظم اطلاعات و تعلقات عامہ، حکومت

DIPR (56)

محبوب مانجھوی

ہزل

کیوں نہ ہو ہم کو بھلا جان سے پیارا سسرال
سارے سسرالوں سے اچھا ہے ہمارا سسرال

جیتے جی چھوڑیں گے کس طرح بھلا ہم اس کو
بڑی مشکل سے ملا ہے ہمیں نیارا سسرال

عید بقرعید میں بھی گھر نہیں جاتے اپنے
ہم سے چھٹتا ہی نہیں ہے یہ ہمارا سسرال

رشک سے کہتے ہیں احباب بھی اب تو اپنے
"ہم بھی دیکھیں گے کبھی روز تمہارا سسرال"

سارا سسرال ہی اٹھ آیا ہے اپنے گھر میں
بن گیا گھر یہ ہمارا ہی ہمارا سسرال

عمر سسرال میں محبوب کٹی ہو جس کی
کس طرح چھوڑ سکے گا وہ "بچارا" سسرال

"شرما

دیانت داری، محنت شاقہ
زیادہ پیداواری
... اس سال یوم جمہوریہ کے موقع

شریمتی اندرا گاندھی (وزیر اعظم ہند)

اس خصوص میں قوم سے پرجوش اور پر زور اپیل کی گئی ہے۔ یہ وقت ہے کہ ہم سخت محنت اور نظم و ضبط کی برقراری کے لئے اپنے عہد کی تجدید کریں۔ ہماری محبوب وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے ہمیں وہ ولولہ انگیز پیام دیا ہے۔ جس میں بلند حوصلہ اور بہتر سماجی موقف کے حصول کے لئے واحد راہ کی نشان دہی کی گئی ہے۔ وزیر اعظم کا ارشاد ہے کہ حق و صداقت کے لئے عہد اور جانفشانی، عزت و احترام ترقی اور خوش حالی کے بنیادی اصول ہیں۔ نیا پروگرام بھی پیداواری صلاحیت میں اضافہ اور کمزور طبقات کی ہمہ جہتی ترقی کیلئے تیز تر فلاحی اقدامات کی ضرورت پر زور دیتا ہے۔

چیف منسٹر مسٹر ٹی انجیا کی قابل قیادت میں آندھرا پردیش میں مختلف اسکیمات کو روبہ عمل لایا جارہا ہے تاکہ کمزور طبقات مثلاً درج فہرست اقوام، درج فہرست قبائل، پسماندہ طبقات نیز عورتوں اور بچوں کو ترقی کے ثمر میں ان کا برابر حصہ مل سکے۔

★ چنانچہ سوشیل ویلفیر کی اسکیمات سے متعلق مصارف کی گنجائش میں ۷۸-۱۹۷۷ء سے اب تک چار گنا اضافہ ہوا ہے جبکہ اس سے متعلق رقومات ۲۱٫۵۷ کروڑ روپے سے بڑھ کر ۸۱٫۱۲ کروڑ روپے کردی گئی ہیں۔

★ اب تک زائد از ۱۴ لاکھ خاندانوں کو امکنہ کے لئے جگہ فراہم کی گئی ہے، جاریہ سال کے دوران مزید ۱٫۰۵ لاکھ خاندانوں کو جگہ مہیا کرنے کی تجویز ہے۔

★ درج فہرست اقوام کے لئے ۸۱-۱۹۸۰ء میں ۴۳٫۸۰ کروڑ روپے اور ۸۲-۱۹۸۱ء میں ۵۰ کروڑ روپے کی منظوری سے ایک خصوصی اور جامع منصوبہ کو روبہ عمل لایا گیا ہے۔ ۸۳-۱۹۸۲ء کے دوران ۸۹٫۳۷ کروڑ روپے مصارف کی تجویز ہے۔

★ شیڈولڈ کاسٹس فینانس کارپوریشن نے چند اسکیمات شروع کی ہیں تاکہ جاریہ سال کے دوران درج فہرست اقوام کے ۱٫۱۹ لاکھ غریبوں کو غربی سے چھٹکارا پاسکیں۔

★ درج فہرست اقوام سے تعلق رکھنے والے ایسے طلباء جو پوسٹ میٹرک کے مرحلہ میں وظائف کی سہولتوں سے استفادہ کررہے ہیں ان کی تعداد جو ۷۸-۱۹۷۷ء میں ۵۳۸ ۲۷ تھی وہ بڑھ کر ۸۱-۱۹۸۰ء میں ۵۱۴۰۰ ہوگئی۔

★ وظائف کے لئے استحقاق کے سلسلہ میں درج فہرست اقوام کے طلباء

جاری کردہ: نظامت اطلاعات و تعلقات عامہ

DIPR 804/83

“ایثار” اور عزم و استقلال کے ذریعہ صلاحیت کا حصول پر ہمارا عہد و پیمان ہونا چاہیے

شری ٹی انجیا (چیف منسٹر آندھرا پردیش)

والدین کی آمدنی کی حد کو سالانہ -/۶۰۰۰ روپے سے بڑھا کر -/۱۲۰۰۰ روپے کردی گئی ہے۔ ہاسٹلس میں مقیم طلباء کے اخراجات طعام بھی بڑھا کر -/۷۵ روپے ماہانہ کر دیئے گئے ہیں۔

★ سماجی بھلائی سے متعلق دیگر خصوصیات اور چھوٹیوں میں بین فرقہ جاتی شادیوں کے لئے ترغیبات، مفت قانونی امداد کی فراہمی اور ہریجنوں پہ مظالم اور سختیوں کا سد باب کرنے کیلئے گشتی عدالتوں کا قیام جیسے امور شامل ہیں۔

★ ریاست میں برقی کی تیاری کی گنجائش اور شرح بڑھ کر اب ۲۲۰۰ میگا واٹ ہوگئی ہے۔

★ آندھرا پردیش مکمل صنعتی امن، شاندار موسم، برقی اور پانی کی دستیابی اور وافر ترغیبات سے متعلق حکومت کی پیشکش کے ساتھ نئے صنعت کاروں کے لئے ایک خوش آئند سرزمین ہے۔

★ صنعتوں کے قیام کے لئے پائپ لائین کی تنصیب کے لئے ۶۰ کروڑ روپے کے اخراجات اور سرمایہ کاری کی گئی ہے۔

★ کمزور طبقات کے لئے ۲ لاکھ ۲۰ ہزار مکانات تعمیر کے مختلف مراحل میں ہیں۔ ہر جھونپڑی کے لئے مالی امداد -/۴۰۰ روپے سے بڑھا کر -/۱۰۰۰ روپے کر دی گئی ہے۔

★ پولمپم بیریج، سری سیلم رائٹ کنال اور جورالا پرا جکٹس کا کام شروع ہو چکا ہے اور ناگرجنا ساگر کنال کو عصری بنانے کا کام تیزی سے جاری ہے۔

★ دیہاتوں میں پانی کی سربراہی کے پروگراموں کو بھی انتہائی ترجیحی اساس پہ روبہ عمل لایا جا رہا ہے۔

★ سوشیل فارسٹری پروگراموں کی وسیع پیمانہ پر عمل آوری ہو رہی ہے جن میں نوجوان اور مقامی ادارہ (لوکل باڈیز) بھی شامل ہیں۔ انڈسٹریل فارسٹ ڈائرکٹوریٹ قائم کیا گیا ہے تاکہ صنعتی اغراض کے لئے زیادہ سے زیادہ لکڑی کے حصول کیلئے جنگلات میں اضافہ کیا جائے۔ ★ فیملی پلاننگ کے پروگراموں کو مستعدی اور سرعت سے روبہ عمل لایا گیا چنانچہ اپریل تا دسمبر ۱۹۸۱ء کے دوران مانع تولید کے ۲،۷۵،۸۳۰ آپریشن کئے گئے جبکہ ان کا ٹارگٹ ۷۵۔ ۲،۳ ہوا تھا۔

★ ۸۳-۱۹۸۲ء کی بابتہ منصوبہ کے قابل ذکر سالانہ ۶۰۰ کروڑ مصارف مختص کئے گئے۔

★ ۸۱-۱۹۸۰ء کے دوران خشک سالی اور سیلابوں کے باوجود غذائی اجناس کی پیداوار تقریباً ۱۰۰ لاکھ ٹن رہی۔

آندھرا پردیش میں اب ہریجن اور دیگر کمزور طبقات پہلے سے کہیں زیادہ بہتر موقف میں ہیں ان کا مستقبل زیادہ سے زیادہ تابناک ہوتا جا رہا ہے۔

ہم نے ۱۹۸۲ء کا بیداری سال کی حیثیت سے اعلان کیا ہے ریاست کی معیشت روز افزوں ترقی پر ہے اور جاریہ سال ایسی مزید ترقیاتی سرگرمیوں کا شاہد ہوگا جن میں تمام طبقات اور بالخصوص کمزور طبقات کی فلاح و بہبود کیلئے نئے ۲۰ نکاتی کی عمل آوری بھی شامل ہے جو مسز اندرا گاندھی کی قابل قیادت اور ہماری محبوب وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی دانشمندانہ رہنمائی اور رفیق دعنایات سے پایہ تکمیل کو پہونچیں گی۔

حکومت آندھرا پردیش

نئے سال کا تحفہ
خود پہنئے اور
دوسروں کو پہنائیے
مضبوط، پائیدار، خوش وضع
جوتے
زنانہ، مردانہ، اور بچوں کے لئے، ہر سائز میں دستیاب ہیں
شو ورلڈ
شو ورلڈ سرکل پتھر گٹی
حیدرآباد ۲
فون : دکان 44852
مکان 45046
نیو شو ورلڈ
روبرو مدینہ بلڈنگ
حیدرآباد

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ
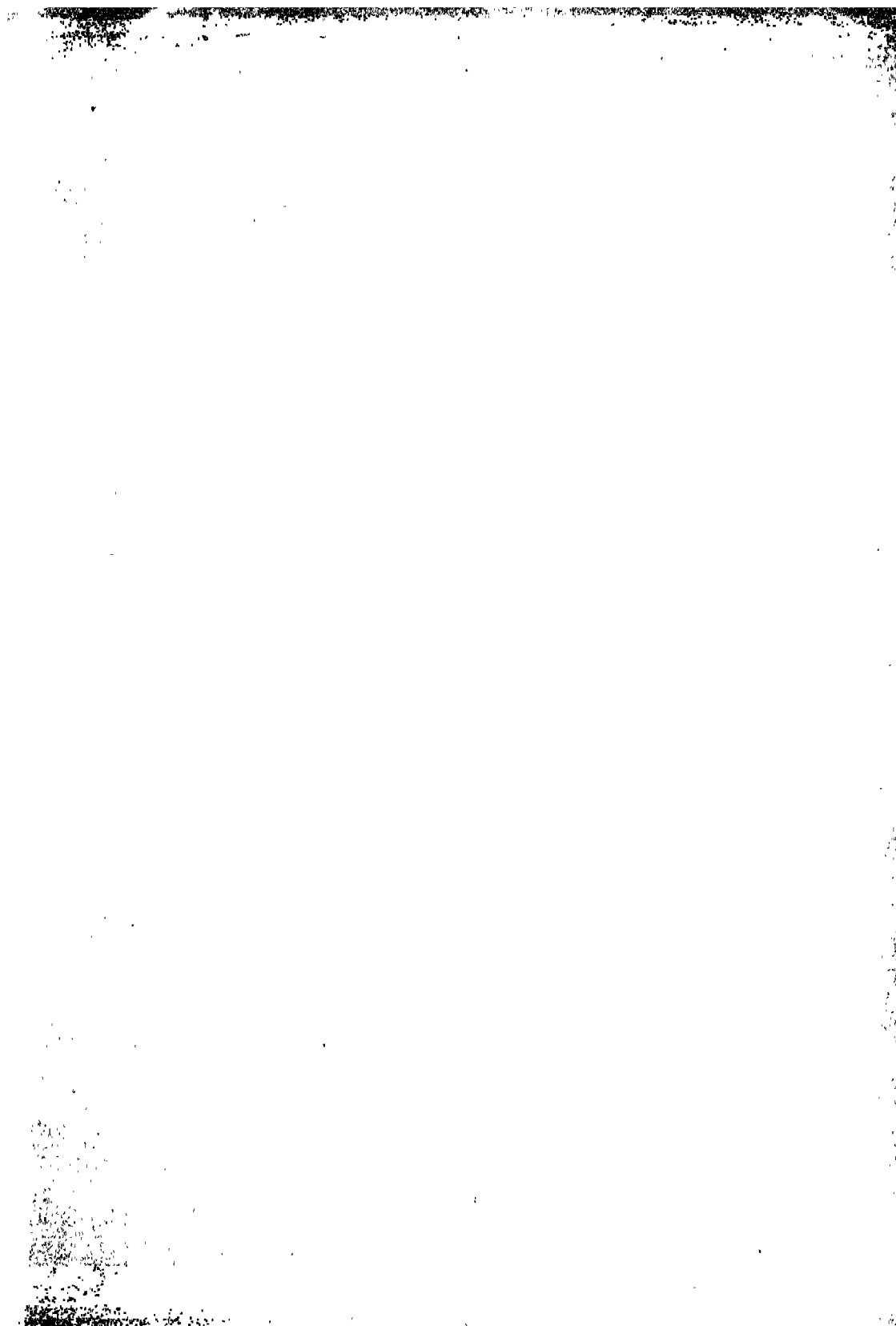
حیدرآباد

جلد : ۱۵

شمارہ : ۲

فروری ۱۹۸۲ء

ایڈیٹر :

سید مصطفیٰ کمال

مجلس ادارت :

حمایت اللہ

منظور احمد

مسیح انجم

منیجر : — سمیع جلیل

منیجر اشتہارات : — فاروق علی

مجلس مشاورت :

راجندر سنگھ بیدی

بھارت چند کھنہ

خواجہ عبدالغفور

نریندر لوتھر

مجتبیٰ حسین

قیمت فی پرچہ : — ۲ روپے ۵۰ پیسے

زرِ سالانہ ، انفرادی : ۲۵ روپے

لائبریری : ۳۰ روپے

بیرونِ ہند سے : — ۹۰ روپے

کتابت : — فہیم احمد ، مسعود انور

— خط و کتابت کا پتہ —

شگوفہ - ۳۱ بیچلرز کوارٹرز ،

معظم جاہی مارکیٹ ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

فون : 57715

طباعت : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس ، چارکمان ، حیدرآباد ۲

بائنڈنگ : حمدیہ بک بائنڈنگ ورکس ، پرانی حویلی ، حیدرآباد ۲

اس تھیلی کے چٹّے بٹّے

(فہرست)

رضا نقوی واہی

"نیم وحشی شاعری" کا انجام

(شعرستان سیریز کی ایک اور نظم)

دو کروڑ اٹھتر ہزار اہلِ سخن کا وہ کلام
عرصۂ بن باس میں لکھا گیا جو صبح و شام

فی سخنور، اک غزل، ہر روز لکھنے کا عمل
دس برس تک رات دن چلتا رہا تھا بے خلل

اب، جو یہ اشعار آئے ارضِ شعرستان سے
اول اول خوش ہوئے نقاد، جی سے جان سے

لیکن ان اشعار کے اسٹور کرنے کا سوال
منصرم، حضرات کی نظروں میں تھا کارِ محال

خیر سے، خالی ملے سرکاری غلّے کے گدام
آخرش رکھا گیا ان میں یہ لاکھوں ٹن کلام

پھر کبوتر خانۂ اشعار بنوایا گیا
شاعری کی مختلف صنفوں کو کھتیایا گیا

یوں تو ہر صنفِ سخن کا تھا نمونہ دستیاب
"نیم وحشی شاعری" لیکن تھی بے حد و حساب

انسپکشن جب کلیم الدین احمد نے کیا
دیکھ کر غزلوں کا انبار اُن کا سر چکرا گیا

غیظ میں آ کے، یہ حکمِ خاص جاری کر دیا
جس نے جینا ہی غزل سازوں کا بھاری کر دیا

دس برس تک مارشل لا کا نفاذِ عام ہو
مثلِ نس بندی، غزل گوئی کا چکّا جام ہو

بلکہ اب تک آ چکا اسمگل ہو کر جو کلام
اس کی بو بھی سونگھنے پائیں نہ ناقد یا عوام

جابر و مجبور، یعنی ناقد و اہلِ سخن
اس نئے فرمان کے پنجے میں آئے دفعتاً

ناقدوں کے دل میں اُٹھتی تھی جو تنقیدی ترنگ
ایک ہی ضربِ کلیمی سے کٹی مثلِ پتنگ

شاعروں کو مل رہا تھا شعر کے بدلے اناج
ہو گیا اس حکم سے مفلوج ان کا کام کاج

بند پنجروں میں پھنسے بے آب و دانہ ہو گئے
دیکھتے ہی دیکھتے سب بے ٹھکانہ ہو گئے

ناقدوں نے شوق کو اپنے پڑھائی بیڑیاں
اور پھر کر لی سبھوں نے پان بیڑی کی دکاں

شعر تو ردّی کے در سے بیوپاری لے گئے
شاعروں کو باندھ کر، نٹ اور مداری لے گئے

برق آشیانوی

ماما کا انٹرویو

ویسے تو ہر ماہ ایک ماما، یا خانساماں کو بدلتے زندگی کا بیشتر حصہ گذر چکا تھا۔ باقی ماندہ ایام حیات گذارنے کے لئے ہم نے طئے کیا کہ ماما کو ملازم رکھنے کا طریقہ بدلا جائے۔ اب جب کہ شادی بیاہ کے معاملے میں اخباروں میں اشتہار دیئے جارہے ہیں جس کا اکثر عنوان ہوتا ہے ـــ "رشتہ مطلوب ہے" ـــ تو ہم نے بھی ایک اشتہار دے دیا کہ ـــ "ماما مطلوب ہے" ـــ اس کے ساتھ چند اوصاف حمیدہ کی شرط لگا دی۔ مقررہ دن آن پہنچا۔ البتہ وقت مقررہ سے بہت پہلے ہمارے گھر میں ایک اہم مسئلہ پیدا ہوگیا کہ اُمیدواروں کا انٹرویو کون لے۔ ہم لیں گے یا ہماری بیگم ـــ ہم نے ارادہ ظاہر کیا کہ انٹرویو ہم لیں گے تو بیگم نے اعتراض کیا کہ "عورتوں کا انٹرویو لیتے آپ کو شرم نہیں آتی۔" ہم نے کہا۔ "اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ ہماری ملازمت ایسی گذری کہ ہمیں کئی لڑکیوں کا انٹرویو لینا پڑا ہے۔ جن میں کئی ایک تو تم سے بھی زیادہ ......" اس کے آگے ہم کچھ نہ کہہ سکے کیوں کہ کئی ایک باتیں کہنے کے باوجود عقل کام نہ کرتی تھی کہ کیا کہیں۔ مثلاً "حسین تھیں"۔ "کم عمر تھیں"۔ یا پھر "بدصورت تھیں" یا "نالائق تھیں۔" یا "بدسلیقہ تھیں" یا "بدمزہ پکوان پکاتی تھیں" یہ تمام جملے تو انتہائی سُرعت کے ساتھ دماغ میں آئے لیکن زبان سے نہ نکل سکے۔ آخر ایک جملہ اچھا سا ذہن میں آگیا اور ہم نے کہہ ڈالا۔ "عمر والی تھیں"۔ تو بیگم نے جو بے صبری سے جواب کا انتظار کر رہی تھیں۔ کچھ مطمئن سی ہوگئیں۔ بیان جاری رکھتے ہوئے ہم نے کہا۔ "چنانچہ یہ تو ہمارے لئے کوئی نئی بات نہیں ہے۔" بیگم نے کہا۔ "تعلیم یافتہ خواتین یا لڑکیوں کا انٹرویو لینا اور بات ہے، ماماؤں کا انٹرویو لینا دوسری بات"۔ ہم نے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ مامائیں ایک تو غیر تعلیمیافتہ ہوتی ہیں، دوسرے غیر شریف"؟ بیگم نے کہا۔ "اس میں کیا شک ہے۔

کیا سالہا سال کے تجربے نے آپ کو یہی نہیں بتایا ہے۔" ہم نے کہا " تو پھر ٹھیک ہے۔ اس قسم کی خواتین کا انٹرویو لینے کے لئے اُسی قسم کی خاتون کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ہمارے خیال میں آپ ہی اس کے لئے موزوں ہیں۔" اس پر جل گئیں اور بولیں۔ "جاؤ ہم نہیں لیتے انٹرویو۔" ہم خوشامد پر اُتر آئے اور کہا۔ "اس دفعہ تو آپ انٹرویو لے لیجئے۔ آئندہ ہفتے یا زیادہ سے زیادہ آئندہ ماہ جب پھر انٹرویو لینا پڑے تو ہم لے لیں گے۔" لیکن وہ کسی طرح راضی نہ ہوئیں۔ آخر طئے کیا گیا کہ اس کا تصفیہ قرعہ اندازی کے ذریعے کیا جائے۔ اس کے بعد ہم نے کاغذ کے دو پُرزے لئے اور بیگم سے کہا۔ "ہم ایک پر" ماما کا انٹرویو" لکھتے ہیں اور ایک پُرزہ سادہ چھوڑ دیتے ہیں۔ دونوں پُرزے میز کی دراز میں ڈال دیئے جائیں گے۔ آپ جاکر اُن میں سے ایک پُرزہ اُٹھا لائیے۔ اگر اس پر لکھا ہوا ہو۔ "ماما کا انٹرویو" ۔ تو آپ انٹرویو لیں گی اور سادہ پرزہ ہاتھ آیا تو ہم انٹرویو لیں گے۔ اس پر وہ راضی ہوگئیں۔ ہم نے کاغذ کے دونوں پُرزوں پر چالاکی سے تحریر لکھ دی۔ اور کوئی پُرزہ سادہ نہ چھوڑا۔ دل تو چاہتا تھا کہ دونوں پُرزے سادہ رکھ چھوڑیں۔ لیکن ہم اپنی ہار ماننے کے لئے تیار نہ تھے۔ بیگم سیدھی سادی خاتون ہیں۔ میز کی دراز میں سے کاغذ کا ایک پرزہ اُٹھالائیں اور ہم سے کہا۔ "کھولئے"۔ ہم نے کہا۔ "جی نہیں آپ کھولئے"۔ انہوں نے کہا۔ "جی نہیں آپ"۔ ہم نے "آپ اور آپ" کے جھگڑے کو طول دینے کی غرض سے پُرزہ خود ہی کھولا تو اس پر لکھا تھا۔ "ماما کا انٹرویو" اس طرح یہ طئے پا گیا کہ ماما کا انٹرویو بیگم لیں گی۔ انٹرویو شام کے پانچ بجے مقرر تھا۔ ہم نے دوپہر کا کھانا کھا کر آرام کیا۔ ٹھیک تین بجے بیگم نے کہا۔ پانچ بجے انٹرویو لینا ہے۔ آپ فوراً تیار ہو جائیے۔ وقت بہت کم رہ گیا ہے۔" ہم جانتے تھے کہ بیگم کو تیار ہونے کیلئے دو گھنٹے کا مختصر سا وقت بھی کافی نہ ہوگا۔ چنانچہ وہ فوراً تیار ہوکر ٹھیک ساڑھے پانچ بجے برآمدے میں جا بیٹھیں۔ اس سے قبل چند عورتیں گیٹ میں داخل ہوکر ایک درخت کے نیچے بیٹھی نہ صرف اپنی سابقہ ملازمت کے بارے میں ایک دوسری کو تفصیل بتا رہی تھیں۔ بلکہ مستقبل میں بھی نوکری کرنے کے طریقوں سے ایک دوسری کو آگاہ کر رہی تھیں۔ بیگم نے گھنٹی بجائی تو تمام عورتیں ایک ساتھ آگئیں۔ بیگم نے سب کے نام ایک کاغذ پر لکھ لئے۔ اور سب کو پھر درخت کے نیچے بیٹھ جانے کیلئے کہا۔ ہم دروازے کو نیم وا رکھ کر پردے کے پیچھے سے جھانک کر تماشہ دیکھ رہے تھے۔ سرفہرست مالن بی کا نام تھا۔ چنانچہ بیگم نے اپنے صاحبزادے سے کہا۔ "مالن بی کو بلاؤ۔" صاحبزادے مالن بی کو بلا لائے۔ ایک ادھیڑ عمر کی گندہ قسم کی عورت بے ہنگم چال چلتی ہوئی لاپرواہی کے ساتھ آکر کھڑی ہوگئی۔ بیگم نے دو ایک سوال کئے اور اس کو رخصت کر دیا۔ اسی طرح چند اور اُمیدواروں کو مختصر سے سوال و جواب کے بعد واپس کر دیا گیا۔ اب بیگم نے نام لیا۔ "خورشید بیگم" اس پر ہم چونک پڑے۔ "اوہ۔ اب بیگمات بھی ماما کی نوکری کرنے لگیں۔" خورشید بیگم کو بلایا گیا۔ جب وہ آئی تو بیگم نے نام اُمیدوارہ نے کہا۔ "خورشید بیگم" ہم نے پردے کے پیچھے سے دیکھا تو ایک خوش پوش اور کچھ خو:

عورت جس کی عمر چالیس سال سے کچھ کم ہی ہوگی، کھڑی تھی۔

بیگم نے سوال کیا۔ "اس سے پہلے کہیں نوکری کی ہے؟"

جواب ملا۔ "جی ہاں! دس جگہ کی ہے۔"

"یہاں ملازمت کے لئے آئی ہو؟"

"اور نہیں تو کیا آپ سمجھ رہی ہیں کہ آپ سے ملاقات کے لئے آئی ہوں۔"

اس جواب پر بیگم ذرا سنبھل گئیں۔ پھر پوچھا۔ "کہاں کہاں ملازمت کی ہے؟"

جواب ملا۔ "کس کس کے نام بتائیں۔ اور آپ نام سُن کر کیا کیجئے گا۔؟"

"اچھا تو پچھلی ملازمت کیوں چھوڑ دی۔؟"

"مالک سے طلاق لے لی۔"

"کیا کہا۔؟ مالک سے طلاق لے لی۔؟"

"جی ہاں۔!"

"تو کیا مالک نے تم سے نکاح کر لیا تھا۔؟"

"جی نہیں۔ میں نے مالک سے نکاح کیا تھا۔"

"یہ تو عجیب بات ہے۔"

"ایک بات میں صاف بتا دوں بی بی۔ میں ملازمت ایک شرط پر کروں گی۔"

"کیا شرط ہے؟"

"میں صاحب سے نکاح کرلوں گی۔!"

"اب تک کتنے نکاح کئے ہیں۔؟"

"جتنے گھروں میں نوکری کی ہے۔ نکاح پہلے کیا ہے۔ نوکری بعد میں کی ہے۔"

"تو کیا یہاں بھی پہلے مالک سے نکاح کرلوگی۔ اس کے بعد نوکری کروگی؟"

"جی ہاں۔! یہ میری شرط ہے۔"

غالباً بیگم کو سوال و جواب میں لطف آرہا تھا۔ پھر مذاق سوجھا تو انھوں نے کہا۔ "اچھا تمہاری شرط تو منظور ہے لیکن اس کے ساتھ ہماری بھی کچھ شرائط ہوں گی۔"

جواب ملا۔ "فرمائیے۔"

بیگم نے کہا۔ "گھر کی صفائی کرتی ہوگی۔" ———— اُس نے کہا۔ "منظور۔"

"برتن دھونے ہوں گے۔" ———— "منظور۔"

"کپڑے دھونے ہوں گے۔" ——— "منظور ہے۔"
"بچوں کو نہ صرف سنبھالنا ہوگا بلکہ انہیں ناشتہ کرا کے اسکول روانہ کرنا ہوگا۔" ——— "منظور ہے۔"
"ہر صرف پچاس روپے ہوگا۔ تاکہ ......"
خورشید بیگم نے مخل ہو کر کہا۔ "جی نہیں۔ صرف دس روپے۔"
"کیوں اتنے کم کیوں ——؟"
"اس لئے کہ جب میرا جی نوکری چھوڑنا چاہے اس وقت طلاق اور ہر لے کر چلی جاؤں گی۔ ہر کم ہو تو فوراً مل جائے گی۔"
بیگم نے کہا —— "منظور —— لیکن بچے نہیں ہوں گے۔"
جواب ملا۔ "بی بی، بچوں کا دینا نہ دینا اللہ کے ہاتھ ہے۔ اتنا بتلائے دیتی ہوں کہ اب تک شوہر کے علاوہ دس نکاح کئے ہیں۔ پندرہ سال کی مدت میں بچہ نہیں ہوا ——"
"تو تم بانجھ ہو ——؟"
"یہ کون کہہ سکتا ہے۔ بعض عورتوں کو شادی کے بیس سال بعد بھی بچہ ہوا ہے۔ اس کا فیصلہ اللہ میاں پر چھوڑ دیجئے۔" ——— "منظور۔ لیکن صاحب کی جائیداد میں تمہارا کچھ حصہ نہ ہوگا۔"
"مان لیا۔" ——— "بچہ ہوگا بھی تو اس کا بھی صاحب کی جائیداد میں کچھ حصہ نہ ہوگا۔ کیونکہ بچہ تمہارے ساتھ ہی چلا جائے گا۔" ——— "یہ بھی مان لیا۔"
"تنخواہ کیا لوگی ——؟" ——— "چار سو روپے۔"
"اتنے زیادہ ——؟" ——— "جی ہاں ——! آپ کو "ملازم" کی ضرورت ہے مجھے "ملازمت" کی۔ ملازم کے مقابلے میں ملازمت میں "ت" زیادہ ہے جس کے اعداد چار سو ہوتے ہیں۔"
"تم پڑھی لکھی ہو ——؟"
"اس سوال کا ماما کی ملازمت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ گھر کا کام کاج کرنا ہے۔ بچوں کو تھوڑے ہی پڑھانا ہے؟"
"وقت ضرورت کچھ پڑھا دیا کرو تو کیا ہرج ہے ——؟" "چلئے یہ بھی منظور ——"
"لیکن تنخواہ چار سو بہت زیادہ ہے۔ کم سے کم کیا لوگی؟" ——— "آپ جو دیں گی۔"
"ہم کھانے کپڑے کے علاوہ چالیس روپے دیں گے۔" ——— "منظور ——"
"لیکن ایک بات سن لو۔ صاحب کی عمر ساٹھ سال سے زیادہ ہے اور تم چالیس سے بھی کم ہو ——"
"سنا ہے کہ صاحب پستہ قامت ہیں۔ پستہ قامت آدمی جلدی بوڑھے نہیں ہوتے۔ اور پھر ..... بی بی، آپ بھی تو چالیس سے کچھ کم کی لگتی ہیں۔ پھر مجھے کیا عذر ہے۔" اس بات سے بیگم بہت خوش ہوئیں اور گھوم

الماری میں لگے آئینے میں اپنی صورت دیکھ کر مطمئن ہوگئیں ـــــ ان تمام سوال وجواب کے بعد کچھ ایسا معلوم
ا کہ بیگم کو اس بات کی اُمید نہ تھی کہ خورشید بیگم پیش کردہ جملہ شرائط پر راضی ہو جائے گی۔ چنانچہ وہ گھبرا سی
گئیں کہ یہ بلا تو اب گلے پڑنے والی ہے۔ پھر پوچھا ـ "صاحب سے نکاح کب کروگی۔ اور کام کب سے شروع کروگی"
"کل صبح پہلے نکاح ہوگا۔ پھر کام پر لگ جاؤں گی۔"
"اچھا اب تم جاؤ ـــ کل سویرے آجانا۔"
خورشید بیگم چلی گئی۔ اس کے بعد نہ معلوم بیگم نے کیا سوچا کہ باقی تمام اُمیدواروں کو واپس کر دیا۔ بیگم گھر میں لوٹنے
، تو ہم پردے سے ہٹ کر دور آرام کرسی پر جا بیٹھے بیگم ہنستی ہوئی آئیں اور کہنے لگیں۔ "مبارک باشد۔ آپ کی دیرینہ
پوری ہونے والی ہے۔"
ہم نے حیران ہوکر پوچھا ـ "وہ کیسے؟"
"وہ اس طرح کہ اب میں آپ کی شادی کرنے والی ہوں۔"
"چھوڑو مذاق ـ چائے پلاؤ ـ بہت دیر ہوگئی ہے۔"
"مذاق نہیں سچ کہہ رہی ہوں۔ کل آپ کا نکاح خورشید بیگم سے ہونے والا ہے۔"
"کل سویرے قاضی صاحب کو بلا لیجئے۔"
"ہمارے قاضی صاحب تو کالے کوسوں پر ہیں۔ انہیں بلوانے کیلئے تو ایک ہفتہ گذر جائے گا۔"
"اجی وہ اپنے دوست مُلّا جمرالہود کو ہی بلوالو۔ وہ تو آپ کا یہ کام بڑی خوشی سے کر دیں گے۔ اور پھر فری
(Free) یعنی کوئی فیس بھی نہیں لیں گے۔"
"بیگم ایک نکاح کر کے اس کا انجام آج تک بھگت رہے ہیں۔ اب دوسرا نکاح کر کے جہنم بھیج دوگی۔ خدا کے
لئے ایسی بات مت سوچو۔"
اس پر بیگم چیں بہ جبیں ہوگئیں اور بولیں ـ "سوچنا کیسا ـ! طئے ہوگیا ہے۔ بھول گئے کہ ہر بات پر دوسری
دی کی دھمکی دیتے تھے۔ آج جب مراد پوری ہونے کو آئی تو گھبرا گئے۔ میں جانتی ہوں یہ گھبراہٹ بھی بناوٹ کی ہے۔
، دل تو خوشی سے ناچ رہا ہوگا ـ"
"دل ناچ تو رہا ہے لیکن خوشی سے نہیں بلکہ گھبراہٹ سے۔ بھلا اس عمر میں نکاح کریں اور پھر تم ابھی ..... ابھی ..."
"ابھی ـ ابھی ـ یعنی کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟"
"یہی کہ تم ...... یعنی کہ میں ...... جو ابھی زندہ ہوں ـ"
"اچھا سمجھ گئی مطلب ـ تو پہلے مجھے ختم کردو ـ"
"خدانخواستہ ـ بھئی یہ تم نے کیا کہہ دیا ـ وہ تو بس یوں ہی زبان سے نکل گیا۔"

" ہاں ۔ ہاں ۔ دل کی بات زبان پر بے ساختہ آ ہی جاتی ہے ۔"
" دل کا ذکر نہ کرو ۔ دل میں تو ایک نہیں کئی باتیں ہیں ۔ خیر چھوڑو ۔ اس واہیات گفتگو کو ۔ کوئی کام کی بات کرو .. مثلاً چائے کی ۔"
"میں تو کام کی بات ہی کر رہی ہوں ۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آپ کا نکاح خورشید بیگم سے کر دوں گی ۔ اس لئے کہ آج کل ماما کو ملازم رکھنے سے بہتر یہ ہے کہ اس سے نکاح کر لیا جائے ۔"
ہم نے انتہائی برہمی کے ساتھ کہا ۔ " بس چھوڑو یہ قصہ ۔ میں نے پردے کے پیچھے سے سب کچھ سن لیا ہے ۔ کل وہ شیطان کی خالہ آئے گی تو دھکے دے کر نکال دیا جائے گا ۔"
" شیطان کی خالہ نہیں ۔ بلکہ اپنے بچوں کی سوتیلی ماں ۔ سمجھے ۔"
ہم کچھ کہنے ہی والے تھے کہ وہ باورچی خانہ کی طرف چلی گئیں ۔ اور بات ختم ہو گئی ۔
دوسرے دن صبح آٹھ بجے خورشید بیگم آدھمکی ۔ بیگم کو مذاق سوجھا ۔ دھیرے سے بولیں ۔ " لو آ گئی تمہاری دلہن ۔ میرے خیال میں قاضی صاحب کو بھی ساتھ لیتی آئی ہے ۔" ہم نے بیگم کو غصہ سے گھور کر دیکھا ۔ اور دور کرسی پہ جا بیٹھے ۔ خورشید بیگم سمٹ سمٹا کر نظریں نیچی کئے فرش پر ہی بیٹھ گئی ۔ کل کی خورشید بیگم سے آج کی خورشید بیگم بالکل بدلی ہوئی نظر آئی ۔ بیگم نے اس سے سوال کیا ۔ " خورشید بیگم ۔ قاضی صاحب کو بھی ساتھ لے آئی ہو یا نہیں ۔" خورشید بیگم کی گردن جھک گئی ساتھ ہی ٹپاٹپ آنسو گرنے لگے ۔ بیگم قریب گئیں اور اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اٹھایا تو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی قطار لگ گئی تھی ۔ بیگم کچھ گھبرا سی گئیں اور پوچھا ۔ " خورشید بیگم ۔ تم رو رہی ہو ۔ بتاؤ کیا بات ہو گئی ۔ وہ دیکھو ۔ سامنے صاحب بیٹھے ہیں ان سے نکاح کر لو ۔" یہ سن کر تو خورشید بیگم نے ہچکیاں لے کر رونا شروع کر دیا اور بڑی مشکل سے جواب دیا ۔ " بی بی ۔ کون خورشید اور کہاں کی بیگم ۔ مامائیں بھی کہیں بیگم ہوا کرتی ہیں ۔" اس نے اپنی طبیعت کو سنبھالا اور کہنے لگی ۔ " سنیئے بی بی ۔ سچی بات یہ ہے کہ میں ایک غریب ماں باپ کی بیٹی ہوں ۔ مجھے بچپن سے پڑھنے کا شوق تھا ۔ ماں باپ نے بھی تکلیف اٹھا کر بی ۔ اے تک پڑھا دیا ۔ غریب لڑکیاں تعلیم حاصل کریں تو بھی انہیں کون پوچھتا ہے ۔ چنانچہ میری شادی کسی کارخانے کے ایک ان پڑھ ملازم سے کر دی گئی ۔ شوہر اچھا ہی آدمی تھا ۔ لیکن میری بدنصیبی کو کون کیا کرے کہ تین سال کے بعد ایک بچہ مر کر پیدا ہوا ۔ اور چھ ماہ بعد شوہر بھی چل بسا ۔ میں نے کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کے بجائے محنت کر کے روزی پیدا کرنی چاہی ۔ اب تک دس گھروں میں نوکری کی ہے کہیں صاحب کی نظر بدل گئی تو کہیں صاحبزادے کا دل لٹو کی طرح پھرنے لگا ۔ جہاں بھی یہ حالات دیکھے ۔ ٹھوکر مار دی نوکری پر ۔ اور دوسری نوکری کر لی ۔ کہیں بیگم صاحبہ بدگمان نکلیں تو کہیں صاحبزادی سر پر سوار ہو گئیں ۔ آخر آپ کے گھر اخبار میں اشتہار دیکھ کر آئی ہوں ۔ مجھے معلوم ہوا کہ صاحب فرشتہ صفت انسان ہیں ۔ بچے ماں باپ کے سیکھے سپوت ہیں اور آپ بہت مہربان ہیں ۔ کل جو کچھ کہا سب مذاق تھا ۔ مسخرہ پن میری فطرت میں ہے ۔" پھر ہماری طرف اشارہ کر کے کہا ۔ " آپ اور صاحب میرے ماں باپ ہیں ۔" بیگم نے یہ سن کر ہنس دیا اور شفقت بھرے لہجے میں کہا ۔ " اچھا تو تم یہیں رہ جاؤ ہمارے پاس ۔"
چار سال گذر چکے ہیں ۔ خورشید بیگم نے پورا گھر سنبھال لیا ہے ۔ بیگم کو تو اب جیسے گھر کی فکر ہی نہیں ہے ۔ ـــ ـــ

برجستہ

رؤف خوشتر

ے بی۔ اے بی رٹتے
ئے ہم بی اے ہوئے تو معلوم ہوا
کہ ملازمت کے سارے دروازے بند ہو گئے
ہیں لیکن یونیورسٹی کے دروازے حزبِ مخالف
کے دہن کی طرح کھلے تھے۔ ہم نے جوں توں
کر کے ایم اے میں داخلہ لے لیا اور سچ مانیئے
ہم امتیازی نمبرات سے کامیاب ہو گئے شکر ہے
موجودہ ریلوں کی طرح یونیورسٹیوں سے بھی درجہ سوم
غائب ہوتا جا رہا ہے لگتا ہے کہ ماہرین تعلیم اور ارباب
ریلوے کی میٹنگ ایک ہی اسٹیشن پر ہوئی ہوگی اور وہ
اسٹیشن یقیناً ہل اسٹیشن ہوگا، میٹنگ کانفرنس یا کمیٹی کی
کامیابی اور گرما گرم بحث کے لئے صحت افزاء مقام کا انتخاب
ضروری ہوتا ہے۔ ایم اے کے بعد پھر ملازمت کا مسئلہ درپیش
آیا معلوم ہوا کہ مقامی کالج میں ہنوز ایک جائیداد خالی ہے، سالے صاحب
کے سالے ڈپٹی منسٹر ہیں۔ فوراً ہم نے سالے صاحب کو بیوی بچوں کے
مستقبل کا خیال کئے بغیر ایک پر تکلف دعوت کا اہتمام کر ڈالا۔ انہیں
ہمارے اس غیر متوقع رویہ پہ تعجب ہوا۔ آخر وہ ہمارے یہاں آ گئے بعد از

آزمائش کا موقع دوھن ہم نے تخلیہ کا نعرہ بلند کیا۔ سالے صاحب کو اس نعرہ سے مستثنیٰ قرار دیا۔ سب کے چلے جانے پر ہم نے فوراً لائٹ بند کی اور ساری خدائی اندھیرے میں غرق کر کے سالے میاں کے پیر پکڑے اور اپنا مدعا بیان کیا۔ جس میں ان کی ہمشیرہ کے نیم بیوہ ہو جانے اور بھانجوں کے نیم یتیم ہونے کا ذکر بد تھا۔ سالے صاحب نے سوچا ہوگا "بندے کو اندھیرے میں بڑی دُور کی سوجھی" پھر ہمیں یہ تیقن دلایا کہ وہ اپنی ہمشیرہ کو نیم بیوہ ہونے نہیں دیں گے۔ انجام کار ڈپٹی منسٹر کی توسط سے ہمارا تقرر ہو گیا۔

مکان پر ایک تختی لگوائی جس میں ڈگری نمایاں اور نام مختصر حرفوں میں لکھا تھا یعنی جغرافیہ کے حساب سے ہندستان چھوٹا اور سری لنکا بڑا تھا، یہ جدید جغرافیہ اب سکۂ رائج الوقت کی طرح مشہور ہو رہا ہے۔

ایک روز مکان کے روبرو والے درزی نے درخواست پیش کی کہ اُن کے افسانے ہم اپنی ڈگری اور عہدے کے ساتھ شائع کریں وہ بیچارہ جب افسانے رسالوں کو بھیجتا واپس کر دیئے جاتے۔

ہم نے معقول پس و پیش کے بعد اُن کی ادیبانہ درخواست قبول کر لی اور یوں ہم ادبی دنیا میں دوسروں کے ویزا کے ساتھ داخل ہوئے۔ یقین مانیئے کچھ عرصہ میں افسانوی افق پر چاند بن کر چمکنے لگے۔ اگرچہ کہ روشنی اخذ کی گئی تھی۔ آخر چاند بھی تو روشنی کے لئے سورج کا مرہون منت ہے۔

اب ہر رسالے کے مدیر اپنے خاص نمبر کے لئے پہلے خط، پھر ٹیلی گرام پھر ٹرنک کال کے ذریعہ افسانوں کا مطالبہ کرنے لگے۔ کئی رسالوں کے مدیروں نے ہمارے سالے صاحب کی مالی شراکت سے فن و شخصیت پر خاص نمبر شائع کئے۔ شہر کی ادبی مجالس میں ہماری شرکت اور صدارت لازمی قرار دی گئی (اس میں ہمارے بچوں کی کوششوں کا ہاتھ اور پیر تھے)

بیگم صاحبہ نے اپنی داخلہ پالیسی میں حیرت انگیز طور پر تبدیلی کر دی۔ کہاں وہ بات بات پر روٹھنا آنکھیں دکھانا ٹھنڈی چائے پیش کرنا اور کہاں اب بات بے بات پر مسکرانا ہماری فرمائش پوری کرنا۔

وہ عین ڈاک کے وقت پڑوسیوں کے پاس چلی جاتیں اور وہیں ڈاکیہ ان کی گود میں قارئین کے ڈھیر سارے خطوط ڈال جاتا۔ اس طرح وہ پڑوسیوں پر رعب ڈال لیتیں کہ دیکھو میرے سرتاج ادب کے بھی تاج ہیں۔ ادھر ہم' بھی اپنی خارجہ پالیسی میں تبدیلی کر کے ہر ماہ اپنے محسن و مربی یعنی درزی کے پاس کچھ نہ کچھ سلواتے تاکہ اُس کے ہونٹ سِلے رہیں۔ اس طرح اصلی افسانہ نگار بھی خوش اور ڈمی افسانہ نگار بھی۔

کئی مدیروں نے ہمارے متعلق جاننے کے لئے بیگم صاحبہ سے انٹرویو لئے وہ بڑے نپے تُلے انداز میں کہتیں کہ میرے شوہر ملک کے عظیم ترین افسانہ نگار ہونے کے باوجود مکان میں ایسے رہتے ہیں کہ مجھے یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ انہوں نے ایک بھی افسانہ نہیں لکھا۔ وہ افسانے کس موڈ میں کب اور کیسے لکھتے ہیں میں آج تک نہیں دیکھ پائی ہمیشہ تو بچوں سے کھیلتے رہتے یا شمع ادبی معمہ حل کرتے ہیں یا پھر سامنے والی درزی کی دکان میں گپ شپ میں رہتے ہیں۔

یہ بیانات پڑھ کر ہم مسکرا دیتے بیگم کو کیا پتہ کہ درزی کی دکان میں ہم کیوں بیٹھتے ہیں۔ اگر وہاں بیٹھنا چھوڑ دیں تو پھر یہ کیسے لکھ سکیں گے کہ

ع آتے ہیں غیب سے یہ مضامین بیاض میں یا یہ کہ

لگا رہا ہوں مضامین اور کے انبار

ایک دن ہم نے صحافتی کانفرنس طلب کی اور ڈرامائی انداز میں یہ اعلان کر دیا کہ اب ہم افسانہ نویسی ترک کر کے زبان کو اس کا جائز حق دلانے میں خود کو وقف کر دیں گے۔ کیونکہ یہ بات کہی جا رہی ہے کہ آج اردو زبان شاعری اور افسانے نہیں بلکہ اس کی بقا و ترقی کے لئے قربانی چاہتی ہے۔

ہمارا یہ اعلان ادبی دنیا میں دھماکہ ثابت ہوا۔ ایوانِ ادب میں شگاف پڑ گیا (اگرچہ کہ یہ گذشتہ سال بارش اور طوفان کی شرارت تھی) کئی رسالوں کے مدیروں نے بھوک ہڑتال شروع کر دی (ویسے بھی رمضان کا مہینہ چل رہا تھا) ہزاروں قارئین کا احتجاجی جلوس نکلا (اس کا اہتمام ہمارے سالے صاحب نے کیا تھا) کئی مداح خواتین نے (شاید بیگم کو جلانے کے لئے) جسم پر تیل چھڑک کر خود سوزی کا اعلان کر دیا (انہیں علم تھا کہ تیل نایاب ہے۔ وہ بہانہ بنا کر کہتی ہے کہ تیل کی قلت نے ہمارے جلنے پر بھی پانی پھیر دیا) کئی ناقدین نے ہمارے اس اقدام کو زبان کے بیوہ ہونے کے مترادف قرار دیا۔

بیگم صاحبہ کا بُرا حال تھا، رو رو کر ان کی سیاہ آنکھیں سُرخ ہو گئی تھیں اب ڈاکیہ صرف ان کی ساس کا خط دے جاتا۔ اب ہم مدیروں، مداحوں، ناقدوں اور بیگم صاحبہ کو کیسے سمجھائیں کہ ہم خود اندر ہی اندر اس بیان سے غمزدہ ہیں ——— مگر کیا کریں، ہم افسانے لکھیں تو کیسے لکھیں؟ ہمارے افسانوں کا سرچشمہ خشک ہو گیا ——— درزی کا پچھلے دنوں انتقالِ پُر ملال ہو گیا ———

اب افسانے کہاں سے آئیں گے ——— ▲ !؟

مفلس قارونی

کنوارے کی دُعا

مجھے ایک بیوی کا شوہر بنا دے
خدایا مرا بھی مقدر بنا دے

جہیز اس قدر ساتھ اپنے وہ لائے
بھکاری کو بھی جو تونگر بنا دے

وہ اک کار بھی اپنے ہمراہ لائے
مجھے چاہے پھر اس کا شوفر بنا دے

ہو اک ریڈیو، ایک ٹی. وی بھی جس میں
مرے گھر کو سنگیت سنٹر بنا دے

نوازش ہو سسرال کی اتنی مجھ پر
کہ قطرہ کو بھی جو سمندر بنا دے

مقدر جہاں سے مرا عقد کر کے
مقدر کا مجھ کو سکندر بنا دے

مقدر سے بیوی جو مل جائے ظالم
مجھے ظلم سہنے کا خوگر بنا دے

نچائے وہ پھر جس طرح چاہے مجھ کو
مداری اُسے مجھ کو بندر بنا دے

ہر طور ہو برتری اس کو حاصل
خدایا مجھے اس سے کمتر بنا دے

اگر وہ ہو شعلہ مجھے برف کر دے
اسے جون مجھ کو دسمبر بنا دے

خسر کو بنا دے گورنر کہیں کا
تو سالے کو میرے منسٹر بنا دے

جہاں میری گھر والی جلوہ فگن ہو
اسی گھر کو یارب مرا گھر بنا دے

کروں زن مریدوں کی میں رہنمائی
مجھے زن مریدوں کا رہبر بنا دے

میں خدمت سے اس کی کبھی منہ نہ موڑوں
اسے مالکن مجھ کو نوکر بنا دے

ہو گھر میں میرے ایک بچوں کی پلٹن
پھر اس فوج کا مجھ کو افسر بنا دے

اثر مجھ پہ مطلق نہ ہو گا بیلن کا
کہ احساس کو میرے پتھر بنا دے

جدھر وہ چلائے اُدھر چل پڑوں میں
تو بیگم کو مفلس کا رہبر بنا دے

* * *

"ملئے جناب! یہ میری بہن تو نہیں ـــــ مگر "بہن جیسی" ہے۔"

" اوہو۔ انھیں نہیں پہچانا آپ نے۔ ارے یہ تو میرے بھائی جیسے ہیں ـــــ!"

" آپ نہیں جانتے۔ میری ماں نہ ہوتے ہوئے بھی مجھے بالکل ماں جیسا پیار کرتی ہیں ـــ!"

" نہیں نہیں جناب۔ یہ میرے والد بزرگوار نہیں، میرے باپ جیسے ہیں ـــــ!"

ایسے تعارف سے تو آپ کئی بار دوچار ہوئے ہوں گے مگر آج ہم جن سے آپ کو ملوانے والے ہیں وہ ذرا چونکا دینے والی ہستی ہیں۔ بس تو پھر اب ملئے: "بیوی جیسی" سے۔ جناب یہ بیسویں صدی ہے، ماڈرن زمانہ ہے، جو ہو سو کم ہے۔

" بیوی جیسی ـــ" تعارف کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مرد کی نہ تو سکھی ہوتی ہے نہ سہیلی، نہ ہی دوست، نہ ہی پورے طور پر غم خوار، غم گسار، نصف بہتر، رفیقۂ حیات یا بیوی ہوتی ہے۔ بس بیوی جیسی ہوتی ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ "بیوی جیسی" ایک "نمائشی چیز" ہوتی ہے۔ جی ہاں ـــــ چیز ـ جسے جب کبھی اور جہاں بھی نمائش درکار ہوتی ہے ساتھ لے لیا جاتا ہے، اپنی شان بڑھانے کے لئے۔ ویسے بھی دو بیویوں والوں کی شان نرالی ہوتی ہے۔ کسی اور بات کا اثر پڑتا ہو یا نہ پڑتا ہو لیکن امارت کا اثر ضرور پڑتا ہے۔ کیونکہ آج کے مہنگائی کے عالم میں دو بیویوں کا مالک ہونا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ چاہے "بیوی جیسی" سب کچھ اپنے طور پر ہی کیوں نہ کر لیتی ہو۔

"بیوی جیسی" کے لیے سماج میں کوئی جگہ نہیں ہوتی کیوں کہ یہ نہ تو رکھیل ہوتی ہے نہ ہی طوائف۔ طوائف اور رکھیل کا بھی ویسے تو سماج میں کوئی درجہ نہیں ہوتا۔ مگر ان کی اپنی ایک دنیا ہے ضرور۔

ایک بار ہم ایک پارٹی میں مدعو کئے گئے یہ پارٹی ہائی سوسائٹی (HIGH SOCIETY) والوں نے دی تھی۔ اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں ـــــ (HIGH SOCIETY) ہائی سوسائٹی میں کیا نہیں ہوتا سب کچھ "ہائی" ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ بلڈ پریشر بھی۔ صرف کاروباری باتیں پیسوں کا یا چیزوں کا ہی لین دین نہیں ہوتا۔ بلکہ ہر بات کا "ع۔ غ" ہمارا مطلب قلع قمع ہوتا رہتا ہے۔ جس میں گھریلو سامان سے لے کر "بیوی جیسی" تک شامل ہے۔

پارٹی میں شراب اور شباب دونوں ہی پرشباب تھے۔ ہم بالکل پہلی بار گئے تھے۔ پارٹی کے آداب سے یوں تو واقف تھے۔ مگر ایک بڑی عجیب سی الجھن کا شکار بھی تھے۔ ہر طرف تصنع بکھرا ہوا تھا۔ اصلی چہروں پر میک اپ کی تہوں سے نقلی چہرے چڑھالئے گئے تھے۔ اور ہم بجائے پارٹی سے لطف اندوز ہونے کے نقلی چہروں کی تہیں اتار کر اصلی چہرے دیکھنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ ہم سب کو حیران حیران نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ تب ہی جناب نے ہمیں ٹھوکا دیا۔ ہم ذرا سے سنبھل گئے۔ "کیا ہے جی۔ کیا بات ہے۔"

جناب نے کہا "سنبھل جاؤ ایک پہونچی ہوئی ہستی سے تعارف کرواتے ہیں تمہارا۔"

اس سے پہلے کہ ہم جناب کی بات کا جواب دیتے وہ پہونچی ہوئی ہستی ایک چھوٹی سی حسین صورت کے ساتھ ہمارے نزدیک پہونچ گئی ـــــ جناب نے ہمارا تعارف کروایا۔ "یہ ہیں مسٹر کھنڈیل وال اور یہ ہیں ان کی - - - - - -

اس سے پہلے کہ جناب تعارف کی رسم پوری طرح ادا کر پاتے مسٹر کھنڈیل وال درمیان میں ہی بول پڑے" اور یہ ہیں "مس سوزی ڈیسوزا۔" [سوزی کے میک اپ چڑھے چہرے کو ہزار بار چھان پھٹک کر دیکھنے کے بعد بھی ہمیں تو سوز و گداز دور دور تک نظر نہیں آیا] ہم ذرا سا چونکے دونوں کو ہی آداب کیا جواباً" دونوں نے" ہائے۔ ہائے۔ کیا۔ ہم اس واویلے کے بارے میں غور کر ہی رہے تھے کہ اور دو چار آوازیں" ہائے ہائے" کی گونجیں۔ اور ہم" ہائے ہائے" کے نعروں کے سمندر میں غوطہ زن ہو گئے۔ جب ہائے وائے ختم ہوئی۔ تو ہم نے جناب کو جالیا جو حسن و شباب کی اس محفل میں شراب اور شباب دونوں سے دور اپنی انفرادیت کا اعلان کرتے ہوئے ایک الگ کونے میں' ایک الگ سی میز پر بیٹھ کر غم دوراں کو دھوئیں میں اڑا رہے تھے۔

"کیوں صاحب۔ یہ مس سوزی ڈیسوزا۔ اور مسٹر کھنڈیل وال یہ معمہ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ برتاؤ تو بالکل" بیوی جیسا" تھا اور مسٹر کھنڈیل وال بھی چاہنے والے میاں کی طرح بچھے جا رہے تھے۔" تب جناب نے ہمیں ایک چپت رسید کی اور کہا "تمہارے پورے بیان میں "بیوی جیسا" فقرہ جو تم نے استعمال کیا وہی تمہارے سوال کا جواب ہے ـــــ یعنی کہ مس سوزی مسٹر کھنڈیل وال کی "بیوی جیسی" ہی ہے۔

"چہ معنی دارد ـــــ"

"معنی وانی کچھ نہیں۔ ایسی باتوں کے۔ ایسے جذبوں کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔" بیوی جیسی رکھنا آج کا ایک فیشن ہے اور آج کی اسی پارٹی میں جس مرد کے ساتھ جو عورت نظر آ رہی ہے وہ اس کی بیوی ہی ہو۔ ایسا ضروری نہیں سمجھ

ادھر ہم صرف اوہ کہکر رہ گئے۔ ہم ایک چھوٹی سی دعوت میں مدعو کئے گئے۔ لفظ دعوت چونکہ ہندوستانی ہے۔ اس سے مشرقیت کی خوشبو آتی ہے۔ اس لئے ہم دعوتوں میں چلے جاتے ہیں۔ یہاں بھی اصلی چہرے نقالی کرتے ہوئے نظر تو آتے ہیں۔ تاہم جدا گذر کئے جا سکتے ہیں۔ دعوتوں کے سلسلے میں ہم تھوڑے سے منفرد ہیں۔ اس لئے جناب اگر ساتھ نہ بھی ہوں تو ہم اکیلے ہی چلے جاتے ہیں۔ کہ اب کی بار ہم جس دعوت میں مدعو کئے گئے تھے۔ وہ صرف خواتین کے لئے ہی نہیں تھی نا ہیں حضرات بھی شامل تھے۔ مگر چونکہ ہم اکیلے تھے اس لئے ہم ایک کونے میں دھونی رمائے بیٹھے تھے۔ اچانک ایک گوشے سے [یہ حیدرآبادی گوشت نہیں جس کا اعلان گھروں کی چھتوں پر چڑھتے ہوئے ببانگ دہل کیا جاتا ہے "گوشت گوشہ ہوت" ہا]؟

"آداب بھابی" کی آواز گونجی۔ پلٹ کر دیکھا تو مسعود بھیا کو اپنی جانب آتے دیکھا۔ ان کے ساتھ ایک محترمہ بھی تھیں۔ ہم نے سوچا یہ مسعود بھیا نے شادی کب کرلی۔؟ محترمہ تھیں بھی بڑی خوبصورت اور چہاڑے دار۔ ہماری سوچوں کو مسعود بھیا نے نزدیک آکر اپنے آداب سے چونکا دیا۔ جواباً ہم نے بھی آداب کیا۔ اب پھر تعارف کا سلسلہ شروع ہوا۔ مسعود بھیا نے ڈراما کیا۔

"بھابی مجھے مسعود کہتے ہیں بھابی اور یہ ہیں مس سعدیہ" مس سعدیہ نے بڑی ہی نقرئی آواز میں ہمیں آداب کہا۔ اور ہمارا جواب سننے سے پہلے ہی کسی اور کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے لپک لیں اور اپنی سعادت مندی کا تاثر چھوڑ گئیں۔ ہم انکی چال کے پیچ و خم میں ہی الجھے رہتے کہ مسعود بھیا نے ہمیں جگا دیا۔

"کیا سوچنے لگیں بھابی۔؟

ہم نے حیرت سے کہا "تم نے شادی وادی کرلی کیا"؟ ہماری بات سن کر مسعود بھیا نے زوردار قہقہہ لگایا۔ اور کہا۔

"بھابی آپ تو جانتی ہیں۔ ہم ٹھہرے تخلیق کار۔ رائٹر۔ ہمیں ایک INSPIRATION کی ایک [illegible] کی ضرورت ہوتی ہے سو یہ ہماری [illegible] یعنی کہ INSPIRATION ہیں۔"

"بھیا سو تو ٹھیک ہے اگر انہیں دیکھ کر انھیں ساتھ لے کر گھومنے سے تمہیں پریرنا ملتی ہے تو بیوی بنالو گے تو کیا یہ تمہیں INSPIRE کرنا چھوڑ کر فائر کرنا شروع کردیں گی۔"

"بھابی کیا فرق پڑتا ہے۔ بیوی نہیں ہے پر "بیوی جیسی" تو ہے۔

مسعود بھیا کے مصنف ہونے میں ہمیں کوئی شک نہیں [اب یہ اور بات ہے کہ وہ کس حد تک انصاف کرتے ہیں "بیوی جیسی" سے] ہمارے ذہن میں شاید یہ جملہ کلبلایا ہو کہ اگر مرد کو تخلیق کے لئے پریرنا کی ضرورت ہے تو مصنفہ کے بارے میں مرد کا کیا خیال ہوسکتا ہے۔ اس خیال کے بلبلا کر باہر آنے سے پہلے ہی مسعود بھیا ہم سے کہنے لگے۔ بلکہ پوچھنے لگے۔

"بیوی ہوتی تو کیا کرتی۔؟ یہی نا کھانا پکاتی۔ گھر سنبھالتی۔ بچے پیدا کرتی۔ نسل بڑھاتی۔ اور "بیوی جیسی" کھانا تو یہ بھی کھلاتی ہے۔ کبھی ہوٹلوں یا رستورانوں میں۔ شاپنگ یہ بھی کرواتی ہے فلمیں یہ بھی دکھاتی ہے اور پھر سب

پکچھ اپنے بل پر۔ ہمیں کچھ بھی نہیں کرنا پڑتا سارا خرچ سعدیہ اٹھا کر اپنا کس بل ہم پر نہیں آزماتی۔" بیوی اور "بیوی جیسی" میں فرق ہے تو صرف اتنا کہ بیوی کے سارے فرائض "بیوی جیسی" پورے کرتی ہے۔ دلی، جسمانی، روحانی بھی۔ صرف نسل بڑھانے سے پہلے "مسز" اور "مِس" کی کھلا جاتے ہیں۔ کیوں کہ "بیوی جیسی" کو مرد ہر طرح سے اوڑھتا بچھاتا ہے اسے اپنا تمام قیمتی سرمایہ تو دے سکتا ہے۔ نہیں دے سکتا تو بس صرف اپنا نام نہاد نہیں دے سکتا۔ ہم حیرت زدہ سے مسعود بھیا کی طرف دیکھتے رہے۔ اور مسعود بھیا ہمیں متحیر چھوڑ کر سعدیہ جان "کا پرجوش نعرہ لگاتے ہوئے سعدیہ کی طرف سعادت سے بڑھ گئے اور ہم اپنی تمام تر پریشانیوں کو بٹور کر اپنی جان کی امان پانے کی خاطر گھر کی طرف ہو لئے۔ یہ اور بات ہے کہ اب پارٹی کی بدبو اور دعوت کی خوشبو ہم سے برداشت نہیں ہوتی کیونکہ دعوت بھی اپنا "خول" بدل چکی ہے۔ مشرقیت نے تمام لبادے اتار کر مغربیت کو اوڑھ لیا ہے۔ اور ہم میں مزید جھاڑ پونچھ کا حوصلہ باقی نہیں رہا ہے۔

ہاں۔ "بیوی جیسی" سے ملنے کی تمنا دل کے کسی کونے میں (گوشے میں) گدگدا رہی ہو۔ تو اپنی بیوی سے بچ کر (اگر ہو تو) بہ نفس نفیس کسی پارٹی میں کسی بھی طرح شامل ہو کر "بیوی جیسی" کے درشن کر سکتے ہیں۔

عابد معز
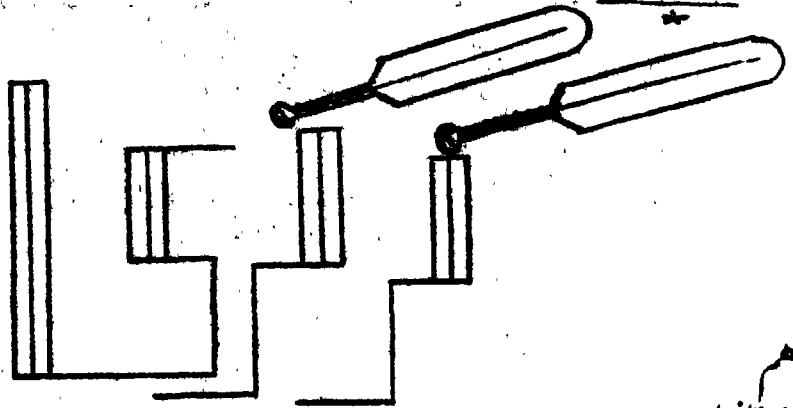
ہم ہندستانیوں کی سماجی زندگی میں دو موسم اہمیت کے حامل ہوتے ہیں' انتخابات کی گرمی اور کرکٹ کی بہار۔ ان دو موسموں کے دوران ہماری زندگی میں کئی تغیرات ہوتے ہیں ہم اس مضمون کے ذریعہ صرف کرکٹ اور اس کے موسمی اثرات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ کہتے ہیں کرکٹ کی ابتدا سولھویں صدی سے انگلستان میں ہوئی جہاں کے امرا نے اس کھیل کی بنیاد ڈالی تھی۔ شروع میں تین وکٹ کے بجائے ایک ہی وکٹ ہوتی تھی۔ گولا اور بیاٹ بھی آج جیسے نہ تھے۔ آہستہ آہستہ اس کھیل کا ارتقا ہوا اور اس نے آج کے کرکٹ کی شکل اختیار کی۔ انگریز اس کھیل کو اپنے ساتھ ہندستان لائے اور چائے' کافی کی طرح ہمیں کرکٹ کا دیوانہ بنا کر واپس ہوئے ہمیں اس نظریہ سے اختلاف ہے' ہمارا خیال ہے کہ کرکٹ ہمارے ملک کا کھیل ہے۔ ہمارے پاس کرکٹ صدیوں سے گلی ڈنڈے کی شکل میں کھیلا جاتا ہے انگریز ہندستان سے گلی ڈنڈا لے گئے اور اسے ترقی دے کر کرکٹ کی شکل عطا کی اور ہمیں واپس لوٹا دیا۔ کرکٹ ناز نخروں سے کھیلا جاتا ہے' جغرافیائی اعتبار سے کرکٹ کھیلنے کیلئے ہلکی دھوپ چاہیئے اس لئے کہ کم روشنی میں کرکٹ کھیلا نہیں جاتا۔ دھوپ کے ساتھ سردی اتنی ہو کہ مخصوص کرکٹ سوئٹر پہن کر برداشت کی جا سکے۔ نزاکت سے پچ تیار کی جاتی ہے۔ میدان میں ہری بھری گھانس ہونی چاہیئے۔ تاکہ کھلاڑی کھیل کے دوران جان بوجھ کر گریں اور خالی وقت لوٹ بھی سکیں۔ کرکٹ دن تمام کھیلا جاتا ہے۔ اہتمام کے ساتھ وقفہ وقفہ سے لنچ' ٹی اور ڈرنکس لئے جاتے ہیں۔ کھیل میں ماروں سے محفوظ رہنے کیلئے کھلاڑیوں کی پیاڈنگ PADDING ہوتی ہے۔ سفید صاف ستھرے کپڑوں اور مخصوص جوتوں کا استعمال ہوتا ہے۔ کرکٹ کا کھیل

دو ٹیموں کے درمیان ہوتا ہے۔ ہر ٹیم میں گیارہ کھلاڑی ہوتے ہیں۔ ویسے بارھواں کھلاڑی بھی ٹیم میں ہوتا ہے جو کھیل سے زیادہ گیارہ کھلاڑیوں کی خدمت کرتا ہے۔ کھیل کے دوران ڈسپلن کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔ ایک گولا پھینکتا ہے، ایک ہی کھیلتا ہے اور پھر گولے کے پیچھے ایک ہی لپکتا ہے ویسے میدان پر اور کھلاڑی بھی موجود رہتے ہیں اسی لئے شاید ہمیں کرکٹ کا کھیل کچھ زنانہ سا لگتا ہے۔ کرکٹ کی بہ نسبت ہاکی فٹبال اور والی بال مردانے کھیل لگتے ہیں۔ ایک گولے کے پیچھے تمام کھلاڑی گرتے پڑتے دوڑتے اور لڑتے ہیں

کرکٹ طویل ترین کھیل ہے۔ شاید ہی کوئی اور کھیل اتنے دن کھیلا جاتا ہے۔ کھیل کی طوالت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اکثر میاچوں کا فیصلہ مقررہ پانچ یا چھ دن میں ہو نہیں پاتا۔ طوالت کی وجہ ہی سے اکثر ہوشیار ممالک کے باشندے کرکٹ نہیں کھیلتے بلکہ وہ اس کھیل میں کئی دن الجھے رہنے والوں کو بیوقوف سمجھتے ہیں۔ اور اب کرکٹ کے عاشق بھی طوالت سے گھبرا کر ون ڈے انٹرنیشنل اور لمیٹڈ اوورس (LIMITED OVERS) نامی مختصر کرکٹ میاچ ایجاد کرلئے ہیں۔ اس کے باوجود بھی آج کل وہی روایتی طویل کرکٹ پسند کیا جاتا ہے۔ اور اسی طوالت کی وجہ سے کرکٹ کیلئے ہمارا شوق جنون کی حدوں کو بھی پار کر گیا ہے۔ ہمارے ایک دوست کہتے ہیں۔ "کرکٹ کھیلوں کا بادشاہ ہے۔ ہاکی، فٹبال، ٹینس وغیرہ بھی کوئی کھیل ہیں۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹے میں فیصلہ ہو جاتا ہے، غم روزگار سے صرف چند منٹ کی فرصت حاصل ہوتی ہے۔ کرکٹ میں بس کھیلتے رہو کھیلتے رہو، منٹ سے گھنٹے اور گھنٹوں سے کئی دن اور کئی دن کے تین، چار، پانچ اور چھ میاچ یعنی ہفتے دنیا سے بے خبر ہو کر کھیل میں گم ہو جاؤ" ہمارے دوست کرتے بھی ایسا ہی ہیں۔ میاچ کے دوران وہ کسی کام کے قابل نہیں رہتے۔ وہ کھلاڑی نہیں ہیں صرف کامنٹری سنتے ہیں کامنٹری شروع ہونے سے پہلے کھانا کر تیار ریڈیو کے پاس بیٹھتے ہیں۔ دوران کامنٹری کسی بھی قسم کی مداخلت پسند نہیں کرتے لنچ کے وقت "لنچ" ٹی ٹائم پر چائے، ڈرنکس کے وقت شربت استعمال کرتے ہیں شام میں کھلاڑیوں سے زیادہ موصوف تھک جاتے ہیں۔ ذرا سی بات پر کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔

ہمارے یہاں کرکٹ سال کے بارہ مہینے کھیلا جاتا ہے، جب بھی کوئی بیرونی ملک کی ٹیم آتی ہے تو کرکٹ وبائی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ امیر اور غریب حسب مقدور میدانوں اور گلی کوچوں میں کرکٹ کھیلتے ہیں۔ متمول لوگ تمام لوازمات کے ساتھ میدانوں میں کھیلتے ہیں تو غربا گلی کوچوں میں کرکٹ کا رنگ جماتے ہیں۔ دیوار پر تین لکیریں کھینچ کر وکٹ بنائی جاتی ہے۔ وکٹ سے گز دو گز کے فاصلہ پر چار انچ چوڑا پھلا [?] لئے جذبات سنبھالتے ہوئے بیٹسمین کھڑا ہوتا ہے۔ بیٹسمین سے دس گز دور ایک لڑکا اپنی چپلیں چھوڑے بولنگ کر رہا ہوتا ہے۔ بولنگ کیلئے اینٹ، کنکر سے لیکر کاک اور کرکٹ کے گیند استعمال ہوتے ہیں گلی کوچوں میں کرکٹ کی وجہ سے اکثر ٹریفک رکتی ہے تو کبھی ٹریفک کی وجہ سے خود کرکٹ رک جاتا ہے، راہگیروں کو مار بھی لگتی ہے۔ ایک وقت ایک راہگیر نے گیند کی زبردست مار کھا کر احتجاج کیا "کرکٹ کیا ٹریفک میں کھیلا جاتا ہے" اس احتجاج پر ایک لڑکے نے ہم کو سمجھایا "جناب والا کرکٹ ٹریفک ہی کا کھیل ہے۔ اس میں گلی (GULLY)

اسکوائر لگ (SQUARE LEG) نامی چوپایا بھی ہے۔ کھلاڑی ڈرائیو (DRIVE) کرتے ہیں شارٹ
کٹ (SHORT CUT) مارتے ہیں۔ رَن (RUN) کرتے ہوئے سلپ (SLIP) ہوتے ہیں۔ ایکسیڈنٹ
سے زخمی بھی ہوتے ہیں" اب آپ ہی بتلائیے ہم اسے کیا جواب دیتے۔

کرکٹ سے دلچسپی تقریباً سبھی کو ہوتی ہے اکثر حضرات کو کرکٹ کا جنون ہوتا ہے۔ کرکٹ سے والہانہ محبت
کرنے والوں کو تین زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلے زمرہ میں کھلاڑیوں کو شامل کیا گیا ہے۔ کھلاڑیوں کو آسانی
سے پہچانا جاسکتا ہے۔ اکثر سفید کپڑے زیب تن کئے ہوتے ہیں۔ بولر کے پتلون پر گیند کی رگڑ سے لال رنگ
کے دھبے ہوتے ہیں اور اپنی انگلیوں کو بولنگ کرنے کے انداز میں بجاتے رہتے ہیں۔ بیاٹسمین دونوں مٹھیاں
بند کئے ہوا میں اسٹروکس لگاتے ہیں۔ فیلڈر اپنی چال سے ظاہر ہوتا ہے ایسا لگتا ہے وہ گویا فیلڈ کرنے کیلئے
دوڑ رہا ہے۔ کھلاڑی وقتاً فوقتاً "امپائر" یا ہاؤز دیٹ (HOW IS THAT) کی اپیل بھی کرتے رہتے ہیں۔

دوسرے زمرہ کے لوگ کرکٹ نہیں کھیلتے بلکہ کرکٹ کو کھیلتا ہوا دیکھ کر لطف اٹھاتے ہیں۔ ایسے
اشخاص کسی زمانے میں کرکٹ کے کھلاڑی رہ چکے ہوتے ہیں یا پھر ان کی کسی کھلاڑی سے رشتہ داری ہوتی ہے
یہ حضرات کھیل شروع ہونے سے پہلے ہی سے میچ دیکھنے کی تیاری کرنے لگتے ہیں۔ سفید کپڑوں کا انتظام
ہوتا ہے۔ دوربین مہیا کی جاتی ہے پرانے رسایل اور اخبارات اکٹھے کئے جاتے ہیں۔ جیبی ٹرانسسٹر خریدا
جاتا ہے آخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوتی ہیں۔ میچ کے دن ایک شان بے نیازی کے ساتھ ٹوپی لگائے بستر
توشہ دان اور رسایل ایک بغل میں دبائے تو دوربین ٹرانسسٹر اور چائے کافی سے بھرا تھرماس دوسرے
بغل میں لٹکائے خوش و خرم اسٹیڈیم جاتے ہیں۔ منچلے حضرات گندے انڈے، میوؤں کے چھلکے، پٹاخے اور
مختلف باجے بھی ساتھ رکھتے ہیں۔ اسٹیڈیم پہنچ کر جگہ منتخب کی اور ڈیرہ جما دیا۔ کھیل سے بیزار ہوئے تو رسایل
سے شوق فرمانے لگے۔ تھک گئے تو بستر پر لیٹ گئے خوش ہوئے تو پٹاخے چھوڑنے لگے۔ شرارت سوجھی
تو باجے بجانے لگے۔ گندے انڈے میوؤں کے چھلکے اور چپلوں کا آزادانہ تبادلہ بھی ہونے لگتا ہے اور صاحب
میچ دیکھ کر جب گھر واپس ہوتے ہیں تو تھکے ہارے، بال پریشان، چہرے اور کپڑوں پر گندے انڈوں
اور چپلوں کے نشان اور اپنے اثاثہ میں سے کوئی ایک چیز غائب رہتی ہیں پھر بھی کھیل پر تبصرہ جاری رہتا ہے

تیسرے زمرے کے لوگ نہ کرکٹ کھیلنا جانتے ہیں اور نہ ہی کرکٹ کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگ
صرف کرکٹ کو سننا پسند کرتے ہیں، ہمارے درمیان کرکٹ کو سننے والوں کی بہتات ہے۔ کرکٹ میاچ کے
دوران آپ جس کسی کو بھی دیکھئے وہ اپنے کان کو ریڈیو یا ٹرانسسٹر میں گھسائے یا پھر ٹرانسسٹر کو ہی کان میں
لگائے نظر آئے گا۔ گھر ہیں، دفاتر ہیں چائے خانے ہیں، سڑک پر غرض ہر جگہ ریڈیو کے اطراف لوگ کان
جوڑے نظر آتے ہیں۔ کامنٹری کے دوران لوگ اپنے تمام کاروبار چھوڑ کر بس ریڈیو کے ہو رہتے ہیں ریڈیو
کے پاس "اچھلتے" کودتے، ہنستے اور خوش ہوتے نعرے لگاتے ہیں تو کبھی اداس بھی ہو جاتے ہیں۔ ایک وقت
ہم دفتر سے تھکے ماندے رات دیر گئے گھر پہنچے۔ ٹھیک نصف شب پر تھی، ہم نے دروازہ کھٹکھٹانا ہی سے

ہانک لگائی "بیگم کھانا دیجئے بھوک سے مرا جارہا ہوں" زوجہ محترمہ نے پیار سے جواب دیا "آج ہم کھانا باہر کھائیں گے" "وہ کیوں؟" ہمارے سوال پر وہ جواب میں کہنے لگیں "آج بہت دلچسپ کھیل ہوا، میں کامنٹری سنتی رہی۔ گوشت بلی کھا گئی، چوہوں نے برتن پھوڑ ڈالے، بہت مشکل سے ہم یہ میچ جیت سکے۔ ایک وقت تو میں سمجھی کہ ہم میچ ہار گئے، لیکن واہ ..." ہمارے چہرے پہ ایک رنگ آیا اور ایک گیا۔ ہم انھیں ڈانٹ ڈپٹ کرنے کی سوچ رہے تھے کہ بیگم خفا ہونے لگیں "آپ میں اسپورٹسمین اسپرٹ ہے ہی نہیں! ایک وقت کھانا نہ ملنے پہ اتنا ہنگامہ کرتے ہیں۔" ہم اپنا سا منہ اور بھوکا پیٹ لے کر چپ ہو گئے۔

کرکٹ اور کامنٹری کا چولی دامن کا رشتہ ہوتا ہے۔ اکثر حضرات تو یہ سمجھتے ہیں کہ کامنٹری بھی کھیل کا ایک حصہ ہے۔ کامنٹری دینے کیلئے بھی ایک ٹیم ہوتی ہے جس کا کپتان کوئی بوڑھا کرکٹ کا کھلاڑی (ایکسپرٹ کامنٹیٹر) ہوتا ہے۔ کھلاڑی گرلہ اور بیاٹ سے کھیلتے ہیں تو کامنٹری دینے والے اپنے خیالات سے کرکٹ کھیلتے ہیں، کہتے ہیں اگر ایسے بیاٹنگ کرتے تو یوں ہوتا، بولر بولنگ ایسے کرتا تو فلاں کو آسانی سے اوٹ کر سکتا تھا بوریت خیالات کے اظہار پہ ہی ختم نہیں ہوتی بلکہ کھیل کو چھوڑ کر کامنٹیٹر حضرات بحث و مباحثہ میں بھی الجھ جاتے ہیں۔ شاید اسی بوریت کا اجر دینے کیلئے آج کل کامنٹری کے دوران مختلف اشتہارات سے دل بہلایا جاتا ہے ہر کس و ناکس کرکٹ کی کامنٹری سنتا ضرور ہے لیکن کامنٹری کو سمجھنا ہر ایک کے بس کا روگ نہیں ہے اس لئے کہ کرکٹ کے گول میدان کے مختلف حصوں کے مختلف نام ہوتے ہیں۔ بیاٹسمین کی ہر ادا، بولنگ کے طریقے گولا اچھلنے کے انداز اور امپائر کے اشاروں کے الگ الگ نام ہوتے ہیں۔ الغرض کامنٹری سمجھنے کے لئے آپ کو کرکٹ کے ادب کا بغور مطالعہ کرنا پڑتا ہے ورنہ کرکٹ کا منٹری بقول ہمارے دادی ماں "ریک... کی بکواس" بن جاتی ہے۔ اکثر سماجی تقاریب میں بھی کرکٹ ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ کھانے کی دعوتیں متاثر نظر آتی ہیں۔ دستر خوان کرکٹ کے میدان کا منظر پیش کرتا ہے۔ ہمارے بزرگ نے ہمارے زمانے کی "ہمارے زمانہ میں دعوتیں بڑی ہی شاندار ہوا کرتی تھیں، جیسے 5 دن کا کرکٹ میچ ہوتا ہے کیا ڈھیلی بولنگ اور فیلڈنگ ہوتی تھی۔ خوب چوکے چھکے لگائے جاتے تھے۔ لوگ دو، دو اننگز کھیلتے تھے۔ آج کل تو بس ون ڈے ہوتے ہیں جو ون ڈے انٹرنیشنل کے مساوی ہے" لوگ گفتگو بھی "کرکٹی زبان" میں کرتے ہیں۔ جن کسی کو بھی دیکھئے کرکٹ کے چند الفاظ استعمال کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ایک مریض نے ڈاکٹر سے کہا "ڈاکٹر صاحب سر میں درد ہے، ایسے لگتا ہے کوئی سر کے اندر بیٹنگ کر رہا ہے۔ اسکوائر ڈرائیو اور ہک کر کے کافی پریشان کر رہا ہے" ڈاکٹر صاحب نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "کوئی بات نہیں، میں صرف تین گولیاں پھینک کر درد کی وکٹ لے لوں گا" ایک اور وقت جب ہم نے ایک آٹو رکشا والے سے اپنی جائے مقام چلنے کیلئے کہا تو اس نے جواب دیا "کپتان صاحب میں لانگ آن (LONG ON) پہ نہیں جاؤں گا۔ میں شارٹ لگ کا فیلڈر ہوں۔ اس طرف چلنا ہے تو چلئے ورنہ بارہویں کھلاڑی کو بلا لیجئے گا۔"

اردو کے شاعر اور شاعری بالخصوص مزاحیہ، کرکٹ سے کافی متاثر نظر آتی ہے۔ آپ نے مشاعروں

یں دیکھا ہوگا کہ شاعر "چوا" عرض کرتا ہے "چھکا" لگاتا ہے اور آہستہ بینگ کے روپ میں اکتا دینے والی غزل پڑھتا ہے: آج کل جدیدیت کے نام پہ مصرعہ ثانی کو مصرعہ اولی پہ "اوور تھرو" (OVER THROW) کیا جاتا ہے۔ شعر کے وزن کو "اسپن" (SPIN) کیا جاتا ہے اور تو اور آج کل بہت سارے شعرا کا کلام سلف اوٹ (SELF OUT) قسم کا ہوتا ہے۔ مختصراً کرکٹ شاعر، شاعری اور سامعین میں جو رشتہ ہے وہ اس شعر میں واضح ہے ؎

لوگ پھینکے گندے انڈے پیچ شاعر نے کیا
شعر کی محفل میں کرکٹ کا مزہ سا آگیا

الغرض صاحب! کرکٹ کے موسم میں ایک عجیب سی بیکار مصروفیت اور ہما ہمی ہوتی ہے۔ بچے اور نوجوان کرکٹ کھیلنے، دیکھنے اور سننے میں مصروف رہتے ہیں۔ بڑے لوگ بھی ان سے پیچھے نہیں ہوتے تمام کاروبار ٹھپ ہو جاتے ہیں۔ لگتا ہے زندگی کرکٹ کے اطراف ٹھہر گئی ہے جبکہ جہاندیدہ لوگ کرکٹ سے بیزار ہو کر کہتے ہیں "کرکٹ! کرکٹ نہ ہوا یہ تو اچھی خاصی "کرکری" ہے ——————— !

"کلب کی ایک رات"

ڈاکٹر غیاث صدیقی

زندگی کی بنیادی ضروریات میں اب کلب بھی شامل ہوگیا ہے۔ میرے ایک پڑوسی دوست نے ہزار پہلوؤں سے مجھے قائل کرکے کلب کا ممبر بنا دیا تھا۔ یہ بات بعد کو سمجھ میں آئی کہ روزانہ کلب آنے جانے کے لئے دراصل اُن کو میری ضرورت نہیں بلکہ میری کار کی ضرورت تھی۔

زندگی میں پہلی بار کلب گیا تھا۔ سارے چہرے نئے تھے۔ پڑوسی صاحب نے میرا تعارف کرایا تھا "آپ سے ملئے قاضی غیاث الدین، شاعر بھی اور پڑوسی بھی"۔ پڑوسی کے لفظ پر سارے ہونٹ تبسم سے لبریز ہوگئے۔ ایک جلد باز بے تکلف قسم کے صاحب نے آخر کہہ ہی دیا "تو آپ کو کلب آنے جانے میں سہولت ہوگئی"۔ اس مختصر تعارف کے بعد سب لوگ مختلف پارٹیوں میں تقسیم ہوگئے۔ برج کی پارٹی، ایک رمی کی پارٹی، ایک پارٹی چیس کھیلنے کو بیٹھ گئی۔ پہلے ہی دن مجھے اکیلا دیکھ کر دو خواتین ازراہِ ہمدردی میرے قریب آکر صوفے پر بیٹھ گئیں۔ ایک محترمہ جو کم سے کم کپڑوں میں تھیں گرمی کی شکایت کرنے لگیں۔ وہ اپنے مختصر کپڑوں کا جواز ڈھونڈ رہی تھیں۔ دوسری محترمہ کے ہاتھ میں ایک انگریزی ناول اور بڑی سی پرس کو دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ ان کا ادبی ذوق یقیناً اونچا ہوگا۔ کم لباس محترمہ نے مجھ سے کہا۔ "مجھ سے گرمی برداشت نہیں ہوتی۔ حالانکہ اکثر لوگ یہاں گرم کپڑے پہن کر آئے ہیں"۔ دوسری محترمہ جو چالیس کے لگ بھگ ہوں گی، کہا "دس سال قبل مجھے بھی گرمی کی برداشت نہیں تھی"۔ پھر میری جانب متوجہ ہوکر پوچھنے لگیں۔ "آپ اپنی مسز کو کلب کیوں نہیں لائے؟"

میں نے کہا۔ "وہ کئی ماہ سے مسلسل بیمار ہیں" اتنے میں شمبھو داس جی بھی گفتگو میں شامل ہو گئے۔
کہنے لگے۔ "کیا آپ کی مسز سخت علیل ہیں؟" میں نے مختصر جواب دیا۔ "ہاں" وہ پھر پوچھنے لگے۔
"کیا بیماری سے بچ جانے کی امید ہے؟" میں حیرت سے انھیں دیکھنے لگا۔ وہ سٹپٹائے، پھر کہنے لگے
"دراصل میں کہنا کچھ اور چاہتا تھا مگر منہ سے کچھ اور نکل گیا۔ آپ ہی دیکھئے نا کہ روز آنہ کوئی نہ
کوئی خوش خبری مجھ کو سننی پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر، اس دوست کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ فلاں
دوست کی بیوی بھاگ گئی۔ پڑوسی کی بیوی اس قدر سخت علیل ہے کہ بچنے کی قطعاً امید نہیں۔ ایک
عزیز کی بیوی نے زہر کھا لیا۔ لیکن ہمارے لئے کوئی خوش خبری نہیں!" میں نے حیرت سے پوچھا۔
"کیا آپ ان تمام حادثات کو خوش خبری سمجھتے ہیں؟" کہنے لگے۔ "پھر آپ کیا سمجھتے ہیں؟ کیا آپ نے
گذشتہ بیس برسوں سے ایک ہی سوٹ پہن رکھا ہے؟ ایک ہی کار میں بیٹھتے آئے ہیں؟ آپ کے
کمرے کا بلب جل جانے کے بعد آپ نے دوسرا بلب روشن نہیں کیا؟ بیڈ شیٹ آپ نے بیس سال سے نہیں بدلی؟"
میں شمبھو داس جی کی بے سر و پا باتوں سے بے حد پریشان تھا کہ کیا جواب دوں؟ کم لباس محترمہ نے کہا
"شمبھو داس جی، آپ، کار، بلب، جوتا، بیڈ شیٹ اور فاؤنٹن پن سے اپنی شریکِ حیات کا موازنہ کرتے ہیں
اسی طرح ہم خواتین بھی اپنے شوہروں کے تعلق سے سوچنا شروع کر دیں تو پھر آپ کہاں رہیں گے؟"
شمبھو داس جی مسکرائے "بھابی، میرا کہنا بھی تو یہی ہے کہ سوچو، بالکل ایسا ہی سوچو، ایک نہیں
ہزار بار سوچو مگر بھگوان کے لئے اس پر عمل بھی کر ڈالو اور ہم مظلوموں کی گردنوں کو سولی کے پھندوں
سے نکالو" دونوں خواتین خفا ہو کر چٹ سے اٹھ گئیں اور شمبھو داس جی ہنستے رہے۔ مسلسل ہنستے رہے
میں نے مسکرا کر ایک آنکھ دبائی "خوب شمبھو داس جی، آپ نے یہاں سے دونوں کو اٹھا دینے کیلئے
اچھا حربہ استعمال کیا!" وہ چونک پڑے اور سوالیہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولے۔ "کیا میرا بیان
کو آپ بناوٹ سمجھتے ہیں؟ قاضی صاحب، میری بیوی...... بھگوان کسی کو ایسی بیوی نہ دے، وہ کبھی بیمار
نہیں ہوتی، خون کا امتحان کر لیجئے، ہیموگلوبین میرے خون میں ستر فی صد اور اس کے خون میں صد فی
صد، وزن میں مجھ سے پندرہ پاؤنڈ زیادہ کیسی سخت سردی پڑے، کتنی ہی تیز موسلا دھار بارش
ہو اس کو چھینک تک نہ آئے گی، کسی ناگوار واقعے پر اس کی پیشانی پہ بل نہیں آئے گا۔ حتیٰ کہ میں جھڑک
دوں تو بھی وہ مسکرائے گی، صبح، دوپہر، شام ہر وقت مسکراہٹ اور ازل سے ابد تک ہونٹوں
پر تبسم مجھے آرزو رہی کہ وہ کبھی تیز آواز میں مجھ سے، ملازمین سے، عزیزوں سے، پڑوسیوں سے
اور دوستوں سے لہجہ میں تلخی ڈال کر بات کرے، بھگوان غارت کرے اس کی مسکراہٹ کو،
ہونٹوں سے نیچے اترتی ہی نہیں۔ جب دیکھو گھر کے کام کاج میں مصروف میرے کپڑے دھل رہا یا
استری ہو رہی ہے۔ میرے لئے طرح طرح کی ڈشس پکائی جا رہی ہیں۔ گرمی میں جھلس رہی ہے
پسینے میں شرابور ہے، لیکن میرا سامنا ہوتے ہی اسپرنگ کی طرح اچک کر مسکراہٹ اس کے

لبوں پر آجاتی ہے۔ میں یہ توقع رکھتا ہوں کہ وہ موسم کا بے حد مصروفیت کا' یا کم از کم میری بے توجہی کا رونا رولے گی
بھگوان کی قسم ایسا مسکراتی ہے۔ میں دل میں ایک بھالا اتر جاتا ہے۔ اتنا کہہ کر شمبھو داس جی نے بھرائی ہوئی
آواز میں کہا۔ "قاضی صاحب' بھگوان کے لئے اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ سے مجھے نجات دلائیے ورنہ میں جی
نہ سکوں گا۔" اور میں نے دیکھا کہ واقعی شمبھو داس جی کی آنکھیں بھیگ گئی ہیں اور سسکیاں لے رہے ہیں۔

میں وہاں سے اُٹھ گیا۔ جب دوسرے ہال میں گیا تو دونوں خواتین قریب آگئیں اور مجھ سے کہنے لگیں۔
"شمبھو داس جی سے آپ کا مکمل تعارف ہو گیا نا؟" میں سراسیمہ تھا کہ بے چارے کو کسی خانے میں فٹ کروں
میں نے کہا "یا تو بہت پی گئے ہیں یا پھر اُن کے دماغ کے دو ایک اسکرو ڈھیلے ہیں۔" وہ کہنے لگیں' نہیں
قاضی صاحب' موصوف روزانہ ہم سے بھی یہی درخواست کرتے ہیں کہ اُن کو اُن کی بیوی کی مسکراہٹ'
محبت' شرافت سے نجات دلائیں' کم لباس محترمہ نے کہا۔" خیر مجھ سے تو انہوں نے صرف ایک ہی مرتبہ
کہا تھا۔ اگر دوسری بار کہیں تو سوچنا پڑے گا۔

اتنے میں میرے پڑوسی آگئے "بھئی' اب گھر چلتے ہیں۔ جیب میں جتنے پیسے تھے رمی کی نذر ہو گئے
اور آپ نے کلب کی تفریح بھی کر لی ہوگی۔" پھر دونوں خواتین سے بھی مخاطب ہوئے۔ آئیے آپ دونوں
بھی ہمارے ہی ساتھ چلئے راستے میں آپ کو ڈراپ کر دیں گے۔ غرض دونوں محترماؤں کو اُن کے
گھر اور پڑوسی کو اُن کے گھر چھوڑ کر جلا تین لیٹر پٹرول پھونک کر میں گھر پہنچا تو میری بیوی میز پہ میری
منتظر تھی اور اُس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ مجھ سے تاخیر کی وجہ پوچھ رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا
کیا اس مسکراہٹ کو کوئی زہر کہہ کر اس سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کر سکتا ہے؟ لیکن جب کوئی
عورت مسکراتی ہے تو مجھے سیٹھ شمبھو داس جی کے آنسو اور سسکیاں یاد آتی ہیں۔ وہ دن اور آج کا
دن پھر کلب نہیں گیا ▲

(پہلا رُخ)

قمر الزماں قمر
(راچی)

شکوۂ شوہر

۱

کیوں نہ ہم شکوہ کریں کاہے کو خاموش رہیں　طعنے بیوی کے سُنیں اور ہمہ تن گوش رہیں
بارِ غم دل پہ لئے بے پئے مدہوش رہیں　کیوں نہ ہم حضرتِ اقبال کے پاپوش رہیں
زن مریدی میں جو گذری ہے جوانی اپنی
قابلِ رحم ہے، پُردرد کہانی اپنی

یہ حقیقت ہے کہ بیچارہ و مجبور ہیں ہم　ناز اُٹھانے کے لئے مُفت کے مزدور ہیں ہم
گرچہ نقلی ہی سہی ستمگر و منصور ہیں ہم　"جی حضوری" میں ہمیشہ ہی سے مشہور رہیں ہم
"ہمہ تن شکوۂ اربابِ وفا بھی سُن لے
خوگرِ مدح سے تھوڑا سا گلہ بھی سُن لے"

ہم تو جیتے ہیں فقط تیری ہی خدمت کیلئے　اور مرتے ہیں تری چشم عنایت کے لئے
نوکری بھی ہے تری رفع ضرورت کیلئے　ورنہ کچھ شوق نہ تھا اپنی حجامت کیلئے
روح اپنی ترے گیسو پہ بھلا کیوں مرتی
تیری پوجا کے عوض شعر کی پوجا کرتی

ٹل نہیں سکتے سرِ بزم ہو اڑ جاتے ہم　لاکھ ہو ٹنگ ہی سہی پر نہ اکڑ جاتے ہم
روکتا پڑھنے سے کوئی تو بگڑ جاتے ہم　رستمِ شعر سے بھی منچ پہ لڑ جاتے ہم
بوجھ دوشن کا بصد صبر اُٹھایا ہم نے
کیا نہ سینے پہ تجھے اپنے سُلایا ہم نے

تو ہی کہہ دے کہ دُلہن تجھ کو بنایا کس نے؟　دل کے گلدان میں پھولوں سا سجایا کس نے؟
اپنے بھارت کا ہر اک شہر گھمایا کس نے؟　جنگلوں میں بھی ہنی مون منایا کس نے؟
باوجود اس کے ہے شک میری وفاداری پر
جانِ جاں، حرف ہے یہ تیری رواداری پر

تیری فرقت کا تصوّر لئے بدحال پھرے ۔۔۔ دربدر ٹھوکریں کھاتے ہوئے بے حال پھرے
ایسا پھرتے رہے جیسے کوئی کنگال پھرے ۔۔۔ ایک دن کون کہے پورے ہی چھ سال پھرے
نوکری کے لئے در کوئی نہ چھوڑا ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیا گھوڑا ہم نے

آگیا عین پڑھائی میں اگر تیرا خیال ۔۔۔ تک دھنا دھن کا دکھا ڈالا اُسی وقت کمال
اپنے بھیجے سے سرک گیا مستقبل و حال ۔۔۔ اور اعصاب پہ چڑھ دوڑا ترا حسن و جمال
دل سے دل تیرے تصور میں صنم ایک ہوئے
سوئیوں کی طرح بارہ بجے ہم ایک ہوئے

رکھتے ہیں خدمت و الفت کے خزانے معمور ۔۔۔ پھر بھی کیا جانے کہ کیوں رہتی ہے تو دور کہیں دور
لٹھ گھماتا جو چلے اس کو ملے حور و قصور ۔۔۔ اور ہم چاہنے والوں کو فقط وعدۂ حور
بے رُخی جب تری ایسی ہے جیئیں ہم کیسے
اپنے دامانِ دریدہ کو سیئیں ہم کیسے

شعر گوئی کی ہماری کبھی قائل نہ رہی ۔۔۔ ہم تو مائل بہ سخن تھے تو ہی مائل نہ رہی
غیر سے آنکھ لڑانے کبھی حائل نہ رہی ۔۔۔ کیا کبھی تجھ سے نظر پیار کی سائل نہ رہی
پھر بھی کہہ دے کہ یہ انگشت نمائی کیوں ہے
بدظنی دل میں ترے جان! سمائی کیوں ہے

لوگ کہتے ہیں سرِ شام یہی ہوتا ہے ۔۔۔ عشق کی شادی کا انجام یہی ہوتا ہے
پی کے پچھتائے جو وہ جام یہی ہوتا ہے ۔۔۔ ٹھوکریں کھائے جو وہ کام یہی ہوتا ہے
طعنہ زن لوگ ہیں احساس تجھے ہے کہ نہیں
اپنے شوہر کا بھی کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں

٭ ٭٭ ٭

(دوسرا رُخ)

شکوۂ بیوی

کون کہتا ہے تمہیں چپ رہو خاموش رہو ۔۔۔ طعنے بیوی کے سنو اور ہمہ تن گوش رہو
شکوہ کرنے میں یہ لازم ہے کہ با ہوش رہو ۔۔۔ فرض سے اپنے نہ زنہار سبکدوش رہو

زن مریدی کے عوض شاعری خود کرتے ہو
اور الزام تھوڑا مرے سر دھرتے ہو

شکوہ بے جا ہے کہ بیچارہ و مجبور ہو تم　　گھر سے مطلب نہیں جب دیکھئے کافور ہو تم
چھوٹا منہ بات بڑی، سترید و منصور ہو تم　　سچ کہوں! عشق و محبت میں بس اچھور ہو تم
کبھی ہم سے کبھی دائی سے شناسائی ہے
وہ بھی ڈائن بڑی حرآفہ و ہرجائی ہے

تم تو جیتے ہو فقط اپنی ہی شہرت کے لئے　　اور مرتے ہو تو بس اپنی ہی عظمت کے لئے
نوکری کرتے ہو خود اپنی ضرورت کے لئے　　در بدر پھرتے ہو، مال و زر و دولت کے لئے
محفلِ شعر کی بو سونگھتے پھرتے ہو تم
مثلِ پروانہ، ہر اک بزم میں گرتے ہو تم

کور چشمی ہے کہ ہر بات پہ اڑ جاتے ہو　　جب غلط بات پہ ٹوکوں تو بگڑ جاتے ہو
جھاڑو دینے کو کہوں، جب تو جھگڑ جاتے ہو　　میرے گھر والے جب آتے ہیں تو لڑ جاتے ہو
یہ غلط ہے کہ مرا بوجھ اٹھایا تم نے
جب گھٹا کچھ، میرے میکے سے منگایا تم نے

حرص کو راہ نما اپنا بنایا تم نے　　اور فقط اوروں پہ احسان جتایا تم نے
آج تک کوئی کمال اپنا دکھایا تم نے　　جو بھی اقدام کیا دھوکا ہی کھایا تم نے
پھر بھی ہے ناز تمہیں اپنی وفاداری پر
اینٹھتے پھرتے ہو اس شیوۂ بازاری پر

تم سے ناکارہ کو بیکار بھلا کون کہے　　در بدر ٹھوکریں کھانے کا گلہ کون سنے
حرص کے جال میں تم جیسا بھلا کون پھنسے　　پھاڑے ہر روز جو دامن تو سیا کون کرے
یوں ستانے کو مرے کوئی دقیقہ چھوڑا!
زندگی ہائے میری ہو گئی روڑا روڑا

گھر سے غائب رہیں اشیا کبھی چاول کبھی دال　　بھوکے بچوں کی فغاں کا نہ تمہیں آیا خیال
تم دکھاتے رہے ہر روز کمال　　زندگی ہوتی رہی میری ذرا دم پامال
بال بچوں کا جو حق ہے وہ بھی مارا تم نے
وقت سڑکوں پہ ٹہلنے میں گذارا تم نے

نشۂ شعر سے آنکھیں رہیں ہر دم مخمور　　داد پائی تو اُچھلنے لگے مثلِ لنگور
اُس پہ یہ چاہ کہ ہاتھ آئے کوئی حور و قصور　　اے میں قربان ! یہ منھ اور ہوس والی حضور
جینے کی اور کوئی راہ نکالو صاحب
جیب و دامن کی یہ دھجی تو سلالو صاحب

شعر کے نام پہ جو اس سے تُک بندی ہے　　تم سمجھتے ہو زبردست ہنرمندی ہے
بلبلہ آب کا ہے رونقِ نو چندی ہے　　اتنی ناواقفِ حالات نہ یہ بندی ہے
بات جو حق ہے اُسے منھ پہ کہوں گی سُن لو
گھڑکیوں سے میں تمہاری نہ ڈروں گی سُن لو

پیار اک رشتۂ ظاہر ہے مری بات سُنو　　اِس کے اُلٹا جو کوئی شخص کہے کہنے دو
کہہ گیا ہے جو کبیرا اُسے سوچو، سمجھو　　پاؤں دو ناؤ پہ رکھنے کے نہ پھیرے میں پڑو
بزم میں اپنا بھرم رکھنے کا بھی پاس رہے
کون ہو ؟ کیا ہو ؟ زمانے کو یہ احساس رہے

✤ ✤ ✤ ✤ ✤ ✤ ✤

مجھ کو یہ منظور نہیں ہے

کے بی بہاری (دہلی)

کھا کے چپّل چور نہیں ہے　　عشق کا یہ دستور نہیں ہے
حاجی جی پاجی کہلائیں　　مجھ کو یہ منظور نہیں ہے
لومڑی کا تو بس نہ چلا تھا　　کھٹّا یہ انگور نہیں ہے
اُس پر ڈھیلے تم نہ چلاؤ　　ہیپّی ہے لنگور نہیں ہے
توند نہ اتنا کھا کے پھلاؤ　　پیٹ ہے یہ تندور نہیں ہے
راکٹ کا ہے یار زمانہ　　دِلّی اب کچھ دور نہیں ہے
بزمِ سخن میں بھتّہ کیسا　　افسر کا یہ ٹور نہیں ہے
اُڑ جائے گُن چمن میں اپنا
صابر ہے کا فور نہیں ہے

رحمت یوسف زئی

"کالی پیلی روحیں"

کا ایک عالمانہ

تنقیدی جائزہ

تہذیب کی ان سرحدوں میں جہاں ابہام و تفہیم بے ربط ہو جاتے ہیں اور وجود کی نامیاتی سطح غیر نامیاتی لیکن مدور شکل اختیار کرکے ذہن کی پیچیدہ تہوں کو دلدلی زمین سے نکال کر سنگلاخ وادیوں میں احساس کی تشکیک کو جلا دیتی ہے، "کالی پیلی روحیں" کے مطالعے کے بعد ہم اپنی سرحدوں کی لامتناہی وسعتوں کو چھوکر درطۂ حیرت میں ڈوب جاتے ہیں اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ "کالی پیلی روحیں" شاعری کا ایک جرعۂ لاثبات ہے جس کے عدم وجود کی بنیاد ساری کی ساری واہمۂ تمیزہ پہ مبنی ہے۔ وہ واہمۂ تمیزہ جو ہمیں شنڈلر ولد اڈلر تک لے جاتا ہے اور جب ادب کی امتناعی حدیں کئی منحنی خطوط کو قطع کرتی ہوئی مستطیلی اشکال کی لب کشائی کرتی ہیں تو "کالی پیلی روحیں" کی صد آہنگ و صد جہت شاعری کی گرہیں کھلنے لگتی ہیں۔ علامہ مرحوم جہانوی کے اس شعری کارنامے کو پڑھتے ہوئے جب قاری استثنائی استغراق سے احتراق تک اور غیر استثنائی احتراق سے مرفوق المذاق تک سفر کرتا ہے احساس کے ذہن لاتبجل ہیں کئی عقدۂ لاینحل ایک دوسرے سے کھلنے لگتے ہیں تو ایسے سنگین لمحات ذوالمتفکرہ میں "کالی پیلی روحیں" فلسفۂ قنوطیہ کو مقبول عام کی سند دیتا ہوا استہزائی مفکرین کی تہہ میں ٹٹولتا دکھائی دیتا ہے۔ مرحوم جہانوی کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے۔

ابریق کلامی میں بحال صنم آرا
تصدیعہ کے روکے لئے ہے ہاتھ ہارا

اس شعر میں جہاں تخیلی محور کے گرد گھومتا ہوا رویہ عام بادگرد کی طرح ماورائے لاشعور ہے وہاں استہزائی مفکرین کے نقطۂ نظر کی خرنیمی عکاسی بھی کرتا ہے۔ استہزائی مفکرین نے دنیا کو سبق رد تصدیعہ بھلا کت دیا تھا۔ بڑی مسرت کی بات ہے کہ انھی

اس روایت کے حامل لاموجودی کیفیت میں ہوتے
ہوئے بھی کرشنؔ احتیاط کو نزاکتِ خط میں تبدیل
کرنے کی سعیٔ مشکور فرما رہے ہیں۔ "کالی پیلی
روحیں" کے شاعر نامدار علامہ مرحوم جہانوی
استخفافوی نظریۂ فکر کے حامل ہیں یا نہیں یہ فیصلہ
تو دقیق غور و مطالعہ کے بعد ہی بحوالۂ دارالضرب
پائے مہر قطعی کیا جاسکتا ہے لیکن جہاں تہاں اس
بات کے اشارے ضرور ملتے ہیں کہ سبق ردِ تعدلیہ
بشکل کھفے کے حاملین کی شاعر کے نقطۂ نظر کے
تحت کافی اہمیت ہے۔ یہ شعر دیکھئے ؎

ڈوبتی آغوش میں خربوزہ گرا
جیسے کہ نسے پہ کوئی کوزہ گرا

اسی غزل کا ایک اور شعر پیش ہے ؎

سرکشی آلودگی کا کرب ہے
کس چھری پر کس کا خربوزہ گرا

قدرتِ فکر کی کھائی میں چھلانگ لگا کر شاعر
نے کچھ ایسے نمکین چشموں کی بازیافت کی ہے کہ
پردۂ پرِ قوت کی اضافِ طبیعہ کے جوہر کھل گئے ہیں
یہ شعر دیکھئے ؎

کیفیتِ غمازِ قبولِ خمِ دوراں
کم گوئی کی لغاظی میں احساس لرزتا

اس اکھڑے اکھڑے طلاطمی انداز میں
پوشیدہ تضادِ باصرہ شاعر کی فکرِ فائقہ کو کارہائے
لایقہ سے مربوط کر دیتا ہے اور کشادگی قریب سے
قریب تر ہونے لگتی ہے۔ لومڑ ٹوٹ ہوں یا توسا
ترحنکی، ان فلسفیوں نے جرمن رمزیت کے مقابلے
میں امریکی منجائیت کی روسی تفرقہ تماش انداز
میں حتی قطع برید کر کے معترض ہو اس کی لب کشائی
کی تھی۔ اور شاعری کی لایعنی و لاموجودی کیفیات
کو متشکل کر دیا تھا۔ اس فلسفے کی تعلیم دینے والے
مفاہرین جو اپنے وجود کے اندر سمٹ جاتے اور
الجھاتے تخلیق انسانی و حیوانی کی غور کو متاثرت
سے مجادلت تک پہنچاتے ہیں، اگر ان کی ذہنی
کیفیت کا جائزہ "کالی پیلی روحیں" کے مطالعے
کے بعد لیا جائے تو بے حد لطف آتا ہے اور یہ راز
آشکارہ ہوتا ہے کہ دراصل یہ ساری پیچیاہٹ
اور الجھاہٹ کسی داخلی غلیان اور بحران انگیز
کی نہیں بلکہ بیرونی کثافتوں سے بھرپور غلاف
خبیثہ کی متقاضی ہے۔ اس ساری گفتگو کا ماحصل
یہ ہے کہ برنارڈ ڈوگیورڈ کے افکارِ عالیہ اور شری
من چپا نندم کے تفکر سادھیانہ نے جہاں مشرق
و مغرب کو شاعری کے داخلی و خارجی حدود کا ایک
منفرد زاویۂ منفرجہ سے غیر فطری مشاہدہ کرایا ہے
اردو کے عظیم شاعر علامہ مرحوم جہانوی کسی سے
پیچھے نہیں رہے۔ ایک اور شعر پیشِ خدمت ہے

وہ شعلۂ ناگفتہ کہ مربوط زدہ ہے
اک چیخ کہ آواز کا مقروض گدا ہے

اس مجموعہ میں کئی غزلیں شامل ہیں اور ساتھ ہی
ساتھ ان گنت یک لفظی نظمیں بھی درخشاں ہیں۔
کہیں کہیں تو صرف نقطوں سے متن کا کام لیا گیا ہے
یہ مجموعہ جسے انجمنِ ناپید کی جانب سے شائع کیا گیا
اور مجلسِ تحفظِ تنزلِ ادب کی سرپرستی میں ترتیب
دیا گیا کئی خوبیوں سے عاری ہے۔ سرورق بے حد خوب
بلکہ خوب تر ہے۔ کتابت جہاں تہاں اور کا قدرے ردّی
فروش ہے۔ کتاب کا سائز شماد جہازی اور طباعت
وجہ آشوب چشم ہونے کی حد تک گوارہ ہے۔ قیمت کچھ نہیں
جن صاحب کو ضرورت ہو آنہ دے کر طلب کر لیں! ▲

انصاری اصغر جمیل (ناگپور)

معجونِ صدارت

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ خدا کے پاس دیر ہے اندھیر نہیں۔ اگر انسان کے دل میں کسی چیز کو حاصل کرنے کی سچی لگن ہو اور وہ صدقِ دل سے خدا کے حضور میں گڑگڑا کے دعا مانگے تو ہمارا دعویٰ ہے کہ اس کی مراد ضرور بر آئے گی کیونکہ ہم بھی اس مرحلہ سے گذر چکے ہیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں (اگر نہ بھی جانتے ہوں تو کوئی بات نہیں) ہم اپنے باپ دادا کی محنت سے کمائی ہوئی دولت کی بدولت گل چھرّے اڑا رہے ہیں۔ آج بھی ہمارے پاس اتنی دولت ہے کہ زندگی بھر دونوں ہاتھوں سے لٹاتے رہیں تو بھی خزانہ خالی نہ ہو (کہیں آپ کا تعلق محکمہ انکم ٹیکس سے تو نہیں) جس طرح امراؤ رؤساء کے مصاحب ہوا کرتے ہیں۔ بالکل اسی طرح ہمارے بھی چند خیر خواہ ہیں۔ جن کا کھانا خرچہ ہمارے ذمّہ ہے اور ہماری ہر بات کی تائید کرنا اُن کا ذمہ۔ خواہ ہم یہ کیوں نہ کہیں کہ آکاش وانی ناگپور کا دفتر بمبئی میں ہے یا "شگوفہ حیدرآباد" ناگپور سے نکلتا ہے۔

ان تمام باتوں کے باوجود کچھ دنوں قبل تک ہمارے دل کو سکون و قرار حاصل نہیں تھا۔ ہماری دیرینہ خواہش تھی کہ ملک میں جہاں بھی کوئی علمی، ادبی، مذہبی یا سیاسی جلسے ہوں ان کی صدارت ہمیں سونپی جانی چاہیئے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ ہمارے آگے کوئی گھاس ہی نہیں ڈالتا تھا۔ شروع میں یہ خواہش اتنی شدید نہ تھی لیکن جب سے ہم نے یہ شعر سُنا کہ ؎

ماہر ہیں انگوٹھا چھاپ نہیں پھر کس لئے کتنی کا ٹیں
جب کلّن و جمّن جیسے بھی جلسے کی صدارت کر بیٹھے

تو ہماری خواہش شدت اختیار کر گئی۔ ہم نے دو آدمی اس کام پر مامور کئے کہ وہ پتہ چلائیں کہ شہر میں

کہاں ؟ کب ؟ اور کس جگہ ؟ جلسہ ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ منتظمین کو یہ بھی باور کرائیں کہ اُس جلسہ کی صدارت کے لئے شہر میں ہم سے موزوں کوئی شخص نہیں ہے۔ لیکن ہائے رے صدارت ! ہمارے قریب سے ہو کر بھی نہیں گذری۔ ہم خود کو دنیا کا بدقسمت ترین انسان سمجھ رہے تھے۔ ہماری راتوں کی نیند حرام ہوچکی تھی۔ جب بھی ہماری آنکھ لگتی ہم خود کو کسی جلسہ گاہ میں پاتے جس کی مسندِ صدارت ہمارے پائے استقامت کی مرہونِ منت ہوتی۔ یہ منظر دیکھ کر ہماری باچھیں کھلتے ہی آنکھیں کھل جاتیں اور ہم خود کو بستر میں دھنسا پاتے۔ راتوں کو صدارت کے خواب دیکھنا ہمارا معمول بن گیا۔ نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے دن میں بھی ہماری آنکھیں خمار آلود رہتیں، ہمارے چہرہ پر وحشت برسنے لگی۔ صحت دن بدن گرنے لگی۔ گھر والوں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر ہمیں مرض کیا ہے ؟ شہر کے بہترین ڈاکٹروں کی خدمات حاصل کی گئیں جنھوں نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ دیا کہ ہمیں کوئی بیماری لاحق نہیں ہے دیہی ہمارے ڈاکٹر، مسجدوں، گرجاؤں اور مندروں میں ہماری صحت یابی کے لئے دعائیں مانگی جانے لگیں۔ اب آپ ہی بتائیے کہ ہم بھلا کس طرح یہ تشہیر کرتے ہیں کہ ہمیں اور نہیں بلکہ صرف اور صرف صدارت کی بیماری ہے۔ یقین جانئے اگر اُس وقت ہمیں کوئی شخص کسی بھی جلسہ کی صدارت دلوا دیتا تو ہماری بیماری اُسی وقت ختم ہو جاتی۔ گھر کے لوگ ہماری بیماری سے تقریباً مایوس ہوچکے تھے۔ رشتہ دار ہمارا آخری وقت سمجھ کر مزاج پرسی کو آنے لگے گھر میں احباب و رشتہ داروں کی ریل پیل ہوگئی۔ ہماری تعریف میں مرثیے پڑھے جانے لگے اور بُرائیوں پر پردہ ڈالا جانے لگا۔ وراثت نامے و وصیت نامے تیار کئے جانے لگے۔

ایسے ہی میں ہمیں اپنی زندگی کی اُمید کی کرن نظر آئی۔ آخر خدا کو ہماری حالتِ زار پر رحم آ ہی گیا۔ انجمن مسیحاں کی یاد میں ایک تعزیتی جلسہ ہمارے محلہ ہی میں منعقد کیا جا رہا تھا اور منتظمین اُس کی صدارت کیلئے ہماری منظوری مانگ رہے تھے۔ (دراصل دیکھا جائے تو منتظمین ہمارے وہ خیرخواہ ہی تھے جنھیں ہماری بیماری کا علم بخوبی تھا)۔ "اندھا کیا چاہے ــ ؟ دو آنکھیں" ہم نے فوراً حامی بھر لی اور یہی نہیں بلکہ مرحوم کی بیوہ کی مدد کے طور پر ایک ہزار روپے چندے کا اعلان بھی کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہم بغیر کسی علاج کے پہلے کی طرح تندرست ہو کر یہ ثابت کر دیا کہ ؎

ہر درد کی دوا ہے ــ معجون صدارت کا

گھر کے لوگوں کے خیال میں مسجدوں، گرجاؤں اور مندروں میں مانگی گئی دعائیں کارگر ثابت ہوئیں (خدا کا شکر ہے کہ انہیں اصلیت کا علم نہیں ہوسکا۔) ! ہم نے جلسہ کے لئے بہترین سوٹ سلوایا۔ یوں سمجھ لیجئے کہ جس طرح عید کی تیاری ہوا کرتی ہے بالکل اُسی طرح ہم صدارت کی تیاری کرنے لگے۔ ہمارا پبلسٹی ڈپارٹمنٹ اس جلسہ کی اور خاص طور پر ہماری صدارت کی پبلسٹی میں جُٹ گیا۔ اب ہم راتوں کو خواب میں اس جلسہ کا منظر دیکھنے لگے۔ ہم دیکھتے کہ لاکھوں افراد اس جلسہ میں شریک ہیں۔ پھر دیکھتے ہیں کہ ہم مسندِ صدارت سے پُرجوش تقریر کر رہے ہیں۔ جس کا ایک ایک لفظ تالیاں بٹور رہا ہے لیکن افسوس کہ ہمارے سارے خواب اُس وقت چکنا چور ہوگئے جب جلسہ سے ایک

دن قبل ہمارے خیرخواہ نے یہ منحوس خبر دی کہ اچھن میاں کی وصیت کے مطابق اُن کی وفات کے بعد اُن کی یاد میں تعزیتی جلسہ منعقد نہ کیا جائے (شائد اچھن میاں کو پتہ تھا کہ ان کے تعزیتی جلسہ کی صدارت ہم ہی کریں گے) ۔ ہم دوبارہ بستر کی زینت بن گئے اور تب گھر کے لوگوں کو ہماری بیماری کی قسم کا پتہ چلا اس پر طرۃ یہ کہ دوسرے دن اچھن میاں کی بیوہ ایک قرض خواہ کی طرح وارد ہوئیں ۔ چونکہ ہم نے علی الاعلان ایک ہزار روپے کا اعلان کیا تھا۔ اس لئے روپے دیتے ہی بنی ۔

چونکہ گھر کے لوگوں کو ہماری بیماری کی وجہ معلوم ہوچکی تھی اس لئے ہمارے خیرخواہوں کو حکم دیا گیا کہ فوراً ایک انجمن کی بنیاد ڈالی جائے اور ہماری صدارت میں ایک کُل ہند مشاعرہ منعقد کیا جائے ۔ بزم کی بنیاد ڈال دی گئی اور مشاعرہ کی تیاریاں زور وشور سے شروع ہوگئیں ۔ سعید بھائی کو مشاعرہ کا کنوینر بنایا گیا ۔ ہم نے انہیں تاکید کردی کہ روپے چاہے جتنے خرچ ہوں فکر نہ کریں البتہ مشاعرہ بہت شاندار ہونا چاہئیے کیونکہ صدارت ہم کریں گے ۔ ملک کے مشاہیر شعرائے کرام نے اس مشاعرہ میں اپنی شرکت کی رضامندی دے دی ۔ ادھر ہم نے یونیورسٹی کے ایک پروفیسر صاحب سے اپنی صدارتی تقریر حاصل کی اور مسلسل کئی دنوں تک اُسے رٹتے رہے (کیونکہ وہ تقریر ہمارے معیار سے کچھ زیادہ ہی معیاری تھی) مشاعرہ بے حد کامیاب رہا ۔ ہماری صدارتی تقریر پر بے شمار تالیاں بھی پیٹی گئیں ۔ (یہ اور بات ہے کہ تالیاں پیٹنے والے کرائے کے لوگ تھے ۔ اس صدارتی تقریر میں ہم نے اس بزم کی ترقی و بقاء کیلئے اپنے ہزار روپیوں کے عطیہ کا بھی اعلان کیا اور تالیوں کی گڑگڑاہٹ میں مسند صدارت پر واپس ہوئے ۔ سی شب ہمیں ایک کامیاب صدر مان لیا گیا ۔ لوگوں نے یہاں تک کہا کہ صرف ہم اور صرف ہم ہی اُس مشاعرہ کی کامیابی کے ضامن رہے ۔ (لوگوں کو کس طرح بتائیں کہ صدر بننے کے لئے ہمیں کتنی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا تھا) ۔

دوسری صبح ابھی ہم نیند سے بیدار بھی نہ ہوئے تھے کہ ملازم نے ہمیں جگا کر یہ خوش خبری سنائی کہ ڈرائنگ روم میں کسی انجمن کے اراکین ہمارے منتظر ہیں ۔ وجہ دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ شہر میں کسی مولانا کی آمد پر ایک مذہبی جلسہ منعقد کیا جارہا ہے جس کی صدارت کی پیش کش لئے منتظمین ہماری خدمت میں حاضر ہوئے ہیں ۔ ہم نے مارے خوشی کے جھٹ سے ملازم کا بوسہ لے لیا اور حکم دیا کہ ان کی اچھی طرح خاطر مدارت کی جائے ۔ غسل سے فارغ ہوکر ہم ڈرائنگ روم میں پہنچے جہاں چار باریش بزرگ تشریف فرما تھے اور ہمیں دیکھتے ہی احتراماً اُٹھ کھڑے ہوئے ۔ بات چیت شروع ہوئی ، ہمیں صدارت کی پیش کش کی گئی جسے ہم نے بلاحیل وحجت قبول فرمالی ۔ ایک بزرگ گویا ہوئے "جلسہ میں تقریباً ایک ہزار روپے خرچ ہورہے ہیں ۔" —— ہم نے ان کا مدعا سمجھ کر ایک ہزار روپے ان کے حوالے کئے ، دروازے تک جاکر انہیں رخصت کیا ۔ ان کے رخصت ہوتے ہی ہمارے خاص الخاص دوست حاضر ہوئے ۔ ہم نے اُسی وقت قبول کی گئی صدارت کا ذکر کیا تو وہ مذہبی جلسہ کی صدارت کی مذمت کرنے لگے ۔ ہم نے اتنا ہی کہا کہ ہمیں صرف صدارت سے مطلب ہے ۔ چاہے وہ مذہبی ہو یا سیاسی ، اس پر وہ خاموش ہوگئے

اس کے بعد تو قسمت کی دیوی جیسے ہم پر مہربان ہوگئی۔ چاروں سمت ہماری صدارت کی دھوم مچ گئی۔ اور اب تو ہمارے دروازہ پر ہمیشہ اداروں کے اراکین ہاتھوں میں صدارت کا آفر لئے اپنی اپنی باری کا انتظار کرتے ہیں۔ کبھی کبھی کسی ادارہ کے اراکین سے ہماری تو تو میں میں بھی ہو جاتی ہے کیونکہ ہم اُن کے جلسہ کی صدارت کے لئے کم رقم پیش کرتے ہیں جبکہ اسی قسم کی صدارت کے لئے دوسرے ادارے کو اُن سے زیادہ دے چکے ہیں۔ اس قسم کی الجھنوں سے بچنے کیلئے ہم نے درج ذیل نرخ طے کر دیئے ہیں اور اپنے ڈرائنگ روم میں ریٹ بورڈ آویزاں کر دیا ہے تاکہ کسی کی دل شکنی نہ ہو۔

افتتاحی جلسہ کی صدارت کے لئے ۲۰۰ روپے
استقبالیہ " " " " ۲۰۰ روپے
مذہبی " " " " ۵۰۰ روپے
سیاسی " " " " ۵۰۰ "
علمی، ادبی " " " " ۷۵۰ "
مقامی مشاعرہ " " " " ۷۵۰ "
کل ہند مشاعرہ " " " " ۱۰۰۰ تا ۵۰۰۰ روپے
تعزیتی جلسہ کی صدارت کے لئے ۵۰۰ روپے (یہ روپے مرحوم کی بیوہ کو دیئے جائیں گے)

آج ہم ترقی کی اس منزل پر پہنچ چکے ہیں جہاں سے لوٹ آنا ہمارے لئے مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہوگیا ہے۔ ملک کے بڑے بڑے جلسوں اور مشاعروں میں ہم بحیثیت صدر مدعو کئے جاتے ہیں۔ ہمارے شہر کی تو بات ہی نہ پوچھئے۔ قرب و جوار میں بھی کوئی جلسہ یا مشاعرہ بغیر ہماری صدارت کے منعقد نہیں ہوتا اور آپ کو یہ جان کر فخر ہوگا (ہم پر نہ کہ خود پر) کہ فی الحال ہم ڈیڑھ سال تک بُک ہیں۔ مسلسل ڈیڑھ سال تک ملک کے کسی نہ کسی شہر میں ہم بحیثیت صدر مدعو ہیں اور اس طرح آج ملک گیر شہرت کے مالک ہو چکے ہیں۔ اگر آپ کسی جلسہ یا مشاعرہ کیلئے ہماری خدمات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو از راہ کرم ڈیڑھ سال تک انتظار کیجئے کیونکہ ہم با اُصول شخص ہیں اور ہمارا اُصول یہ ہے کہ ہم بیک وقت دو جلسوں کی صدارت نہیں کر سکتے اور ایسا ممکن بھی نہیں کہ ہم بیک وقت دو مسندوں پر جلوہ افروز ہوں ورنہ ہمیں ڈیڑھ سال سے قبل بھی آپ کی خدمت میں "بحیثیت صدر" حاضر ہونے میں عذر نہیں۔

(مضامین صاف، خوش خط اور صفحے کی ایک جانب لکھ کر روانہ کریں)

امداد باہمی تحریک ترقی کرتی جارہی ہے

امداد باہمی تحریک کے میدان میں ریاست آندھراپردیش نے آغاز سے بے حد لائق ستائش ترقی کی ہے۔ امداد باہمی تحریک انجمنیں جو اصل میں کسانوں کے قرض کی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے بنائی گئی تھیں بعد میں محدود وسائل رکھنے والے افراد کو سماجی اور معاشی مجبوریوں سے نجات دلانے کے لئے غیر قرضہ جاتی شعبوں میں بھی داخل ہوگئیں۔

زرعی قرض کے شعبے میں اسٹیٹ کوآپریٹیو بنک کی جانب سے سال ۸۱-۱۹۸۰ء کے دوران ۹۰ء۹۰ کروڑ روپے کے قلیل اور متوسط مدت کے قرضے جاری کئے گئے مذکورہ رقم کا ۵۸ فی صد حصہ چھوٹے اور حاشیائی کسانوں کو بطور قرض دیا گیا۔ اس کے علاوہ اسٹیٹ سنٹرل اگریکلچرل ڈیولپمنٹ بنک نے سال ۸۱-۱۹۸۰ء کے دوران ۱۸ء۶۸ کروڑ روپے کے طویل مدتی قرضے جاری کئے اس طرح ۶۵ کروڑ روپے کے مقررہ نشانے سے بھی زاید رقم دی گئی۔ اس بنک نے ملک میں گزشتہ تین سال سے قرضوں کی اجرائی میں سب سے اونچا مقام حاصل کیا ہے۔

کمزور طبقات جیسے بکشت بننے والوں، دھوبیوں اور قبائلیوں کے لئے کئی کوآپریٹیو سوسائٹیاں قائم کی گئیں۔

اسٹیٹ کوآپریٹیو ہاؤزنگ سوسائٹیز فیڈریشن کی جانب سے کم آمدنی و متوسط آمدنی اور معاشی طور پر کمزور طبقات سے تعلق رکھنے والوں کے لئے مکانات کی تعمیر کے واسطے مالیہ فراہم کیا جارہا ہے۔ اشیاء ضروریہ کی تقسیم کے لئے سنٹرل مہیا سوپر بازار کے صارفین کی کوآپریٹیو سوسائٹیوں کا جال بچھا دیا گیا ہے۔

اسٹیٹ کوآپریٹیو مارکیٹنگ فیڈریشن (مارک فیڈ) کیمیائی کھاد کی سربراہی، دھان کے حصول، پراسیسنگ یونٹوں کے قیام اور بھوسی سے تیل نکالنے کے کارخانے قائم کرنے کا کام انجام دے رہا ہے۔

(بقیہ صفحہ ۴۰ پر)

صفدر

ایک زمانہ تھا جب دشمنی، دوستی کی ناکامی کے بطن سے پیدا ہوتی تھی۔ ٹسٹ ٹیوب بے بیز کے عہد میں دشمنی بھی کسی کے بطن سے پیدا ہونے کی قائل نہیں رہی اب تو یہ آپ سے آپ بس ہو جاتی ہے۔ یہ ہونے پر ہی اکتفا نہیں کرتی بلکہ ہر جگہ ہر حال میں موجود ہوتی ہے جیسے غذا میں ملاوٹ، فضا میں کثافت، غنڈوں میں شرافت، خون میں جراثیم اور فلم میں ننگے سین ہوتے ہیں۔ اسی طرح بزرگی خوردی میں، وفا میں ادا میں، پڑوسی میں اور دوستی وغیر دوستی میں بن بیاہی کے تعلقات اور ملا کی خرافات کی طرح دشمنی ہوتی ہے۔ جب کسی چیز کی بہتات ہو جاتی ہے تو وہ بے اثر بھی ہو جاتی ہے۔ اب یہی دیکھئے نا کہ جب بچے منتوں مرادوں کے بعد ہوتے تھے تو بچہ کی سانس اور حلوائی کے ترازو کی طرح سارا محلہ اور سارا قصبہ زیر و زبر ہو جاتا تھا۔ اب بچے بے تحاشہ اور بے شمار ہو رہے ہیں تو کیا، محلہ اور قصبہ، خود پیدا کرنے والوں پر بھی کوئی تاثر قائم کرنے میں ناکام ہیں۔ ابھی کل کی بات ہے مردم شماری والے میرے پڑوسی سے پوچھ رہے تھے "آپکے کتنے بچے ہیں؟" موصوف نہایت بے پروائی سے فرمانے لگے "اجی صاحب! کون گنتا ہے۔ بہت ہیں اور ہو ہی رہے ہیں!" یہی حال دشمنی کا ہے۔ اب کوئی بیماری سے مرتا ہے نہ دشمنی سے ڈرتا ہے۔ پہلے دشمنی نہیں ہوتی تھی، پھر شروع ہوتی تھی، ہر میدان میں پہونچتی اور معرکے سر کرتی تھی۔ اس کی شان انقلابی تھی۔ اب چونکہ دشمنی ہر جگہ ہر میدان میں موجود ہے تو یہ کہاں سے شروع ہو؟ کس میدان میں پہونچے؟ کن سے معرکے سر کرے؟ لہذا اس کی انقلابی شان جاتی رہی۔ بس اس کا وجود رہ گیا ہے۔ ہمارا زمانہ بھی کیا زمانہ ہے اب نہ تو انقلاب ہے نہ انقلابی؛ انقلابی، انقلاب تو تیرے

میں شرکت اور سگریٹ کی برکت یک گھست کر ہانپ جاتا ہے۔ پھر ہر تیس مار خاں انقلابی ہے تو دشمنی میں انقلابی شان کہاں سے پیدا ہوگی؟ انقلاب اس لفظ پر سے ایک دلچسپ واقعہ یاد آگیا۔ ہمارا علاقہ ملّا کے مکان کی طرح سونا اور بے آواز ہے۔ ایک دن یوں ہوا کہ ہمارے کان بجنے لگے اور رگوں میں خون تیزی سے گردش کرنے لگا۔ اپنے ہی خون کی گردش سے گھبرا کر ہم نے پاس بیٹھے دوست کو پکڑا اور پوچھا "بھائی یہ کیا ہو رہا ہے؟" کہنے لگا "اپنے علاقہ میں شیر آگیا ہے۔ اس کی دہاڑ سے علاقہ گونج رہا ہے۔ یہ اسی کا اثر ہے" ہمیں بڑی خوشی ہوئی۔ پھر رفتہ رفتہ یوں ہوا کہ ایک دن ہم نے محسوس کیا، ہمارے کان بے آواز ہیں اور رگیں سوکھ گئی ہیں۔ ہم نے اپنے اس دوست کو پکڑا "بھائی وہ جو ہو رہا تھا اب نہیں ہو رہا ہے؟" فرمانے لگے۔ "شیر علاقہ میں نہیں ہے" پوچھا کہاں گیا؟ فرمایا ایک سرکس آئی تھی۔ اس میں بھرتی ہو گیا۔ سرکس دلی چلی گئی سو وہ بھی چلا گیا؟ جب انقلاب کا اور انقلابی کا یہ حال ہے تو دشمنی کی انقلابی شان کیا باقی رہے گی؟ پہلے سنتے تھے فلاں کو ٹی۔بی ہو گئی اور دل دھک سے ہو جاتا تھا۔ اب کہتے ہیں فلاں کو ٹی۔بی ہے۔ فلاں کو سرطان اور فلاں کو ذیابطیس اور غیرہ غیرہ کو وغیرہ وغیرہ ہے مگر کسی پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ دشمنی بھی ایک بیماری ہے اور ایسی عام کہ ہر کسی کو ہے۔ ہر بیماری کا ایک علاج بھی ہے۔ مگر دشمنی کا بھی کوئی علاج ہے؟ ہڑبڑیئے ہم نے بیماری اور دشمنی کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا یہ ہماری غلطی تھی۔ اس غلطی کا احساس ہوا، ایک سوال قائم کرنے پر یہاں یہ نکتہ ہاتھ آتا ہے (نکتہ ہی ہاتھ آتا ہے عدد ہمیشہ پھسل جاتے ہیں) کہ بہت سی چیزیں ہیں آج ایک جیسی نظر آتی ہیں مگر ہوتی نہیں ہیں۔ ان میں تمیز کرنا ہے تو سوال قائم کرو۔ مگر یہ کام بہت خطرناک اور بے فیض بھی، آپ پارلیمان کی کارروائی ضرور پڑھتے ہوں گے۔ سرکار جو پارلیمان کو جوابدہ ہے سوالات کو پسند نہیں کرتی۔ سوال ہوتا ہے، تو بہت کچھ ہوتا ہے۔ تکرار ہوتی ہے، مار پیٹ ہوتی ہے ہنگامہ ہوتا ہے۔ تو ہاں۔ یہ عرض کر رہا تھا کہ بیماری اور دشمنی ایک جیسی چیزیں نہیں ہیں، بیماری کا علاج ہوتا ہے دشمنی کا نہیں ہوتا۔ بیماری ترک کی جاتی ہے اور دشمنی پالی جاتی ہے۔ یعنی دشمنی ایک پالتو چیز ہے۔ پہلے جو چیزیں پالتو ہوا کرتی تھیں۔ آج فالتو (غیر ضروری) کے صیغے میں چلی گئی ہیں جیسے طوطا، مینا وغیرہ، دشمنی دل کے پنجرے میں بڑی احتیاط سے رکھی جاتی ہے۔ پھر اس کی غذائیں بغض کینہ، حسد وغیرہ بڑے اہتمام سے اسے پیش کی جاتی ہیں۔

آج آدمی طوطے مینا کی بجائے دشمنی کیوں پالتا ہے اس کی بھی ایک وجہ ہے۔ جانور، بہرحال جانور ہے۔ پنجرے کا پٹ کھلا اور فرار ہو گیا۔ دشمنی بہت وفادار ہوتی ہے، آپ دل کے دوار کھلے رکھئے یہ اور اندر کی طرف سمٹ جاتی ہے۔ پھر سفر میں حضر میں تنہائی میں محفل میں ہر جگہ ہر وقت ساتھ رہتی ہے اسی لئے لوگ دشمنی پالتے ہیں یہاں بھی یہ سوال قائم کیا جاسکتا ہے کہ آیا آدمی دشمنی کے پنجرے میں قید ہے یا دشمنی آدمی

دل میں قید ہے؟ پھر سوال آگیا۔ میں معذرت خواہ ہوں۔ آپ اس کا جواب ہرگز نہ سوچئے۔
جا نہایت خطرناک کام ہے۔ فساد کا باعث ہوتا ہے۔ ڈسپلن میں خلل انداز ہوتا ہے۔
پہلے دشمنی کا رخ متعین ہوتا تھا۔ ہدف متعین ہوتا تھا۔ آج ایسا کچھ نہیں ہے، جہاں کہیں
، وقت بھی جس کسی کے ساتھ موقع ہاتھ آتا ہے دشمنی کا اظہار کر دیا جاتا ہے۔ دشمنی بچھو کے
، اور سانپ کے دانت کی طرح اپنے زہر کے بے خطا استعمال کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں
ے دیتی۔ پہلے دشمنی عین ایمان تھی۔ دوست اور دشمن کے درمیان دیوارِ چین کی طرح
ا ہوکر فرق کرتی تھی۔ آج دشمنی عین نفاق ہے۔ دل میں دشمنی ہے۔ ادھر سلام ہو رہے ہیں۔
ہیں دشمنی ہے اور خیریت پوچھی جا رہی ہے۔ معانقے مصافحے ہو رہے ہیں۔ دانت ہنس رہے ہیں
آپ کہہ سکتے ہیں کہ جب دنیا جہاں میں کیڑے تلاش کئے جا رہے ہیں تو ذرا اپنے گریباں
ندر بھی منھ ڈال کر دیکھئے! تو لیجئے صاحب دیکھتا ہوں۔ مگر گریباں کے اندر نظر نہیں
داڑھی جاتی ہے اور اندر سوائے داڑھی کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ مگر آپ یقین کیوں کرینگے
ہیں گے ناکہ تمہارے دل میں بھی دشمنی بھری پڑی ہے۔ آپ اس طرح سوچتے رہیے۔
ی عرض کریں گے کہ ہاں ہے بہت دشمن ہے۔ اتنی زیادہ کہ ہم دشمنی سے بھی دشمنی رکھتے ہیں۔
دہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ آپ کے دل میں ہمارے لئے بھی دشمنی پیدا ہو جائے گی سو وہ کب
ہتی؟ ــــــ آج دشمنی اندھے کی لاٹھی ہے جبکہ اسے ماہر نشانہ باز کی بندوق ہونا چاہئے
ہیں جب کوئی نشانہ بنتا ہے تو نشانہ لینا سیکھ جاتا ہے۔ اسی لئے میں نے دشمنی کو نشانہ بنایا ہے
ماہر نشانہ باز کی بندوق ہو جائے۔ تب اس کا ہدف کون بنے گا؟ برخوردار ی سے بے کاری
ور عیاری سے بدکاری تک بہت سی چیزیں ہیں کس کس کا نام بتاؤں؟ ▲

جب ہوئی ہماری خاطر تواضع

بانو سرتاج
چندرپور (مہاراشٹرا)

نہیں ٹھہریئے ۔! یہ جوتے چپل ، مارپیٹ والی " خاطر تواضع " نہیں بلکہ اوائلِ شباب کی خاطر تواضع ہے (جب وہ اتنی بدنام نہیں ہوئی تھی) ۔ ویسے اس خاطر تواضع کے بعد ہماری وہی حالت ہوئی جو جوتے چپل والی خاطر تواضع کے بعد ہوتی ہے۔ کمر، پیٹھ، ٹانگیں، چہرہ، حلق، دانت، زبان، آنت اور نظامِ ہاضمہ وغیرہ ستم کا شکار ہوئے تھے۔ اب حال یہ ہے کہ جس طرح تختۂ دار کے ساتھ صورتِ جلاد نظروں میں گھومتی ہے۔ اُسی طرح ڈائننگ ٹیبل کے ساتھ ہمیں نعیم الدین بھائی یاد آتے ہیں۔

گذشتہ دنوں شوہر نامدار کے ساتھ ہمارا بمبئی جانا ہوا۔ گئے تو تھے خالص سیر و تفریح کی غرض سے مگر یقین کیجئے اگر ہمیں ذرا بھی گمان ہوتا کہ وہاں نعیم الدین بھائی کی مہمانی کا شرف اُٹھانا پڑے گا تو ہم بھول کر بھی بمبئی میں قدم نہ دھرتے (دوسروں کی گلی میں جانے والا ہمیشہ پچھتاتا ہے) ۔ نعیم الدین بھائی کو بھی شاید بہت دنوں سے کوئی نہیں ملا تھا۔ اندھے کے ہاتھ بٹیر کی طرح ہم دونوں لگ گئے۔

آتشِ شوق (نعیم الدین بھائی کی) بڑھتی گئی جوں جوں ہم نے غلطی کی۔ فون پر صبیحہ آپا کو اپنے بمبئی میں وارد ہونے کی اطلاع دے کر ہم نے پہلی غلطی کی ۔ دوسری خطا یہ ہوئی کہ ملاقات کا وقت طے کر کے ملنے نہ جاسکے۔ مانا کہ ہم وعدہ وفا نہ کر سکے مگر اس کی اس قدر سنگین سزا ملنی چاہیئے تھی ۔۔؟ ہم نے معذرت خواہی کے لئے فون کیا ۔ صبیحہ آپا بولیں ۔ " کوئی بات نہیں، شام کو آجاؤ ۔ تمہاری دعوت کریں گے ۔"

تب تک ہم لفظِ 'دعوت' سے اتنا نہیں ڈرتے تھے جتنا آج ڈرتے ہیں ۔ اس سے پہلے ہمیں معلوم ہی نہ تھا کہ کسی سے انتقام لینے کا ایک طریقہ اُسے کھلا کھلا کر مار دینا بھی ہو سکتا ہے (دھوکا مار دینا ہم نے سُنا تھا) ہم نے اپنی شرافت اور ناسمجھی میں یہ دعوت قبول کرلی گویا اپنے پیٹ پر آپ کلہاڑی مارلی ـــــ دوسرے روز ہمارے دشمنوں کی طبیعت ناساز ہوگئی ۔ بمبئی کی آب و ہوا بڑی بے دردی سے مزاج پوچھنے لگی تھی۔ شوہر نامدار نے صبیحہ آپا کا نمبر ملایا ۔ نعیم الدین بھائی نے ریسیو کیا ۔ بولے " ہوٹل کا پتہ بتایئے ۔ میرے بہن بہنوئی ، بھائی بھاوج ڈاکٹر ہیں ۔ جو بھی مل جائے ساتھ لے کر آتا ہوں ۔"

شوہر نامدار گھبرا کر بولے ۔ " ڈاکٹر سے دوا لے لی ہے ۔ وہ آرام کر رہی ہیں ۔ "

نعیم الدین بھائی نے الٹی میٹم دیا ۔ " ایک اور ڈاکٹر کو دکھا لینے میں کیا حرج ہے ؟ مگر کل صبح تک نہیں اچھا ہوگا
ہی ہوگا ۔ صبیحہ نے تاج ہوٹل میں آرڈر دے کر ڈنر تیار کروایا ہے ۔ ریفریجریٹر میں رکھو رہے ہیں ۔"

سویرے چھ بجے فون آیا ۔ علیک سلیک ہوئی پھر ارشاد ہوا ۔ " پائے اور پراٹھے بھی تیار ہیں (بشمول بریانی اور
شامی کباب کے) ساڑھے سات بجے تک آجائیے ۔ " مرتے کیا نہ کرتے ۔ کسی طرح الٹے سیدھے تیار ہوکر پہنچے ان کے گھر

پہلی مرتبہ جب نعیم الدین بھائی سے سامنا ہوا تو قطعی خوفناک نہیں لگے ۔ (بلکہ کچھ بے ضرر ہی لگے) ہمیں معلوم ہوا کہ آپ
ایڈوکیٹ ہیں تو ہم کبھی الماری میں اوپر سے نیچے تک سلیقے سے چنی ہوئی قانون کی کتابوں کو دیکھتے ، کبھی ڈشز سے ٹھساٹھس
بھری ہوئی ڈائننگ ٹیبل کو ۔ دونوں کا تعلق ہم آج بھی تلاش نہیں کر پائے ۔ (یہ تعلق ہم نے کیوں ڈھونڈنا چاہا یہ بھی
ہماری سمجھ میں اب تک نہیں آیا)

دس منٹ کی رسمی بات چیت کے بعد نعیم الدین بھائی نے ہم دونوں کو ڈائننگ ٹیبل پر بٹھاکر مورچہ سنبھال لیا
وئی دوسری بات کرنے کا موقعہ ہی نہیں دیا ۔ یہاں تک کہ ہم ایمان لے آئے اس بات پر کہ واقعی خوراک کا مسئلہ
ہندوستان کا اہم مسئلہ ہے ۔ جب یہ مسئلہ موضوع بحث آجاتا ہے (وہ بھی پریکٹیکل طور پر) تو کوئی دوسرا سماجی ، سیاسی
قتصادی مسئلہ راہ نہیں پا سکتا ۔

ایک اور صاحب موجود تھے ۔ تعارف کے طور پر کہا گیا کہ ڈاکٹر ہیں ۔ صبیحہ آپا نے پلیٹ بھرنے کی شروعات کی اور
عیم الدین بھائی نے انتہا تک پہنچا دیا ۔ ہم بار بار ہماری رات کی خرابیٔ صحت کا حوالہ دیتے وہ بار بار ڈاکٹر صاحب کی
رف اشارہ کر دیتے ۔ ڈاکٹر صاحب بھی اس قدر مطمئن انداز میں سر کو جنبش دیتے جیسے ہر بات کا وہ علاج کریں گے ۔
کھاتے کھاتے ہمارا پیٹ پھٹ جائے گا تو اسے بھی سی دیں گے) ۔ کھانے کے دوران جیسے ہی نعیم الدین بھائی کو علم ہوا
ہم مچھلی زیادہ پسند کرتے ہیں ۔ انہوں نے پکار کر خانساماں سے کہا ۔ " شام کے لئے ایک کلو مچھلی لاکر فرائی کر لینا ۔"
اری شامت کہ کچھ دیر بعد ہم نے بازار میں جا بجا فروخت کے لئے رکھے نیلے گول بیگنوں کی تعریف کر دی ۔ نعیم الدین
ائی نے فوراً حکم صادر کیا ۔ " ایک کلو بیگن خالص حیدرآبادی طریقے سے پکائے جائیں ..... " اسی طرح شوہر نامدار
پسند پر ایک کلو پسندے ، ایک کلو بھنڈی اور کلیجی گردے کا سالن تیار کرنے کا آرڈر دیا گیا ۔ یہ حقیقت تو ہم پر
ہیں آشکار ہوئی کہ وہ اسی طرح باتوں کے جال میں پھنسا کر مہمانوں کی پسند معلوم کرتے ہیں اور بھگتنا مہمانوں
پڑتا ہے ۔

شوہر نامدار چونکے تو ہمیں بھی ہوش آیا ۔ " یہ سب آپ ہمارے لئے بنوا رہے ہیں ۔"
کہا " نہیں تو کیا لنگر کھلوا رہا ہوں ۔ ارے صاحب آپ ہمارے مہمان ہیں ۔ مہمان نوازی ہمارا فرض ہے ۔"
ہم نے خجل ہوکر کہا ۔ " مگر اتنا سب ہم لوگ کھائیں گے کیسے ؟"
کہنے لگے ۔ " دوپہر کے کھانے پر مچھلی اور پسندے ، بریانی اور قورمہ ، نرگسی کوفتے اور شاہی ٹکڑے .....

شام میں پلاؤ اور بیگن کا سالن، پائے اور پراٹھے شامی کباب، کسٹرڈ، سوئیاں اور زردہ۔۔۔ یا جیسا آپ کا دل چاہے۔۔۔۔"

ہم نے نہایت عاجزی سے عرض کیا۔ "بھائی صاحب! ہم دوپہر میں کھانا کھانے نہ آسکیں گے۔"

اطمینان سے فرمایا۔ "شام کو آئیے۔ کھانا تو سب پڑے گا۔"

شوہر نامدار اچانک بولے۔ "بھائی صاحب! بمبئی میں کلو سے کم وزن رائج نہیں ہیں کیا؟"

نعیم الدین بھائی ذرا چکرائے تو ہم نے وضاحت کی۔ "مچھلی ایک کلو، بیگن ایک کلو۔۔۔ قیمہ گردے ایک کلو۔۔"

اب خجل ہونے کی باری اُن کی تھی مگر صبیحہ آپا نے بات سنبھال لی یہ کہہ کر کہ "ابھی ایک کلو سیب اور ایک کلو انگور کھانے باقی ہیں۔"

سب نے قہقہہ لگایا۔ ہاتھ دھو کر ہم ڈرائنگ روم میں پھلوں کے سامنے جا بیٹھے (پھلوں کی مقدار دیکھ کر یہی کہنا مناسب تھا) نعیم الدین بھائی نے انگور کا ایک ایک خوشہ ہم دونوں کے ہاتھوں میں بہ اصرار تھما دیا۔ ہم اب اور خاموش نہ رہ سکے۔ انگور کھاتے ہوئے کہہ ہی تو دیا۔ "کاش! بھائی صاحب آپ سے تین چار ماہ پہلے ملاقات ہوئی ہوتی ۔۔۔!"

نعیم الدین بھائی چونکتے ہوئے پھر استفسار کر بیٹھے۔ انداز کچھ اس طرح تھا جیسے چار ماہ پہلے ہم اُن سے ملے ہوتے تو کیا بگاڑ لیتے اُن کا؟ ہم نے مسکینی سے جواب دیا۔ "ہم نے ایک میگزین میں خاطر تواضع کس طرح کی جائے، یہ مضمون لکھا ہے۔"

"تو پھر ۔۔!" وہ اُلجھن میں پڑ کر بولے۔

ہم نے کہا۔ "ارے بھئی۔ تب ہمیں اتنا نہ لکھنا پڑتا۔ ہم لکھ دیتے خاطر تواضع کس طرح کی جائے یہ نعیم الدین بھائی کے گھر ایک روز قیام کرکے دیکھئے اور سیکھئے۔ آپ کا پتہ دے دیتے جنھیں اس موضوع میں دلچسپی ہوتی وہ فیضیاب ہوتے۔ آپ کی مہمان نوازی کی خواہش بھی پوری ہو جاتی۔"

وہ خوب فراخدلی سے ہنسے۔ اتنے خوش ہوئے کہ شام کے کھانے پر چار یا پانچ ڈشز اور بڑھا دیں۔ (نماز بخشوانے گئے تھے روزے گلے پڑے)۔ بمبئی میں پیدل گھوم پھر کر صبح کا کھایا ہوا ہضم کر کے شام کو جب اُن کے مکان پر پہنچے تو ڈائننگ ٹیبل دیکھ کر خواہ مخواہ یہ خیال پیدا ہوا کہ دس بارہ لوگ اور مدعو ہیں۔ شوہر نامدار نے ہماری طرف دیکھا۔ ہم نے کہا۔ "بقیہ لوگوں کو بھی آجانے دیجئے۔ ہمیں کوئی جلدی نہیں ہے۔"

جواب ملا۔ "اور کوئی نہیں آنے والا۔"

ہم حیرت کا مظاہرہ کئے بغیر بیٹھ گئے۔ (مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آسان ہو گئیں) تھوڑی دیر پہلے ایک زیر تعمیر عمارت دیکھی تھی۔ تیسری منزل پر سلیب ڈالا جا رہا تھا۔ نیچے سے اُوپر تک مزدور قطار در قطار کھڑے

تھے۔ نہایت سرعت کے ساتھ سنک کے ٹوکرے اٹھوا چٹپٹا سے جا رہے تھے۔ چشم تصور سے ہم نے دیکھا ہمارے حلق سے پیٹ تک خوراک کی ایسی ہی لائن لگی ہوئی ہے۔ خوراک کا پہاڑ تیار ہو رہا ہے۔ ہر قسم اور ہر طرح کی ڈشیں نعیم الدین بھائی اور صبیحہ آپا کی مرضی کے مطابق کھالینے کے بعد ہم نے تمام ایسی کیٹ پلیٹیں طاق رکھ دیئے۔ نعیم الدین بھائی کہتے رہیے "یہ لوگ صاحب بہت ناراض ہو جائیں گے۔" ہم نے سنی ان سنی کر دی۔ اور صبیحہ آپا کے پلنگ پر جا کر پسر گئے۔ شوہر نامدار کو اکیلے ہی ہوٹل واپس جانا پڑا۔ کیونکہ ہم میں چلنے کی سکت نہیں تھی۔ (اسٹریچر کا انتظام ہو نہیں سکتا تھا)

علی الصبح شوہر نامدار مع سامان کے آگئے۔ آج ہمیں کوچ کرنا تھا۔ صبیحہ آپا کو کالج جانا تھا۔ وہ ہم سے رخصت ہو کر چل دیں۔ ہماری ٹرین دوپہر کے بارہ بجے روانہ ہوتی تھی۔ دوپہر کے کھانے کا مرحلہ باقی تھا۔ ہماری حالت زار پر ترس کھاتے ہوئے نعیم الدین بھائی نے ہمارے لئے سادہ چاول اور ارہر کی دال بنوا دی۔ مگر اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا ...... دال، چینی کے کٹورے میں لبالب بھری ہوئی اس شان سے آئی کہ اوپر تیرتا ہوا گھی خوشبو دے رہا تھا۔ ناچار آنکھیں بند کر کے پی گئے۔ شوہر نامدار کے ساتھ کسی قسم کی رعایت برتنے کو وہ تیار نہیں ہوئے۔ پھر وہ ہمارے ساتھ کا کھانا تیار کروانے میں جٹ گئے۔

پسندے جو ہم کھا نہیں سکے تھے۔ ایک ڈبے میں، اُبلے ہوئے انڈے ایک لفافے میں، تلی ہوئی بھروان بھنڈی ایک بوتل میں۔ اچار دو الگ الگ شیشیوں میں۔ آلو کے پراٹھے پلاسٹک کے بیگ میں، بھنڈی مرچ بھروان، ویجیٹیبل سینڈوچ ...... گوند کے لڈو اور خدا جانے کیا کیا ...... ہمارے پاس باسکٹ نہیں تھی، سو باسکٹ بھی مہیا کر دی۔ ہم نے احتجاج کیا تو بولے "ایک دن ایک رات کا سفر ہے۔ ٹرین میں یوں بھی بھوک زیادہ لگتی ہے۔" ہم چپ ہو رہے کہ خیر کھانے ہی کا شغل رہے گا ٹرین میں۔

سامان لے کر سیڑھیوں سے اُتر رہے تھے کہ خانساماں دوڑتا ہوا آیا۔ "بی بی! یہ قیمہ متی کی بھاجی ہے۔ گرم ہے ٹرین میں تھوڑی دیر کے لئے کھلا رکھ دیں۔" وہ بھاگم بھاگ اوپر جانے لگا تو نعیم الدین بھائی نے کہا "دیکھو چھولے بھی لے آؤ۔ ذرا جلدی۔ تب تک ہم ٹیکسی میں سامان رکھتے ہیں۔"

ہمارا منہ حیرت سے کھل گیا۔ منہ بند کرتے تب تک چھولے بھی آگئے۔ ٹیکسی اسٹارٹ ہونے کو ہوئی تو ہم نے کہا۔ "بھائی صاحب اب چلیے؟"

کہا "...... خدا حافظ"

ہم نے کہا۔ "دادر اسٹیشن بہت دور ہے۔ آپ کو خواہ مخواہ تکلیف ہوگی۔"

چونک کر بولے۔ "ہم آپ کو رخصت کرنے اسٹیشن نہیں آرہے ہیں۔"

"کوئی سبزی، پراٹھے وغیرہ رہ گئے ہوں گے تو آپ کو آنا پڑے گا۔ ایک بار دیکھ تو لیں۔"

وہ جھینپ گئے۔ "مذاق کرتی ہیں آپ تو۔" پھر شوہر نامدار سے بولے۔ "اب کبھی بمبئی آنا ہو تو ہمارے گھر

قیام کریں۔"

ہم نے فوراً میاں میں ٹیک کر کہا . . رمضان میں آئیں گے۔"

وہ کچھ سمجھتے اس سے پہلے ٹیکسی اسٹارٹ ہو گئی۔ ہر پیچھے آتی ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے شخص پر ہمیں نعیم الدین بھائی کا گمان ہوتا۔ اسٹیشن پہنچے۔ ٹرین روانہ ہو گئی۔ تب ہماری جان میں جان آئی۔

بمبئی سے لوٹنے کے بہت عرصہ بعد تک نعیم الدین بھائی ہمارے اعصاب پر سوار رہے۔ ہمیں بیمار اور کمزور دیکھ کر کالج کے ساتھی پوچھتے تو ہم کہہ دیتے۔ "بمبئی میں کچھ زیادہ ہی خاطر تواضع ہو گئی۔"

کچھ دنوں بعد شوہر نامدار نے ہمیں احساس دلایا کہ تمہاری صورت اور صحت کو دیکھ کر لوگ خاطر تواضع کو غلط معنی میں لے رہے ہیں، تو ہم نے اس لفظ کا استعمال ترک کر دیا۔ پریکٹیکل کو بھی بھول جانا چاہا مگر ہمارا معدہ اب تک اپنے اوپر ہوئے مظالم کو فراموش نہیں کر پایا ہے۔ گاہے بگاہے احتجاج کرتا ہی رہتا ہے اور ہم اُسے سمجھاتے رہتے ہیں کہ محبت سے کوئی زہر بھی پلا دے تو پی جانا چاہیے۔

— —

کچھ مزاح اور طنز کے بارے میں

آفاق حسین صدیقی
اجین ایم پی

رونا انسان کی فطرت بھی ہے اور اس کا مقدر بھی۔ آدمی روتے ہوئے ہی پیدا ہوتا ہے اس کے بعد وقتاً فوقتاً وہ ساری زندگی روتا رہتا ہے اور روتے ہوئے نہ صرف مرجاتا ہے بلکہ دوسرے لوگوں کو رونے پر مجبور کرکے اور خوب رُلاکر رونے کے سلسلہ کو ثواب جاریہ کی طرح جاری رکھتا ہے۔ رونے کے انداز مختلف اور اس کی قسمیں متنوع ہیں یہاں چونکہ ہمیں رونے سے تفصیلی بحث نہیں کرنا ہے اس لئے رونے کے مختلف انداز و متنوع اقسام کا ذکر غیر ضروری ہے۔ یہاں رونے کا تذکرہ بھی اس لئے کیا گیا ہے کہ ہمیں ہنسنے کا ذکر کرنا ہے اور ہنسنے کے ساتھ عموماً رونے کا ذکر کیا جاتا ہے، حالانکہ ہمارے خیال میں رونا اور ہنسنا لازم و ملزوم نہیں ہیں، اس کے علاوہ دونوں کا تعلق ایسا بھی نہیں ہے جیسا اندھیرے اُجالے کا پھر بھی نہ جانے کیوں رونے اور ہنسنے کا ذکر عام طور پر ساتھ ساتھ کیا جاتا ہے۔ لوگ روتے نہیں تو ہنستے بھی نہیں اور اگر ہنستے نہیں، تو روتے بھی نہیں؟ [illegible] روتے ہوئے ہی لگتے ہیں دنیا میں ایسے لوگ کم ہی ملتے ہیں جو ہنستے ہوئے ہی معلوم ہوتے ہیں اور ایسے افراد کی تعداد تو بہت کم ہے جو رونے میں [illegible] یا روتے ہوئے بھی ہنستے

ہوئے لگتے ہیں۔ دنیا میں رونے کی بے پناہ مقبولیت اور عمومیت اس کے علاوہ رونے والوں کی کثرت ہنسنے والوں کی کم تعداد، رونے کے نسبت ہنسی کی اہمیت اور قدر و قیمت کی ضامن ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ رونے کے بہ نسبت ہنسنا ایک دشوار عمل اور نازک فعل ہے۔ رونے کے لئے کوئی وجہ اور کسی سبب کی خاص ضرورت نہیں ہوتی اور رونے کے لئے کسی بہانے کی تلاش میں بھی زیادہ پریشانی نہیں ہوتی، ہم ایسے بہت سے لوگوں سے واقف ہیں جو ہر وقت ہر موقع پر بغیر کسی تیاری کے رو دیتے ہیں اور ہر جگہ رونے کی گنجائش نکال لیتے ہیں لیکن ہنسنے کے لئے موقع محل اور وقت سب کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے فضا اور ماحول کو دیکھنا پڑتا ہے اور خود کو تیار اور آمادہ کرنا پڑتا ہے۔ ہم جب چاہیں جس وقت چاہیں، جہاں چاہیں رو سکتے ہیں لیکن ہنس نہیں سکتے

اور اگر ہنس دیں تو ہنسی گلے کا پھندا بن جاتی ہے۔ سینکڑوں لوگ ہماری طرف مشتبہ نگاہوں سے دیکھنے لگتے ہیں۔ ان میں سے بعض صرف ناگواری کا اظہار کرکے اپنی سماجی ذمہ داری ادا کر دیتے ہیں بعض برہم ہونے پر اکتفا کرکے آداب مجلس سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن بعض ایسے بھی نکل آتے ہیں جو اپنی تہذیبی، سماجی اور اخلاقی ذمہ داری کا ثبوت دینے کے لئے اس فعل پر اپنے عمل کا سکہ بٹھانے کو فوراً تیار ہو جاتے ہیں۔

ہنسنا اول تو دشوار عمل ہے ہی لیکن آج کے دور میں جب کہ زندگی میں قدم قدم پر رونے کے بے حساب مواقع موجود ہیں اور ہر طرف رونے کے اسباب بکھرے ہوئے ہیں۔ ہنسنا اور بھی زیادہ دشوار ہو گیا ہے اسی لئے آج کل ہنسی کمیاب ہی نہیں نایاب ہوتی جا رہی ہے۔ اصلی گھی اور مشک کی طرح نہیں بلکہ اصلی آدمی کی طرح اور آج کل دنیا کی دوسری چیزوں کی طرح ہنسی کی بھی کئی قسمیں ہو گئی ہیں۔ ایک قسم تو وہ ہے جس میں حلق سے ہنسی کی آواز نکلتی ہے اور چہرے پر ہنسی کی سی کیفیت نظر آتی ہے۔ ایکٹر، ڈائریکٹر، لیڈر، منسٹر اور جوکر وغیرہ اس ہنسی کے ماہر ہوتے ہیں اور پریکٹس کرکے اس میں مہارت حاصل کرتے ہیں۔ دوسری قسم منقول ہنسی ہے اس میں ہنسی کی نقل میں ہنسا جاتا ہے اس قسم کی ہنسی کے نمونے منسٹروں اور افسروں کے آس پاس دیکھنے کو ملتے ہیں۔ تیسری قسم وہ ہے جو کوشش کرکے پیدا کی جاتی ہے۔ اس کے نمونے عام طور پر کلبوں، کاک ٹیل پارٹیوں اور سرکاری نوعیت کی تقریبات میں زیادہ نظر آتے ہیں۔ ہنسی کی ایک قسم بے ساختہ ہنسی کی ہے۔ یہی ہنسی اصل ہنسی ہوتی ہے اس قسم کی ہنسی کے سوتے دل و دماغ کی گہرائیوں سے پھوٹتے ہیں اور اس ہنسی کے عمل کے دوران میں انسان کے ظاہری و باطنی ماحول میں تضاد نہیں رہتا ہے بلکہ ظاہر و باطن دونوں کی فضا یکساں طور پر خوشگوار ہوتی ہے یہ ہنسی آج کل بہت کم نظر آتی ہے۔ شرافت اور ایمانداری کی طرح ..... موخرالذکر ہنسی کا سبب عموماً خوشی کا کوئی حادثہ مسرت کا کوئی جذبہ یا کوئی پر لطف واقعہ ہوتا ہے اور اس کے محرکات میں حس لطیف اور زندہ دلی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

اب ہنسنے کے ساتھ ہنسانے کی طرف توجہ دیجئے تو یہ کام ہنسنے سے بھی زیادہ دشوار اور مشکل ہے، اس دنیا میں جہاں رونا اتنا عام ہے کہ آدمی تو آدمی جانور بھی روتے ہیں اور جہاں رونے رلانے کے ہزاروں نہیں لاکھوں بہانے ہیں آدمی کو رونے سے فرصت ہی نہیں ہے وہاں خود ہنسنا اور پھر کسی کو ہنسانا بڑی ہمت اور بڑے دل گردے کا کام ہے۔ کسی کو ہنسانے کے لئے ہمارا خود ہنسنا ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ دوسروں کو اس پر آمادہ کرنا پڑتا ہے اس کے لئے ہنسی پیدا کرنے والی مختلف چیزوں سے واقفیت کے ساتھ ساتھ ہنسی پیدا کرنے والی انسانی حسوں کو متحرک کرنے والے طریقوں سے گہری واقفیت بھی درکار ہوتی ہے ورنہ آپ اور ہم بھی جانتے ہیں کہ انسانی مشین کی مشینری کتنی نازک کتنی باریک اور کتنی الجھی ہوئی ہے۔ انسانی جسم میں مختلف نسوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے اور یہ نسیں ایک دوسرے سے انتہائی قریب ہی نہیں اتنی ملتی جلتی بھی ہیں کہ ان میں امتیاز کرنا دشوار ہے اس کے علاوہ انسانی جسم کے مختلف پرزے بیک وقت مختلف النوع کام بھی انجام دیتے ہیں۔ قطع نظر اس کے انسان کے جذبات اور احساسات بھی بڑے نازک ہوتے ہیں ایسی صورت میں اگر ہنسانے والے سے ذرا سی چوک

ہو جائے تو سارا معاملہ ہی گڑبڑ ہو جائے ہنسی کے بجائے رونے کے سُر نکلنے لگیں۔ اس لئے یہ بات غلط نہیں
ہے کہ ہنسنا تو دشوار ہے ہی ہنسانا اور بھی زیادہ دشوار اور مشکل ہے اور جو یہ دونوں کام بیک وقت انجام دے
اس کی اہمیت جرأت اور صلاحیت کو تسلیم نہ کرنا ناانصافی ہی نہیں ظلم ہے۔ ہماری اس معاشی پسورتی دنیا میں جو
لوگ اس جرأت مندی کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں یعنی بیک وقت ہنستے اور ہنساتے رہتے ہیں انہیں عام طور پہ
ظریف کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ فطرتاً زندہ دل، عادتاً خوش مذاق ہوتے ہیں اور عام لوگوں سے اس لئے بھی
علاوہ ہوتے ہیں کہ عام لوگ جن معاملات پر رونے لگتے ہیں یہ ان معاملات میں بھی ہنسنے کے پہلو نکال لیتے ہیں
اس کے علاوہ یہ اپنی فطرت اور عادت کے تحت صبح و شام دن رات ہر وقت ہنسنے ہنسانے کے بہانے تلاش
کرتے یا تراشتے رہتے ہیں کیوں کہ ہنسنے ہنسانے کے لئے کوئی نہ کوئی بہانہ تو ہونا ہی چاہیئے۔ ورنہ ہم اور
آپ سب خوب جانتے ہیں کہ بغیر بہانے کے نہ صرف ہنسنا دشوار ہے بلکہ بغیر وجہ اور سبب کے ہنسنے میں
بہت سے اندیشے بھی ہیں اور خطرات بھی۔

ہنسنے ہنسانے کے لئے معقول بہانے تلاش کرنا یا مناسب بہانے تراشنا بھی ہمارے خیال میں کوئی
آسان کام نہیں اور ہر ایک کے بس کی بات نہیں اور اس میں کامیابی بڑی مشکل سے حاصل ہوتی ہے۔ اس
میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے علاوہ فطری صلاحیتوں کے دوسری چیزوں سے بھی مدد لینی پڑتی ہے' احساسات
و جذبات کے سمندروں کی غواصی کرنا پڑتی ہے' زندگی کے وسیع صحراؤں میں شگفتگی کے نخلستان تلاش
کرنے پڑتے ہیں' انسانی ذہنوں میں جھانکنا پڑتا ہے' دلوں کو ٹٹولنا پڑتا ہے اور خود کے دیدۂ دل کے
کواڑ کھولنے کے علاوہ زہر کو تریاق بنانے کا عمل بھی کرنا پڑتا ہے۔ جو لوگ ان منازل کو طے کرنے میں کامیابی
حاصل کر لیتے ہیں اور اپنی باتوں یا تحریری باتوں سے ہنسنے اور ہنسانے میں مہارت حاصل کر لیتے ہیں۔ انہیں ادب
کی قلمرو میں مزاح نگار کے لقب سے سرفراز کیا جاتا ہے اور ان کے ہنسنے ہنسانے کے عمل کو مزاح کہا
جاتا ہے' دنیا میں رونے کے معاملات اور واقعات کی طرح تلخیوں' ناانصافیوں' ناہمواریوں' بدعنوانیوں'
بدمزاجیوں' بداخلاقیوں' بداطواریوں' خود غرضیوں اور خود فریبیوں وغیرہ کی بھی بڑی بہتات ہے اور جنگی سامان
اور ہتھیاروں کی طرح ان کے نت نئے نمونے سامنے آتے رہتے ہیں۔ اگرچہ ان سب سے چپ چاپ گزر جانا
عین دانشمندی ہے مگر دنیا میں سب تو دانش مند ہیں نہیں چنانچہ جن لوگوں میں دانشمندی کے جراثیم کی کمی
ہوتی ہے ان کے لئے ان معاملات سے سرسری گذر جانا ممکن نہیں ہوتا ہے۔ مگر یہاں ان بے چاروں کے سامنے
ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے' یہ بے چارے لوگ ان معاملات پر نہ رو سکتے ہیں نہ ہنس سکتے ہیں دونوں
میں قباحت ہے۔ شکایت کریں تو کس سے؟ ناک بھوں چڑھاتے ہیں تو بھی اپنے ہی چہرے کے خراب ہونے
کا خطرہ ـــ اور خود کو روکیں تو کیسے؟ دانشمندی کا فقدان اس کی اجازت نہیں دیتا۔ چنانچہ غیر دانشمند
لوگوں نے جو دنیا کی برائیوں' حالات کی ستم ظریفیوں اور احباب کی عنایتوں پہ پہلے ہی رو رو کر رونے سے

اکتا گئے اور ہنسنے کی طاقت و تاب کھو چکے تھے اور شکایتیں کر کے تھک چکے تھے اپنی خیر و دانشمندی سے پیدا ہونے والی بے قراری و بے چینی کو متسکن کرنے کے لئے ایک ایسا طریقۂ اظہار اختیار کیا جو بیک وقت ان سب کا نعم البدل ہو۔ اس طریقۂ اظہار کو طنز کا نام دیا گیا۔ اس میں آدمی بظاہر ہنستا ہوا معلوم ہوتا ہے مگر حقیقت میں روتا ہے۔ بظاہر ہنستا ہوا لگتا ہے مگر اصل میں رلاتا ہے' بظاہر مذاق کرتا ہے مگر ایک طرح سے حقیقتاً بیان کرتا ہے اور دنیا کی برائیوں' خرابیوں اور زندگی کی ناہمواریوں' حالات کی تلخیوں اور کرم فرماؤں کی عنایتوں اور زمانے کی بے رحم سچائیوں کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ ہنسنے کا' رونے کا اور شکایت کرنے کا سب کا حق ایک ہی وقت میں ادا ہو جاتا ہے۔ ایک طرح سے طنز کا عمل تلخی کو مٹھاس میں ملفوف کرنے یا تلخ و کڑوی گولی کا سارا روپ دینے کے عمل کے مترادف ہے۔ آپ جانئیے متضاد خصوصیات والی چیز وں کو یکجا کرنا اور اس طرح یکجا کرنا کہ ان کی اصلیت بھی برقرار رہے اور اصلیت ظاہر بھی نہ ہو کتنا دشوار ہے چنانچہ یہ کام مزاح سے بھی زیادہ مشکل ٹھہرا اور مزاح نگار حضرات کے ہی بس میں آیا اور مزاح کے بہت سے حربے اور اوزار اور مزاح سے متعلق بہت سی خصوصیات مثلاً ذکاوت حس احساس تناسب' وسیع ذوق' خوش مزاجی' تیز نگاہی اور لطافت خیال وغیرہ اس عمل کے لئے بڑی کارآمد ثابت ہوئیں' غالباً اسی بناء پر اسے یعنی طنز کو مزاح کے قریب تصور کر لیا گیا اور چونکہ اردو ادب میں تلخیوں کی ہمیشہ سے زیادتی رہی ہے اور رونے رلانے کے معاملات سے اس کا دامن ہمیشہ لبریز رہا ہے اس کے علاوہ مشرق کے لوگ بالخصوص اردو ادب کے لوگ کچھ زیادہ ہی نازک طبع واقع ہوئے ہیں اس لئے طنز کی تلخی پر مزاح کی موٹی تہہ چڑھانے کا عام رواج ہو گیا اور دھیرے دھیرے یہ مزاح سے قریب سمجھا جانے لگا — پھر ہمارے بزرگوں نے جو بڑے وسیع النظر' وسیع القلب' بڑے بامروت بڑے لبرل اور انتہائی سیکولر مزاج کے مالک تھے عام رواج اور عام تصور کا لحاظ رکھتے ہوئے طنز کو "دُکی ڈور" سے مزاح کے ساتھ منسلک کر دیا اور نتیجتاً اردو ادب میں مزاح اور طنز اور طنز و مزاح لازم و ملزوم ہو گئے اور طنز و مزاح ایک صنف ادب بن گئی ———— ▲

فلم "بازار" کا ایک مقبول گیت

کروگے یاد تو...

کروگے یاد تو ہر بات یاد آئے گی
گزرتے وقت کی ہر موج ٹھہر جائے گی
کروگے یاد تو...

یہ چاند بیتے زمانوں کا آئینہ ہوگا
بھٹکتے ابر میں چہرہ کوئی بنا ہوگا
اداس راہ کوئی داستاں سنائے گی
کروگے یاد تو...

برستا بھیگتا موسم دھواں دھواں ہوگا
پگھلتی شمعوں پہ دل کا مرا گماں ہوگا
ہتھیلیوں کی حنا یاد کچھ دلائے گی
کروگے یاد تو...

گلی کے موڑ پہ سونا سا کوئی دروازہ
ترستی آنکھوں سے رستہ کسی کا دیکھے گا
نگاہ دور تلک جا کے لوٹ آئے گی
کروگے یاد تو...

خرافات (مراسلے)

▪ کل کے پتے سے "شگوفہ" کا سالنامہ بھی ملا۔ معلوم ہوتا ہے آپ مضامین پڑھ کر چھاپتے ہیں۔ کارٹونوں کا اضافہ کافی اچھا ہے۔ حمایت اللہ کا کارٹون دلچسپ ہے۔ آپ نے پردہ نشین سے کام لیا اور شگوفے کا دفتر کبھی اتنا سنسان نہیں ہوتا۔ عزیز کارٹونسٹ اچھے آرٹسٹ ہیں۔ کارٹونوں کا کارٹون بنانا مشکل کام ہے۔ سالنامہ بہت پسند آیا

◄ یوسف ناظم۔ بمبئی

▪ اس قہقہہ بر صفحات سالنامہ کیلئے میری طرف سے دلی مبارکباد۔ عزیز کارٹونسٹ اور مسیح انجم صاحبان کو بھی آپ نے سرورق پر اپنی تصویر کا جواز خوب نکالا۔ اتنے سارے سربرآوردہ مزاح نگاروں کا تعاون حاصل کرنا بجائے خود کمال ہے اور فی زمانہ یہ صرف مصطفیٰ کمال ہی سے ممکن ہے۔

◄ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید
تروپتی

▪ "شگوفہ" کا سالنامہ موصول ہوا، جس کی حرارت سے انتظار کی برف پگھل۔ سرورق سے آخری صفحے تک "شگوفہ" کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔ سالنامے کا ہر لفظ ذائقہ دار ہے۔ اس کے مطالعہ کے دوران بھوک کا احساس تو ہوتا ہی نہیں۔ میری نظر میں یہ غم دوراں اور غم جاناں کا بہترین علاج ہے۔ اس کی سجاوٹ پر نئی نویلی دلہن کا دھوکہ ہو رہا ہے۔ یہ سالنامہ انوکھی نعمت کا حامل ہے۔ ہر مضمون معیار کی کسوٹی پر کھرا نظر آتا ہے۔ غزلوں اور نظموں کا انتخاب آپ کے دلچسپ مزاج کا آئینہ دار ہے۔ اس عمارت کی ہر اینٹ پختہ نظر آتی ہے۔ جناب عزیز کارٹونسٹ کا فن قہقہوں کا دعوت نامہ ہے۔ ہندوستان کے مشہور و معروف مزاحیہ مضمون نگاروں اور شاعروں کے کارٹونوں کی نمائش اس سالنامے کے چہرے کا غازہ ہے۔ جناب عزیز کارٹونسٹ کی کارگذاری قابل صد ستائش ہے۔ انہوں نے کارٹونوں کا سہارا لے کر مزاحیہ فنکاروں کی فنی بلندی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ اردو دنیا کو ایسی شخصیت پر ناز ہے۔ خدا جناب عزیز کارٹونسٹ کو عمر خضر عطا کرے تاکہ وہ فن کا پٹاخہ چھوڑتے رہیں — "شگوفہ" کا سالنامہ، رسالہ نہیں فن کا آئینہ ہے جس میں طنز و مزاح کا ہر پہلو جھلکتا ہے۔ ایسے غیر معمولی سالنامے کی کامیاب اشاعت پر مبارکباد کی سوغات قبول فرمائیں۔

◄ جوہر سیوانی (بہار)

▪ جنوری ۸۲ء کا حسین و جمیل شاہکار سالنامہ دستیاب ہوا۔ شگوفہ نوازی کا شکریہ۔ سینما اسکوپ قوالی کا نصف شائع کرنا مناسب تھا (باقی۔ پسماندہ قوالی شائد زینت شگوفہ بنے اگر مناسب موقع و محل دستیاب ہو)۔ شگوفہ کے مضامین اور نظموں کا مطالعہ جاری ہے۔ عزیز کارٹونسٹ کا کمال واقعی مصطفیٰ کا کمال ہے جو پیش کر دیا گیا۔ واہی صاحب کی نظم شاندار ہے۔ مبارکباد پہونچا دیجئے۔ ادارۂ شگوفہ کی محنت و کاوش کو نہ سراہنا یقیناً ظلم و بیداد کے مترادف ہوگا۔ جملہ اسٹاف کو مبارکباد و سلام

◄ مختار یونس۔ مالیگاؤں

▪ سالنامہ نظر نواز ہوا۔ "خاکہ سے خرافات تک" کس کس کا ذکر کروں۔ اقوام متحدہ میں اگر یہ پیش کیا جائے تو سرد جنگ اور گرم جنگ دونوں ٹل جائیں گے۔ اس

افراطِ زر اور شر کے دور میں اتنا حسین اور پُر مغز شمارہ نکالنا آپ کی ہی ہمت ہے۔ مصیبت کے ماروں کے لئے یہ پینگسنا کا رنا کا کام دیتا ہے۔ خدا کرے آپ یوں ہی سالا یہ مزاح بن کر کاروانِ مزاح کے ساتھ سوکھے ہونٹوں کو تبسم دیتے رہیں۔

▶ رؤف خوشتر۔ گلبرگہ

■ سالنامہ "شگوفہ" حاصل کرنے کے لئے میں مقامی بک اسٹال پر روز حاضری دیتا رہا اور بک اسٹال کا مالک "شگوفہ ابھی نہیں آیا" کہہ کر مجھے شرمندہ کرتا رہا۔ مگر ایک دن سالنامہ شگوفہ میرے ہاتھ لگ ہی گیا (مفت میں نہیں بلکہ قیمت ادا کرنے کے بعد) میں سب سے پہلے سرِ ورق کو دیکھتے ہی عزیز کارٹونسٹ کے کسی مزاحیہ کارٹون کی طرح ہنس پڑا۔ دو ہی دن میں پورا "شگوفہ" چاٹ کر دم لیا کم بخت ہے ہی اس قدر لذیذ ایک بار منہ کو لگ جائے تو چھٹتا ہی نہیں۔ ایک دو مضامین کو چھوڑ کر تمام مضامین دلچسپ اور قہقہوں سے بھرپور ہیں۔ مزاحیہ غزلوں کا بھی جواب نہیں۔ اس قدر قہقہے بکھیرنے والے ادیبوں اور شاعروں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے اپنی شہرت اور "شگوفہ" کی مقبولیت بڑھانے کا آپ نے خوب طریقہ نکالا ہے۔ میں آپ کی شہرت اور شگوفہ کی مقبولیت دونوں کو مبارک باد دیتا ہوں۔

▶ منظور وقار۔ گلبرگہ

■ نقد روپیہ منہ دکھائی ادا کر سالنامے کا گھونٹ اٹھایا۔ دل تڑپ کر منہ کو آیا اور مزید گارڈن گارڈن ہوا۔ چورن پہنچتے ہی نظر پڑی منہ میں پانی بھر آیا۔ قیمت اچھی تھی کیونکہ مال مفت جو تھا۔ کس کس کے انشائیے پر روشنی ڈالی جائے۔ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ بجلی گل ہو گئی۔ مجبوراً سبھوں کو موم بتی دکھائی۔

▶ مرزا کھونچ۔ نیا ٹولہ (پٹنہ)

■ سالنامہ دیکھا۔ آج کے تمام طنز و مزاح نگاروں کو یکجا دیکھ کر حیرت ہوئی۔ صحت کے لئے یہ بہتر بھی نہیں کہ تمام ہنسانے والے ایک پرچے میں موجود ہوں۔ مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم، نریندر لوتھر کے مضامین پسند آئے۔ نریندر لوتھر کا مضمون بہت بہتر معلوم ہوا پڑھنے کو ملا۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

▶ محمد احمد۔ سیلم

اس یوم جمہوریہ کے موقع پر

ایمانداری، عزم صمیم اور سخت محنت کے

ذریعہ پیداوار میں اضافہ

کے لئے ہمارا عہد

وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی نے اپنے پرجوش اور ولولہ انگیز پیام میں مساوات اور انصاف پر مبنی سماجی نظام کے حصول کے لئے واحد راستے کی نشان دہی کر رہی ہے اور قوم سے کہہ دیا ہے کہ یہ وقت نظم و ضبط کے ساتھ ہمہ تن مصروف عمل ہوجانے کا ہے۔ وزیراعظم نے کہا کہ ہماری عزت، ترقی اور خوشحالی کا دار و مدار سچائی اور سخت محنت پر کاربند ہوجانے میں ہے نئے معلنہ پروگرام میں کمزور طبقات کی ہمہ جہتی ترقی کے لئے اضافہ پیداوار اور تیز رفتار فلاحی تدابیر کی عمل آوری پر بھی زور دیا گیا ہے۔

چیف منسٹر شری ٹی انجیا کی زیر قیادت آندھرا پردیش میں درج فہرست اقوام، درج فہرست قبائل، پسماندہ طبقات خواتین اور اطفال جیسے کمزور طبقات کو ترقی کے ثمرات سے اُن کا جائز حصہ دلانے کے لئے مختلف نوع قسم کی اسکیمات روبہ عمل لائی جارہی ہیں۔

- سماجی بہبود کی اسکیمات کے موازنہ جاتی گنجائش سال ۱۹۷۷-۷۸ء کے مقررہ رقم ۲۱.۵۷ کروڑ روپیوں سے بڑھتے بڑھتے ۸۷.۱۲ کروڑ روپیوں کی تقریباً چارگنا مقدار تک پہونچ گئی ہے۔
- چودہ لاکھ سے زاید خاندانوں کو اب تک رہائشی جگہیں فراہم کی گئی ہیں۔ جاریہ سال کے دوران میں مزید ۰.۵ لاکھ خاندانوں کو اس سہولت سے مستفید کرنے کی تجویز ہے۔
- درج فہرست اقوام کے لئے ایک جزوی منصوبہ زیر عمل آوری ہے جس کے لئے سال ۱۹۸۰-۸۱ء میں ۴۲.۴۰ کروڑ روپے اور سال ۱۹۸۱-۸۲ء میں ۵۰ کروڑ روپے مقرر کئے گئے ہیں سال ۱۹۸۲-۸۳ء

کے لئے مجوزہ گنجائش خرچ ۳۲۷ء۸۹ کروڑ روپے ہے۔

■ شیڈولڈ کاسٹس فینانس کارپوریشن نے درج فہرست اقوام کے خاندانوں کو غربت کی سطح سے اوپر اٹھانے کے لئے جاریہ سال کے دوران ۱۱۹ء۱۹ لاکھ روپے کی مالیت کی اسکیمات شروع کی ہیں۔

■ تعلیمی وظائف سے استفادہ کرنے والے مابعد میٹرک جماعتوں کے درج فہرست اقوام طلبأ کی تعداد جو ۷۸-۱۹۷۷ء میں ۲۷۵۳۸ تھی بڑھ کر سال ۸۱-۱۹۸۰ء میں ۵۴۰۰۰ تک پہونچ گئی۔

■ درج فہرست اقوام طلباء کو تعلیمی وظائف کے استحقاق کے لئے اُن کے والدین کی آمدنی کی حد کو سالانہ ۶۰۰۰ روپے سے بڑھاکر ۱۲۰۰۰ روپے کر دیا گیا ہے۔ اقامت خانوں میں مقیم طلبأ کی خوراکی بڑھاکر ماہانہ ۸۵ روپے کر دی گئی ہے۔

■ سماجی بہبود پروگرام کی دوسری نمایاں خصوصیات یہ ہیں۔ بین فرقہ جاتی شادیوں کے لئے ترغیبات مفت قانونی امداد کی سہولت، ہریجنوں سے مظالم سے نمٹنے کے لئے متحرک عدالتوں کا قیام۔

■ برقی پیداوار کی تنصیبی قوت ۲۳۰۰ میگاواٹ تک پہونچ گئی ہے۔

■ مکمل صنعتی امن، بہترین آب و ہوا، برقی قوت اور پانی کی دستیابی اور حکومت کی جانب سے فیاضانہ ترغیبات کی بدولت آندھراپردیش کے نئے صنعت کاروں کا منظور نظر ہے۔

■ صنعتوں میں ۶۰۰ کروڑ روپیوں پر مشتمل سرمایہ مصروف ہے۔

■ کمزور طبقات کے لئے ۲۲۰۰۰ مکانات تکمیل کے مختلف مراحل پر ہیں۔ جھونپڑی کے لئے مالی امداد ۴۰۰ روپے سے بڑھاکر ۱۰۰۰ روپے کر دی گئی ہے۔

■ پولاورم بریج، سری سیلم رائٹ کنال اور جورالا پراجکٹ پر کام شروع ہو چکا ہے۔

■ ناگرجنا ساگر کنال کو عصری بنانے کا کام پوری تیزی سے جاری ہے۔

■ دیہی آبرسانی پروگراموں کی عمل آوری اولین ترجیح کے ساتھ ہو رہی ہے۔

■ نوجوانوں اور مقامی مجالس کے اشتراک سے سماجی منفعت کے لئے شجر کاری کے پروگرام وسیع پیمانہ پر روبعمل لائے جارہے ہیں۔

■ صنعتی مقاصد کے لئے درکار چوبینہ کی پیداوار بڑھانے کے لئے ایک صنعتی شجر کاری فنڈ قائم کیا گیا ہے

■ خاندانی منصوبہ بندی پروگرام زور و شور کے ساتھ روبہ عمل لائے جارہے ہیں۔ مقررہ نشانہ ۱۴۲۷۵ کے مقابلے میں اپریل تا دسمبر ۸۱ء کے دوران ۱۸۳۵۲۷ نس بندیاں کی گئیں۔

■ ۸۳-۱۹۸۲ء کے لئے سالانہ منصوبہ کا خرچ ۶۰۰ کروڑ روپے کی ریکارڈ مقدار میں مقرر کیا گیا ہے

■ خشک سالی اور سیلابوں کے باوجود ۸۱-۱۹۸۰ء میں تقریباً ۱۰۰ لاکھ ٹن غذائی پیداوار حاصل کی گئی

■ آندھراپردیش میں ہریجن اور کمزور طبقات اب پہلے سے کہیں زیادہ بہتر موقف میں ہیں۔ اُن کے لیل و نہار تابناک تر ہوتے جارہے ہیں۔

MARCH 1982 **Rs. 2-50**

زندہ دلان حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

جلد — ۱۵
شمارہ — ۳
مارچ ۱۹۸۲ء

ایڈیٹر
سید مصطفیٰ کمال

کتابت: نسیم احمد، مسعود انور
طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان، حیدرآباد
بائنڈنگ: محبوب بک بائنڈنگ ورکس، پرانی حویلی، حیدرآباد

قیمت فی پرچہ — ۲ روپے [illegible] پیسے
زرسالانہ — انفرادی ۲۵ روپے
لائبریری: ۳۰ روپے
بیرون ہند سے: ۹۰ روپے

— خط و کتابت کا پتہ —

شگوفہ — ۱۳- چیمبرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱ فون نمبر ۵۷۷۱۶

سالگرہ کیک اور ویڈنگ کیک کے اسپیشلسٹ

کراچی بیکری

معظم جاہی مارکیٹ۔ حیدرآباد

ڈسٹری بیوٹرس برائے :-

۱۔ موہن میکن بریوریز
۲۔ انڈین بیسٹ کمپنی لمیٹڈ
۳۔ پیری سوئٹس اینڈ ٹافیس
۴۔ اجنٹ ڈیری، آگرہ
۵۔ کیکو کیننگ انڈسٹریز ٹیپچور
۶۔ ڈرک بوٹان فوڈ پراڈکٹس
۷۔ ہارکو، سری نگر
۸۔ میڈونا کیننگ کمپنی
۹۔ چمپین وہائٹ روٹس
۱۰۔ سیل ہاؤ (جیمس اسمتھ اینڈ کمپنی) وغیرہ

سب قواموں کا بادشاہ ہے یہ
کیف و لذت کی انتہا ہے یہ

کشمیری قوام

نقلی اور ملتے جلتے مال سے بچنے اور اصلی کشمیری قوام خریدنے کے لیے اس کے ڈبے اور پیکنگ کو بغور دیکھ لیجیے۔

تیار کنندگان :-

پورن داس رنچھوڑ داس اینڈ سنس۔ گلزار حوض۔ حیدرآباد

اِس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

ڈاکٹر محی الدین قادری زور

جن کے قائم کردہ ادارۂ ادبیاتِ اردو کی گولڈن جوبلی تقریب
کا نائب صدر جمہوریۂ ہند جناب ہدایت اللہ نے ۳ر مارچ کو افتتاح کیا

وجاہت علی سندیلوی

(ریڈیائی ڈرامہ)

الکشن کا شوق

کردار :-
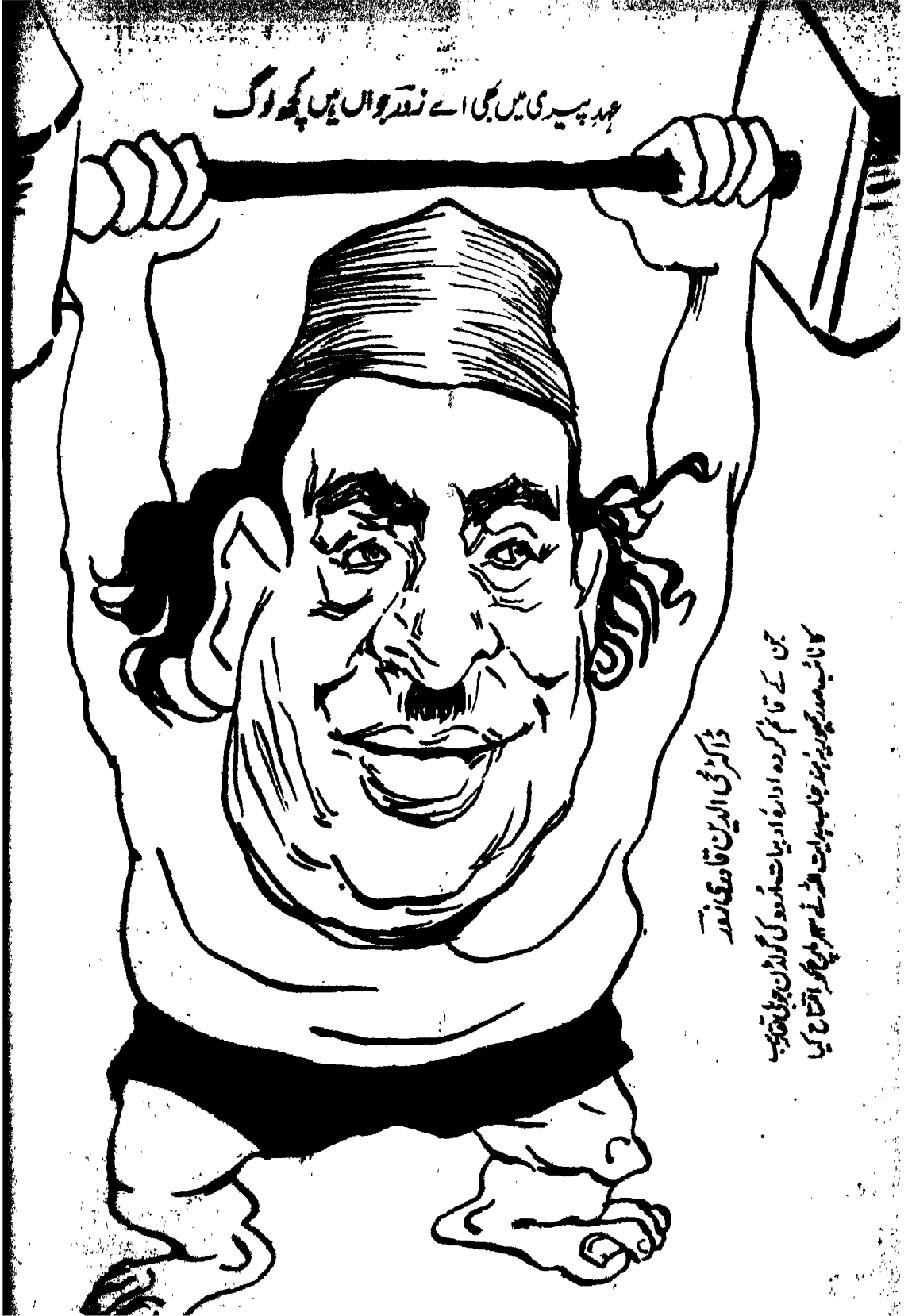
۱. ڈکشٹ جی - الکشن کے اُمیدوار
۲. مرزا صاحب - اُن کے دوست
۳. ایک شریمتی جی
۴. سلیمن } ووٹر
۵. دھرو پہلوان

(دروازے کی زنجیر کھڑکتی ہے۔ پہلے کچھ دھیرے سے پھر کچھ زور سے، پھر اور زور سے۔ پھر پکار سنائی دیتی ہے جو رفتہ رفتہ بلند ہوتی جاتی ہے۔ مرزا صاحب۔ مرزا صاحب۔ مرزا صاحب۔ مرزا صاحب!)

مرزا صاحب: (خراٹوں کے درمیان گہری نیند سے بیدار ہوتے ہوئے)۔ اجی کون صاحب ہیں جو سو مرغ پال رہے ہیں بانگ پر بانگ دیئے جا رہے ہیں!

ڈکشٹ جی: اجی، دروازہ بھی کھولو گے یا گھوڑے بیچ کر سوتے ہی رہو گے؟

مرزا صاحب: اچھا آپ ہیں ڈکشٹ جی! خیریت؟ یہ آدھی رات کو سحری والوں کی طرح کیسے جگانے آ پہنچے؟

(دروازہ کھولتے ہیں)

ڈکشٹ جی: بھئی آپ بھی سڑک پر گشت کرنے والے کانسٹبل کی طرح باتیں کرنے لگے۔

مرزا صاحب: سڑک پر گشت کرنے والا کانسٹبل! کیا مطلب آپ کا؟

ڈکشٹ جی: مطلب یہ کہ آج آنکھ ذرا جلدی کھل گئی۔ سوچا کہ آپ کو ساتھ لے کر کچھ دوستوں کے گھروں کا گشت بھی لگا لوں۔ گلی کی نکڑ پر وہ کانسٹبل مل گیا۔ کہنے لگا یہ آدھی رات کو کہاں جا رہے ہو! میں نے کہا صبح کی چہل قدمی کو جا رہا ہوں۔ تو آپ کو معلوم کہ اس ناشدنی نے کیا کہا؟

مرزا صاحب: کیا کہا اس نے؟

ڈکشٹ جی، کہنے لگا کہ آدھی رات سے صبح کی چہل قدمی کرنا تھی تو صبح کی چہل قدمی کرکے ہی کیوں نہیں سوئے تھے ؟

مرزا صاحب : (ہنستے ہوئے) سچ پوچھئے تو اُس نے کچھ غلط نہیں کہا۔ دیکھئے ناکہ اس وقت پونے چار بجے ہیں اور آپ اس سے پہلے نہیں معلوم کب گھر سے نکلے ہوں گے۔

ڈکشٹ جی، کہئے آپ بھی کہئے ! لیکن جب میں نے سوتوں کو جگانا اپنی زندگی کا مقصد ہی بنالیا ہے تو مجھ پر غیروں کی فضیحت یا اپنوں کی نصیحت کا کچھ بھی اثر نہیں ہوسکتا ہر بڑے نیتا کو شروع شروع میں یہی پریشانیاں اُٹھانی پڑتی ہیں۔ اچھا اب یہ چہ میگوئیاں بند کیجئے اور گشت کیلئے جلدی سے تیار ہوجائیے۔

مرزا صاحب : دیکھئے پنڈت جی. میرے آپ کے تیس سال پرانے تعلقات ہیں۔ مجھے اپنا مخلص دوست اور بہی خواہ سمجھتے ہیں یا نہیں؟

ڈکشٹ جی، ارے بھائی سمجھتا نہ ہوتا تو اس وقت تمہارے پاس بیٹھا کیسے ہوتا۔ لیکن اب یہ لچھے دار باتیں چھوڑیئے اور اُٹھ کر جلدی سے تیار ہوجائیے۔ اس وقت ہر ووٹر اپنے ہی کے نیچے یعنی گھر ہی میں ملے گا۔ اب دیکھئے ہم یہاں بیٹھے یہ رونا رو رہے ہیں کہ ابھی ٹھیک سے سویرا نہیں ہو پایا ہے اور امریکہ اور یورپ میں کارخانے چل رہے ہونگے اور کروڑوں روپوں کا مال کھٹا کھٹ بن رہا ہوگا۔

مرزا صاحب ، بھئی میں ایک دوسری بات کہنا چاہتا ہوں اگر آپ ٹھنڈے دل سے اس کو سمجھنے کی کوشش کریں تو ! اب آپ اس نگر پالکا کے الکشن وکشن کے چکر میں نہ پڑیں زیادہ بہتر ہے۔

ڈکشٹ جی، یہ بھی ایک ہی رہی۔ بھئی اس چکر میں نہ پڑوں تو کروں کیا ؟ جنتا کی آخر سیوا کیسے کروں ؟

مرزا صاحب ، جنتا کی سیوا کرنے کے بہت سے دوسرے طریقے ہوسکتے ہیں۔ کوئی اسکول کھولئے۔ کوئی اسپتال بنوایئے۔ کسی لائبریری کے قائم کرانے کی کوشش کیجئے۔ کسی یتیم خانے میں چندہ دیجئے۔ رشوت خوری اور چور بازاری بند کرانے کیلئے کوئی کمیٹی بنوائیے۔

ڈکشٹ جی، جی ہاں ! کوئی پاگل خانہ بنواؤں اور اُس میں آپ کے ساتھ بھرتی ہوجاؤں۔ مرزا صاحب میں نے ساری خدائی کا ٹھیکا نہیں لیا ہے: چراغ پہلے اپنے گھر میں جلایا جاتا ہے۔ مجھے پہلے اپنے وارڈ کی فکر ہے۔ بڑا اور منجھلا لڑکا دُکان پر بیٹھتا ہے۔ تیسرا خالی ہے اس کو نگر پالیکا سے ٹھیکہ دلوا کر فوراً اپنے وارڈ کی ساری سڑکیں ٹھیک کرادوں گا۔ یہ کیا کچھ کم خدمت ہوگی جنتا کی ؟ اور پھر سڑکوں پر یہ کیسے پھدے بلب لگے ہیں کہ چراغ سے بھی مدھم روشنی دیتے ہیں۔ میرے سالے کی قصبے میں سب سے بڑی بجلی کے سامان کی دُکان ہے۔ ایسے چھپاتے بلب لگوا دوں گا کہ رات، دن کو شرمانے لگے گی۔

مرزا صاحب ، ڈکشٹ جی۔ آپ کے سب منصوبے تو بہت ہی اُونچے ہیں لیکن مصیبت تو یہ الکشن ہے جس میں اپنے آپ کو گلی گلی اور گھر گھر نیلام کرنا پڑتا ہے اور ووٹ دیتے وقت لوگ چوٹ دے جاتے ہیں۔ آپ غالباً دو الکشن ہار چکے ہیں۔

ڈکشٹ جی، نہیں تین۔

مرزا صاحب ، اور آخری الکشن میں تو شائد آپ کی ضمانت بھی ضبط ہوگئی تھی۔

ڈکشٹ جی، تو ضمانت ضبط ہوجانے کی ذمہ داری مجھ پر کیا ؟

ضمانت ضبط کرنے کا قاعدہ میں نے نہیں سرکار نے بنایا ہے۔ اور میرے خیال میں یہ قاعدہ بالکل غلط ہے ایک تو بیچارہ اُمیدوار ہارے اور دوسرے سرکار کا جُرمانہ بھگتے۔ میری مانی جائے تو ایسے اُمیدوار کی تسلی کے لئے اُلٹی سرکاری امداد ملنا چاہئیے۔ جیسے کار دُرگھٹنا یا ریلوے کے حادثوں میں مرنے یا زخمی ہونے والوں کو ملا کرتی ہے۔

مرزا صاحب: بھائی میں دوسری بات کہنا چاہتا ہوں، یعنی ضمانت ضبط ہو جانے کے بعد اب آپ کس برتے پر پھر الکشن لڑنا چاہتے ہیں۔؟

ڈکشت جی: آپ ہمیشہ دوسری بات کہنا چاہتے ہیں۔ ضمانت ضبط ہوگئی تو ہوگئی۔ میری زبان اور پیر تو ضبط نہیں ہوگئے میرے دوست اور ورکر تو نہیں ضبط ہوگئے۔ تعجب ہے کہ اتنی صاف اور کھلی ہوئی بات آپ کی سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک دفعہ ضمانت ضبط ہو جانے سے میں میدان چھوڑ کر بھاگ نکلوں تو جنتا مجھے کیا کہے گی۔؟ ضمانت بچانے کے لئے گھر میں دبک کر بیٹھا رہا۔

مرزا صاحب: ؎ یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھکو زباں اور

ڈکشت جی: لیجئے۔ اب شعر و شاعری پر اُتر آئے آپ۔ اجی یہ سب باتیں بعد میں کر لیجئے۔ اس وقت بس جلدی سے کپڑے پہنئے اور ساتھ چلئے میرے۔ اب وہ گشت کرنے والا کانسٹبل بھی جا چکا ہوگا۔

(وقفہ)

کنڈی کھٹکھٹانے کے بعد

ڈکشت جی: [illegible] بھوپول جی! (اور زور سے)

اجی بھوپول جی!

(قریب ہی کہیں مُرغا بولتا ہے)

بھئی مرزا شگون تو اچھا معلوم ہوتا ہے۔

مرزا صاحب: پہلے گھر والا مرغا تو ڈربے سے نکلے۔

ڈکشت جی: اجی بھوپول جی! ذرا باہر تو قدم نکالیئے۔ (دھیرے سے) کسی کے آنے کی آہٹ تو سنائی دے رہی ہے

ایک شریمتی جی: (دروازے کے پیچھے سے)۔ یہ کون لوگ ہیں آپ۔ جو چیخ چیخ کر سارے محلے کی نیند خراب کر رہے ہیں۔

ڈکشت جی: بہن جی کوئی بات نہیں۔ اگر بھوپول جی ابھی آرام کر رہے ہوں تو ہم لوگ کسی وقت پھر پھیرا لگا لیں گے۔

شریمتی جی: (بہت تلخ طنزیہ انداز میں) اگر بھوپول جی آرام کر رہے ہوں تو ہم لوگ کسی وقت پھر پھیرا لگائیں گے! میں کہتی ہوں کہ آخر آپ لوگوں کے ماں اور بہنیں ہیں کہ نہیں؟ آپ کو شرم نہیں آتی کسی شریف عورت پر اس طرح کا اتہام لگاتے! آخر بھوپول کون ہوتے ہیں میرے گھر میں آرام کرنے والے؟ محلے والے سنیں گے تو کیا کہیں گے مجھے؟ (گلوگیر آواز میں) ایک ایک کی چار لگائیں گے اور میری ساری عزت آبرو مٹی میں مل کر رہ جائے گی۔ . . . . . .

مرزا صاحب: بس بھاگ چلئے ڈکشت جی یہاں سے۔ آیئے چلیں . . . . .

ڈکشت جی: اس گھر کے دوست پتے سمجھئے۔ دال میں کچھ کالا ضرور ہے بھوپول کے ذریعے سب ٹھیک ہو جائیگا

(وقفہ)

ڈکشٹ جی، ارے سلیمن بوا سلام۔ سویرے سویرے اس تیزی سے کہاں چل پڑیں۔

سلیمن، بھیا کل رات سے میرا گھورو، غائب ہے اسی کو گھر گھر تلاش کر رہی ہوں۔

ڈکشٹ جی، تو آپ اور گھورو، میرے چناؤ نشان مرغے ہی پر مہر لگائیے گا۔

سلیمن، بس دُعا کرو پنڈت جی کہ گھورو مل جائے۔ ہم دونوں آپ ہی کے چناؤ نشان پر مہر لگائیں گے... لیکن کیا اب مرغوں کو بھی ووٹ ڈالنے کا ادھیکار مل گیا ہے؟

مرزا صاحب، کیا مطلب!

سلیمن، گھورو، تو میرا مرغا ہے۔

ڈکشٹ جی، پرماتما کرے آپ کا گھورو، ضرور مل جائے۔ دیکھئے اس پرچے پر جیسا مرغ بنا ہے اسی پر مہر لگائیے گا۔

سلیمن، ذرا دیکھوں تو بھیا —— ہائے یہ تو بالکل میرے گھورو، ہی کی تصویر ہے۔ وہی گردن وہی کیس۔ وہی اکڑی ہوئی گردن۔ وہی ڈیل ڈول، وہی آگے کو جھکی ہوئی چونچ۔ وہی نیتاؤں جیسی اکڑفونی چال ڈھال۔ بانگ دیتا تو سارے محلے کی مرغیاں کڑکڑانے لگتیں اور مرغے ڈھابیوں میں منہ چھپا لیتے۔

ڈکشٹ جی، جیتی رہو بوا۔ بس آج ایک سو فیصدی پکا ووٹ ملا ہے! ہاں تو آپ کرپا کرکے اپنے گھورو ہی کی تصویر پہ اپنی مہر لگائیے گا۔

سلیمن، مگر...... بُرا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں بھیا (کچھ غصّے کے انداز میں)۔ ایک تو الامنہ میں نہیں ڈالا۔ اپنے گھورو کے لئے انگاروں پر لوٹ لوٹ کر ساری رات کاٹی اور تم اس کی تصویر لئے موا ووٹ مانگتے پھر رہے ہو۔ کسی غریب کا صبر ایسے نہیں سمیٹا جاتا۔

ڈکشٹ جی، (ہکلاتے ہوئے) ارے بوا جی یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ میں آپ کے گھورو کو کیا جانوں؟

سلیمن، ڈکشٹ جی، اب چھوٹے منہ سے بڑی بات نہ نکلوایئے! جب گھورو کی تصویر آپ کے پاس ہے تو پھر گھورو کس کے پاس ہو سکتا ہے؟ سیدھے ہاتھ سے میرا گھورو مجھے واپس کیجئے۔ ایک تو آپ نے میری اجازت کے بغیر اس کی تصویر کھنچائی؟ کہیں اس کو کسی کی بُری نظر لگ گئی تو میں تو کہیں کی نہیں رہوں گی اور پھر اوپر سے یہ سینہ زوری کر رہے ہیں کہ (ڈکشٹ جی کی آواز نقل کرتے ہوئے) میں گھورو کو کیا جانوں۔

ڈکشٹ جی، بوا ذرا ہوش کے ناخن لو! یہ تصویر تو میرے پاس آج پندرہ دن سے ہے اور آپ کا گھورو، کھویا ہے کل شام کو۔

سلیمن، تو یہ کہیئے کہ آج پندرہ روز سے آپ کی نظر اس پر تھی اور کل شام کو آپ اس پر ہاتھ مار پائے۔ دیکھئے میں ابھی چیخ پکار کرکے سارے محلے کو اکٹھا کرتی ہوں اور انہیں کے سامنے میرا آپ کا فیصلہ ہو جائے گا۔ (پکارتی ہے) سیتارام

بابا ! — جھمن ماما ! — ٹکو ! — رمو ! —
ٹوطارام بھیا ! —

(ایک مرغا بانگ دیتا ہے)

ارے میرا گھورو، تو میرے گھر ہی سے بانگ دے رہا ہے ! (بھاگتی ہوئی جاتی ہیں)

ٹ جی: (ہکلاتے ہوئے) بھئی ابھی تو حجامت ہی بنتے بنتے رہ گئی۔ محلے میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا تھا اس سلیمن نے ! خیر اس کا ووٹ تو بالکل ہی پکا ہے۔

احب: بھئی میری مانیئے تو اب لوٹ چلئے۔

ٹ جی: جی ہاں آپ کی مانیئے تو سامنے والے کنویں میں پھاند پڑیئے۔ بس دو تین گھر اور جھانکے لیتے ہیں۔ دیر ہی کتنی لگے گی۔

ٹ جی: (کئی دفعہ زور زور سے کنڈی کھڑکانے کے بعد چیختے ہیں) اجی دمڑو پہلوان جی ! اجی دمڑو پہلوان جی !

(دمڑو پہلوان دروازے کا پٹ زور سے بند کرتے ہوئے کھنکھارتے ہوئے نکلتے ہیں)

و : (غصے میں)۔ جان نہ پہچان۔ خالہ اماں سلام آخر کیا برائی کی تھی میں نے آپ کے ساتھ جو ابھی ٹھیک سے سویرا بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ آپ نے میرے دروازے پر شور مچا کر پورا محلہ جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور میرا بنا بنایا کھیل بگاڑ کر رکھ دیا۔ کیسے کیسے کہاں سے بھاگ کر آئے ہیں آپ اور مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟

ڈکشٹ جی: (گڑگڑاتے ہوئے) ہم نگر پالکا کے ہونے والے چناؤ کے لئے آپ کا ووٹ مانگنے آئے ہیں۔

دمڑو — خوب کان کھول کر سن لیجئے۔ میں آپ کو اپنا ووٹ ہرگز ہرگز نہیں دے سکتا۔ بلکہ آپ کو اس گلی کا ایک ووٹ بھی مل جائے تو میری ان مونچھوں کو چھچھوندر کی دم سمجھئے گا۔ بڑی مشکل سے دو نئے کبوتروں کو دانہ ڈال کر منڈیر سے نیچے صحن میں اتارا تھا۔ لیکن آپ نے آکر ایسا غل غپاڑہ مچایا کہ وہ کیا خود میرے کبوتر بھی پھرتا مار کر اڑ گئے۔ سچ پوچھئے تو بس خون اتر رہا ہے آنکھوں میں آپ کو دیکھ کر۔ اپنی خیریت اسی میں سمجھئے کہ بس میرے سامنے سے دور دفعان ہو جائیے۔

(دروازہ بند ہونے کی آواز آتی ہے)

ڈکشٹ جی: (پکار کر) چھچھوندر کی دم والے پہلوان جی! بکرے کو نہ بھولئے گا ! میرا چناؤ چنھ بکرا ہے بکرا

(دمڑو کی گرجدار آواز "ٹھہر جا تو رہنا" اور ڈکشٹ جی اور مرزا کے بھاگنے کی آواز آتی ہے

(کچھ وقفہ) ....)

مرزا صاحب: (بری طرح ہانپتے ہوئے) بھئی کمال ہی کر دیا آپ نے۔ یہ کیا حرکت تھی نامعقول؟ بھاگتے نہ تو اس وقت اسپتال میں ہوتے یا قبرستان میں۔

ڈکشٹ جی: (قہقہہ لگاتے ہوئے) ایک دوست ملا تو وہ بھی عقل سے ٹرپ۔ ارے مرزا صاحب!

اب اس پوری گلی سے ایک ووٹ بھی بکرے کو نہیں ملے گا۔ بکرے نے تو دمڑو پہلوان کے سب کبوتر ہٹکا دیئے ہیں۔ اب ووٹ ملیں گے خاکسار مُرغے کو!

منوا صاحب: بھئی۔ مجھے تو ہر ووٹر آپ کا قاتل نظر آتا ہے ابھی سویرا ہے۔ باز آیئے اس الکشن کی حماقت سے۔ کیا کسی ڈاکٹر نے نسخے میں لکھا ہے آپ کو الکشن لڑنا۔

ڈگشٹ جی: بھول گئے آپ وہ شعر، جو اکثر پڑھا کرتے؟

مجھے بھی یاد نہیں آرہا ہے، کچھ اس قسم کا تھا مجھے نہیں کچھ خوف و ہراس ہے، چلتا ہوں وہ راہ جو سیدھی اور صاف ہے۔ ابھی آپ منہ لٹکائے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت کا یہ گشت ضرورت سے زیادہ کامیاب رہا۔ اب تو الکشن لڑیں گے ضرور۔ ؎

سر کو جھکا دے، دُم کو اُٹھا دے
بول میرے مُرغے ککڑوں کوں

— —

غزل

رشید عارف (پٹنہ)

نادار ہیں پر اتنے تو مُردار ہم نہیں
فن بیچ کے جو کھائے وہ فنکار ہم نہیں

ہم لگ رہے تھے راہ میں فاقوں کی مار سے
اے تھانیدار بالوانشہ خوار ہم نہیں

پرمٹ کی، لائسنس کی، کوٹہ کی بات کر
کوڑے کی بات چھوڑ جمعدار ہم نہیں

تم کو کھلا ہی دیتے حوالات کی ہوا
افسوس! اے رقیبو حوالدار ہم نہیں

دنیا تو کیا کہ بیوی کے آگے بھی خوار ہیں
بدقسمتی سے اپنی جو زردار ہم نہیں

کیسے روپے کی تین اٹھنی بنائیں گے
لیڈر کی طرح دوستو ہشیار ہم نہیں

جب ڈھل گئی جوانی تو بھیجا ہیں پیام
[illegible]

بھٹّہ کھائیے!

اور خداوند تعالیٰ کا شکر ادا کیجئے کہ اُس نے بھٹہ جیسی نعمت سے آپ کو نوازا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اب تک کسی دانشور یا بھلے آدمی کی نظر بھٹے پر نہیں گئی۔ اس طرح بھٹے کو پڑھے لکھے طبقے میں وہ مقام نہیں مل سکا جس کا وہ مستحق ہے۔ پتہ نہیں یہ بھٹے کی بدقسمتی ہے یا اُس طبقہ کی جس نے کبھی بھٹے کو منہ نہیں لگایا!

بھٹوں میں بھٹہ مکئی کا بھٹہ غیر معمولی چیز ہوتا ہے۔ جوار کے بھٹے یا کسی اور بھٹے کو وہ بات نصیب نہیں جو مکئی کے بھٹے کو حاصل ہے۔ کھیتوں میں اس طرح نظر آتا ہے۔ جیسے کوئی جوان حسین عورت سمٹ سمٹا کر خود کو برقعے میں چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔ ریشم کے سنہری تاروں میں لپٹا لپٹا مکئی کا بھٹہ پتوں کے کیپسول میں بند خود کو دھوپ کی جھلسا دینے والی تیزی اور سردی کی ٹھٹھرا دینے والی لہر کے اثر سے محفوظ رکھتا ہے۔ پتوں کے ایک ایک پرت کو نکالنے یا الٹنے کے بعد مکئی کا بھٹہ برآمد ہوتا ہے۔ بلن وضع کی سخت لمبوتری شئے پر پیلے پیلے دانے اس طرح چمکتے رہتے ہیں۔ جیسے کسی سُنار نے بڑی توجہ اور محنت سے اُن نگینوں کو جڑ دیا ہو۔ بغیر بھنے ہوئے ان دانوں کو منہ میں ڈالتے جائیے' کچے دودھ کا مزہ آئے گا۔ واقعی بھٹہ دیکھنے کی شئے نہیں بلکہ کھانے کی چیز ہوتا ہے!

غریب لوگ بھٹے کو بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ دیہاتیوں کے لئے تو یہ بڑا سہارا ہے۔ بچے والی مائیں بھٹوں کا ہمیشہ اسٹاک رکھتی ہیں۔ جہاں کسی بچے کی رونے کی آواز آئی وہیں ماں نے اپنے لال کے ہاتھ میں بھٹے کا دستہ تھما دیا۔ اور کہا لے بیٹا کھا!

بھٹہ کھا لینے کے بعد ان بچے کو ایک گلاس ٹھنڈا پانی پلا دیتی ہے۔ اور بچہ پانچ چھ گھنٹوں تک بھوک اور

پیاس کو بھول کر کھیلنے لگتا ہے!

مگر یہاں ایک بات یاد رکھنی چاہیئے کہ بھٹہ کھانے کے لئے یا چبانے کے لئے منہ میں دانتوں کا ہونا بےحد ضروری ہے۔ شیر خوار بچے اور پوپلا منہ رکھنے والے بڑھے یا بچے بھٹے کے ذائقہ سے محظوظ نہیں ہو سکتے۔ اگر کوئی بڑھا اپنے ماضی کو دہرانا چاہتا ہے تو اُسے چاہیئے کہ کسی اچھے ڈنٹسٹ سے اپنے دانت بنوا لے!

بھٹہ بڑے کام کی چیز ہے۔ بلالحاظ عمر اور مذہب یہ عوام کی تمام جائز ضروریات کی تکمیل کرتا ہے۔ مثال کے طور پر لوگ اُسے روٹی کی شکل میں کھانا پسند کرتے ہیں، تو وہ گرم گرم روٹی بن کر اُن کی تھالی میں پہونچ جاتا ہے، اور کبھی یہ کیک، پسٹری اور بسکٹ کی شکل میں بڑی بڑی ہوٹلوں کی سیر کرتا ہے۔ غرض لوگ بھٹے کے آٹے سے قسم قسم کی چیزیں بناتے ہیں۔ اور وہ اُن کی پسند کے مطابق خود کو ڈھال لیتا ہے۔ اب یہ کھانے والوں کی مرضی پر منحصر ہے کہ بھٹے کا کس طرح اور کس انداز میں استعمال کرے!

ارے جاؤ ـــــ جاؤ ـــــ بھٹہ کھاؤ!!

یہ فقرہ جب کوئی عورت یا مرد کی زبان سے ادا ہوتا ہے تو اس کا مطلب کبھی بھی یہ نہیں ہوتا کہ واقعی وہ اپنے مخاطب کو خلوصِ دل کے ساتھ بھٹہ کھانے کی دعوت دے رہا ہے یا دے رہی ہے۔ بلکہ کچھ اور ہوتا ہے بتانے کی ضرورت نہیں۔ سمجھ جائیے!

محاورے میں اور ادب میں بھٹے کا استعمال ذرا تلخ ہو گیا ہے۔ اور لوگ اس کی کڑواہٹ کو محسوس کرنے لگے ہیں۔ ورنہ بھٹہ جیسی میٹھی، مزے دار شے اور کوئی نہیں ہوتی!

یوں تو مزے دار اشیاء میں بلا تکلف گندم کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔ گندم کے آٹے کی بنی ہوئی اور گھی میں تلی ہوئی گرم گرم روٹیوں کا جواب نہیں ہوتا۔ گندم کو کوٹ کوٹ کر گوشت کے ساتھ بنائی ہوئی حلیم کے ذائقے کا کچھ نہ پوچھئے۔ حلق کے نیچے اترتے ہی خون بڑی تیزی کے ساتھ اُچھلنے لگتا ہے اور بڑھاپے میں بھی دیواروں کو پھاندنے کے منصوبے بنانے لگتا ہے۔ لیکن گندم کو کبھی نہ کھائیے۔ کیونکہ یہی وہ شجرِ ممنوعہ ہے۔ جسے آدم کھائے تھے اور جنت سے نکال دیئے گئے تھے!

ساری گڑبڑ اور ہنگامے اسی گندم کی وجہ سے ہیں۔ وہ قومیں جو دن رات گندم کا استعمال کرتی ہیں۔ بات بات پہ مرنے اور مارنے کے لئے تیار ہو جاتی ہیں۔ اور یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ اردو زبان میں اسے بدتمیزی کہتے ہیں۔ اس لئے گندم کو ہاتھ مت لگائیے۔ کیونکہ تہذیب اور گندم دو مختلف نام ہیں۔ اور ان کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں ہوتا!

رہ گئی گندم کی دلالی کی بات تو یہ دوسری بحث ہے۔ اس کے جائز ہونے یا نہ ہونے کا فتویٰ تو کوئی مذہبی عالم ہی دے گا۔ لیکن اُن قوموں کا جواب نہیں۔ جنہوں نے گندم کے خطرے کو محسوس کیا اور اسے کسانوں سے خرید کر یا تو بڑے بڑے گوداموں میں بند کر دیا۔ یا باہر بھیجنے لگے، تاکہ امنِ عامہ برقرار رہ سکے اور عوام مہذب بن کر زندگی گزار سکیں!

ویسے بھی کسی بڑے آدمی یا ترقی یافتہ قوم کی نظر کسی اچھی چیز پر پڑے تو وہ آہستہ آہستہ بازار سے غائب ہونے لگتی ہے اور کبھی اچانک نگاہوں سے یوں اوجھل ہو جاتی ہے۔ جیسے کبھی اس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا لیکن اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اب تک کسی بھلے آدمی یا ترقی یافتہ قوم کی نظر بھٹے پر نہیں گئی!

لہٰذا بھٹہ کھائیے! اور زندگی کا صحیح لطف اٹھائیے!

اگر کسی وجہ سے آپ کو بھٹہ پسند نہیں تو کوئی بات نہیں۔ بھٹے کے علاوہ بھی قدرت نے بہت سی مزے مزے کی چیزیں پیدا کی ہیں۔ آپ انھیں کھائیے۔ اور اپنے بال بچوں کے ساتھ کھائیے!

مثلاً سیب کھائیے۔ کشمیری سیب بہت ہی میٹھا اور صحت بخش ہوتا ہے۔ کہتے ہیں مسلسل کھانے سے چہرے پر سرخی آجاتی ہے!

ایک سیب پر کیا منحصر، انگور بھی تو ہیں۔ انگوری شراب کا تو خدا نے وعدہ کیا ہے۔ لیکن وہ اچھے اعمال کے بدلے جنت میں نصیب ہوگی۔ بعض بے صبر بندے دنیا میں ہی اپنی تشنگی کو دور کر لیتے ہیں۔ کوئی بات نہیں۔ خدا ہمیشہ اپنے بندوں کے گناہوں کو معاف کرتا ہے۔ بشرطیکہ توبہ خلوصِ دل کے ساتھ کی جائے!

آم اور امرود کا جواب نہیں ہوتا۔ طب کی کتابیں ان کے فایدوں سے بھری پڑی ہیں۔ انھیں مزے سے کھائیے بلکہ ہو سکا تو جیلی بنا کر مرتبانوں میں محفوظ کر لیجئے تاکہ برس کے بارہ مہینے روز ناشتہ پر اسے استعمال کر سکیں!

بھئی انار کے کیا کہنے۔ آپ نے تو وہ محاورہ سنا ہوگا کہ ایک انار سو بیمار لیکن آج کل لوگ بیمار ہی نہیں پڑ رہے ہیں۔ سیدھا سیدھا مر جاتے ہیں۔ اچانک ہارٹ فیل کی وجہ سے یا حادثے کا شکار ہو کر، اس لئے وقت کی تبدیلی کے ساتھ محاورے میں بھی تبدیلی ہونی چاہئیے۔ اب تو صورت حال یہ ہے کہ سو انار ہیں اور بیمار ایک بھی نہیں۔ بھئی کیا زمانہ آگیا۔ ہے کوئی انار کا خریدار۔ آواز دے اور طلب کر لے!

انار کے علاوہ بھی قسم قسم کے میوے ہیں۔ کس نے روکا ہے آپ کو کھانے سے؟ سنترہ، موسمی، کیلا، خربوزہ اور سپوٹا سے لے کر سیتا پھل تک موجود ہے جسے دوسرے شہروں میں شریفہ کہا جاتا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ شریفہ کو میووں کی برادری میں شامل کر لیا گیا۔ ورنہ شریفہ کو بازاری چیز سمجھ کر کوئی لفٹ ہی نہیں دیتا تھا لیکن جیسے ہی شریفہ کو سماج میں ایک باعزت مقام ملا اور دوسرے شہروں میں جانے لگا۔ اس کی قیمت بڑھنے لگی، سچ ہے وطن چھوڑنے کے بعد ہی قدر میں اضافہ ہوتا ہے۔

خشک میوہ برا نہیں ہوتا۔ احتیاطاً جیب میں بادام، پستہ، اخروٹ اور کاجو ڈال لیجئے اور جب بھی بھوک لگے چباتے جائیے۔ لیکن خدا کے واسطے کسی ہوٹل کا رخ مت کیجئے۔ کیونکہ جلے جلے تیل کی بنی ہوئی چیزوں سے صحت خراب ہو جاتی ہے۔ اور یرقان کا اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے۔ اس لئے تیل سے دور رہئیے۔ ویسے اصلی گھی کی بریانی یا اور کوئی نشتے مل جائے تو کھانے میں کوئی ہرج نہیں۔ لیکن اس کا امکان کم ہے۔ اس لئے محتاط انداز تو یہی ہے کہ بازار میں بکنے والی کسی شئے کو ہاتھ نہ لگایا جائے۔ ویسے دودھ، مکھن اور میووں پر گذارا کیا جا سکتا ہے۔ اگر شہد کو بھی غذا کا ایک جزء بنا لیا جائے۔ تو کیا کہنے۔ طب کی تمام کتابیں اس کے فایدوں

سے بھری پڑی ہیں۔ مذہبی کتابوں میں بھی شہد کا ذکر ملتا ہے' یقین نہ آئے تو پڑھ لیجئے!

ویسے آپ کی مرضی - آپ جو چاہیں کھا سکتے ہیں۔ قدرت نے سیکڑوں نعمتیں آپ کے لئے پیدا کی ہیں
کیا آپ ان نعمتوں کو جھٹلا سکتے ہیں!

صرف آپ کا حکم چاہیئے۔ دکاندار فوراً آپ کی خدمت میں مطلوبہ شئے پیش کر دے گا۔ ورنہ ـ ورنہ بھبڑ کھائیے!

اگر بھبڑ بھی آپ کو پسند نہیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ کم از کم ہوا کھائیے۔ اچھی صحت اور خوشحال زندگی کے لئے تازہ اور صاف ہوا بے حد ضروری ہے!

ڈاکٹر ادم شیخ
(بمبئی)

بات صرف اتنی سی ہے کہ انسان کو قدرت نے بولنے کی صلاحیت عطا کی ہے اور اسی لئے وہ خود کو "اشرف المخلوقات" اور کُتّے کو "مردودِ خلائق" سمجھتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جن خوبیوں اور صلاحیتوں کی بنا پر انسان اپنے آپ کو برتر و بالا سمجھتا ہے، وہ تمام خوبیاں اور صلاحیتیں ایک کُتّے میں بھی موجود ہیں اور جو کوتاہیاں اور خامیاں انسان میں موجود ہیں، کسی کُتّے میں نہیں پائی جاتیں۔ کُتّے کے تعلق سے انسان کی غلط فہمی کا یہ حال ہے اگر اسے "کُتّا" کہہ کر مخاطب کیا جائے تو مرنے مارنے پر تیار ہو جائے گا لیکن مجھے یقینِ واثق ہے کہ اگر کسی کُتّے کو "انسان" کہہ کر پکارا جائے تو وہ بھی خوش نہیں ہوگا اور کاٹ کھانے کو دوڑے گا۔

ایک کُتّے کا ناقابلِ معافی تصور یہ ہے کہ اس نے اپنا زیادہ سے زیادہ وقت انسان کے ساتھ گذارنے کی کوشش کی اور غلط صحبت کا شکار ہو کر مفت میں بدنامی مول لی۔ یوں تو کُتّے کی طرح اور بھی بہت سارے پالتو جانور ہیں جن سے حضرتِ انسان کو کوئی مخاصمت نہیں ہے۔ وہ انسان کے ایک ایک اشارے پر دُم ہلاتے ہیں بلکہ اکثر اوقات اپنی دُم سمیت انسان کی غذا بن کر اپنی خودی تک کو مٹا دیتے ہیں لیکن کُتّا اتنی خاکساری اور بے بسی کا مظاہرہ نہیں کرتا۔ کُتّے کی دُم بلکہ پیر پکڑ کر انسان کو اس کے غیض و

[illegible] سے [illegible] نہیں مل سکتا۔ وفادت اور [illegible] کی [illegible] [illegible] بنا دیا ہے۔
ذرا سوچئے تو کہ انسان کا ایک بے زبان جانور کے مقابلے پر اس طرح آنا کہاں کی شرافت ہے؟ اسکی
صفت کو مٹانے کے لیے انسان نے کُتّے کو نجس قرار دیا ہے۔ کُتّے کی نجاست تو دُکتّے کے حق میں بہتر ہے
اسی بہانے انسان کُتّے سے دور رہنے کی کوشش کرتا ہے اور اس طرح کُتّے کا مستقبل برباد ہونے سے
بچ جاتا ہے۔

یوں تو کُتّا ازل سے انسان کی زیادتی اور ناانصافی کا شکار رہا ہے لیکن اس کی ٹیڑھی دُم کو بے
تحاشہ تختۂ ستم بنایا گیا ہے۔ کُتّے کی ٹیڑھی دُم کو کجروی اور ہٹ دھرمی کی علامت قرار دے کر آدمی
نے یہ مشہور کرا دیا ہے کہ سو سال تک پھُکنی میں رہنے کے بعد وہ ٹیڑھی کی ٹیڑھی رہتی ہے۔ انصاف کیا
جائے تو کُتّے کے دُم کی اس کجی میں بھی ایک شان جھلکتی ہے اور اس کی فطرت، مزاج اور پائداری
کا ثبوت ہے۔ کُتّا ہر حال میں اپنے جسم اور مزاج کے کسی پہلو کو بگڑنے نہیں دیتا ورنہ ایک انسان ہے
کہ حالات کے ذرا سے دباؤ سے اس کی شخصیت و شکل کے پُرزے بکھر جاتے ہیں۔ جب کسی انسان پر کُتّے
کی ٹیڑھی دُم کا اطلاق کیا جائے تو اس کا واضح مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ شخص خودسر، ضدی اور ناعاقبت
اندیش ہے لیکن تجربات تو یہی بتاتے ہیں کہ کُتّا اپنی ٹیڑھی دُم کے باوجود بُردبار اور راست باز ہے
جبکہ انسانی مزاج کی ٹیڑھی دُم اُسے حیوان بنا دیتی ہے۔

انسان کے مقابلے میں کُتّے کی راست بازی اور شرافت کا جب خیال آتا ہے تو ذہن میں کئی باتیں
جھلملانے لگتی ہیں۔ روٹی کے سوکھے ٹکڑوں کے عوض اپنے مالک کی جھڑکیاں سُن کر وہ اس کی چوکھٹ
سے رات دن لگا رہتا ہے، اس کے جان و مال کی حفاظت کرتا ہے، اس کے بچوں کا دل بہلاتا ہے
وفاداری اور نمک حلالی کی اس سے بہتر مثال اور کہاں مل سکتی ہے؟ اور ایک انسان ہے کہ اپنے
خالق کی لاکھوں انمول نعمتوں سے فیض یاب ہونے کے باوجود، بغاوت، احسان فراموشی اور نمک حرامی کی
جسارت کرتا رہتا ہے۔ لاکھوں پیغمبروں اور رہنماؤں کی جدوجہد بھی انسان کی کجروی اور گمراہی کو کم
نہیں کر سکی، وہ آج بھی اپنے مالک کا باغی اور احسان ناشناس ہے۔ الہامی اور غیبی رہنمائی کے
بغیر کُتّے کی راست روی اگر اسے انسان سے ممتاز قرار دے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے!

ایک سگِ لیلیٰ کی وجہ سے انسان نے کُتّے کو خواہ مخواہ عشق و عاشقی میں ملوث کر دیا ہے۔ سادہ
دل عاشق، رقیب روسیاہ کو کُتّا کہہ کر بڑا خوش ہوتا ہے لیکن اسے کیا معلوم کہ محبت کے معاملے
میں کُتّا کس قدر فراخ دل اور روادار واقع ہوا ہے۔ درحقیقت اشتراکیت کی بہترین مثال کتوں
کی عاشقی میں نظر آتی ہے۔ کئی کُتّے بیک وقت ایک ہی منظورِ نظر سے تسکین حاصل کر لیتے ہیں۔

کسی کُتّے کی جبین پر ہلکی سی شکن بھی نہیں آپاتی۔ انسانوں میں کبھی ایسی واردات پیش آجائے تو کوئی عشاق اپنے سر پھوڑ وا بیٹھیں اور محبوب کو اپنی ناک بچانا مشکل ہو جائے۔ ہر کُتّا اشتراکی اولاد کو بلا پس و پیش قبول کر لیتا ہے جب کہ انسان بعض اوقات اپنی ہی اولاد کو ناجائز کہہ کر اسے خود کے گناہوں کا خمیازہ بھگتنے کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ اس رواداری اور فراخ دلی کے باوجود کُتّا خود غرض اور نجس کہلاتا ہے اور انسان اپنی تمام نجاثت اور خود غرضی کے باوجود معصوم، اور سادہ دل۔

کُتّے پر ایک الزام یہ بھی ہے کہ وہ اپنے ہی ہم جنسوں پر بھونکتا ہے اور اظہار نفرت کرتا ہے۔ اسی بنیاد پر دوستوں اور رشتہ داروں سے بدکلامی اور شر انگیزی کرنے والے شخص کو کُتّا کہہ کر گالی دی جاتی ہے۔ اس مد میں بھی بیچارہ کُتّا ہی مظلوم ہے اس لئے کہ ہم نے آج کسی بھونکتے ہوئے کُتّے کو کاٹتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اس کے برخلاف انسان کی بدگوئی اور شر انگیزی؟ الامان والحفیظ!۔ انسان اگر سچ مچ ہی بھونکتا تو آج دلآزاری اور دل شکنی کا زہر اس قدر نہ پھیلتا۔

کُتّے پر برہنگی اور بے حیائی کی سنگین تہمت بھی ہے لیکن اس کے لئے غریب جانور سے زیادہ نظام قدرت جواب دہ ہے۔ کُتّے کی بے لباسی اس کی مجبوری ہے اور انسان کی عریانیت اس کا اختیار۔ جسم کے شہوت انگیز خطوط کی نمائش کر کے فتنہ و فساد برپا کرنا کُتّے کا شیوہ نہیں بلکہ انسان کا وطیرہ ہے۔ فطرت کی طرف مراجعت کا نام دے کر کچھ عقلمندوں نے تو برہنہ رہنے کے لئے کلب ہی بنا لئے ہیں۔ اگر انسان کے اس ننگے پن کو فطری کہا جاسکتا ہے تو کُتّے پر برہنگی اور بے حیائی کا الزام کیوں؟

غور سے دیکھا جائے تو انسانی معاشرے کی بنیاد ہی ہوس پرستی اور بداخلاقی پر رکھی ہوئی نظر آتی ہے۔ ایک عورت کا سنگھار اپنے شوہر کے علاوہ دنیا جہاں کے مردوں کو للچانے کے لئے ہے اور مردوں کی ساری سجاوٹ اور مردانگی اپنی بیوی کے سوائے دنیا کی ہر عورت کو رجھانے کے لئے ہے۔ عشق و محبت کے خوبصورت نام، تو محض ایک پردہ ہے جس کے سہارے بے وفائی اور بے حیائی کے سارے کھیل کھیلے جاتے ہیں۔ ایک کُتّے کے ظاہر و باطن میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ وہ گلی کو گلی اور کُتیا کو کُتیا ہی سمجھتا ہے لیکن انسانی رشتوں اور تعلقات کا تقدس اور خلوص اب کہاں؟۔ انسان ہی کے قانون نے اب تو اس کو بھی جائز قرار دیا ہے کہ ایک بہن اپنے بھائی کی سیج سجائے اور ایک ماں اپنے بیٹے کی محبوبہ بن جائے۔ اب تو مرد ہی شوہر ہے اور مرد ہی بیوی ہے۔ عورت ہی عاشق ہے اور عورت ہی محبوبہ۔ آج تک انسانی آنکھ نے دو کتوں یا دو کُتیاؤں کو قریب آتے نہیں دیکھا، کیا اب وہ وقت نہیں آگیا ہے جب انسانوں کو کتوں سے سبق لینا چاہیئے۔

کُتّے کو ذلیل کرنے کے لئے انسان نے جتنی کہاوتیں بنائی ہیں اُن میں سے ایک یہ ہے کہ کُتّا اپنی گلی میں شیر ہوتا ہے۔ گویا اس طرح انسان نے کُتّے کی بزدلی اور کمزوری کا مذاق اُڑانے کی کوشش کی ہے۔ دراصل ہر کُتّا صلح پسند اور امن نواز ہوتا ہے۔ توسیع پسندی اور جارحیت سے کُتّے کو کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ وہ اپنی دنیا میں مگن اور اپنی گلی میں مست رہتا ہے ورنہ ایک انسان ہے کہ ملک گیری اور دولت کی ہوس میں شہروں، باغوں اور کھیتوں کو تاراج کرتا رہتا ہے۔ کیا کبھی کُتّے نے کسی ہیروشیما پر ایٹم بم پھینکا تھا؟ جلیان والا باغ میں قتل عام کرنے والے اور ہریجنوں کو زندہ جلانے والے انسان تھے، کُتّے نہیں۔ پیغمبروں کو مصلوب کرنے اور بازاروں میں نیلام کرنے والے بھی انسان ہی تھے۔

اقبالؔ کی طرح اگر کوئی کُتّا یہ پوچھ بیٹھے کہ ؎

یہی شہکار ہے تیرے ہنر کا

تو ایک مرتبہ تو قدرت کو بھی کچھ سوچنا پڑے۔

رضا نقوی واہی

زوالِ شعرستان (در) واہی

(طویل نظم شعرستان کا آخری باب)

(غیر ذمہ دارانہ زندگی بسر کرنے اور ناقدوں کے قلم کی زد سے بچنے کے لیے شاعروں نے ریاستِ شعرستان میں پناہ لی۔ اس ہجرت سے ناقدوں کا کاروبار چوپٹ ہوگیا۔ لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔ اسمگلروں سے سازش کرکے شاعروں کو ملک میں اغوا کرلیا۔)

جب سخنور ارضِ شعرستان کے پکڑے گئے
جال میں واہی بھی ان کے ساتھ ہی جکڑے گئے

آگئے آگے تھے جو وہ تحریکِ شعرستان میں
حیثیت ان کی اہم تھی مگو یہ سامان میں

اس لیے اسمگلروں کی خاص نگرانی میں تھے
اپنی بداعمالیوں سے خود پریشانی میں تھے

ارضِ شعرستان کا دکھلا کے سُرخ و سبز باغ
کردیا تھا شاعرانِ خوش نوا کو بددماغ

ورغلا کر لے گئے تھے ان کو ہندستان سے
قوم نقادوں کی برہم تھی ہی جی سے جان سے

شاعروں کی اکثریت بھی خفا رہنے لگی
کچھ تو درپردہ مگر کچھ برملا رہنے لگی

تھا مدارِ شاعری جن کا فقط سُر تال پر
یعنی جو آئے تھے قوالی کا پیشہ چھوڑ کر

جو اکڑتے پھرتے تھے لکھ کر مُعتائی سخن
یا سرِ محفل دکھاتے تھے جو رقاصی کا فن

ماہرِ ہوٹنگِ جرگہ، شاعرانِ تاریخ باز
قطعۂ تاریخِ رحلت لکھنے والے شعر ساز

شاعرِ بسیار گو، گمگشتہ، اصحابِ جدید
سب نے کر رکھی تھی اُن سے منقطع گفت و شنید

سب کے سب عاجز تھے اُن کی جو کبھی تنقید سے
جا و بے جا واہیاتی نظم کی تولید سے

اُس پہ طرّہ، ڈال کر "جشنِ ظرافت" کی بنا
شاعری کے عام اداروں کی اُکھاڑی تھی ہوا

اب جو یہ آئے پکڑ کر ناقدوں کے رُوبرو پابجولاں، ہتھکڑی ہاتھوں میں، رسّی درگلو
دیکھتے ہی ناقدِ اعظم نے غُرّا کر کہا یہ وہی کم بخت ہے جو ہم کو غچّہ دے گیا
شاعروں کو لے اُڑا تھا جب سے شعرستان میں ایک بھی دانہ نہ تھا تنقید کے کھلیان میں
رکھیے اب ایسی جگہ اس کو جہاں کوئی نہ ہو "ہم سخن کوئی نہ ہو، اور ہم زباں کوئی نہ ہو"
تاکہ دوبارہ نہ پھر یہ فتنہ سامانی کرے چال سے اپنی ہمیں وقفِ پریشانی کرے
چیر کے سر اس کا دیکھیں ماہرینِ نفسیات مغز میں ہیں کون سے کیڑے، ہیں کیا ان کی صفات

وائرس، طنز و ظرافت کا جو ہے سر میں گھُسا
"نیم وحشی شاعری" سے بھی ہے مہلک تر وبا

اک محقق بھی وہاں حاضر تھے ہندستان کے "آپ نے نقطے گِنے تھے میرؔ کے دیوان کے"
غور سے واہیؔ کا لے کر سر سے پا تک جائزہ ناقدِ اعظم کو وہ دینے لگے یہ مشورہ
اس کی نظموں کا کفن سِلوا کے پہناؤ اسے جیتے ہی جی کولڈ اسٹوریج میں دفناؤ اسے
سو برس دو سو برس کے بعد میرے جانشیں اس کی خاکستر پہ ڈالیں گے نگاہِ خشمگیں
اپنے تحقیقی عمل کے اونٹ کو دوڑائیں گے اس کے مجموعوں کا اک اک حرف گِنتے جائیں گے
اس نے کیا اور کیوں لکھا اِس پر نہ جائے گی نظر ہاں مگر دیکھیں گے، کُل نظموں میں کتنے ہیں زبر
ناقدِ اعظم نے مانا، مشورہ معقول تھا "زندہ دفنانا" تھی خود ان کی پسندیدہ سزا

الغرض اک آہنی تابوت بنوایا گیا
اور میاں واہیؔ کو اس میں زندہ گڑوایا گیا

مُنجمد ہو کر شکم میں رہ گئی مثلِ ریاح حضرتِ واہیؔ کی چابکدستیٔ طنز و مزاح
اک لپک دکھلا کے بس مفقود کو ندا ہو گیا ختم، شعرستان کا سارا گھروندا ہو گیا
مرکزِ شہرِ سخن، نذرِ سیاست ہو گیا اپنی نا اہلی سے شعرستان غارت ہو گیا
پھنس کے رہ جائے جو مِلّت قافیوں کے جال میں لا نہیں سکتی ہے وہ اصلاح اپنے حال میں
لیکے مُنھ اپنا سا حضرت کی قیادت رہ گئی ایک ہی سیلِ حوادث میں ظرافت بہہ گئی
مثلِ سایہ، تیزیٔ ذہنِ رسا غائب ہوئی پھٹتے ہی، بیلون کی ساری ہوا غائب ہوئی

خُلدِ شعرستان واہیؔ کا تصوّر خانہ تھا
"خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سُنا افسانہ تھا"

---

۱ سے ۵ تک اشارہ ہے شاعر کی اُن نظموں کی جانب، جو ان موضوعات پر لکھی گئیں۔

ڈاکٹر سمیع بن سعد
(امراؤتی)

میر
دی زوالوجسٹ
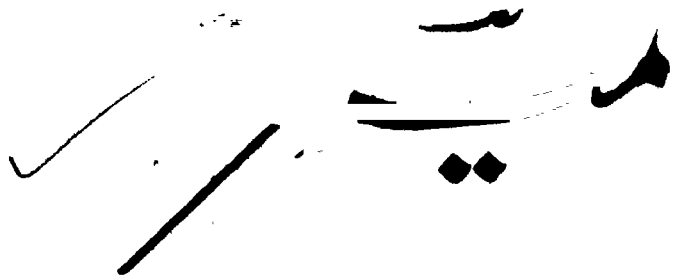
آجکل تحقیق کا بڑا زور وشور ہے تھی۔ برساتی کیڑے مکوڑے، مینڈکوں، چھپکلیوں کا زور تھا،
ہر شخص اپنی اپنی ڈفلی بجا کر "ہمچو من دیگرے جانور کلیلیں کرتے پھر رہے تھے تب یاد آیا کہ میر کو زوالوجسٹ کیوں
نیست"، کا نعرہ بلند کر رہا ہے۔ یہاں تک کہ مرحوم نہ ثابت کر دیا جائے، سائنسی طور پر نہیں، ظاہری طور پر ہی
شاعروں اور ادیبوں کو ان کی قبروں میں چین سے سہی۔ آپ سوچیں گے کوڑی تو دور کی ملی ہے لیکن بات
سونے نہیں دیا جا رہا ہے۔ زندہ ادیب و شاعر ریسرچ میں کچھ دم بھی تو ہے — تو نذرانہ حاضر ہے۔ کیڑے
کرنے والوں کے مشقِ ستم سے گھبرا کر الامان والحفیظ مکوڑے اور جانور۔ ملاحظہ فرمائیے۔ پسند آئے تو واہ
کی صدائیں بلند کر رہے ہیں۔ کیونکہ ہر ریسرچ کرنے والا واہ۔ نہ آئے تو کسی کا کیا بگڑے گا؟ ایک نئی بات
گفتنی و ناگفتنی حقیقی و فرضی۔ تمام باتوں کو بیچ چوراہے جس کی طرف کسی کی توجہ شاید ہی گئی ہو، معلوم
پر لا کر پٹخنے پر تلا ہوا ہے۔ میں حیران ہوں کہ کس کو تو ہو جائے گی۔ موضوعِ زیر بحث کو اجاگر کرنے
تختۂ مشق بنا کر آپریشن ٹیبل پر لٹاؤں۔ سوچا میر اچھے کی ضرورت اس لئے بھی ہوئی کہ میر کو کبھی
رہیں گے۔ ان کے گودام شاعری میں رطب و یابس سبھی ہے زوالوجسٹ کے روپ میں پیش نہیں کیا گیا۔
اس میں ڈھونڈنے سے کوئی نہ کوئی کام کی چیز تو نکل آئے گی۔ ان کو شاعرِ یاس، قنوطیت پرست، شاعر
سطورِ ہذا کی تحریر کے وقت موسم برسات تھا۔ زوردار بارش ہو رہی غم والم، تنہائی پسند کہا گیا ہے۔ اور یہ بھی

بتایا گیا ہے کہ انہیں پائیں باغ کی کھڑکی کھول کر باہر جھانکنے کی فرصت نہیں تھی۔ وہ نیچر سے بہت دور بھاگتے تھے۔ لیکن اِن کا دیوان دیکھنے سے بہت سی باتوں کی تردید ہوتی ہے۔ کم از کم حیوانات و جانداروں، پرندوں کیڑوں مکوڑوں کے بارے میں تو وہ کافی فراخ دل معلوم ہوتے ہیں۔ اِن کے دیوان میں جن جن کیڑوں مکوڑوں، پرندوں، جانورانِ آبی و خشکی کا تذکرہ آیا ہے۔ اس کی ذرا فہرست تو ملاحظہ فرما لیجئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پورا zoo ہی نہیں (Sanctuary) موجود ہے۔ اگر ہم اِن جانوروں اور پرندوں کی فہرست مرتب کرنے بیٹھ جائیں تو اندیشہ ہے کہ حشرات الارض کی ایک چھوٹی سی کتاب مرتب ہو جائے۔ صرف چند اشعار پر تکیہ کرتے ہیں۔

اتنے جانوروں، پرندوں، پروانوں، کیڑوں مکوڑوں وغیرہ کا ذکر میر کی شاعری میں موجود ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ کہیں اِن کی تعریف ہے تو کہیں تحقیر، کہیں غصّہ ہے کہیں پیار، کہیں اپنے ممدوحین کو اچھے جانوروں سے تشبیہ دی ہے اور کہیں دشمنوں کو بُرے جانداروں سے۔

بلّی کی تعریف :۔

ایک بی موہنی تھا اس کا نام — اُس نے میرے گھر کیا آ کر مقام
بی بلائی سے کی بہت التجا — گربۂ محراب سے چاہی دُعا

سگ و گربہ کی تعریف : (میر صاحب کے پاس یہ دونوں ایک جان دو قالب تھے)

سگ و گربہ ہیں دو ہمارے یہاں — دو ہیں قالب اور اُن کی ایک ہے جاں
سارے ہمسایوں پہ رہے یہ معلوم — موش کی نسل ہو گئی معدوم
چوہا کیا ہے جو سامنے آئے — گھونسوں سے بھی یہ تیر پھڑ جائے
اُن نے جو ماریاں ہیں گھونسیں دھوس — موش دشتی ہوا ہے کونے گھونس
کوئی چھچھوندر جو بستی میں یاں ہے — سو وہ چوہوں کی مرثیہ خواں ہے

بندر کی تعریف :۔ جو آپ کا بے حد مونس و غمخوار تھا۔

تھا کسی کا بچہ اک درویش پاس — باش و بود اس کی تھی مجھ دلریش پاس
بلند نہ لیا کوئی تحفہ دہر کا — عزت افزا بندر ابن شہر کا

بکری کی تعریف :۔

کہتے ہیں جو غم نداری بز بخر — سو ہی لی میں ایک بکری ڈھونڈ کر
شکر ان کی کیا جگر مینڈھا اٹھائے — تو پچ سرزن سامنے ہرگز نہ آئے
گو وہ ٹکر کا جو ڈکراتا رہا — بز دلی سے گرگ بھی جاتا رہا

مرغ بازی کا آپ کو شوق تھا۔

مرغا ہے ایک ایک جیسے کلنگ   قازو سارس سے جنگ جن کا ننگ
زہرہ ققنس کا اس خطر سے آب   شب نہ سوئے ہراس سے سرخاب

اور تو اور آپ کا ایک فروس راہی ملک بقا ہو گیا۔ اس کا مرثیہ ملاحظہ ہو۔

کئی برس سے ہمارے کنے تھا ایک خروس   خروس عرش کی اولاد سے ولے افسوس
کبھی جو صحن میں مکر کے وہ اشرف الطیار   پھرا ہے کہیں کو ڈالے تو مرغ آتشخوار
رہا ہمیشہ سے وہ مرغ مستعد جنگ   طرف نہ اس کے ہوئے بچگی میں قاز و کلنگ
بجز کنارا نہ سیمرغ کو بتا یہ چارا   کہ نیل مرغ کو بکری کی طرح سے مارا
جھکا جو خاک کی جانب کو کیسر بے جاں کا   زمیں پہ تاج گرا ہدہد سلیماں کا
خموش میرؔ تجھی کو نہیں یہ رنج و تعب   کباب آتش غم میں ہیں مرغ و ماہی سب

میرؔ نے جو شکارنامے لکھے ہیں ان کا موضوع بظاہر تو ممدوح کے شکار کے حالات اور شکار کی لیاقت کی تعریف ہے لیکن دراصل اس میں انھوں نے جانوروں، پرندوں وغیرہ کا تذکرہ محفوظ کر دیا ہے۔ یہ شکارنامے پورا جنگل کا جنگل ہی ہیں۔

پلنگان صحرا کے دل خون کئے   نہنگان دریا ہوئے مر جئے
نہ چیتل نہ پاڑھا نہ اسنا نہ شیر   ہوئے گولیاں کھا کے یک لخت ڈھیر
پلنگوں نے کہسار کی راہ لی   نہنگوں نے دریائی جا نہا لی
شغال اور روباہ و خرگوش سے   نہیں بحث کچھ یہ ہیں بے ہوش سے
نہ قشقل نہ سلی نہ سرخاب ہے   تمام ان کے لوہو سے سرخ آب ہے
اگر خرس تھا مفتہ و بدمعاش   لگا موش خانے کو کرنے تلاش
بیٹر اور تیتر کا ہے کیا شمار   کہ باز آ گئے جرے کرتے شکار
کئے گم جو گینڈے نے اپنے حواس   کھڑا ہو رہا آ کے بھینسوں کے پاس
نہ چھوڑا ہے طیر ایک عصفور تک   نہ وحشی کچھ اور لنگور تک
پھنسے گاؤ اشتر گرے بار خر   ہوئے اسپ اشتر بھی زیر و زبر
اسی بن میں شیر اور یوز و پلنگ   اسی بن میں گور و گوزن اور رنگ
اسی بن میں ہاتھی وہیں کرگدن   وہیں توچ سرزن اسی میں ہرن
اسی میں لنگور و بندر بھی تھے   وہیں ایک دو ہم قلندر بھی تھے

اسی بن میں پاڑھا وہیں نیل گاؤ   اسی بن میں یہ صید بندی کا پاؤ

شکار کے جنگلوں میں جانوروں، پرندوں، کیڑوں، کوڑوں کے ذکر کیساتھ میر ممدوح کی مدح کرتے وقت بھی جانداروں کا ذکر کرتے رہتے ہیں ؎

عصفور کس شمار میں پر تیرے عدل سے   گھتی نہیں ہے باز شکاری کی اعتصام
کیا لکھوں اسپ تیک سیر کی اس کے تعریف   ادہم خامہ بھی لکھتے ہوئے جاتا ہے اچھل
نعرے سے اس کے یوں ہیں بہت یوں رہ گریز   بھاگیں ہیں جیسے شیر کی آواز سے شغال
آیا ڈپٹ کے گھوڑے کو جس وقت بھیڑ و پر   خرگوش تھے بھیڑ کے گویا جوان و بہر
شیر ہونا تیرا کیا کچھ بڑا خشش ہے تیغ   شیر میرے میں سدا رہتا ہے یاں ببر بیاں

مدح کی طرح ہجو کرتے وقت بھی وہ پرندوں، جانداروں کو فراموش نہیں کرتے در خانۂ ہجو میں کہتے ہیں ؎

کہیں گھر ہے کسی چھچھوندر کا   شور ہر کونے میں ہے جھر کا
کہیں مکڑی کے لٹکے ہیں جالے   کہیں جھینگر کے بے مزہ نالے
پیکر اپنی حذر نے رکھی ہے   دانس ایک ایک جیسے مکھی ہے
کبھی کوئی سپنو لیا ہے پھرے   کبھی چھت سے ہزار پائی گرے
کھٹملوں سے سیاہ ہے مو بھی   چین پڑتا نہیں ہے شب کو بھی
کیڑا ایک ایک پھر مکوڑا ہے   سانچہ کو کھانے ہی میں دوڑا ہے

اژدرنامہ میں اور مثنوی ہجو عاقل نام ناکے بنگاں نے کہ تمام داشت (جو سودا کی ہجو میں ہے)۔ کئی جانداروں کا ذکر کیا ہے۔

اژدرنامہ بھی پورا zoo معلوم ہوتا ہے۔ یا افریقی جنگل۔ اس میں ناگن۔ مارسیاہ۔ افعی۔ ناگ اژدہا۔ اژدر۔ اجگر۔ جونک۔ زاغ۔ چھپکلی۔ پلنگ۔ شیر۔ شغال۔ روبہ۔ خراطین۔ موش۔ شغال۔ مینڈک چوہے۔ گرگٹ۔ غوک۔ گیدڑ، وغیرہ کا ذکر آیا ہے۔

پھر غزلوں کو دیکھئے تو یہاں بھی یہ جانور ریزرو کئے ہیں۔ پروانہ، ہما، جگنو، مرغ چمن، عندلیب بلبل، کبک وغیرہ۔

کہتے ہیں اُڑ بھی گئے جل کے پر پروانہ   کچھ سنی سوختگاں تم خبر پروانہ
کبکوں نے تیری چال ڈھال جو دیکھی ٹھٹک گئے   دل سا کنان باغ کے تجھ سے اٹک گئے

ان مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ میر نے جتنے کیڑوں، کوڑوں، پرندوں، جانوروں کو قابل اعتنا سمجھا مجموعی طور پر اُردو شاعری میں اسکی مثال مشکل سے ملے گی۔ میر کو محب حیوانات یا Zoologist کہنا بالکل مناسب ہے

———— : ————

شکیل شاہجہاں کامٹوی
(ناگپور)

کرسی

وہ کون ہے جو کرسی سے واقف نہیں۔ یہ تیز و
طرار محبوبہ سے کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ اس کو پانے کیلئے
لاکھوں، کروڑوں بے گناہ انسانوں کا خون بہایا جاتا ہے
بستیاں ویران کی جاتی ہیں۔ مانگیں اُجاڑی جاتی ہیں۔
گودیں سُونی کی جاتی ہیں۔ انسانیت کے پاکیزہ اُصولوں
کو بالائے طاق رکھ کر درندگی کے نوکیلے ناخن کو بڑھایا
جاتا ہے۔ جھوٹ، فریب، مکاری کو اپنایا جاتا ہے۔ گھناؤنی
صورت اور کھوکھلی سیاست کا استعمال کیا جاتا ہے۔ تاریخ
کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہر دور میں یہ چار
ٹانگوں والی محبوبہ اپنی دلکشی سے توجہ کا مرکز بنی رہی۔ دورِ
حاضر میں اس کی اہمیت کچھ زیادہ ہی تجاوز کر گئی ہے

انسان کرسی کو پانے کے لئے سب کچھ کر گذرتا ہے۔ لیکن برُا وقت آنے پر یہ اس کا ساتھ نہیں دیتی۔
بڑی ظالم چیز ہے یہ کرسی۔ کرسی پر بیٹھنے والے کرسی پر بیٹھنے سے پہلے کچھ اُصول بناتے ہیں۔ نظم و نسق کے کتابچے
لکھتے ہیں۔ وعدہ کرتے ہیں۔ قسمیں کھاتے ہیں۔ اور کرسی پر بیٹھنے کے بعد سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ نہ جانے
کرسی میں کون سی شئے پوشیدہ ہے۔ جو فقیر کو بادشاہ اور راجہ کو کنگال بنا دیتی ہے۔
محبوبہ اگر روٹھ جائے تو اُسے منایا جا سکتا ہے۔ مگر کرسی چھوٹ جائے تو اُسے حاصل نہیں کیا جا سکتا
یہ بات الگ ہے کہ کچھ باہمت لوگ دوبارہ کرسی حاصل کرنے کی جرأت رکھتے ہیں۔ کرسی کے جادو میں وہ
اثر ہوتا ہے کہ بولتے منہ پر تالہ لگ سکتا ہے۔ اور گونگوں کو زبان عطا ہو سکتی ہے۔ کرسی پر اگر بوڑھا
بیٹھے تو جوان ہو جائے۔ اور جوان بیٹھے تو دھوان ہو جائے۔ کرسی پر بیٹھ کر کبھی کبھی لوگ بہت بڑی بڑی

باتیں کرتے ہیں۔ اور کبھی کبھی ایک دم خاموش ہو جاتے ہیں۔ اس راز کو سوائے کرسی کے اور کوئی نہیں جانتا۔

کرسی میں کھسکنے کی غیر یقینی طاقت پوشیدہ ہوتی ہے۔ کرسی کب کھسک جائے یہ کوئی نہیں جانتا۔ اس لئے لوگ کرسی کو بڑی مضبوطی سے تھام کر بیٹھتے ہیں۔ اور کبھی کبھی اتنی مضبوطی سے تھام لیتے ہیں کہ انھیں اتارنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کسی چیز سے مسلسل تعلق دل میں محبت پیدا کر ہی دیتا ہے۔ اور جب وہ چیز چھوٹتی ہے تو رنج ضرور ہوتا ہے۔

شراب اور کرسی کا رشتہ بہت پرانا ہے۔ شراب کرسی کی چھوٹی بہن ہے۔ اگر کسی الکشن میں کرسی کو مدعو کرنا ہو تو شراب کا سہارا لیجئے۔ اور اگر کسی محفل میں شراب کو دعوت دینا ہو تو کرسی کی مدد لینا بہت ضروری ہے۔ کرسی شراب کی بڑی بہن ہونے کے ناطے کچھ زیادہ ہی خطرناک اثرات رکھتی ہے۔ شراب کا نشہ کچھ دیر بعد اتر جاتا ہے۔ مگر کرسی کا نشہ مرتے دم تک نہیں اترتا۔ شراب جھگڑا کرواتی ہے۔ کرسی فساد۔ شراب گالی بکواتی ہے۔ کرسی نعرہ لگواتی ہے۔ شراب پینے سے صحت جاتی رہتی ہے۔ کرسی پا کر آدمی تندرست و توانا ہوتا ہے۔ شراب کنگال بناتی ہے۔ کرسی مالدار بناتی ہے۔ شراب سچ کہلواتی ہے۔ کرسی جھوٹ .....

اگر آپ گالیوں کو تعریف سمجھ کر خوش ہو سکتے ہیں۔ ٹماٹروں اور گندے انڈوں کی طوفانی بارش میں بغیر چھاتہ لئے نکلنے کی ہمت رکھتے ہیں۔ جھوٹ پر سچ کا خوبصورت لیبل لگا کر مارکیٹ میں فروخت کرنے کا گر ہے۔ کثیر تعداد میں قسمیں کھانے کے بعد بھی اگر آپ کو بدہضمی نہ ہوتی ہو۔ روٹی کے سنہرے وعدوں سے جنتا کا منہ سینے کے فن سے بخوبی واقف ہوں تو بے شک آپ بھی کرسی کے حقدار ہیں۔ چاہے کرسی حاصل کرنے والوں کی کتنی ہی لمبی لائن کیوں نہ ہو۔ آپ بھی لگ جائیے۔ کرسی آپ کو ضرور ملے گی۔ "امید کا دامن انسان کو ہاتھوں سے نہیں جانے دینا چاہیئے۔"

کرسی کا المیہ یہ ہے کہ جو لوگ کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ اترنا نہیں چاہتے اور جو لوگ اس پر بیٹھنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ انہیں کرسی نصیب نہیں ہوتی۔ کرسی پر بیٹھے ہوئے لوگ ہمیشہ ہمیشہ براجمان رہنے کے لئے طرح طرح کے کھیل کھیلتے ہیں۔ کرسی کے خواہش مند کرسی کو حاصل کرنے کے لئے طرح طرح کے داؤ پیچ آزماتے ہیں۔ اور دونوں ہی کا نشانہ عوام ہوتے ہیں۔ مگر اب عوام بھی کرسی کے بے تکے کھیل سے اچھی طرح واقف ہو گئے ہیں اور کرسی سے دلچسپی کا مظاہرہ پستی کی سمت گامزن ہے۔ کیونکہ عوام اپنے مسئلوں کے حل کے لئے جن کو کرسی پیش کرتی ہے، وہ عوام کے مسئلوں کو کم اور اپنی جیبوں کا زیادہ خیال رکھتے ہیں۔

بہرحال کرسی کی اہمیت، کسی کی عدم دلچسپیوں سے ہرگز کم نہیں ہو سکتی۔ کرسی کو جو اعلیٰ مقام ماضی میں حاصل تھا۔ وہی حال میں بھی ہے اور مستقبل میں بھی رہے گا . . . . .

▬ ▬

جہانگیر انس (دیوان)

ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ بچپن میں جب ہم رونے لگتے اور کسی طرح چپ ہونے کا نام نہ لیتے تو والدہ محترمہ
ہتا ایک آزمودہ نسخہ آزماتیں۔ وہ یہ کہ ہمارے کان کے قریب منھ لاکر نہایت ہی رازدارانہ لہجہ میں کہتیں "چپ
ہوجا، ورنہ تھانیدار آجائے گا۔" اور تھانیدار کا نام سن کر ہمارے رونے کی سو میل فی سکنڈ رفتار آناً واحد میں
یک میل سو منٹ میں بدل کر بالکل ختم جاتی۔ یہ بات نہیں تھی کہ ہم تھانیدار سے ڈرتے تھے۔ اسوقت تو ہم یہ بھی نہیں
انتے تھے کہ تھانیدار کسے کہتے ہیں۔ ہمارے ڈرنے کی وجہ اصل میں یہ ہوتی تھی کہ تھانیدار کا نام سنتے ہی اس کی
الی لانبی بچھو ٹائپ مونچھ ہمارے تصور کے پردے پر رقص کرنے لگتی اور اس مونچھ کے خوف سے ہماری روح فنا
ہوجاتی اور اگر کبھی خدانخواستہ تھانیدار کا سامنا ہوجاتا تو اس مونچھ کے خوف سے ہم اس طرح بھاگتے جیسے کوئی چوہا
لی کو دیکھ کر جائے پناہ کی تلاش میں بھاگتا ہے۔

جب ہم کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں تھے۔ ہمارے نزدیک تھانیدار کی شناخت مونچھ تھی اور مونچھ کی
شناخت تھانیدار۔ چنانچہ ہم جس کسی چہرہ پر بھی کالی، لانبی بچھو ٹائپ مونچھ دیکھتے اسے تھانیدار ہی سمجھتے۔ یہاں
ک کہ اس شخص کو بھی ایک عرصہ تک تھانیدار سمجھتے رہے جو روزآنہ صبح و شام مو اپنی لانبی، کالی بچھو ٹائپ مونچھ کے
ھر کی نالیاں صاف کرنے آیا کرتا تھا ——

جب ہم کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوئے تو مونچھ کے متعلق لوگوں کی باتیں سن کر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مونچھ

مرد کی شان ہوتی ہے ۔ جس کے چہرہ پر جتنی لانبی مونچھ ہوتی ہے وہ اتنا ہی شاندار مرد ہوتا ہے یعنی تھانیدار اور نالیاں صاف کرنے والا سب ہی شاندار مرد ہیں ۔ اس وقت اپنے والد محترم کے متعلق ہم ایک سخت اُلجھن میں گرفتار ہو گئے ۔ والد صاحب کا چہرہ چٹیل میدان تھا پھر بھی نہ جانے کیوں محلہ والے انہیں شاندار مرد سمجھتے تھے ۔ یہ بات نہیں ہے کہ ان کا چہرہ پیدائشی طور پر چٹیل تھا جیسا کہ ہمارے ایک عزیز بیارے میاں کا ہے ۔ بلکہ وہ روز آنہ صبح وشام بھارت بلیڈ کا بلڈوزر چلاکر اپنے چہرہ کو چٹیل میدان کی طرح بنا لیا کرتے تھے ۔

کچھ اور ہوش سنبھالنے کے بعد مونچھ کے متعلق جو دوسرا خیال ہمارے ذہن میں آیا وہ یہ ہے کہ مونچھ صرف مرد کی شان ہی نہیں بلکہ بہادری کا سمبل بھی ہے ۔ ویسے بھی لفظ شان کے لغوی معنی جو بھی ہوں اور اصطلاح میں لوگ اسے جس طرح استعمال کرتے ہوں حقیقت یہ ہے کہ لفظ 'شان' بہادروں کو ہی زیب دیتا ہے ۔ ہمارے اس خیال کو تقویت پہنچانے میں ہٹلر اور اس کی مونچھ کا بہت بڑا ہاتھ تھا ۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران ہٹلر کی مونچھ اس کی بہادری کا سمبل بن گئی تھی ۔

ہاں تو ہم یہ کہہ رہے تھے کہ اس وقت ہٹلر کی مونچھ اس کی بہادری کا سمبل بن گئی تھی اور ہٹلر کے متعلق کوئی بھی گفتگو اس وقت تک مکمل نہیں سمجھی جاتی تھی جب تک کہ اس میں اس کی مونچھ کا ذکر شامل نہ ہو ۔ بعض لوگ تو یہاں تک کہہ دیتے کہ ہٹلر کی بہادری کا راز اس کی مونچھ تھی ـــــ خیر ، یہ تو بعض لوگوں کا خیال تھا لیکن اکثر لوگ اس وقت اپنی شان اور بہادری کا سکہ جمانے کے لئے ہٹلر کی طرح مونچھ رکھنے لگے تھے ۔ غرض کہ ہٹلر مونچھ ایک ایسا سکہ رائج الوقت تھی جسے آسانی سے کسی بھی بہادری کے کاؤنٹر پر بھنایا جاسکتا تھا ۔ لیکن ہمارے اس خیال کا تصور اس وقت چکنا چور ہو گیا جب ہم نے ایک موٹے تگڑے ہٹلر کٹ مونچھ والے شخص کو ایک دُبلے پتلے مونچھ منڈے کے ہاتھوں پٹتے دیکھا ۔ غالباً ایسے ہی موٹے تگڑے مونچھ والوں کے متعلق کسی شاعر نے کہا ہے ؎

دل کے تو مرد نہیں مونچھ مگر رکھتے ہیں
تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں

جب ہم نے ہائی اسکول میں داخلہ لیا اور جنسیت کی واقفیت ہوئی تو ہمیں یہ جان کر نہایت ہی افسوس ہوا کہ مونچھ جسے لوگ مرد کی شان اور بہادری کا نشان سمجھتے ہیں ، مونث ہے ـــــ اسکول کے محدود دائرہ سے نکل کر جب ہم نے کالج میں قدم رکھا اور ایک وسیع دنیا اور اس کے اسرار و رموز کا کچھ علم ہوا تو یہ سوال خود بخود حل ہو گیا ۔ ہم نے کالج کے اپنے اکثر ساتھیوں کو اپنی شان اور رعب و دبدبہ کے اظہار کے لئے نسوانی اشیاء کا سہارا لیتے دیکھا مثلاً کریم ، سنو ، پاؤڈر وغیرہ اِن کے استعمال میں طلباء صنفِ نازک سے بھی دو چار قدم آگے رہتے ہیں ۔

آج جبکہ ہم بزعم خود کافی سمجھدار ہو چکے ہیں اور ہمارا سابقہ ہٹلر کٹ مونچھ والوں سے لے کر پر دیپ کٹ مونچھ والوں تک ، چہرہ پر پونے تین بھاتی ہوئی مونچھ والوں سے لے کر دس بج کر دس منٹ اور آٹھ بج کر بیس

منٹ بجاتی ہوئی مونچھ والوں تک ، اینٹھی ہوئی مونچھ والوں سے لے کر جھبری اور کتری ہوئی مونچھ والوں تک ، دوفٹ لانبی مونچھ والوں سے لے کر چیونٹی کی آنکھ برابر مونچھ والوں تک بلکہ مونچھ منڈوں تک سے پڑ چکا ہے ۔ ہم مونچھ کے متعلق بہت کچھ جاننے اور سمجھنے کے باوجود کچھ بھی جان اور سمجھ نہیں پائے ہیں۔ ہمیں آج تک اس بات کا علم نہیں ہو سکا ہے کہ مونچھ رکھنے کی ابتداء کب ہوئی اور کیوں ہوئی ؟ یہ سوال ہم نے بڑے سے بڑے تاریخ داں کے سامنے پیش کیا ہے لیکن آج تک کوئی بھی اس کا تسلی بخش جواب نہیں دے پایا ہے — ہاں ایک بات پر سبھی متفق ہیں کہ مونچھ رکھنے کی ابتداء دنیا کے عالم وجود میں آنے سے قبل ہو چکی تھی ۔ شیطان کو حضرت آدمؑ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے میں کوئی عذر نہیں ہوتا۔ اگر معاملہ اپنی مونچھ اونچی رکھنے کا نہیں ہوتا ۔ شیطان نے راندۂ درگاہ ہونا قبول کر لیا لیکن حضرت آدمؑ کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کیا ۔ آج بھی بہت سے لوگ اپنی مونچھ اُونچی رکھنے کے لئے وہ سب کر گذرتے ہیں جس کے تصور ہی سے ہماری روح تک کانپ اُٹھتی ہے ۔ چند سال قبل کی بات ہے ہمارے پڑوسی ایک خانصاحب نے اپنی مونچھ اُونچی رکھنے کے لئے اپنی بیوی اور دو بچوں کو خود گولی مار کر ملکِ عدم پہنچا دیا تھا ۔ اب وہ جیل میں ہیں اور پتہ نہیں جس مونچھ کو اُونچی رکھنے کے لئے انہوں نے اپنے خاندان کا خاتمہ کیا تھا وہ مونچھ اب بھی اونچی ہی ہے یا جیل کی سرد وگرم ہوا نے اسے نیچی کر دیا ہے اور خانصاحب جیل کی مشقت اُٹھانے کے ساتھ ہی ساتھ اپنی نیچی مونچھ کا ماتم بھی کر رہے ہیں۔ ویسے جیل جانا بذاتِ خود مونچھ نیچی ہونے کی دلیل ہے لیکن یہ اُصول لیڈروں پر لاگو نہیں ہوتا کیونکہ جیل جا کر ان کی مونچھ کچھ اور بھی اُونچی ہو جاتی ہے — !

مونچھوں نے تو دنیا کی بساط اُلٹ کر رکھ دی ہے ۔ دنیا میں جتنی بھی ہیرا پھیری ہوتی ہے جتنے دنگے فسادات ہوتے ہیں ۔ جتنی سازشیں ہوتی ہیں سب کے پیچھے اپنی مونچھ اُونچی رکھنے کا جذبہ ہی کارفرما ہوتا ہے ۔ **

غزل

نیض الرحمٰن فیض

دفتر میں بیبیاں ہیں تو مردانہ گھر میں ہے — موجودہ انقلاب بڑا شاندار ہے

ہر سُو سفیدی چھائی ہے رعشہ ہے جسم پر — بالوں پہ اب خضاب بڑا شاندار ہے

پہلے بھی ہم غلام تھے اب بھی ہیں ہم غلام — ذہنوں کا انقلاب بڑا شاندار ہے

دوشیزہ کو لیئے چلے جاتے ہیں شیخ جی — ہڈی میں یہ کباب بڑا شاندار ہے

جائے پڑھائی بھاڑ میں تنخواہ سے ہے غرض — اسکول کا نصاب بڑا شاندار ہے

بجو اس سُن رہے ہیں تیری فیضؔ کب سے لوگ

کہتے ہیں یہ خطاب بڑا شاندار ہے

تنخواہوں میں سے مناسب ٹیکس کاٹا نہ بھولئے

انکم ٹیکس قانون تنخواہ ادا کرنے کے ذمہ دار ہر فرد سے مانگ کرتا ہے کہ وہ ماخذ پر بھی مقررہ شرحوں پر ٹیکس کاٹ لے اور سرکاری ملازمین کی حالت میں فوری طور پر اور دیگر ملازمین کی حالت میں سات یوم کے اندر اندر اسے سرکار کے کھاتے میں جمع کرا دے۔

آجر کے غفلت کرنے پر:

i) ٹیکس کی کل رقم اس سے وصول کی جائے گی۔

ii) اس پر سُود اور جرمانہ لگے گا اور

iii) قانونی کارروائی بھی ہو سکے گی جس کے نتیجے میں قید بامشقت اور جرمانے کی سزا بھی ہو سکتی ہے۔

سزا سے بچیئے

خیال رہے تنخواہ میں سے کاٹے جانے لائق ٹیکس صحیح صحیح کاٹا گیا ہے اور اسے مقررہ مدت کے اندر اندر سرکاری کھاتے میں جمع کرا دیا گیا ہے۔

کاٹے گئے ٹیکس میں اگر کوئی کمی بیشی رہ گئی ہو تو اسے ماہ فروری / مارچ 1982ء میں ادا کی جانے والی تنخواہوں میں سے پوری کر لیجئے۔

ڈائریکٹوریٹ آف انسپکشن
(ریسرچ، اسٹیٹسٹکس اینڈ پبلک ریلیشنز)
محکمہ انکم ٹیکس، نئی دہلی ــ 110001

سکندر عرفان ۔ (کھنڈوہ)

بچپن میں نہ جانے کس سے ہم نے سُنا تھا کہ "شاعر بنتے نہیں پیدا ہوتے ہیں۔" ہم شاعر تو تھے نہیں البتہ شاعر بننا چاہتے تھے۔ تصور میں شاعر بن جانا ہماری ہابی تھی۔ ویسے مشاعروں میں شاعروں کو سُننا اور واہ واہ کرنا بھی ہمارے شوق میں شامل تھا۔ خواہ شعر کا مطلب ہمارے لئے اجنبی ہی کیوں نہ ہو ہم ان کا خیر مقدم بڑی گرمجوشی سے کرتے تھے۔ اور شاعروں کی یہی توصیف اور عزت نے ہماری اِس خواہش کو دبی چنگاری سے شعلہ بنا دیا۔ اور ہم نے باقاعدہ اپنے دل کو شاعری سے اور اپنے نام کو تخلص سے جوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ چنانچہ ہم نے ثابت کرنا چاہا کہ شاعر بنتے ہیں، پیدا نہیں ہوتے۔

سب سے پہلا مرحلہ ہمارے لئے تخلص کا انتخاب تھا۔ کائنات کے پردے چھان مارے۔ ہر طرف شاعر پہلے ہی سے اپنا اڈا جمائے نظر آئے۔ برق، نسیم، صبا، نظر، حیات، غرض کہ ہر شئے پر تقریباً شاعر غالب تھے۔ ہمیں بڑی مایوسی ہوئی۔ تھوڑی دیر سر کھجانے کے بعد غور کیا مگر بے سود۔ یکایک ایک خیال بجلی بن کر ذہن پر لپکا۔ کیوں نہ تخلص "مایوس" رکھ لیا جائے۔ چنانچہ ہم نے اپنا نام مع تخلص جناب

خوش حال الدین مایوس رکھ لیا۔ مگر یہ کیا ؟ خوش حال بھی اور مایوس بھی۔ مایوس تو ہمیں پسند تھا مگر خوشحال الدین بہت پریشان کر رہا تھا۔ بہت غور و خوض کیا۔ آگے پیچھے، اوپر نیچے، دائیں بائیں، سب طرف دیکھنے کے بعد ہمیں ایک تخلص سمجھ میں آ گیا "نامراد"۔ تخلص کی تلاش کے بعد ہم نے خود کی طرف توجہ کی۔

ایک ہفتہ میں ہماری دنیا ہی بدل گئی تھی۔ شیو کافی بڑھ چکا تھا۔ کپڑے کافی گندے ہو چکے تھے۔ جسمانی صفائی سے ایک حد تک ہم بے نیاز ہو چکے تھے۔ آئینے کی شہادت کے مطابق ہم میں شاعر کے آثار نمایاں ہو چکے تھے۔ گھر کے سبھی افراد ہمارے اس جنون سے متنفر نظر آ رہے تھے۔ مگر خاموش ضرور تھے۔

بہرکیف تخلص کے لفڑے سے آزاد ہوئے تو مسئلہ شعر گوئی ہمارے درپیش تھا۔ ہمیں یہ سوچنا ضروری تھا کہ کس قسم کے شعر کہے جائیں۔ وہ عاشقانہ ہوں یا فلسفیانہ، یاسیت میں ڈوبے ہوئے ہوں یا ان میں صوفیانہ جھلک ہو۔ بہرحال ہمیں تو عاشق اور معشوق کی تکرار، انکار، اقرار کے مضامین سے ایک خاص لگاؤ تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مشاعروں میں ایسے اشعار پر شاعر کو کافی شاباشی دی جاتی ہے۔ اسے کافی سراہا جاتا ہے کیونکہ معشوق کی گلی میں اس نے خود کو کھو دیا، قتل ہوا، نقشِ پا کو جائے سجدہ بنا لیا۔ کیا کیا نہ کیا اس نے تب جا کر اسے شعر کہنے کا شعور آیا۔ اور اس قسم کے اشعار سمجھنے کی صلاحیت شاید ہمارے لاشعور میں ازل سے ہی تھی۔ بہرکیف اس قسم کے خیالات سے ہی ہمارے ذہن کے چاروں طبق روشن ہو گئے۔ ایک وجدانی کیفیت طاری ہو گئی ہم پر۔ ایک مسئلہ پھر ہمارے سامنے دیوارِ چین بن کر آن کھڑا ہوا۔ وہ یہ کہ ہمارا معشوق کون ؟ بدنصیبی بلکہ اوقات کی ستم ظریفی کہ ہم ایک عدد معشوق سے بھی محروم تھے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ خدائے بزرگ و برتر نے ہمارے چہرہ کو بنانے میں تھوڑے بخل سے کام لیا۔ ورنہ ہر پری چہرہ ہم سے ہماری دید سے بے نیاز نہ ہوتا۔ ویسے ہم کافی خوبصورت تھے ...... ہماری نظر میں۔

بہرحال دو دن یوں ہی گذر گئے۔ کئی مصرعے لکھے۔ کاٹ دئیے۔ کبھی الفاظ چھوٹ دئے جاتے تھے۔ کبھی ردیف قافیہ بن جاتی کبھی قافیہ ردیف۔ کبھی ثانی مصرعہ گرینڈ ٹرنک روڈ بن جاتا تو اولیٰ مصرعہ ہمارے گھر کے سامنے والی گلی سا معلوم ہونے لگتا۔ طبیعت میں ایک عجیب سی ہیجانی کیفیت تھی۔ جھنجھلاہٹ تھی۔ ہم کئی کاغذ کا حلیہ بگاڑ چکے تھے۔ سفید کاغذات پر بنے کراس کے نشانات ہمارا منہ چڑا رہے تھے۔

رات کا تیسرا پہر گذر رہا تھا۔ ہم نے کمرے میں ٹہلنا شروع کیا۔ رات کا سماں، خاموشی ..... ہمارے قدموں کی آہٹ ایک عجیب سا بے ہنگم شور کمرہ میں برپا کئے ہوئے تھی۔ سارا عالم محوِ خواب تھا مگر ہماری شعلہ بار آنکھیں محروم خواب تھیں۔ محلہ کے آوارہ کتے شاید ابھی تک جاگ رہے تھے۔ ہمارا دل کہہ رہا تھا شاید وہ بھی کسی مشاعرے کی تیاری کر رہے ہیں۔

مسلسل کوشش کے باوجود بھی ہم کوئی مکمل شعر نہیں کہہ پائے تھے۔ اپنی بے بسی پر ہماری آنکھیں چھلک

آ ئی تھیں۔ ہماری یہ اضطراری کیفیت اِس لئے بھی تھی کہ اگلے روز شہر میں ایک عظیم الشان مشاعرہ منعقد ہو رہا تھا۔ اور ہم ایک نرالی شان اور انفرادی آن بان سے منظرِ عام پر آکر عوام سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوانا چاہتے تھے۔ یہ موقعہ ہم کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتے تھے۔

آخر کار رات کے آخری پہر تک آنسوؤں کی سیاہی کو بروئے کار لاکر ہم نے تین شعر غزل کے کہہ ہی ڈالے۔ ادھر مرغ بانگ دے رہے تھے اُدھر ہماری غزل اپنے آخری مراحل سے گذر رہی تھی۔ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہماری غزل بھی مکمل ہو گئی۔ غزل کو آخری ٹچ دے کر ہم نے ایک انجانی فرحت محسوس کی۔ ہمارا سر فخر سے تن گیا، گویا ہم غالب و میر کے شانہ بشانہ چل رہے ہوں۔ لہک لہک کر ہم نے شعر پڑھنا شروع کیا اور لاشعوری طور پر ہماری زبان سے واہ واہ بھی نکل رہی تھی۔

طویل انتظار کے بعد مشاعرہ کی رات آگئی۔ ہم نے بارگاہ ایزدی میں دُعا مانگی کہ یا رب آج کا یہ مشاعرہ ہمارے حق میں کر دے۔ ہم نے شکریہ ادا کیا کہ اے خدا تو نے ہمیں ایک عدد غزل کا مالک بنا دیا۔ ہم نے بڑے اہتمام سے غزل ایک شفاف پرزے پر اُتار کر مشاعرہ گاہ کی راہ لی۔

آج کی رات ہماری زندگی کی نورانی رات تھی۔ آج سے ہمارا شمار ہندوستان کے مایہ ناز شعراء میں ہونے والا تھا۔ کل تک ہم دوسروں کے لئے واہ واہ کرتے تھے۔ آج ہمیں واہ واہ کی جائے گی۔ اِن خیالات کے آتے ہی مارے خوشی کے ہماری سانس پھولنے لگی۔ ہم غزل کے اشعار گنگنانے لگے۔

مشاعرہ شروع ہوئے کافی وقت گذر چکا تھا۔ کئی شعراء اپنا اپنا کلام سنا کر داد حاصل کر چکے تھے۔ خدا خدا کر کے ہمارا نام مائک پر سُنائی دیا۔ کچھ اس انداز میں کہ سامعین ہنس پڑے۔ ہم یہ سمجھے کہ یہ ہنسی شاید ہمارے لئے استقبالیہ ہے۔

اسٹیج پر پہنچ کر ہم نے ایک طائرانہ نظر سامعین پر ڈالی۔ نہ جانے کیوں ہمارے قدم کپکپا رہے تھے ٹھنڈے ٹھنڈے قطرے ہماری پیشانی سے ٹپک رہے تھے۔ تھوڑی دیر بوم کی مانند ہم سامعین کا نظارہ کرتے رہے۔ یکایک سامعین میں سے آواز آئی۔ واہ! واہ!! واہ!!! اور یوں سمجھئے طنزیہ ہنسی کا سیلاب سا آگیا۔ ہر طرف چیخ و پکار کا عالم تھا۔ ہم نے اپنے حواس یکجا کر کے بڑی ہمت سے غزل کا مطلع شروع کیا۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے ۔۔۔ تو بتا دے مری دعا کیا ہے

مطلع کیا پڑھا، گویا گندے انڈوں، سڑے ٹماٹروں اور گالیوں کی برسات ہو گئی۔ واقعی ہم بھیگ گئے تھے بلکہ گئے تھے۔ ایک صاحب نے اسٹیج پر آکر ہماری ہمت بندھائی۔ ہمارے دامن سے ہمارا رُخِ روشن صاف کیا۔ ہماری آنکھ بند ہو چکی تھی۔ مگر زبان تب بھی کھلی ہوئی تھی۔

ہم نے اپنی سانس روک لی۔ آنکھیں کھولیں۔ ایسا لگا ہم خواب سے بیدار ہوئے ہیں۔ ایک صاحب نے ہمارا کالر

پکڑ کر ہمیں اسٹیج سے الگ کر کے یہ کہا۔ "میاں نامراد تمہاری مراد بر آئی۔ براہ کرم اب ادھر کا رُخ مت کرنا۔ ہم تمہارے شکر گذار ہیں کہ تم نے سامعین کو انٹرول کا موقعہ دیا۔

ہم سر جھکائے، آنکھوں میں آنسو لئے اپنے غریب خانہ پر لوٹ آئے۔ رات بھر ہمیں نیند نہیں آئی۔ دوسرے دن علی الصبح ہم قبرستان پہنچے۔ ایک گڑھا کھود کر غسنزل کو دفن کیا۔ گویا نامراد کو دفن کر دیا۔ اس کے بعد واقعی نامراد و ناشاد بہت اُداس گھر لوٹ آئے۔ اور شاعری سے توبہ کر لی۔ اب بھی ذہن کے پردوں سے یہ الفاظ جھانک کر ہمارا منہ چڑا رہے تھے۔ "شاعر پیدا ہوتے ہیں، بنتے نہیں۔"

--

خود رہ کر منجے گھر سے باہر بھگانے آئی
یہ لال چھڑی گھر کو دوزخ بنانے آئی
ناحق سے میرے دل پہ پتھر چلانے آئی
سُکھی جگہ لے جا کو نڑلا دبانے آئی

سیدھا مجھے گڈھے کا رستہ بتانے آئی
اماں رے یہ جلاپا، اُفو رے یہ جلاپا

سر کو مرے منڈھا کو بے بال کری دیکھو
رکھتے ہی پاواں گھر میں کیا حال کری دیکھو
سوتن بنا کو منجے کنگال کری دیکھو
بیٹھے بٹھائے بینا جنجال کری دیکھو

کیا حال کری دیکھو، کیا حال کری دیکھو
اماں رے یہ جلاپا، اُفو رے یہ جلاپا

منتر پڑھا کو، سر پو مندل لگا کو چھوڑی
میرے میاں کو پورا اپنا بنا کو چھوڑی
لنکا لگا کو چھوڑی، ناکتی پڑا کو چھوڑی
کیسی تھی اُن کی کاٹھی کیا بنا کو چھوڑی

کچھ بولے نئیں سر پکا واڑاں جٹا کو چھوڑی
اماں رے یہ جلاپا، اُفو رے یہ جلاپا

ھزل — پاگل عادل آبادی

مرا باپ، ماتم مناتیں کی نیئں کی ۔ کفن بھی بُڈھے کو سِلاتیں کی نیئں کی
تڑی دے کو مسجد سے جوتے تو لایوں ۔ مگر اُن کے پاؤں میں آتیں کی نیئں کی
پھکٹ کی ہِلی تو پیٹے جار ہے ہیں ۔ گھر کھیر ماموں بچاتیں کی نیئں کی
بڑے ڈاکٹر میرا، کر رئیں علاجاں ۔ مجھے زندہ گھر کو بھجاتیں کی نیئں کی
میں خط اُن کو مُرغی کے ذریعے بھجایا ۔ اُنوں مُرغی واپس بھجاتیں کی نیئں کی
بُلا رئیں مجھے شیخ جنّت میں لیکن ۔ پھکٹ میں وال گانجہ پلاتیں کی نیئں کی

مِنسٹر بنیں ہیلتھ کے وہ بھی پاگل
جو عیدین کو بھی نہاتیں کی نیئں کی

غزل — رؤف رحیم

باپ کی مانی نہ تھی اور گھر سے بے گھر ہو گئے ۔ ہم کسی کی چاہ میں جنگلی کبوتر ہو گئے
پہلے پہلے جو مِلا کرتے تھے بس اسٹانڈ پر ۔ رفتہ رفتہ وہ ہمارے گھر کے اندر ہو گئے
آج تو گھر گھر میں ٹی وی ہے خدا کے فضل سے ۔ رفتہ رفتہ گھر ہمارے مِنی تھیٹر ہو گئے
مونچھ داڑھی چٹ ہوئی اور زلف ہے شانوں کے گرد ۔ آج کل لڑکے بھی لڑکی کے برابر ہو گئے
گھوڑے جوڑے کے ملے سسرال سے جب دس ہزار ۔ بھیک کے کپڑوں میں وہ لقا کبوتر ہو گئے
شیخ صاحب میرے گھر میں قورمہ روٹی کہاں! ۔ آپ ناحق اک غریب انسان کے سر ہو گئے
بِن بلائے اس قدر مہمان گھر بھر ہو گئے ۔ سارے گھر والے ہمارے گھر کے باہر ہو گئے
ہم نے سب کچھ سیکھ کر پایا نہ اب تک روزگار ۔ جن کو کچھ آتا نہ تھا وہ تو منسٹر ہو گئے
ایک دم رک جائے گا یہ فرقہ وارانہ فساد ۔ فوج میں بھرتی کرا دو جو بھی لوفر ہو گئے
مل گئی اُن کو وزارت، چڑھ گیا اُن کا دماغ ۔ یہ مقدر ہے، مقدر کا سکندر ہو گئے
بیچ کر اب فکر و فن کھاتے ہیں روٹی دوستو ۔ آج کے اس دور میں تاجر سخنور ہو گئے
جب سے پیروڈی کار پیچھے آ گئے اسٹیج پر ۔ شاعری میں ہم نہ ہونے کے برابر ہو گئے

خون پی پی کر ملاوٹ کی غذا کا اے رحیم
[illegible]

سلسلہ مطبوعات زندہ دلان حیدرآباد

نامور مزاح نگار یوسف ناظم کے مضامین کا مجموعہ

ممتاز ادیب لیئق صلاح کے ہلکے پھلکے مضامین کا مجموعہ

سُن سُنا

شگوفہ کے زیر اہتمام شائع ہو چکا ہے

قیمت : دس روپیہ

بتوسط : ماہنامہ شگوفہ حیدرآباد

فکر تونسوی

کے نام

شکیل اعجاز

کا خط!

اپنے دولت کدہ پر ایک گھنٹہ کی طویل ملاقات کرنے اور اس دوران دو دفعہ شربت روح افزا پلانے کے بعد آپ نے ناسازگی طبیعت کے باوجود ہمیں گیٹ تک چھوڑا۔ پھر گل مہر پارک کے دو کتے بس اسٹاپ تک چھوڑنے کے لئے آئے۔ ہم نے لاکھ کوشش کی کہ وہ راستے سے چلے جائیں لیکن انھیں تو مہمان نوازی کا مظاہرہ کرنا تھا۔ وہ تو اور آگے تک آتے لیکن دو ایک مقامی لوگوں نے سمجھا کر واپس بھیجا۔ انہوں نے واپس جاتے جاتے بھی مڑ مڑ کر ہم کو زوردار آواز میں خدا حافظ کہا۔ وہاں موجود تمام مسافر ہماری خوش نصیبی پر رشک کر رہے تھے اور ہم شرماشرما کر داد وصول کر رہے تھے۔ آپ کے دولت کدہ کے قریب ہی قطب مینار ہے (گستاخی معاف لیکن دلی کارپوریشن نے یہ اچھا کیا کہ بہت سے آثار قدیمہ کو ایک جگہ ایڈجسٹ کر دیا ہے) ہم دونوں اس ڈر سے قطب مینار کے اندر نہیں گئے کہ بجلی فیل ہو گئی تو مجتبیٰ حسین صاحب سے ملاقات نہ ہو سکے گی۔ لیکن انھیں ہمارے آنے کی بھنک پڑ گئی تھی اس لئے فوراً حیدرآباد چلے گئے تھے۔ مایوس ہو کر مظفر حنفی صاحب کے ہاں گئے۔ وہ ہماری دانست میں پہلی دفعہ اور ان کے چھوٹے بچے کے بقول آخری دفعہ ہمارے میزبان بنے تھے۔ موصوف جس طرح بے تحاشہ ہماری خاطر کر رہے تھے۔ اس سے ہم پہلے ہی ڈر رہے تھے۔

آپ نے فرمایا تھا خیریت کا خط لکھنا اس لئے حسب ارشاد لکھتا ہوں کہ :

"ہم لوگ بہت ہی خیریت سے اکولہ پہونچ گئے۔ راستہ میں کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوئی۔ ساری ٹرین خالی پڑی ہوئی تھی۔ راستہ بھر ہم اِس بوگی سے اُس بوگی میں ٹہلتے رہے۔ خلافِ توقع ٹرین خالی دیکھ کر دل چاہا کہ ہم خوب لمبے ہو جائیں اور پھر پوری برتھ پر قبضہ کر کے گذشتہ عمر کے سفروں کا بدلہ نکال لیں۔ اس

لئے کئی دفعہ ڈبل کے انداز میں ہاتھوں کو سر سے اوپر لے جاکر پوری بیٹھک پر دم رو کے لیٹے رہے۔ اب جبکہ ریلوے کا سفر اتنا آسان ہو گیا ہے تو دل چاہتا ہے کہ بار بار آپ سے ملنے آئیں۔

حال ہی میں یہاں طنز و مزاح پر ایک سمینار ہوا اس کی روداد آپ کے سوا کون سننے گا۔ ۲۱/۲۲ فروری کو مہاراشٹرا اردو اکاڈمی کے زیر اہتمام "مہاراشٹرا میں طنز و مزاح" کے عنوان سے اکولہ میں پہلی بار ایک سمینار ہوا۔ (یہاں کتابیں چھپنے سے سمینار تک سب کام عموماً صرف پہلی ہی دفعہ ہوتے ہیں) ہم پر ترس کھا کر استقبالیہ کمیٹی میں شامل کر لیا گیا تھا۔ بمبئی سے تشریف لانے والے مہمانوں کی ٹرین صبح ۹ بجے اکولہ پہونچتی ہے۔ اس لئے ہم ٹھیک ۹ بجے بستر سے اٹھے اور سارے گھر میں دندناتے پھرتے رہے۔ چھوٹی بہن نے ناشتہ لاکر رکھا تو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ آج ناشتہ اتنا ضروری نہیں ہے۔ ظ صاحب آچکے ہوں گے۔ وہ کیا جانے ظ صاحب کی اہمیت، بولی "ظوئے صاحب آئیں یا طوئے صاحب آئیں پہلے ناشتہ کیجئے۔"

۲۱ فروری کو دو بجے سمینار شروع ہوا۔ سمینار تنقید کا نشانہ نہ بنے۔ اس لئے دعوت نامے نسبتاً کم عقل لوگوں کو تقسیم کئے گئے تھے (ظاہر ہے ہمیں ضرور ملا تھا) پرنسپل منشی صاحب، خواجہ عبدالغفور صاحب، عبدالستار دلوی صاحب، سید صفدر صاحب اور شیخ رحمٰن صاحب نے مقالات پڑھے۔ یوسف ناظم صاحب کا نمبر آیا تو شام ہو چکی تھی۔ انہوں نے شروع ہی کیا تھا کہ ہال کے قریب سے ایک شادی کا شور سنائی دیا، وہ رک گئے۔ دوبارہ پڑھنا شروع کیا تو بجلی چلی گئی۔ اسپیکر بند ہو گیا۔ کہا "عجیب شہر ہے۔ کبھی باجے بجتے ہیں۔ کبھی بجلی چلی جاتی ہے" پھر بغیر مائک کے پڑھا اور اندھیرا ہونے کے باوجود کاغذات پر دیکھ کر مقالہ سناتے رہے۔ درمیان میں ایک دفعہ ظ۔ انصاری صاحب سے پوچھا بھی کہ پڑھوں یا بیٹھ جاؤں تو انہوں نے کہا "بجلی آنے تک تو پڑھتے رہئے۔" نیاز تو ہی مقالہ پسند کیا گیا۔ اس لئے کہ لوگ سن نہیں سکے۔ ان کے بعد ظ۔ انصاری صاحب کی تقریر تھی۔ وہ سامعین کو ادھر ادھر ڈبکاتے رہے کبھی کھسیانے ہو کر مائیک کو پکڑا یا چھوڑ دیا پھر بیٹھ کر اکڑ کر لائے، یہی کہتے رہے کہ خیر چھوڑ دیئے اس قصہ کو، میں آپ کو کدھر لے کر چلا گیا تھا۔
اب آئیے اصل موضوع کی طرف لیکن سامعین قابل داد ہیں کہ اتنے Exertion کے باوجود تر و تازہ تھے۔ اور ظ۔ صاحب کی سوا گھنٹے کی تقریر سننے کے بعد مزید سننے اور جھیلنے کے لئے آمادہ تھے کہ اچانک باورچی نے کھانا تیار ہو چکنے کا مژدہ سنایا۔ سمینار ختم کر دیا گیا۔ اردو اکاڈمی کے ممبر سہیل صاحب جس وقت حاضرین کا ان کی تشریف آوری کے لئے شکریہ ادا کر رہے تھے، آدھے سے زیادہ لوگ ہال سے باہر نکل چکے تھے۔ (شاید اسے ہی نیکی کر دریا میں ڈال کہتے ہیں)

رات میں مشاعرہ تھا۔ سردار جعفری اور بشیر نواز صاحبان کی آمد متوقع تھی۔ لیکن انہوں نے صرف اشتہارات میں شرکت کی۔ مشاعرے میں نہیں۔ اکولہ آنے سے قبل دونوں کی طبیعتیں ایک ساتھ ناساز ہو گئی تھیں۔ ظ۔ صاحب کے انکار کے باوجود انھیں اناؤنسر بنایا گیا۔ اس لئے انہوں نے (شاید شرارتاً) شاعروں کو غزل سرائی کیلئے اسطرح مدعو کیا جیسے سرکاری اسپتال میں مریضوں کا نمبر پکارا جاتا ہے۔ چند کو چھوڑ کر تقریباً تمام شعرا او سط کامیابی کے ساتھ ہوٹ ہوئے۔ بارہ بجنے کے ۲ گھنٹہ بعد جب دوسرے مشاعرے شروع ہوتے ہیں یہ ختم ہو گیا۔

لوگ کہتے ہیں سامعین سے زیادہ شاعروں کی تعداد تھی۔ حالانکہ سامعین اور شاعروں سے زیادہ تعداد ان لوگوں کی تھی جنھوں نے مشاعرے میں شرکت نہیں کی۔ اکثریت ایسے شاعروں کی تھی۔ جنھیں اکیڈمی نے مدعو نہیں کیا تھا۔ (دیگر تمام معاملوں میں شاعر نازک مزاج ہوتا ہے۔ بغیر دعوت کے پڑوس کی شادی میں بھی نہیں جاتا۔ لیکن مشاعرہ دیکھ کر ایسا بے قابو ہو جاتا ہے کہ کچھ نہیں سوجھتا)

دوسری صبح یعنی ۲۲ر فروری کو مہمان حضرات اکولہ سے ۲۵ کلو میٹر دور بالاپور میں نقشبندیہ لائبریری دیکھنے روانہ ہونے والے تھے۔ (ہزاروں نایاب کتابوں اور قلمی نسخوں پر مشتمل یہ لائبریری واقعی دیکھنے کی چیز ہے کیونکہ یہاں کتابیں پڑھنے کی اجازت نہیں ہے) ہم صبح نو بجے ریسٹ ہاؤس پہنچے تو روانگی کے دور دور تک آثار نہ تھے۔ ایک سوٹ میں ظ۔ صاحب اور منشی صاحب ابھی ابھی جاگے اور گفتگو کر رہے تھے۔ منشی صاحب کے کچھ پوچھنے پر ظ۔ صاحب نے فرمایا "مگر اقبال کو ہم سے زیادہ جاننے والے لوگ بھی موجود ہیں۔ بگن ناتھ آزاد ہیں۔ اور' اور بھی لوگ ہیں ۔ ہم نے تو غالب کو پڑھا ہے۔ اور غالب سے ہمارا پیری مریدی والا معاملہ ہے۔ ....' وہ اس موضوع پر کافی دیر بات کرتے رہے۔ پھر ہاتھ روم گئے ہی تھے کہ بازو کے سوٹ سے یوسف ناظم صاحب تشریف لائے اور کہا "کس کی تقریر ہو رہی تھی؟ ظ۔ صاحب کی ۔ کس موضوع پر؟ (پھر خود ہی کہا) ویسے انھیں موضوع کی ضرورت نہیں پڑتی"۔

وہیں ہمارے والد صاحب بھی موجود تھے۔ یوسف ناظم صاحب نے اُن سے کہا۔

"آپ شکیل میاں کی صحت پر بالکل توجہ نہیں دیتے۔ یہ ایک سال میں بہت دُبلے ہو گئے ہیں"۔ ابا جان نے جواب دیا "ہم خود حیران ہیں' حالانکہ گھر میں ان کو کوئی پریشانی نہیں ہے۔ ہر چیز کی کھانے پینے کی سہولت ہے" یوسف ناظم صاحب بولے "یہ آپ اب بتا رہے ہیں۔ ان کو پہلے ہی بتا دینا چاہئیے تھا"۔

دھیرے دھیرے دیگر حضرات بھی جاگے۔ اس دوران بات چیت کرتے ہوئے ظ۔ صاحب اور ہم دھوپ میں کھڑے تھے کہ ظ۔ صاحب نے نیم کے درخت کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ یہ ہمارا پسندیدہ درخت ہے۔ پھر قریب جاکر تازہ تازہ چھوٹے چھوٹے پتوں کو دیکھا اور ارشاد کیا کہ کاندھوں پر کھڑے ہو کر ان کے لئے توڑ دیں۔ عرض کیا آپ ہمارے بزرگ ہیں۔ دوم اس جملے میں صنعت تلمیح ہے۔ آپ اس بادشاہ کی طرح کسی دن ناراض ہو کر ہماری کسی کتاب کی کھال اُدھیڑ دیں گے۔ فرمایا کوئی اور بندوبست کرو۔ بندوبست کرنے نکلے ہی تھے کہ شکیل اعجاز شکیل اعجاز کی آوازیں آئیں۔ ہم نے عجلت میں درخت کے چاروں طرف نظریں گھمائیں (احتیاطاً ڈالیوں پر بھی نظر ڈالی) لیکن وہ نظر نہ آئے۔ موصوف یونس کے نیم کی ایک ڈالی پکڑے پتے کھا کر ان کی اہمیت بڑھا رہے تھے۔ ہم سعادتمندی سے ہاتھ باندھے اُن کے پاس کھڑے رہے۔ اور ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔

"سر! نیم کے تازہ پتوں کی افادیت بتایئے تاکہ سب کو معلوم ہو" انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں رُک رُک کر جواب دیا۔

"نہیں' بس ہم کھاتے ہیں' بچپن سے عادت ہے یہیں کھانے کی" غرض یہ کہ انھوں نے پتوں کی افادیت

یہ اندھیرا ہی رہنے دیا۔ کوئی روشنی نہیں ڈالی۔ ہم نے ناقص عقل سے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ کسی اور کو اُن کی طرح عالم فاضل دیکھنا نہیں چاہتے۔

اُدھر گارڈن چےاُرس پر عبدالستار دلوی صاحب اور یوسف ناظم صاحب چاء نوش فرما رہے تھے کہ ہمارے ایک نوجوان دوست جو مقبول سوشل ورکر بھی ہیں تشریف لائے۔ یوسف ناظم صاحب سے اُن کا تعارف کراتے ہوئے جب ہم نے یہ کہا کہ "یہ صرف کام کے لئے کام کرتے ہیں۔ نام و نمود یا شہرت کی خاطر کام نہیں کرتے"

تو ناظم صاحب نے برجستہ کہا۔

"اُس کے لئے ہم لوگ ہیں نا"

دوپہر میں "کھلا اجلاس" تھا یہ ایک طرح سے "دفترِ شکایات" بھی تھا۔ دو روزہ پروگرام کا سب سے زیادہ گرما گرم حصہ تھا۔ جس کے لئے شہر کے کچھ لوگ دو دن سے ریہرسل کر رہے تھے۔ اس موقعہ پر اکیڈمی کی مالی اعانت سے شائع شدہ کتب و رسائل کی نمائش بھی تھی۔ اکیڈمی کے دو ممبروں اور دوستوں نے بہت ورغلایا کہ ہم اپنی تیار کردہ تصاویر بھی نمائش کے لئے رکھ دیں۔ لیکن ہم ڈر گئے کہ ہلڑ بازی میں بھائی لوگ تصاویر لے کر نو دو گیارہ ہو گئے تو کس کا منہ نوچیں گے۔ اجلاس شروع ہی ہوا تھا کہ کسی نے جوش ملیح آبادی کے انتقال کی افواہ اڑا دی' ظ۔ صاحب نے ایک جذباتی تقریر کی۔ اور کہا کہ "عام طور سے کسی شاعر یا ادیب کی موت یا تعزیتی جلسہ میں اُس کی ادبی خدمات کا تذکرہ ہوتا ہے۔ لیکن جوش کی موت میرے لئے ایسی ہے جیسے میرے گھر کے کسی فرد کی موت۔ اس لئے میں ان کی ادبی حیثیت کی بجائے۔ ان کی زندگی کے کچھ دلچسپ واقعات آپ کو سناؤں گا۔

اور واقعی ظ۔ صاحب نے آدھے گھنٹہ تک بہت دلچسپ واقعات سنائے (اس کے لئے ایک الگ خط کی ضرورت ہے) ظ۔ انصاری صاحب کی تقریر کے باوجود ہم جوش کے انتقال کی خبر ماننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ دوستوں نے مختلف دلیلیں دیں۔ لیکن ہم ٹس سے مس نہ ہوئے۔ آخر پچھلی نشست پر بیٹھے ایک پہلوان نے ہماری پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ جوش کا انتقال ہو گیا ہے تو ہمیں فوراً یقین ہو گیا۔ اُسی شام، بیچے یہ لوگ بمبئی واپس روانہ ہو گئے۔ ہم اس بات پر متعجب ہیں کہ ایسے لوگ بھی جو سوائے آئینہ کے کسی اور کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ ان دنوں ظ۔ انصاری صاحب' یوسف ناظم صاحب اور دوسرے مہمانوں کے اخلاق و علمیت کی تعریفیں کر رہے ہیں۔ ابھی ابھی پتہ چلا کہ خط طویل ہو گیا ہے اس لئے خدا حافظ۔

دعا کا طالب

چوروں کا اجلاس

(مراٹھی مزاحیہ)

سری کرشن کولہٹکر
مترجم: محمد اسداللہ (ورمجہ)

موجودہ دور جلسے' جلوس' سبھا' سمیلنوں کا زمانہ ہے۔ قومی' مذہبی اور سماجی جلسے تو ہر جگہ عام ہیں مخصوص پیشوں اور ذاتوں کے جلسوں کی بھی کمی نہیں۔ جلسوں کے انعقاد کا یہ مرض پھیلتے پھیلتے کتنی دور تک پہونچ گیا ہے' اس کا عجیب و غریب تجربہ مجھے پچھلے دنوں ہوا۔ ہوا یوں کہ پچھلے ماہ کے شروع ہی سے ہمارے گاؤں میں نئے نئے چہرے نظر آنے لگے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ ان چہروں کی ایک ہی وضع تھی۔ کالی رنگت' خشک بال' گال ابھرے ہوئے' گردنیں کوتاہ مگر قدرے فربہ اور بلا کی چنچل آنکھیں پہلے تو ان بن بلائے مہمانوں کی آمد ہی کا عقدہ نہ کھلا اور نہ آتے پتے ہی کا کچھ سراغ مل سکا۔ گاؤں میں ان لوگوں کی آمد اور چوریوں کی تعداد میں یکایک اضافہ ہو جانا ہماری قیاس آرائی کا موجب ہوا کہ ہو نہ ہو ان مہاشیوں کی تشریف آوری کا مقصد دوسروں کے مال پر نظر رکھنا کر عوام الناس کو اپنے مال و جائیداد کے تحفظ کی خاطر خبردار کرنا ہے یعنی جب ساری دنیا چادر تان کر میٹھی نیند سوتی ہو' اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر لوگوں کو جمع پونجی کی فکر جاں سوز سے چھٹکارا دلانے کا غیر شریفانہ پیشہ ان شب بیداروں نے اپنا رکھا ہے۔ اس یقین کا راسخ ہونا تھا کہ ہم فوراً پولیس اسٹیشن پہونچے اور رپورٹ درج کرائی' منشا یہی تھا کہ سرکار ان سنیاسیوں کو ٹھہرنے کے لئے بلا کرایہ معقول مکانات مہیا کرے مگر سرکار نے انھیں چھوڑ گاؤں والوں کو بلا کرائے کے مکانوں میں منتقل کرنا شروع کر دیا تو بھیک نہ دے مگر کتا سنبھال ۔

کہہ کر ہم نے اس فاسد خیال کو اپنے سر سے نکال پھینکا۔

بری صحبت کا کرشمہ دیکھئے کہ جب تک ان ناخواندہ مہمانوں کی تعداد قلیل تھی۔ گاؤں کی شرافت و وضعداری پر کوئی حرف نہ آیا۔ پھر یہ ہوا کہ ان کی تعداد بڑھتے بڑھتے اس قدر ہو چلی کہ وہ میزبان اور ہم مہمان معلوم ہونے لگے۔ تب ہماری شامت ہم ہی کو ستانے لگی۔ پہلے پہل گاؤں والوں ہی کی چوریاں ہوئیں۔ دھیرے دھیرے ان میں کمی واقع ہونے لگی۔ بعد کو حالت یہاں تک آپہونچی کہ چور ہی آپس میں چوریاں کرنے لگے۔ جس طرح احمقوں کے دیس میں عقلمند بیوقوف گردانا جاتا ہے اسی طرح چوروں کے نگر میں شریفوں کی قیمت آہستہ آہستہ گھٹنے لگی۔ تب ہمارے رجحانات بھی چوری چکاری کی طرف بڑھنے لگے میری ابتدائی چوریاں چھوٹی چھوٹی ہوا کرتیں' مثلاً کسی چور کو قریب سے گذرتا ہوا دیکھ کر میں صرف اپنا بدن چرا لینے پر اکتفا کرتا۔ پھر میں اپنے روپیوں پیسوں ہی پر ہاتھ صاف کرنے لگا۔ یعنی اسی صندوق کی رقم اس صندوق رکھ' اس تجوری کی رقم اس الماری میں چھپا۔ اور اس عمل کے دوران چوکس مگر شریفانہ سہمی سہمی نظروں سے چاروں طرف دیکھتا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ بڑھتے بڑھتے یوں ہوا کہ ایک دن ہمت جٹا کر" بنڈو نانا" کے گھر سے پھٹا ہوا جوتا تک اڑا لایا۔ ان دنوں میری ہی طرح بنڈو نانا کو بھی یہ گندی عادت لگ رہی تھی۔ چنانچہ مذکورہ جوتا جو میں اس کے گھر سے چرا لایا تھا۔ فی الحقیقت میرا ہی تھا جسے بنڈو نانا اسی لہر میں میرے گھر سے غائب کر چکا تھا۔ پورا گاؤں چور بن چکا تھا۔ اس لئے کسی کا بھی کوئی خاص نقصان نہ ہوا کیونکہ اگر ایک نے دوسرے کی پگڑی چرائی تو اس نے اس کا رومال غائب کر کے حساب بے باک کر دیا۔ نئی نئی چیزیں ہاتھ آنے لگی تو یکسانیت سے پیدا شدہ بوریت دور ہوئی۔

لیکن اتنے سارے چور ہمارے ہی گاؤں میں کیوں ڈیرہ ڈالے ہوئے ہیں۔ نیز کب تک قیام فرما رہیں گے ؟ اس کا کسی کو بھی علم نہ تھا۔ ہمارے یہاں ڈاکہ ڈالنے کے لئے کوئی خزانہ بھی نہ تھا۔ تب لگا کہ ہم خواہ مخواہ بدگمانی میں پھنسے گئے' یا پھر ان چوروں نے گاؤں والوں کی صحبت کو اپنے لئے موافق خیال کیا ہے۔ بالآخر ایک ہوشیار جوہری ان کے پیٹ میں گھس کر باطن کا حال معلوم کر آیا کہ عنقریب اس گاؤں میں چوروں کا ایک عظیم الشان اجلاس منعقد ہونے والا ہے۔ جس میں ہندوستان بھر کے چور اچکے' اٹھائی گیرے و جیب کترے اپنے وفود روانہ کریں گے۔

پھر اجلاس کے متعلق نت نئی خبریں سنائی دینے لگیں کہ آج بمبئی سے جیب کتروں کا سردار آیا۔ کل دلی سے ٹھگوں کا سرغنہ وارد ہوا' پرسوں پونے کے اٹھائی گیروں نے قدم رنجہ فرمایا۔ اس قسم کی ایک نہ دو ہزاروں بازاری افواہیں ہمارے تجسس کا مذاق اڑانے لگیں۔ دو ایک مرتبہ اجلاس کے پنڈال کی تیاری کے کام کی رپورٹ گھر بیٹھے موصول ہوئی۔ مثلاً میرا اور بنڈو نانا کا ایک ایک رومال ایک رات یکایک غائب ہو گیا۔ ہم نے قیاس باندھا کہ ہو نہ ہو ان رومالوں کو بجائے ہمارے سروں کے پنڈال کی چھت کے لئے زیادہ مناسب سمجھا گیا اور بعد میں یہ سچ بھی ثابت ہوا کیونکہ پنڈال کے ایک حصے پر بنڈو نانا کے بتا کر کے

داغ اور میری بیڑی سے پیدا شدہ سوراخ صاف نظر آئے" دوسری مرتبہ ہماری پگڑی رفو چکر ہوئی تو گمان
کیا کہ اب پنڈال کو تجا کر باندھی جارہی ہے۔ اور ایک مرتبہ تو کسی نے بنڈو نانا کی سینڈھی پر ہی ہاتھ صاف کر دیا
لاکھ سر مارا مگر اس کا مصرف سمجھ میں نہ آیا۔ پھر ایک دن پنڈال کے صدر دروازے کے قریب چند جانوروں
کے مجسمے نظر آئے جن میں ایک بکرا بھی تھا۔ اس کی داڑھی کے مقام پر بنڈو نانا کی سینڈھی لٹکی ہوئی دکھائی دی۔
بالآخر اجلاس کا دن نکلا۔ اس دن صدر موصوف کی آمد پر بیسیوں لوگ آگے بڑھے اور انھیں ہاتھوں
ہاتھ لے کر خوش آمدید کہا۔ لیکن اسی بھیڑ میں کسی نے صدر کی گھڑی اور انگوٹھی پر ہاتھ صاف کر دیا لیکن
چونکہ یہ اشیا موروثی نہ تھیں لہٰذا ان کے چلے جانے کا انھیں قطعی افسوس نہ ہوا۔ اسی ساعت میری گھڑی اور
بنڈو نانا کی انگوٹھی اڑن چھو ہو گئی سو اس طرح یہ خسارہ پورا ہوا۔

آؤ بھگت کمیٹی کے صدر اجلاس کی غرض و غائت پر روشنی ڈالتے بولے' یہ انتہائی افسوس کا مقام
ہے کہ تاہنوز چوری کے پیشے کو سماج میں متوقع پذیرائی حاصل نہیں ہو سکی۔ (شیم شیم) معاشیات کا
مشہور اصول ہے کہ ملک کی ترقی کے لئے ملک کے اندر دولت کا بہاؤ ہمیشہ جاری رہنا چاہیئے۔ حاضرین ذرا
غور فرمائیے اگر چوری کا پیشہ نہ ہوتا تو یہ کلیہ کتابوں میں دفن ہو کر رہ جاتا۔ کنجوس کوڑی کوڑی جمع کر کے
زمین میں دفناتا ہے۔ ساہوکار دھوکہ دے دے کر حاصل کیا ہوا روپیہ تجوری میں چھپاتا ہے نیز عورتوں نے
زیورات کی شکل میں ملک کا کس قدر روپیہ روک رکھا ہے۔ کیا اس جمع شدہ پانی کو رواں کرنے کا سہرا ہمارے
سر نہیں؟ عہدِ قدیم میں اس پیشے نے خوب ترقی کی۔ سری کرشن بچپن میں دہی چرایا کرتے تھے۔ ثبوت کے
لئے پران حاضر ہیں۔ اسی طرح وشوامتر کو وششٹ کی کام دھینو چراتے ہوئے کسی برائی کا خیال نہ آیا۔ دریودھن
اور اس کے سینا پتی کو ویراٹ کی گائیں چراتے وقت کوئی خاص بات محسوس نہ ہوئی۔ ظاہر ہے ان بادشاہوں
نے معاشیات کے اس اصول کو ذہن نشین کر رکھا تھا اور اسی پر عمل پیرا بھی ہوئے۔ موجودہ حکومت ترقی
یافتہ ہونے کے باوجود چوروں کو سخت سزائیں دیتی ہیں۔ ان حالات کو دیکھ کر بھلا کس رحم دل آدمی کا دل درد
سے بھر نہ آئے گا۔ آج سے سو سال قبل ٹھگی جیسے سودیشی دھندے کو راجہ مہاراجاؤں کی سرپرستی امداد حاصل
تھی۔ غیر ممالک میں بھی چوروں کی خاطر خواہ پرورش ہوتی رہتی ہے۔ آج چوری کی بہن رشوت خوری کی ملک بھر
میں بن آئی ہے۔ یہ واقعی خوشی کی بات ہے۔ رشوت خوری مالک کی رضا مندی سے ہوتی ہے اور چوری مرضی کے
خلاف دونوں میں یہ ایک واضح فرق ہے کہ ہمارے دھندے میں مالکوں کو کف افسوس ملنے کا موقع نہیں ملتا
چوری پکڑی گئی تو اس کی پوری ذمہ داری چور پر ہوتی ہے وہ اپنے بدلے مالک کو نہیں گھسیٹتا۔ سوچئے اگر
چوری نہ ہوتی تو قفل کیوں ایجاد ہوتے۔ سائنسی ایجادات میں پہلی دریافت یقیناً قفل ہی ہے۔ اسی کے بعد
دیگر اشیا وجود میں آئیں۔ غرض ان اشیاء کے موجد قفل اور قفل کے موجد ہم ہیں بلکہ آگے چل کر ایجادات کا یہ
سلسلہ ریل سے جاملتا ہے۔ چنانچہ ریل گاڑیوں کو تو دن دہاڑے ملک بھر میں دندناتے پھرنے کی اجازت ہے
اور ہمیں مجبوراً جنگلوں پہاڑوں میں چھپنا پڑتا ہے۔

اس کے بعد صدر موصوف کا تعارف بھی ضروری ہے۔ اس موقع پر ان کی مدح سرائی مجھے ہرگز مقصود نہیں کیونکہ اگر میں ان کی خوبیاں لکھنے بیٹھوں تو اس کے لئے ضروری کاغذ اور سیاہی مہیا کرنے کے لئے مجھے تمام عمر ان ہی دو اشیاء کی چوریاں کرنی پڑیں گی۔ ان کے متعلق بس یہ کہنے پر اکتفا کروں گا کہ ان کی ایک بھی رات ایسی نہیں گذری جب انہوں نے چوری نہ کی ہو۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ اس اجلاس سے ان کے اس معمول میں کوئی فرق واقع ہوگا۔ کیونکہ بستی والوں کو اپنے ہاتھوں کا کرشمہ دکھانے کا صدر صاحب نے تہیہ کر لیا ہے (صدر کے اس فیصلے کی صداقت مجھ پر اور بنڈونا پر اوروں سے کچھ زیادہ ہی کھلی) جناب صدر کے عہد طفلی کا یہ عالم تھا کہ پالنے ہی میں انہوں نے اپنے پاؤں بلکہ ہاتھ کی صفائی دکھانا شروع کر دی تھی۔ چنانچہ دودھ پلاتے پلاتے ہی یہ اپنی والدہ کے گلے میں پڑے ہوئے گہنے غائب کر دیتے۔ اس کے بعد انہیں چوٹا اچکا، لفنگا، ڈاکو وغیرہ کے خطابات ملنے شروع ہو گئے اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ پچھلے دنوں پھانسی تک کا حکم سنا دیا گیا۔ ہمیں ڈر یہ تھا کہ کہیں یہ ہمیں چھوڑ کر چلے ہی نہ جائیں مگر شکر ہے خدا کا کہ ان کے وکیل نے سخت جانفشانی کے بعد انہیں صاف بچا لیا۔ اس سلسلے میں قابل ذکر بات یہ کہ وکیل کی خدمات سے خوش ہو کر جو پچاس ہزار روپے وکیل کو انعام دیئے گئے وہ خود اسی وکیل کا گھر پھوڑ کر حاصل کئے گئے تھے (تالیاں)

اس کے بعد چند قراردادیں پیش کی گئیں جو متفقہ رائے سے پاس ہو گئیں۔

۱۔ ہر سال چوروں کے اجلاس ہی کے ساتھ چوری میں معاون ہتھیاروں اور اوزاروں کی ایک نمائش بھی منعقد کی جائے گی۔

۲۔ چوروں کو گھر مالکوں کے ہتھیار استعمال کرنے کا ہر وقت دھڑکا سا لگا رہتا ہے بعض اوقات جانی نقصان بھی ہوتا ہے مگر سرکار نے ہتھیاروں کا قاعدہ بنا کر یہ دھڑکا دور کر دیا۔ اسکے لئے سرکار کے تہہ دل سے شکر گذار ہیں۔

۳۔ ڈاکہ زنی کے بعض مواقع پر اس مجلس کے اراکین پر گاؤں والے اجتماعی پتھراؤ کرتے ہیں۔ اس نیچ حرکت کی سخت مذمت کی جاتی ہے۔

۴۔ میونسپلٹی کی قندیلوں کی وجہ سے اندھیری راتوں میں بدکار عناصر کو روپوشی اختیار کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ریل گاڑی کی بوگیوں سے گزرتے وقت ڈبے میں بھر جانے والی دھند میں آگ لگ جانے کا خدشہ ہوتا ہے لہٰذا بلدیہ اور ریلوے کمپنی والوں سے درخواست کی جاتی ہے کہ ان اوقات میں دیئے بند کر دیئے جائیں۔

۵۔ اس جلسے کا ایک مقصد چونکہ سودیشی تحریک کو تقویت پہونچانا بھی ہے لہٰذا چوری کے لئے سودیشی ہتھیار ہی استعمال کئے جانے چاہیئے۔ اسی طرح چوری بھی اپنے دیش واسیوں ہی کی جائے نیز سودیشی اشیاء ہی پر ہاتھ صاف کیا جائے۔ پردیسی اشیاء کا مکمل بائیکاٹ کیا جائے۔

۶۔ چوروں اور ادیبوں و شاعروں کے اجلاس مشترکہ طور پر منعقد کئے جائیں۔

۷۔ دیہاتوں قصبوں میں پولیس کی تعداد میں کمی کفایت شعاری کے لحاظ سے سودمند ہوگی، اسی طرح جگہ

نوٹوں کا چلن بند کرنا معاشیاتی نقطۂ نظر سے مفید ہے یا کم از کم ان نوٹوں پر نمبرات نہ ڈالے جائیں سرکار سے اس طرح کی درخواست کی جائے۔

۸۔ اس مجلس کے امیدوار بننے کے خواہشمند کے لئے کم از کم دس گھروں کی چوری کا سرٹیفکیٹ گھر مالکان سے حاصل کر کے درخواست کے ساتھ منسلک کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح صدارت کے امیدوار شخص کے لئے کم از کم یک بار پھانسی پر لٹکنا ضروری ہے۔

اسی طرح کی چند قراردادوں کے پاس ہونے کے بعد یہ مجلس برخاست ہوگئی۔

اگلے دن مہمانوں کو سرحد تک رخصت کرنے ہم لوگ بھی گئے۔ ہر مہمان جیب یا بغل میں کچھ نہ کچھ چھپایا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ رخصتی معانقہ کے دوران بہت سوں کے جسم سے مالِ مسروقہ گر پڑا تب نہ جانے ہمارے یا اس مال کے فراق میں ان کے گلے بھر آئے۔ اب ان لوگوں سے دوبارہ ملاقات کی امید نہ تھی۔ چنانچہ ہم بھرے دل اور ہلکی جیبوں سے اپنے گھر لوٹ آئے۔

نعمان ہاشمی

(خاکہ)

ڈاکٹر وہاب اشرفی

کئی سال پہلے کی بات ہے کہ ہفتہ وار "مورچہ" گیا کے دفتر میں میں افسانہ نگار برادرم محمود واجد (جو اِن دنوں کراچی میں مقیم ہیں) سے ملنے گیا۔ وہیں جناب کلام حیدری، مدیر آہنگ و "مورچہ" جناب تاج انور اور جناب ڈاکٹر وہاب اشرفی بھی موجود تھے۔ ڈاکٹر وہاب اشرفی اُن دنوں پیٹ کے مرض سے بہت پریشان تھے، میں نے جب اُن کی مزاج پُرسی کی تو مسکرا کر بولے "اب لگتا ہے میرے جانے کا وقت قریب آگیا ہے۔ آپ مجھ پر مضمون لکھنا شروع کر دیجئے۔" اس وقت ان کی بات سن کر مجھے بڑا دکھ ہوا۔ میں نے کہا "آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں۔ بیماری کا موت سے کیا تعلق خدا نے چاہا تو آپ جلد صحت یاب ہو جائیں گے۔" اور واقعی وہ اللہ کے فضل و کرم سے صحت یاب ہو گئے۔ اب کئی برسوں بعد اچانک مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ وہاب اشرفی صاحب تو اب مستقبل قریب میں مرتے نظر نہیں آتے (خدا اُن کی عمر دراز کرے) لیکن اگر میں ہی ان سے قبل اس دارِ فانی سے چل بسا تو اُن کی خواہش کا کیا ہوگا۔ لہٰذا میں نے یہی بہتر سمجھا کہ ان کی موت کے بعد کی خواہش ان کی زندگی میں اور اپنی موت سے پہلے ہی پوری کر دوں تاکہ حشر میں انہیں منہ دکھا سکوں۔ ویسے یہ بھی اندیشہ

ہے کہ پتا نہیں وہ اس مضمون کو پڑھنے کے بعد میرا منہ دیکھنا بھی پسند کریں گے یا نہیں، بہرکیف ردِعمل کا تصور قبل از عمل کرنا اہلِ قلم کا دستور نہیں۔

ڈاکٹر وہاب اشرفی کا آبائی مکان گیا ضلع کے ایک قصبہ "بی بی پور" میں ہے۔ کب، کس مکان میں کس روز اور اُس وقت کس بُرج میں کون سے ستارے تھے۔ یہ سب محققین کے لئے چھوڑ رہا ہوں جوانی کا زیادہ تر حصہ کلکتہ میں گذرا (ویسے وہ اب بھی جوان ہی کہے جائیں گے) کلکتہ جس کی مثال امرتا سے دی جاسکتی ہے، مشکل سے ہی اپنے پہلو میں آئے ہوئے انسانوں کو نجات دیتی ہے، لیکن خدا کا شکر ہے کہ وہاب اشرفی کسی طرح اُس کے شکنجے سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ اور اُس کامیابی نے اُن کے ہاتھوں میں قسمت کی چابی عطا کر دی۔ پھر کیا تھا وہ یکے بعد دیگرے اپنی قسمت کے بند دروازے کھولتے چلے گئے۔ اس میں پہلا دروازہ ایل آئی سی (L.I.C.) کا تھا، دوسرا گیا کالج میں لکچررشپ کا اور تیسرا مگدھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کا، طلباء اُن کی آمد سے بہت نہال ہوئے لیکن یہ خود خوش حال نہ ہوسکے۔ لہٰذا ایک چھلانگ اور لگائی اور رانچی یونیورسٹی میں ریڈر کی جگہ پائی ان دنوں یہ اسی عہدہ پر فائز ہیں۔ طلباء ان کی تحریر و تقریر سے مستفیض ہو رہے ہیں اور ہم عصر بھی نکھار رہے ہیں۔

ڈاکٹر وہاب اشرفی، لوٹا سا قد، موٹا سا جسم اور لوٹا سا سر کے ساتھ پُراثر شخصیت کے مالک ہیں۔ آپ کو شاید لوٹا سا سر پر کوئی اعتراض ہو، مگر میرا خیال یہ ہے کہ ایک وسیع المطالعہ اور ہمہ گیر نقاد کے سر کی تمثیل لوٹے سے بہتر نہیں ہو سکتی۔ لوٹے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اسے سمندر سے لیکر بالٹی تک کسی میں چاہئے ڈبو کر پانی بھر لیجئے اور پھر اسی رفتار سے جہاں جس جگہ چاہئے ڈبو کر پانی انڈیل دیجئے۔ لوٹے کی یہی افادیت اُسے بدھنے سے مختلف ہی نہیں بلکہ برتر بنا دیتی ہے۔ بدھنے میں پانی ڈالنے اور پھر اسے استعمال کرنے کے دو مختلف دہانے ہوتے ہیں۔ پانی نکلنے کا دہانہ جسے عرفِ عام میں ٹونٹی کہتے ہیں اس قدر تنگ ہوتا ہے کہ پانی گرانے والا اس کی سُست رفتاری سے تنگ آجاتا ہے اور جس کے لئے پانی گرایا جاتا ہے وہ بھی سیراب نہیں ہو پاتا ہے۔ لیکن سب سے نمایاں مماثلت جو لوٹے اور نقاد کے سر میں ہے وہ پیندے کے گول ہونے میں ہے۔ جس طرح لوٹا اپنے گول پیندے کی وجہ سے وقت اور مصلحت کے تحت اپنی جہت بدلتا رہتا ہے۔ اسی طرح نقاد میں بھی یہ تبدیلی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ لہٰذا میری حقیر رائے تو یہی ہے کہ نہ صرف وہاب اشرفی بلکہ ہر نقاد کے سر کی مثال اگر لوٹے سے دی جائے تو غلط نہ ہو۔

وہاب اشرفی یوں تو نہ بہت ہی موٹے ہیں اور نہ ہی بہت ناٹے، لیکن دونوں کی تھوڑی تھوڑی مقدار یکجا ہو جانے سے وہ موٹے بھی نظر آتے ہیں۔ اور ناٹے بھی ــ ہاں یہ کہنا ضرور مشکل ہے کہ آیا وہ موٹے ہونے کی وجہ سے ناٹے نظر آتے ہیں یا ناٹے ہونے کی وجہ سے موٹے۔

وہاب اشرفی کا رنگ مدھم گندمی ہے۔ سر کے بال جھڑ جانے میں فیاض لیکن چہرہ داڑھی مونچھ سے

بے نیاز، بال گردن پر وبال بن کر لٹکا رہتا ہے۔ مانگ قریب قریب بیچ سے نکالتے ہیں۔ جس سے ان کے نازک طبع اور چابک دست ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ اُن کے حافظے اور ہاضمے دونوں بہت مضبوط ہیں۔ اسی لئے وہ پڑھنے اور کھانے کی رفتار و مقدار میں کسی سے پیچھے نہیں رہتے ہیں۔ بس فرق صرف اسی قدر ہے کہ وہ جو پڑھتے ہیں۔ کبھی نہیں بھولتے اور جو کھاتے ہیں۔ وہ کبھی یاد نہیں رکھتے۔

دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرنے والے یہ نقاد اپنے احباب میں شیر و شکر ہو کر مل جاتے ہیں۔ دل کھول کر ہنستے اور ہنساتے ہیں جب ہنسنے لگتے ہیں۔ تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے پورا جسم ہنس رہا ہو۔ پورے بدن میں ایک زلزلہ سا آجاتا ہے۔ اس وقت جناب وہاب نظر آتے ہیں۔ وہاب اشرفی بھی اسی طرح نقاد بنے ہیں۔ جس طرح اردو کے اور بہت سارے نقاد اور جن کے متعلق میرا ہی ایک قطعہ ہے۔

ناکامیاں بھی باعثِ شہرت ہوئیں جناب
مجنوں کوئی ہوا کوئی فرہاد بن گیا
لیکن ہوا ہے شہرِ ادب میں یہ سانحہ
شاعر بگڑ گیا تو وہ نقاد بن گیا

اوپر کے قطعہ سے آپ کو یہ اندازہ تو لگ ہی گیا ہوگا کہ وہاب اشرفی بھی عنفوانِ شباب میں شاعری کیا کرتے تھے۔ لیکن شاعری کی کیاری انہیں زیادہ پیاری نہیں لگی اور وہ افسانہ نگاری کی طرف مائل ہوگئے اور بحیثیت افسانہ نگار بہت مقبول بھی رہے۔ لیکن پھر نہ جانے کیوں اس قدر ملول ہوئے کہ افسانہ نگاری کے میدان سے اچانک تنقید کے اکھاڑے میں کود پڑے اور کودتے ہی لوگوں کو پچھاڑنا شروع کر دیا۔ جو بھی سامنے آیا۔ وہ کام سے گیا۔ تنقید کے اکھاڑے میں تو "فری اسٹائل" کشتی چلتی ہے۔ پھر کیا تھا نحیف، ضعیف، صاحبِ فنِ لطیف یا صاحبِ فنِ کثیف (فنِ کثیف سے مراد تنقید ہے) جو بھی ہاتھ لگا اُسے رگڑتے چلے گئے۔ اگر آپ کو یقین نہ آئے تو ان کے مطالعہ کے کمرہ میں تشریف لے چلئے۔ ڈھیر سارے فنکار اپنے مجموعے کی شکل میں نظر آئیں گے۔ کئی کے پیٹ کھلے ہیں اور جا بجا نشتر لگے ہیں۔ کسی کے بازو میں سرخ پٹی لگی ہے تو کوئی ٹخنے کو سہلا رہا ہے۔ جدید فنکار یا تو ٹیبل پر دست بستہ کھڑا ہے یا سرہانے تکیہ کی خوشبو سے خود کو معطر کر رہا ہے۔ لیکن کلاسیکی فنکار یا تو ورد کرنے والی میز پر ڈبکا دم سادھے کھڑا ہے یا پھر بستر کے نیچے دبا اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہا ہے، جیسے رنگ میں گرا ہوا پہلوان ریفری کی گنتی سن رہا ہو۔ اُن سب کے درمیان وہاب اشرفی سگریٹ کے دھوئیں کو منہ سے اس طرح پھینکتے نظر آتے ہیں جس طرح ایک میل گاڑی کے انجن سے بھک بھک کرتا دھواں نکلتا ہے۔ الغرض عجیب شکست و ریخت کا پُرہول ماحول نظر آتا ہے اور یہ کہنا

کوئی شاعر ہو کہ نثار کہ افسانہ نگار
جو تری بزم سے نکلا وہ پریشاں نکلا

وہاب اشرفی بہت حد تک دوسرے نقادوں سے مختلف ہیں۔ اُردو کے زیادہ تر نقاد خشک مزاج اور جلاد صفت

واقع ہوئے ہیں۔ لیکن وہاب اشرفی خوش مزاج اور فولاد صفت ہیں۔ اُردو کے دوسرے نقاد کسی نہ کسی ازم کے شکار ہیں لیکن وہاب اشرفی نے اب تک خود کو کسی 'ازم' کے لیبل سے بچا رکھا ہے۔ اُردو کے سبھی نقاد بال کی کھال تو اُتار دیتے ہیں، لیکن وہاب اشرفی اُس کھال میں پھر بال اُگانے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔

—— **

فارم ۴

(قاعدہ ۸)

۱۔ مقام اشاعت : ۳۱۔ مجردگاہ۔ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۱
۲۔ وقفۂ اشاعت : ماہوار
۳۔ پرنٹر کا نام : سید مصطفیٰ کمال
پتہ : ۶-۷۶۸-۱۷، دبیرپورہ۔ حیدرآباد
۴۔ پبلشر کا نام : سید مصطفیٰ کمال
پتہ : ۶-۷۶۸-۱۷، دبیرپورہ حیدرآباد
۵۔ ایڈیٹر کا نام : سید مصطفیٰ کمال
پتہ : ۶-۷۶۸-۱۷، دبیرپورہ۔ حیدرآباد
۶۔ مالک کا نام : قیصر کمال
پتہ : ۶-۷۶۸-۱۷، دبیرپورہ حیدرآباد

میں سید مصطفیٰ کمال تصدیق کرتا ہوں کہ میرے علم و یقین کے مطابق مندرجہ بالا معلومات صحیح ہیں۔

سید مصطفیٰ کمال
۲۷ فروری ۱۹۸۲ء

راز و نیاز

فرحت قمر (دہلی)

ہم نے اک روز یہ طنزاً اپنی بیگم سے کہا
"زر کمانا نہیں آسان مگر جانِ جہاں!
نوٹ پر نوٹ بھناؤ تمہیں ڈر کس کا ہے
پر یہ کس کا ہے مری جان، یہ زر کس کا ہے؟"

وہ یہ سمجھیں کہ یہ ہے پیار تو نخرے سے کہا
"مکھیاں شہد جمع کرتی ہیں ملکہ کے لئے!
تم کماؤ کہ کمانے کے لئے آئے ہو
ہم اڑائیں گے، اڑانے کے لئے آئے ہیں
خرچ سے روک سکے ہم کو، جگر کس کا ہے؟
جانتے ہو مرے سرتاج یہ گھر کس کا ہے؟"

* * *

میرے ــــ پیارے

* یوسف یکتا

تو رو رو کے سب کو ہنسا میرے پیارے
تماشہ نیا کچھ دِکھا میرے پیارے

ہتھیلی میں جنّت دِکھا میرے پیارے
چوَنّی کی بس ہے، چِلا میرے پیارے

اُجالے سے پہلے پہونچنا ہے گھر کو
قدم جلدی جلدی بڑھا میرے پیارے

بجائے گا کب تک یہ دھچڑا پُرانا
نئی اب ڈفلی بجا میرے پیارے

ہو سرپٹ کہ بھاٹ، پاگل، بھلا واں
تو اِن سب پہ سکّہ جما میرے پیارے

ـــــ ◆ ـــــ

غزل

سراج نوملی

بیویوں کے ناز اُٹھائیں ہم سے بن پڑتا نہیں
تیسری شادی رچائیں ہم سے بن پڑتا نہیں

خود پئیں تم کو پلائیں ہم سے بن پڑتا نہیں
مچھلیاں تل تل کے لائیں ہم سے بن پڑتا نہیں

لائیے تحفے تحائف شوق سے پھر آئیے
مُفت دعوت میں بُلائیں ہم سے بن پڑتا نہیں

گھومتے پھرتے رہیں، یوں ہی سدا، بیگم ترے
آگے پیچھے دائیں بائیں ہم سے بن پڑتا نہیں

چھوڑ کر مُرغ اور ماہی، کوفتے شامی کباب
صرف، غم، جھٹکا کھائیں ہم سے بن پڑتا نہیں

دال روٹی جو بھی ہے، حاضر کریں گے ہم فقط
مُرغ بریانی کھلائیں ہم سے بن پڑتا نہیں

تم غزل لکھ کر اگر دو تو سُنائیں گے سراج
خود ہی لکھیں اور سُنائیں ہم سے بن پڑتا نہیں

(تبصرہ)

"نقار خانہ میں"

(مزاحیہ مضامین کا مجموعہ)

مصنف : عبدالقادر ادیب

تبصرہ نگار : رؤف خوشتر

⁂

طنز و مزاح کی تاریخ میں حیدرآباد کا ایک اہم مقام ہے۔ چنانچہ طنز و مزاح کو زندہ دلانِ حیدرآباد کے پلیٹ فارم کے توسط سے ہندوستان گیر پذیرائی حاصل ہوئی اور اِس کے زیر اثر طنز و مزاح نگاروں کی ایک اچھی ٹیم نکل آئی۔ جن کی گراں قدر تحریروں نے اس صنفِ ادب کو بامِ شہرت پر پہنچایا۔ زندہ دلانِ حیدرآباد سے متاثر ہو کر ہندوستان بھر میں اس صنفِ ادب کی طرف توجہ کی جانے لگی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو لوگ اِس صنف کو دوسرے درجہ کا ادب تصور کرتے تھے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھنے پر مجبور ہو گئے۔

اِسی طنز و مزاح نے اپنے جادو سے کئی قلمکاروں کو اپنے دام میں گرفتار کر لیا۔ اس کی تازہ مثال جانے پہچانے شاعر جناب عبدالقادر ادیب ہیں۔ جو اِس وادیٔ پُرخار میں آبدپا ہیں۔ ان کے انشائیوں کا مجموعہ "نقار خانے میں" بڑے اہتمام کے ساتھ منظرِ عام پر آگیا ہے۔ طنز و مزاح کی وادی میں یہ ایک نئی آہٹ ہے۔ موجودہ زمانہ کی ناہمواریوں، کمزوریوں اور دشواریوں کو ہم طنز و مزاح سے زیادہ بہتر مؤثر اور حقیقی انداز میں کسی دوسری صنف میں پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ ایک ایسا آلہ ہے جس کے ذریعہ آپ نہ صرف سماج کے ناسور اور جراثیم دریافت کر سکتے ہیں بلکہ مرہم بھی ڈھونڈ لیا جا سکتا ہے۔ ادیبؔ اپنی تحریر کو حشو و زوائد سے پاک رکھنے میں بڑی حد تک کامیاب ہو گئے ہیں۔ مضمون مختصر، لب و لہجہ تازہ، شگفتہ اور چوٹ کہیں کہیں گہری اور کاری۔

ادیبؔ نے موضوعات میں تنوع کا بھی خیال رکھا ہے۔ کبھی وہ "علی بابا چالیس چور" جیسے افسانوی کرداروں پر حال کے تناظر میں بڑی علامتی معنویت کے ساتھ ساتھ موجودہ سیاسی و معاشی لوٹ کھسوٹ بتلاتے ہیں۔ "اندھوں میں کانا راجہ" جیسے انشائیہ کے توسط سے موجودہ فیشن پرستی اور مغرب زدگی کا عمدگی سے نقشہ کھینچتے ہوئے اُس کے تاریک پہلوؤں کو ہم پر روشن کرتے ہیں۔ ادیبؔ کے انشائیوں میں اُردو کی کسمپرسی کا درد بھی جھلکتا ہے جیسے وہ اپنے انشائیہ "طوطے کی زبانی" میں اُردو کی بے زبانی سناتے ہیں۔ "انجمن آرائی سے معرکہ آرائی تک" "مشاعرہ" اور "یہ بھی فن ہے مشاعرے لوٹنا" کا موضوع ملتا جلتا ہے۔ پھر بھی اپنے مخصوص اندازِ بیان کی وجہ سے یہ انشائیے بھی قاری پر اپنا اثر چھوڑتے ہیں۔ انہوں نے اُن شاعروں پر بھرپور طنز کیا ہے جو اپنے فن سے زیادہ سیاسی داؤ پیچ پر قدرت رکھتے ہیں۔ سیاسی گٹھ جوڑ سے مشاعرے منعقد کر کے انعامات اور اعزازات پاتے ہیں۔

"نقار خانہ میں" تصنیف طنز و مزاح میں ایک خوشگوار اضافہ ہے اور انہوں نے اُردو ادب کے دامن پر طنز و مزاح کے گل و بوٹے بڑے مؤثر انداز میں سجائے ہیں۔

بلاعنوان (تبصرہ)

محبوب راہی
ایم اے ریسرچ اسکالر

مصنف: شیخ رحمٰن اکولوی صفحات: ایک سو
سائز: ڈیمائی قیمت: دس روپے

یہ کسی فلمی رسالے کی کہانی نہیں جس کے لئے ایک یا زیادہ سے زیادہ تین موزوں یا غیر موزوں عنوانات تجویز کر کے آپ مجوزہ انعام کے حصول کی تگ ودو میں اپنی جان کھپائیں بلکہ اکولہ (مہاراشٹر) کے ہونہار طنز و مزاح نگار شیخ رحمٰن اکولوی کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کے مجموعے کا عنوان ہے۔ اپنی اس کتاب کو شیخ صاحب نے غالباً اس لئے بلاعنوان رکھا ہے کہ یوں بھی اس دور میں کون سی چیز اپنے عنوان کے محور سے مربوط ہے؟ کوئی مقالہ' کوئی کہانی' کوئی نظم پڑھیے' عنوان پر نظر ڈالئے اور دونوں کے مابین کوئی رشتہ ثابت کرنے کے لئے گھنٹوں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہ جایئے۔ عنوان ہوگا "چمگاڈر چیختی ہے" اور مواد میں یہ ثابت کرنے کیلئے کہ تا منگیشکر کی خوش الحانی بلبل کی خوش نوائی سے اکتساب ہے یا کوئل کی کوک سے دلائل کا طومار باندھا جائے گا۔ عنوان سے اس قسم کے کھلواڑ کو بدعنوانی کہا جاتا ہے۔ شکر ہے کہ رحمٰن صاحب کی بلاعنوانی نے انہیں بدعنوانی سے بچا لیا۔ ویسے "بلاعنوان" اسی کتاب میں شامل ان کے ایک مضمون کا عنوان بھی ہے جس میں اس عنوان پر دلچسپ انداز میں حاشیہ آرائی کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے

وہ تخلیقات جنہیں تخلیق کار موزوں عنوان دینے سے قاصر ہوتے ہیں بلاعنوان شائع ہوتی ہیں۔ مقدمے کے تحت یوسف ناظم رقمطراز ہیں "عنوان کوئی دعوت نامہ نہیں اور نہ کوئی درخواست ہے کہ آپ اس کتاب کا نام تجویز فرمائیں۔ اگر کوئی احمد شریف اپنے فرزند دلبند کا نام اسم شریف رکھ دیں تو آپ ان کا کیا بگاڑ لیں گے۔" اور فکر تونسوی نے تحریر فرمایا ہے۔
"ہمارا اگر دور پیش بدعنوان ہے۔ آپ بلاعنوان ہیں گویا یہ بدعنوان اور بلاعنوان کی جنگ ہے۔ خدا کرے اور آپ بھی کریں کہ ایک بلاعنوان ہزاروں بدعنوانوں کے ساتھ نکتہ آفرینی کی یہ جنگ جاری رکھے۔"

تبصرہ کا آغاز ہمیں اس طرح کرنا چاہئے تھا کہ یہ کتاب مہاراشٹرا اردو اکیڈمی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے ڈیمائی سائز میں ہے۔ انتساب ان کی بیگم فرحت رحمٰن کے نام ہے جو بقول ان کے ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو بنئے کا بل دکھا کر انہیں تصوراتی دنیا سے حقیقی دنیا میں لے آتی ہے اور یہ کہ پورے ایک سو صفحات کو مذکورہ بالا دنیائے طنز و مزاح کے ہمالیاؤں کے مقدموں اور رایوں سمیت رحمٰن اکولوی کے ایک بلاعنوان اور ایک درجن عنوان زدہ مضامین اور خاکوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ جن میں کبھی تو بھیا ان کی قلم کی زد میں آگئی ہے تو کبھی وہ خود فوٹو کھنچانے کے لئے اپنی مضحکہ خیز پوزیشن میں کیمرے کی زد پر دکھائی دیتے ہیں۔ کہیں وہ اپنی فرضی موت کا سوانگ رچا کر کئی ان کہی باتیں کہہ گئے ہیں تو کہیں مہمان اور میزبان کے عبرت انگیز تعلقات کا بیان انتہائی رقت آمیز الفاظ میں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اپنی بیکاری کے دنوں کے دلچسپ مشاغل کچھ اس سنجیدگی سے مناتے ہیں کہ بے ساختہ ہنسی چھوٹ جاتی ہے۔ اپنے شہر اکولہ کے جغرافیائی' تہذیبی اور ثقافتی حالات انہوں نے کچھ ایسے

دلچسپ اور اچھوتے انداز میں کئے ہیں کہ اس کا پڑھنے والا ایک بار اکولکر کی میر کے لئے اپنے دل میں گدگدی محسوس کرے گا۔ دودھ' 'مونچھیں' 'سلام' اور شادی ہے' جس کا نام ان معمولی عنوانات پر کچھ وہ انکشافات کئے ہیں کہ لگتا ہے یہ تمام موضوعات انہوں نے پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھنے کے لئے کسی یونیورسٹی سے رجسٹرڈ کر رکھے ہیں۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے میں بھی ایک انکشاف کرتا چلوں۔

بات ہے اکولکر کے ہونہار اور مشہور معروف مصور شکیل اعجاز کی' جنہوں نے سینکڑوں تصویریں پورٹریٹ اور ڈیزائن بنا کر دنیائے مصوری میں نیکنامی اپنے نام لکھوائی ہے۔ بیسیوں کتابوں کے سرورق بنا کر جو اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کے انمٹ نقوش دلوں پر ثبت کر چکے ہیں۔ حُسنِ اتفاق سے یہ صاحب شیخ رحمن اکولکری کے انگریزی میں "Brother in Law" اردو میں برادرِ نسبتی اور تکلف برطرف سالے ہوا کرتے ہیں۔ اب یہ بتانے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کہ شکیل اعجاز نے نہ صرف یہ کہ بلا عنوان کا سرورق بنانے میں اپنی فنکارانہ مہارت کے ساتھ ساتھ برادرانہ نسبت کا بھی بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ بلکہ اندرونی صفحات پر ہر مضمون سے مطابقت رکھتے ہوئے بیحد خوبصورت خاکے بنا کر ان کی معنویت کو مزید اجاگر کر دیا ہے۔ شیخ رحمن اکولوی نے بھی اپنے آپ کو ایک خوددار بہنوئی ثابت کرتے ہوئے ایک سالم مضمون "رنگوں کا جادوگر" لکھ کر حق ادا کر دیا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ مجھے بھی پوری کتاب میں سب سے پیارا ان کا یہی مضمون لگا۔ کیوں نہ ہو۔ رحمن صاحب کی فنکارانہ چابکدستی ظریفانہ شگفتگی اور زبان و بیان کی مہارت کی

کچھ اور مثالیں قارئین کی تفریح طبع کے لئے پیش خدمت ہیں۔ لطف اندوز ہوئیے اور دعا دیجئے اس ہونہار کو درازیٔ عمر کی۔ "دودھ کی سفید رنگت بڑی وسیع القلب ہے میونسپلٹی کے گدلے پانی کو اپنے اندر سمو لیتی ہے۔"

"لوگ شاعر کو اس کے کلام پر کم سلام پر زیادہ داد دیتے ہیں۔"

شوہر کی مثال اس گھوڑے کی سی ہے جسے پہلے گھڑسواری اور بعد میں بار برداری کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔"

مونچھیں یوں تو مردانہ وقار کی علامت ہیں لیکن اگر بیوی انہیں اپنے وقار کا مسئلہ بنالے تو شوہر کو اپنی مونچھیں ہمیشہ کے لئے نیچی کر لینی پڑتی ہیں۔

چائے کبھی کبھی بطور رشوت بھی استعمال کی جاتی ہے۔

بلا عنوان میں ایسے پُرلطف جملے ایک ہزار مل جائیں گے شیخ رحمن اکولوی کا نام ان لوگوں کے لئے بھلے ہی اجنبی ہو جن کے لئے اخبارات و رسائل شجر ممنوعہ ہیں' ورنہ ادب کے قارئین کے لئے یہ نام خاصا جانا پہچانا ہے شاعر' تحریک' گلفشاں' شگوفہ' ہما ڈائجسٹ اور بمبئی کے روزناموں میں وہ اپنے قہقہہ بردار مضامین کے ذریعے نئے دن کھلکھلاتے رہتے ہیں۔

دیکھنے میں بے حد کم سن اور بے ضرر لگتے ہیں لیکن باتوں ہی باتوں میں کچھ ایسی چٹکیاں بھرتے رہتے ہیں کہ مد مقابل اندر ہی اندر تلملا کر رہ جاتا ہے۔ ان کی تحریروں میں خوشگوار طنز زیادہ اور مزاح کا پھکڑ پن کم ہے۔ ان کا مزاح جھرنوں اور آبشاروں کا بے ہنگم شور پیدا نہیں کرتا۔ پر سکون جھیل یا ساکت سمندر پر ہوا کے جھونکوں سے جو ایک ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ وہی کیفیت ان کی تحریروں میں لطیف طنز کی ہوتی ہے۔ ہنستا ہنساتا اس کرب و ابتلا کے دور میں

ایک نعمت سے کم نہیں اور شیخ رحمٰن یہ انمول اور
کمیاب نعمت بڑی فراخدلی سے لٹا رہے ہیں۔ یہ
سعادت سب کو کہاں نصیب ہوتی ہے۔

کچھ لوگ ان کے مضامین میں فکر تونسوی کے
رنگ کی جھلک محسوس کرتے ہیں تو کچھ کو
مجتبیٰ حسین کے طرز کا عکس دکھائی دیتا ہے
کچھ یوسف ناظم کا انداز بتاتے ہیں تو کچھ کنہیا لال کپور
اور رشید احمد صدیقی کے رنگ و آہنگ کا شائبہ ہونے
کا انکشاف کرتے ہیں۔ لوگوں کی تو عادت ہی ہے
اصل کو نقل اور نقل کو اصل کا روپ دینے کی۔
ورنہ واقعہ یہ ہے کہ رحمٰن اکولوی کا طرز ان کا اپنا ہے
ان کی تحریروں میں ادبی چلبلی ہے۔ اکولہ اور ودربھ کے لئے ان کا
وجود غنیمت ہے کہ اس علاقہ نے بہتیرے نامور شاعر تو پیدا کئے ہیں
لیکن نثر نگار اور بالخصوص طنز و مزاح نگار اس ڈھب کا
یہاں ابھی تک نہیں ملتا۔ شیخ رحمٰن اکولوی سے توقع ہو چلی
ہے کہ بہت جلد ہندوستان کے ادبی نقشہ پر ان کے نام کے
ساتھ اکولہ ایک روشن نقطہ کی مانند جگمگائے گا۔

ہنسی صحت کے لئے وٹامن سے زیادہ تقویت بخش ہے
اور وٹامن کا یہ ضخیم پیکٹ "بلا عنوان" ماہنامہ شگوفہ
حیدرآباد، حنیف بکڈپو، مومن پورہ ناگپور، مکتبہ جامعہ
لمیٹڈ نئی دہلی اور جاوید عزیزی بک سیلر مومن پورہ اکولہ
سے صرف دس روپے بھیج کر حاصل کیا جا سکتا ہے۔

خرافات

(مراسلے)

- سالنامہ وصول ہوا۔ کافی شاندار رہا۔ تقریباً سارے کے سارے مضامین بہت اچھے رہے۔ "سینما اسکوپ قوالی" اور "میرے دل کو جلایا جی ماسٹی ملا" بہت پسند آئے۔ میری طرف سے تمام قلمکاروں کو اور عزیز کارٹونسٹ کو بہت مبارکباد دیں۔ اُمید کرتا ہوں کہ شگوفہ اسی طرح اور نکھرتا جائے گا۔

انیس احمد، دوحہ (قطر)

* * *

- سالنامہ، سالنامہ سے زیادہ عزیز نامہ ہے۔ عزیز صاحب کا آرٹ خوب ہے۔ آپ کی قدر و منزلت مرغوب ہے۔ اُستاد محترم جناب واہی صاحب نے شعرستان میں طوالت و وسعت عطا کرکے طنزیہ مزاحیہ ادب کو فیض پہنچایا ہے۔ فکر تونسوی صاحب کی فکر کارآمد ہے۔ بقیہ تمام فنکار اپنی جگہ آفتاب ہیں اور آپ شگوفہ والے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ خدا کرے شگوفہ پھلتا پھولتا رہے۔

صابر بہاری۔ رانچی

* * *

- اتنا شاندار سالنامہ دیکھ کر اگر افسوس ہے تو اپنے آپ پہ۔ بہرحال اس شاندار پیشکش پر میری طرف سے مبارکباد قبول فرمائیں

عزیز صاحب کے کارٹونی خاکے برجستہ اور خوب ہیں۔ تصویر دیکھ کر کارٹون بنانا ان کا ہی کمال ہے۔ میری طرف سے ان کو مبارکباد پہنچا دیں۔

تمنا مظفرپوری

* * *

- سالنامہ بہت پسند آیا۔ آپ کی اور آپ کے معاونین کی عرق ریزی ہر صفحہ پر نظر آتی ہے۔ طالب خوندمیری صاحب کا خاکہ اور قطعات بھی بہت عمدہ ہیں۔ یوسف ناظم کے عناصر اربعہ، واہی صاحب کی نظمیں مجتبیٰ حسین کی آرام کرسی، خواجہ عبدالغفور کا سالِ نو، وجاہت علی سندیلوی کا مقدمہ نریندر لوتھر صاحب کی سیر سویرا۔ ہندر سنگھ کنور صاحب کا تلاشِ روزگار، مسیح انجم کا سری ہری، شفیقہ فرحت اور حبیب ضیا صاحبات کے خاکے خاصے پسند آئے۔ عزیز کارٹونسٹ کے تصویری خاکے تو اپنی جگہ مسلّم ہیں۔ محسنہ صاحب کلمپور تاثر اور پرویز یداللہ مہدی کے حساب دوستاں بھی پسند آئے۔ سبھوں کو خاکسار کی مبارکباد۔ فکر تونسوی کے خطوط بھی واقعی قابل ستائش ہیں۔

مختار یونس۔ مالیگاؤں

* * *

- ویسے شگوفہ کا عام شمارہ بھی اس معنی میں خاص ٹھہرا ہے کہ یہ مُردہ ادیبوں مردہ دلوں کو جینے کا حوصلہ بخشتا ہے جس کا آ کل فقدان سا ہے۔ دوسرے رسالے تو کو ذہنی دلدل میں پھنسا دیتے ہیں اور انہیں سرور و راحت عطا کرتا ہے۔ یہ ک کم انسانی خدمت ہے۔

رؤف خوشتر۔ گلبرگہ

* * *

- شگوفہ کے حالیہ شمارے میں اسداللہ کا مضمون "ودربھ میں طنز و مزاح" اس ا سے خاصی اہمیت کا حامل ہے کہ دنیائے طنز و مزاح میں ودربھ کے ادبا شعراء بلحاظ مواد و کمیت قابلِ ذکر تعد میں نمائندگی کر رہے ہیں اس واضح حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ آپ اس امر اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہندوستان کے طنز کے واحد رسالے "شگوفہ" میں ودربھ سے مصنف اور اسداللہ ناگپور سے ناظم انصاری اور اصغ انصاری، کھام گاؤں سے رفیق شاکر ا اکیلے اکولہ سے شیخ رحمٰن اکولوی (مصنف بلا عنوان) شکیل اعجاز، رحمت اللہ خان ایس ایس علی اور آپکا یہ خاکسار کئی با نمایاں طور پر چھپ چکے ہیں۔ اس لح سے ودربھ طنز و مزاح نگاروں کا اچھا خاصا گڑھ بن کر اُبھر رہا ہے۔ کاوشش یہ کثرت زندہ دلانِ ودربھ کی شکل میں تبدیل ہوجائے۔

محبوب راہی (مخلص فاروقی)

بارسی ٹاکلی۔ اکولہ

پھر ملیں گے اگر خدا لایا

اداریہ

● اُردو کے عظیم المرتبت شاعر جوشؔ اور فراقؔ ہم میں نہیں رہے۔ ان کے ساتھ ہی اُردو کا ایک زرّین عہد ختم ہوگیا۔ جوشؔ و فراقؔ دونوں نے طویل عمر پائی، ایک ہی زمانہ میں تقریباً یکساں حالات سے گزرے۔ شعر کی دنیا میں گم نہیں رہے بلکہ ملک و قوم، ادبی و سیاسی رجحانات سے رشتہ رکھا۔ عزت و شہرت کے اُونچے آسمانوں تک پہنچے۔ اور ختم ہوئے تو چند دن کے فرق سے۔ جوشؔ کے انتقال پر فراقؔ نے جن الفاظ میں تعزیت کی اور اپنی موت کی طرف اشارہ کیا اس سے ا ہوتا ہے کہ ان میں کس قدر یگانگت اور محبت تھی ــــ دونوں نے شعر و ادب کی اپنی اپنی سلطنت بنائی تھی جس کا کوئی قائم مقام نہیں ہوسکتا۔

● زندہ دلان حیدرآباد کی سالانہ تقاریب اپریل میں منعقد ہونے والی تھیں لیکن بعض ناگزیر وجوہات سبب اب یہ تقاریب اکتوبر ۸۲ء میں برپا ہوسکیں گی۔

● شگوفہ کے سالانہ خریداروں سے التماس ہے کہ مدتِ خریداری کے اختتام پر زرِ سالانہ ذریعہ منی آرڈر تجدید کروالیں۔ وی۔پی اخراجات میں اضافہ کی وجہ سے ادارہ کے لئے یہ ممکن نہیں رہا کہ پرچہ بذریعہ وی ارسال کرے

R. No. 1 ;822/68 Postal Regd. No. H.HD 6

SHUGOOFA

Vol. 15 Copy 3 31 Bachelor Quarters, M.J. Market, Hyderabad-1. March 1982 Phone : 57716

APRIL 19
Rs. 2

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ شگوفہ حیدرآباد

جلد (۱۵) ★ اپریل ۱۹۸۲ء ★ شمارہ (۴)

ایڈیٹر

سید مصطفیٰ کمالؔ

مجلسِ ادارت: حمایت اللہ ○ منظور احمد ○ مسیح انجمؔ

مجلسِ مشاورت

راجندر سنگھ بیدی ▬ بھارت چند کھنّہ

خواجہ عبدالغفور ▬ نریندر لوتھر ▬ مجتبیٰ حسین

مینجر: سمیع جلیل

منیجر اشتہارات: میر فاروق علی

قیمت فی پرچہ: ۲ روپے ۵۰ پیسے

زرِ سالانہ: انفرادی ۲۵ روپے، لائبریری ۳۰ روپے
بیرونِ ہند سے ۹۰ روپے

طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد ۲
بائنڈنگ: محمدیہ بک بائنڈنگ ورکس، حیدرآباد
کتابت: نعیم احمد - محمد غالب

خط و کتابت کا پتہ

شگوفہ، ۱۳/۳ مجرد گاہ، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱
PHONE 57716

اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

★ مال مفت (انشائیے)

کنھیا لال کپور

کانٹوں کا تاج

جب تک ہماری ملاقات پرنسپل بھٹناگر سے نہیں ہوئی تھی ہم سمجھتے تھے ڈگری کالج کا پرنسپل ہونا ایک بڑی سعادت یا خوش قسمتی ہے۔ انھوں نے ہمیں بتایا کہ ہم ایک مضحکہ خیز غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ سرد آہ بھر کر بولے۔ "صاحب پرنسپل کے عہدے پر نام بڑا اور درشن چھوٹے والی کہاوت صادق آتی ہے۔ سچ پوچھیے تو یہ عہدہ آپ کانٹوں کا تاج بن کر رہ گیا ہے۔۔!" وہ کیوں؟

"کیوں زمانہ قدیم کے عاشقوں کی طرح پرنسپل کو نہ دن کو چین اور نہ رات کو آرام نصیب ہوتا ہے۔"

وہ کیسے؟ ذرا اس کی وضاحت فرمادیجیے۔ "ایک پرائیویٹ کالج کے پرنسپل کا واسطہ کئی قسم کے اشخاص سے پڑتا ہے اور اسے بہت جلد محسوس ہونے لگتا ہے۔ قریب قریب ہر شخص اس کے درپئے آزار ہے۔ سب سے پہلے "سٹاف" کا نمبر آتا ہے یعنی ان برگزیدہ اشخاص کا جنھیں عرف عام میں پروفیسر کہا جاتا ہے۔ خدا کی یہ مخلوق صرف اس وقت تک خوش رہتی ہے جب تک پرنسپل اسے من مانی کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ اگر اسے ذرا بھی روکا ٹوکا جائے تو یہ خونخوار شیرنی کی طرح بپھر جاتی ہے۔ ان کا سب سے بڑا مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ اسے کبھی سخت سست نہ کہا جائے۔ نہیں تو وہ قیامت برپا کردے گی۔

فرض کیجیے کوئی پروفیسر ہر روز لیٹ آتا ہے اور ایک دن پرنسپل ہمت سے کام لے کر اس سے جواب طلب کرتا ہے تو اسے یہ کچھ سننا پڑتا ہے۔

"آپ خواہ مخواہ ناراض ہو رہے ہیں۔ ہم اگر آج صرف دو منٹ لیٹ ہو گئے تو کیا غضب ہو گیا۔ فلاں صاحب ہر روز دس منٹ لیٹ آتے ہیں۔ آپ نے ان کو تو کبھی کچھ نہیں کہا۔ وہ آپ کے منظور نظر جو ٹھہرے۔"

اور اگر کوئی پروفیسر اجازت لیے بغیر اپنا پیریڈ نہیں لیتا اور اسے دفتر میں طلب کیا جاتا ہے تو پھر گفتگو اس قسم کی ہوگی۔

"آپ نے تیسرا پیریڈ نہیں لیا۔؟"

"طبیعت ذرا ناساز تھی!"

"کیا بات ہے؟"

"درد ہوتا ہے۔"

"کہاں درد ہوتا ہے!"

یہ مضمون عرصہ قبل روزنامہ ہندسماچار کے کالم میں شائع ہوا تھا۔

"یہ پوچھیے کہاں نہیں ہوتا۔ پیٹ میں ہوتا ہے۔ گھٹنوں میں ہوتا ہے۔ جگر میں ہوتا ہے اور سر میں ہوتا ہے۔"

"آپ مجھے اطلاع تو دے دیتے۔ آپ پیریڈ نہیں لے رہے ہیں۔"

"صاحب" اتنی ہمت ہوتی تو ہم پیریڈ ہی نہ لے لیتے۔ درد سے تو جان پر بنی ہوئی تھی۔"

"آئندہ اجازت لے کر ہی پیریڈ چھوڑا کیجیے۔"

"آپ نے خوب یاد دلایا تو اگلے دو پیریڈ چھوڑنے کی اجازت دیجیے، کیونکہ درد بدستور ہو رہا ہے۔"

"وہ دفتر سے باہر جاتے ہوئے ایسی ایکٹنگ کرتے ہیں گویا درد سے ان کا برا حال ہو رہا ہے۔ مگر باہر نکلتے ہی اکڑ کر چلنے لگتے ہیں۔ جیسے دل ہی دل میں پرنسپل کا مذاق اڑاتے ہوئے کہہ رہے ہوں۔ اگر پیریڈ نہ لینے کی ہم نے جواب طلبی نہ کی جاتی تو ہم اگلے دو پیریڈ لے لیتے۔

اسٹاف کے بعد طلباء کا نمبر آتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب پرنسپل ان کے لیے ہوّا ہوا کرتا تھا۔ اب تو وہ پرنسپل کے لیے بنے ہوئے ہیں۔ خاص کر ایسے طلبا جو لیڈر کہلاتے ہیں ان خدا کے بندوں نے قسم کھا رکھی ہوتی ہے۔ کبھی پرنسپل کو چین نہ لینے دیں گے چنانچہ آئے دن وہ مطالبات کا چارٹر پیش کرتے رہتے ہیں۔ کالج واٹر کولر ہونا چاہیے۔ ہر ایک کمرہ میں تین کی بجائے چار پنکھے ہونے چاہئیں۔ فلاں پروفیسر فلاں کلاس کو پڑھا نہیں سکتا۔ اس کی بجائے فلاں پروفیسر ہونا چاہیے۔ اب پرنسپل انہیں لاکھ یقین دلائے ان کے جائز مطالبات جلد یا بدیر منظور کر لیے جائیں گے۔ وہ اصرار کرتے ہیں۔ فلاں تاریخ تک منظور کر لیے جائیں نہیں تو وہ ہڑتال کر دیں گے۔ یہ صرف دھمکی نہیں ہوتی۔ اس پر عمل بھی کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک صبح جب پرنسپل سو کر اٹھتا ہے۔ کالج کے آنگن کو گونجتا ہوا پاتا ہے اور یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ مطالبات کی تعداد جو شروع میں صرف چار تھی۔ اب چودہ ہو گئی ہے۔ اور سب سے پہلا مطالبہ یہ ہے کہ پرنسپل کو فوراً برخاست کیا جائے

طلباء کے علاوہ پرنسپل کا واسطہ منیجنگ کمیٹی اور شہریوں سے بھی پڑتا ہے۔ عام طور پر منیجنگ کمیٹی کا نقطۂ نظر یہ ہوتا ہے کہ کالج میں جو چیز بھی اچھی ہو رہی ہے اس کا کریڈٹ ہمیں ملنا چاہیے۔ اور جو بھی بری ہو رہی ہے اس کے لیے پرنسپل ذمہ دار ہے۔ منیجنگ کمیٹی کا تکیہ کلام ہوتا ہے "یہ سب پرنسپل کا قصور ہے۔" چنانچہ اگر کوئی غیر ذمہ دار سیاسی پارٹی طلباء کو اکسا کر کالج میں اسٹرائک کرا دیتی ہے تو یہ پرنسپل کا قصور ہے۔ اگر طلباء کی دو پارٹیوں میں لڑائی جھگڑا ہو جاتا ہے تو یہ پرنسپل کا قصور ہے۔ اور اگر منیجنگ کمیٹی کے کسی ممبر کو زکام ہو جاتا ہے تو یہ بھی پرنسپل کا قصور ہے۔

اب رہے شہری۔ خدا کو خوش کرنا آسان لیکن انہیں خوش کرنا مشکل ہے۔ یہ ہمیشہ عجیب و غریب فرمائشیں کرتے ہیں۔ ہمارے لڑکے کی ساری فیس معاف ہونی چاہیے۔ ہمارے بھانجے پر جو جرمانہ کیا گیا ہے وہ سراسر ناجائز ہے۔ ہمارے بھتیجے کا داخلہ خواہ مخواہ روکا جا رہا ہے اگر ان کی ایک آدھ بات نہ مانی جائے تو یہ پرنسپل کے خلاف جہاد کا فتویٰ دینے کے بعد اسے ذلیل و خوار کرنے کی مہم کا آغاز کر دیتے ہیں۔ صاحب یہ پرنسپل پہلے درجے کا نالائق ہے۔ جب سے اس نے چارج لیا ہے کالج تنزل کی طرف جا رہا ہے، کالج کو بچانے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اس کی بجائے کسی اور شخص کو پرنسپل مقرر کیا جائے۔ الغرض پرنسپل وہ بدقسمت شخص ہے جسے بیک وقت چومکھا لڑنا پڑتا ہے۔

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا اعصابی نظام تباہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ اکثر سوچتا ہے۔ خدا جانے میری عقل پر کیوں پردہ پڑ گیا تھا جو میں نے اس عہدے کو قبول کیا اور اسے ابراہیم لنکن کی وہ بات یاد آ جاتی ہے جو انہوں نے اس شخص کے سوال کے

جواب میں سنائی تھی جس نے ان سے دریافت کیا تھا کیا آپ پریذیڈنٹ کا عہدہ پسند کرتے ہیں۔ لنکن نے کہا تھا۔ ایک مرتبہ جنگل میں میں نے ایک شخص کو دیکھا۔ اس کے ننگے جسم پر کولتار مل کر پرندوں کے پر چپکائے گئے تھے اور وہ ایک گدھے پر سوار تھا۔ اس کے آگے بینڈ والے تھے۔ اور پیچھے لوگوں کا ہجوم تھا۔ لنکن کے پوچھنے پر اس نے کہا ان لوگوں نے مجھے اپنا پریذیڈنٹ منتخب کیا ہے۔ اور میری عزت افزائی کر رہے ہیں۔ لنکن نے پوچھا لیکن کیا تم اپنے عہدے کو پسند کرتے ہو۔ اس شخص نے مسکرا کر جواب دیا۔ عہدے کی خاطر ہی تو اتنی بڑی ذلت برداشت کر رہا ہوں۔

غزلیں

سرپٹ حیدرآبادی

میں بڈھا ہوں تو کیا مجھ میں کمی ہے
میرے دل کی جوانی تو وہی ہے

خزاں بن کر بہار آئی ہوئی ہے
لباسِ دشمنی میں دوستی ہے

پھنسا ہوں جیسے گھن چکر میں دل کے
رفو چکر سکونِ زندگی ہے

رہی پیشِ نظر مہتاب برسوں
مگر اب سامنے اک طشتری ہے

مسلّم ہے کہ میں اک سرپھرا ہوں
رفیقِ زندگی اک سرپھری ہے

میں بن کر رہ گیا اس کا چمچہ
مری شمعِ خودی اب مٹّی ہے

اسے کہتے ہیں معراجِ تکلّم
مری جو بات بھی ہے بے تکی ہے

نظر آئی یہ رشوت کی کرامت
جہاں تھی جھونپڑی بارہ دری ہے

جسے کل میں نے خود ٹھکرا دیا تھا
اُسی سے آج پھر وابستگی ہے

میں پیدا ہوتے ہی رویا تھا، موزوں
یہ میری شاعری، پیدائشی ہے

میں سرپٹ ہوں، یہ میری تیز گامی
لگد کوبِ حوادث میں پلی ہے

پاگل عادل آبادی

اولاد کو دھندے سے لگا کیوں نہیں دیتے
ٹک ہاتھ میں چندے کی تھما کیوں نہیں دیتے

یہ وقت الیکشن کا ہے جوُرو کی خوشی بھی
سالے کو کوئی سیٹ دلا کیوں نہیں دیتے

لُچا ہے لفنگا ہے اگر آپ کا فرزند
لیڈر اسے بستی کا بنا کیوں نہیں دیتے

بھارت سے غریبی نہ ہٹی ہے نہ ہٹے گی
غُربا کو ہی بھارت سے ہٹا کیوں نہیں دیتے

ہیں آپ میری جان کے دشمن تو کسی دن
اک ریل کے ڈبے میں بٹھا کیوں نہیں دیتے

سر اپنا کھجانے کی بھی فرصت نہیں مجھکو
تم کانچ کوری ان کو لگا کیوں نہیں دیتے

سر میرا دُکھانا ہے اگر آپ کو منظور
بھاشن کبھی نیتا کا سُنا کیوں نہیں دیتے

وہ شہر میں لُچّے کا مکاں ڈھونڈ رہے ہیں
پاگل کا پتہ ان کو بتا کیوں نہیں دیتے

اندرجیت لال
نئی دہلی

بھول گئے جب

بھول جانا اور یاد رکھنا متضاد ہیں اور دونوں میں انسانی زندگی کی بڑی دلچسپیاں چھپی ہوئی ہیں۔ یادداشت ایک مثبت صلاحیت ہے اور اس کا شمار اچھی قدروں میں ہوتا ہے۔ اور بھول جانے کے عمل کو کوئی قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتا بلکہ اسے منفی قدر ہی مانا جاتا ہے۔ لیکن کچھ غور کرنے سے یہ سمجھ میں آجاتا ہے کہ بھول میں بھی ایک بے پناہ دلچسپی ہے۔ لطف ہے۔ تجسس ہے۔ بھول زندگی کی ایک دلچسپ کامیڈی ہے۔ جو بھلکڑ کو ندامت اور دوسروں کو ایک بشاشت و مزاح دیتی ہے۔ ایسا مزاح جو ہمیں مسکرانے اور بسا اوقات پیٹ بھر کر ہنسنے کا موقع بخشتا ہے۔ اگر بھول جانے کا عمل اور بھول جانے والے لوگ نہ ہوتے تو زندگی کی یبوست بڑھ جاتی۔ اردو کے اس موضوع پر کثیر القدر اشعار ہم محفوظ نہ کر پاتے اور ہر آدمی دو چار لمحوں کی مسکراہٹ کے لیے ترس جاتا۔ ایسے مسکراہٹ کے لمحوں کو نکال دیجیے تو زندگی آنسوؤں، سانحوں اور سنجیدگی کا پلندہ بن جاتی ہے۔ اگر یوں پڑھیے تو سماج میں بھلکڑوں کا احسان مند ہوئیے کہ انھوں نے اپنی کمزور یادداشت کی قیمت پر محظوظ کرنے کے مواقع پیدا کیے۔

ہر آدمی کی یادداشت اتنی قوی نہیں ہوتی کہ ہر وقت ہر بات یا ہر واقعہ یاد رکھ سکے۔ ایک کلیہ جو بزرگوں نے عموماً تسلیم کیا ہے کہ ہر اوسط آدمی وہ واقعات یا شخصیتیں یا باتیں یاد رکھتا ہے جس میں اس کی بنیادی دلچسپی ہو۔ اور اس کے برعکس زندگی کے نفرت انگیز واقعات۔ گھناونی شخصیتوں اور غیر دلچسپ امور کو شعوری اور لاشعوری طور پر بھول جاتا ہے۔ یہ کلیہ ایک حد تک صحیح ہے مگر سو فیصدی صحیح نہیں۔

کچھ لوگ وقتی طور پر ہنگامی حالات میں کچھ نہ کچھ بھول جاتے ہیں۔ اور ایسی خود فراموشی قدرتی ہے کوئی ناقابل تلافی نقصان ہو جائے یا سانحہ پیش آجائے یا کسی عزیز کی اچانک موت ہو جائے کچھ عجب نہیں کہ ایسے غیر معمولی حالات میں توازن ذہن بھی حواس باختہ ہو جائے۔ اور ضروری سے ضروری بات بھول جائے۔ ایسا ہی واقعہ ایک بار ایک حضرت سے پیش آیا۔ یہ حضرت کسی حجام کی دکان پر حجامت کروا رہے تھے اور مسکرا مسکرا کر حجام سے باتیں کیے جا رہے تھے۔ دفعتاً ایک شخص حجام کی دوکان کے باہر چلایا۔

" میاں۔ عبدالرؤف۔ میاں عبدالرؤف! جلدی گھر کی طرف بھاگیے۔ آپ کے مکان کو آگ لگ گئی ہے۔ وہ حضرت تڑپ کر اٹھے حجام کو پیچھے جھٹک کے ارد گرد بندھا تولیہ ایک طرف دے مارا۔ چہرے پر لپا صابن ایک اور شریف آدمی پر پھینکا

اور منتظر گاہک جو اخبار پڑھ رہے تھے ان کا اخبار بڑی عجلت اور گھبراہٹ سے پھاڑ دیا۔ ایک دو گاہکوں سے بری طرح ٹکراتے ہوئے سڑک کی طرف پھرتی سے بھاگے۔ یکایک پھسلتے گرے۔ پھر اٹھے اور ایک خوانچہ والے سے ٹکرائے۔ اس کا سارا سامان سڑک پر بکھر گیا۔ تھالی یہاں، ترازو باٹ وہاں۔ حضرت فوراً اچھل کر پھر بھاگے۔ کچھ دور جا کر یکایک رک گئے۔ مسکراتے ہوئے بولے "ادے میں بھی کتنا بے وقوف ہوں۔ بھلا میرا نام عبدالرؤف کہاں ہے" اور یہ کہتے ہوئے خفت سے اپنا سر کھجانے لگے۔

شفیق الرحمان کمزور یادداشت والے لوگوں کے متعلق ایک فلسفی کا ذکر یوں کرتے ہیں۔ آج سے کئی سال پہلے فلاسفی کے ایک پروفیسر ان کے پڑوس میں رہتے تھے۔ دونوں کی آپس میں جان پہچان تھی۔ ایک روز دونوں ریڈیو سن رہے تھے۔ کوئی محترمہ گا رہی تھیں باتوں باتوں میں پروفیسر بولے کہ میں نے عجیب و غریب خواب دیکھا کیا دیکھتا ہوں کہ جیسے میں کلاس میں ہوں اور لیکچر دے رہا ہوں اور جب میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ میں واقعی کلاس میں تھا اور لیکچر دے رہا تھا۔"

شفیق الرحمن یہ بات اچھی طرح نہ سمجھ سکے۔ انھوں نے پوچھا ابھی آپ کیا فرما رہے تھے۔" "معلوم نہیں میں کیا کہہ رہا تھا۔ پروفیسر بولے۔ دراصل میں متوجہ نہیں تھا۔

میرے خیال میں فلسفہ موضوع ہی کچھ ایسا ہے جو اس سے دلچسپی رکھنے والوں کو ایسی دھن اور ایسے انہماک میں رکھتا ہے کہ انہیں اپنے آپ تک کی سدھ بدھ نہیں رہتی۔ فلسفہ دماغ انسان ان باتوں کو بھی اپنے ذہن میں جلدی سے تازہ نہیں کر سکتا جس سے اسے اکثر و بیشتر واسطہ پڑتا ہے۔

ایسے ہی فلسفی ذہن کے ایک شخص بنک پہنچے اور چیک بک نکال کر اور چیک بک میں رقم بھر کر چیک اکاؤنٹ کلرک کو پیش کیا۔ انھوں نے سب اندراج پر سرسری نظر ڈالی اور ٹوکن دینے کی بجائے حضرت کو فوراً لوٹا دیا۔ یہ کہتے ہوئے اس پر آپ نے اپنے دستخط نہیں کیے۔ اس لیے چیک اپنے ہاتھ میں واپس لے لیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ سوچ میں پڑ گئے کہ ان کا نام کیا ہے۔ وہ دو چار منٹ تک اپنا نام سوچتے رہے۔ لیکن اپنا نام یاد نہ کر سکے۔ پھر خیال آیا یوں اپنا نام شاید ذہن میں نہ ابھر سکے۔ کہنے لگے جلد گھر چلتے ہیں اور فلسفی اپنے گھر چلے گئے۔ گھر پہنچ کر اپنے مکان کے باہر لگی تختی پر اپنا نام پڑھا حضرت کو تسلی ہوئی اور انھوں نے انہی ہجوں میں چیک پر دستخط کر دیئے اس کے بعد وہ دوبارہ بنک پہنچے اور اپنی رقم وصول کر سکے۔

غائب دماغی کی کلاسکی مثال ہمارے فارسی کے پروفیسر خاکی دیا کرتے تھے۔ بقول ان کے ان کے ایک دوست جو ان کے ساتھ کالج میں ساتھی تھے اپنی غائب دماغی کے لیے بہت مشہور تھے اور جب انہیں بیک وقت دو تین کام کرنے پڑتے تو ان کا عمل کچھ ہنسی کا سامان پیدا کر دیتا۔ کالج سے لوٹنے پر یہ پروفیسر اپنی شیروانی کھونٹی پر ٹانگ دیتے اور چھڑی ایک کونے میں اور جوتے ایک پلنگ کے نیچے رکھ دیتے اور خود آرام کرنے کے لیے بستر پر دراز ہو جاتے۔ ایک دن برسات کی وجہ سے کچھ بھیگ گئے۔ اپنے گھر میں حسب معمول وارد ہوئے چھڑی کھونٹی پر ٹانگ دی۔ شیروانی پلنگ کے نیچے رکھ دی اور جوتے بستر پر رکھ دیئے اور خود حضرت کمرے کے کونے میں کھڑے ہو گئے۔ اتنے میں ان کی محترمہ آ گئیں اور خاوند کی غائب دماغی کا عجیب و غریب تماشہ دیکھ کر کھلکھلانے لگیں۔

نہ بھولنے کا ایک فارمولا کسی بزرگ نے یوں دریافت کیا ہے کہ جب آپ مستقبل تک کوئی بات یاد رکھنا

چاہتے ہوں تو اپنے رومال میں گانٹھ باندھ دیجیے تاکہ آپ کو گانٹھ کھولتے وقت پوری بات من و عن یاد آجائے۔ لیکن اس امر کی کوئی گارنٹی نہیں کہ آپ کو ساری بات وقت پر یعنی گانٹھ کھولتے وقت یاد آجائے گی۔ دراصل یہ فارمولا پچاس فیصدی عملاً صحیح کام کرتا ہے لیکن جہاں تک گانٹھ باندھنے کا تعلق ہے وہاں تک تو بات یا واقعہ ضرور یاد رہتا ہے لیکن ضرورت پڑنے پر آدمی بھونچکا کی طرح منہ تاکنے لگتا ہے کہ یہ گانٹھ آخر کیوں باندھی گئی تھی۔ اس طرح کا ایک تجربہ مجھے بھی ہوا۔ ایک دوست جو مجھے بچپن سے جانتے تھے ایک ادبی محفل میں کئی برسوں کے بعد مل گئے۔ رسماً علیک سلیک کے بعد فرمانے لگے مجھے تین معتل شعراء (انگریزی) درکار ہے کسی وقت بھیجنے کا اہتمام کیجیے گا۔" میں نے جواباً کہا میں اکثر بھول جاتا ہوں۔ بہرحال اگر یاد رہا تو ایک ہفتہ کے اندر اندر ضرور بھجوا دوں گا۔ دوست کے اصرار پر میں نے رومال میں گانٹھ باندھ لی لیکن گھر پہنچنے کے بعد دوسرے دن رومال میں گانٹھ دیکھ کر سمجھ میں نہ آیا کہ یہ گانٹھ آخر کیوں باندھی گئی تھی۔ ایک دو دن جب کچھ یاد نہ آیا تو نادم ہو کر گانٹھ کھول دی گئی۔ مہینوں کے بعد اس دوست سے دوبارہ ملاقات ہوئی تو بڑی شرمندگی ہوئی۔ دوست نے کہا۔ اب دو گانٹھیں باندھ لو۔ ایک گانٹھ کچھ یاد کرنے کی طرف اور دوسری اصل واقعہ دماغ میں تازہ کرنے میں رہنمائی کرے گی۔ دوست کا مشورہ مان لیا۔ صرف اس لیے کہ اس میں اپنی بھی بھلائی تھی۔ لیکن اس رات جب میں نے دو گانٹھیں دیکھیں تو فلسفی جوکر کا سا منہ بنا کر سوچنے لگا کہ یہ دو گانٹھیں۔ آخر کیا یاد دلاتی ہیں یہی نا کہ کوئی واقعہ یا بات ایک گانٹھ سے دوسری گانٹھ سے کوئی نہ کوئی مناسبت رکھتی ہے۔ اپنے ذہن پر پورا زور دیا لیکن کوئی بات سمجھ میں نہ آئی۔ آخر یہ کہہ کر دونوں گانٹھیں کھول دیں کہ اگر یادداشت اتنی تیز ہو تو ویسے ہی ہر بات موقع پر یاد آجاتی۔ گانٹھیں باندھ کر تو ہم اپنے ذہن پر یادداشت کا زیادہ وزن لاد دیتے ہیں جو عام وزن سے یقیناً زیادہ ہوتا ہے۔

بھول لینے کے عمل سے کوئی آدمی خالی نہیں۔ کئی آدمی بڑے چوکس چاق و چوبند اور ذہنی طور پر اتنا توانا ہوتے ہیں ایسے لوگوں کی یادداشت بھی شاذونادر ہی انھیں دھوکہ دیتی ہے اور نہیں جب دھوکہ دیتی ہے تو دوسروں کے لیے مزاح کا سامان پیدا کر دیتی ہے۔ اس طرح کے ہمارے ایک دوست بھی ایک بار عجیب کیفیت میں الجھ گئے۔ یہ حضرت خاصے کھاتے پیتے آدمی ہیں۔ ان کا کاروبار خوب پھیلا ہوا ہے۔ آمدنی کا وسیلہ بھی کافی معقول ہے۔ ایک دن گھر سے سبزی لینے نکلے۔ گلی کے نکڑ پر کچھ لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر ایک لمحے کے لیے رک گئے۔ دیکھا تو ایک کمسن بچہ رو رہا ہے اور سب لوگ اس کو پچکار رہے ہیں۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ بچہ کسی طرح ماں باپ سے بچھڑ گیا ہے یا غلطی سے گھر سے اکیلے ہی بازار میں آنکلا ہے۔ سب لوگ اسے تھانے یا لاپتہ بچوں کے دفتر میں پہنچانے کا مشورہ دینے لگے۔ ان حضرات کو بچہ کی اس حالت پہ بڑا ترس آیا۔ فوراً بول اٹھے۔ کیسے لاپرواہ والدین ہیں کہ اپنے بچوں کی دیکھ بھال نہیں کر پاتے۔" چل بچو! میرے ساتھ چل" اور یہ کہہ کر بچے کی انگلی پکڑ کر اپنے گھر لے آئے

دالان میں داخل ہوتے ہوتے اونچی آواز سے اپنی بیوی کو آواز دی۔ "ذرا باہر آنا"۔ اور پھر اسے یوں کہنے لگے کہ بچہ کہیں اپنے ماں باپ سے بچھڑ گیا ہے مجھے اس پر ترس آگیا ہے اس لیے اسے اپنے ساتھ لے آیا ہوں۔ برا نہ منانا آخر ہمارے آٹھ نو بچے ہیں اسے بھی پال لیں گے۔ خدا ہمیں اجر دے گا۔" اور یہ کہہ کر بچے کی انگلی اپنی بیوی کے ہاتھ میں دے دی بیوی نے بچے کی طرف غور سے دیکھا اور فوراً اسے گود میں اٹھا لیا۔ اور چومنے لگی اور پھر تمتماتے چہرے سے خاوند کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ اسے پہچان بھی نہ سکے۔ یہ تو اپنا بیٹو ہے۔" بیوی نے ابھی جملہ پورا ہی نہ

کیا تھا کہ حضرت تیزی سے بازار کی طرف بھاگ نکلے کہ کچھ وقفہ کے لیے تو اپنی خفت چھپا سکیں۔

ان حضرت سے بھی دو قدم آگے بڑھنے والے ایک شخص کے بھولکڑ پن کی نظیر نہیں ملے گی۔ جنہیں ایک دن کناٹ پلیس میں ایک خاتون سودا سلف سے لدی دو ٹوکریاں ہاتھ میں اٹھائے ملی۔ اتفاق سے آمنے سامنے سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ حضرت خاتون کی طرف گھور گھور کر دیکھنے لگے۔ خاتون نے سمجھا شاید یہ حضرت اس سے کچھ کہنا چاہتے ہوں۔ وہ ذرا قریب ہوئی تو حضرت چشمہ اتار کر کہنے لگے "محترمہ معلوم ہوتا ہے میں نے اس سے پہلے بھی آپ کو کہیں دیکھا ہے"۔ خاتون مسکرانے لگی اور دل ہی دل میں کہنے لگی "عجیب خاوند ہیں میرے"!

●●

ادارہ

شگوفہ

کے توسط سے حسبِ ذیل مزاحیہ کتابیں حاصل کی جاسکتی ہیں

کیوڑے کا بن	سلیمان خطیب	مجموعہ کلام	۱۵/- روپے
نشتر و مرہم	رضا نقوی واہی	"	۵/۵۰
تیرِ نیم کش	بھارت چند کھنہ	مضامین	۷/۵۰
خواہ مخواہ	رشید الدین	"	۱۰/-
فقط	یوسف ناظم	"	۶/-
بالآخر	مجتبیٰ حسین	"	۱۴/-
ٹوٹو میں میں	پروفیسر یداللہ مہدی	ڈرامے	۱۰/-
البتہ	یوسف ناظم	مضامین	۱۰/-
کیا نام نہ ہوگا	بھارت چند کھنہ	"	۸/-
سمن زار	خواجہ عبدالغفور	"	۸/-
دھر گھسیٹ	سرپٹ حیدرآبادی	مجموعہ کلام	۸/-
بہرحال	مجتبیٰ حسین	مضامین	۷/-
آدمی نامہ	"	خاکے	۹/-
انڈین کاجہ	عاتق شاہ	مضامین	۸/-
سنی سنائی	لئیق صلاح	"	۱۰/-
رقص تماشائی	وجاہت علی سندیلوی		۱۵/-

شوہر موئے کہیں کا

مفلس فاروقی

(بیگم کی زبانی)

تھا گاؤں بھر میں جو اِک لوفر موئے کہیں کا　　بن بیٹھا ہے مرا اب شوہر موئے کہیں کا
اِک چڑسی ہوگئی ہے صورت سے اس کی مجھ کو　　اُلّو موئے کہیں کا بندر موئے کہیں کا
چہرے کو اپنے فیشن، سنڈ بنا رکھا ہے　　حلیہ تو اس کا دیکھو جوکر موئے کہیں کا
میرے ہی دم قدم سے گھر بار کا ہوا ہے　　پھرتا تھا ورنہ پہلے در در موئے کہیں کا
کھانا بھی میں پکاؤں جھاڑو بھی میں لگاؤں　　مجھ کو سمجھ رہا ہے نوکر موئے کہیں کا
غلطی سے مجھ سے کوئی برتن جو ٹوٹ جائے　　تو ظلم توڑتا ہے مجھ پر موئے کہیں کا
گھر سے میں دور ہو کر جاتی ہوں جب بھی پیچر　　دیدے نکالتا ہے مجھ پر موئے کہیں کا
چنگھاڑتا ہے مجھ پہ جھڑکا رتا ہے مجھ کو　　دیتا ہے گالیاں بھی اکثر موئے کہیں کا
رہتا ہے غل غپاڑہ اس روز گھر میں بیروں　　آتا ہے جب بھی وارد ی کر موئے کہیں کا
دن بھر تو گھر میں رہ کر توڑے ہے چارپائی　　راتوں کو دیکھتا ہے پکچر موئے کہیں کا
دن رات مجھ سے کر کے کڑوی کسیلی باتیں　　دل پہ مرے چلائے نشتر موئے کہیں کا
تہذیب اس کو گویا چھو کر نہیں ہے گذری　　جنگلی موئے کہیں کا ڈھنگر موئے کہیں کا
سنتا نہیں ہے میری اپنی ہی ہانکتا ہے　　منہ پھٹ موئے کہیں کا لیچر موئے کہیں کا

کیا کر سکے گا پوری فرمائشوں کو میری
مفلس یہ دو ٹکے کا نوکر موئے کہیں کا

ھزل

ضمیر ساجد، اکولہ

پیار میں سب ہمیں گوارا ہے　　تیر اُلٹا بھی ہم کو پیارا ہے
جس میں کھوٹوں کی دال گلتی ہے　　ایک ایسا یہاں ادارہ ہے
سیکڑوں ہیں ہنر مگر پھر بھی　　لڑکا اب تک مرا کنوارہ ہے
میں بھی کر لوں گا پھر نکاح اُس سے　　اس کا منشاء اگر دوبارہ ہے
کروٹیں لے رہا ہوں کھٹیا پر　　سامنے ایسا کچھ نظارہ ہے
میرے سالوں کی بات مت پوچھو　　کوئی رستم ہے کوئی دارا ہے
خیر اپنی مناؤ تم ساجدؔ　　گرم بیگم کا آج پارہ ہے

ڈیوٹی پہ جو یہ ساقیٔ میخانہ رہے گا
خالی ہی مرے ہاتھ میں پیمانہ رہے گا

جب تک اثرِ جلوۂ جانانہ رہے گا
لوگوں کی زباں پہ مرا افسانہ رہے گا

تم اپنی زباں سے مجھے کچھ بھی کہو لیکن
یہ تاؤ مرا تم سے شریفانہ رہے گا

ہم تجھ کو سمجھتے نہیں اُس وقت تک اپنا
اغیار سے جب تک ترا یارانہ رہے گا

تم قبر پہ ہنڈا بھی جلاؤ گے تو کیا ہے
ویرانہ ہر اک حال میں ویرانہ رہے گا

یہ کیا کہ نہ پردہ ہے نہ برقعہ نہ ردا ہے
کب تک ترا انداز یہ بچکانہ رہے گا

اسراف بتاتا ہے تمہارا مجھے بیگم
گندم کا مرے گھر میں نہ اک دانہ رہے گا

شاید مرے ہاتھوں میں نہیں شادی کی ریکھا
کاشانہ ہمیشہ مرا مردانہ رہے گا

"میک اپ" کی ہے دُھن گڈو کی ممی کو ہر وقت
آئینہ رہے گا نہ ہی اب شانہ رہے گا

وہ قیس کا قصہ ہو کہ فرہاد کی باتیں
"فیمس" مرا ان لوگوں سے افسانہ رہے گا

فیشن کی ہوا ایسی کبھی اک روز چلے گی
صورت سے کوئی مرد نہ مردانہ رہے گا

ہے تھوڑا اگر کرگس کا خباثت کی تجوری
اُس کا ہر اک انداز ظریفانہ رہے گا

کرگس [illegible]

غزلیں

رفیق احمد رفیق

نادار ہیں مزدورِ خلا کا رہم نہیں
فاقوں سے گزر رہے ہیں نشہ خوار ہم نہیں

لانا ہے تجھ کو جو بھی اسے اپنے ساتھ لا
مانگیں گے تیرے باپ سے گھر بار ہم نہیں

ان سے بچھڑ کے ہم سے دو بیٹے نے یہ کہا
جی بھر کے دیکھو بیچ میں دیوار ہم نہیں

دروازہ کھولتی ہیں وہ جھاڑو لئے ہوئے
مالک ہیں اپنے گھر کے جمعدار ہم نہیں

بچوں کی یہ قطار بھی تم نے لگائی ہے
بیگم خدا گواہ مددگار ہم نہیں

اپنے ہی گھر کے کتے سے اب مات کھا گئے
کہتی ہیں وہ کہ اتنے وفادار ہم نہیں

بیگم کما کے لاتی ہیں کھاتے ہیں ہم رفیق
کھانا بھی ایک کام ہے بیکار ہم نہیں

عابد معز
حیدرآباد

مرد محنت کرکے روٹی روزی کماتا ہے اور عورت گھر گرہستی سنبھالتی ہے۔ یہ بات ماضی میں حقیقت ہوا کرتی تھی لیکن جب سے مساوات کا دور دورہ اور مہنگائی کا بول بالا ہوا ہے یہ جملہ اپنی حقیقت کھونے لگا۔ آجکل مرد و زن مل کر کماتے اور گھر سنبھالتے ہیں۔ اس کے باوجود بھی چین و سکون میسر نہیں آتا۔ ہمارے گھر آج بھی ہم کماتے ہیں اور بیوی گھر سنبھالتی ہیں۔ آپ چاہیں تو ہمیں قدامت پسند کہہ سکتے ہیں۔ ویسے ہم اس بات سے بعض وقت خوش رہتے ہیں تو اکثر اداس بھی ہو جاتے ہیں۔ ہمیں وزارت داخلہ سے بالکلیہ بے دخل کر دیا گیا ہے لیکن فینانس کے معاملہ میں ہماری قابلیت کا لوہا مانا جاتا ہے۔ یہ ہمیں جانتے ہیں کہ اپنی قابلیت کا لوہا منوانے کے لیے ہمیں خود کتنے لوہے کے چنے چبانے پڑتے ہیں۔ ایک اور بات جو ہمیں کھٹکتی ہے وہ یہ کہ ہماری بیوی گھرداری کے معاملہ میں ہم سے زیادہ سبقت لے جا رہی ہے اور ہم اس کے مرہون منت ہو گئے ہیں۔ اس قسم کی سوچ اور آفس میں لنچ کے وقت دوستوں کے ہاتھ کا بنایا ہوا پکوان کھا کر ہمارے دل نے بھی چاہا کہ ہم کچن میں جائیں۔ کئی بار کوشش کی لیکن ہماری مشرقی شوہر پرست بیوی نے کبھی اس کا موقع نہ دیا۔ آخر قسمت ہم پر مہربان ہوئی۔ زوجہ محترمہ کو بخار آیا اور ہماری دیرینہ آرزو پوری ہوئی۔

کچن میں داخل ہونے سے پہلے ہم پرامید تھے کہ نئی ایجادات کے ذریعہ صنف نازک پر احسان کریں گے۔ لیکن شرمندگی سے کہنا پڑتا ہے کہ پکوان کے سلسلے میں ہم پر کئی انکشافات ہوئے۔ پکوان کے لیے سب سے پہلے ایندھن کا انتظام کرنا ہوتا ہے۔ ہم کچن میں داخل ہوئے اور سوچنے لگے کہ ایندھن کے لیے عورتوں کا سر چولہے میں جھونکنے (جیسا کہ وہ کہتی ہیں) کے بجائے ایٹمی بیٹریاں مہیا کی جانی چاہیے۔ اور جب ایٹمی بیٹری ہوگی تو کمپیوٹر قسم کی مشین بھی چاہیے جو مطلوبہ کھانا تیار کر دے۔ آپ کھچڑی بنانا چاہتے ہیں۔ کتاب میں درج کئے ہوئے فارمولے کے تحت تمام اشیاء مشین میں ڈال دیں۔ چند سکنڈ انتظار کیا۔ بٹن دبایا اور گرم گرم کھچڑی کا قاب نکل آیا ——— خوابوں کی دنیا میں بے روک ٹوک دوڑتے ہوئے ہم کچن میں ایسی مشین رکھنے کے لیے جگہ تلاش کرنے لگے۔ ہماری نظر کا[illegible] سے لدی پڑی

برتنوں پر پڑی جنھیں صاف کرنا تھا۔ یاد آیا کہ برتنوں کو دھونے کا مسئلہ سائنس نے حل کر دیا ہے۔ ہم نے یہ مشین اب تک اس لیے نہیں خریدی کہ زوجہ محترمہ نے اس طرف توجہ نہیں دلوائی۔ ہر مرد کی طرح ہم بات کا بتنگڑ بناتے ہوئے بیوی پر برسنے لگے۔ وہ مسکراتی رہیں پھر کہنے لگیں "آپ کی تنخواہ اور گھر کا خرچ اس مشین کو خریدنے کا متحمل نہیں ہو سکتا گھر کی سیاست اور معیشت آپ مردوں کے بس کا روگ نہیں۔ پہلے ہی دن احتجاج کرنے لگے" منہ کی کھا کر آستین اور پائنچے چڑھائے برتن دھونے بیٹھے۔ آدھے برتن دھونے سے ہی ہماری وہ درگت ہوئی کہ ہمیں خود کو دھونے اور صاف کرنے کے لیے دوگنا وقت اور دو ٹکیاں صابن خرچ ہوا۔ خیر صاحب ہم نے ایندھن تیار کرنے پھر کچن کا رخ کیا۔ آگ لگانے کے لیے آدھا گھنٹہ صرف ہوا تین عدد دیا سلائی کی ڈبیاں، ایک کیلو روئی اور ایک لیٹر مٹی کا تیل چولھے کی نذر ہوا۔ اپنی بے بسی پر خود روئے اور اوروں کو بھی رلایا لیکن ہم یہ کہکر پردہ پوشی کریں گے کہ آنسو دھوئیں کی شدت سے نکل پڑے تھے۔

ایندھن تیار کرنے کے بعد دوسرا سبق دودھ گرم کرنے کا ہوتا ہے۔ گوالے سے دودھ لیا۔ "دودھ لیا" کہنا غلط ہے۔ ہمیں کہنا چاہیے کہ گوالے سے "پانی دودھ" لیا۔ پانی میں دودھ کا تناسب دیکھ کر ہم نے بے ساختہ گوالے کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ اکثر ہماری بیوی ہر صبح یہی کیا کرتی تھیں۔ تب ہم انھیں صبر کرنے کے لیے کہتے تھے۔ ہم نے اس تبدیلی پر غور کرتے ہوئے دودھ کو ایندھن پر رکھا۔ دودھ میں موجود پانی بھاپ بن کر اڑنے لگا۔ ہمارے خیالات بھاپ کا تعاقب کرتے ہوئے اسٹیم انجن تک جا پہنچے اور ہم اس کے موجد کا نام یاد کرنے لگے۔ باوجود کوشش کے نام یاد نہ آیا۔ بچپن میں اس محسن سائنسداں کا نام ہماری زبان کی نوک پر تھا۔ اس وقت ہمیں یہ معلوم نہ تھا کہ اسٹیم انجن کیا ہوتا ہے۔ کیسے ہوتا ہے۔ اب ہمیں سب کچھ معلوم ہے اور موجد کا نام بھاپ بن کر ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ واقعی بچپن معصوم ہوتا ہے۔ غرض ویسے غرض سے ذرا آشنا

ہم نے دیکھا کہ دودھ گرم ہو کر حجم میں بڑھتا ہے۔ یہ چیز مہنگائی کے زمانے میں امید افزا معلوم ہوئی اور ہم دودھ کو بڑھتا ہوا دیکھ کر خوش ہونے لگے۔ دودھ اتنا بڑھا کہ برتن سے باہر نکلنے لگا۔ ہم لالچی نہیں ہیں۔ ضرورت کے مطابق حاصل کی ہوئی آشیاء سے مطمئن رہتے ہیں۔ ابلتے دودھ کو برتن سے بہنے دیا پھر آہستہ آہستہ دودھ سکڑتا گیا ہم حیرت و تعجب سے دودھ کو برتن کے اندر سمٹتا ہوا دیکھتے رہے۔ آخر کار دودھ آدھا رہ گیا۔ اس آدھے دودھ کی قیمت دے کر ہم نے جانا کہ دودھ ابلتا ہے اور ایسے ہی آدمی جب غصہ کی وجہ سے بے قابو ہوتے ہیں تو اپنی ہر چیز کھو بیٹھتے ہیں۔

دودھ گرم کرنے کے بعد کا سبق چائے بنانا ہوتا ہے۔ چائے بنانا بھی ایک فن ہے۔ الائچی کی چائے کشمیری مالہ کی چائے غرض کئی قسم کی بنائی جاتی ہے۔ ہم نے صرف چائے کی پتی والی چائے بنانے کی ٹھانی۔ خسر صاحب بھی گھر آئے تھے۔ یہ سنہری موقع تھا۔ جب ہم انھیں بتلا سکتے تھے کہ آپ نے اپنی لڑکی کو ہم جیسے آدمی کے ساتھ بیاہ کر کے عقلمندی کا ثبوت دیا ہے۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ چائے کی پتی اور چینی کا مقام کدھر ہے، پیالے کہاں تشریف فرما ہیں۔ انھیں ڈھونڈھ نکالنے کے دوران ہم نے دو مرتبان، کئی برتن اور تین گلاس پھوڑ ڈالے۔ چائے تیار کی۔ اور خود ہی لے جا کر خسر صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ اس کا اظہار انھوں نے ہمیں بھی ایک پیالی چائے دے کر کیا۔ چائے کا گھونٹ

حلق سے اتارا۔ کانوں میں گھنٹیاں بج اٹھیں۔ چھٹی کا دودھ یاد آگیا۔ رنگ چائے کا تھا لیکن مزہ صرف اور صرف مرچ کا تھا۔ چائے آگ لگاتی ہوئی منہ اور حلق سے گزرتی رہی۔ ہم نے خسر صاحب کا اور انہوں نے ہمارا خیال کرتے ہوئے اس مرچ کے پانی کو پیا۔ پیتے وقت ہم دونوں ایسے منہ بنا رہے تھے جیسے ایک دوسرے کو چڑا رہے ہوں۔ اس پر تکلفات اور رشتہ کی نزاکت کا اندازہ لگائیے کہ خسر صاحب چائے کی تعریف کرتے رہے اور ہم خاکساری سے کام لیتے ہوئے شکریہ اور ذرہ نوازی کی ہانک لگاتے رہے۔ اس چائے نے جلاب کی دوا سے بھی بڑھ کر کام کیا۔ ہم دو دن بہت مصروف رہے۔ بعد از تحقیق پتہ چلا کہ چائے کی پتی کے بجائے ہم نے کالی مرچ کا سفوف استعمال کیا تھا۔ ہم اتنے قابل ہیں کہ آپ کو بتلا سکتے ہیں کہ روز کتنی چائے پی جاتی ہے۔ کس کس ملک میں چائے اگائی جاتی ہے۔ چائے کی کتنی قسمیں ہوتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن افسوس ہم اتنے نادان ہیں کہ چائے کو نہیں پہچانتے۔ یہ نہیں جانتے کہ وہ کیسی ہوتی ہے۔ سچ ہے تجربہ کا نعم البدل کوئی نہیں!

روٹی بنانے کے خیال سے "پاپڑ بیلنا" محاورہ یاد آیا۔ اس محاورہ سے ہم نے اندازہ لگایا کہ روٹی بیلنا اور بنانا بھی کچھ کم مشکل نہ ہوگا۔ آٹے کو بھگو کر گوندا جاتا ہے۔ مانسون کی طرح کبھی پانی زیادہ تو کبھی کم ہو جاتا تھا۔ بڑی مشکل سے آٹا بھگو سکے۔ آٹے کو گوندنا اس لیے غیر ضروری سمجھا گیا کہ ہمیں گوندنا آتا ہی نہ تھا۔ گردہ اور بیلن کے بیچ گیلے آٹے کو رکھا اور بیلنا شروع کیا۔ معلوم ہوا روڈ رولر چلانا آسان ہے لیکن روٹی کا بیلنا بہت مشکل امر ہے۔ بیلنے کے دوران ایک وقت ایسا بھی آیا جب گردہ بیلن جدا ہونا نہیں چاہتے۔ انھیں آٹے نے اٹوٹ بندھن میں جکڑ دیا ہے جس طرح سے محبوب اور محبوبہ کو محبت ایک اٹوٹ بندھن میں جکڑ دیتی ہے۔ بے رحم سماج بن کر ہم نے زور لگایا، گردہ اور بیلن الگ ہوئے روٹی کے کئی ٹکڑے ہوئے کچھ گردہ اور کچھ بیلن کے ساتھ رہ گئے۔ کوشش کر کے جب ہم آٹے کو بیلنے میں کامیاب ہوئے تو دیکھا روٹیاں گول ہیں نہ چوکور وہ مختلف ممالک کے نقشے اختیار کر چکی ہیں آج بھی ہمارے لڑکے ان روٹیوں پر ندی پہاڑ اور سڑکیں بنا کر سیلون آسٹریلیا اور افریقہ کا جغرافیہ سیکھ رہے ہیں۔

روٹی بنانے میں ناکام ہونے کے بعد ہم نے ناشتے سے روٹی اور انڈے منگوائے انڈوں کا آملیٹ بنانا چاہا ہاتھ میں انڈا لے کر کفگیر سے اسے پھوڑا سفیدی ہاتھ میں بہی زردی کپڑوں پر گری اور چھلکے کڑھائی میں جا پڑے پہلے انڈے کا انجام دیکھ کر دوسرے انڈے میں ایک چھوٹا سوراخ کیا اور اس میں سے سفیدی اور زردی کو ایسے نکالا جیسے کوئی کنویں سے پانی نکالتا ہے۔ آملیٹ تیار کیا انڈا آملیٹ تو نہ بن سکا لیکن وہ چاند کی زمین جیسی شکل ضرور اختیار کر گیا رنگ سیاہی مائل بھورا کہیں ابھرا کہیں گہرا، کہیں اونچ نیچ جیسی گہرائی ہو گئی تھی ہماری آملیٹ دیکھ کر ہمارا وہ رویہ یاد آتا۔ جب کبھی آملیٹ اچھا بنا ہوا نہ دیکھتے تو تنقید کرنے لگ جاتے۔ اب معلوم ہوا تنقید کرنا آسان ہے اور محنت کر کے کسی چیز کو تنقید کے لیے پیش کرنا کتنی بلند ہمتی ہے۔

دودھ گرم کرنے چائے بنانے اور روٹی اور آملیٹ تیار کرنے کے لیے کسی رہنما کی ضرورت نہیں پڑتی لیکن دوسرے پکوان کرنے کے لیے آپ کو کسی استاد کی شاگردی قبول کرنی پڑتی ہے یا پھر سسرال والوں کے طعنے و تشنے سننے پڑتے ہیں جو کہ اکثر ہوتا ہے۔ ان طریقوں کے علاوہ دسترخوان کی کتابیں بھی رہنمائی کرتی ہیں شاہی دسترخوان غریب کا دسترخوان نواب کا دسترخوان بیٹو کا دسترخوان۔ رضیہ کا دسترخوان، بالک کا دسترخوان وغیرہ وغیرہ نامی کتابیں بازار میں دستیاب ہیں ہم نے

بھی ایک دسترخوان کی کتاب خریدی کتاب میں دیئے ہوئے پکوانوں کے نام اور ان کی ترکیب پڑھ کر ہی بھوک بڑھ جاتی ہے ہم کسی ڈھابے کے بجائے ہانگ کانگ کے کھانے سے پہلے دسترخوان کی کتاب کے چند صفحے پڑھ لینا زیادہ مفید ہے۔ خیر صاحب پکوان کی ترکیبوں سے ہم بہت متاثر ہوئے اور بصد شوق اپنے چند دوستوں کو کھانے پر مدعو کیا۔ پلاؤ پکانے کی ترکیب نکالی ہر شئے کو مقدار سے بڑھ کر اس نظریہ سے ڈالی کہ جو مقدار کتاب میں درج ہے۔ وہ اصلی اشیاء کی ہوگی اور جب ملاوٹ شدہ چیزوں کو زیادہ مقدار میں لیں گے تو شاید اصل کا کچھ مزہ آئے گا۔ ترکیب پر عمل کرنے کا جب وقت آیا تو کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا عمل ایسا ہوتا، نتیجہ کچھ اور نکلتا تھا۔ لکھا تھا پانچ منٹ گرم کیجئے اور عمل کرنے پر پکوان جل جاتا۔ آخر تنگ آکر ہم نے تمام اشیاء کو برتن میں ڈالا اور ایک مقررہ وقت تک ایندھن پر رکھا۔ پلاؤ کو دیکھا تو اس میں سے چند اشیاء بالکلیہ گھل کر پانی ہوچکی تھیں اور چند تک بھاپ بھی نہ پہونچی تھی۔ دعوت کے وقت کو گذرے آدھا گھنٹہ ہوچکا تھا۔ دوستوں کی آمد شروع ہوچکی تھی۔ عزت کا سوال تھا۔ ہوٹل سے لقمی، کباب، پلاؤ، سالن، میٹھے وغیرہ منگوائے اور اداکاری کے ساتھ انہیں پیش کیا۔ پکوان کے تعلق سے خوب ڈینگیں ماری۔ کہا کہ "عورتیں خواہ مخواہ اتراتی پھرتی ہیں۔ ان سے بہترین پکوان تو ہم کرسکتے ہیں۔" دوستوں نے بھی تائید کی۔ ہم ذات کی برائی ہماری بیوی کو پسند نہ آئی اور انہوں نے پان کے ساتھ ہوٹل کا بل بھی بھیجا۔ بل کو دیکھ کر دوست ہمیں گھورتے اور ہم کھسیانی ہنسی سے انھیں جواب دیتے۔
——— یہ تھا کچن میں ہمارا پہلا تجربہ جو کافی مایوس کن رہا۔ اس کے باوجود بھی ہم اپنی کوششیں جاری رکھیں گے، اس عزم کے ساتھ اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔

٥٥

رہبرؔ سیوانی

"ہر دریچے پہ مرے قتل کا منظر ہوگا"

اِس نئے دور میں جو شخص بھی پیچر ہوگا
رہبرِ قوم بنے گا وہ منسٹر ہوگا

بال بچوں سے کہاں اس کا بھرا گھر ہوگا
وہ مخنث ہو مونث نہ مذکر ہوگا

اپنا گھر چھوڑ کے سسرال میں جو رہتا ہے
وہ کوئی خادمِ زن نام کا شوہر ہوگا

کھاد ڈالی ہی گئی پھر بھی اُپج کیوں نہ ہوئی
اور کیا ہوگا سبب کھیت ہی بنجر ہوگا

جب الکشن میں اُلٹ جائے گی کرسی تیری
پھول بھی آئے گا دامن میں تو پتھر ہوگا

رات بھر جس نے تجھے چین سے سونے نہ دیا
عشق کا بھوت نہیں وہ کوئی مچھر ہوگا

جس میں غرقاب ہوئی شاعرِ میخوار کی ناؤ
بحرِ انکار نہیں مے کا وہ ساغر ہوگا

کل سرِ بزم اُچھل کود مچائی جس نے
وہ مداری کا نکالا ہوا بندر ہوگا

ڈھونڈتا پھرتا ہے کیوں شیخِ حرم کو ساقی
بالیقین پچھلے بقائے کا وہ چکر ہوگا

ہے یہ مصرع کسی نقابِ سخن کا شاید
"ہر دریچے پہ مرے قتل کا منظر ہوگا"

کنٹرول اپنے بیپر پہ ذرا رکھنا ناصح
عادتیں اس کی بتاتی ہیں کہ لوفر ہوگا

شہر میں آج حریفوں کو بھی یہ کہتے سنا
لوٹ لی بزمِ سخن جس نے وہ رہبرؔ ہوگا

قبلہ کا ہوں غلام کہ ان کے طفیل سے
اک مالکہ بھی مل گئی اک نوکری ملی
گھر میں بلا سے رہتا ہوں جوتی کی نوک پہ
کالج میں تو جگہ مجھے استاد کی ملی

○

بچپن سے ہم چٹائی پہ سوتے رہے مگر
شادی ہوئی تو صوفے کے حقدار ہوگئے
گھر میں بلا سے ایک پلنگڑی نہیں ملی
سسرال کے تو مالک و مختار ہوگئے

تلاشِ آب

قمرالزماں قمر (رانچی)

پانی پانی ہو رہا ہوں جستجوئے آب میں
صبح ہوتے بالٹی و دیگچی کی ہے برات
سوکھ کر دریا و تالاب و کنواں کانٹا ہوئے
اچھے اچھے پانی بھرتے اب نظر آنے لگے
ہے تلاشِ آب لیکن کچھ نہیں ملتا پتا
ساتھ محرومی و ناکامی کے میں واپس ہوا
دیکھ کر خالی گھڑا بیگم بگولا ہو گئیں
گھڑکیوں کے ساتھ کڑکیں اور یہ طعنہ دیا
نہر کھودی دودھ کی اس نے تو شیریں کیلئے
زن مریدی پہ مجھے اپنی جو تھا یارو غرور
رہ گیا منہ دیکھتا ان کا گھڑا کا میں کھڑا
رکھ دیا پانی نے منصوبوں پہ پانی پھیر کر
مستقل طعنوں نے ان کے بورا تنا کر دیا
اک پولیس والے نے دیکھا ڈانٹ کر کہنے لگا
پہلے تو سہما ذرا پھر جی کڑا کر کے کہا
سوچتا جاتا تھا دل میں گر نہیں پانی ملا
چلّو بھر پانی نہیں کہ ڈوب کر مر جاؤں گا
رات بن بیاہوں کی کٹتی ہے فراقِ یار میں
رات رخصت ہو گئی قطرہ نہ پانی کا ملا
شہر کے چوراہے پر تھی بھیڑ لوگوں کی کثیر
تھے کئی اقسام کے صف میں لئے لوٹے گلاس
پانی پت جیسا وہاں پہ چھڑ گیا تھا کارزار
گرچہ میں نے رات بھر ہر گھاٹ کا پانی پیا
اہلیہ میکے گئیں، تھے ساتھ سب اہل و عیال
ایسا سوچا بھی نہ تھا میں نے خیال و خواب میں
ساتھ سب کے ڈھونڈھتے پھرتا ہوں میں آبِ حیات
اب کے گرمی نے چکھائے یوں جہنم کے مزے
گاڑیوں پہ لاد کر نکلے ہیں سب اپنے گھڑے
کیا یہ پانی بھاپ میں تبدیل ہو کر اڑ گیا!
مستقل کاندھوں پہ تھا رکھا ہوا خالی گھڑا
مثلِ گرگٹ مختلف رنگوں میں وہ ڈھلنے لگیں
کیا نہیں فرہاد کا قصہ کتابوں میں پڑھا ؟
دو گھڑے پانی نہ لا سکتے ہو تم میرے لئے!
پڑ گیا مجھ پہ گھڑوں پانی تھا گرچہ بے قصور
بالٹی تھی ہاتھ میں اور دوش پہ رکھا گھڑا
ہو گیا مفلوج میری زن مریدی کا ہنر
دو بجے شب میں تلاشِ آب میں میں چل پڑا
کون ہے؟ چوروں لئے پھرتا ہے کاندھے پہ گھڑا
کچھ نہیں صاحب! اجی بندہ ہوں اک بیوی زدہ
بیگمِ عالی کو کیا دونگا جواب اس کا بھلا
راگ کا ماہر نہیں جو میگھ کو برساؤں گا
اور بیاہوں کی تلاشِ آب ناہنجار میں
الغرض واپس ہوا میں لے کے گھر خالی گھڑا
مسئلہ پانی کا تھا گو یا نزاعِ کاشمیر
بوڑھے بچے مرد و عورت سب کے سب تھے بدحواس
دور تک برتن ہی برتن تھے قطار اندر قطار
میری قسمت میں وہی لکھا تھا "بس خالی گھڑا"
اور میں خالی گھڑا کاندھے پہ رکھے ہوں نڈھال

عبدالکمال خان (بمبئی)

جب نوکری کے لئے درخواستیں دے دے کر تھک گیا اور نوکری نہیں ملی تو سوچا کہ چلو بہ نفس نفیس چل کر ہر کمپنی اور فرم کے دروازے کھٹکھٹاتے ہیں۔ شاید آن دی اسپاٹ نوکری مل جائے۔

گھر سے چلا تو سب سے پہلے ایک فرم کا آفس نظر آیا۔ "بڑھ چڑھ کر پنڈھرپور تمباکو مینوفیکچررز" پہلے تو نام سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر سوچا کہ ہٹاؤ! نام میں کیا رکھا ہے؟ کام سے مطلب ہے۔

آفس کے دروازے پر اونگھتے ہوئے چپراسی نے استقبال کیا اور پوچھا "واٹ از یور نیم؟"

میں نے کہا "مائی نیم از کمال خان"۔ "بولا وہاٹ ڈو یو وانٹ؟" میں نے کہا "باس کو ملنا مانگتا ہے" بولا "وہاٹ از دی کام؟" میں نے کہا "پرسنل" بولا "کارڈ ہینڈ اوور!" میں بولا "کائے کا کارڈ؟" بولا "وزیٹنگ کارڈ!" میں نے کہا "ابھی چھپا نہیں ہے۔" بولا "ادکے یو اسٹے ہیئر! آئی ایم گوئینگ اِن سائیڈ دین کمنگ آوٹ سائیڈ اینڈ دین یو گوئنگ اِن سائیڈ۔" میں نے کہا "بہت بہت تھینک یو صاحب!"

اندر سے بیس منٹ بعد باہر آیا۔ بولا "یو آر گیون دی پرمیشن ٹو گو ان سائیڈ!"

میں اندر گیا۔ دیکھا تو ایک بہت ہی خوبصورت آفس تھا۔ مگر جتنا خوبصورت آفس تھا، اتنا ہی بدصورت آدمی میرے سامنے ایک عالیشان تخت پر بیٹھا ہوا نظر آیا۔ میں نے کہا "مے آئی کم اِن اینڈ سِٹ ڈاؤن سر!" اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ تھوڑی دیر تک یوں ہی دیکھتا رہا پھر بولا۔ "تم مُرنگن چپراسی کا بھائی ہے؟" میرے سر پہ چودہ طبق روشن ہو گئے۔ "جناب! میں نے کہا "آپ کس مرنگن چپراسی کی بات کر رہے ہیں؟"

"وہ جو ادھر بیٹھا ہے! ہمارا چپراسی۔"

"ارے نہیں! آپ بھی غضب کر رہے ہیں صاحب! کہاں وہ چپراسی اور کہاں میں بچاسی!"

"اچھا، اچھا! بیٹھو۔" وہ مسکرایا۔ اس کے پیلے پیلے دانت دیکھ کر میں نے بھی مسکرانے کی کوشش کی اور بیٹھ گیا۔

"ہمارا تماکو!" وہ کہنے لگا۔ "دنیا بھر میں مشہور ہے۔"

"جی ہاں!" میں نے کہا "دنیا بھر میں کیا —— یعنی ساری دنیا میں مشہور ہے!"

اور اتنا کہہ کر وہ کھانسنے لگا اور پچاک سے نیچے کہیں (پتہ نہیں میز کی آڑ میں نظر نہیں آیا) تھوک دیا۔ اور پھر [illegible] ہمارے تماکو میں ایک پرکار کی خوشبو ہوتی ہے۔"

"جی ضرور ہوتی ہے۔ میں نے خود سونگھا تھا۔ کیوڑے سے ملتی جلتی ہے!"

"ہائیں!" اس کے چہرے کی رنگت بدل گئی "کیوڑے سے ملتی جلتی ہے؟"

"جی کیوڑا، کیوڑا ..... پھول کا نام ہے۔ بڑی اچھی ہوتی ہے اس کی خوشبو!"

"ہاں ہاں! اور ..... اور ہمارے تماکو میں ایک پرکار کا کیمیکل ڈالا جاتا ہے جس سے آدمی کو کینسر نہیں ہوسکتا۔ بلکہ ٹی بی بھی نہیں ہوسکتی۔"

"بالکل!" میں نے سر ہلایا "کیمیکل ڈالنے سے ملیریا بھی نہیں ہوتا ہے۔"

"ہاں، ویری گڈ! .... اچھا اور ہمارا تماکو کہاں کہاں ایکسپورٹ ہوتا ہے۔ تم کو معلوم ہے؟"

میں نے کہا "ارے صاحب، یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے! آپ کے تماکو کو کون نہیں جانتا،

میں نے نام یاد کرنے کی کوشش کی، مگر یاد نہیں آیا۔ اس لئے آگے بڑھا۔ "آپ کا تماکو تو .... میں نے ایک روز کہیں اخبار میں پڑھا تھا۔ انگلینڈ، فرانس، جرمنی، کیرڈیا، سیلون، ویت نام، بنگلہ دیش، برما، جاپان، پرتگال اور .... اور .... کینن چینگا، درۂ خیبر .... اب کیا کیا بتاؤں بہت بہت مشہور ہے آپ کا تماکو۔"

وہ ہنسنے لگا "ایک نام تم بھول گیا۔"

میں شرمندہ سا ہو کر بولا "جی کونسا؟"

"یونائیٹڈ اسٹیٹس آف امریکہ!" اس کا سینہ بلکہ شاید پیٹ فخر سے پھول گیا۔

میں بولا "اوہ! آئی ایم سوری! اتنا اہم نام میں بھول گیا تھا۔ میں بھی کیا ....."

تھوڑی دیر تک وہ فخریہ انداز میں مجھے دیکھتا رہا پھر سنجیدہ ہو کر بولا۔

"مگر تم کو ... یعنی آپ کو ہمارا تماکو کاہے کے لئے چاہیئے۔"

میرے خون کی گردش رک گئی۔ پھر نارمل ہو کر بولا "کاہے کے لئے بھی نہیں۔"

"پھر تمہارا ادھر آنے کا وہاٹ از دی پرپز؟"

میں بولا "کوئی کام وام چاہیئے تھا۔"

"کاہے کا کام؟"

"کوئی بھی! میں بی اے، پاس ہوں۔ ٹائپنگ جانتا ہوں اور اکاؤنٹس بھی ... تھوڑا بہت۔"

وہ غصے میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا "تم نے ہمارا ٹائم اتنا کاہے کے لئے خراب کیا؟ ہائیں؟؟؟

پہلے بولنے کے لئے منہ دکھتا تھا کیا؟ .... میں سمجھا آرڈر مانگنے کے لئے آیا ہوگا۔ تم تو الٹا ہم کو اُلّو

دے رہا ہے .... ادھر سالا ہمارے لئے نوکری
نہیں ہے ۔ کوئی کام نہیں ہے ۔
تم کو کدھر سے کام دے گا؟ .... گیٹ آؤٹ!
جی چاہا کہ ایک زوردار گھونسہ جبڑے پہ رسید کروں
مگر ......

گھومتے گھومتے پھر ایک بورڈ پر نظر پڑی بورڈ
پر گرد جم جانے کی وجہ سے نام سمجھ میں نہیں آرہا تھا ہاں
"اینڈ کمپنی" کچھ کچھ نظر آرہا تھا ۔ میں نے سوچا چلو
دیکھتے ہیں ۔ فرسٹ فلور پر آفس تھا۔ وہاں پہ بورڈ
ذرا صاف تھا۔ لکھا تھا "بلیک اینڈ وائٹ اینڈ کمپنی"
باہر کوئی چپراسی نہیں تھا۔ آفس کا دروازہ اس طرح
بند تھا کہ اندر کیا کچھ ہو رہا ہے۔ سمجھ میں نہیں آیا، کال
بیل بھی نہیں تھی ۔ دروازہ کھٹکھٹانا بھی اچھا نہیں لگا
پھر دروازے کے ہینڈل کو پکڑ کر آہستگی سے باہر کھینچا
اندر سے ایرکنڈیشنڈ کی سرد ہوا باہر آئی، دل خوش
ہو گیا۔ مگر اندر ایک صاحب میز پہ سر دھرے خراٹے
لے رہے تھے ۔ اور کوئی نہیں تھا اندر ۔
کیا کروں سمجھ میں نہیں آیا۔ کیسے جگاؤں انہیں؟
تالی بجا کر، جھنجھوڑ کر یا پکار کر! جی چاہا کہ لوٹ جاؤں
مگر خدا کا شکر کہ اچانک فون کی گھنٹی بج اٹھی، اور
وہ ہڑبڑا کر اٹھے پہلے تو ان کا ہاتھ فون پر گیا مگر
مجھے یوں سامنے کھڑا دیکھ کر وہ بُت کی طرح مجسم ہوگئے
شک کی لہریں میں ان کی آنکھوں میں برابر دیکھ رہا تھا
مجھے کچھ سوجھا نہیں تو مسکرانے لگا۔ فون کی گھنٹی مسلسل
بج رہی تھی ۔ مجھے مسکراتے دیکھ کر ان کی نظریں خونخوار
ہو گئیں، میں کھنکھار کر بولا "فون ... فون کی گھنٹی ...
بج رہی ہے "
پھر جب تک وہ ریسیور اٹھاتے، گھنٹی کی آواز بند ہو گئی
میں نے کہا "گڈ آفٹر نون .... میرا نام کمال خاں ہے
مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہاں کوئی ویکنسی ہے ۔
اس لئے چلا آیا "
" جیسے چلے آئے ہو ویسے چلے جاؤ ....." انہوں نے
نتھنے پھلا کر کہا، اور پھر سونے کا ارادہ کرنے لگے ۔
مگر آنکھیں بند کرتے کرتے کھول دیں ۔ شاید انہیں
خیال آیا کہ میں کھڑا ہوں ۔ ویسے اُن کے یہاں کوئی
قیمتی چیز تو نہیں تھی ۔ پھر بھی ....
"آپ کو کسی ٹائپسٹ کی ضرورت نہیں ہے " میں نے
قسمت آزمانے کے لئے بات شروع کی ۔
"ہے! مگر لیڈی ٹائپسٹ کی " انہوں نے گھورتے ہوئے کہا
" سیلز مین کی بھی نہیں ۔ ؟"
"اچانک ان کے چہرے پہ تبدیلی سی آگئی اور چہرہ پرسکون
ہو گیا۔ بلکہ وہ شاید کچھ سوچنے کے موڈ میں نظر آنے لگے
پھر بولے " اچھا بیٹھ جاؤ " ۔
میں بیٹھ گیا ۔
بولے " تم کو معلوم ہے، ہم کیا دھندہ کرتے ہیں " ۔
میں نے کہا ۔ " جی نہیں "
انھوں نے اپنے سر کے بالوں کو جھٹکا دیا اور
ایک وگ اتار کر میرے سامنے میز پہ رکھ دی ۔
میں سمجھ گیا " اچھا، اچھا، بہت خوب! "
وہ مسکرانے لگے، انہیں مسکراتے دیکھ کر میرا دل بھی
خوش ہو گیا ۔ پھر کچھ دیر تک خاموشی رہی ۔ میں ان کے
شفاف و چمکدار سر کو تکنے لگا ۔
پھر وہ اپنا سر ہلانے لگے اور انگلی سے اپنی کنپٹی کو

ہٹو نکنے لگے ۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کچھ سوچ رہے ہیں
تھوڑی دیر بعد ایک گہری سانس لے کر بولے ۔
"ٹھیک ہے !" ——— "ہمیں ایک سیلز مین کی
ضرورت ہے ۔ مگر پہلے میں اپنے پارٹنر مسٹر وائٹ
سے بات کرنا ضروری سمجھتا ہوں ۔"
"بصد شوق !" میں نے کہا ۔
بولے "ویسے تو وہ کچھ کہیں گے نہیں ۔ کیونکہ میرا شیئر
اس فرم میں اُن سے زیادہ ہے ۔ اور اس وقت وہ
ملیں گے بھی نہیں ۔ کل ہی کہہ رہے تھے کہ انہیں کوٹھاپور
میں ایک میٹنگ میں جانا ہے ۔ خیر میں تمہارا انٹرویو
لینا شروع کرتا ہوں ۔"
میں سنبھل کر اچھی طرح بیٹھ گیا ۔ کالر ٹھیک کیا ۔ بالوں
کو سنوارا اور کھنکھار کر بالکل تیار ہو گیا ۔
انہوں نے چھت پر تکتے ہوئے پہلا سوال کیا "اس
سے پہلے کہاں کام کرتے تھے ؟"
"جی دھوبی گلی میں ایک کنگھی بنانے کی فیکٹری تھی ۔
وہاں تین سال کام کیا ہے ۔"
"کنگھی کے بارے میں کیا جانتے ہو ؟"
"جی کنگھی چھ قسم کی ہوتی ہے ۔ پہلی کنگھی جس سے
بالوں کو سنوارا جاتا ہے ۔ اس میں پنتالیس دانت ہوتے ہیں"
"دانت ! — کیا مطلب ؟" وہ چونک گئے ۔
"جی وہ کنگھی میں ہوتا ہے نا ...... میں نے اشارے
سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی "یعنی ایک کنگھی ہے ۔
جو یعنی مین چیز جو کنگھی میں ہوتی ہے ۔ جس کے بغیر
بال سنوارے نہیں جا سکتے ۔"
جب وہ سمجھے نہیں تو میں نے قلم سے کنگھی کی تصویر
بنا کر انہیں بتائی ۔ تب وہ سمجھے ۔

اور ایک قسم کی کنگھی وہ ہوتی ہے جس سے عورتیں
سروں سے جوئیں وغیرہ نکالتی ہیں ۔
اس میں اڑتالیس دانت ہوتے ہیں ۔ یہ بڑی مضبوط
ہوتی ہے ۔" ———
"تیسری قسم کی کنگھی حجام وغیرہ استعمال کرتے ہیں"
"اس میں کیا خاص بات ہوتی ہے ؟" انہوں نے پوچھا
اور اس میں کتنے دانت ہوتے ہیں ؟"
"اس میں خاص بات یہ ہوتی ہے کہ اس میں دانت
نہیں ہوتے ہیں ۔"
"پھر کیا ہوتا ہے ؟"
"آرے ہوتے ہیں ۔ اس کنگھی کی مدد سے حجام یا
نائی بہت کم وقت میں حجامت بنا لیتے ہیں ۔ اس سے
فائدہ یہ ہوتا ہے کہ قینچی اور استرے بہت دنوں
تک استعمال میں آتے ہیں ۔"
"اچھا اور ؟"
"چوتھی قسم کی کنگھی ..."
"نہیں نہیں ، چھوڑو اسے" انہوں نے منہ بنا کر میری
بات کاٹی ، دوسرا سوال ... کہاں تک پڑھے ہو ؟"
"جی بیچلر آف آرٹس ہوں ۔"
"یہ کیا ہوتا ہے ۔" انہوں نے چونک کر پوچھا
جی بیچلر آف آرٹ ، یعنی بی ، اے ۔"
تو ایسا کہو نا ! .... اچھا .... تو وہ پہلی والی نوکری تم نے
کیوں چھوڑ دی ؟"
"جی وہاں ..... ایسا ہو گیا تھا نہ کہ ..... میں فوری طور پر
سوچنے کی کوشش کرنے لگا ۔ اچانک خیال آیا ۔ بولا
"اس کمپنی کا مالک مر گیا تھا ، اور کمپنی بند ہو گئی تھی ۔"
اوہ ، ہوہو ،... وہ افسردہ سے ہو گئے اچھا وِگ کے

بارے میں کچھ جانتے ہو؟"

"جی ہاں! کیوں نہیں!! وگ بڑے کام کی چیز ہوتی ہے"

"کیا کام میں آتی ہے؟" انہوں نے کچھ اس انداز سے پوچھا جیسے اب میری چھٹی کر دیں گے۔

"دھوپ سے بچاتی ہے سر کو! ... اور آدمی اگر بڑھا ہو تو جوان لگتا ہے ... اسے پہننے سے۔"

"ویری گڈ! اور!"

"اور لڑائی جھگڑے میں کوئی بال پکڑ کر کھینچے تو ..."

میں ہنسنے لگا "آپ خود سمجھ سکتے ہیں۔"

"ویری ویری گڈ! یعنی ہاتھ نکل جاتا ہے اور دُم رہ جاتی ہے۔" وہ بھی مسکرائے۔

"جی ہاں! اور سر پہ کوئی چپت مارے تو لگتا بھی نہیں ہے۔"

"اور کوئی فائدہ وگ کا!"

"اب آپ ہی کچھ بتائیے" میں نے خاکسار بنتے ہوئے کہا

"وگ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے" انہوں نے تن کر کہا کہ وگ آدمی کو آدمی بناتی ہے۔ آدمی کی پرسنلٹی کو نکھارتی ہے، اور آدمی کے دماغ کو تر و تازہ رکھتی ہے۔"

"سبحان اللہ بلکہ ماشاء اللہ۔ میں نے بڑے ہی تعریفی لہجے میں اور بہت ہی زیادہ متاثر ہو کر کہا۔ "آپ نے وگ کے سلسلے میں سائیکلوجیکل یعنی نفسیاتی نکتے سے جو بات کہی، اس کی تو تعریف ہی نہیں ہو سکتی۔ بہت بہت ہی خوب!"

ان کا چہرہ خوشی سے اتنا مالا مال ہو گیا، گویا دنیا میں اب ان کے سوا کوئی مائی کا لال نہیں ہے جو ان سے ٹکر لے سکے۔ پھر کچھ دیر بعد بولے۔

"اچھا تم یہ جانتے ہو کہ ایک انسان کے سر پہ کتنے بال ہوتے ہیں؟"

میں نے کہا "آپ عورت کے سر کے بال کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں، یا مرد کے؟"

"دونوں کے۔"

"مرد کے سر پہ پینتالیس ہزار چار سو اڑتالیس اور عورت کے سر پہ پینتالیس ہزار چار سو پینتالیس بال ہوتے ہیں اور پھر اُن کے سر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا" اور ایک عالم و فاضل مرد کے سر پہ بال ہوتے ہی نہیں ہیں۔"

اچھا، اچھا، ان کے دانت نکل پڑے۔ پھر سنجیدہ ہو کر بولے "اچھا یہ بتاؤ، ایک نارمل سر کی لمبائی، چوڑائی اور گہرائی کتنی ہوتی ہے؟"

میں بولا "آپ نے ایک نارمل ناریل تو دیکھا ہی ہوگا بس سمجھئے ایک نارمل ناریل اور ایک نارمل سر کی لمبائی اور چوڑائی میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اور گہرائی کا ایسا ہے ناکہ یہ آدمی کے دماغ پر منحصر ہوتا ہے۔ اب آپ کے سر میں میرے خیال سے گہرائی ہی گہرائی ہو گی۔ اور میرے سر میں تو اب کیا بتاؤں ....!"

وہ الجھن میں پڑ گئے۔ پھر بولے "اچھا ایک سر کا وزن کتنا ہوتا ہوگا؟"

"بھیجے کے ساتھ، یا بھیجے کے بغیر"

"بھیجے کے ساتھ۔"

"گیارہ اعشاریہ پانچ سات آٹھ دو پونڈ!"

"اور بغیر بھیجے کے۔"

"اعشاریہ پانچ سات آٹھ دو پونڈ۔"

"ہوں!" وہ سر ہلانے لگے۔ پھر اپنا سر ٹٹولنے بھی لگے۔ پھر میری طرف گھور کر بولے "بھلا میرے سر کا وزن کتنا ہوگا؟"

"پندرہ اعشاریہ پانچ سات آٹھ دو پونڈ!" میں نے اُن کے

سر کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔
یہ سننا تھا کہ اُن کی باچھیں کھل گئیں۔ اور بولے
"تمہارے تمام جواب صحیح ہیں۔ تم بہت قابل آدمی ہو"۔
میں خوش ہو کر بولا "تو سیلز مین کی نوکری پکّی؟"
"ابھی کہاں سے کی پکّی! ابھی تمہارا انٹرویو ختم نہیں ہوا۔"
میں مری ہوئی آواز میں بولا "تو پھر پوچھئے اگلا سوال!"
"سوال نہیں!" انہوں نے فلسفیانہ انداز میں کہا "اب
میں تمہارا امتحان لونگا۔"
"کیسا امتحان" میں گھبرا گیا۔
"آہا.... ہا..." وہ ہنسنے لگے "اصلی چیز تو یہی ہے۔
تمہیں سیلز مین کی نوکری چاہیئے۔ ہے نا؟"
میں نے سر ہلایا۔
"تو سمجھو کہ میں ایک خریدار ہوں۔ اور تم سیلز مین ہو۔
اب یہ وِگ ہے۔ اسے مجھے فروخت کرنے کی کوشش کرو"
میں چکرا گیا۔ کبھی زندگی میں ایسے انٹرویو سے سابقہ نہیں
پڑا تھا۔ وہ کہنے لگے کیا سوچ رہے ہو؟ اگر ایک
اچھے سیلز مین ہو تو اسے مجھے فروخت کر کے دکھاؤ۔"
میں نے وِگ اٹھائی اور باہر جانے لگا۔ وہ گھبرا کر اٹھنے لگے
مگر میں نے انہیں تسلی دی کہ میں ان کی وِگ لے کر بھاگ
نہیں رہا ہوں۔ باہر سے سیلز مین بن کر آتا ہوں' وہ
تیار رہیں۔ پھر باہر جا کر میں نے دل ہی دل میں انہیں
ہزاروں گالیاں دیں۔ اور پھر آہستگی سے دروازہ کھول
کر اندر جھانکا۔ وہ آنکھیں پھاڑے دروازے ہی
کو گھور رہے تھے۔ میں نے کہا۔
"مے آئی' کم اِن!"
"یس کم اِن!"
"گڈ آفٹر نون!"

"گڈ آفٹر نون!" وہ بھی شاید سمجھ گئے تھے کہ میں سیلزمین
کی اداکاری کر رہا ہوں۔ اس لئے وہ خود بھی اداکاری پر
تل گئے تھے۔
"یس پلیز!" انہوں نے پوچھا۔
"دیکھئے' یہ وِگ ہے" میں بولا۔
"اچھا ہے تو"
"کبھی دیکھی ہے ایسی وگ!"
"کیوں نہیں!" ہم لوگ خود وِگ بناتے ہیں"
"اچھا" اب میری گاڑی رک گئی تھی۔ پھر بھی میں
نے کہا۔ "اچھا' مگر اس وگ سے اچھی نہیں بناتے ہونگے"
"اس سے بھی اچھی بلکہ ساری دنیا میں ہماری وگوں سے
زیادہ اچھی ...."
"ٹھہریئے' ٹھہریئے! میں نے انہیں روکا "مگر
آپ کا سر گنجا کیوں نظر آرہا ہے۔ آپ وِگ کیوں نہیں؟"
"وِگ پہننے سے سر پہ بوجھ لگتا ہے" انہوں نے کہا۔
"مگر وِگ پہننے سے دماغ تر و تازہ رہتا ہے۔ آدمی
کی پرسنلٹی نکھر جاتی ہے۔ آدمی جوان نظر آتا ہے۔
اور وگ آدمی کو آدمی بناتی ہے۔
"ویری گڈ! مگر میں ابھی بوڑھا نہیں ہوا ہوں' اور
میری پرسنلٹی ماشاءاللہ بہت اچھی ہے۔ اور دماغ
تو .... اس کا کیا پوچھنا! ارسطو اور افلاطون کے
دماغ بھی میرے دماغ کے سامنے ایسے ہی ہیں جیسے
تربوز کے سامنے انگور!"
میں نے کہا "آپ کی شادی ہو گئی ہے۔"
"بالکل! ساڑھے سات بچوں کا باپ ہوں!
"سس ... ساڑھے سات" میری آواز پھنس سی گئی۔
"اہ .... اہ .... ہا .... وہ سر ہلا کر یوں مسکرانے لگے

جیسے میں ایکدم اُلّو کی دم فاختہ ہوں۔

"نہیں سمجھے نا! ... اسی لئے کہہ رہا تھا کہ میرا دماغ"

"تو پھر سمجھا ہی دیجئے۔ میں گھگھیا کر بولا۔

"سات بچے ہیں میرے .... ایک ابھی پیدا ہونے والا ہے ساڑھے چار مہینے باقی ہیں .... وہ مسکرائے اور بھویں اُچکا کر مزاحیہ انداز میں مجھے دیکھنے لگے۔

"اچھا تو آپ کی شادی ہو گئی ہے۔" میں سنجیدہ ہو گیا۔

"تو یہ وگ آپ کے لئے بڑی مفید رہیگی۔

"وہ کیسے!"

"آپ کی بیوی پیار سے کبھی آپ کے سر پہ چپت تو لگاتی ہی ہو گی۔"

"بالکل نہیں! میری بیوی کے دونوں ہی ہاتھ نہیں ہیں اب میرا دماغ ایک دم سُن ہو گیا تھا۔ آخر بولا۔

"دھوپ میں آپ کا سر گرم ہو جاتا ہو گا۔ راہ چلتے لوگوں کو بھی تکلیف ہوتی ہو گی! یعنی سورج کی کرنیں جب آپ کے سر سے ٹکرا کر لوگوں کی آنکھوں میں ...

"پہلی بات تو یہ ہے کہ میں دھوپ میں کہیں جاتا ہی نہیں ہوں۔ اور جاتا بھی ہوں تو اپنی کار میں جاتا ہوں۔"

انہوں نے میری بات کاٹ کر جواب دیا۔

"کبھی کار خراب بھی ہو جاتی ہو گی۔"

"تو ٹیکسی کر لیتا ہوں۔"

"ٹیکسیوں کی ہڑتال ہو جانے پہ کیا کرتے ہیں؟"

"تب تک میری کار کی مرمت ہو جاتی ہے۔"

"اگر دونوں ہی چیزیں ایک ساتھ ہو جائیں تو، یعنی ہڑتال بھی ہو اور آپ کی کار بھی خراب ہو تو ...؟

"تو میں گھر سے باہر ہی نکلتا نہیں ..."

اب میں سوچنے لگا کہ کیا کروں؟ وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں بولا "بیز وگ کے لوگ آپ کو چڑھائیں گے آپ پہ پھبتی کسیں گے۔ خاص طور پہ بچے"

"کیسے چڑھائیں گے؟"

"چپڑ گنجو کہہ کر!"

"میں چڑھوں گا ہی نہیں"

"ایسے کیسے نہیں چڑیں گے" میں غصّے سے بولا "دیکھئے میں آپ کو چڑاتا ہوں" یہ کہہ کر میں نے آستین چڑھائیں اور بولا۔

"ابے او چپڑ گنجو! یہاں بیٹھے بیٹھے کیا بکواس کر رہا ہے گنجے کی اولاد! خدا نے تجھے ناخن نہیں دیا ہے۔ شکر کر! ورنہ سر کھجا کھجا کر زخمی کر لیتا اپنے آپ کو .... نامعقول اُس کی آنکھیں غصّے سے پھیلنے لگیں اور چہرہ سرخ ہو گیا۔ نتھنے پھولنے پچکنے لگے۔

میں کہتا گیا۔ "یہ تیرا سر ہے؟ یہ تیرا سر نہیں اُبلا ہوا انڈہ ہے! اور تیرے سر کے اندر ہے کیا ...! گوبر بھرا ہوا ہے گوبر ... تیرے سر کا وزن اعشاریہ پانچ سات آٹھ دو پونڈ بھی نہیں ہے .... تیرا سر سر نہیں ... کھوکھلا ناریل ہے ... مگر ناریل بھی گنجا نہیں ہوتا۔ خدا نے اسے بھی بال عطا کئے ہیں۔ مگر تجھے .... ! تجھے ایک بال بھی عطا نہیں کیا گیا۔ تو چپڑ گنجو نہیں بلکہ چپڑ ... چپڑ .... چپڑ گنجو ہے۔"

اب اس سے پہلے کہ میں آگے کچھ کہتا، وہ مجھ پہ زخمی شیر کی طرح جھپٹے اور میز کے ساتھ ہم دونوں نیچے آ رہے۔ ان کا سر فرش سے ٹکرایا اور میری ناک دیوار سے۔ میری آنکھوں کے سامنے رنگ برنگے لہریئے ناچنے لگے ذرا ہوش ٹھکانے آئے تو دیکھا، چپڑ گنجو صاحب فرش پہ پڑے ہانپ رہے ہیں، میں فوراً اٹھا اور اس طرح سے بھاگا، جیسے کوئی خبیث روح میرا پیچھا کر رہی ہو — ▲

فلم بینی

الیاس صدیقی

سُنا ہے فلم بینی زندگی کی اک ضرورت ہے   سُنا ہے علم اور تہذیب کو بھی اس کی حاجت ہے
کہا جاتا ہے فلمیں بستیوں کی زیب و زینت ہیں   یہ تہذیب و ثقافت اور ترقی کی علامت ہیں
اگر فلمیں نہ ہوں یہ زندگی دشوار ہو جائے   دلِ انسان اس دنیا سے ہی بیزار ہو جائے
مجھے حیرت نہیں ہے آپ کی بیجا عقیدت پر   میں اک شاعر ہوں رہتی ہے نظر جس کی حقیقت پر

حقیقت فلم کی سب پر عیاں کر دوں تو اچھا ہے
حقائق اور اندیشے بیاں کر دوں تو اچھا ہے

اِنھیں سے نوجوانوں نے محبت کا چلن سیکھا   انھیں سے رہزنی ڈاکہ زنی چوری کا فن سیکھا
اِنھیں فلموں کے باعث عاشقی کا نام زندہ ہے   بغاوت جرم اور آوارگی کا نام زندہ ہے
شریکِ زندگی کو گھر کی اک لونڈی سمجھتے ہیں   یہ دنیا رائے کو خوابوں کی شہزادی سمجھتے ہیں

مٹکنا ناچنا گانا انھیں فلموں نے سکھلایا   دواخانوں کا رستہ بھی انھیں فلموں نے دکھلایا
قویٰ ہیں مضمحل لاغر بدن ویران سی آنکھیں   جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں
عقابی روح کیا پیدا رہے گی ان جوانوں میں   نظر آئے گی کیسے ان کو منزل آسمانوں میں

سبق پڑھتے ہیں مسلم تاج بیٹر سے شجاعت کا
لیا جائے گا ان سے کام دنیا کی امامت کا

انھیں سے لڑکیوں نے دل لگی اور دلبری سیکھی   ادائیں بانکپن ناز و ادا عشوہ گری سیکھی
اشارے بازیوں کا بے وفائی کا چلن سیکھا   فقط عریانیت اور ناچنے گانے کا فن سیکھا
انھیں فلموں سے وہ بے پردگی کا درس لیتی ہیں   انھیں فلموں سے وہ آوارگی کا درس لیتی ہیں
اطاعت اور وفا کے سارے بندھن توڑ دیتی ہیں   کسی کے ٹوکنے پر وہ شرافت چھوڑ دیتی ہیں

غرض یہ فیصلہ قدرت کا ہے جو ٹل نہیں سکتا
کہ ان کی گود میں کوئی مجاہد پل نہیں سکتا

کسے معلوم تھا قسمت میں ایسا دن بھی آئے گا   گھروندے کی طرح ہر خواب اپنا ٹوٹ جائے گا
حقیقت خانۂ کعبہ کی فلموں میں بیاں ہوگی   سحر اسلام کی تھیٹر کے پردے سے عیاں ہوگی
ضرورت ہے کہ اب بھی خواب سے بیدار ہو جائیں   وگرنہ اپنے بد انجام کو تیار ہو جائیں

ہماری فلم بینی خون کے آنسو رلائے گی
بھنور میں فلم کے ملت کی کشتی ڈوب جائیگی

مختار یونس
مالیگاؤں

(پرچہ علم الخواتین)

ھدایت: کامیابی کے لیے ہر سوال حل کرنا لازمی ہے۔

سوال: وجوہات بیان کیجئے:
(۱) خدا نے حوا سے پہلے آدم کی تخلیق کی ہے مگر خدا کے بندے "لیڈیز فرسٹ" پر آمادہ ہیں؟
(۲) ایکٹریس کی نجی زندگی گھناؤنی ہوتی ہے پھر بھی ان کے دیدار کے لیے ٹکٹ کا بلیک ہوتا ہے۔
(۳) بیوٹی کوئین Beauty Queen مقابلہ میں نا محرم مرد "جسم پیمائی" کرتے ہیں۔ پھر بھی والدین صاحبزادیوں کو ملکہ حسن بنانے کے لیے بے تاب ہوتے ہیں؟
(۴) بیوی ہر معاملہ میں شوہر سے مکمل تعاون کرتی ہے پھر بھی وہ نصف بہتر کہلاتی ہے؟
(۵) ہیرو کی ہیروئن سے چھیڑ چھاڑ پر فلم بین خوش ہوتے ہیں مگر یہی حرکت ویلن دہرائے تو فلم بین کی غیرت جوش میں آجاتی ہے؟

سوال ۲: ہر عنوان پر مضمون لکھیے:
(۱) شوہر / بیوی کو قابو میں کرنے کے سائنٹفک طریقے (۲) اگر میں قاضی نکاح ہوتا (۳) میرا پسندیدہ رقیب۔
(۴) مجنوں کی آپ بیتی (۵) چوپاٹی پر محبوب کے ساتھ ایک شام۔

سوال ۳: رقیب روسیاہ کے نام خط لکھیے جس میں اُسے محبوبہ کے والد خوفناک کا حلیہ رقم کیجیے۔ محبوبہ ہرجائی ہے۔ اس کی فرضی مثالیں گڑھ کر لکھیے۔ اسے اللہ سے لو لگانے کی تلقین بھی کیجیے۔ خط کے آخر میں اسے عشقِ محبوب سے دست برداری کی درخواست کیجیے۔

سوئمبر کی رسم موضوع پر پرتھوی راج چوہان سے انٹرویو لیجیے۔ اس سے سنجوگتا کے خصائل دریافت کیجیے۔ نیز آج کے زمانے میں سوئمبر میں دوشیزائیں کنواروں کو گھوڑے کی بجائے اسکوٹر پر بھگا لے جاتی ہیں۔ اس بات سے انہیں آگاہ کیجیے اور انہیں دوسرا جنم لینے پر اکسائیے۔

سوال ۴: (الف) قوسین سے مناسب لفظ لے کر خانہ پری کیجیے۔
(۱) مثالی بیوی اپنے ———— سے بے حد پیار کرتی ہے (زیور / دیور)
(۲) ———— کے استعمال سے خوب صورتی میں اضافہ ہوتا ہے (سنو پاؤڈر / سیاہ برقع)

(۳) عاشق صادق کو ______ سے ڈرنا چاہیے (سگِ محبوب/سماج کے ٹھیکیدار)
(۴) عورتیں اپنے ______ کی برائی برداشت نہیں کر سکتیں (سسرال/میکہ)
(۵) باتونی ہونا عورتوں کا پیدائشی ______ ہے (حق/فرض)
(ب) مندرجہ ذیل جوڑیاں صحیح ہیں یا غلط نمک مرچ لگا کر لکھیے۔

کالم الف	کالم ب
(۱) سالہ	نیا جوتا چرانے میں ایکسپرٹ
(۲) ساس × بہو	خانہ جنگی کے موجد
(۳) جہیز	دولہے کی قیمت فروخت
(۴) طلاق	بیوی کی رخصتی
(۵) مینا بازار	میک اپ مارکیٹ

سوال ۵ (الف) ایک لڑکی کی شادی میں ایک دولہے نے ایک اسکوٹر، ایک بنگلہ، ایک کار اور کشمیر میں ہنی مون منانے کا کل خرچ جہیز میں مانگا۔ بارات T.A. اور D.A (سفری اور مہنگائی بھتہ) لڑکی کے باپ نے قرض لے کر ادا کیا۔ منڈپ کی لائٹنگ اور باراتی کے بینڈ باجے کے آرکسٹرا میں کل اخراجات کا ۵۰ فی صدی خرچ ہوا۔ بتاؤ شادی کے بعد لڑکی کا باپ کون سے فٹ پاتھ پر بھیک مانگ رہا ہے؟
(ب) آپ کا رقیب شب فراق میں چھت پر لیٹے لیٹے پچاس تارے ۵ سیارے اور ایک چاند گن لیتا ہے۔ بتاؤ وہ چارٹرڈ اکاونٹنٹ (فرینکسرا) میں بنے گا۔
(ج) اگر خواتین ہونٹوں پر مہندی لگائیں تو پرمننٹ سرخی حاصل ہوگی اور پان ولپ اسٹک کی عادت چھوٹ جائے گی۔ اگر یہ مقولہ آپ اپنی پتنی کے آگے دہرائیں تو آپ کا کیا حشر ہوگا؟ آپ زخمی ہوں گے یا بیلن گھائل ہوگا؟
(د) لباس اور بال کے فیشن پر تنقید کرنے والے ناصح حضرات فیشن عام ہونے کے بعد اسی فیشن کو گلے لگا لیتے ہیں کیوں؟
سوال ۶ (الف) ذیل کی اشیاء کی مدد سے اپنے جسم کی تجربہ گاہ یا نبرد گاہ میں گیس "آہ" (A_2H) تیار کیجیے اور بتایئے کہ میر، فانی اور ظفر میں کس کی آہ زیادہ خالص ہے۔
آہ تیاری کی ضروری اشیاء۔

(۱) خون جگر	۵۰ ملی میٹر
(۲) درد دل ______ میٹھا	حسب ضرورت
(۳) شب فراق (کالی) ______	تطبین والی
(۴) بے رخی محبوب ______	۱۰۰ فی صدی
(۵) اشک گرم (عاشق والا)	آٹھ آٹھ آنسو فی چشم کے حساب سے
(۶) دربان کا ڈنڈا ______	ایک ضرب (لوہار والی)
(۷) محبوب کی گلی ______	۷۰ پھیرے روزانہ

(ب) مندرجہ بالا تجربہ کے بعد ذیل کے مشاہدات نوٹ کیجئے اور اپنی ڈائری میں خوش خط لکھیئے۔

(۱) AAH (آہ) گیس کی تیاری میں جگر کے کتنے ٹکڑے ہوئے؟

(۲) تیر نظر نے قلب میں کتنے گھاؤ لگائے (ایکس رے رپورٹ کے مطابق)

(۳) پھیپھڑے کے مرتبان میں آہ کا دباؤ کتنا تھا؟

(۴) سرد آہ اور گرم آہ کا کیمیائی فرق رقم کیجئے؟

(۵) کیا یہ صحیح ہے کہ سرد آہ سائیکل ٹیوب میں بھرنے سے پنکچر کا خطرہ دور ہو جاتا ہے؟

(۶) کیا گرم آہ غباروں میں بھر کر آسمان پر بھیجی جا سکتی ہے؟

(۷) میر کی آہ اور سودا کی "واہ" کا لیبارٹری ٹسٹ کرنے کے بعد آپ نے کیا پایا؟ آنسو یا قہقہے؟

سوال ۷ (الف) ذیل کی ماڈرن ضرب الامثال سے آپ کہاں تک متفق ہیں۔ دس سطروں میں بیان فرمائیے۔

(۱) غریب کی جورو سب کی بیبی

(۲) ایک سوئمنگ پول میں سب ننگے

(۳) ستر پاپ کرکے بلا اپیل کرنے چلا۔

(۴) گھر کی مرغی dog برابر کوئی نہ سمجھے جھاگ برابر

(۵) جان گئی لاکھوں پائے (بیمہ پالیسی کی روشنی میں)

(ب) دیئے گئے ٹسٹ ٹیوب بے بی کا بغور مشاہدہ اور مطالعہ کیجئے اور ذیل کے سوالات کا صحیح جواب الف، ب، ج بیانات سے منتخب کیجئے۔ صحیح جوابات لکھنے والوں کو تین عدد ٹسٹ ٹیوب بے بی مفت۔

(۱) سائنس دانوں نے نلکی زادہ کی تخلیق کی کیونکہ . . . . .

(الف) زلزلہ، سیلاب اور فسادات کی وجہ سے دنیا کی آبادی بے حد کم ہو گئی ہے۔

(ب) ٹسٹ ٹیوب بے بی۔ ٹسٹ کھلاڑی بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

(ج) مرد بھی بانجھ ہونے لگے ہیں۔

(۲) اکیسویں صدی کا ہر انسان ـــــ کہلائے گا؟

(الف) ابن آدم

(ب) ابن بندر

(ج) ابن لیبارٹری

(۳) ٹسٹ ٹیوب بے بی کی پیدائش پر ـــــ میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔

(الف) اہل مذاہب کے ○ حلقے میں

(ب) فیملی پلاننگ کے ▽ تکون میں

(ج) شوہر ایسوسی ایشن میں۔

غزلیں

نشتر سیوانی

دلوں کی "واشنگ" تو ہو نہ پائی نکھرتا کسطرح ذہن یارو — اُسی کے آزادی ہاتھ آئی جو عمر بھر تھا غلام صاحب
میں بیٹھا کہنے غزل تو بیگم کو ناشتے کی تھی فکر لاحق — سویرے بچوں کو دونگی کیا میں، نہ جیلی گھر میں نہ جام صاحب
تمہارے ذہن وخیال میں یہ ہُوا" بسا ہے مشاعرہ ہی — وہ جان لیوا ادا سے بولیں مجھے ہوا ہے زکام صاحب
کوئی منسٹر یہاں جو آئے تو گرد پنڈال دیکھیئے پھر — قدم قدم پر جُٹے رہینگے ہیں جتنے چمچے تمام صاحب
اساتذہ کی زمیں پہ کہنا غزل کا آساں نہیں ہے نشتر
مجھے تو ایسا لگا کہ یہ بھی ہے جان جوکھوں کا کام صاحب

* * *

صابر بہاری۔ (رانچی)

خاطر میں میں کیوں نالہ و تالاب کو لاؤں — گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے
آئینہ دکھاتا ہے فضول آکے مجھے کیوں — تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے
گو، ساس، سسر سے ہے مجھے سخت "اِلرجی" — کیوں کر کہوں لو نام نہ اُن کا مرے آگے
ہے آج منگیتر کے یہاں میری ضیافت — آتا ہے ابھی دیکھیئے کیا کیا مرے آگے
صابرؔ کی طرح وہ بھی تھا خوش فکر سخنور
غالبؔ کو بُرا کیوں، کہو اچھا مرے آگے

قطعات

زین العابدین نایابؔ اکولوی

زمیں اوپر جو نیچے آسماں ہوتا تو کیا ہوتا — یہ دالان سر پہ، نیچے سائباں ہوتا تو کیا ہوتا
تمہاری بات کا یہ ڈھنگ میں سمجھا نہیں بیگم — فلانی بات کرنے سے فلاں ہوتا تو کیا ہوتا
یہ تیرا حُسن تیرے ناز، اور موسم بہاروں کا — اگر نایابؔ پہلا سا جواں ہوتا تو کیا ہوتا

مختار شمیم (اندور)

فیشن کی کرامت سے حیراں ہوں خداوندا — لڑکا نظر آتی ہے، لڑکی نظر آتا ہے
لو بیٹھے بٹھائے ہم ٹیچر سے بنے شاعر — اب اپنی تباہی کا ساماں نظر آتا ہے
مختار شمیم اس کو کہتے ہیں جو صورت سے — اللہ کے بندوں میں احمق نظر آتا ہے

رؤف خوشتر
(گلبرگہ)

آتش دوزخ میں یہ....

خورشید کسی جبان سال بیوہ کی ظالم ساس کی طرح پھر آگ برسا رہا تھا۔ اسے جب چراغ پا دیکھتا ہوں تو جسم سے پسینے
ی دھاریں بہنے لگتی ہیں۔ آنکھیں موند کر (میں) اسے دیکھوں؟ بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے) پوچھتا ہوں۔

" سنا ہے تم امریکہ اور یورپ میں زن مرید کی طرح کافی ٹھنڈے مزاج کا مظاہرہ کرتے ہو۔ پھر ایشیا اور آفریقہ
پر تمہارے قہر و غضب کا عتاب کیوں نازل ہوتا ہے؟ کہیں اوروں کی طرح تم بھی نسلی تعصب کا شکار تو نہیں؟

" مغرب میں عریانی اور اخلاقی گراوٹ دیکھ دیکھ کر شرم سی آنے لگی ہے۔ اس لیے وہاں میں اپنا چہرہ
پوشیدہ رکھتا ہوں۔ مشرق میں تپتے جھلستے چہروں پر شرم و حیا کی لالی اور امید کی کرن جھلملاتی نظر آتی ہے۔ اس لیے یہاں
گرم جوشی کا مظاہرہ کرتا ہوں"

عالم خیال میں سورج کا یہ استدلال سن کر میں اس کا معترف ہو گیا اور یہ بات مجھ پر روشن ہو گئی کہ لوگ کیوں چڑھتے
سورج کے آگے جھکتے ہیں۔

تو صاحب گرمیاں آتے ہی ہماری سرگرمیاں یوں رخصت ہو جاتی ہیں جس طرح بجٹ کی آمد آمد پر اشیائے
خورد و نوش غائب ہو جاتے ہیں۔ تاجروں کے لیے اگر یہ قلت بہترین بہانہ ہے تو موسم گرما سستی کے لیے بہترین زمانہ
ہے جس کے سہارے ہم دفتر اور اپنے آفت کدہ (مکان میں اب دولت کہاں؟) میں بالترتیب وقتی اور ہمہ وقتی عزائق
حیات کے احکامات کی حکم عدولی کی ہمت کر سکتے ہیں۔

اس موسم میں آپ کسی بھی دفتر تشریف لے جائیں تو وہاں سناٹا آپ کا استقبال کرے گا۔ گھبرائیے نہیں۔
ہمت کر کے آگے بڑھیے۔ اندر داخل ہوتے ہی آپ ایک بورڈ پائیں گے جس پر لکھا ہوگا۔ " سر تسلیم خم ہے" مگر
ذاتوں کے بغیر" اس لیے کہ دیواروں کے علاوہ صاحب کے بھی کان ہوتے ہیں۔

تاہم کوئی بیدار مغز افسر اپنے اختیارات کا جیتا جاگتا ثبوت جتانے کی ضد میں اپنے آرام دہ کمرے میں
نیم وا آنکھوں سے کوئی حکم صادر کرتا ہے تو ماتحتین اس مراسلے کو یا تو سراحی کے ٹھنڈے پانی میں بہا دیتے ہیں یا پھر
برقی پنکھے کو اتنی زور سے ہلاتے ہیں کہ بیچارے کاغذ کو براہ کھڑکی فرار ہونے میں ہی عافیت نظر آتی ہے۔

دستی پنکھے پر یاد آیا کہ ہم ایک دن اپنے دوست کے دفتر میں بیٹھے پسینہ میں نہا رہے تھے۔ ہمارے دوست

نے اپنے ساتھی سے ہماری طرف دستی بم پھینکنے کہا۔ ہم جھٹ میز کے نیچے چھپ گئے۔ دھپ کی آواز آئی۔ ڈرتے ڈرتے جب ہم اوپر آئے تو معلوم ہوا کہ وہ فائل کے سرورق کو دستی بم کہتے ہیں۔ جب ہم نے ان کے اس جارحانہ اور گوریلا طرز مذاق پر ناراضگی ظاہر کی تو معلوم ہوا کہ وہ اس طرح کے خطرناک مذاق ہمیشہ کرتے رہتے ہیں کیونکہ ان کی پیدائش دوسری جنگ عظیم کے عین شباب کے وقت واقع ہوئی تھی۔

ہمارے دفتر کے ایک ساتھی گرمیوں کے دنوں میں بھی نئے دولہے کی طرح کوٹ میں مقید رہتے تھے۔ ان کی نوٹ وابستگی تو سب پر عیاں تھی۔ لیکن کوٹ وابستگی نہاں تھی۔ ایک دن وہ اپنے کوٹ سمیت دفتر آئے۔ کوٹ کو بمشکل جسم سے جدا کرکے کیل کے حوالے کرنا چاہا۔ کیل نے ذمہ داری اٹھانے سے انکار کردیا۔ چنانچہ کوٹ فرش پر گرکر آرام سے لیٹ گیا۔ روح افزاء کی بوتل کوٹ کی بدبودار فضا سے چھٹکارا پانے کے لیے جیب سے چھلانگ لگائی تو فرش پر گرکر جام شہادت نوش فرمانے لگی۔ جدید شعراء کے محبوب موضوع کی طرح اس کی شخصیت ٹوٹ کر بکھر گئی۔ اب ہم پر یہ راز کھلا کہ ان کا کوٹ روح افزا کے لیے کنگا رو تھا ہم نے پہلی بار روح افزاء کا روح فرسا منظر دیکھا۔ ہمیں فرش پر رشک آیا۔

یکایک صاحب بوتل نے تخلیہ کا نعرہ بلند کیا۔ ہمارے اخراج کے بعد انھوں نے کمرہ کا دروازہ بند کرلیا۔ اندر سے چٹاخ چٹاخ کی پیہم صدائیں ہمارے کانوں سے ہوتی ہوئی معدہ میں گشت کرنے لگیں۔ دروازہ کھلا اور ان کے ہونٹوں کو دیکھ کر میر کی پنکھڑی گلاب والی غزل بے ساختہ یاد آگئی۔ تب سے وہ کہتے ہیں کہ میرے جسم میں روح دوڑ رہی ہے۔

اس موسم کے شروع ہوتے ہی مدراس کافی ہاؤس، شملہ کولڈ رنگ میں بدل جاتا ہے۔ گرمیوں میں ہم سب فطرت سے اتنے قریب ہوجاتے ہیں کہ بے ساختہ چچا ڈارون یاد آتے ہیں۔ کم سے کم لباس پہن کر ہم ان کے نظریات کو عملی جامہ پہناتے رہتے ہیں۔ ہم نے اپنے پڑوسی کو بروز جمعہ قبل از اذان مسجد کی طرف لپکتے دیکھا تو پوچھا کہ آپ کی اس پیش قدمی کو ایمان کی حرارت سے تعبیر کیا جائے یا ......

انھوں نے کہا " حرارت تو ہے مگر موسم کی۔ مسجد میں چونکہ ایک ہی پنکھا ہے اس لیے جلد جانا سودمند ہے۔ اپنے دوست شرما جی سے ہم نے کہا کہ موسم گرما میں حمام خانہ آرام دہ جگہ ہے۔ انھوں نے کہا گرما ہو یا سرما۔ شرما کے لیے غسل خانہ بہترین پناہ گاہ ہے۔ جب کبھی گرم مزاج بیگم سے کسی بات پر اختلاف رائے کی وجہ سے محاذ آرائی کی نوبت آتی ہے میں غسل خانہ میں پناہ لیتا ہوں۔ میرے لیے تو یہی ایک گوشۂ عافیت ہے۔

اور یوں بھی اس افراط زر دہشت اور پرشور و پرشر ماحول میں یکسو نہ تنہائی حمام خانہ میں میسر ہوتی ہے۔

اس موسم میں ہر ایک شدت گرمی سے زبان لٹکائے ہانپتا رہتا ہے اور زبان ہلا ہلا کر بغیر کہے ایک دوسرے سے مزاج پوچھتا رہتا ہے۔ اس کیفیت کو ہمارے دوسرے چچا غالب یوں فرما گئے ہیں۔ ع

پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

کسی کو ایک لفظ ادا کیے بغیر زبان درازی کا مشاہدہ کرنا ہو تو اس موسم میں دوپہر کے وقت مکان سے نکل کر دیکھیے۔ تھوڑی دیر بعد آپ خود اپنی زبان کو دانتوں کے نرغے سے نکل کر یوں آزاد ہونے کی سعی فرماتے پائیں گے جس طرح ہر ایک کی پیاری زبان (اردو) مخالف حالات کی تپش، زہریلے ماحول کے جبڑوں سے نکلنے کے لیے سرگرم عمل ہے۔

زاہد ہو یا رند، پارسا ہو یا گنہگار، وزیر ہو یا فقیر ہر کوئی حسب سابق اس سال بھی موسم گرما کے متعلق یہی کہے گا۔

" آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں"

حالاتِ حاضرہ
(نظم)

(۱)

نیتا کرے ہے سو ہے ہوشیاری
جنتا کرے ہے سو چوری چکاری
ست میں حصہ دسرمایہ کاری
پیڑھیوں کے لئے تخم کاری
ست و دولت، تجارت و صنعت
دیوتاؤں کی دنیا پجاری
تو ہے جنتا کا نیتا کا رشتہ
اری نچائے بندر یا کماری
ہشائیت ہو کہ جمہوریت ہو
طبقہ حاکم ہے جو ہے بیوپاری
تاج دارو اکرو شکرِ مولا
م آپ کے تو ہیں بھینس دودھاری
ملاتا ہے تھوڑا سا پانی
لیڈروں کی تو حق، چاندماری
کونسل ہے وہاں ہاتھا پائی
ں ہے کمیٹی، وہاں مارا ماری
مرزٹ ہوں گے اُدھر ووٹ مہنگے
ن لڑائے جس کی ہو جیب بھاری
بستی میں ہے غنڈوں کا ڈیرا
سے میں کالج میں، قاتل فراری
نے ہیں بچوں کے تعلیم کیا ہے
بر کی مشقِ ستم اب بھی جاری
نے کے ہمراہ بدلیں نہ پائیں
طعام و رواج و سواری

(۲)

زبانیں، ادب، علم تہذیب اس میں
نہیں آج کچھ بھی گنوایا، گنواری
ہر اِک لڑکا ہے اب امیتابھ بچن
ہر اِک لڑکی ہے آج زینت کماری
گرامر نہ اِملا، ریاضی نہ جملہ
انہیں صرف فلموں کی ہے جانکاری
کہیں خاک پھانکیں، کہیں کھائیں ستو
کہیں نوش جاں ہوں گے کلچے نہاری
ملاوٹ کا کھانا، ملاوٹ کے سکّے
ملاوٹ کی ریاستیں فرمان جاری
فسادی فسادوں کی جڑ کاٹتے ہیں
نہ مردم رہیں اور نہ مردم شماری
پرائی زباں ہو، یا کلچر، یا مذہب
سدا مار دھاڑ کیں گہ سے کاری
زبانوں کی ترویج اکاڈیمیوں سے
چبالیتے ہیں سوکھے ٹکڑے بھکاری
علاقائی درجہ تو دیتے نہیں ہیں
بناتے ہیں اُردو کو میٹھی و پیاری
ادیب اور شاعر، عوام اور فلمیں
لہو ان کا اردو میں جاری و ساری
بڑا آدمی اور طبیعت کا اوچھا
اڑان اس کی اونچی، مگر جسم بھاری
جہیز اور جوڑے کی برکت سے واعظ
ادھیڑ عمر کی لڑکیاں ہیں کنواری

(۳)

بڑے، چھوٹے فرعون ہر جا ملیں گے
علوم اور صحافت نہیں ان سے عاری
گھنے جنگلوں، گاؤں، شہروں میں مرضی
کدھر جائے "گجران جنتا تمہاری"
زبانوں علاقوں و فرقوں کے جھگڑے
یہ تلواریں قاتل، مگر ہیں دودھاری
شکوں کے سوا سیٹھ جی سب کے مالک
عذابِ مسلسل ہے سرمایہ داری
خلوص اور نیت پہ ایسا گہن ہے
لگے جھوٹ سب کو حقیقت نگاری
گرانی، جوانی، جنوں اور طوفاں
شتر بے مہارا و اسپ فراری
فحش اور عریاں رسالے، کتابیں
ادب کی کریں سچی خدمت گزاری
لفنگے، اچکّے، موالی و دادا
کئی ہیں پڑھے لکھے مجرم فراری
کہاں رہنما اور کہاں چور ڈاکو
ہوئی ہے کبھی بھول، کانٹوں میں یاری
اکڑتے پھریں جھنڈے جھنڈے سے لیڈر
محلے محلے کریں تاج داری
یہ غنڈے گرہ کٹ یہ لچے یہ شہدے
الگ ان کا راج اور الگ سکّہ جاری
بتاؤ مرے "ملا" فسادی پجاری
کہاں دفن کی تم نے "پرہیزگاری"؟

پڑھو روز قرآن گیتا و بائبل
عمل سے مگر جھولی خالی تمہاری
"لڑو اور لڑاؤ" کی بنیاد ڈالی
اسی نے سبھی فرقوں کی عقل ماری
دکھاتے ہیں کچھ اور دیتے ہیں کچھ ہم
ہے ناقص بدیسی تجارت ہماری
کہیں سیتا، ڈور، راشن پہ جھگڑا
کہیں نل کے پانی پہ ہے مارا ماری
ترقی کے نقشے ہیں جنتا کی خاطر
مگر زر کا چشمہ کہیں اور جاری
جو نیتا تھا پہلے غریب اور قلاش
ہوئی جیب اور جسم بھی اس کا بھاری
کلرک، آفیسر اور لیبر، منیجر
سبھی حق کے طالب بلا ذمہ داری
سیاسی جماعت کے ٹکڑے پہ ٹکڑے
کبھی ٹکڑے ٹکڑے کی پھر بخیہ کاری
نہیں کوئی منزل سیاسی معاشی
جماعت کے لیڈر کو کرسی ہے پیاری
کبھی وقت پہ کوئی آتا نہیں ہے
ولیمہ ہو یا مجلسِ غم گساری
محلے، جماعت، ادارے کے لیڈر
سبھوں کی ہے زر پر نظر دھن کاری
یہ سردار مکھیا، یہ لیڈر پلیڈر
بہت کم ہیں ایسے، جو حق کے پجاری
زمیں، زر و زن کا پرانا تماشہ
جہاں دیکھئے ہے یہی کھیل جاری
مدارس کا مقصد ہے تنخواہ ٹیوشن
کسی طرح سے اپنی مقصد برآری

عالمِ بالا سے غالب کا خط ہاشم عظیم آبادی کے نام

ہاشم عظیم آبادی

پہلا خط تم کو مل گیا ہوگا
جو لکھا تھا وہ پڑھ لیا ہوگا

آج پھر تم کو لکھنے بیٹھا ہوں
کیا کہوں اپنا حال اچھا ہوں

رنج یکسانیت کا سہنا ہے
کھاتے رہنا ہے پیتے رہنا ہے

یوں تو ہر اجنبی سے بنتی ہے
کوثریوں سے خوب چھنتی ہے

یاں جو پہلے پہل میں آیا تھا
توبہ توبہ عجیب نقشہ تھا

حوریں تھیں سب خیام کے اندر
جا نہ سکتی تھیں خلد سے باہر

سر پہ آنچل ہمیشہ رہتا تھا
بڑھیوں کو بھی سب سے پردا تھا

دام ہستی سے چھوٹ کر جب سے
لڑکیاں آ رہی ہیں مر مر کے

ان کی صحبت میں پڑ کے حوریں بھی
بنتی جاتی ہیں آج کل ٹیڈی

اب تو ان کا بھی چست جمپر ہے
چلنا پھرنا بھی جن سے دوبھر ہے

زلف تو ہے مگر ردا نہ کہاں
شرمگیں چشم نیم باز کہاں

سوچتا ہوں یہ دیکھ کر ان کو
لگ نہ جائے کہیں نظر ان کو

ریش والوں سے کیا ملیں گی یہ
مولویوں کو جب ملیں گی یہ

ان سے کیوں کر نبھے گی جنت میں
خوب ان سے ٹھنے گی جنت میں

اس لئے بھیجتا ہوں یہ پیغام
مولویوں سے کہنا بعد سلام

ٹیڈیوں سے ابھی سے ربط بڑھائیں
ان کے طور و طریق سیکھ کے آئیں

ورنہ ہوگا نباہ ناممکن
ایسی حوروں سے چاہ ناممکن

چونکہ اک دن تمہیں بھی آنا ہے
انہی حوروں کا ناز اٹھانا ہے

اس لئے یہ بتاتا ہوں سن لو
تم خدا سے یہی دعا مانگو

خلد محمود کر اگر دے یا رب
تو بچا ٹیڈی حوروں سے یا رب

صفدر
درودؔ (امرادتی)

شیخ جی مرحوم

شیخ جی ایک منفرد شخصیت تھے۔
قارئین کرام! آپ انہیں کسی عرب ملک کا "شیخ" نہ سمجھیں۔ عرب کے شیخ صاحبان کی جمع ہوتی ہے۔ اردو، ایک سے زیادہ ہو کر "شیوخ" کہلاتے ہیں۔ ہمارے دوست شیخ جی نے اپنے نام کے ساتھ "جی" کا لاحقہ اس لئے جوڑ رکھا تھا کہ اس کی جمع ناممکن ہو جائے اور شیخ جی کی انفرادیت قائم رہے۔

شیخ جی کا واحد مشغلہ، ٹوپیاں پہنانا تھا۔ اب وہ زمانہ تو رہا نہیں کہ جو چیز اپنے لئے پسند کرو وہی اپنے بھائی کے لئے بھی پسند کرو۔ زمانے کے رواج کے مطابق اپنی پسندیدہ چیز یا دوسروں کے متھے مارنے کا سلیقہ شیخ جی کو بھی خوب آتا تھا۔ اسی اصول کے پیش نظر شیخ جی ٹوپی پہننا پسند نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اپنے سر کو خالص رکھنے کی دھن کا یہ عالم تھا کہ موصوف اپنے سر پہ بال تک اگانا پسند نہیں کرتے تھے۔ انہیں فخر تھا کہ خالص چمکیلی کھوپڑی ان کا سر کہلاتی ہے۔ دنیا بڑی ظالم ہے۔ شیخ جی کو کھوپڑی کو خالص کیوں رہنے دیتی لہٰذا اکثر یہ ہوتا کہ یار لوگ شیخ جی کو بھی ٹوپی پہنا دیتے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ شیخ جی کے ٹوپی پہنانے کا انداز معشوقانہ تھا۔ یعنی مخاطب کے بالوں میں محبت بھری انگلیاں گھماتے گھماتے شیخ جی ٹوپی پہنا دیتے جبکہ لوگ زبردستی حدت اور شدت آمیز طریقے پہ شیخ جی کی سرپوشی فرماتے تھے۔ اس حدت اور شدت کے نشانات شیخ جی کی کھوپڑی پہ صاف دیکھے جاسکتے تھے کہ ان کا کاسۂ سر تابنے کے چپکے چپکائے گھڑے کے مشابہ تھا۔

ایک دن شیخ جی کو مغموم پاکر میں نے پوچھا "شیخ جی! کیا بات ہے آپ کے چہرے پہ متانت برس رہی ہے؟" شیخ جی متانت کا قافیہ تھوک کے ساتھ نگلتے ہوئے گویا ہوئے "تم بھی انہیں خبیثوں کے ساتھ ہو! عرض کیا کون حبیث؟ فرمایا "وہی جو مجھ سے چندے کا حساب طلب کرتے ہیں! یہ کہاں کی شرافت ہے کہ چندہ میں کروں اور حساب تم مانگو! ارے تم بھی چندہ کرو!" کیسی معقول بات کہی شیخ جی نے، مگر کسی کے عقل تو ہے نہیں۔ اس لئے چندے کے پیچھے پڑنے کی بجائے شیخ جی کی چندیا کے پیچھے پڑ جاتے تھے، مگر تا کجے؟

بقول شخصے، وقت ہر زخم کو ہر گھاؤ کو بھر دیتا ہے۔ شیخ جی کے گھاؤ بھرتے نہ تھے کہ وہ پھر گھاؤ لگانے یا بالفاظِ دیگر گھاؤ کھانے نکل پڑتے۔ اُن کے دماغ کی زرخیز زمین پر نت نئے پلانز اگتے رہتے۔ اور اس کثرت سے اگتے تھے کہ پلانز کا ایک جنگل ہمیشہ ان کے ساتھ رہتا تھا۔ جس میں شیخ جی شکار کا شوق فرماتے تھے۔ اور خود بھی اس میں رہتے تھے۔

ایک دن شیخ جی پان کی دوکان پہ ملے۔ میں نے ان کی چندیا پہ ہاتھ رکھ دیا۔ بیچارے ایک ہاتھ سے میرا ہاتھ اور دوسرے سے اپنی جیب کے بیں پیسے ہٹانے لگے۔ اب میں بھی اُن کے ساتھ پان کھا رہا تھا شیخ جی کا پان میں بہت مزے لیکر کھاتا اور وہ مجھے یوں گھورتے گویا میں پان نہیں ان کا کلیجہ چبا رہا ہوں۔ پیسے ان کے اپنے ہوں یا دوسروں کے شیخ جی کو اپنے کلیجہ کا ٹکڑا ہی معلوم ہوتے تھے۔ شیخ جی کچھ کھلے تو معلوم ہوا کہ قربانی کے لئے بکرے کی تلاش ہے۔ میں نے یاد دلایا کہ بکرا، بکرا منڈی میں دستیاب ہے۔ سادہ تا ہوں کہ میں تو چائے، پان، سگریٹ اور ناشتہ ملتا ہے۔ شیخ جی غنچہ کی طرح تھوڑا اور کھلے تو معلوم ہوا کہ ایک بکرے کی قربانی عید سے پہلے ہوگی دوسرے کی عید کے بعد میں نے پھر ٹوکا کہ عید پہ نماز سے پہلے قربانی ناجائز ہے۔ فرمانے لگے۔ "جب تک عید سے پہلے ایک بکرا قربان نہیں ہوتا، میں عید کی نماز کے بعد قربان ہونے والا بکرا کیسے خرید سکتا ہوں!" بات میری سمجھ میں آگئی مگر انجان بنتے ہوئے عرض کیا "شیخ جی بندہ حاضر ہے! میں اپنے تیئں پیش کر سکتا ہوں۔" فرمانے لگے "تم تو کاٹنے والے ہو۔ تمہاری قربانی جائز نہیں ہے" شیخ جی کی اِس گالی کا جواب ایک قہقہے کے سوا کیا ہو سکتا تھا کہ ہمیں شیخ جی کی چندیا پر بیس پیسے والا ہاتھ رکھے رہنا تھا۔ پھر عید کے دن شیخ جی کے صاحبزادے گوشت تقسیم کرتے پائے گئے۔ (شیخ جی رفاہِ عام کے لئے کھالیں جمع کر رہے تھے) صاف ظاہر ہے کہ شیخ جی کو بکرا مل گیا تھا۔ یعنی مل گئے تھے عید سے پہلے قربانی کے لئے اور پھر عید کے دِن قربانی کے لئے شیخ جی کی کھوپڑی پہ چمکتی بکروں کی گنتی پڑھنے میں ایک آنکھ والے کو بھی کوئی دشواری پیش نہیں آتی تھی پھر بھی الغرض بکرے مِل ہی جاتے تھے۔ لوگ کہتے ہیں رزق انسان کو ڈھونڈ لیتا ہے۔ شیخ جی کے سلسلے میں اس محاورے کو یوں ادا کر سکتے ہیں کہ "بکرے شیخ جی کو ڈھونڈتے تھے۔ کچھ کو شیخ جی چکھ لیتے تھے اور کچھ شیخ جی کو مزا چکھاتے تھے۔ آخر عمر میں تو یہ حال تھا کہ جب تک شیخ جی کو کوئی مزا چکھانے والا نہ ملتا خود انہیں زندگی بے مزہ معلوم ہونے لگتی تھی۔

شیخ جی کو اپنی اولاد سے بڑی محبت تھی۔ انہوں نے حبِ اولاد کے دائرہ کو حبِ قوم تک پھیلا دیا تھا یہی وجہ تھی کہ جب جب وہ اپنی اولاد کے لئے کوئی کارِ خیر انجام دیتے۔ اپنے ہم قوموں کی فلاح کے لئے بھی ضرور کوشش فرماتے۔ مثلاً شیخ جی کی صاحبزادی کی شادی ہونے جا رہی ہے تو شیخ جی کو فوراً قوم کی یتیم لڑکیاں یاد آجاتیں اور وہ ان کے جہیز کی تیاری کی فکر میں دبلے ہونے لگتے۔ پھر اپنی صاحبزادی کی شادی کی تیاری کو پس پشت ڈال شیخ جی یتیم لڑکیوں کے جہیز کی تیاری کے لئے چندہ مہم میں جی جان سے جٹ جاتے اور اپنی صاحبزادی کی رخصتی تک جٹے رہتے۔ شیخ جی کے صاحبزادے کو تعلیم کی غرض سے دوسر

شہر بھیجا ہے۔ اس وقت یہ ممکن نہیں کہ شیخ جی اپنی قوم کے غریب بچوں سے غافل رہیں۔ وہ اسی دن اپنے شہر میں غریب بچوں کے لئے اسکول کھولنے کے لئے چندہ شروع فرما دیتے۔

"ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں"۔ لوگ شیخ جی کے دردِ قوم کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ اس لئے بُرا بھلا کہتے رہتے تھے۔ چونکہ شیخ جی کی عمرِ عزیز خدمتِ قوم میں گذری شیخ جی عوام کی چہ میگوئیوں سے عام طور پہ متاثر نہیں ہوتے تھے۔ مگر کبھی کبھی تھوڑا بہت متاثر ہو بھی جاتے تھے۔

تھوڑا متاثر ہوتے تو مجھے پان کھلاتے اور قوم کی کم عقلی کا رونا روتے، بہت متاثر ہوتے تو پان سے پہلے چائے بھی آفر کرتے تھے اور اس صورت میں قوم کی کم عقلی کا رونا نہ ہوتا بلکہ مرگِ عقل پہ بین ہوتا تھا۔ پھر بھی قومی خدمت جاری رہتی تھی۔ شیخ جی نے طے کر لیا تھا کہ "جب تک بندہ ہے چندہ ہوتا رہے گا۔ میں نے بار بار اصلاح دی "شیخ جی یوں کہو "جب تک چندہ ہے، بندہ ہوتا رہے گا"۔

آج جبکہ ہم شیخ جی کی روح کو خراجِ عقیدت پیش کرنے جا رہے ہیں، مجھے یہ اعتراف کرنا ہے کہ واقعی میری اصلاح غلط تھی کہ شیخ جی اس دنیا سے چلے گئے، تو چندہ بھی بند ہے۔ ۵

جیبوں ہی میں رہ گئیں سب کی نیکیاں

دعا

مشکلوں میں ہے پھنسی جان، خدا خیر کرے
گھر میں آ دھمکے ہیں مہمان، خدا خیر کرے

چار غنڈے نما بھائی ہیں مری بیگم کے
اور والد ہیں پہلوان، خدا خیر کرے

آج پھر ہو گئی اُن سے مری تُو تُو، میں میں
جنگ ہو جائے نہ گھمسان، خدا کرے

کیا ہوئی اپنی وہ اگلی سی حمیّت محبوب
نام کے ہم ہیں مسلمان، خدا خیر کرے

محبوب مانجھومی (بلاسپور)

رحمت اللہ خاں مالوی (اکولہ)

ضرورت ہے

(امتحانات میں ماس کاپنگ اور طلباء میں بڑھتے ہوئے اِن ڈسپلن سے پریشان ہوکر)

چوپٹ نگر مہاودیالیہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ یونیورسٹی کے تمام امتحانات بحُسن وخوبی تکمیل تک پہنچانے کے لئے ایسے سپرنٹنڈنٹ، ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ اور اِن ویجی لیٹر (Invagilator) مقرر کئے جائیں جو امتحانات لینے سے زیادہ دورانِ امتحان طلبا کو کنٹرول کرسکیں اور بڑے پیمانے پر ہونے والی نقل (جسے عُرفِ عام میں Mass Copying کہا جاتا ہے) کو روک سکیں۔

یونیورسٹی نے بروقت یہ فیصلہ کرکے صرف اپنی "دانشمندی" کا ہی نہیں بلکہ واقعی "دانش گاہ" ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ اگر ہم ایسا نہ کرتے تو ملک کے بے روزگاروں کی اَن گنت تعداد میں ہزاروں کا اضافہ ہوجاتا۔ خصوصی ہدایات: ۱۔ یہ اشتہار صرف ناخواندہ حضرات کے لئے ہے۔ خواندہ حضرات کوشش بھی نہ کریں۔ ۲۔ وہ اہلِ دانش جو Wanted کا کالم دیکھتے دیکھتے اہلِ بنیش ہوگئے ہیں، ان سے مودبانہ التماس ہے کہ وہ حسبِ معمول دیکھے کر اَن دیکھا کریں۔ اور اگر ضرورت ہو تو کسی ناخواندہ کو بتادیں یا پڑھ کر سنادیں۔ ۳۔ قبیلۂ شرفائے افراد، ابناوادی عقابیہ کے پیرد ان اسامیوں کے لئے درخواستیں نہ دیں۔ ۴۔ اس یونیورسٹی کے وہی سابق طلباء درخواست دیں جو کسی وجہ سے یونیورسٹی سے نکال باہر کئے گئے تھے۔ یا جو کبھی نقل کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑے گئے تھے۔ اور اس جرم میں Debar کئے گئے تھے۔ اب یونیورسٹی اپنے فعل پر نادم ہے۔ اظہارِ ندامت کا ایک ہی ذریعہ سمجھا گیا ہے کہ Debar سرٹیفکیٹ کو کوالیفکیشن گردانا جائے۔

۵۔ درخواستیں وہی امیدوار بھیجیں جو ان اسامیوں کے اہل ہوں اور ہماری مندرجہ ذیل شرائط پوری کرتے ہوں۔

تینوں قسم کے اسامیوں کے لئے تعداد کا کوئی تعین نہیں امیدواروں کی تعداد ان کی طرف سے ملنے

والے نذرانوں کے تناسب سے گھٹائی یا بڑھائی جاسکتی ہے اور اسی اعتبار سے امتحان کے مراکز کا تعین بھی ہوگا

تعلیمی قابلیت : ۱۔ سپرنٹنڈنٹ کے لئے ساتویں جماعت کامیاب یا ناکام ہونا ضروری ہے۔
۲۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے لئے تیسری یا چوتھی جماعت فیل۔

ذاتی قابلیت : ۱۔ چوڑا چکلا سینہ ہو۔ پٹھے مضبوط۔ کسرتی بدن۔ اعصاب کسے ہوئے ہوں تنے ہوئے نہ ہوں۔ جسم مضبوط بلکہ مضبوط پٹھا اور موٹی چمڑی والوں کو ترجیح دی جائے گی۔
۲۔ چہرے پر دو چار زخموں کے نشانات' لہجہ کرخت۔ آواز' پاٹ دار' جذبات سپاٹ چہرے کی کرختگی ہندی فلموں کے ویلنوں جیسی۔
۳۔ صورت حسین و جمیل نہ ہو۔ بلکہ بھیانک اور رعب دار۔ سیرت جلادوں کی سی لیکن اردو شاعری کے جلادوں کی سی نہیں۔
۴۔ مار دھاڑ یا ہاتھا پائی میں اعلیٰ قسم کی مہارت رکھتا ہو بلکہ ایسے موقعوں پر بنفس نفیس شریک ہو چکا ہو اور ان موقعوں کی تلاش میں رہتا ہو۔ ثبوت کے لئے D.S.P سطح کا سرٹیفکیٹ ضروری ہے۔
۵۔ مونچھیں لمبی گھنی۔ اتنی گھنی کہ ہونٹ تلاش کرنے پڑیں یا پانی پینے کے لئے چلمن کی طرح ہٹانا پڑے لیکن لمبائی بھی چھ انچ سے کم نہ ہو۔ انٹرویو کے وقت مونچھوں کی پیمائش کی جائے گی۔

ضروری لیاقت : ۱۔ کسی شہر یا کم از کم دو تین محلوں کا دادا ہو۔ بہت سارے بچوں کا دادا نہ ہو اگر صرف اپنے ہی محلہ کا دادا ہے تو اپنے ہی قبیل کے دو سو شرفاء کا لیڈر رہنا ضروری ہے۔
۲۔ ڈاکہ زنی' نقب زنی وغیرہ کے علاوہ چاقو زنی میں مہارت رکھتا ہو۔ اپنے ساتھ ہمیشہ خواہ مخواہ ہی ایک رامپوری رکھتا ہو۔
۳۔ مونچھوں پر تاؤ دینے کی عادت ہو۔ بات بے بات پیشانی پر بل پڑتے ہوں۔

لباس۔ جرسی اور پتلون پہنتا ہو۔ جرسی بیٹے دار ہو' یا محمد علی کلے کی وہ تصویر جرسی پر ہو جس میں اس نے دنیا کو اپنے ہاتھ پر اٹھا رکھا ہے۔ پتلون پہنے یا نہ پہنے لیکن جرسی کی شرط پوری کرنا ضروری ہے تاکہ امیدوار کے Muscles (مسلس) نظر آسکیں۔ اسی لباس میں آدمی خطرناک (ہمارا مطلب ہے خوبصورت) نظر آتا ہے ویسے بھی لوگ اوپر ہی دیکھتے ہیں۔ نیچے یا گہرائی میں کوئی نہیں دیکھتا۔

Invagilator إن ویجی لیٹر :-

اس پوسٹ کے لئے بھی وہی شرائط ہیں جو پوسٹ نمبر ایک اور پوسٹ نمبر دو کے لئے رکھی گئی ہیں۔ البتہ تعلیمی قابلیت اور دیگر کے لئے' کچھ رعایتیں۔ Relaxations ہیں' یہ Relaxations اس لئے ہیں کہ کچھ نہ کچھ لوگوں کو کسی نہ کسی طرح کھپانا ہی پڑتا ہے۔ دوسرے یہ کہ شاگرد بھلا استاد سے کیسے آگے بڑھ سکتا ہے۔ مثل مشہور ہے' جائے استاد خالی است' رہا رفتار گفتار' لباس چال ڈھال کا معاملہ تو وہ تقریباً اپنے استادوں کے جیسے ہوں۔ تعلیمی قابلیت صرف اتنی ہو کہ امیدوار دستخط کرسکے یا بالفاظ دیگر دستخط کرنا پڑھے لکھے ہونے کی علامت

سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے ایسے لوگوں کی تعلیمی قابلیت پہ کوئی حرف نہیں آتا۔ عزت آبرو پردے میں رہتی ہے اور شان بے پردہ ہو جاتی ہے۔

اگر دستخط نہ کر سکے تو کم از کم انگوٹھے کا نشان لگانے کی صحیح ترکیب سے واقف ہونا ضروری ہے ورنہ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ بہت سارے سیدھے سادھے لوگ یہ پوچھتے ہیں ہاتھ کا انگوٹھا لگائیں یا پیر کا۔ یا پھر ہمارے کلرکوں کے سامنے ہاتھ کا انگوٹھا اس طرح کر دیتے ہیں۔ جیسے ٹھینگا دکھا رہے ہوں۔ اگر اس حرکت پہ کسی آفس کا بابو ایسے افراد کو جواباً ٹھینگا دکھا دے تو پھر شکایت کیسی؟

مونچھوں کی لمبائی میں عہدہ کی مناسبت سے نہیں بلکہ وہ لوگ جو بالائی الذکر دو اسامیوں کے لئے منتخب کئے گئے ہیں ان کے احترام میں کتر بیونت جائز ہے۔ جوڈو، کراٹے سے پہلے ہی ایسے امیدوار واقف نہ ہوں مگر جوڈو کراٹے کی آوازوں کی کامیاب نقل کر سکتے ہوں۔ یونیورسٹی کی تازہ ترین معلومات کے مطابق آجکل بدوسلکی کا مارکٹ زوروں پہ ہے۔ اس لئے اس عہدہ پہ کام کرنے کے متمنی حضرات صرف ایسی جو سیاں پہنیں جن پہ بد وسلکی کی تصویر ہو۔ آخر کو محمد علی کلے اور بد وسلکی کے درمیان کچھ فرق تو ہونا چاہیئے۔

انٹرویو کے لئے ہر امیدوار کو اپنے ذاتی مصارف سے سفر کرنا پڑے گا۔ بلا ٹکٹ سفر کرنے والوں کو فوقیت دی جائے گی جس کے لئے ریلوے مجسٹریٹ کا صداقت نامہ درکار ہوگا۔

نوٹ: ۱۔ نوٹ سکّہ رائج الوقت بھی ہے۔ ابن الوقت بھی اور نوٹ ہی خصوصیت کا حامل ہے۔ اس لئے تمام امیدوار یہ نوٹ فرمالیں کہ اپنی اپنی درخواستوں کے ساتھ کم از کم پانچ روپے یا پوسٹل آرڈر (زیادہ سے زیادہ کی کوئی قید نہیں) روانہ کریں۔ پوسٹل آرڈر سے حساب کتاب رکھنے کا درد سر بڑھ جاتا ہے۔ اور بعد میں درد شکم بن جاتا ہے۔ جس درخواست کے ساتھ جتنا بڑا نوٹ ہوگا اُسے اہمیت دی جائے گی۔ تمام امیدوار نوٹ نمبر ۱ کے آخرالذکر جملے کو بار بار پڑھیں۔ جو اس کا مفہوم نہ سمجھ سکے ہوں ان سے ہم بعد میں سمجھ لیں گے۔

۲۔ اگر ایک ہی گینگ کے امیدوار میسّر ہوں تو زیادہ اچھا ہے۔ کیونکہ یہاں ہکیجر گڑبڑ کر دیتا ہے۔ بقول شخصے 'کند ہم جنس باہم جنس پرواز' والی بات صحیح ثابت ہوتی ہے۔

۳۔ منتخب شدہ امیدوار ایسے مراکز یا مقامات پہ تعینات کئے جائیں گے جو ان کے اپنے ایریا میں آتے ہوں اس لئے ہر امیدوار کو حق حاصل ہے کہ وہ ایسے کالجوں کو ترجیح دیں جہاں ان کی چلتی ہو۔

۴۔ امیدواروں کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ طلبا کو نقل نہ کرنے دیں۔ کیونکہ یونیورسٹی کی مستقل آمدنی خطرے میں ہے۔ اگر ہم اس طریقے سے کام نہ لیتے تو ایسے طلباً جو ہماری آمدنی کا مستقل ذریعہ ہیں یعنی ایک ہی کلاس میں بار بار فیل ہوتے ہیں وہ سب ایک ہی جھٹکے میں پاس ہو جاتے ہیں۔

۵۔ نقل کرنے سے روکنے کے لئے ہر امیدوار اپنا من چاہا طریقہ اختیار کر سکتا ہے۔ اگر ہاتھا پائی کی نوبت آئے تو اس سے بھی نہ گھبرائیے۔ کیونکہ ہم ہر امیدوار کے پیچھے ہیں۔ ویسے احتیاطاً امیدوار اپنے تحفظ کیلئے پیش بندی کر سکتے ہیں۔ پیش بندیوں میں وہ وصیت بھی شامل ہے جو امتحان ہال میں داخل ہونے سے پہلے وہ اپنے گھر والوں کو کر کے آئیں گے، اور ساتھ ہی ساتھ بیمہ کروالیں ورنہ ہم ذمہ دار نہیں ہونگے۔ ▲

ایگمارک
بھارت سرکار ایگمارک کا لیبل
پیک شدہ اشیاء کے خالص اور اعلیٰ
کوالٹی کے ہونے کی گارنٹی کے طور پر جاری کرتی ہے۔
اعتماد کے ساتھ خریدیئے
ایگمارک پر بھروسہ کیجئے
گھی، مکھن، خوردنی تیلوں، شہد
دالوں اور پسے ہوئے مسالوں کو
"ایگمارک" لیبل تبھی جاری کیا جاتا ہے
جب اصلی سازوسامان سے لیس لیبارٹریوں
میں ان کی اچھی طرح اور بار بار جانچ
پڑتال کرلی جاتی ہے۔
یہ خالص
جانچ شدہ اور اعلیٰ
درجے کی اشیاء
ہوتی ہیں
ہمیشہ "ایگمارک" لیبل والی
اشیاء خریدیئے۔
یہ پنساریوں اور جنرل اسٹوروں سے بآسانی دستیاب ہیں۔
davp 81/307

ظہیر کیفی امروہی

★

(عصمت چغتائی کے چابڑے سے معذرت کے ساتھ!)

پستہ قد، گٹھے ہوئے بدن کے تائے بڑے، چہرے پر مشرع داڑھی اور سر پہ ٹوپی رکھنے لگے تو یکایک بدلتے ہوئے فیشن کی طرح تابڑے مشہور ہو گئے۔ سنتے ہیں تابڑے کو اپنی جوانی میں دو ہی شوق تھے ایک تو ہر شام ڈھائی آنے کا ٹکٹ خرید کر فلم دیکھنا، اور ہر صبح اپنا تانگہ گھوڑا جوت کر نوگانویں کا چکر لگانا وہ گھوڑے کو پیار اور ڈلار سے کم غصیلی نظروں سے ہی تانگے میں جوتتے تھے اور یہی رویہ اُن کا تائی بے چاری کے ساتھ ہمیشہ رہا تھا تائی ایک دم پھولوں کی طرح شگفتہ بات چیت میں شفیق اور مہر و محبت سے بھرپور رہتیں، ان کے لہجہ کی نرمی میں بے پناہ شفقت ہر ایک کے لئے رچی اور گھلی ہوئی تھی اپنی غربت کے باوجود وہ نہایت متواضع اور مہمان نواز قسم کی مسکین صورت عورت تھیں۔ اس کے برعکس تابڑے میں نہایت خشونت، اشتعال اور قطعیت کا سا انداز جھلکتا تھا۔ ان کی بے چینی فطرت اور عجلت پسندی کی عادت نے انھیں مرتے دم تک سرگرم عمل رکھا، پتہ نہیں اُن کے مزاج میں یہ بے قراری بدحواسی اور بے چینی شاید کثرت عیال کی وجہ سے تھی جو اُن کے لئے کثرت وبال بھی بن گئی تھی، سات بیٹیاں اور تین بیٹے اُن کی مختصر اور محدود کمائی کے طلب گار رہتے، خدا جانے تابڑے کس طرح اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتے اور نہایت شاہ خرچی کے ساتھ ڈھائی آنے کا فلم کا ٹکٹ خریدنا نہ بھولتے تھے۔ اُن کی بیوی نہایت صابر شاکر اور شوہر پرست قسم کی واقع ہوئی تھیں وہ نہ تو تابڑے کو کبھی طعنہ دیتیں، نہ لڑتی جھگڑتیں، نہ کسی شئے کی فرمائش کرتیں بلکہ وہ شوہر کو متوازن رکھنے کے جتن کرتیں انھیں غصہ میں بھرتا پاکر بھی اُن کے منہ نہ لگتیں، جواب میں نہایت نرم گفتاری اور میانہ روی اختیار کر لیتیں، ان کے اس انداز اور گھریلو پالیسی کے نتیجے میں بڑے سے بڑا ہنگامہ صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا اور تابڑے اپنی ذہنی اور جذباتی کشمکش سے ان کی بدولت جلدی چھٹکارا پا لیتے۔

تایڑے کو ادھر سے اُدھر مٹرگشت کرنے کا بھی شوق تھا، وہ اپنے رشتہ داروں، کنبہ داروں کے یہاں دن بھر بیسیوں چکر لگاتے نہ تھکتے تھے، ایک چھلاوے کے مانند پتے کسی عزیز کے یہاں پہونچتے، آنگن میں کھڑے ہوکر خیریت دریافت کرتے اور کسی قسم کی تواضع کا انتظار کئے بغیر اپنی راہ چل دیتے بہت ہوا تو خیریت کے ساتھ کوئی نئی خبر سنانا بھی نہ بھولتے ـــــ

"ارے بھئی سنا تم نے، سنا ہے وہ جلیل بہت بیمار ہے" دوسرا شخص ابھی یہ پوچھنے بھی نہ پاتا کہ کیا بیمار ہے وہ رفوچکر ہو جاتے، وہ طوفانی باتیں نہ کرتے بلکہ نہایت اختصار سے سرسری بات چیت کرنا پسند کرتے تھے کسی بھی سنگین مسئلہ پر انھیں متفکر کسی نے نہیں دیکھا، سوچ بچار کو وہ شاید اہمیت ہی نہ دیتے تھے۔ فکر اور افسوس کا گزر اُن کی زندگی میں نہ تھا اُن کی زندگی میں انتشار ہی انتشار تھا کوئی ترتیب اور سلیقہ اور توازن کسی بھی معاملے میں اختیار نہ کرتے تھے۔ وہ اپنی موجودہ کیفیت اور حالت سے بظاہر مطمئن نظر آتے، معمولی لباس میں رہتے ایک تہمد اور مختصر سی قمیص یا شلوکہ اُن کا مخصوص لباس تھا پسندیدہ لبادہ تھا۔ پاؤں میں پشاوری چپل کبھی ہوتے کبھی نہ ہوتے تو بھی وہ مضائقہ نہ سمجھتے ضروری نہ جانتے، لیکن ٹوپی ان کے گول سر پہ سماوار کے ڈھکن کی طرح چڑھی اور منڈھی رہتی تھی۔ ان کی رنگت گدلا چکی تھی لیکن آنکھوں میں چمک اور لہجہ میں کڑک زندگی بھر اُن کی رفیق رہی محرومیوں اور مایوسیوں کے باوجود اُن کے کسی انداز سے بے بسی یا ناراضی نہ جھلکتی تھی۔ اسی غربت اور نکبت کے عالم میں انہوں نے اپنی ساتوں بیٹیوں کی شادیاں موزوں اور ناموزوں مردوں کے ساتھ خاموشی سے کر دی تھیں، تائی کو وہ کبھی خاطر میں نہیں لاتے اُن کی بات اور رائے کو وہ کوئی اہمیت ہی نہ دیتے تھے ہمیشہ ان سے نظریاتی اختلاف رکھتے، اگر تائی یہ کہتیں ـــ! تھک گئے ہو لاؤ میں سر دبا دوں ـــ تو تایڑے نہایت خشونت سے جواب دیتے "باولی ہوئی ہو میں تو یوں ہی لیٹ گیا تھا ــــــــ ذرا سستانے کے لئے!؟ اگر کبھی تایڑے بیمار پڑ ہی جاتے تو بھی وہ تائی کو ڈانٹ پھٹکار سے محروم نہ رکھتے ان کی کم فہمی اور نالائقی کو نشانہ بنانا نہ بھولتے، تائی بے چاری ان کو بیمار دیکھ کر بے چین ہو جاتیں، ہر امکانی طور پر وہ اپنی خدمت اور دیکھ ریکھ سے جو کرتی تھیں، مگر تایڑے ان کے ممنون احسان و کرم نہ ہوتے بلکہ انھیں صلواتیں سُناتے ـ! سمجھ گئے صاحب کچھ کرنا ہی نہیں آتا... ؟ سمجھ گئے صاحب تایڑے کا تکیہ کلام تھا وہ اپنی گفتگو میں اس لفظ کو نہایت سلیقہ اور طریقہ سے شامل کرتے، جنگ ہو یا امن، بیماری ہو یا فساد کا معاملہ تایڑے اس لفظ کو استعمال کرنا نہ بھولتے!

"سمجھ گئے صاحب، سورت میں ریل ڈوب گئی ـــ!"

"سمجھ گئے صاحب، تگری کے جاٹوں نے حملہ کر دیا"

"سمجھ گئے صاحب، طاعون کے پھیل جانے کا خطرہ ہے"

"سمجھ گئے صاحب، دلّی جا رہا ہوں"

"سمجھ گئے صاحب، چھوٹی لڑکی کا نکاح ہے"

"سمجھ گئے صاحب! نفیسہ نے کھڑکی سے کھیر نہیں بھیجی۔"
"سمجھ گئے صاحب! سلطی میں وحید نوکر ہو گیا۔"
"سمجھ گئے صاحب! تانگہ گھوڑا بیچ دیا۔"

لیکن سمجھ گئے صاحب کا استعمال وہ اپنے کسی دکھ کے لئے کبھی نہ کرتے۔ وہ یہ نہ کہتے "سمجھ گئے صاحب! کھانا نہیں کھایا۔" یا "سمجھ گئے صاحب! فاقے کر رہا ہوں" یا "سمجھ گئے صاحب! لڑکی کے نکاح کے لئے پیسہ کہاں سے لاؤں" یا "سمجھ گئے صاحب! مجھے اپنڈے سائیٹس کا مرض لاحق ہے۔" تابڑسے کو ہفتہ عشرہ میں آنت کی تکلیف کا عارضہ ستاجاتا تھا اور وہ درد اور کرب سے بے چین اور بے حال ہو جاتے، کوئی دوا دارو نہ کرتے، کرتے بھی کہاں سے پیسہ پاس ہوتا ہی نہ تھا، تائی بے چاری محنت و مشقت کرکے جو چار پیسے کما لاتیں وہ تابڑسے کی تکلیف میں گرما گرم دودھ کی نذر کر دیتیں اور ایسا کرکے وہ بے حد خوش ہوتیں ان کے چہرے پر طمانیت کے پھول سے کھل جاتے، اُن کے لہجے میں سرخوشی اور خوشبو سی شامل ہو جاتی، لگتا تھا، جیسے تابڑسے کی خدمت کرکے انھیں روحانی اور قلبی سکون اور مسرت کی لازوال دولت و نعمت حاصل ہو گئی ہے۔

تابڑسے تمام عمر بے گھر، بے در، بے سر و سامان رہے، وہ ہمیشہ کرائے کے مکان میں رہے اگر وہ چاہتے تو اپنے سوتیلے بھائیوں کے ڈھنڈار اور ویران مکانوں پر قبضہ جما لیتے۔ اگرچہ ان کے سوتیلے بھائی متمول اور آسودہ حال تھے لیکن انہوں نے کبھی بھی تابڑسے کی ٹھیک اور بھرپور مدد و اعانت نہیں کی، تابڑسے کا خاندان بڑا بھرا پُرا تھا۔ ایک درجن سے زیادہ اُن کے سگے اور سوتیلے بہن بھائی تھے اور اُن کی اولادیں بھی خوش حال تھیں لیکن تابڑسے نے کبھی کسی کے آگے دست سوال دراز نہیں کیا کبھی اُن کی دولت کو حریصانہ انداز میں نہیں دیکھا، اپنی غربت اور تہی دستی اور تہی دامنی اور کسمپرسی کا رونا نہیں رویا، تائی بھی اپنے کنبہ کے افراد کی خوشحالی سے کبھی رشک و حسد اور جلاپے کا شکار نہ ہوئیں وہ تو ہمیشہ ہی اپنی سسرالی رشتہ داروں کو پھلنے پھولنے کی دعائیں دیتے نہ تھکتیں، بچوں کو درازی عمر اور شفقت آمیز جملوں سے مالا مال کرتیں، اپنے پرایوں کی خوشیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتیں اور کسی کو یہ احساس نہ ہونے دیتیں کہ وہ مال و دولت اور خوش حالی میں کسی سے کم تر ہیں یا مجبور ہیں، البتہ کبھی کبھی تابڑسے بن بلائے مہمانوں سے گھبرانے لگتے تھے اور وہ تائی کو سخت سُست کہنے سے بھی نہ چوکتے تھے، کبھی وہ نہایت پریشان اور بے قرار ہوتے تو انھیں عجیب اور نئی تُلی گالی دینے سے بھی نہ چوکتے، اور یہ گالی تائی میٹھی شئے کی طرح مسکرا مسکرا کر برداشت کر لیتیں، مزہ سا لینے لگتیں، تابڑسے غصیلے لہجے میں کہتے، "لچّی ——!" اور تائی مسکرا کر کہتیں، ذرا ایک بار پھر تو کہو کیا پھول جھڑ رہے ہیں۔ تابڑسے بڑبڑاتے گھر سے نکل جاتے اور پھر کسی عزیز کے گھر کا رخ کرتے "سمجھ گئے صاحب! آج نیم تلے حبیب ملا تھا... اور یہ کہہ کر پھر وہ چھلاوے کی مانند نظروں سے غائب ہو جاتے۔

تابڑسے کو اپنے چھوٹے اور سگے بھائی سے بے حد محبت تھی، شدید محبت، جب تک وہ ان کے گھر کے دن بھر میں دس پھیرے نہ لگا لیتے انھیں سکون ہی نہ ملتا تھا، شاید اُن کا کھانا تک ہضم نہ ہوتا تھا۔ اپنے چھوٹے بھائی سے کبھی کوئی فرمائش

نہ کرتے نہ سرزنش کرتے نہ کوئی گفتگو کرتے' مگر ایک نظر دیکھ لینے میں ہی آسودگی محسوس کرتے
کچھ کہنا بھی ہوتا تو منھ در منھ بات نہ کرتے بلکہ بھاوج کے ذریعہ کہلوا دیتے ۔ اُس سے کہنا' لڑ
کیا را ئے ہے ؟ یا اس سے کہنا ۔" انیس میرا کہنا نہیں مانتا' ذرا سمجھا دے" یا اپنی بھاوج سے کہ
نہ کرے' غرض عجیب طرح کی پیغام رسانی بھاوج کے ذریعے کرتے' اپنی بہنوں کے سلسلے
رویہ مشفقانہ تھا ۔ اگرچہ وہ ان کی کوئی مالی امداد تو نہ کرتے' مگر ان کے دکھ سکھ میں برابر شریک
بڑے کا کان گرم ہوا' اور تا بڑے کو پتہ نہیں کیسے الہام ہو جاتا' صبح ہی خیریت جاننے کیلئے آ
بڑوں سے تا بڑے کا ناطہ اور تعلق یکساں تھا انھیں کسی بھی بچے سے ٹھٹھولیاں کرتے کسی نے نہیں د
ہوتے نہ ڈانٹتے ڈپٹتے تھے ۔ بس ایک نظر دیکھ کر ہی جی ہی جی میں خوش ہوتے' یہی رویہ وہ اپنے بچ
روا رکھتے نہ پچکارتے نہ چمکارتے نہ غصے ہوتے نہ دلار کرتے نہ اکتاتے اور نہ بد دل ہوتے کدورت
میں تھی نہ تا بڑے کے مزاج میں کبھی جھلاہٹ نہ تھی ۔

کسی کے مال' دولت' اولاد کو دیکھ کر وہ نہ حسد کرتے تھے نہ رشک کرتے تھے اُن کے انداز سے
گراں پر کسی کی آسودگی اور خوشحالی کا کیا ردعمل ہوتا ہے کسی کی مالی داریت سے وہ نہ مرعوب ہوتے
ہوتے تھے' البتہ ہر ایک کی خوشی میں خوش اور مگن ہو جاتے تھے' ہر ایک کے دکھ میں بے غرض شریک
وہ سب سے پہلے خبر گیری اور امداد و اعانت کرنے سے نہ چوکتے تھے' موسم کی سختی کو وہ کبھی خاطر میں نہ
سردی ہو یا گرم لو کے تھپیڑے' انھیں اپنے فرض اور معمول سے باز نہ رکھتے' برسات میں بھیگتے بھیگتے وہ آ
کرتے' کسی کا مکان تو ٹپک نہیں رہا' ڈھہ تو نہیں گیا' یہ وہ اپنی ڈیوٹی سمجھتے تھے کہ ساری معلومات اور ذمہ
مستعدی سے پورا کرتے اور اپنی محدود و مختصر دنیا میں گم رہتے ۔ دھیرے دھیرے تا بڑے کے دونوں شو
اب نہ وہ ڈھائی آنے کا ٹکٹ خرید کر فلم دیکھتے نہ اپنے گھوڑے پر اپنا غصہ اتارتے تھے ۔ تائی بے چاری
مختصر سی جان گنوا کر اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں اور ان کی ساری بیٹیاں اپنی اپنی دنیا میں گم ہو چکی تھیں ۔ تا بڑے بے
طلب گار نہ تھے وہ جو کچھ دیتا لے لیتے' نہ دیتا تو اس کے لئے تگ و دو نہ کرتے' اس لئے بھی وہ خود کچھ شکو
ہی کہلوا دیتے' ساری عمر سلقت و معیت' محرومی اور پریشانی میں زندگی بسر کرنے کے باوجود تا بڑے چاق و چو
پنج وقتہ نمازی تھے نہ پرہیزگار' نہ حاجی تھے نہ ناجی' پیر تھے نہ فقیر' مالدار نہ ہوتے ہوئے بھی مستغنی تھے'
اس کے آرزو مند نہ تھے کہ اپنا گھر جوڑ توڑ کر کے حاصل کیا جائے' یا دوسروں کے مال و دولت اور املاک کو
سیدھا کیا جائے' زندگی بھر تا بڑے روکھی سوکھی کھا کر اگر رب کا شکر نہ بجا لائے تو وہ کسی کے لقمے کو چھیٹے ہوئے
غیبت اور حسد کے ہتھکنڈے انہوں نے کبھی اختیار نہیں کئے' وہ عبادت گذار تو نہ تھے لیکن آدمی کو دکھ اور آزا
نہ رکھتے تھے خود وہ تکلیفوں میں گھرے رہنے کے باوجود دوسروں کو راحت پہنچانے میں پیچھے نہیں رہے ۔ ا
بھی اس بے رحم دنیا اور ظالم سماج کی بے حسی کے بیچ گمنامی کی موت مر گئے' ان کے مرنے پہ نہ ان کا کوئی مرقد و مزار
رنج کا جذبہ جاگا لیکن تا بڑے جیسے مخیر اور کھرے لوگ بار بار پیدا نہیں ہوتے ہیں اس لئے کبھی کبھی ان کی یاد ذہن و دل کو جھنجھو

فاروق نشتر
(گلبرگہ)

تغیرات ہیں زمانے کے

مرزا جمّن کو رات بارہ بجے کھنکتی پیالیوں اور سگریٹ کے مرغولوں میں گھرا پایا تو ہم نے اُن سے اس تغیر کی وجہ دریافت کی۔ مرزا نے جواباً مُنہ بنا کر کہا۔ "تغیرات ہیں زمانے کے!" ہم نے بھی مرزا سے کہا "مرزا جی! تغیرات زمانے کے نہیں بلکہ تغیرات زمانے کے کہیے"۔

صاحبو! اطلاعاً عرض ہے کہ زمانہ تغیر پذیر نہیں ہوتا۔ سورج، چاند، زمین کبھی بدلے ہیں نہ بدلیں گے ہاں بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے! مگر محدود رنگوں ہی میں ہاتھ پاؤں مارتا رہتا ہے کبھی ہم نے اُسے انسان کی طرح ایسٹ مین کلر ہوتے نہیں دیکھا، جبکہ انسانیت تغیر پذیر اتری ہے تو کیا زمانہ اور مرد اور سب ہی تغیر کے شکار ہو جاتے ہیں۔

مرزا جمّن کو لیجیے! شادی کے پہلے سال قید و بند کی صعوبتیں جھیل چکے۔ اگلے سال کچھ بندھن کھلے تو ہم نے مکان کے پارٹیشن کے پیچھے سے نغمے کی آوازیں سنیں اور اب برتنوں کے ساز پر مسز مرزا کی شوریدہ آواز سننے کے عادی ہیں اور جب مرزا جمّن پیالیوں اور سگریٹوں کے درمیان ملے تو ہمارا چونکنا ضروری تھا۔ ورنہ ہم تو ہم بیگم اور بچوں کو بھی پارٹیشن کے پیچھے سے سنائی دینے والی لوری سُنے بغیر نیند نہیں آتی۔

اب ہماری بیگم صاحبہ میں وہ دم خم باقی نہ رہا کہ چوٹ پر چوٹ دیئے اور کئے جاتیں لہٰذا مرزا کی چوٹوں کی شروعات کے ساتھ ہی نیند کی چوٹی پہ ہم مع کنبہ چڑھ دوڑتے۔

خلیب مرحوم (سلیمان خلیب) نے لکھا تھا۔

اولا بدلی ہوئی ہے کپڑوں کی
لنگی پہنی ہے دیکھو فرزانہ

تحریر زمانہ دراز کی نہیں زمانہ قریب ہی کی ہے خلیب صاحب نے بی بی (بے بی نہیں) فرزانہ کو لنگی پہنے دیکھا اور بھڑک اٹھے۔ شاید انہیں اپنی پیرسالی کا شدت سے احساس تھا ورنہ وہ فلموں میں دیکھتے کہ فرزانہ نے لنگی کو کب اور کس وقت پہنا تھا۔

ہمارے فرزند کو دیکھئے! کچھ دنوں تک اپنے بالوں میں کنگھا کرنا شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ ہم انجان بنے رہے کہ شاید اب تک دلیپ کمار کی جوانی سلامت

ہو گی' لہٰذا اسی کا اثر ہے۔ مگر جب بالوں میں کنگھی اور بالوں کی کترن ہونے لگی تو سر گوشوں میں فرزند سے اس تغیر کی وجہ دریافت کرنے کے لئے ہمارا منہ اُن کے کان کے قریب لے گئے تو معلوم ہوا کان غائب اور بال حاضر ہیں۔ فرزند نے ہمارا ارادہ بھانپ کر کنگھی سے اپنا بھ بچنا نہ انداز میں بالوں کو سرکایا اور کان ہماری طرف کر دیا (پہلے لڑکیاں گھونگھٹ سرکاتی تھیں، اب لڑکے بال سرکا رہے ہیں) ہمیں فرزند کے کان کو دیکھ کر اطمینان ہوا کہ اب تک کان کترنے کا فیشن نہیں چل پڑا۔

صاحبزادی کا وطیرہ ملاحظہ ہو۔ کل تک بضد تھیں کہ وہ اب ڈھیلے ڈھالے لباس میں اسکول نہیں جائیں گی' مگر جب کالج میں آئیں تو ان کی کھال پہ ہر چیز ڈھیل ہو گئی کہنے لگیں کالج کی یہی لاج ہے۔ کرتہ ڈھیلا پاجامہ ڈھیلا' حتیٰ کہ بیگم سے سنا گیا زلفیں بھی ربن کی بندشوں سے آزاد لہرانے لگی ہیں۔ صاحبزادی بچی تھیں تو ایک گز کپڑے میں دوپٹہ کافی ہو گا۔ پھر عمر کے ساتھ ساتھ غائب ہو گیا۔ مگر جب پھر دوپٹہ کی فرمائش ہوئی تو معلوم ہوا پانچ گز ضروری ہے۔ مانگ پوری کی گئی کہ شاید دوپٹہ اوڑھنے اور وقت ضرورت ساڑی باندھنے کے لئے استعمال ہو گا اور خوشی ہوئی کہ چلو فیشن کی آڑ میں اسلامی اقدار زندہ رہے ہو رہے ہیں (الجلانے میں سہی) مگر نہیں! اب یہ دوپٹہ بدن پہ کم اور زمین پہ زیادہ بچھا نظر آتا ہے۔

ویسے ہم بھی تغیرات کے قائل ہیں ورنہ دنیا اتنی ترقی پذیر نہ ہوتی۔ مگر یہ کیا کہ تغیر جہاں سے سفر کو نکلتا ہے چل چلا کر پھر وہیں زمین کی گولائی کا ثبوت لئے لوٹ آتا ہے۔

ماضی میں ڈھیلی پتلون ضروری سمجھی گئی۔ حال میں تنگ ہو گئی۔ مگر اب دیکھئے! اوپر تنگ تھے گرمی کے احساس کو دبانے کے لئے پائچوں کو ڈھیلا کروا لیا اور اب ڈھیلے ہی چلے۔ اور ڈھیلے بھی ایسے اوپر ماضی ہے اور نیچے حال ـــــ دونوں کو جمع کیجئے۔ اگر آپ ریاضی میں چالاک ہیں تو حاصل جمع ماضی ہی آئے گا۔ عوام جب تغیر کو اپناتے ہیں تو نہایت سنجیدگی سے اپناتے ہیں اور محسوس ہوتا ہے نیا تغیر اب کسی اور تغیر کا محتاج نہیں ملبوسات کو مارئیے گولی! ذرا پڑوسی صاحب کے گھر چلئے۔ کل تک اچھا خاصہ پرانی طرز کا مکان بنا ہوا تھا۔ بیٹے نے جیسے ہی سعودیہ سے پہلا ڈرافٹ بھیجا یہ ہمیں اپنے احاطہ کی دیوار کا پلاسٹر اکھاڑتے ہوئے ملے' دوسرا ڈرافٹ آیا۔ مکان کو سمنٹ کا لبادہ اوڑھا دیا گیا۔ دوسرے فرزند نے بڑے بھائی کی تقلید کی۔ پڑوسی جی نے مکان ہی کو اکھاڑا اور بلڈنگ تیار کھڑی ہے۔ مگر کیا بتائیں! کل ہی موصوف کے ساتھ انہی کے چبوترے پہ بیٹھے سیاسی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ (حالانکہ ہماری یہ کوشش ہمارے ہوش سنبھالنے کے بعد ہی سے جاری تھی) کہ ہمارے سر پہ قیامت ٹوٹ پڑی۔ جو اینٹ کی شکل میں ہمارے ملائم کندھے سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو چکی تھی۔ پڑوسی صاحب سے اس قیامت کے ٹوٹنے کی وجہ دریافت کی تو معلوم ہوا شاید مسز پڑوسی صاحبہ چھت پہ چہل قدمی کے دوران اپنے لہراتے دوپٹہ کو لہرانے سے روکا ہو گا اور یہ اینٹ اسی دوپٹہ کے ٹکرانے سے ہم پہ قیامت بن کر ٹوٹ پڑی ہے۔ ہم نے پڑوسی صاحب سے پوچھا

پڑوسی جی! بیگم کے دوپٹے کے لہرانے کے بعد دیوار کا یہ حال ہے تو آپ کے لڑکے اور لڑکیاں کس جگہ کپڑے پہنتے ہیں۔" کہنے لگے: "اس کا انتظام بغیر دیوار کی جھاڑیوں سے گھرے باغیچہ میں کیا گیا ہے۔
مرزا غالب بھی موقع بے موقع ہمارے ذہن پہ اس طرح سوار ہیں جیسے آج کل عوام کے دل و دماغ اور پھیپھڑوں پر مہنگائی کا بھوت سوار رہتا ہے۔ انہوں نے کہا تھا۔

ع ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا

چند سال قبل محلہ کی مسجد کے کچھ نمازی حضرات نے مسجد کی درستگی کے لئے گھر گھر چندہ بٹورنا شروع کیا معلوم ہوا مسجد نمازیوں کے انتظار میں اس قدر اکتا چکی کہ خود ہی سجدہ میں جانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ لہٰذا چند اعلیٰ ظرف اور اعلیٰ خرچ حضرات نے اسے سجدے میں جانے سے باز رکھا۔ مسجد نے سجدے کا ارادہ ترک کیا تو نمازیوں کو سجدے میں گرمی ہونے لگی جو سلام کے پھیرنے پھیرنے تک ناقابلِ برداشت ہو جاتی تھی۔ پھر چندہ اکٹھا کیا گیا۔ پنکھے لگا دیئے گئے اور بچی کچھی رقم سے پرانی جانمازوں کے پیوند لگائے گئے۔ اور ایک دن مسجد کمیٹی نے اعلان کیا۔ "محلے سے جتنے لوگ سعودیہ گئے ہیں اُن کے متعلقین اُن کے نام اور پتہ درج کروائیں۔ تمام نام اور پتے اکٹھا ہوتے تو عظیم سعودیوں کو لکھا گیا۔ آپ قالین روانہ کیجئے ___ آپ اذان دینے والی گھڑی، آپ دس عدد خود کار جھاڑو بھیجیں ___ آپ ایک عدد مسجد کے نام کا کتبہ روانہ فرمائیے۔
جن صاحب کو کتبے کے لئے لکھا گیا تھا، انہوں نے جانے کیا سوچ کر لکھ بھیجا "مسجد الکٹرسی" بات معقول تھی، لہٰذا الکٹرسی کے لئے ایرکنڈیشن ہونا ضروری ہے۔ ؎

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

بہرحال تغیر ہی ایک ایسا باوثوق و بے تعصب نظریہ ہوتا ہے جسے بلالحاظ مذہب و ملت اپنانے میں عوام چوں یا چراں نہیں کرتی، حال ہی میں ایک تغیر نے عوام کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ پہلے مجرا نوابوں اور حاکموں کا دل بہلانے کے لئے کافی تھا۔ مجرے کی محفل کے اختتام پر کیبرے کا انتظام ہوا اور اب ان دونوں صنفوں کے درمیان سے جو صنفِ ڈانس یا صنفِ ناچ اُبھری ہے "ڈسکو ڈانس" اور اسی کے زیرِ اثر اس تغیر کا نام ہے "ڈسکو" ___ ہم نے اس تغیر کے جتنے چرچے سُنے اور جب سے دیکھے آج تک زنانے اور مردانے کو اتنی برق رفتاری سے کسی تغیر کا ساتھ دیتے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن عرصہ تک ہم یہ سمجھے رہے کہ آخر "ڈسکو" کیا بلا ہے۔ ایک دن ایک نوجوان کے کرتے کی جیب پہ نظر پڑی لکھا تھا "DISCO" ہم سمجھے شاید کرتے کی جیب کو ڈسکو کا نام دیا گیا ہے۔ مگر جب سینے کی جیب پر دیکھا تو ارادہ بدلنا پڑا۔ پھر یہ ڈسکو جگہ لگا کر پیٹ اور پیٹھ پہ نظر آیا اور اب سارے جسم کا چکر کاٹ کر نوجوانوں کی رگ رگ میں سما کر "ڈسکو ڈانس" بن گیا ہے۔
یہ تغیر بھی چکر کاٹ کر رہا ہے۔ پہلے کشتی کے اکھاڑوں میں ہاتھا پائی کا نام کشتی تھا۔ اب ہوائی مکابازی کا نام "ڈسکو" ہے۔ مقابل سے لڑنے کا دم خم ختم ہوا تو ہوا سے لڑنے کو "ڈسکو" کہا گیا۔

واقعی اب نوجوانوں کے وہ دم خم نہیں رہے کہ حالات سے مکہ بازی کرتے لہٰذا ہوائی قلعوں کی فتح یابی ...سلئے ہوائی مکے چلایا کرتے ہیں۔ مگر شرط ہے۔ ایک مخصوص آواز کی! جو ٹیپ ریکارڈ پہ بجے۔ ریڈیو پہ بجے ...سے بجائی جائے یا تالیوں کی زبانی بولی جائے۔

مندرجہ بالا حسب نوجوانوں پہ آزمائیے۔ نوجوان ہر کام چھوڑ کر 'ڈسکو' 'ڈسکو' پکارتا ہوا ہوائی فیر ... طرح ہواؤں میں ہاتھوں اور لاتوں کو دہراتا ہوا دہرا ہونے لگے گا۔

آج کل بس اسی نام کی مارکٹ ہے۔ جس شئے کا نام ڈسکو ہوگا لہٰذا وہ بے بھاؤ کی بکے گی' بازار ...یئے قلم ڈسکو' کاپی ڈسکو' پیالی ڈسکو' ملبوسات ڈسکو' حتیٰ کہ "ڈسکو کرانہ مرچنٹ" ڈسکو ہیر کٹنگ سیلون' ...سکو اشیائے خورد و نوش اور ان تمام کی بنیاد "ڈسکو دیوانے" ہیں۔ جو ڈسکو کو ہوا دے رہے ہیں۔

مگر بنیادوں کے کیا کہنے' یہ یا تو اکھڑ جاتی ہیں یا اکھاڑ دی جاتی ہیں۔

اور ایک دن ہمارے گھر کی بنیادیں بھی صاحبزادے کے سعودیہ سے پلٹتے ہی تغیر کا شکار ہوگئیں۔ ...ہنوں نے حویلی نما مکان کو ڈھلوا دیا اور "ڈسکو بلڈنگ" کے بنانے کا حکم دیدیا۔ ہم بے حد پریشان ہوئے کہ آخر یہ ڈسکو بلڈنگ بھی ہر ڈسکو چیز کی طرح بے سروپا ہوگی یا پھر ہم اس میں قیام بھی کر سکیں گے؟

ڈسکو بلڈنگ کی تیاری کے انتظار میں رشتہ داروں کے ہاں پناہ ڈھونڈلی۔ ایک دن صاحبزادے نے نہایت خلوص کے ساتھ قریب آکر ایک "ڈسکو گھڑی" دی جس کا سر پیر کے برابر اور پیر سر کے برابر تھا۔ ہم نے گھڑی کو نہایت سعادتمندانہ انداز میں بائیں ہاتھ میں ڈالا اور ادھر دائیں ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لئے صاحبزادے ...یک اور گھڑی پہنانے لگے۔ ہم نے ان سے اپنے لاغر ہاتھوں میں دو دو گھڑیوں کی سجاوٹ کی وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا "باباجان! یہ ڈسکو گھڑی نہیں بلکہ گھڑی نما ڈسکو کڑا ہے جو بلڈ پریشر کو روکے رکھتا ہے۔" ہم نے ملتجیانہ انداز میں کہا "لیکن ہمیں تو اپنے بلڈ میں پریشر کی شکایت معلوم نہیں ہوتی۔" کہنے لگے "سعودیہ سے لائے ہوئے مالِ غنیمت اور ڈسکو بلڈنگ کے مالک جب آپ ہیں تو آپ کے بلڈ کو پریشر کا مالک ہونا چاہیئے؟" کیونکہ ؎

تغیرات ہیں زمانے کے

مناظر عاشق ہرگانوی

"پیکرانِ بے سخن"

روپے کا ٹکنا

ڈاکٹر شمیم احمد، ڈاکٹر شمیم افزا قمر، ڈاکٹر عزیز الرحمٰن، پروفیسر شاداب رضی، پروفیسر رئیس انور اور مناظر عاشق ہرگانوی بیٹھے گرانی کی باتیں کر رہے تھے کسی نے کہا کہ آج کل پیسے ٹکتے نہیں ہیں۔ ڈاکٹر شمیم احمد نے مسکرا کر کہا "پیسے نہ ٹکنے کی شکایت ایک بار ڈاکٹر محمد سلیمان نے پروفیسر اختر قادری سے کی تو وہ بولے تمہارے پاس پیسے کہاں سے ٹکیں گے۔ سبھی پیسے تو بنک کو دیدیتے ہو۔"

بیوی کی کمائی

ڈاکٹر شمیم احمد، ڈاکٹر مظفر اقبال، ڈاکٹر عزیز الرحمٰن، ڈاکٹر محمد شفیق، پروفیسر رئیس انور اور مناظر عاشق ہرگانوی بیٹھے انٹرویو میں پوچھے جانے والے سوالات پر باتیں کر رہے تھے۔ ڈاکٹر عزیز الرحمٰن نے کہا "میں ایک انٹرویو میں گیا تو مجھ سے کوئی طنزیہ شعر سنانے کے لئے کہا گیا، میں نے یہ شعر پڑھا ؎

اے شاعر لکھنوی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق میں شامل ہو بیوی کی کمائی

تو انٹرویو بورڈ کے چیرمین چیں بہ جبیں ہو کر بولے آپ تعلیم نسواں کے مخالف معلوم ہوتے ہیں۔"
بعد میں پتہ چلا کہ چیرمین صاحب کی بیوی ملازمت کرتی ہیں

عاشقی کی برکت

اسی محفل میں ڈاکٹر مظفر اقبال نے یہ شعر پڑھا ؎

عاشقی قیدِ شریعت میں جب آتی ہے
جلوۂ کثرتِ اولاد دکھاجاتی ہے

اور ڈاکٹر محمد شفیق سے کہا کہ اس کی تقطیع کیجئے۔ ڈاکٹر عزیز الرحمٰن نے بات اُچکتے ہوئے کہا "شفیق صاحب بہت ہی منقطع ہیں، مجھ سے پیروڈی سنئے ؎

عاشقی صدرِ نضیحت میں جب آجاتی ہے
جلوۂ دلہن بے باک دکھاجاتی ہے

بیاہتا عورت کے لئے

پروفیسر محمد اکرام، پروفیسر رئیس انور، پروفیسر عقیل احمد عقیل، پروفیسر جمشید حسن، عبدالعزیز عزیز اور مناظر عاشق ہرگانوی بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ مناظر عاشق ہرگانوی نے محمد اکرام سے مخاطب ہو کر کہا "ذرا بتایئے تو، کیا یہ سچ ہے کہ دنیا میں ایک جوان بیاہتا عورت کے لئے سب سے میٹھی اور دلآویز آواز اپنے شوہر کی ہوتی ہے؟ یہاں تک کہ شوہر کے خراٹے بھی رات کے سناٹوں میں، بہت ہی اطمینان بخش اور باعث تحفظ معلوم ہوتے ہیں۔"
"میں خراٹے نہیں لیتا ہوں بھائی" محمد اکرام نے جواب دیا۔
"آواز کے بارے میں کیا خیال ہے، ڈر سے وہ بھی نہیں نکالتے ہیں کیا؟" رئیس انور نے پوچھا۔

دل والوں کی قبر

ڈاکٹر شمیم احمد، ڈاکٹر شمیم افزا قمر، پروفیسر شاداب رضی، ڈاکٹر عزیز الرحمٰن، پروفیسر رئیس انور اور مناظر عاشق ہرگانوی بیٹھے خوش گپی کر رہے تھے کہ شمیم افزا قمر نے بتایا کہ خدا بخش لائبریری کے ایک سمینار میں بیدل عظیم آبادی پر مقالے پڑھے جارہے تھے، کسی نے یہ انکشاف کیا کہ بیدل کی قبر نکل آئی ہے۔
پروفیسر عطا کاکوی نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا "دل والوں کی قبر کی بھی تحقیق ہونی چاہیئے۔"

تبصرہ :
طیب انصاری

بالآخر

مجتبیٰ حسین

ناشر: حسامی بکڈپو - مچھلی کمان حیدرآباد

مجتبیٰ حسین کا شمار معدودے ان چند مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ جنھوں نے خونِ جگر دے کر اپنے فن کی حنا بندی کی ہے۔ مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری سے پہلے ایسا تو نہ تھا کہ اس فن پر مذاق کی ادبی دنیا میں کوئی آبرو نہیں تھی۔ البتہ بعض نقاد ان فن ایسے تھے (اور اب بھی ہیں) جو مزاح کاری کو تیسرے درجہ کا فن قرار دیتے ہیں۔ اصل میں اس کی بنیادی وجہ خود فنکار ہیں۔ جو محض گدگدانے اور ہنسانے کے لئے فن کے تقدس کو مجروح کرتے اور قلمی کارٹون بناتے رہے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کانفرنسوں کے انعقاد کے ذریعہ اس صنف کو جو ملک گیر شہرت حاصل ہوئی اس میں مجتبیٰ اور ان کے رفقاء کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

مجتبیٰ حسین کو ان مزاحیہ سرگرمیوں سے ہٹ کر بھی مزاح نگار کی حیثیت سے بلند مقام حاصل ہے ویسے تو بالآخر ان کی پانچویں تصنیف ہے لیکن وہ اپنے پہلے مجموعہ مضامین "تکلف برطرف" کی اشاعت کے ساتھ ہی ملک کے مقبول اور مشہور مزاح نگاروں میں شامل ہو گئے تھے۔ "بالآخر" کے مضامین میں جو نمایاں تبدیلی ہمیں نظر آتی ہے وہ مزاح پر گہرے طنز کی فوقیت ہے۔ اس سلسلہ میں ان کا پہلا مضمون "اردو کا آخری قاری" اہمیت رکھتا ہے اس مضمون میں مجتبیٰ حسین بظاہر اردو زبان کے مستقبل سے مایوس نظر آتے ہیں۔ اور مضمون کے پڑھنے سے "بالآخر" کے قاری پر یہی تاثر قائم ہوتا ہے کہ اردو زبان کا مستقبل اکیسویں صدی عیسوی میں انتہائی تاریک ہے اور یہ کہ اس زبان کے ادب کے قاری کی تلاش ناممکنات میں سے ہوگی۔ میرا اپنا خیال ہے۔ مجتبیٰ حوادثِ زندگی سے ہر لمحہ گذرتے رہے ہیں، لیکن وہ کبھی مایوس نہیں ہوئے۔ ناگفتہ بہ حالات چہرہ کی شکن کی صورت نمایاں تو ہوئے ہیں لیکن ان کے اندر جو مزاح نگار ہے۔ وہ انہیں نئی جولانیٔ طبع عطا کرتا ہے۔ وہ ہنستے مسکراتے آلامِ زندگی کا مقابلہ کرتے ہیں۔ ان کے قہقہے محض گدگدانے سے ابل نہیں پڑتے بلکہ ان کے اندر ایک سنجیدگی اور متانت ہوتی ہے۔ اور مسکرانے یا قہقہے لگانے کا یہ عمل فطری ہوتا ہے۔ اور جب کشاکشِ حیات کی بات چھڑتی ہے تو یہ سنجیدگی گہری ہوتی جاتی ہے اور قاری کو سوچ و فکر کے دائرہ میں لاکر چھوڑ دیتی ہے، یہ وہ خوبی ہے جو مجتبیٰ کی ادبی قامت کو بلند کرتی ہے۔ "اردو کا آخری قاری" مزاحیہ ادب میں اتنا ہی اہم مضمون ہے جتنا کلیم کا مضمون "اردو کا آخری نقاد" سنجیدہ ادب میں اہمیت رکھتا ہے۔ اصل میں مجتبیٰ نے اس مضمون میں اردو زبان و ادب کے ان ٹھیکیداروں کو بے نقاب کیا ہے جو اردو کے نام پر اپنی دکان چمکاتے ہیں اور اس کو منافع کی تجارت سمجھ کر اس زبان کا استعمال کر رہے ہیں۔ و نیز اس مضمون کے ذریعہ مجتبیٰ نے

اُردو زبان کو مستقبل میں لاحق خطرہ سے عوام کو آگاہ بھی کیا ہے۔

"اُردو کا آخری قاری" کے علاوہ جو دوسرے مضامین مجھے پسند آئے۔ ان میں "برف کی الماری" ڈائرکٹر کا کتا' جشن منانا' جانا ہمارا کشک اور پانا خطاب ہاسپٹلٹی دادکی بیداد اور اُردو پبلشنگ کے بارے میں وغیرہ شامل ہیں۔ برف کی الماری میں جو واقعات مجتبیٰ نے درج کئے ہیں وہ اپنے میں بڑی سچائی رکھتے ہیں۔ اصل میں ہم لوگ فیشن زدگی کا شکار ہیں اور اپنی استطاعت سے بڑھ کر اخراجات کرتے ہیں۔ ڈائرکٹر کا کتا عصری دفتریت پر گہری چوٹ ہے۔ خصوصاً رحمت علی جب یہ کہتا ہے کہ اب بہت دیر ہو چکی' میں ڈائرکٹر کے کتے کو نہیں پکڑوں گا۔ کیونکہ میں تو کل سے ریٹائر ہو رہا ہوں" ـــــــ تو اس جملہ سے ہماری دفتر شاہی بے نقاب ہوتی ہے۔ " کالونی میں رہنا" میں مجتبیٰ کا پہلا جملہ ہی بڑی تلخ حقیقت رکھتا ہے اور موجودہ سماج پر طنز ہے "ایک زمانہ تھا جب ہمارا ملک برطانیہ کی ایک کالونی تھا اور آج اس میں کئی کالونیاں آباد ہو گئی ہیں"۔ جشن منانا اور "جانا ہمارا کشک" میں مجتبیٰ حسین نے اُردو ادیبوں نقادوں اور اردو عوام سے درپردہ اپنی ناقدری کا گلہ کیا ہے اور بین السطور میں ان کی آرزو ہلکی جھلکتی نظر آتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اردو والے جیتے جی کبھی کسی ادیب یا شاعر کی قدر افزائی نہیں کرتے لیکن اب یہ کفر ٹوٹتا نظر آ رہا ہے بلکہ اندیشہ ہے کہ اس روایت شکنی کے نتیجہ میں بہت سے ایسے ادیبوں اور شاعروں کے جشن کا اہتمام ہو جائے جو ادبی قامت تو نہیں رکھتے لیکن سرکار دربار میں اثر و رسوخ رکھتے ہیں پھر مجتبیٰ تو مجتبیٰ ہی ہیں۔ ان کا جشن یقیناً ہوگا۔

مجتبیٰ خوش دلی' خوش وقتی اور خوش مذاقی کو زندگی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں اور اسی ضرورت کی تکمیل میں پے در پے مزاحیہ مضامین کے انبار لگا رہے ہیں اس لئے میرے خیال میں انہیں یہ دعویٰ کرتے ہوئے تکلف سے کام نہیں لینا چاہئیے کہ انہوں نے اُردو مزاح نگاری کے سرمایہ میں کوئی اضافہ کیا ہے۔

"تکلف برطرف! مجتبیٰ حسین مزاح نگاری کی آبرو ہیں" ان کی تحریریں محض گدگدانے کا فریضہ ہی انجام نہیں دیتیں وہ ذہن انسانی کو جھنجھوڑتی بھی ہیں۔ ادھر پچھلے چند برسوں سے ان کا انداز تحریر اور انداز تفکر دونوں ہی نے اُردو کے قاری کے دامن کو مسکراہٹوں کے پھولوں سے بھر دیا ہے "بالآخر" صرف مجتبیٰ کی مطبوعات ہی میں نہیں اُردو کے مزاحیہ ادب کے سرمایہ میں یقیناً اضافہ ہے۔

مجتبیٰ حسین کے ان دلچسپ مضامین کے مجموعہ بالآخر کو حسامی بکڈپو نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے' یہ کتاب چودہ روپیہ ادا کرنے پر شگوفہ بکڈپو سے بھی دستیاب ہو سکتی ہے۔

دندوبھی - امیدوں کا سال

اُگادی ساڑھے پانچ کروڑ تلگو عوام کیلئے نئے سال کا تہوار ہے۔ آنے والا دندوبھی تلگو سال ریاستی عوام کیلئے زیادہ سے زیادہ ترقیاتی پروگرام اور بہتر سہولتیں لیکر آرہا ہے۔

ریاستی حکومت نے ریاست میں ثقافتی سرگرمیوں میں اضافہ کرنے کا عزم کرچکی ہے۔ پوتنا کی پنچایتی تقریب حال میں مقدس شاعر کے پیدائشی مقام بومیرا میں منعقد کی گئی جس سے ماضی کی ادبی عظمت میں تلگو عوام کی دلچسپی کے احیاء میں مدد ملی ہے۔ ورنگل میں عظیم شاعر پوتنا کی شایانِ شایان یادگار کا قیام عمل میں لایا جارہا ہے۔

مارچ کے مہینے میں ناگرجونا یونیورسٹی کے بدھسٹ اسٹڈیز سنٹر کا بھوٹان کے راجہ کے ہاتھوں افتتاح عمل میں لایا گیا۔ یہ ایک منفرد واقعہ ہے جو ہمیں دنیا کے اس علاقے میں صدیوں قبل علم کو پھیلانے میں اچاریہ ناگرجونا نے جو حصہ ادا کیا اس کی یاد دلاتا ہے۔

ہماری وزیراعظم کی جانب سے پیش کردہ نیا ۲۰ نکاتی پروگرام پر بھرپور جوش اور اشتیاق کے ساتھ عمل آوری کی جارہی ہے تاکہ کمزور طبقات کی حالت کو بہتر بنایا جاسکے اور ریاست کو ہمہ جہتی ترقی سے ہمکنار کیا جائے۔ اس پروگرام کی عمل آوری کی نگرانی کیلئے سکریٹریٹ میں ایک خصوصی شعبہ قائم کیا گیا ہے۔ تلگو نئے سال سے مواضعات کی سطح پر اشیائے ضروریہ کی تقسیم کا آغاز کیا جائیگا۔ اس اقدام کا مقصد اشیائے ضروریہ کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کے چکر کو روکنا ہے۔

تمام شہروں اور دیہاتوں اور خصوصیت سے ایسے دیہاتوں کو جہاں پانی کا مسئلہ شدید ہے پینے کے پانی کی سربراہی کی اسکیم پر نئے سال کے آغاز سے سختی سے عمل آوری کی جائیگی۔ ایلیر جلاشیہ ڈیم سے مارچ کے مہینے میں پانی چھوڑا گیا ہے۔ اس طرح سری رام ساگر نے ریاست کے عوام کو فائدہ پہنچانا شروع کردیا ہے۔ — دندوبھی تلگو سال بلاشبہ ریاست کے عوام کیلئے امیدوں بھرا سال ہے۔
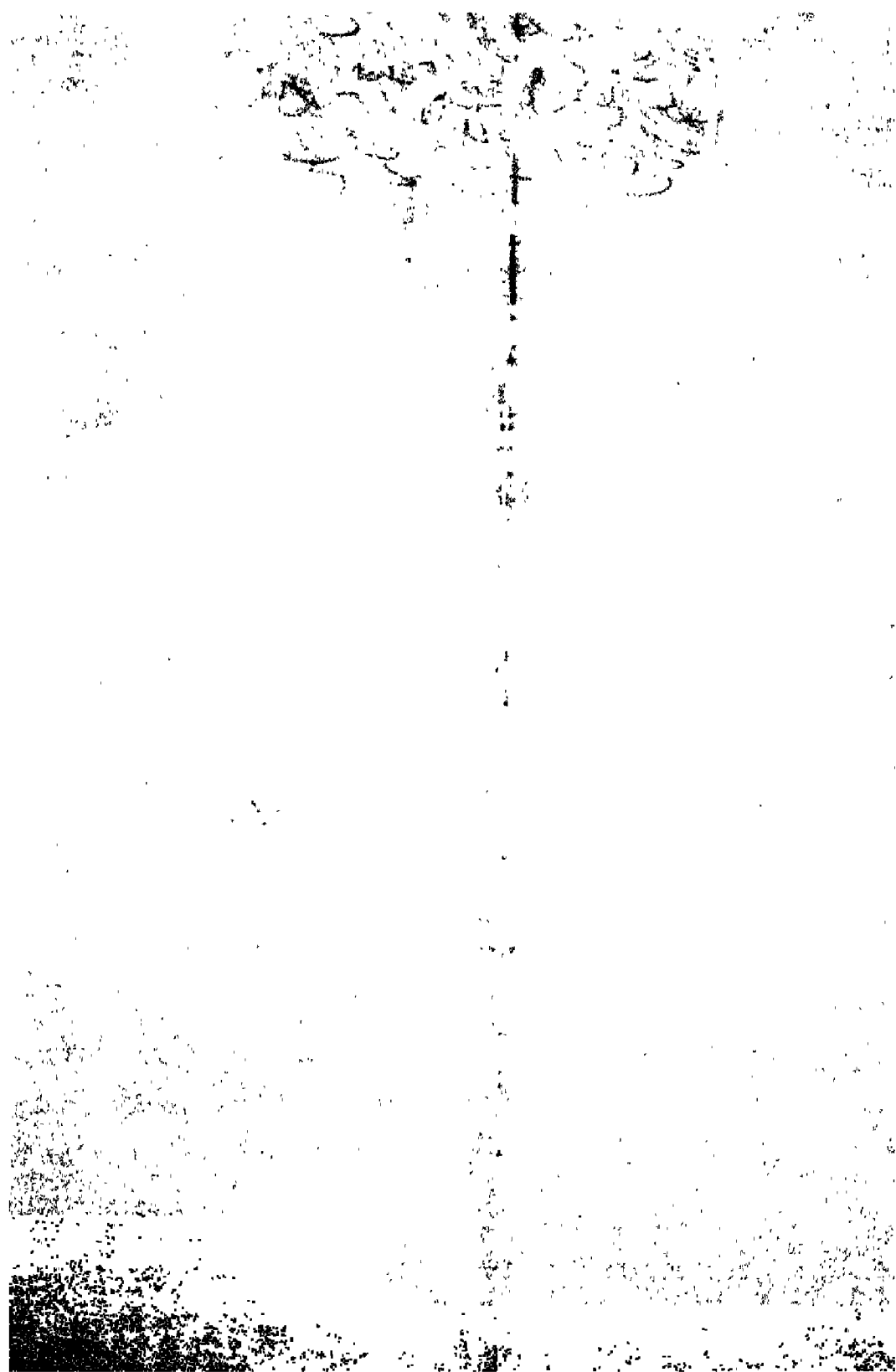
زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان
ماہنامہ
شگوفہ
رجسٹرڈ
جلد (۱۵)
شمارہ (۵)
ایڈیٹر
سید مصطفیٰ کمال
مجلس ادارت
ٹائیٹل
عزیز کارٹونسٹ (کراچی)
مجلس مشاورت
حمایت اللہ
منظور احمد
مسیح انجم
منیجر: سمیع جلیل
منیجر اشتہارات: میر فاروق علی
راجندر سنگھ بیدی
بھارت چند کھنہ
خواجہ عبدالغفور
نریندر لوتھر
مجتبیٰ حسین
زرِ سالانہ، انفرادی: ۲۵ روپے
لائبریری: ۳۰ روپے
بیرونی ممالک سے: ۹۰ روپے
قیمت فی پرچہ: ۲ روپے ۵۰ پیسے
کتابت:-
نعیم احمد ٭ مسعود الرب
طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چار کمان حیدرآباد ٭ بائنڈنگ: محمدیہ بک بائنڈنگ ورکس حیدرآباد
خط و کتابت کا پتہ
شگوفہ ۳۱، بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱
فون:
57716

اس تھیلی کے چٹے بٹے

بے جوڑ شادیوں

پر

ایک طنز

ساگر سرحدی کی فلم

بازار

اسٹارز: سمیتا پاٹل ★ نصیر الدین شاہ
فاروق شیخ ★ سپریہ پاٹھک
بھرت کپور ★ بی ایل چوپڑہ اور دوسرے

۲۱ مئی سے بمبئی اور حیدرآباد میں دکھائی جا رہی ہے

کنہیا لال کپور

شاعروں کی نازک خیالیاں

یالال کپور کا یہ مضمون
ماہنامہ "ہنس چار"
ئع ہوا تھا۔

ردں کو خدا کی عجیب و غریب مخلوق کہا گیا ہے۔ وہ عموماً دُور کی کوڑی لاتے ہیں۔ لیکن اُسے دُور کی
بلائے نازک خیالی کہتے ہیں۔ اصل میں یہ نازک خیالی ایک مبالغہ آمیز بیان کے علاوہ اور کچھ نہیں
یہ ذوقؔ کے اس شعر کو لیجئے : ؎

نازک خیالیاں مری توڑیں عدو کا دل
میں وہ بلا ہوں شیشے سے پتھر کو توڑ دوں

یہ شعر کو پڑھ کر بے ساختہ یہ الفاظ زبان پر آجاتے ہیں "واہ صاحب واہ! آپ شاعر نہیں جادوگر
سے پتھر کو توڑ دیتے ہیں۔ یہ بتائیے اپنا شیشہ آپ کے ہاتھ کیسے لگا۔ تاکہ اس سے شیش محل تیار
جس میں بیٹھ کر دوسروں پہ پتھر برسائے جائیں نیز اسے دروازوں اور کھڑکیوں میں لگایا جائے تاکہ لوگ
توڑ نہ سکیں۔ سنسکرت کا ایک شاعر دوج کا چاند دیکھ کر کہتا ہے ۔ یہ چاند نہیں میری محبوبہ کی
جہاں معت اس کے پاؤں سے گر پڑی جب وہ آسمان میں ناچ رہی تھی۔ دوج کے چاند کو پاؤں
کون خیال کر سکتا ہے۔ تبھی تو شیکسپیئر نے کہا تھا۔ جہاں تک تخیل کا سوال ہے۔ عاشق
خیالوں میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔
کے ایک شاعر نے پہلی رات کے چاند کو دیکھ کر یہ شعر موزوں کیا تھا : ؎

دیر تک اس شبہ میں دیکھا ہلال
یہ کسی کافر کی انگڑائی نہ ہو

ملاحظہ فرمایا آپ نے، پہلی رات کا چاند چاند نہیں کسی خوبصورت عورت کی انگڑائی ہے۔ لطف یہ کہ جب یہ چاند چودھویں کا ہو جائے گا، تو پھر اسے دیکھ کر شاعر کو اپنی محبوبہ کے چہرے کی یاد آجائے گی۔

کل چودھویں کی رات تھی، شب بھر رہا چرچا ترا
کچھ نے کہا یہ چاند ہے، کچھ نے کہا چہرا ترا

بیچارے شاعر کو شاید یہ پتہ نہیں کہ تسخیر چاند کے بعد کسی چہرے کو چاند کہنا، اس چہرے کی توہین کرنا ہے کیونکہ چاند کی سطح بے حد بھیانک اور بدصورت ہے۔

مرزا غالب کا ایک شعر ہے، جس کا مفہوم ہے ہجر کے صدمے اٹھا اٹھا کر عاشق میاں اتنے کمزور ہو گئے ہیں کہ اُن کے آنسو اب سرد آہوں میں تبدیل ہو گئے ہیں اور انہیں یقین ہو گیا ہے۔ جب پانی کو گرم کیا جاتا ہے وہ بھاپ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے مرزا نے لڑکپن ہی میں جو تھوڑی کیمسٹری پڑھی تھی، انہوں نے اس کا اس شعر میں خوب فائدہ اٹھایا ہے۔

اب ایک لکھنوی شاعر کے تخیل کی داد دیجئے جس نے کسی حسینہ کو نہانے کے بعد جوڑا باندھتے ہوئے دیکھا اور دُور کی کوڑی لاتے ہوئے کہا :

اگر وہ اپنے سر کا کھول دے جوڑا شرارت سے
ابھی چھا جائے گھٹا، پانی برس جائے دھنک نکلے

سبحان اللہ! عورت نہ ہوئی، ساون کا مہینہ ہوا، اب جہاں کہیں سوکھا پڑ جائے اس عورت کو وہاں لے جا کر اس سے اپنا جوڑا کھولنے کی درخواست کرنی چاہیئے۔ تاکہ لوگ بیک وقت گھٹا، برکھا اور دھنک کا نظارہ کر سکیں۔

اسے کئی شعرا کی نازک خیالی کہیے کہ انہیں اپنے محبوب کی کمر یا تو نظر نہیں آتی یا اتنی باریک نظر آتی ہے کہ انہیں حیرت ہوتی ہے، دھڑ کس چیز کے سہارے کھڑا ہے۔ ایک شاعر فرماتے ہیں :

سنتے ہیں صنم تیری بھی کمر ہے
کہاں ہے کس طرح کی ہے کدھر ہے

دوسرے فرماتے ہیں :

کمر باریک ہے تابِ نظر سے

اس مصرع کے خالق سے یہ کہنے کو جی چاہتا ہے قبلہ اگر آپ کو کمر تابِ نظر سے باریک دکھائی دیتی ہے تو یہ کمر کا نہیں آپ کی بینائی کا قصور ہے۔ آپ عینک لگوائیے اور اگر آپ عینک کا استعمال کرتے ہیں تو یقیناً اس کا نمبر بدل گیا ہے۔ اس لئے نئی عینک بنوائیے۔

کئی بار محض انوکھا پن پیدا کرنے کے لئے شعرا حقیقت کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں۔ غالب فرماتے ہیں درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا، پھر ارشاد ہوتا ہے رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو اب ان سے کوئی عرض کرے کہ حضور جب درد حد سے گذر جاتا ہے تو کسی بڑے اسپتال کا رخ کیا جاتا ہے اور اگر آدمی لُٹ جائے تو رہزن کو دعا نہیں دیتا۔ بلکہ پولیس اسٹیشن میں رپٹ درج کرواتا ہے۔ نازک خیالی کا یہی تقاضہ ہے کہ شعرا خود فریبی میں مبتلا ہو کے بعد اس کا ذکر بڑے فخر سے کریں، دو مثالیں ملاحظہ فرمائیے

شاید مجھے نکال کر پچھتا رہے ہوں آپ
محفل میں اس خیال سے پھر آگیا ہوں

کیا کیا فریب دل کو دیئے اضطراب میں
ان کی طرف سے آپ لکھے خط جواب میں

سچ تو یہ ہے اگر یہ بات نثر میں کہی جاتی تو شاید لوگ کہنے والے کا دماغ چل گیا ہے لیکن چونکہ وہ نظم میں کہی گئی ہے اسے نازک خیالی کہتے ہیں۔

ڈاکٹر سید حامد حسین
(بھوپال)

ردّی کا جادو

انسان کو جو بات
حیوان سے امتیاز بخشتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ
اُسے فضول سامان کو سینے سے لگا کر رکھنے کا خداداد
ملکہ حاصل ہے۔ یہ انسان ہی ہے جو عام زندگی میں کام نہ
آنے والے کاٹھ کباڑ کو زندگی کا سرمایہ، تاریخ، وراثت اور نہ
جانے کیا کیا خوبصورت نام دیتا ہے۔ کسی انسان کے تہذیبی مقام کا پتہ اس
بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ردّی سامان کو اپنے گھر کے ویران خانے اور اپنے
ذہن کے نہاں خانے میں جگہ دینے کے لیے کتنے خوبصورت بہانے تراش لیتا ہے۔ بعض نفسیات
کے ماہرین نے تو بڑی محنت سے انسانی شعور کے دو منزلہ مکان کے بارے میں یہ عرفان حاصل کیا
ہے کہ اُس کی بالائی منزل میں شعور کا تھیٹر واقع ہے اور نیچے کی منزل میں شعور کا ردّی خانہ۔ وہ کہتے ہیں کہ
دو منزلہ بس کی طرح انسانی شعور و احساس کا اسٹیرنگ بھی نیچے والی منزل میں ہے اور وہاں سے اُٹھنے والی
گرد ہی بالائی تھیٹر پر طرح طرح کے منظروں اور منصوبوں کو جنم دیتی ہے۔
ہر شریف انسان کی زندگی میں وہ لمحات آزمائش کا سامان بن کر آتے ہیں جن میں اُسے اپنی ملکیت
اشیا میں سے کچھ کو فضول اور بیکار قرار دے کر گھر سے باہر پھینک دینے کا روح فرسا فیصلہ کرنا ہوتا ہے

اور آج کی سکڑتی دنیا میں اس پاؤں پسارتی ملکیت کی وجہ سے یہ لمحے بار بار آتے اور ہماری قوت فیصلہ کو للکارتے ہیں۔ ہماری اپنی زندگی میں بار بار ٹالنے کے باوجود ایسے مواقع اکثر آتے رہتے ہیں اور ہماری شخصیت پر اپنے لرزہ خیز اثرات چھوڑے بغیر نہیں رہتے۔

ایک ایسے ہی حادثے سے ہم تین ماہ قبل دوچار ہوئے ہیں۔ اس کمرے کی جسے جدید دور کے لوگ اسٹور اور قدیم داستان گو حجرۂ ہفت بلا کہا کرتے تھے، صفائی کو ہم پچھلے سات سال سے بڑی کامیابی سے ٹالتے رہے تھے۔ لیکن اس بار یہ کامیابی نصیب میں نہ تھی۔ چنانچہ ہم کو سر پر جھاڑن باندھ کر اس بحر ظلمات میں کود ہی پڑا۔ اس حجرۂ عجائبات کا دروازہ کھلنا تھا کہ ایک سیاہ آندھی اٹھی اور باقی ماندہ گھر کے گوشہ گوشہ پر اس طرح چھا گئی کہ من و تو، سیاہ و سفید اور قدیم و جدید کے سارے بے معنی امتیازات ختم ہو گئے۔ جب ہمارے ہوش و حواس کے دھندلکے میں پھر سے سمجھ کی پو پھٹی تو ہم نے دیکھا کہ گھر کا ہر فرد مال غنیمت میں سے اپنا حصہ رہ لے اڑا ہے اور چشم زدن میں پورے گھر کی وہ کیفیت نظر آ رہی تھی جو تاریخ میں مذکور ہیروشیما، پانی پت یا پیپائی شہروں کو جمع کر کے تین سے تقسیم کر دینے کی صورت میں تصور کی جا سکتی ہے۔

ایک جانب ہمارے صاحبزادے ایک تین بنا آٹھ ٹکڑی کے گھوڑے، بے سر کی بطخ، بلا پہیوں والی گاڑی، ہینڈل کے سہارے جھولتے مرگی کے مرض میں مبتلا کرکٹ کے بیاٹ، بغیر تیلیوں والے طوطے کے پنجرے میں بھرے ہوئے مختلف سائزوں اور شکلوں کے جوتوں کی چھان بین میں محققانہ سنجیدگی سے مشغول تھے، تو دوسری طرف ہماری صاحبزادی بوتلوں، شیشیوں، بلا دانت کے سن رسیدہ کنگھوں، پولیو زدہ ٹوتھ برشوں، نصف جوڑ آویزوں، بلا تصویر والے تاشوں کی گڈی میں منہمک تھیں۔ ہماری بیگم کو نوادرات کا ایک بکس ہاتھ لگ گیا تھا اور باآواز بلند رواں تبصرے کے ساتھ ایک ایک آئٹم کو اس طرح پیش کر رہی تھیں جیسے کوئی نیلام والا حاضرین کا دل جیتنا چاہ رہا ہو۔ دیکھو یہ تین انگلیوں والا اُس گڑیا کا ہاتھ جو ہم نے تین سال کی عمر میں بنایا تھا۔ اور یہ اُن ڈاکٹر مکرجی کا نسخہ ہے جو انگریزی دواؤں کے نام بنگلہ میں لکھتے تھے۔ بیچاروں کے بنگالی کپاؤنڈر کو بھی مرے اب دس سال ہو گئے لیکن یہ ہے پرانی پیچش کے لیے اچوک نسخہ۔ اور یہ دیکھو یہ ہماری عقل داڑھ کا ایکسرے ہے۔ ڈاکٹر چورسے نے اُس وقت لکھ دیا تھا جب وہ پوری نکلی بھی نہیں تھی۔ اور یہ سگار کا وہ ڈبہ ہے جو ہمارے ماموں کے جرمن دوست چھوڑ گئے تھے اور اس میں ایک بار چوہے نے بچے دیئے تھے۔ اور ہاں ہاں یہ دیکھو یہ ہمارے اسکول کے زمانے کا فوٹو۔ اس میں ہم یہاں ذرا باہر کھڑے تھے۔ فوٹوگرافر نے ہمارا فوٹو ہی نہیں لیا لیکن ہے یادگار فوٹو۔ اور یہ کترنیں دیکھئے یہ ہمارے بھائی۔ وہ منظر ماموں ہیں نا تمہارے اُن کی شادی کی شیروانی کی ہیں۔ اب ایسا کمخواب کب ملتا ہے۔ اوہ اور یہ تو عطر کی وہ شیشی ہے جو کریم خالو نے لکھنؤ سے بھیجی تھی۔ اُس وقت جب ہم اتنے سے تھے۔ اچھا یہ کیا ہے یہ تو جیلہ پھوپھی کا

شادی کا کارڈ ہے۔ سنبھال کر رکھو۔ وہ آئیں گی تو بتائیں گے . . . . .

لیکن حال یہ تھا کہ ہر ایک اپنی اپنی تاریخ پر سے گرد جھاڑ کر ماضی کی اندھیری سرنگ میں داخل ہو چکا تھا اور اُسے پتہ نہ تھا کہ دوسرا کیا کھویا کیا پا رہا ہے۔ ہمیں بھی نوادرات پر نوادرات مل رہے تھے۔ پرانے خطوں کے بنڈل، رسالوں کے منتشر اوراق، بچوں کی کتابیں اور کچھ عرصے بعد ہمیں محسوس ہوا کہ ہم بھی اس سیلاب میں غرق ہو چکے ہیں

تیسرے پہر کے قریب جب تھک ہار کر ماضی سے حال کی طرف لوٹے تو ہم نے تجویز پیش کی کہ اس انبار میں سے غیر ضروری چیزوں کو الگ کر دیا جائے۔ ہر ایک نے اس سے اتفاق کیا۔ چنانچہ ہم نے سب سے پہلے پرانی شیشیوں اور بوتلوں کی جانب رُخ کیا۔ یہ سینٹ کی شیشی پھینک دیں۔ نہیں، دیکھو کتنی خوبصورت ہے۔ آج کل کہاں آتی ہیں ایسی شیشیاں۔ اچھا یہ بوتل الگ کر دیں۔ ارے یہ تو بڑے منہ کی ہے کوئی پودا ہی لگا دیں گے۔ اچھا یہ بغیر ڈھکنے کی بوتل بالکل بیکار ہے۔ الگ رکھ دو، کسی کو دے دیں گے خوش ہو جائے گا۔ اچھا تو پھر یہ بلا بوتلوں کے ڈھکنے پھینک دیں۔ واہ آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ دیکھئے یہ ڈھکنا کتنا خوبصورت ہے۔ پھر آپ کی شطرنج کا ہاتھی بھی کھو گیا ہے اس کی جگہ رکھ لیجیے گا۔ اچھا یہ دیکھو یہ تصویر پتہ نہیں کس کی ہے۔ کسی فلم ایکٹریس کی لگتی ہے اسے پھینکو۔ آپ بھی غضب کرتے ہیں۔ یہ تو میں نے رسالے سے کاٹ کر رکھی تھی۔ دیکھو اس کی شکل نکہت باجی سے کتنی ملتی ہے۔ اچھا دیکھو یہ بلا جوڑی کا اکیلا جوتا الگ کئے دیتے ہیں۔ واہ بھئی آپ تو ہر چیز پھینکنے پر تلے ہیں۔ آپ کو یاد نہیں سلیم نے اسی کے ساتھ کا جوتا تو آگرے میں گما دیا تھا۔ جب ہم آپ تاج محل دیکھنے گئے تھے۔ رکھ دیجیے یہ اُس کی یاد دلاتا رہے گا۔ ٹھیک ہے یہ ٹوٹی بانسری پھینکے دیتے ہیں۔ واہ واہ یہ کہاں کی ٹوٹی ہے۔ پچھلے سال اسی کو تو کلیم ڈرامے میں لے گیا تھا۔ وہاں بجانا تھوڑی پڑی تھی۔ رکھ لیجیے کام آئے گی۔ اچھا تو پھر یہ کاغذ کی تھیلی پھینک دیں۔ لاؤ دیکھیں۔ ارے یہ تو میں نے رکھی تھی اس کروشیا کے ڈیزائن کے لئے جو یہ تصویر والی عورت پہنے ہے . . . . .

الغرض تین گھنٹے پچاس منٹ کی طویل بحث کے بعد صرف ٹین کے ایک ایسے ڈبے کے پھینکنے پر اتفاق ہوا جس پر کوئی لیبل نہ تھا۔ چنانچہ کلیم میاں کو آواز دی گئی کہ وہ اُسے اُٹھا کر گھر کے باہر پھینک دیں لیکن انھوں نے آتے ہی انکشاف کیا کہ یہ ڈبہ تو اس حلوہ حبشی کا تھا جو غضنفر ماموں کراچی سے لائے تھے۔ ظاہر ہے بالیبل کے ہوتے ہوئے بھی یہ ڈبہ تاریخی اہمیت کا مالک تھا اور پھر اگر اتفاق سے غضنفر ماموں نے اُسے کچرے گھر میں پڑے دیکھ لیا تو ساری عمر کے لیے تعلقات خراب ہو جانے کا اندیشہ تھا۔

چنانچہ یہ فیصلہ ہوا کہ سب چیزیں حسب سابقہ [illegible] کوٹھریوں میں رکھ دی جائیں۔ اب جب اس کائنات کو سمیٹ کر ایک مختصر کمرے کی حدود میں بند کرنے کی کوشش کی گئی تو الف لیلہ کے پُر جلال جن کی طرح

اس نے بوتل میں قدم رکھنے سے صاف انکار کر دیا۔ چنانچہ آج تین ماہ کا عرصہ ہو چکا ہے، ان تاریخی نوادرات نے گوشۂ گمنامی سے نکل کر گھر بھر میں اپنی کالونیاں بنا لی ہیں۔ کہیں پرانے کھلونوں کا عمل دخل ہے۔ کہیں مسعود محمود کے کھیل کا سامان اپنے اپاہج پن کی نمائش کر کے داد و تحسین حاصل کر رہا ہے۔ کہیں وضع وضع کی بوتلیں اور شیشیاں آنکھ مچولی کھیل رہی ہیں۔ کہیں پرانے کیلنڈروں کا راج ہے۔ یہاں تک کہ الماریوں اور میز کی درازوں تک میں اُن کی عملداری پہنچ چکی ہے۔ مثلاً کل جب اپنے قلم کی تلاش میں میز کی دراز کھولی تو اس میں بوشرٹوں کے بے رنگ برنگے بٹنوں، پرانے پرس، بٹنوں اور تالوں سے سامنا ہوا جن کی پرانے سامان سے بازیافت کی گئی تھی۔ کتابوں کے درمیان اب پرانے عید کارڈوں اور دعوت ناموں کی ریل پیل تھی۔ کپڑوں کی الماری میں ماضی و حال اُس طرح شیر و شکر ہو چکے ہیں کہ یہ ناممکن نہیں کہ ہم جسے اپنی جیب میں رستی سمجھ کر رکھ لیں وہ بعد میں ہماری صاحبزادی کی گڑیا کا دوپٹہ ثابت ہو۔

ردی سامان کے اس بھرپور حملے سے گھبرا کر اب ہم کو عافیت صرف اس میں نظر آتی ہے کہ اس گھر کو چھوڑ کر بھاگ نکلیں اور اپنا سر چھپانے کے لیے کوئی اور جگہ تلاش کریں۔ اس خطرے کا سامنا کرنے پر پہلی بار ہمیں اس حقیقت کا بھرپور اندازہ ہوا کہ آخر ہمارے شاعر ایک نیا گھر بسانے کے گیت کیوں گاتے رہتے ہیں۔

پیروڈی

جس کو سمجھا تھا وہ جمیلہ نکلی
جمیلہ پڑوسی کی سہیلی نکلی

کوئی سمجھا نہ اُسے آفس میں
ٹائپسٹ اپنی پہیلی نکلی

اک دن بھی نہ وہ پہنچی کالج
گھر سے کالج تو ڈیلی نکلی

غالب و میر کا دیوانہ میں
اور شیلے کی وہ چیلی نکلی

کیا کھنکتی تھی وہ سکے کی طرح
ہاتھ جب آئی تو دھیلی نکلی

میں سمجھا تھا کشمیر اُسے
اصل وہ ناگنِ زہریلی نکلی

[illegible]

سخاوت

برق آشیانوی

اک شیخ کے فرزند نے از راہِ سخاوت
خیرات کی نیت سے نیا پیسہ نکالا

جب شیخ نے دیکھا تو سمجھ میں نہ کچھ آیا
پوچھا کہ "یہ کیا کرتے ہو؟" تو بولا یہ بیٹا

کل آپ نے مسجد میں یہ کی تھی نصیحت
خیرات جو دے گا تو ثواب اس کو ملے گا

یہ بات سنی شیخ نے تو فکر میں ڈوبے
پھر ہنس کے بڑے پیار سے فرمایا کہ بیٹا

یہ وعظ و نصیحت تو مریدوں کے لئے ہے
اطلاق کسی بات کا ہم پر نہیں ہوتا

یہ قاعدہ ہے عام کہ میخانے میں ساقی
مے نوش کراتا ہے مگر خود نہیں پیتا

اعجاز وارثی سنبھلی

ناموں کی شستم ظریفی

(اس مزاحیہ نظم کے جملہ نام (علاوہ میرے نام کے) محض خیالی ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے)

---

(۱)
ناموں کا زندگی پہ کوئی خاص اثر نہیں
قدرت کے فیصلوں سے کسی کو مفر نہیں

(۲)
پوچھا جو ایک سائل خستہ سے میں نے نام
اک آہ بھر کے بولا کہ حاتم ہے یہ غلام

(۳)
خوشحال جن کا نام ہے دست سوال ہیں
اور ایک وہ عروج جو وقت زوال ہیں

(۴)
ذیجاہ و سربلند اک آغا رئیس ہیں
بیوی اور آپ قد میں بس انیس بیس ہیں

(۵)
مدقوق ہیں ہمیشہ سے شہ زور جان خاں
اک کشتی شکستہ کے بوسیدہ بادباں

(۶)
عطا کا وہ لونڈا نزاکت ہے جس کا نام
سرکس میں ہو تو ہاتھی کے بچے کا لے مقام

(۷)
اپنے پڑوس ہی میں میاں انکسار ہیں
بالکل بنے بنائے بڑے حق نہ دار ہیں

(۸)
اوصاف خاں شمال کے بدلے جنوب ہیں
کہنا یہ چاہتا ہوں مجسم عیوب ہیں

(۹)
تھیں تو توقعات بہت شیر جنگ سے
مجبور ہیں حضور مگر پائے لنگ سے

(۱۰)
پندار ایک شاعر خانہ خراب ہیں
سرقہ اور استفادہ کے ماہر جناب ہیں

(۱۱)
نو عمر رکشہ والا نزاکت کہیں جسے
لاغر نحیف مید مشقت کہیں جسے

(۱۲)
اولاد آدم ایک جناب شریف ہیں
فصل ربیع کی جگہ فصل خریف ہیں

(۱۳)
وہ پھول والا کہتی ہے دنیا جسے بہار
چہرے کے اعتبار سے چیچک کا اشتہار

(۱۴)
اک صاحب اور یونہی سے قد سے طویل ہیں
تکیہ کلام یہ ہے کہ ہم بھی عقیل ہیں

(۱۵)
گوڈری کا وہ ڈرائی کلینر قمر لطیف
صحبت میں گر کر ہے تو پوشاک میں کثیف

(۱۶)
خیراتی آج کار میں اپنی سوار ہیں
اور کار کے ڈرائیور استھار ہیں

(۱۷)
احمق وہ اک جو اپنی انا کا غلام ہے
اعجاز نام کہ جسے اعجاز نام ہے

سیّد نصرت
(آرکیٹکٹ)

اس سال عید آئی تو بیگم ہمارے پیچھے پڑ گئیں کہ جیسے بھی ہو عید پر قربانی ضرور دی جائے گی اور یہ کہ پچھلے
ئی سالوں کی طرح اس مرتبہ کوئی حیلہ یا بہانہ ہرگز نہیں چلے گا۔ حالانکہ ہم بھی دل و جان سے یہ چاہتے ہیں کہ عید
بان پر ایک عدد موٹے تازے بکرے کی قربانی دی جائے تاکہ اس عمل سے ایک طرف جہاں پاس پڑوس
ہمارے متمول ہونے کی دھاک بیٹھ سکے تو دوسری قربانی کے گوشت سے کچھ کام و دہن کے مزے بھی لوٹے
سکیں لیکن اس کو کیا کیجئے کہ ایک تو ہم کو بازار جاکر بکرے کا بھاؤ تاؤ کرنا نہیں آتا اور دوسرے عید کے
ن اس کے گلے پر چھری پھیرنے کا منظر ہمارے لئے انتہائی لرزہ خیز ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ قربانی کا
عاملہ برسوں سے یونہی ٹلتا چلا آ رہا تھا لیکن اب کی بار جب بیگم کا اصرار حد سے زیادہ بڑھنے لگا تو ہم نے
بھی سنجیدگی سے قربانی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ حسن اتفاق کہ عید سے آٹھ دس دن پہلے ہمارے
ہو اور اکلوتے سالے قمر الزماں اپنے شہر سے ہمارے ہاں تشریف لائے اور آتے ہی انہوں نے اس
ت کا باقاعدہ اعلان بھی کر دیا کہ وہ ہمیشہ کی طرح ہمیں دو چار ماہ شرف میزبانی بخشیں گے۔ قمر الزماں کی شخصیت
ہمارے بہت سارے دوست احباب، رشتہ داروں اور محلے والوں کے لئے نئی نہیں ہے بلکہ سال کے لو

دس ماہ ہمارے گھر قیام پذیر ہونے کی وجہ سے محلے کے سارے لوگ بالک تھے، بلیاں، کیڑے مکوڑے اور تمام حشرات الارض ان کو نہ صرف اچھی طرح جانتے پہچانتے ہیں بلکہ اکثروں سے ان کا یارانہ بھی ہے چنانچہ ہم نے ایک دن اپنے اکلوتے سالے صاحب سے پوچھا کہ "بھائی آج کل آپ کی نظر میں کوئی بکرا وکرا ہے تو بولے "کیوں نہیں بھائی جان۔ سینکڑوں بکرے میرے ہاتھ پر ہیں" اور پھر کسی کو بھی منٹوں میں بکرا بنانا تو میری ہابی ہے" ہم نے کہا "میاں ہم اس بکرے کی بات نہیں کر رہے ہیں، بلکہ ہمیں تو وہ بکرا درکار ہے جس کی قربانی دی جاتی ہے۔ کیونکہ یہ نہ صرف تمہاری آپا کا اصرار ہے بلکہ برسوں سے ہمارے پڑوسی بھی اس انتظار میں ہیں کہ کسی برس ہمارے ہاں قربانی دی جائے اور انہیں ان کے حصے کا گوشت مل سکے۔

بولے "فکر نہ کریں ایسے بکرے کا انتظام ہو جائے گا" مگر میری ایک شرط آپ کو ماننی پڑے گی وہ یہ کہ معین الدین صاحب کے گھر ایک بوٹی بھی نہ جائے گی"۔ ہم نے کہا "میاں! معین الدین صاحب تو ہمارے بہت اچھے پڑوسی ہیں اور وقتاً فوقتاً ہم سے ادھار لیکر ہمارے احسان مند بھی رہتے ہیں" تو کہا "اجی کیا خاک اچھے پڑوسی ہیں۔ محلے میں آئے ہوئے انہیں پورے ۵ برس ہو رہے ہیں اور آج تک ان کے ہاں سے کوئی دعوت آئی اور نہ ہی کسی عید پر انہوں نے چھپا تک آدھی چھپا تک گوشت بھیجا۔

دروغ بر گردن راوی سنا جاتا ہے کہ کسی دن ہمارے سالے صاحب نے معین الدین صاحب کی لڑکی سے شادی کے لئے پیام روانہ کیا تھا۔ جس کے جواب میں معین الدین صاحب نے انہیں یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ ان کی لڑکی کوئی بکری نہیں ہے جس کا بیاہ وہ قدیر میاں جیسی شہرہ آفاق شخصیت سے کریں گے اور بس اسی دن سے معین صاحب کی شخصیت سے ہمارے سالے صاحب کو خدا واسطے کا بیر سا ہو گیا ہے ہم کو چونکہ عید پہ ایک عدد بکرے کی ضرورت تھی اور ہماری یہ ضرورت ہمارے سالے صاحب بخوبی پوری کر سکتے تھے، چنانچہ ہم نے حامی بھر لی کہ معین صاحب کے گھر ایک بوٹی تو کیا ایک چھیچھڑا تک بھی نہ جائے گا۔

پھر قدیر میاں کہیں سے مناسب داموں پہ ایک تنو مند اور متناسب الاعضاء بکرا خرید لائے اور گھر میں پورے زور و شور سے قربانی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

عید کے لئے ابھی چار دن اور باقی تھے اور ان چار دنوں تک بکرے کی نگہداشت کرنا اپنی جگہ ایک مسئلہ تھا پہلے دن بیگم مصر ہو گئیں کہ وہ بکرے کو نہلا دھلا کر کسی شریف آدمی کی طرح صاف ستھرا کریں گی۔ ہم نے انہیں لاکھ سمجھایا کہ بکرے اپنی زندگی میں کبھی بھول کر بھی نہیں نہاتے اور وہ محض بکرے ہی رہتے ہیں۔ اگر انہیں نہلانے کی کوشش بھی کی جائے تو وہ اپنی تمام تر شرافت بالائے طاق رکھ کر سینگ مارنے پہ تل جاتے ہیں لیکن بیگم جس کام کو بھی پورا کرنے کا بیڑہ اٹھاتی ہیں اسے پایۂ تکمیل کو پہنچا کر ہی دم لیتی ہیں چنانچہ وہ اپنے بھائی قدیر میاں کی مدد سے بکرے کو پکڑنے میں کامیاب ہو گئیں اور پانی کی بالٹی لیکر اس کے سر پہ پہنچ گئیں پھر اچانک ہی منہ پہ ساڑی کا پلو ڈھانپ کر پلٹیں۔

ہم نے پوچھا "کیا ہوا" "تو بولیں" بکرے میں جیسے جان آ رہی ہے" ہم نے حیران ہو کر سالے صاحب
طرف دیکھا تو بولے "آدھے سے نہیں ادھر ہے۔" اب بکرا اس پوزیشن میں کھڑا تھا کہ اس کے
دونوں سینگ ہمارے سالے صاحب کے بائیں ہاتھ میں تھے تو دائیں ہاتھ سے انہوں نے اس کی
ن کے گرد کچھ اس طرح کا بازو حمائل کرکے دبوچ رکھا تھا کہ جیسے عظیم مصور چغتائی کی کسی تصویر میں عمر خیام
ی سے شراب اناری یعنی حسینہ کو اس پوزیشن میں تھامے ہوئے نظر آتے ہیں کہ مذکورہ حسینہ
ئے رفتن نہ پائے ماندن کی سی کیفیت میں مبتلا نظر آتی ہے۔ اب جیسے ہی بیگم نے بکرے کے جسم
پانی ڈالا بکرا ایک زوردار قسم کی میں میں کرتا ہوا سالے صاحب کی گرفت سے تڑپ کر آزاد ہو گیا اور
تے ہی دیکھتے سالے صاحب کے مقابلے میں ایک زوردار قسم کی پوزیشن لے لی۔ بیگم پانی کی بالٹی پھینک کر
طرف ہو گئیں، ہم نے اس سچویشن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ریفری کی جگہ سنبھال لی اور گنتی شروع
ی ایک ..... دو ..... تین بکرا آگے بڑھا اور نہایت جارحانہ انداز میں قدیر میاں پہ حملہ آور ہوا، رضیہ
نے سے چلائی "بکرا جیت گیا ..... بکرا جیت گیا۔" ننھے عرفان بولے "نہیں --- ماموں جان جیتے"
ہیں ہمارے دونوں بچے کب سے کونے میں کھڑے اپنے ماموں جان اور قربانی کے بکرے کا یہ تماشہ
رہے تھے۔ اب پوزیشن خاصی مضحکہ خیز ہو گئی تھی۔ قدیر میاں ایک ہاتھ سے بکرے کی رسی تھامے اور
رے ہاتھ سے اس کے سینگ پکڑے زمین پہ چاروں خانے چت پڑے تھے اور بکرا بکرے کی ہی طرح
..... میں کئے جا رہا تھا اور ساتھ ہی اپنی داڑھی ہلا ہلا کر گویا اس بات کا اعلان بھی کر رہا تھا کہ جیت اسی
وئی ہے۔ پھر قدیر میاں اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے بڑی مشکل سے اٹھے اور بکرے کو ایک نہایت
اور شستہ سی گالی دی۔ فیضان بولے "ماموں جان! قربانی کا بکرا اللہ میاں کا بکرا ہوتا ہے اسے گالی
ن دیں" "گناہ ہو گا" سالے صاحب یہ سن کر اپنی جھینپ مٹانے کے لئے جھپاک سے حمام میں گھس گئے۔" ہم
بیگم سے کہا "چلیئے اب آپ اپنے بھائی کو نہلا دیجئے۔"

دراصل ہمارے سالے صاحب قدیر الزماں نے اپنی شکل و صورت ہی کچھ ایسی پائی ہے کہ جسے دیکھ کر
میں یکایک ہی کسی شیخ چلی ٹائپ کی شبیہ ابھر آتی ہے جو اپنی مٹھی بھر داڑھی کی بنا پہ دور ہی سے پہچانی
سکتی ہے اور اسی لئے وہ جھٹ بکرے کو گھر میں باندھ کر باہر چلے گئے تھے۔ اور پھر شام میں بچوں کے اسکول
واپسی کے وقت آئینے کے سامنے کھڑے اپنی چھدری چھدری داڑھی کی تراش خراش میں مصروف تھے۔
ضیہ نے انہیں بکرے کی موجودگی کا احساس دلانے کے لئے خوشی سے چلانا شروع کر دیا "ماموں جان
..... ماموں جان بکرا" جس پہ سالے صاحب جھنجھلا کر بولے "ہاں ہاں دیکھ تو رہا ہوں اس میں چلانے کی
بات ہے؟"

اب جو غور کیا سالے صاحب حمام سے باہر نکلے ہوئے تو کچھ کچھ آدمی دکھائی دینے لگے" سالے صاحب

کے نہانے کے دوران بکرا برا بر ''میں'' کئے جا رہا تھا۔ اور جب نکھرے نکھرے دھلے دھلے سالے صاحب پہ اس کی نظر پڑی تو یکدم چپ سا ہو گیا اور دائیں بائیں اپنے سر کو جھٹک کر زمین پہ بیٹھ گیا۔ سالے صاحب بیگم سے پوچھنے لگے "آپا! اس بکرے کو صبح سے کچھ کھانے کو بھی دیا ہے کہ نہیں؟" تو بیگم بولیں، صبح سے تو منہ چلا رہا ہے لیکن اس کی میں ... میں بند نہیں ہوتی" پھر پوچھا "اسے کیا کھلایا تھا؟"

ہم نے فوراً کہا "کچھ وہ جو آپ کھاتے ہیں، اور کچھ وہ جسے آپ سونگھ کر چھوڑ دیتے ہیں" خفا ہو کر بولے "کیا مطلب؟" ہم نے کہا "یعنی روٹی اور گھاس"۔

دن بھر تو بکرے نے چلا چلا کر سارے گھر کو سر پہ اٹھا رکھا تھا پھر جب رات آئی تو اس کا چلانا کچھ کم ہونے لگا۔ لیکن پاس کے کمرے سے سالے صاحب کے خراٹے اپنی پوری گھن گرج کے ساتھ اسٹیریو فونک میوزک کی طرح شروع ہو گئے۔ جس کی وجہ سے نہ صرف ہماری نیند خراب ہوئی بلکہ پاس پڑوس کے افراد بھی رات میں دیر گئے دروازہ کھٹکھٹا کر ہم سے پوچھتے رہے کہ اس سال عید پہ ہم کتنے بکروں کی قربانی دے رہے ہیں۔ دوسری صبح بچے اسکول جانے کی تیاریوں میں لگے رہے اور ادھر بیگم صاحبہ سارے گھریلو کام کاج نپٹا کر بکرے کی طرف رجوع ہوئیں اور بڑے دلار سے اس کا منہ دھلانے لگیں۔ سالے صاحب بستر سے برآمد ہو کر برآمدے میں کھڑے طول طویل جمائیاں لے رہے تھے۔ انہوں نے جب یہ منظر دیکھا تو بے اختیار ہنس پڑے اور بولے "آپا آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ بکرے کا منہ دھلا رہی ہیں۔" بیگم صاحبہ قدرے مسکرا کر بولیں "بھول گئے تم بھی جب چھوٹے سے تھے تو میں اسی طرح تمہارا منہ دھلایا کرتی تھی۔"

رضیہ منی جو جوتا پہننے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی، تعجب سے بولی "بالکل اسی طرح!"

ہم نے کہا: "بیگم صاحبہ وہ تو بچپن کی بات ہے اگر آپ اب بھی ان کا منہ اسی طرح دھلائیں تو کچھ بات بھی بنے گی۔" بیگم نے کہا "کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔ میرا ایک ہی تو بھائی ہے اور میں نے اسے ماں کی طرح پالا ہے میں نہیں تو اور کون ان کا منہ دھلائے گی؟" بکرے نے کہا میں ... میں، سالے صاحب موقعہ پا کر کمرے میں گھس گئے اور دیر تک برآمد نہ ہوئے۔

شام تک ادھر ہم آفس میں رہے اور ادھر گھر میں بیگم صاحبہ بکرے کی نازبرداریاں اٹھاتی رہیں۔ شام جب ہم گھر واپس ہوئے تو دیکھا کہ بیگم صاحبہ سالے صاحب کے کمرے سے بڑبڑاتی ہوئی برآمد ہو رہی ہیں۔ "سارا کمرہ اصطبل بنا رکھا ہے۔ صفائی اور سلیقہ تو چھو تک نہیں گیا، بالکل بکروں کی طرح رہتا ہے وغیرہ وغیرہ" ہم نے کہا "بکرے کو ان کے ساتھ ایک ہی کمرے میں کیوں نہیں رکھ دیتیں تاکہ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو" تو جواب دیا "ایسی صورت میں بکرا کمرہ چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوگا۔"

رات آئی تو پھر بکرے کی میں ... میں اور سالے کی غوں، غطر۔ غڑاپ ... پھر سے شروع ہو گئی سالے صاحب کے خراٹے جیسے جیسے تیز ہوتے گئے ویسے ویسے بکرا بھی اپنی میں ... میں کی صدائیں بلند کرتا جاتا

ٔوس ہونے لگا جیسے کسی بڑے پنڈال میں دو کلاسیکل استادوں کے بیچ پکے راگوں اور استادی
مقابلہ ہو رہا ہے پھر بکرے نے بہت جلد اپنی ہار مان لی اور رات کے پچھلے پہر چپ سادھ لی۔
دن تک سارے محلے میں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ ہم عید پہ قربانی دے رہے ہیں۔ چنانچہ کئی حضرات
دوست احباب و رشتہ دار وقتاً فوقتاً ہمارے گھر آکر ہم سے قربانی کے بارے میں استفسارات
رہے تاکہ ایک طرح انہیں اس بات کا اطمینان ہو جائے کہ قربانی واقعی دی جا رہی ہے اور دوسرے
ہم سے مل کر وہ ہمیں اپنی موجودگی کا احساس بھی دلا سکیں اور ہم گوشت کی تقسیم کے موقع پر انہیں یاد
ں۔ کچھ حضرات نے تو بکرے کا سارا حسب نسب بھی ہم سے پوچھنا شروع کر دیا۔ فصیح صاحب نے
اس کی عمر کیا ہے؟" ہم نے جواب دیا "سالے صاحب کو معلوم ہے" اسمٰعیل صاحب فرمین نے سوال
واقعی بکرا ہے یا مینڈھا ہے اور یہ کن بکروں کی نسل سے اس کا تعلق ہے۔" اور اس سلسلے میں ہمارا وہی جواب
سالے صاحب بہتر جانتے ہیں" پھر اسمٰعیل صاحب نے اپنے تئیں بکرے کے حسب و نسب کے تعلق سے
شروع کر دی اور یہ اُن کی عادت میں شامل ہے کہ وہ کسی بھی چیز کے بارے میں پوری تفصیلات
بغیر نچلے نہیں بیٹھ سکتے۔ چنانچہ انہوں نے بکرے کو چاروں طرف ٹھوک بجا کر دیکھا اور اس کے
ایک بڑے نشان کو دیکھ کر فاتحانہ انداز میں نعرہ لگایا "میں اسے جانتا ہوں" ہم کو شک گذرا کہ کہیں ہمارے
حب بکرے کو کسی اور کے گھر سے اٹھا نہ لائے ہوں، گھبرا کر پوچھا "کس طرح جانتے ہو؟" تو بولے پیٹ پر
یہی مطلب ہے کہ اب سے چند دن قبل اس کا آپریشن ہوا ہوگا اور میں نے شاید اسے بڑے دواخانے
ہے۔" ہم اسمٰعیل صاحب کی اس بیش بہا معلومات پر ابھی عش عش بھی کرنے نہ پائے تھے کہ قدیر میاں
ایک بڑا ترازو اٹھائے گھر میں داخل ہوئے اور بکرے کو پکڑ دھکڑ کر اس کا وزن کرنا شروع کر دیا۔
وہ بکرے کو ایک پلڑے میں بٹھا کر دوسرے پلڑے میں باٹ رکھنے جاتے، بکرا کود کر بھاگ کھڑا ہوتا
دھو لینے لگا۔ پھر کافی کوششوں کے بعد وہ بکرے کو پلڑے میں بٹھانے میں کامیاب ہو ہی گئے اور جب باٹ
باری آئی تو باٹ رکھتے رکھتے ان کا بیلنس کچھ اس طرح آؤٹ ہوا کہ وہ سالم پلڑے میں جا بیٹھے اب
پلڑا یکایک ہی نیچے کی طرف چلا گیا۔ سالے صاحب نے خوشی سے نعرہ لگایا "وہ مارا بکرا کافی وزن دار
خوب گوشت ہاتھ لگے گا" ہم نے کہا "لیکن آپ حیث ہلکے ثابت ہوئے۔"
عید کے دن علی الصبح سالے صاحب قصائی کے تعاقب میں دوڑائے گئے بلکہ وہ خود ہی دوڑے گئے
دن سب سے پہلے قصائی سے شرف حاصل کرنا ایک نعمت سے کم نہیں ہوتا یا پھر ہو سکتا ہے کہ
سالے صاحب کو اس بات کی بے حد جلدی رہی ہو گی کہ بکرے کی گردن پر جتنی جلد ہو سکے چھری پھر
اور انہیں اس عذاب سے نجات مل جائے جو بکرے کے گھر میں آجانے سے ان پر گذشتہ تین چار روز سے
تھا اور بکرے کی موجودگی سے ان کی اپنی پوزیشن خاصی نازک صورتحال اختیار کر گئی تھی۔

ہم بستر سے برآمد ہو کر ابھی نہانے کے بارے میں غور کر ہی رہے تھے کہ سالے صاحب ایک عدد تازہ صحیح قسم کے قصائی کے ساتھ آدھمکے اور اسے ہمارے ساتھ بکرے کی گردن زنی کا کیا ہوا کرتا چھوڑ کر بکرے کے پاس بھاگے بھاگے گئے۔ بکرا انہیں دیکھ کر چلا اٹھا میں .... میں جیسے کہہ رہا ہو "خوش رہو بھائی میرے ہم تو سفر کر چلے" قصائی بولا "بکرے کہاں ہیں؟" ہم نے اشارے سے بتایا "وہ رہے۔"

لیکن وہاں تو صرف ایک ہی بکرا دکھائی دے رہا ہے؟" وہ بولا۔

ہم نے کہا "ہاں صرف ایک ہی بکرا ہے" ~~قربانی کرنا ہے تم تو ایسے کہہ~~ رہے ہو" قصائی منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگا "بھوری کا وقت اور صرف ایک ہی بکرا"۔

قربانی سے قبل ہماری بیگم صاحبہ اور سالے صاحب نے پروگرام یہ بنایا تھا کہ قربانی کے گوشت کے تین حصے کئے جائیں گے۔ اور ان تین حصوں میں سے ایک حصہ غریب غرباء میں تقسیم کر دیا جائے گا پھر ایک حصہ رشتہ داروں (یعنی صرف سالے صاحب کو) دیا جائے گا اور باقی گوشت سے ذرا زور دار قسم کی بریانی بنائی جائیگی یعنی اس طرح کی تقسیم سے دو تہائی گوشت گھر ہی میں استعمال ہو رہا تھا لیکن جب گوشت تقسیم کا وقت آیا تو رشتہ داروں اور دوست احباب کی فہرست اتنی طویل ہو گئی کہ ہر ایک کو چھٹانک چھٹانک بھر گوشت تقسیم کرنے کے بعد اپنے استعمال کے لئے صرف کیلو آدھا کیلو گوشت ہی بچتا دکھائی دینے لگا۔ دراصل پچھلے تین چار دنوں میں ہمارے ہاں قربانی دینے کی اطلاع کچھ اس قدر مشہور اور عام ہو گئی تھی کہ اب سب کے ہاں گوشت بانٹنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ قربانی کا سارا گوشت دوست احباب اور رشتہ داروں میں تقسیم کر دیا جائے اور بریانی بنانے کے لئے اس وقت تک انتظار کیا جائے جب تک کہ ہمارے سارے دوست احباب اور رشتہ داروں کے ہاں قربانی نہیں ہو جاتی کیونکہ بہت سارے لوگوں کے پاس سے گوشت کے حصے ملنے کی ہمیں قوی امید تھی۔ چنانچہ قربانی کا سارا گوشت تقسیم کر دیا گیا اور اس کے بعد حصہ کا انتظار شروع ہوا پھر سالے صاحب کو باہر کے دروازے پر احتیاطاً کھڑا کر دیا گیا کہ ہمارے کسی بھی عزیز دوست کو ہمارے گھر کی نشاندہی میں مشکل نہ پیش آئے۔ کچھ دیر بعد محمد بھائی نے باہر سے آواز دی اور ہم لپک کر باہر کی طرف لپکے کیونکہ محمد بھائی ہمارے بہت ہی گہرے دوستوں میں سے ایک ہیں اور ان کے پاس سے بکرے کی ایک ثابت ران ملنے کی پوری پوری امید تھی۔ محمد بھائی نے پہلے تو ہمیں خوب بھینچ بھینچ کر عید کی مبارکباد دی پھر بولے "اماں یار! تمہارے ہاں ابھی تک قربانی نہیں ہوئی؟" ہم نے جواب دیا "کب کی ہو چکی اور آپ کے حصے کا گوشت بھی روانہ کیا جا چکا ہے۔"

کچھ تذبذب کے انداز میں بولے "تو تمہارے سالے صاحب باہر کیوں کھڑے ہیں؟"

ہم نے ان کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے پوچھا "آپ کے پاس قربانی ہو گئی؟" بولے "کل اطمینان سے کرنے کا ارادہ ہے" ان کے جواب سے ہماری آدھی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ پھر شام تک گوشت کا انتظ

اور اس دوران کوئی دس بارہ عزیزوں کے ہاں سے حصے آئے۔ اس کے بعد کسی قدر اطمینان ہوا کہ
بریانی ضرور ملے گی۔ لیکن بیگم نے سارے حصوں کا تجزیہ کرنے کے بعد اعلان کیا کہ تقریباً سوا سیر گوشت
ہاتھ لگا ہے اور جس کا آدھا حصہ ہڈیوں پر اور ایک چوتھائی حصہ چھیچھڑوں پر مشتمل ہے اور وہ صرف ڈبل
ربہ ہی تیار کر کے ہماری ضیافت کر سکتی ہیں۔

عید کے دن لوگ باگ پلاؤ زردہ مرغ و ماہی کے مزے لوٹتے ہیں۔ ہمارے لئے شوربہ پینے اور
کی حسرت دل میں لئے عید منانے کا یہ پہلا تجربہ تھا اور ہم نے معمولات میں تنوع کی خاطر شوربے کا
ٹی سے لگایا اور خدا کا شکر بجا لائے اور اس طرح ہماری عید کا اختتام ہوا۔

عید کے بعد ہمارے اکلوتے سالے صاحب کئی روز تک ہم سے کھنچے کھنچے سے رہے
کہ بکرے کے حصول سے لیکر اس کے ذبح تک کی گئی ان کی ساری محنتوں پر ہم نے پانی پھیر دیا ہے
فراخ دلی سے سارے کا سارا گوشت عزیزوں میں تقسیم کر دیا۔ ہم نے بڑی مشکل سے انہیں منایا
ہے اس بات کا وعدہ بھی کیا کہ اگلے برس اگر انہوں نے ہمارا ساتھ دیا تو ہم چاہیں گے کہ شاندار
ے پر نہ صرف قربانی کا انتظام کریں گے بلکہ گوشت کی تقسیم کا سارا کام ان کے سپرد کر دیں گے۔

مفلس قادری (بجنایم)

(بیگم کا خط اپنے پردیسی شوہر کے نام)

رات دن بس آپ کا ہے دھیان باقی خیریت
اے مرے بچوں کے ابّا جان باقی خیریت

دس مہینے ہو گئے خط آپ کا آیا نہیں
ہو رہی ہوں فکر سے ہلکان باقی خیریت

آتے جاتے آپ کا خط پوچھتی ہوں اس سے میں
ڈاکیہ سے ہو گئی پہچان باقی خیریت

اپنے گھر آئے ہیں مہماں ڈیڈی اور بھیا مرے
ساتھ ہیں بہنیں اور ساتھی جان باقی خیریت

گر گئی آنگن کی اک دیوار کل برسات میں
اور ٹپکا رات بھر دالان باقی خیریت

گیہوں، چاول، مرچ، دھنیے، تیل، دالیں اور نمک
ہو چکا ہے ختم سب سامان باقی خیریت

جس جگہ سے آپ ہمیشہ لایا کرتے تھے ادھار
ہو چکی ہے بند وہ دوکان باقی خیریت

آپ سے تھے اک مہکتا گلستاں تھا میرا دل
بن چکا ہے آج ریگستان باقی خیریت

ایک مژدہ اور سنئے جلد ہی پھر اپنے گھر
آنے والا ہے نیا مہمان باقی خیریت

دست ہیں منی کو اور پپو کو ہے جاڑا بخار
اور بڑی بی کو ہے یرقان باقی خیریت

عارضہ میں دق کے ماموں ہو چکے ہیں مبتلا
مر گئیں کل رات نانی جان باقی خیریت

مرغیاں آئی نہیں انڈوں پہ پچھلے ماہ سے
کھو گئی شادی کی شیروان باقی خیریت

پھر ہوا کمبخت سٹہ کھیلتے پکڑا گیا
آپ کا بھائی، وہی سلطان باقی خیریت

رات دن بچوں کی اودھم اور بیگم دھاڑ سے
گھر میں اٹھتا رہتا ہے طوفان باقی خیریت

لگ گئے پیوند چھ اکلوتی ساڑی کو مری
پھٹ گئی خورشید کی بنیان باقی خیریت

اپنے گھر سے ہو گئی کل لاجونتی پھر فرار
گاؤں میں آیا ہے پھر طوفان باقی خیریت

آپ تو پردیس میں ہیں جا کے مفلس بیٹھ رہے
ہے اِدھر آفت میں میری جان باقی خیریت

★★★

رؤف خوشتر
(ایم۔اے)

چشمِ عریاں

عزیزو! واقعہ سخت اور چشم نازک تھا۔ ہمارے کثیر رشتہ دار بچوں نے اسے اجتماعی طور پر توڑ کر حب الوطنی کا ثبوت پیش کیا۔ کیونکہ اب ملک میں توڑ پھوڑ ہی تو اجتماعی طور پر ہوسکتی ہے۔ اس معاملہ میں ہم ہندوستانی متحد اور مشترک ہیں۔

ایسا لگتا ہے کہ بچے عملی طور پر یہ تجربہ کرنا چاہتے تھے کہ غالب کی شاعری کا ہماری زندگی میں کہاں تک دخل ہے۔ کیونکہ ہم عبدالرحمٰن بجنوری کی تاثراتی تنقید سے متاثر ہو کر غالب کے اشعار اشلوک کی طرح ازبر کر رہے تھے۔ بچوں نے بارہا غالب کا یہ مصرعہ ہم سے سنا ہوگا۔

اور لے آئیں گے بازار سے گر ٹوٹ گیا

طرفہ تماشہ یہ کہ یہ ستم (عینک کا ٹوٹنا) آخری ہفتہ میں ہم پر ٹوٹا تھا۔ آخری ہفتہ جب کہ گداگر سے لے کر ڈاکٹر سبھی اپنے شکار سے مایوس رہتے ہیں۔

لیکن ہم مکان میں کب تک آنکھیں بند کئے بیٹھے۔ طوعاً و کرہاً چشمِ عریاں لئے گھر سے نکل پڑے۔ ہر منظر جدید افسانوں کی طرح غیر واضح مبہم اور تجریدی نظر آیا۔ یار اور اغیار میں کوئی خاص فرق نظر نہ آیا۔

محلہ کا خوش اخلاق کتا بھی ہمیں پہچاننے سے انکار کر دیا۔ آج پہلی بار معلوم ہوا کہ طوطا چشمی صرف انسانی خصلت نہیں۔ اب تک ہم سمجھتے تھے کہ وفاداری کے لئے بے مثال تھے۔ شاید محلہ کے میونسپل کونسلر کے مکان کا طواف کر کے آرہا ہے۔ جب ہی تو ہمیں پہچاننے سے انکار کر رہا ہے۔

جب کتا تک لاتعلقی کا اظہار کر سکتا ہے تو پھر انسانوں سے کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ اس لئے ہم نے ضروری سمجھا کہ ہر ایک کو بہ آواز بلند سلام کرتے جائیں تاکہ لوگ ہماری آواز سے ہی شناخت کریں۔ انسانی بھیڑ میں شناخت کا ایک یہی آسان ذریعہ رہ گیا ہے۔

ہمارے سامنے ایک انسانی ہیولہ نمودار ہوا۔ جیسے ہی ہم نے سلام داغ دیا۔ ادھر سے ایک سریلی

سخت آواز آئی "خواتین سے متعارف ہونے کا یہ طریقہ پرانا ہو گیا ہے۔" محلہ سدھار کے دو چار کارکن کی مدد کو آگے بڑھے۔ ہم نے خاتون سے معذرت چاہی۔ کارکنوں کو زحمت دی، اپنی راہ لی۔

اب ہم نے توبہ کر لی کہ سلام کرنے میں پہل نہ کریں۔ ذرا آگے بڑھے تو ایک صاحب نے پکڑا "اماں! یہ گردن جھکائے ہم سے شرمائے کہاں جا رہے ہو۔" ہمارے دوست یوم الدولہ کہنے لگے۔ مانا کہ میں نے تم سے کچھ روپے ادھار لئے ہیں مگر شرمندہ کرنے کا یہ انوکھا طریقہ کم از کم تمہیں زیب نہیں دیتا۔" "بھئی میں تو چپ چاپ چلا جا رہا ہوں" میں نے کہا۔

"بھئی نظر انداز کرنے کی تمہاری یہ ادا اتنی کراری ہے کہ میں کٹا جا رہا ہوں۔ تم راست روپے طلب کرتے تو اس سے کہیں اچھا ہوتا۔ تمہاری خاموشی مجھے ڈس رہی ہے۔ تمہاری اس خطا کی سزا یہ کچھ روپے اور دے دو۔"

دیتا کیا نہ کرتا۔ یوم الدولہ کی انوکھی رہزنی پہ معلوم ہوا کہ یہ دور آواز چاہتا ہے۔ خاموشی لے ڈوبتی ہے جو جتنا کریگا اتنا ہی فایدے میں رہیگا۔ سیاسی اکھاڑے اسٹیج پلیٹ فارم اور مذہبی جلسے اس بات کے شاہد ہیں کہ اس پر ماحول میں اتنا شور مچایا جائے کہ عوام کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں اور مزید سماعت سے محروم ہو جائیں۔ بھئی ہم بھی سے خواص کا تماشہ دیکھتے رہیں۔ اب عوام کے لئے یہی ایک قومی مشغلہ رہ گیا ہے۔ اکبر الہ آبادی نے ایسی جمہوریت کی پیش بہت پہلے کی تھی۔ ؎ آنکھیں میری باقی اُن کا

اب ہم اپنی آواز سنوانے اور شخصیت منوانے کے لئے زور زور سے گنگناتے پیش قدمی کی۔ ہاری نغمہ سرائی ہمیں عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ جیسے کہہ رہے ہوں کہ صبح تک تو اچھا خاصہ تھا۔

ایک صاحب دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ اب گویا اگر یہ بھی خوش پوش ہو گئے ہیں۔ ان کے اس ریمارک پر غصہ تو آیا مگر دانتوں کے پیسنے کا خیال کر کے انہیں منہ میں دبائے آگے بڑھے۔ اس لئے کہ ہمارے دانت صرف کھانے کے لئے استعمال اب ہم گردن لٹکائے خاموشی سے چلنا مناسب جانا۔ ایک اسکوٹر سے ہم ٹکرائے اسکوٹر پہ خاتون سوار تھیں۔ "دو دو آنکھیں ہوتے ہوئے بھی آپ شاید ان سے کام لینا نہیں چاہتے۔ کیا آپ ان کو کوئی آئی بینک کو تحفہ دینا چاہتے ہیں۔ یوں آپ اس بھرے پڑے اور بُرے ماحول میں شریفوں کی طرح گردن جھکائے چلتے آپ عالم بالا اور ہم عالم تہ بالا (جیل) میں ہوں گے۔ کہیں آپ گاؤں والے تو نہیں؟"

محترمہ کی فی البدیہہ تقریر نے ہماری تیسری آنکھ بھی کھول دی۔ فٹ پاتھ کے آخری کنارے پہ چلنے عافیت جانی۔ ٹریفک قواعد کا خیال کر کے دائیں طرف ہو لیتے۔ اس لئے کہ حادثہ پیش آنے پہ ہمارے متعلقین پس ماندگان کیس جیت کر ہرجانہ وصول کر لیں۔

انجام کار خود کو گھیلتے ہوئے کا بعد ہلاک ہونے سے بچتے ہوئے منزلِ مقصود یعنی عینک کی پیر تجبے اور بجٹ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے نئی عینک خرید ہی لی — ۸۸

غزل

اسمٰعیل ظریفؔ

(حضرت غالب کی روح سے معذرت کیساتھ)

مرغا مرے آگے کبھی بکرا مرے آگے
"آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے"

بیہودگیٔ اطفال کا مرکز ہی ہے لیکن
بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے

بکچر بھی چلا جاتا ہوں دن میں کبھی شب میں
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

پی پی کے ہی مرنا ہے مجھے موت سے پہلے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

اک رعب جما رکھا ہے سسرال پہ میں نے
کرتا نہیں گڑبڑ کوئی سالا مرے آگے

وہ مجھکو چچا کہتے ہیں اور میں انہیں چاچا
اب کوئی بھتیجہ ہے نہ چاچا مرے آگے

بچے ہی سے جب کام نکلواتے ہو اپنا
پھر اس کو بُرا کیوں کہو اچھا مرے آگے

اب سائیڈ سے چلنا بھی خطرناک ہے یارو
آٹو مرے پیچھے ہے تو رکشا مرے آگے

دعوت میں شروع ہوتی ہے جب دست درازی
بریانی بھی بن جاتی ہے خطرہ مرے آگے

محفل میں ظریفؔ اس لئے انجان بنا میں
تھا سامنے بیٹھا ہوا اچھا مرے آگے

غزل

نعیم اخترؔ

پڑ گئے جان کے مری لالے
گھر سے جاتے نہیں شمسر سالے

محتسب کی بھلا سنے گا کون
جبکہ محفل میں سب ہیں متوالے

ایسا کوئی نہیں زمانے میں
سر پھروں کو جو بڑھ کے سمجھا لے

جن کو کھلا گیا وہ اُٹھے ہیں
تلملانے لگے ہیں دھن والے

حلوہ مانڈے سے کام رہتا ہے
ملا پنڈت ہوں یا جٹا والے

مانگ پوری اگر نہیں ہوتی
کر کے ہڑتال اس کو منوا لے

شرط جد و جہد کی ہے یارو
جو بھی ڈھونڈے وہ اسے پالے

منہ کو اپنے بنا کے وہ بولے
جائیے آپ ہیں بہت کالے

وقت سے پہلے آ گئی برسات
بھر گئے کھیت اور ندی نالے

پاس میرے نہ ایک کوڑی ہے
کیسے بھیجوں تیرے لئے سالے

کام جس کو ملے نہ اے اخترؔ
کس طرح اپنا پیٹ وہ پالے

لوٹیں گے۔ ایک پکنک ہی سمجھ لیجیے۔

ایک اور لیکچرر نے رائے دی "کالج کے کام تو زندگی کے ساتھ لگے ہیں۔ ایسے مواقع بار بار نہیں
ہم نے ہتھیار ڈال دیئے۔ نیم رضامندی ظاہر کرتے ہوئے کچھ پس وپیش سے کہا "وہ بات یہ ہے کہ ہم
کوئی مقالہ وغیرہ تیار نہیں کیا۔"

ایک قہقہہ پڑا اور ہم نگوں بن کر رہ گئے، فوراً ایک لیکچرر نے وضاحت کی "یہاں کس نے لکھا ہے
سب مقالہ لکھنے لگیں گے تو مقالہ سُنے گا کون؟ بحث میں حصہ لینے کے لئے بھی کچھ لوگوں کی ضرورت ہوتی

اپنی بہت زیادہ بولنے والے لیکچرر نے ہانک لگائی۔ بالکل اسی طرح، جیسے بس اسٹینڈ پر
پرائیوٹ بس سروسیز والے مسافروں کو متوجہ کرنے کے لئے پکارتے ہیں "کیوں بھئی! کسی نے لکھ
ہے یہ... ؟" ——— اثبات میں کوئی جواب نہ آیا تو ہم نے بلا خوف وتردّد اپنی رضامندی ظاہر
کالج کی باگ ڈور وائس پرنسپال کے ہاتھوں میں سونپ کر ہمارے کالج سے بارات روانہ ہوئی اور
گھنٹے کا سفر طے کر کے منزلِ مقصود پہ پہونچ گئی۔ سفر کے دوران ہی یہ طے ہو گیا تھا کہ کون کہاں تو
کرے گا۔ اس شہر میں ہر ایک کا کوئی نہ کوئی رشتہ دار، دوست یا شناسا موجود تھا۔ کسی کی بیٹی وہا
بیاہی تھی، اُس کی خیریت جاننا مقصود تھا۔ کسی کو میڈیکل میں پڑھ رہے اپنے فرزند کو ماہانہ خرچ دی
اور کسی کو یونیورسٹی سے کوئی پرانا بل نکلوانا تھا۔ ایک کانفرنس کے اتنے متضاد مقاصد ہو سکتے ہیں ہم
اسی روز جانا ——— ہاں تو صاحب کانفرنس کا افتتاح ہوا، کسی بھی کانفرنس کا چونکہ سب سے اہم
یہی ہوتا ہے اسی لئے تقریباً سب ہی حاضر تھے۔ ہال میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ رجسٹریشن کے بعد کوئی
پر انتظار کرتے ہوئے اپنے دوست کے ساتھ رفو چکر ہوا، تو کسی نے کورٹ یا یونیورسٹی میں اپنے مقد
پروگریس دیکھنے یا بل نکلوانے کی غرض سے اُدھر کی راہ لی، کوئی سیدھا ، یم یم کے تھیٹر میں پہونچ گیا۔

جن کا شہر میں کوئی رشتہ دار، دوست یا شناسا نہیں تھا، جن کو یونیورسٹی، کورٹ میں کوئی کا
نہیں تھا جن کو سفر کی نیند پوری کرنی تھی۔ خواتین ڈیلی گیٹس جو چھوٹے شہروں سے آئی تھیں اور اس شہر
مارکیٹ کے تئیں کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتی تھیں یا جن کو پیپر پڑھنا تھے۔ بس وہی لوگ باقی رہ

ایک خاتون کافی دیر تک ہمارا سر تا پا مشاہدہ کرتی رہیں جب کسی نتیجے پہ پہونچ لیں تو ہمارے قری
آکر گویا ہوئیں "آپ کچھ غلط نہ سمجھیے گا۔ آپ ہو بہو میری ایک عزیز سہیلی کے بھائی کی طرح ہیں۔"

ہم نے خوش دلی سے کہا "کاش! ہم غلط ہی سمجھے ہوتے، مگر محترمہ! جان لیجیے کہ ہم آپ
سہیلی کے بھائی کی طرح نہیں ہیں، سہیلی کے بھائی ہی ہیں۔ آپ مینا جوشی ہیں نا؟"

وہ کھل پڑیں۔ اس بات پہ خوش ہوئیں کہ ہم نے انہیں پہچان لیا۔ اُن میں فرق صرف اتنا ہوا
کہ وہ مینا جوشی سے مسز مینا مراٹھے ہو گئی تھیں، اور ہم تو سر سے پیر تک بدل گئے تھے۔ زمانے کا ا

پھیرنے ہمیں ہندوستان کے نقشے کی طرح بدل کر رکھ دیا تھا مگر ماورائی عورت کی نگاہ! قدیم تہذیب کی طرح ہمیں طرح طرح ہی نکالا .... بہت دیر تک وہ ہماری پیاری گڑیا بہن کے حالات پوچھتی رہیں۔ سیشن ختم ہوا تو انہوں نے ہمارا پیچھا چھوڑا۔

دوسرے روز پہلے سیشن کے بعد وہ پھر ہم سے ٹکرا گئیں۔ ہم نے گھبرا کر کہہ دیا۔ "دیکھئے محترمہ! آپ کی سہیلی یعنی ہماری بہن جب سے آپ سے بچھڑی ہیں۔ اُس کے بعد سے اب تک کی باتیں ہم کل ہی آپ کو بتا چکے"۔ وہ کھلکھلا کر بولیں "اُف وہ! میں تو پوچھ رہی تھی کہ اس سیشن میں آپ بڑی سنجیدگی سے نوٹس لے رہے تھے۔ بتائیے تو کیا کیا لکھا ہے"۔

کہتے کہتے انہوں نے کاغذ اُچک لیا۔ ہمارے نوٹس کچھ اس طرح تھے۔

ممبران کی ایک تہائی تعداد غائب ہے۔

امراوتی کالج کی پرنسپال کی ساڑی امپورٹیڈ ہے۔

مس جادھو کا جوڑا عنقریب کھلنے والا ہے۔

کرسیوں کی دوسری قطار میں بائیں سے تیسرے نمبر پر بیٹھے جناب سو رہے ہیں۔

مقالہ پڑھنے والے حضرات بہت بور کر رہے ہیں۔

جناب صدر جمہائیاں لے رہے ہیں۔

وہ کچھ کمنٹس کرتیں اس سے پہلے ہی ہم کاغذ چھین کر بھاگ گئے وہاں سے۔

اُسی دن ایک اور شخص سے ہمارا تعارف ہوا۔ تعارف کچھ اس قدر عجیب ڈھنگ سے ہوا کہ پہلے تو ہم انہیں معقول آدمی سمجھے ہی نہیں مگر جیب پیاز کے چھلکوں کی طرح اُن کی شخصیت پر سے پرتیں ہٹیں تو کمال کے آدمی نکلے وہ ہمارے بھائی صاحب بن گئے وہ۔ تیسرا سیشن چل رہا تھا ایک صاحب کی طرف نظر گئی دیکھا ہمیں ہی دیکھ رہے ہیں۔ سرخ سفید رنگ، سندھیوں کا سا ناک نقشہ، تھوڑی دیر بعد دیکھا تو پھر اپنی طرف دیکھتا پایا، ہم سمجھ گئے، ہماری کیٹیگری کے ہیں۔ بوریت سے بچنے کے لئے فیس ریڈنگ کر رہے ہیں۔ کھانے کی میز پر اتفاقیہ وہ ہمارے سامنے تھے۔ دریافت کیا "آپ انگریزی پڑھاتے ہیں!"

ہم نے جواب دیا "نہیں۔ بندہ پڑھاتے ہیں"

پھر کہا "آپ کو کھانا پسند نہیں آرہا ہے!"

ہم نے زبان سے کچھ نہیں کہا تھا۔ ہمارے بنتے بگڑتے منہ نے کہا ہو تو کہا ہو اسی لئے اطمینان سے کہا "ہمارے پسند کرنے نہ کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ پیٹ تو بھرنا ہی ہے۔ ہاں اگر آپ اتنی مقدار میں ہمارے لئے کچھ رہے تو شاید یہ بھی ممکن نہ ہو"۔

انہوں نے اتنی ندرت کا تجربہ لگا کر ہماری پلیٹ میں سے روٹیاں اٹھا لیں۔ ہم منہ دیکھتے رہ گئے

تھا اسی تیقے نے ہمارے دل میں اُن کے لئے جگہ بنا دی، ہم جلد ہی اُن سے گھل مل گئے۔ ہماری کم علمی
ناتجربہ کاری کو دیکھتے ہوئے کانفرنسوں اور سیمیناروں سے متعلق ہمارے علم میں گراں قدر اضافہ کیا انہوں نے
گُر کی باتیں بتائیں، کہا کہ پیپر (مقالہ) کبھی نہ پڑھو کیونکہ پیپر پڑھنے والے کی ٹانگ بے طرح کھینچی جاتی ہے۔ اور
بحث میں ضرور حصہ لو، پورا مقالہ سُننا کوئی ضروری نہیں۔ جو نکتہ سنائی پڑ جائے اس پہ ایک ایسا الجھا ہوا سوال
کرو جو مقالہ لکھنے والے کی سمجھ میں آئے نہ حاضرین کی (اپنی سمجھ سے باہر ہو تو اور اچھا) بس سب پر آپ کی
دھاک جم جائے گی، سب آپ کا نام جان جائیں گے۔ کانفرنس میں جانے کا واحد مقصد یہی ہوتا ہے۔
ہم ایمان لے آئے اُن کی باتوں پہ اگلے سیشن میں ہم نے کچھ پینسل [illegible] بنائے۔ بہت دنوں
فرصت ہی نہیں ملی تھی کہ اس طرف توجہ دیتے (یہ کانفرنسیں، سیمینار نہ ہوں تو یہ علم دنیا سے مٹ جائے)
صاحب کو نمونے کے لئے ایک اسکیچ دکھایا۔
ایک چھوٹے قد کے دبلے پتلے حضرت تھے۔ پینتیس چھتیس کی عمر، سر کے بال آدھے سفید کھچڑی
کی طرح گردن پہ اترے ہوئے۔ دانت ہونٹوں سے دو قدم آگے تھے۔ تس پہ انہیں ہنسنے، ہنستے رہنے
خبط تھا۔ ہنسی کی بات ہو نہ ہو، تائید کی ضرورت ہو نہ ہو وہ پوری باچھیں پھاڑ کر ہنستے اور خواہ مخواہ
(خود کو کچھ سمجھنے والوں کی خاص پہچان) سر بھی ایسا کہ جسم کی مناسبت سے قدرے بڑا۔ وہ کسی نکتے پہ
کرتے ہوتے اور دور سے کوئی انہیں دیکھتا تو یہی سوچتا کہ حضرت ملیریا بخار سے تھر تھر کانپ رہے
ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اتنا بڑا سر وہ (اتنی آسانی سے) ہلا کیسے لیتے تھے؟ (ویسے ہم کو اس کے
ہونے میں شک تھا) بھائی صاحب ہنستے ہنستے بے حال ہو گئے۔ طرّہ یہ کہ ہم نے سوال بھی جڑ دیا "آپ
پرنسپال نے آخر انہیں پکڑا کہاں سے؟
انہوں نے کسی طرح ہنسی روک کر کہا "یو پی کی ایک یونیورسٹی سے" بخدا مگر ہم نے یہی سُنا
کے ایک جوڑا یا گھر سے .... " خیر یہ سب تو ہنسی دل لگی کی باتیں تھیں۔ جی تو چاہتا تھا کہ یہ کانفرنس کبھی
نہ ہو، چاندی کے دن تھے سونے کی راتیں، گھر کی فکر نہ کالج کا لیکچر، میزبان کالج جو ہماری ناز برداری
میں مصروف تھا۔ آخری سیشن کے وقت ہم بھائی صاحب کو تلاش کرتے ہوئے اُن کے کمرے تک پہنچے
وہ اپنا سامان سمیٹ رہے تھے۔ ہم نے جاتے ہی اُن کے کالج کے ایک اور لکچرر کا نام لیکر پوچھا "آپ کے
ساتھی بہت پھولے پھولے دکھائی دے رہے ہیں۔ کیا بات ہے؟"
تنک سے بولے "رات کے سیشن میں غائب تھے نا؟ کون سی فلم دیکھی؟"
ہم نے برا مانتے ہوئے کہا "ایسا نہ کہیئے، ہم پر ابھی آپ بزرگوں کا سایہ نہیں پڑا ہے۔ ہار
میں موچ آگئی تھی کمرے ہی میں لیٹے رہے۔ آپ سے تو اتنا بھی نہ ہو سکا کہ خیریت پوچھنے چلے آتے"
ہمارے بگڑے تیور دیکھ کر انہوں نے فوراً معافی مانگ لی۔ پھر بتایا "کل پی، ایچ، ڈی

ن کا استقبالیہ ہوا۔ اُن صاحب کی تعریف میں چند مقرروں نے زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے تھے
ہی سے قمیص تنگ ہو رہی ہے اُن کی۔"
ہم نے پوچھا "کیا موضوع تھا اُن کا؟"
قطعی فضول سا موضوع ہے۔ ہمیں یاد نہیں" کہہ کر ایک قہقہہ لگایا۔ "ذرا اُن حضرت ہی سے پوچھ
دیکھو۔ زبانی صحیح صحیح بتا سکتے ہیں یا نہیں" انہوں نے خود لکھا ہوگا، پی ایچ ڈی کا مقالہ تو موضوع [illegible]
ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ اس بات پر ہنسیں یا رو دیں۔ بھائی صاحب نے بھی مشکل آسان کی۔ بولے "ایک لطیفہ
سنو، کل میرے کالج کے پرنسپال نے ہم سے پوچھا تھا۔ استقبالیہ میں تقریر کرو گے؟"
میں نے کہہ دیا "میں جھوٹ نہیں بولا کرتا۔"
ہم بے ساختہ ہنس پڑے۔ بڑا خطرناک تھا یہ شخص، بات بات میں یوں بات نکالتا کہ بس خود بھی کچھ دیر
ہنستے رہے پھر بولے "میں تعزیتی جلسوں اور استقبالیہ جلسوں میں نہیں بولا کرتا۔ اعزاز پانے والے اور
مرنے والے دونوں کو ان تمام خوبیوں کا مستحق ٹھہرانا پڑتا ہے جو حقیقتاً ان میں نہیں ہوتیں۔ مرنے والے کی تعریف
بطور اخلاقی طور پر جائز ٹھہرائی جا سکتی ہے، مگر اس کے لئے جھوٹ کیوں بولا جائے۔ جیا بھی دنیا والوں کو دھوکہ
دینے کیلئے زندہ ہے۔ میں تو کہتا ہوں حریف کو زیر کرنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ اس کے اعزاز
میں ایک جلسہ کر کے اس پر تعریفوں کے ڈونگرے برسا دو، دوسرے دن وہ تمہارے قدموں میں نظر آئے گا"
"بجا فرمایا آپ نے" ہم نے تائید کی "مگر ہم بھی ڈاکٹریٹ کرنے کا سوچ رہے ہیں۔"
انہوں نے ہماری بات کاٹ دی "کیا واقعی تم اپنے آپ کو اس لائق سمجھتے ہو کہ ڈاکٹریٹ کے لئے
بس لکھ ڈالو، لکھو، ضرور لکھو، مگر پہلے آپ کو اس معیار تک پہنچاؤ تو سہی۔ ویسے آج کل تو یہ حال
ہے کہ کل تک جو دودھ تولا کرتے تھے، پنڈتائی کیا کرتے تھے گھاس، کھودا کرتے تھے، وہ آج ریسرچ
کر رہے ہیں۔ علم خریدا اور بیچا جانے لگا ہے۔ ریسرچ محنت مانگتی ہے۔ نیلامی کی بولیاں نہیں۔"
ہم نے دبی زبان سے کہا "ہمارے پرنسپال بھی یہی کہتے ہیں۔ گدھے کی پشت پر کتابیں لاد دینے
سے وہ انسان نہیں بن جاتا۔ ڈاکٹریٹ کی ڈگری کسی کے عالم ہونے کا ثبوت نہیں۔"
بھائی صاحب نے ہماری پیٹھ ٹھونکی "دوست پہلے بچوں کو علم دو جو تمہارا اولین فرض ہے۔ کچھ لوگ
ایسے بھی ہوتے ہیں" جنہیں ملتا ہے تنخواہ طالب علموں کو پڑھانے کے لئے نہیں، اس بات کے لئے ملتی
ہے کہ وہ جی جان سے تھیسس پیدا کر کے یونیورسٹی پر احسان کریں۔ تم ایسے نہ بننا دوست!"
کانفرنس ختم ہو گئی۔ ہم حاصلِ کانفرنس اس ایک جملے کو قیمتی سوغات کی طرح اپنے دل میں چھپا لائے
تھا..... تم ایسے نہ بننا دوست!

چھ منزلہ عمارت

بجنور دھوی (مودھا)

چھ مدہوش بیٹھ کر کرنے لگے یہ مشورہ
ایک نے پوچھا کہ آخر کس طرح تعمیر ہو
دوسرا بولا کہ میرے ذہن میں خاکہ ہے ایک
ایک پہ اک آپ کندھوں پہ کھڑے ہو جائیے
سب عمل پیرا ہوئے فوراً خیالِ خام پر
لوگ ان کی یہ حماقت دیکھنے آنے لگے
یہ تصادم دیکھ کر یا پولیس والا کوئی
سب سے اوپر جو مدہوش تھا کیا اس نے کلام

اب عمارت ایک بنانا چاہیئے چھ منزلہ
پہلے اپنے سامنے تو کچھ نہ کچھ تعمیر ہو
اور میں بتلا رہا ہوں آپ کو تدبیر نیک
اس طرح بلڈنگ نئی چھ منزلہ بنوائیے
ایستادہ ہو گئے اک شاہراہِ عام پر
ایک مجمع ہو گیا آپس میں ٹکرانے لگے
بد نیچے والے کے اس نے لگا ڈالے کئی
آ رہی ہے کیسی یہ آواز اے عبدالسلام

بیچ والے نے کہا سمجھے نہ تم اس بات کو
کھٹکھٹاتا ہے کوئی دروازہ آدھی رات کو

قطعہ

سخت لہجے میں کہا اک باپ نے بیٹا سنو
خط تمہاری ماسٹرنی کا ملا مجھ کو ابھی
ذکر اس خط کا نہ ممی سے کرو دیگا میں کبھی
ہنس کے بیٹے نے کہا پاپا رکھو یہ اطمینان

شگفتہ مدھوری

غزل

راشد امام نشتر سیوانی

دلوں کی واشنگ تو ہو نہ پائی نکھر گیا کس طرح ذہن یارو
اسی کے آزادی ہاتھ آئی جو عمر بھر تھا غلام صاحب
میں بیٹھا کہنے غزل تو بیگم کو نالشتے کی تھی فکر لاحق
سویرے بچوں کو دودھ بھی کیا ملے نہ جیلی گھر میں نہ جام صاحب
تمہارے ذہن و خیال میں یہ مقولہ بسا ہے مشاعرہ ہی
وہ عالمانہ ادا سے بولے ہوا نہ میرا ہی کام صاحب
کوئی منسٹر یہاں جو آئے تو گرد پنڈال دیکھئے پھر
قدم قدم پر جھٹے رہیں ہیں جتنے چمچے تمام صاحب
اساتذہ کی زمیں پہ کہنا غزل کا آساں نہیں ہے نشتر
مجھے تو ایسا لگا کہ یہ بھی ہے جان جوکھوں کا کام صاحب

نظام الدین نظامی (بمبئی)

لفڑے کی جڑ

کسی نے کہا ہے (کسی نے کیا؟ کہنا تو دراصل
کو ہے مگر چونکہ کسی کے کہے کو بغور پڑھا اور سُنا
ہے۔ اس لئے) کسی نے کہا ہے کہ "ہر آدمی اپنے طور
پر جینا چاہتا ہے:"
مگر ہر ایک کو اپنے طور پر جینے کے وسائل اور
حاصل نہیں ہیں۔ اس لئے وہ جھلاتا ہے، بوکھلاتا ہے
اسی جھلاہٹ اور بوکھلاہٹ کا نام ہے "لفڑا"۔
میں جھلاہٹ کا مطلب تو لفڑا ہرگز نہیں۔ "لفڑا"
کے معنی تو خدا معلوم کیا ہیں مگر لغوی طور پر اس لفظ
کے معنی ہیں۔ کسی سے تُو تُو مَیں مَیں ہو جائے تو اہلِ زبان
کہیں "تکرار ہوگئی"۔ معاملہ اور بڑھا یعنی فریقین میں
سے کسی نے ایک آدھ ہاتھ جڑ دیا تو کہیں گے "جھگڑا ہوگیا"
۔ چونکہ بمبئی کے باسی فطرتاً سہل پسند واقع ہوئے
اس لیے انھوں نے تکرار اور جھگڑا دونوں کے مفہوم کو
لفظ "لفڑا" میں سمو دیا۔ اس شہر کی گلیوں میں
لفظ کا استعمال بڑی کثرت سے ہوتا ہے بلکہ اب تو
ادبوں، شاعروں اور کلرکوں کا بھی محبوب ہے
کے جیسے مختلف رنگ، مختلف ادائیں اور مختلف
ہوتے ہیں ٹھیک طرح اس لفظ کے استعمال کی بھی
مختلف صورتیں اور مختلف محل ہیں:
"لفڑا ہوگیا۔ لفڑا کھڑا مت کرو۔ کیوں لفڑے میں
پڑتے ہو۔ زندگی بھی ایک لفڑا ہے۔ یار یہ ان دنوں
لفڑے میں ہوں۔ سارے لفڑے اسی کے دم سے ہیں۔ سکوت
توڑ کوئی لفڑا پیدا کر۔ شادی بھی ایک لفڑا ہے:" اسی طرح
کے کئی موقعوں پر اس لفظ کا استعمال کیا جا سکتا ہے اور
اب یہ لفظ بمبئی والوں کی زبان کے ذخیرۂ الفاظ میں ایک
بیش قیمت موتی کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ مگر
ہم کیوں لفڑے میں پڑ گئے۔ بات تو چل تھی کسی
کے کہے سے۔ کسی نے کہا تھا ہر آدمی اپنے طور پر جینا
چاہتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر آدمی اپنے
طور پر جینے کا خواہش مند نہ ہو تو کون سا پہاڑ ٹوٹ
پڑے گا؟ ظاہر ہے کہ پھر جھلاہٹ کا غلبہ نہ ہوگا۔ اور
اگر جھلاہٹ نہ ہوئی تو لفڑے کا کوئی سوال ہی پیدا
نہ ہو۔ گویا سارے لفڑے کی جڑ ہے اپنے طور پر جینے
کی خواہش اور اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے کی
کوشش۔ مگر یہ اپنے طور پر جینا آخر ہے کیا؟ سوچو تو
ہر شخص یوں بھی اپنے ہی طور پر تو جیتا ہے۔ جیسا کہ
چاہا اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جب چاہا بیٹھ گئے۔ جب نیند
آئی سو گئے، آنکھ کھلی اُٹھ گئے۔ جب بھوک محسوس ہوئی
کھانے پر ٹوٹ پڑے اور جب پیٹ بھر گیا کھانے سے ہاتھ

… ہر شخص خواہ وہ غریب ہو یا امیر، پڑھا لکھا ہو یا اَن پڑھ، لیڈر ہو یا شریف انسان، اونچا
… قد۔ بال دار ہو یا گنجا، اپنے طور پر اُٹھتا ہے، بیٹھتا ہے، سوتا ہے، بیدار ہوتا ہے، کھاتا ہے
… ہے۔ آدمی جب تک سویا رہے سارے لفڑوں سے دور رہتا ہے۔ یہ بات بھی کسی کی کہی ہوئی لگتی ہے
دوسرے کی باتیں بار بار دہرانا کوئی اچھی علامت نہیں اس لئے باقی ——— باقی

———

"تمہیں پتہ ہے کہ اس کا مکان اسٹیٹ میں ہے یا فلیٹ میں؟"

"جی نہیں"

"اسٹریٹ نمبر معلوم ہے؟"

"جی نہیں"

"کالونی کا نام جانتے ہو؟"

"جی نہیں"

"روڈ کے بارے میں معلومات ہے؟"

"جی نہیں" میں اس شہر میں اجنبی ہوں۔ کیا آپ اس سلسلے میں میری مدد کر سکتے ہیں؟

"جی نہیں" اس نے کہا اور چلتا بنا۔ میں اسے دیکھتا رہ گیا۔

یکلخت مجھے یاد آیا کہ زبیر کا ٹیلی فون نمبر میرے پاس ہے۔ میں نے فون پر اس سے رابطہ قائم کیا تو اس نے کہا کہ میں بذریعہ ٹیکسی بتائے ہوئے پتے پر آجاؤں۔ کچھ دیر بعد دفتر میں چھٹی کی درخواست دے کر وہ خود بھی گھر پہنچ جائے گا۔ میں نے ایک ٹیکسی روکی اور منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہوا۔ ڈرائیور سے میں نے کہہ دیا کہ وہ ٹیکسی زیادہ تیز نہ چلائے تاکہ میں راستے میں آنے والی عالیشان عمارتوں، خوبصورت باغیچوں اور سمندر کی کھاڑیوں وغیرہ کے دلکش نظاروں سے لطف اندوز ہو سکوں۔ میں خوش تھا کہ ٹیکسی کے اس سفر سے بمبئی کی سیر کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

ایک گھنٹہ بعد زبیر کے ہاں پہنچا تو اس نے چھوٹتے ہی کہا "کب سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں، اتنی دیر کیوں ہوئی؟" "اتنی دور گھر لے رکھا ہے اور پوچھتے ہو کہ اتنی دیر کیوں ہوئی!"

میرا جواب سن کر اس نے پوچھا "کتنے پیسے لئے ٹیکسی والے نے تم سے؟"

"پورے پچیس روپئے"

تب زبیر نے مجھے بتایا کہ ٹیکسی والا خواہ مخواہ ادھر اُدھر ٹیکسی دوڑاتا رہا اور پچیس روپے وصول کر لئے۔ چرنی اسٹیشن سے اس کے گھر کا کرایہ صرف ۲ روپے ہوتا ہے۔ زبیر کی بات سن کر مجھے یاد آیا کہ ایک مرتبہ ایک کشادہ سڑک سے گزرتے ہوئے میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا تھا کہ شاید ہم ادھر سے پہلے بھی گزرے ہیں تو اس نے یہ کہہ کر میری بات رد کر دی تھی کہ بڑے شہروں میں سبھی سڑکیں ایک جیسی دکھائی دیتی ہیں۔

کھانے کی میز پر جب میں نے دیکھا کہ روٹی کا کہیں پتہ نہیں ہے تو اس ضمن میں زبیر سے پوچھا۔ اس نے ڈبل روٹی نما چیز کی طرف اشارہ کر کے کہا "یہ پاؤ ہے۔ یہاں کے لوگ اسے [illegible] کر کھاتے ہیں۔"

اس کا استعمال کثیر المقاصد چیزوں کی طرح کیا جاتا ہے۔ کبھی اسے صبح چائے اور سالن کے ساتھ روٹی کے طور پر کھاتے ہیں تو کبھی مکھن لگا کر بریڈ ٹوسٹ! مستقل مزاجی کا مظاہرہ یہ لوگ نئے نئے طریقے سے کر رہے ہیں، اتراتا

میں نے ایک کپڑا پسند کیا تو دوکاندار بولا "صاحب! ماننا پڑتا ہے کہ اچھے کپڑے کی خوب پرکھ ہے آپ کو۔ یہ اسپیشل کپڑا ہے۔ جسے ہم پچھلے دروازے سے حاصل کر کے آپ ایسے صاحب ذوق حضرات کی تسکین کا سامان کرتے ہیں۔" زبیر نے اس کپڑے کی طرف میری طبیعت کا جھکاؤ دیکھا تو یہ کہہ کر مجھے اس کپڑے سے باز رکھا کہ مجھے اپنی جیب سے بڑے سپنے نہیں دیکھنے چاہئیں۔ دوکان سے باہر آئے میں نے پوچھا "تمہیں وہ کپڑا کیوں پسند نہیں آیا؟" "چائے چھاننے کے لئے ہم اتنا قیمتی کپڑا تو استعمال نہیں کر سکتے ہیں نا؟" "کیا مطلب؟"
"مطلب یہ کہ دو چار مرتبہ دھوبی سے ملاقات کرنے کے بعد وہ اسی مصرف کا رہ جاتا۔"

شام کے ساڑھے چار بجے تھے۔ ہم لوگ بچوں کے لئے کپڑے اور ایک علاحدہ سوٹ کیس خرید کر باندرہ کی طرف روانہ ہوئے۔ جس کمپارٹمنٹ میں ہم سفر کر رہے تھے۔ اس میں اس قدر مسافر بیٹھے ہوئے تھے کہ پیر رکھنے کیلئے جگہ نہیں تھی۔ میں خود ایک پیر پر کھڑا ہوا تھا۔ جس طرح سارس مچھلی پکڑنے کے لئے کھڑا ہوتا ہے ٹرین باندرہ کی طرف دوڑتی رہی اور میں پیر بدل بدل کر سفر طے کرتا رہا۔

باندرہ اسٹیشن قریب آیا تو میں نے کھڑکی سے باہر پلیٹ فارم پر نظر ڈالی اور انسانوں کا لہریں لیتا ہوا سمندر دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ زبیر نے بتایا کہ دفتروں کو چھٹی ہو جانے کی وجہ سے [illegible] کا یہ میلہ لگا ہوا ہے۔ ٹرین رکی تو ٹرین سے اترنے والوں اور ٹرین میں سوار ہونے والوں کے درمیان زور آزمائی شروع ہو گئی۔
ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ چڑھنے والے مسافر اترنے والوں کو اترنے کا موقع نہیں دینا چاہتے اور اترنے والے مسافر سوار ہونے والوں کو روک رہے ہیں۔ بمشکل تمام میں کمپارٹمنٹ سے اترا۔ اس دھکم پیل اور دھینگا مشتی میں میری ایک آستین جاتی رہی۔ اور سوٹ کیس کی وہ گت بنی کہ اٹیچی کیس دکھائی دینے لگا۔ پلیٹ فارم پر موجود لوگ مجھے دیکھ کر ہنسی کے مارے دوہرے ہوئے جا رہے تھے۔ قہقہوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے میں نے زبیر سے کہا "دیکھا یار تمہاری بمبئی نے میرا تماشہ بنا دیا۔ اب مجھے [illegible] اجازت دے دو میں باز آیا بمبئی گھومنے سے"
رات کے ۹ بجے تھے۔ ٹرین اکولہ کی طرف دوڑی چلی جا رہی تھی۔ اور مجھے اپنے دوستوں کا بمبئی کے متعلق یہ متفقہ بیان یاد آ رہا تھا۔ "جس نے بمبئی نہیں دیکھی، سمجھو دنیا نہیں دیکھی۔" ▲

نامور مزاح نگار
یوسف ناظم
کے مضامین
بتصرف
شگوفہ

اپوزیشن دعا

عالم تاجپوری

ہر سخنور کو الٰہی بخش دے عقلِ سلیم
بادہ نوشی کے توسل سے جو بن جائیں ندیم

انڈین مجنوں بنا دے ہم کو اے پروردگار
ذہن و دل سے عشق کا اُترے نہ محشر تک بخار

شاعروں کا دیکھ کے اسٹیج پر نقش و نگار
بے قراروں کو بھی یارب آئے گانے میں قرار

غنڈہ گردی پر خدایا اتنا ہو جائے عبور
خود پولس والے کہیں ہم سے کوئی خدمت حضور

اے خدایا دیش کے بچے ہوں اب اتنے نڈر
بید سے سیدھا کریں جو ٹیچروں کو مار کر

کر عطا ہر ایک چینڈک ڈاکٹر میں یہ کمال
دیکھتے ہی نبض ہر پیشنٹ کا ہو انتقال

اے خدا ہم کو لتا کی موہنی آواز دے
اور ہیما مالنی کے ڈانس کا انداز دے

یہ تو مانا جاہلِ مطلق ہیں ہم ربِ قدیر
ممبری کی ہے عطا تو اب بنا بھی دے وزیر

اے خدا ہم کو شعورِ شاعری کر دے عطا
سُن کے بیگم صاحبہ اشعار کہہ دیں واہ وا

نقل بازی کا سلیقہ کر عطا اے ذوالمنن
تاکہ ڈگری لے کے پھوکٹ میں رہیں ہم بھی مگن

بزمِ عالم کے ہیں ڈپلیکیٹ جتنے داعیین
مرغ و ماہی کھائیں پھوکٹ میں سب صاحب [illegible]

غزل

مہمل لکھنوی

مشاعرہ ہے کسی بیوہ انجمن کے لیے
مجھے بھی نیوتا ہے خدمتِ سخن کے لیے

پجامہ جوتا تو پنواڑی سے میں لے لونگا
کہاں سے لاؤں مگر شیروانی تن کے لیے

ہڑپ کے بیٹھ گیا مال نیتا کا سالا
کلرک میں تھا نکالا گیا غبن کے لیے

چلو جی جانے دو، اب قافیے ذرا سوچو
وطن گلشن دکے لیے، اور چمن جلن دکے لیے

تو شعر عرض ہے سنئیے ذرا توجہ سے
یہ لمحہ فکر کا ہے ناقدانِ فن کے لیے

جو تیرے در پہ مروں گا تو خود اٹھائے گا
مجھے ہو فکر بھلا کیوں کفن دفن کے لیے

تو دال روٹی بھی دینے سے کر رہا ہے گریز
لگاؤں آس کہاں مرغی و مٹن کے لیے

یہ مقطع سنئیے کہ اب وقت ہو گیا مہمل
کھڑا [illegible] گھر تک [illegible] کے لیے

* *

شرمایو جیاتے

ہماری وزیر اعظم نے قوم کے نام اپنے پیام میں ایک نئے سماجی معاشی نظام کی تعمیر کے لئے سخت محنت کے ساتھ جدوجہد کرنے پر زور دیا ہے۔

آندھرا پردیش میں صنعتی مزدور پیداوار میں اضافہ کی خاطر اپنا امکانی حصہ ادا کرنے کے سلسلہ میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں اور آندھرا پردیش کی حکومت بھی محنت کشوں کو ممکنہ طور پر بہتر سے بہتر کام کے حالات اور سہولیات کی فراہمی کے معاملہ میں کسی سے پیچھے نہیں ہے۔

آندھرا پردیش مزدوروں کے لئے اقل ترین اجرتوں کے تعین اور عمل آوری میں صف اول کے مقام کا حامل ہے اور ریاست میں روزگار کے ۳۹ زمروں کو متعلقہ قانون کے احاطۂ نشر میں لے لیا گیا۔ انتظامیہ میں مزدوروں کی شراکت سے متعلق اسکیم کے جزو کے طور پر شاپ فلور اور پلانٹ کی سطح پر ایسے تمام صنعتی اداروں میں جہاں ۳۰۰ یا زیادہ مزدور کام کرتے ہیں کونسلیں تشکیل دی گئی ہیں۔ صنعتی مزدوروں کے لئے امدادی اسکیم زیر عمل آوری ہے، پانچویں منصوبہ کے ختم تک مزدوروں کی منفعت کے لئے ۲۴۳۵ کوارٹرس تعمیر کئے گئے۔ علاوہ ازیں ۵۲۱۷ مکانات سال ۱۹۷۹-۸۰ء کے ختم تک ریاست، آجرین اور امداد باہمی ایجنسیوں کی جانب سے تعمیر کئے گئے ہیں۔ ریاست میں بہبودی مزدوران کے ۱۲ مراکز ہیں جہاں صنعتی مزدوروں کے لئے تفریحی و تعلیمی سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں۔ ایک آندھرا پردیش لیبر ویلفیر فنڈ کا قیام کیا گیا ہے جس کے ذریعہ مزدوروں کے لئے ٹریننگ سنٹر، لائبریریز، کھیل، اسپورٹس، تفریحات اور پیشہ وارانہ تربیت وغیرہ سے متعلق اسکیمات روبہ عمل لائی جا رہی ہیں۔

آندھرا پردیش میں مزدور طبقہ مطمئن و آسودہ حال ہے اور زیادہ سے زیادہ مراعات و فوائد سے قریب ہیں۔

جاری کردہ: ناظم اطلاعات و تعلقات عامہ، حکومت آندھرا پردیش

DIPR - 6

طلعت سہسرامی

تلاشِ گمشدہ

معذرت : موصوف کی تصویر نہیں ہے۔
رنگت ، گوری نہیں تو آپ کالی بھی نہیں کہہ سکتے۔
قد ، پانچ فٹ چھ انچ لمبا ہی ہوگا کیوں کہ ایسا ہی ڈائری میں لکھا ہے ویسے یہ ڈائری ان کے ابا حضور کی بھی ہو سکتی ہے وہ بھی ایم۔ اے خاں ہی کہلاتے تھے)۔
آنکھیں ، آنکھوں پر چشمہ ہوتا ہے جس کا فریم گاڑھے چوکلیٹ رنگ کا ہے (لیکن امی اس کا رنگ کالا بتاتی ہیں)
ناک ، اونچی ہے (لیکن کبھی اس پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا)
کان ، منت کے لیے بچپن میں چھیدا گیا تھا (جس کا سوراخ اب بند ہو چکا ہے بہت قریب سے دیکھنے پر کچھ نشان نظر آتا ہے)
بال :۔ سیاہ ہیں لیکن مانگ کے پاس کے پانچ سات بال سفید ہو چکے ہیں۔ (اگر مانگ داہنی طرف نکالی جائے تو سارے بال سیاہ ہی نظر آتے ہیں اور وہ داہنے بائیں کرنے کے عادی ہیں)
پہچان : گردن پر ایک بڑا سا سیاہ تل ہے (جو قمیص کے کالر سے چھپا رہتا ہے)
کپڑے ، ان کے جسم پر پتلون (رنگ یاد نہیں) اور سفید بش شرٹ ہے (ویسے امی کہہ رہی ہیں کہ کمیں میں ایک سیاہ ... نہیں ہے)
عمر ، پینتالیس، چھیالیس سال کے درمیان (دیکھنے میں چالیس سال کے ہی لگتے ہیں)
انعام ، ساتھ لانے والے کو امی نے راکھی باندھنے کا وعدہ کیا ہے (اس طرح میرے ماموؤں میں ایک اور اضافہ ہو جائے گا)
پتہ ، چوکھٹ پورا کے تالاب کے پاس سے رستہ مسجد کی طرف گیا ہے۔ مسجد کے پاس پہونچ کر داہنی طرف دیکھنے سے جو گلی نظر آتی ہے اسی کے آخری کنارے پر پورب رخ کا اپنا گھر ہے۔ دروازہ پر کھڑکی ہونے کا شبہ نہ کریں۔ یہی مین گیٹ ہے (پتہ نہیں دادا حضور نے ایسا کس مصلحت سے کیا)۔ شہر کا نام رستم نگر ہے۔

ابا حضور!

آپ ہر بار تو تنخواہ کے بعد ایک دن کے لیے غائب ہوتے تھے لیکن دس دن ہونے کو آئے ابھی تک واپسی نہیں ہوئی۔ اس لیے یہ عجلت کر رہا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ ہم سے بھوک برداشت نہیں ہوتی کہ رمضان کے روزے بھی نہیں رکھتا۔ اس لیے ایک وقت کے بعد سے کھانا شروع کر دیا۔ ہے بالکل ... ہوتی ہے لیکن رات میں نہیں

پڑھتی، امتحان میں فیل ہوگئی تو شادی ایک سال اور بڑھ جائے گی۔ امی جو آپ کی مار سے اونچا سننے لگی ہیں، ہر وقت رونے سے آنکھ کی بینائی بھی نہ کھو بیٹھیں۔ ویسے معلوم نہیں وہ آپ کے نہ آنے کے غم میں آنسو بہاتی ہیں یا کان کے درد کی تکلیف سے۔ امید ہے آپ کے پاس پیسہ ختم ہو چکا ہوگا۔ اس لیے اب واپس آجائیے

آپ کا اکلوتا لڑکا

ایم۔ اے۔ خان

اقبال شانہ (نظام آباد)

گرانی، ناتوانی، تنگدستی اور فاقہ ہے — ہماری زندگی افکار کا دارالخلافہ ہے

جہیز جو ماں کے گھر سے لیکے آئی ہیں مری بیگم — وہ سب سامان آثارِ قدیمہ کا اثاثہ ہے

محبت اک سے دو دو سے تیسرا گھر میں — یہ عشق و عاشقی گویا کہ بندر کا تماشہ ہے

بڑا پُر لطف ہے یہ سلسلہ بھی نسلِ آدم کا — محبت کی محبت ہے اضافے کا اضافہ ہے

در و دیوار لرزے کھڑکیاں ہلنے لگیں گھر کی — پلنگ سے اُن کا گر پڑنا بھی ایٹم کا دھماکہ ہے

پڑا ہے دل ہمارا کشمکش میں کیا کریں یارو — ہیں گر وہ پھلجھڑی اُن کی سہیلی بھی پٹاخہ ہے

ابھی میں نے جو تم کو چھ ورق پڑھ کر سنائے ہیں — یہ میری مختصر تقریر کا زرّیں خلاصہ ہے

خدا کو کس طرح شانہ یہ کالا منہ دکھاؤ گے
میاں اس کالے دھندے میں خرابہ ہی خرابہ ہے

✣ ✣ ✣ ✣ ✣

مصطفیٰ ابدالی پھکڑ (ناندیڑ)

بیٹے مُنّا تجھے ہوا کیا ہے — تیری اس بھوک کی دوا کیا ہے

کر دیا تم نے صاف دسترخواں — اب بتاؤ کہ مدعا کیا ہے

میں نے مانا کہ یہ نہیں کافی — اب مرے پاس کچھ دھرا کیا ہے

جیب خالی ہے پیٹ بھی خالی — یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

ڈاکٹر میرا روگ کیا جانیں — پوچھئے نرس سے ہوا کیا ہے

ہے دُعا اپنی بس یہی پھکڑ
کچھ نہ سمجھے کوئی کہا کیا ہے

صبیح محسن (کراچی)

اسٹیٹس سمبل

انگریزی
کی ایک اصطلاح ہے
اسٹیٹس سمبل STATUS SYMBOL
اس کا صحیح اور جامع ترجمہ تو ہمارے بزرگ محترم میجر آفتاب حسن
ناظم شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی نے ضرور کیا ہوگا۔ لیکن بدقسمتی سے یہ ترجمہ
ہمارے علم میں نہیں ہے۔ اس لئے ہم اسے اپنی ناقص زبان میں صاحبِ حیثیت ہونے کی نشانی کہے لیتے ہیں۔
یہ تو تاریخ کا گہرا مطالعہ کرنے والے ہی بتا سکیں گے کہ کس دور میں صاحبِ حیثیت ہونے کی نشانی کیا تھی۔
ہم نے تو جب آنکھ کھولی تو یہ دیکھا کہ جس کے پاس موٹر گاڑی ہو اسے صاحبِ حیثیت سمجھا جاتا تھا۔ ان دنوں
شفیع الدین نیر بچوں کے مقبول شاعر تھے۔ ان کی ایک نظم ہمیں بہت پسند تھی جس کا ایک بند تھا سہ

صاحب بیٹھے کوچ کے اندر
آگے بیٹھا ان کے شوفر
گاڑی چلدی فر فر فر فر

پھر یہ ہوا کہ ہم جیسے ہما شما قسم کے لوگ بھی پیٹ کاٹ کر یا قسطوں پر سودا کر کے کھٹارہ سی گاڑیاں پالنے
لگے اور کار نشین کہلائے۔ یہ اور بات کہ ہے کہ نہ تو ان کے آگے شوفر بیٹھتا ہے اور نہ گاڑی فر فر چلتی ہے۔
اکثر صاحب کار کا رشتہ گاڑی کے ساتھ کچھ ویسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ شوہر کا بیوی کے ساتھ، وہی تنک
مزاجی ادھر، وہی ناز برداریاں اِدھر، کوئی خاص پروگرام بنانے سے پہلے بیوی کا موڈ دیکھئے اور گاڑی کا مزاج
بھی۔ مہینے میں پندرہ دن اگر اس گُل بدن کی ناسازیٔ طبیعت کے باعث اسپتال کے چکر کاٹئے تو باقی پندرہ
دن اس نازک بدن کی نامسندیٔ صحت کی وجہ سے ورکشاپ کے پھیرے لگائیے۔
خیر تو کہنا یہ تھا کہ جب کار پرستی کا رشتہ عام ہوا تو اہلِ ثروت نے دوسری نشانیاں اپنا لیں۔ پھر ہم نے
ایک دور وہ بھی دیکھا کہ جب بعض بیماریاں اعلیٰ طبقے کے لئے مخصوص تھیں۔ مثلاً ہائی بلڈ پریشر، دل کا دورہ پڑنا وغیرہ
اس زمانے میں کسی رئیس ابن رئیس کا تعارف کچھ اس طرح کرایا جاتا تھا۔

آپ سے ملیے۔ آپ ہیں فلاں ابن فلاں، آپ کے دادا کا انتقال دل کا دورہ پڑنے سے ہوا۔
تعارف حاصل کرنے والے صاحب تعظیماً کھڑے ہو جاتے اور تعارف جاری رہتا۔
آپ کے چچا پھیپھڑوں کے سرطان میں مبتلا ہوئے اور جانبر نہ ہو سکے۔
بیماری سے متعارف ہوتے والے انھیں آنکھیں پھاڑ کر دیکھتے اور پھر دوبارہ ہاتھ بھی باندھ لیتے۔ اور آپ کے والد کا انتقال دماغ کی رگ پھٹ جانے کے سبب ہوا۔

تعارف کرانے والے صاحب فاتحانہ انداز میں کہتے اور متعارف ہونے والے صاحب مارے مرعوبیت کے غش کھاتے کھاتے بچتے۔ پھر یوں ہوا کہ کھانا پکانے کے تیل کی جگہ موبل آئل، مکھن کے بجائے پیٹرولیم جیلی اور مسالوں کے بدلے لکڑی کا برادہ استعمال ہونے لگا۔ چنانچہ بیماریوں نے بھی موقع غنیمت جانا اور محمود و ایاز کے فرق کو مٹا دیا۔ اور جب رئیسانہ بیماریوں نے جمہوری نشینوں کو بھی نوازنا شروع کر دیا تو ایک بار پھر نئی علامتوں کی تلاش شروع ہوئی کہ جب تک طبقے موجود ہیں تب تک ان کو پہچاننے کے لئے نشانیوں کی ضرورت بھی رہے گی

آج کل اس قسم کی کئی نشانیاں رائج ہیں۔ مثلاً یہ کہ آپ کو شہر میں ہونے والی کلاسیکی موسیقی کی محفلوں کے کتنے دعوت نامے موصول ہوئے ہیں یا پھر یہ کہ مصورین نے اپنی تصاویر کی کتنی نمائشوں کی افتتاحی تقریب میں میں آپ کو شرکت کی زحمت دی۔

ہم اس طبقے میں شامل تو نہیں جس کی یہ نشانیاں ہیں لیکن اپنے پیشہ ورانہ فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں بارہا ایسی محفلوں اور نمائشوں میں شرکت کا شرف حاصل کر چکے ہیں۔ موسیقی کی محفلوں کے ساتھ علت یہ ہے کہ عموماً خاصی رات گئے شروع ہوتی ہیں اس لئے سرپرستی فنونِ لطیفہ کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کا یہ طریقہ ذرا مشقت طلب ہے۔ خصوصاً خواتین کے لئے، ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ اُدھر فنکار سر اور لَے کے جادو جگا رہا ہے اُدھر حسنِ فتنہ انگیز محوِ خواب ہونے کے لئے پینترے بدل رہا ہے۔ اِدھر گانے والا کھاؤ تار رہا ہے، اُدھر جماہیاں ہیں کہ بے حساب چلی آ رہی ہیں۔

مصوری کی نمائش اس اعتبار سے آسان نسخہ ہیں۔ نہ نیند کے خلاف جدوجہد کی ضرورت، نہ ایک جگہ جم کر بیٹھنے کی پابندی، ہاں کبھی کبھی خشک تقریریں ضرور برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ غالباً ان ہی آسانیوں کے پیش نظر ایسی تقریبات میں اہلِ ذوق خواتین بڑی تعداد میں شرکت کرتی ہیں۔

جہاں ان نمائشوں کے اور بہت سے قابلِ قدر فوائد ہیں وہاں ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں سے شام کو شائع ہونے والے اخبارات نکل رہے ہیں۔ ان اخبارات کی جان صفحہ اول اور صفحہ آخر پر چھپنے والی چار کالمی تصاویر ہی تو ہیں۔ اگر یہ نمائش نہ ہوں تو یہ بیچارے صفحہ بھر ایسی تصویریں کہاں سے لائیں؟

ویسے اتفاق اتفاق ہم نے یہ بھی سنا ہے کہ اگر [illegible] نمائش دیکھے [illegible] کے فنکار نے

کے لئے بے چین ہوسکتے ہیں تو وہ خواتین بھی اپنے تعریفیں جتانے کے لئے کچھ کم بے تاب نہیں ہوتیں۔ نتیجہ
دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

دوسروں کی بابت تو ہم کچھ نہیں کہتے لیکن ہمیں خود اپنی کور ذوقی کا پورا پورا اعتراف ہے۔ نہ تو ہمیں راگ راگنیوں کی پہچان ہے اور نہ ہم جدید آرٹ کو سمجھنے کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ اس لئے ایسی محفلوں میں ہماری تمام دلچسپیاں گائیک کی گائیکی کے بجائے سازِ فطرت کے نقوش پر اور مصور کی تخلیقات کی بجائے صانعِ حقیقی کے شاہکاروں پر مرکوز ہوتی ہیں جن کی ان محفلوں میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔

آئیے اب ایک اور سطحِ الوقت علامت کی طرف چلیے یہ نشانی نئی نہیں ہے۔ بس وقت کے ساتھ ساتھ اس میں تھوڑی سی تبدیلی آگئی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ لوگ قرض کی پیتے تھے، اس احساس کے ساتھ کہ یہ فاقہ مستی ایک دن رنگ لائے گی۔ اس دور میں جو جتنا بڑا رئیس ہوتا اتنا ہی زیادہ مقروض بھی ہوتا۔ آج کے دور میں بھی یہی حال ہے۔ فرق صرف اتنا ہوا کہ اس زمانہ میں رؤسا، قرض لیکر وضعداری نبھاتے تھے۔ اور مٹ جاتے تھے۔ آج لوگ قرض لے کر کاروبار پھیلاتے ہیں اور بن جاتے ہیں۔

مشہور و معروف بائیس خاندان والے سرمایہ کار ملک کے بڑے بڑے اداروں سے قرض لیتے ہیں، ان سے کمتر درجے کے خاندانی لوگ بنکوں سے اوور ڈرافٹ لیتے ہیں اور ہمارے جیسے بے ننگ و نام اپنی اپنی چادروں میں ہی پیر چھپانے بلکہ منہ چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یعنی بقرضہ زیادہ، خوشحال گھرانہ۔

آخر ہم بھی انسان ہیں۔ ہمارا بھی جی چاہتا ہے کہ معاشرے میں کوئی مقام ہو۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ کوئی نشانی اپنے آپ میں پیدا کریں۔ لہٰذا بڑے سوچ بچار کے بعد ہم نے طے کیا ہے کہ یہی آخری علامت یعنی مقروض ہونا ہمارے لئے مناسب رہے گی۔ اسی کو اپنانے کی کوشش کریں۔

لیکن بنک والے یا دوسرے ادارے تو ہم جیسے بے گھر بے در کو قرضہ دینے سے رہے۔ اس لئے ہم نے یہ پروگرام بنایا ہے کہ پہلے دوستوں اور عزیزوں سے قرض لیں۔ جب اس طرح کچھ حیثیت بن جائیگی تو بنک والے خود ہی ہمیں اپنے یہاں اکاؤنٹ کھولنے اور اوور ڈرافٹ لینے کی دعوت دیں گے۔

چنانچہ بہت جلد ہم احباب سے قرض حاصل کرنے کی مہم پر نکلیں گے۔ آپ کے پاس بھی آئیں گے۔ دیکھئے مایوس نہ لوٹائیے گا۔

نوکر رحمت یا زحمت

بے ڈھب بنارسی

مترجم:- کالیکا پرشاد

سوشلزم کا دور آئے گا یا نہیں کہا نہیں جا سکتا مگر سوشلزم کا ایک اصول عام ہو گیا ہے۔ اب نوکر نہیں ملتے۔ نوکر سے مطلب گھر میں کام کاج کرنے والوں سے ہے۔ یوں تو لیڈر یا استاد یا دفتروں میں کام کرنے والے اتنے مل جاتے ہیں جتنے شمشان میں کتے یا گدھ۔

کسی زمانے میں نوکر رکھنا بڑے آدمی یا رئیس ہونے کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ اب نوکر رکھنا دانش مندی، سمجھداری، مہربانی، عدم تشدد، قوت برداشت، شرافت وغیرہ خوبیوں کی آزمائش ہے۔ جن لوگوں میں یہ اوصاف بدرجہ اتم پائے جاتے ہوں وہی نوکر رکھ سکتے ہیں۔ نوکر رکھنا آرٹ ہے۔ یہ سمجھنا غلط ہے کہ پیسے پاس ہوں تو نوکر رکھ لیا جا سکتا ہے۔ جو لوگ ابھی اس مغالطے میں ہوں انہیں ہوشیار ہو جانا چاہیے۔

جس طرح علم عروض پڑھ کر کوئی کالیداس نہیں ہو سکتا، یا بانسری رکھ کر کوئی کرشن نہیں ہو سکتا، مونچھ منڈوا کر اور صدری پہن کر جواہر لال نہیں ہو سکتا اور اپنے سے زیادہ عمر والی عورت سے شادی کرنے سے شکسپیئر نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح پالا یا پیسے کے سہارے نوکر نہیں رکھا جا سکتا۔ اس کا تجربہ

کسی ایک کو ہوگا۔

میرے دوست اور ہم جماعت تجمل حسین لکھنؤ میں ڈپٹی کلکٹر ہو کر گئے۔ انھیں وہاں نیا نوکر رکھنا پڑا کوئی نوکر دو دن کے بعد چلا جاتا، کوئی تین دن کے بعد۔ وہ بہت گھبرائے۔ ان کی بیوی کو گھر کا کام کرنے کی عادت نہیں تھی۔ پھر چلم بھرنا، تمباکو چڑھانا کون کرتا؟ جو آدمی آتا تھا، اُس نے ایک آدھ کام سنبھالا لیکن اس کے رنگ ڈھنگ سے پتہ چلا کہ اُسے یہ سب ناپسند تھا۔ حسین صاحب نے ایک دوست سے شکایت کی۔ "ایسا نوکر دلائیے جو ٹکاؤ ہو۔" دوست نے پوچھا۔ "بات کیا ہے؟" کوئی بات ایسی نہ تھی۔ پھر دوست نے کہا۔ "آپ نوکر کو کیا کہہ کر پکارتے ہیں؟" ڈپٹی صاحب نے بتلایا ـــــ "نام لے کر پکارتا ہوں اور کیا بابا" یا "دادا" کہہ کر پکارا جائے؟ دوست نے کہا۔ "یہی سبب ہے لکھنؤ میں نوکروں کو "نواب صاحب" کہہ کر پکارا جاتا ہے"۔ دوست نے نوکر بھی تلاش کر کے بھیجا۔ ڈپٹی صاحب اُسے "نواب صاحب" کہہ کر پکارنے لگے۔ "نواب صاحب جوتا صاف کر دیجیے، نواب صاحب برتن مانجھ دیجیے، نواب صاحب بی بی صاحبہ کے پائجامہ میں ناڑا لگا دیجیے۔ یہ نوکر کہیں نہیں بھاگا۔ جب تک ڈپٹی صاحب لکھنؤ میں رہے اُس نے ساتھ دیا۔

ایک مرتبہ روٹری کلب میں قرارداد پاس کی گئی کہ نوکروں کو "آپ" کہہ کر مخاطب کیا جائے۔ اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ انگریز اپنے بٹلر کو بھی عزت سے بلاتے تھے۔

جو لوگ دوبارہ جنم لینے میں ایقان رکھتے ہیں انھیں یہ جاننا چاہیئے کہ اُس جنم میں جس نے نیک کام کیے ہیں۔ انھیں کوئی اچھا نوکر مل سکتا ہے۔ میں دوبارہ جنم لینے میں یقین کرتا ہوں اور اس میں میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ پہلے جنم میں میں نے کوئی اچھا کام نہیں کیا۔ شائد پہلے جنم میں مرتے وقت بچھیا کی دم بھی نہیں پکڑی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے اس جنم میں کبھی اچھا نوکر نہیں ملا۔ جہاں تک میں نے حساب لگایا ہے آج تک کل ملا کر پینتالیس نوکر میں نے وقتاً فوقتاً رکھے۔ علم حساب میں کمزور ہونے کے باعث اس میں دو چار کا فرق ہو سکتا ہے لیکن زیادہ کا نہیں۔ مجھے ہر اقسام کے نوکروں سے سابقہ پڑا اور عجیب تجربہ ہوا۔ کسی وقت میں نے خیال کیا تھا کہ میں نے کچھ ادب کا مطالعہ کیا ہے تھوڑی عقل بھی ہے، کچھ غور کرنے کی صلاحیت بھی ہے لیکن اب مجھے یقین ہو گیا کہ میں سدا غلط فہمی میں رہا اور اس کا سبب وہ نوکر ہیں جو وقتاً فوقتاً میرے پاس کام کرتے رہے۔ ان میں کچھ تو اس قدر دانش مند تھے جن کا مقابلہ اگر سقراط اور ارسطو کی منطق نہ ہو تو انھیں سے کیا جا سکتا ہے۔ باقی میں کوئی احمق بھی تھا کہنا مشکل ہے۔ ہم لوگوں کے حساب سے احمق ہو بھی تو در اصل احمق تھا نہیں۔

بہت دنوں کی بات ہے۔ میری دادی زندہ تھیں۔ اتوار کا دن تھا۔ اُسی دن نیا نوکر آیا۔ اُس کی

عمر اسال رہی ہوگی۔ آتے ہی اُس نے چیک میں جھاڑو لگائی۔ پھر باہر سے ملنے جلنے والے تھے ان کا ناشتہ کیا۔ میری دادی کو کوئی قابل نجومی نے بتا رکھا تھا کہ اتوار کے دن سرخ کپڑے پہن کر باہر لال پھول چڑھایا کیجیے آپ کے بیٹے اور پوتے طویل عمر پائیں گے۔ اُس نوکر سے انہوں نے کہا ـــــ " جا کر بازار سے بارہ لال پھول لاؤ گھر میں پیسے نہیں تھے۔ ایک روپیہ اُسے دے دیا گیا۔ وہ پھول لانے گیا۔ اُس دن سے آج تک وہ نہیں لوٹا۔

کچھ ہی دنوں کی بات ہے۔ ایک نوکر آیا۔ ان دنوں میں اپنے آپ چھرے سے داڑھی بنایا کرتا تھا جرمنی کا چھرا دنیا میں سب سے اچھا سمجھا جاتا تھا۔ ایک دن سویرے جب چہرے پر صابن لگا کر برش سے رگڑ کر کافی جھاگ بنا ڈالا تو چھرا چلانا شروع کیا۔ ایک انچ کا دسواں حصہ بھی نہیں چلا تھا کہ ایسا محسوس ہوا کہ آری سے چھیل رہا ہوں۔ نوکر سے پوچھا کہ چھرے کو چھوا تھا؟ اُس نے جواب دیا " نہیں، صرف دو مسواک ہی اس سے چھیل تھیں۔" میں نے اُس سے کہا ـــــ " داڑھی بنانے کے لیے ہے یا مسواک چھیلنے کے لیے؟ " اپنی زبان میں اُس نے جواب دیا ـــ " میں نے سمجھا کہ آپ کی داڑھی کے بال مسواک سے بھی سخت ہوں گے۔ جب مسواک چھل گئی تب بال نہیں کٹیں گے؟ اُس دن سے میں نے سیفٹی ریزر کا استعمال کرنا شروع کر دیا۔ دل میں اس کی دلیل پر خوش ہوا۔ ارسطو اگر بقید حیات ہوتا تو اس کو اپنا اُستاد بناتے۔ اس میں شک کسی کو نہیں ہو سکتا کم از کم مجھے تو نہیں۔

ایک اور واقعہ کا ذکر کروں گا۔ میرے ایک دوست ہیں۔ اس وقت وکالت کرتے ہیں۔ انہوں نے بڑی مہربانی فرما کر مجھے ایک نوکر عطا کیا۔ گرمی کا مہینہ تھا۔ میں باہر سے آیا اور پینے کو پانی مانگا۔ پانی پی کر میں نے گلاس چارپائی کے پاس رکھ دیا اور لیٹ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک صاحب ملنے آئے۔ میں نیچے ہی جانے والا تھا تب انہوں نے بھی پانی مانگا۔ نوکر مہاراج نے وہی گلاس اُٹھایا۔ پانی لے کر نیچے چلے۔ میں نے کہا ـــ " اس گلاس میں تو میں نے پانی پیا تھا۔ یہ جھوٹا ہے۔ اُس نے بلا جھجک جواب دیا ـــ وہ باہر کے آدمی ہیں کوئی گھر کے تھوڑے ہی ہیں؟ " میں نے گلاس بدلوایا۔ اگرچہ اُس میں یہ خوبی تھی کہ اپنے پرائے کا فرق سمجھ سکتا تھا اور اس سے مستقبل میں فائدے کے امکانات تھے لیکن میں نے دوسرے ہی دن اُسے روانہ کر دیا۔ میرے پاس واٹرمین کی ایک فونٹین پن تھی جس میں سونے کے دو چھلے لگے تھے۔ ان کو اس نے میری اجازت کے بغیر تحفہ سمجھ کر رکھ لیا اور چلتا بنا۔

اگر نوکر جاتے وقت آپ کی سبھی چیزیں جہاں کی توں چھوڑ دیتا ہے تو ضرور ہی اس کے دماغ میں فتور ہے کسی ڈاکٹر سے امتحان کروانا چاہیے۔ جب نوکر گھر سے جاتا ہے اور لوٹ کر گھر آ جاتا ہے۔ یا تین سیر بکنے والی بھنڈی کا حساب تین آنے ہی بتاتا ہے تو سمجھ لیجیے اخلاقیات کی اصطلاح میں ترمیم کرنی ہوگی۔

لئیق صلاح

پطرس کی مزاح نگاری

پطرس کا شمار اردو ادب کے صف اول کے مزاح نگاروں میں کیا جاتا ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی جو خود ایک مزاح نگار تھے۔ وہ پطرس کو صاحب طرز ادیب سمجھا کرتے تھے۔ چنانچہ وہ رقم طراز ہیں۔

"سب سے پہلے "راوی" میں پطرس کا مضمون "کتے" پڑھا تو ایسا محسوس ہوا کہ لکھنے والے نے اس مضمون سے جو درجہ حاصل کیا۔ وہ بہتوں کو تمام عمر نصیب نہ ہوگا۔ ظرافت نگاری میں پطرس کا ہمسر ان کے ہمعصروں میں کوئی نہیں۔"

طنز و ظرافت بظاہر آسان فن محسوس ہوتا ہے لیکن در حقیقت نازک ترین فن سمجھا جاتا ہے۔ بقول کسی نقاد کے کب ہنسنا چاہیئے؟ کتنا ہنسنا چاہیئے؟ اور سب سے مشکل یہ کہ کیسا ہنسنا چاہیئے؟ طنز بھی اتنا ہی اہم ہے، جتنی کہ ظرافت بعض اوقات طنز نگار خود اپنے طنز کا نشانہ بن جاتا ہے طنز کا تعلق برہمی یا بیزاری سے ہوتا ہے تو ظرافت کا تعلق تفریح و تفنن سے، ایک ہی واقعہ، ایک شخص کو ایک طرح سے متاثر کرتا ہے، تو دوسرا اس کا کچھ اور اثر لیتا ہے۔ [illegible] میں طنز و ظرافت کا پہلو لئے ہوئے ہیں ...

اردو نثر میں طنز و مزاح کی ابتداء [illegible] سے

ہوتی ہے۔ غالب فطرتاً شوخ واقع ہوا تھا۔ لیکن زمانہ "باندازِ تمنا" اُسے اس قدر سرمایۂ نشاط مہیا نہ کر سکا، جس کا وہ طلبگار تھا، اس لیے شعری فضا میں سنجیدگی، ظرافت پر غالب آگئی۔ چنانچہ بہت کم جگہ وہ شوخ اور چنچل غالب ملے گا۔ جس کی رگ رگ میں ظرافت بھری تھی۔ بہرحال! وہ سنجیدگی کے ان لبادوں کو ہٹا کر اپنی جھلک دکھا ہی دیتا ہے جیسے سے

دھول دھپّا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں　　ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا میری جو شامت آئی　　اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کیلئے

دہاں جاتا بھی تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب　　یاد تھیں، جتنی دُعائیں صرفِ درباں ہوگئیں

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کے رقیب　　گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

اُردو شاعری میں محبوب کو سراپا ناز سمجھ کر، اُس کے ہر ظلم وستم کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے والے شعراء کو غالبؔ کا یہ ایک بہت بڑا چیلنج تھا۔ جو اُس کی اپنی انفرادیت کے ساتھ اُس کی ظرافت کا بھی غماز ہے۔ لیکن اس سے زیادہ غالبؔ نے اُردو نثر کو "گراں مایہ" اور "گراں قدر" ظرافت کے سرمایہ سے مالا مال کیا ہے۔ جو لطائف کی حیثیت سے بھی موجود ہیں اور خطوط کی صورت میں بھی۔

بقول وزیر آغا، غالبؔ کی ظرافت کی اہم خوبی یہ ہے کہ، انھوں نے بہت کم نشانہ تمسخر بنایا۔ بلکہ زیادہ تر اپنے آپ ہی پر ہنستے رہے۔ مثلاً وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "میں اپنے گھر میں مثل بلائے ناگہانی نازل ہوا ہوں۔" ظاہر ہے کہ ان الفاظ کا لکھنے والا کوئی معمولی انسان نہیں، اس لیے کہ انسان کو تمام کائنات میں اپنی ذات سے جو لگاؤ رہتا ہے۔ وہ خود کو مذاق کا نشانہ بنانے نہیں دیتا جیسے کہ آغا صاحب نے کہا ہے "فی الحقیقت خود پر ہنسنے کے لیے وسیع القلبی کی ضرورت ہے۔ اور قدرت نے غالبؔ کو اس کو بہت بڑا حصہ بخشا تھا۔"

غالبؔ کے بعد اس روایت کو آگے بڑھانے میں جن لوگوں نے نمایاں حصہ لیا ہے۔ وہ ہیں "اودھ پنچ" کے لکھنے والے منشی سجاد حسین، اور سرشارؔ مشہور مزاح نگار تھے۔ لیکن ان کے پاس چند بندھے ٹکے اصول نظر آتے ہیں۔ انھوں نے جو کردار پیش کئے ہیں۔ جیسے "چچا چھکن" حاجی بغلول اور میاں خوجی، تو یہ زیادہ تر ماورائی محسوس ہوتے ہیں۔ "خوجی" سرشارؔ کا سب سے بہترین کردار ہے جو مضحک پہلوؤں اور اُس دور کے لکھنوی معاشرے کا ایک جیتا جاگتا پیکر ہونے کے سبب واقعی صفِ اول کا کردار محسوس ہوتا ہے۔ لیکن حد سے زیادہ مبالغہ آرائی، خوجیؔ کو عام انسانی سطح سے کہیں اوپر پہنچا دیتی ہے۔ اس کے برعکس پطرسؔ کے یہاں ہمیں کوئی ایسا کردار نہیں ملتا۔ جو ہماری اپنی دنیا کا نہیں۔ ہاسٹل کا طالب علم ہو کہ، "لالہ جی" لیڈر ہوں کہ مرزا سب وہی ہیں جن سے آئے دن ہمیں سابقہ پڑتا ہے۔ ان کی کمزوریاں واقعی، ہماری اپنی کمزوریاں ہیں جسے پطرسؔ نے مزاحیہ انداز میں ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ رشید احمد صدیقی

نے ٹھیک ہی کہا :۔

"مضحک کو مضحک دکھانے بتانے کا کوئی نتیجہ نہیں۔ یہ سستا اور فضول کاروبار ہے۔ شخصیت کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ معمولی کو غیر معمولی بنا دے۔ یعنی طنز و ظرافت کے یہی نمونے فن کار کی شخصیت کی کشید ہوتے ہیں۔ اور اچھے ادب اور اچھے ذہنوں میں جگہ پاتے ہیں۔"

پطرس کی مزاح نگاری کا سب سے خاص وصف واقعہ نگاری ہے۔ وہ مزاح کے تمام حربے واقعے کو اُبھارنے اور اُجاگر کرنے میں صرف کرتے ہیں اور دوسری خوبی یہ ہے کہ واقعہ جس شخص کے گرد گھومتا ہے وہ خود ہی اُسے مضحکہ خیز ماحول میں پہنچا دیتا ہے۔ اس کے لیے انھیں کوئی خاص ریاضت کرنے کی ضرورت لاحق نہیں ہوتی۔ وہ مزاحیہ کردار، خود مصنف یا مصنف کا ہمزاد ہوتا ہے۔ غالب کی طرح پطرس دوسروں پر ہنسنے کے بجائے اپنے آپ ہی پر ہنستے ہیں اور مذاق کا نشانہ کسی اور کی ذات نہیں بلکہ وہ خود ہوتے ہیں جیسے "میں ایک میاں ہوں"۔ میں ایک ایسا ستم رسیدہ شوہر بنے ہوئے ہیں۔ جسے بیوی کے میکے جانے سے خوشی بھی ہوتی ہے، اور رنج بھی۔ چنانچہ یہ متضاد احساسات انھیں اپنے فیصلے پر قائم رہنے نہیں دیتے۔ وہ رنجیدہ ہوکر بیوی کو تار دیتے ہیں کہ جلد لوٹ آؤ۔ اور شامتِ اعمال یہ کہ وہ اپنی اس حرکت کو بھول کر اس کی ناراضگی کے سامان بھی مہیا کر لیتے ہیں۔ وہ دوستوں کی بیٹھک اپنے ہی دولت کدہ پر رکھتے ہیں۔ تاش کی بازی میں جب وہ ہار جاتے ہیں تو سزا یہ تجویز ہوتی ہے کہ وہ کاغذ کی لمبوتری ٹوپی پہن کر زنانے سے حقے کی چلم بھر لائیں۔ پطرس یہاں ظرافت کی اس بلندی کو چھو لیتے ہیں جو سوائے اُن جیسے مزاح نگاروں کے کسی اور کے بس کی بات نہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

"ہم بھی مزے میں آئے ہوئے تھے۔ ہم نے کہا تو ہوا کیا؟ آج ہم ہیں کل کسی اور کی ہار کی آئے گی۔ نہایت خندہ پیشانی سے اپنے چہرہ کو پیش کیا، ہنس ہنس کر وہ بے ہودہ سی ٹوپی پہنی۔ ایک شانِ استغنا کے ساتھ چلم اٹھائی اور زنانے کا دروازہ کھول کر باورچی خانے کو چل دیے اور ہمارے پیچھے کمرہ قہقہوں سے گونج رہا تھا۔

صحن میں پہنچے ہی تھے کہ باہر کا دروازہ کھلا۔ اور ایک برقعہ پوش خاتون اندر داخل ہوئیں منہ سے برقعہ اٹھا تو روشن آرا۔ روح منجمد ہوگئی۔ اور تمام حواس نے جواب دے دیا۔ روشن آرا کچھ دیر تو چپکی کھڑی دیکھتی رہی اور پھر کہنے لگی ..... لیکن میں کیا بتاؤں کہ کیا کہنے لگی۔ اس کی آواز تو میرے کانوں تک جیسے بے ہوشی کے عالم میں پہنچ رہی تھی۔"

"سویرے جو کل آنکھ کھلی میری" میں سویرے جاگنے کی مشکلات کو بڑے دلچسپ پیرائیہ میں بیان کیا ہے۔ وہ اپنے پڑوسی لالہ جی سے یہ خواہش کرتے ہیں کہ اُنھیں وہ جگا دیں اور جب لالہ جی اُنھیں جگانے کی ناکام کوشش کرتے ہیں تو جاگنے والے کے احساسات و جذبات کچھ اس طرح ہوتے ہیں:۔

"یہ موتوں کو جگا رہے ہیں یا مُردوں کو جلا رہے ہیں اور حضرت عیسیٰ بھی تو ہلکی سی آواز میں "قم" کہہ دیا کرتے ہوں گے۔ زندہ ہو گیا تو ہو گیا نہیں تو چھوڑ دیا۔ کوئی مردے کے پیچھے لٹھ لے کر پڑ جایا کرتے تھے۔ توپیں تھوڑی داغا کرتے تھے۔"

ان کا سب سے بہترین انشائیہ "کُتّے" ہے۔ اور غالباً پطرس کی سب سے بڑی کمزوری بھی کُتّے ہی ہو۔ اس لیے لکھنے والے نے اپنے تمام مشاہدات اور تجربات کو اس سلیقہ سے پیش کیا ہے کہ کوئی اور شخص اس طرح یا اس سے اچھا لکھنے کا دعویٰ کر ہی نہیں سکتا۔ انھیں کوئی کُتّا "خداترس" نظر آتا ہے تو کسی میں انھیں فقیرانہ شان دکھائی دیتی ہے تو، کوئی فلاسفر جس کا سلسلۂ نسب وہ دیوجانس کلبی سے ملاتے ہیں۔ ان کے خفیہ جلسے، ان کی تبلیغ واشاعت، غرض ہر پہلو سے ان کا بغور مطالعہ کیا گیا ہے۔ کتوں کی آواز، ان کے تمام قویٰ معطل کر دیتی ہے۔ اسی سبب وہ اس کے حل کے بھی متلاشی ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

"اگر ان کا ایک نمائندہ شرافت کے ساتھ ہم سے آکر کہہ دے کہ عالی جناب سڑک بند ہے تو خدا کی قسم ہم بغیر چوں و چرا کے واپس لوٹ جائیں اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ہم نے کتوں کی درخواست پر کئی راتیں سڑکیں ناپنے میں گزار دی ہیں۔ لیکن پوری مجلس کا یوں متحدہ طور پر سینہ زوری کرنا ایک کمینہ حرکت ہے۔"

"مرید پور کا پیر" میں نام نہاد قومی لیڈروں پر بھرپور طنز کیا گیا ہے۔ لیڈر اور تقریر دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہوا کرتے ہیں۔ اسی لیے تو لیڈر بدنام ہیں کہ سوائے تقریروں کے انھیں کچھ کام نہیں آتا۔ اور یہی وہ خصوصیت ہے جو لیڈر کے لیے کبھی جان لیوا ثابت ہوتی ہے۔ اس مضمون میں پطرس نے لیڈر کی اس کمزوری کی طرف اشارہ کیا ہے۔ طنز و مزاح کی چاشنی قابل دید ہے:۔

"حضرات! ہندوستان کے جس نامی اور بلند پایہ لیڈر کو آج کے جلسے میں تقریر کرنے کے لیے بلایا گیا ہے۔

تقریر کا لفظ سن کر میں نے اپنی تقریر کے تمہیدی فقروں کو یاد کرنے کی کوشش کی لیکن اس وقت ذہن، اس قدر مختلف تاثرات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا کہ نوٹ دیکھنے کی ضرورت پڑی۔ جیب میں ہاتھ ڈالا تو ندارد۔ ہاتھ پاؤں میں یکلخت ایک خفیف سی خنکی محسوس ہوئی دل کو سنبھالا کہ ٹھیرو ابھی کئی اور جیبیں ہیں۔ گھبراؤ نہیں۔ رعشے کے عالم میں سب جیبیں دیکھ ڈالیں لیکن وہ کاغذ نہیں ملا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دس بارہ دفعہ تمام جیبوں کو ٹٹولا، لیکن کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔ جی چاہا کہ زور زور سے رونا شروع کر دوں۔"

"مرحوم کے بارے میں" وہ اپنے دوست مرزا کے آگے اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ ایک موٹر خریدنا

چاہتے ہیں۔ جب مرزا نے کہا کہ روپے کا انتظام کیوں کر ہوگا تو یہاں پطرس کی ظرافت ملاحظہ کیجیے :۔

"میں اپنی کئی قیمتی اشیا بیچ سکتا ہوں۔" مرزا بولے کون کون سی۔ مثلاً میں نے کہا۔ "ایک تو اپنا سگریٹ کیس بیچ ڈالوں گا۔ باقی ڈھائی تین ہزار کا انتظام بھی اسی طرح ہو جائے گا۔"

چند ناقدین کا یہ خیال ہے کہ پطرس نے ٹکنیک اور مواد، دونوں میں مغرب سے خوشہ چینی کی ہے لیکن دوسروں کی رائے اس سے مختلف ہے۔ اور سچ پوچھا جائے تو سوائے "میبل اور میں" کہ تمام انشائیوں میں مقامی رنگ جھلکتا ہے۔

اُس دور کے لکھنے والوں میں پطرس سب سے آگے تھے۔ ان کے مضامین "نیرنگِ خیال" میں شائع ہوا کرتے تھے۔ پطرس پروفیسر تھے۔ اور وہ دوسرے اعلیٰ عہدوں سے بھی وابستہ رہے۔ U.N.O میں بھی انہوں نے عرصے تک کام کیا۔ زندہ دلی ان کا اوڑھنا، بچھونا تھی۔ اس لیے ہر محفل میں وہ "جانِ محفل" بنے رہتے۔ لطیفے یاد کر کے سنانے کی زحمت کبھی پطرس نے گوارا نہیں کی۔ برجستہ کئی لطیفے کہہ سکتے تھے۔ ڈاگ ہیمر شولڈ جو اس وقت اقوام متحدہ کے سکریٹری تھے۔ وہ بھی پطرس کی ذہانت اور ان کی ظرافت کے معترف تھے

پطرس نے اردو ادب کے لیے جو سرمایہ چھوڑا ہے۔ اُس میں مضامین بھی ہیں، ڈرامے بھی اور افسانے وغیرہ بھی۔ یہ متنوع سرمایہ ضخامت کے لحاظ سے زیادہ نہیں لیکن قابلِ قدر ضرور ہے۔ انھوں نے بہت کم لکھا اُن کی دیگر معروفیات نے انھیں اتنی مہلت نہیں دی کہ وہ اس میں کچھ اضافہ کر سکیں۔ مدیر نقوش محمد طفیل نے پطرس کے اسلوب کو سراہتے ہوئے لکھا ہے :۔

"پطرس نے جب بھی لکھا، لفظوں کے تاج محل بنائے .... پطرس کے بارے میں لکھنا آسان نہیں اور اُس جیسا ایک فقرہ لکھنا قیامت ہی قیامت، میرا خیال ہے جس نے پطرس جیسا ایک فقرہ لکھ لیا۔ وہ کم بخت ادیب ضرور ہے۔"

پطرس کے مزاح کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ پھکڑپن اور ابتذال نہیں پایا جاتا۔ ورنہ عموماً لوگ ہنساتے وقت، ان باتوں کو ملحوظ نہیں رکھتے۔ وہ گھٹیا قسم کے مذاق پر بھی اُترنے سے باز نہیں آتے۔ پطرس کی وضع داری آخر وقت تک قائم رہی۔ یہی ان کی عظمت کا ثبوت ہے۔ واقعی پطرس ایک بہت بڑا فن کار تھا۔ جنھوں نے اصولوں کی پیروی بھی کی اور فن سے انصاف بھی کیا۔ اس لیے ان کا مزاح بے روح نہیں بلکہ جاندار اور شاندار محسوس ہوتا ہے۔ — —

مضامین صاف، خوش خط، صفحہ کے ایک جانب لکھے جائیں

تبصرہ: یوسف ناظم

"مزاح میں حسن صبیح"

پتہ نہیں پاکستان میں شاعروں اور ادیبوں کو اپنی کتابوں کے لئے اتنا نفیس اور اُجلا کاغذ کہاں سے مل جاتا ہے۔ جو کتاب بھی ہاتھ آتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے سفید مُرغّق اطلس پر کیسلی گرائی کے چمن بکھرے ہوئے ہیں۔ ہر سطر 'گلِ مہندی کی روش اور ہر ورق' گنجینۂ گوہر' سرورق بھی اتنا نظر فریب اور دلکش کہ زیادہ دیر دیکھو تو بینائی متاثر ہونے کا ڈر ہو۔ یہ سرورق وہی نقاب ہے جس کے بارے میں غالب نے کہا ہے

ع زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

ہماری نظر سے تو جتنی بھی کتابیں گذریں آرٹ کا نمونہ ہی دکھائی دیں۔ (آپ اس بیان کو مبالغہ سمجھتے ہیں) تو ضرور سمجھئے۔ یوں بھی اِن دنوں سچ بولا ہی کتنا جاتا ہے پروین شاکر کی خوشبو ہو یا مسعود صاحب کی آوازِ دوست۔ مشتاق یوسفی کی زرگذشت ہو یا خواجہ مشفق کی' ابیات۔ ہر کتاب پہ نفاست کی مہر لگی ہوئی۔ اِس بات پر ہماری طرف سے ایسی کتابوں کے ناشروں کو مبارکباد۔ (لیکن ناشر کتاب کی قیمت بھی کس کر وصول کرتے ہیں کوئی بھی کتاب چاہے وہ دبیز ہو یا نہیں ۲۰' ۲۵ روپے سے کم کی نہیں ہوتی' یہ وہاں کا عام نرخ ہے)

حال ہی میں ایک کتاب پڑھنے کو ملی۔ بین السطور۔ مصنّف ہیں صبیح محسن نیا نام ہے لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ کام دیکھنا چاہیئے۔ کتاب مکتبۂ جمال کراچی سے چھپی ہے اور مکتبۂ مذکور نے اپنے جمال کا کافی حصہ اس میں منتقل کر دیا ہے۔ کتاب خوبصورت ہے اور خوش جمال ہے بیسرا لکھا گئی ہے۔ اِس میں کتابت کی غلطیاں نہیں ملتی۔ یہ تو اُردو کتابوں میں ہونی ہی چاہئیں۔ اِس میں بھی ہوتیں تو یہ کتاب مکمل کتاب کہلاتی —— کتابت کی کچھ غلطیاں تو ایسی چھوٹی ہیں جنھیں بے مثال کہا جا سکتا ہے۔

ایک جملہ تھا "..... صاحب عمر بھر نامراد رہے اور نامراد ہی مرے" کاتب صاحب نے جب یہ جملہ پڑھا تو انہیں 'نا' کا الف تو نہیں کھلا لیکن 'مراد' کا الف اِن کی طبع نازک پر گراں گذرا اور انہوں نے اسے حذف کرنا ہی مناسب سمجھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ جن صاحب کے بارے میں یہ جملہ لکھا گیا تھا وہ انتقال فرما چکے تھے۔ وہ زندہ ہوتے تو کاتب صاحب کا انتقال یقینی تھا۔ ہو رثا کی طرف سے خطرہ اس لئے نہیں تھا کہ آج کل' ورثا کو اردو پڑھائی ہی نہیں جاتی۔

بات بین السطور کی تھی۔ پاکستان کے مزاحیہ ادب کو معتبر اور باوقار کہنے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ یہ حقیقتاً ایسا ہی ہے۔ بین السطور میں بھی اسی وقار کی جھلک ملتی ہے۔ بین السطور نام مجھے اس لئے پسند آیا کہ اکثر لوگ مزاح میں صرف سطریں پڑھتے ہیں اور بین السطور کو کسی اور کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ صبیح محسن نے نہایت ہی مہذب انداز میں ایک فرمائش کی ہے اور یہی دبا دبا مزاح ان کی کتاب کا اصل جزو ہے۔ وہ اپنے قاری کو ہنسنے کی زحمت نہیں دینا چاہتے۔ انہوں نے اپنے قلم کی نوک کو نوکِ قلم میں رہنے دیا ہے نشتر نہیں بننے دیا۔ دبی زبان سے میں بھی کہنا چاہوں گا کہ ان کی شائستگی ہر جگہ حاوی اور نمایاں ہے۔ وہ زبان کی اونچ نیچ سے واقف ہیں۔ صحیح اور

شستہ زبان لکھتے ہیں اور وہ اگر چاہیں تو اسی طمطراق کا
مزاح لکھ سکتے ہیں جو اس محفل میں اگلی نشستوں پر ہی نہیں
مسند نشین پر بیٹھنے والوں کی تحریروں میں موجود ہے وہ
نبض دیکھنا جانتے ہیں صرف نسخہ لکھنے میں ذرا تکلف
سے کام لیتے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اب مزاح
صرف ہومیو پیتھک اور ایورویدک طریقہ علاج نہیں
عمل جراحی بھی ہے لیکن یہ ان کا اپنا مزاج ہے کہ وہ
رگِ گل سے بلبل کے پر باندھنے کے نازک کام کو
اپنا وطیرہ بنائے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے
ان کے فن کے بارے میں یہ صحیح لکھا ہے کہ اُن کے ہاں
مزاح ایک ایسی لطیف سی کیفیت کا نام ہے جو دل
میں مسرت کا ابھار تو پیدا کرتی ہے مگر ہونٹوں تک آتے
آتے تبسم کی موہوم سی لکیر سے آگے نہیں جاتی" ڈاکٹر وزیر
آغا نے لیکن یہ بھی کہا ہے۔ ابن انشا کی طرح صبیح محسن بھی
ایک بہت اچھے مزاح نگار ہیں (یہ رائے اتفاقاً ابن
انشا کے انتقال کے بعد چھپی ہے۔ اور میں یہ نہیں کہنا
چاہتا کہ یہ رائے ہر دو مزاح نگاروں کے ساتھ
ناانصافی ہے)

صبیح محسن نے اپنے بارے میں یہ نہیں بتایا کہ وہ
کون ہیں کیا کرتے ہیں اور کب سے لکھ رہے ہیں وہ
تو بھلا ہو مقدمہ نگار خواجہ مشفق کا کہ انہوں نے یہ ظاہر
کر دیا کہ صبیح محسن صنفِ سخت سے تعلق رکھتے ہیں اور
پبلک ریلیشنگ سے متعلق ہیں۔

" آپ خاصے کوتاہ قلم واقع ہوئے ہیں۔ بہت
تیر مارا تو سال میں ایک آدھ مضمون لکھ لیا۔ اور اگر سال
لیپ کا ہوا تو اتنی زحمت بھی گوارا نہ کی۔ اس کوتاہ قلمی کا نتیجہ
یہ ہوا کہ ہمارے عام ادبی حلقوں میں پڑھے بھی گئے اور
پسند بھی کئے گئے۔

پبلک ریلیشنگ پر یاد آیا کہ صبیح محسن پیشے کے اع
سے اسی شعبے سے وابستہ ہیں۔ حیرت ہے کہ انہوں نے
اپنی ذات کے معاملے میں اس فن کا کوئی حربہ نہیں آزما
وہ اگر ذرا سی توجہ اپنی طرف بھی کر لیتے تو اب تک کئی ادبی
رسالوں کے خاص نمبر ان کے اعزاز میں ضرور شائع ہو گئے
ہوتے' لیکن اچھا ہی ہوا کہ انہوں نے ملک گیر شہرت کیلئے
ہاتھ پاؤں مارنے کی بجائے یہ بہتر سمجھا کہ چپکے چپکے اپنا کا
کرتے رہیں۔ اسی صورتِ حال کا نتیجہ اس وقت 'بین السط
کی صورت میں ہمارے سامنے ہے اور اس کے مصنف
کی حیثیت سے صبیح محسن ہمارے طنز و مزاح لکھنے والا
کی صفِ اول میں نظر آ رہے ہیں۔"

صبیح محسن کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اردو
کے کلاسیکی ادب سے کما حقہ واقف ہیں۔ اور یہ بات اُن
کے ہاں جگہ جگہ ابھر کر سامنے آتی ہے۔ متقدمین کے ایسے
اشعار سے جو زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ سبھی نثر نگار استفا
کرتے رہے ہیں۔ ....

..... لیکن صبیح محسن چاہیں تو اس روشِ عام سے ہٹ کر
بھی اپنی راہ بنا سکتے ہیں۔ اُن کے ہاں وہ چمک ہے جو
انہیں کسی کی مدد کے بغیر' صحیح و سالم رکھ سکتی ہے
"اسٹیٹس سمبل" اس چمک اور چہل کی مثال ہے۔

" پھر ہم نے ایک دور وہ بھی دیکھا کہ جب بعض بیماریا
اعلیٰ طبقے کے لئے مخصوص تھیں۔ مثلاً ہائی بلڈ پریشر، دل کا
دورہ پڑنا وغیرہ' اس زمانے میں کسی رئیس ابن رئیس کا
تعارف کچھ اس طرح کرایا جاتا تھا:

"آپ سے ملئے۔ آپ ہیں فلاں ابن فلاں' آپ کے
دادا کا انتقال دل کا دورہ پڑنے سے ہوا۔"

تعارف حاصل کرنے والے صاحب تعظیماً کھڑے
ہو جاتے اور تعارف جاری رہتا۔

"آپ کے چچا پھیپھڑوں کے سرطان میں مبتلا
ہوئے اور جانبر نہ ہو سکے"

بیچارے متعارف ہونے والے صاحب انھیں
آنکھیں پھاڑ کر دیکھتے اور پھر مودبانہ ہاتھ بھی باندھ لیتے
اور آپ کے والد کا انتقال دماغ کی رگ پھٹ
جانے کے سبب ہوا۔

تعارف کرانے والے صاحب فاتحانہ انداز میں
کہتے اور متعارف ہونے والے صاحب مارے مرعوبیت
کے غش کھاتے کھاتے بچتے ـــــــ"

"پیشے کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے" میں مصنف
نے مختلف پیشوں کے مضحک پہلوؤں کو رسوا کرنے میں
کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

۱۷ مضامین اور ایک پیش حرف پر مشتمل ۱۴۸ صفحوں
کی یہ خوش جمال کتاب خوش خصال چھپی ہے۔ مصنف نے
اپنی تصویر شائع کرنے سے احتراز کیا ہے' اپنی عمر بتانے
سے گریز کیا ہے۔ انہوں نے اپنا تعلیمی ریکارڈ بھی پیش
نہیں کیا ہے۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ شکل و صورت
اور عمر تو ان کی پردۂ خفا میں ہے لیکن ان کی علمیت بہر حال
ورق ورق پر مترشح ہے۔ صاف ستھری اور صحیح زبان میں اتنے
شائستہ اور مہذب مزاح کے خالق صبیح محسن یقیناً
معقول آدمی ہوں گے ـــــ

بین السطور

ناشر: مکتبۂ جمال ۱۴۱۔ شرف آباد
کراچی ۵

خرافات (مراسلے)

⁂

▬ سالنامہ ملا۔ اپنی پرانی روایتوں کو ہی پورا نہیں کرتا بلکہ کارٹونوں کے اضافے سے اور بھی زیادہ پُرکشش ہوگیا ہے۔ شگفتہ مضامین کے ساتھ ساتھ سنجیدہ تحریرات سے ایک توازن پیدا ہوگیا ہے۔ تبصروں میں اگر کچھ شگفتگی کا عنصر ہوتا تو "شگوفے" کے ساتھ اُن کی موزونیت اور بڑھ جاتی۔

(ڈاکٹر) سید حامد حسین۔ بھوپال

⁂

▬ مارچ کا "شگوفہ" نظر نواز ہوا۔ سرورق کو دیکھ کر خوف ہوتا ہے کہ کہیں نظر نہ لگ جائے۔ وجاہت علی سندیلوی کا ڈرامہ الکشن کے دوران ہونے والی ہُلڑ بازی اور گھما گھمی کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ عاتق شاہ کا "بھُٹّہ" پڑھ کر منہ میں پانی آگیا (حالانکہ بھُٹّہ دیکھ کر یا اس کا نام سن کر کبھی منہ میں پانی نہیں آتا) ڈاکٹر آدم شیخ کا مضمون پڑھ کر ہنسی کم آتی ہے تو کُتّے پر رحم زیادہ آتا ہے۔ ڈاکٹر سمیع بن سعد کا میرؔ کے تعلق سے نیا انکشاف چونکا دینے والا ہے۔ سکندر عرفان کی آپ بیتی "جب ہم شاعر بنے" دلچسپ اور مزاح سے بھرپور ہے۔ "فکر تونسوی کے نام شکیل اعجاز کا خط" ناچیز کی رائے میں اس ماہ کی بہترین تخلیق ہے۔ میرے رفیقِ محترم رؤف خوشتر کا تبصرہ مختصر ہونے کے باوجود عبدالقادر ... [illegible]

محبوب راہی جیسے زبردست قلمکار کو "بلاعنوان" پر تبصرہ کرنا کوئی بڑی بات نہیں تھی پھر بھی اُنہوں نے دل کی گہرائیوں کے ساتھ شیخ رحمٰن کے فن کو اُجاگر کیا ہے۔ اس ماہ شائع ہونے والی غزلوں اور نظموں کو دیکھ کر خطرہ محسوس ہو رہا ہے کہ اگر اس دلچسپ شاعری کا چسکا اُردو داں قارئین کو لگ جائے گا تو پھر سنجیدہ شاعری کرنے والے شعراء کرام کے آگے کون گھانس ڈالے گا۔ غرض اس ماہ کا "شگوفہ" قابلِ تعریف ہی نہیں قابلِ رشک بن گیا ہے۔

منظور وقار۔ گلبرگہ

⁂

▬ بہت سارے "شگوفہ" کے شمارے نظر سے گزرے۔ خدا کرے آپ اسی طرح سے نئے نئے گل کھلاتے رہیں۔ اب اسے شامتِ اعمال ہی سمجھئے کہ سب ہی شمارے ایک سے بڑھ کر ایک لگے۔ اور خصوصاً پتہ میں مجرّدگاہ کی ترکیب بہت پسند آئی۔

عبدالرشید نشاطؔ، بدنیرہ (مہاراشٹرا)

⁂

▬ اپریل کا شمارہ میں کنہیا لال کپور کا مضمون میرے لیے بہرحال نیا ثابت ہوا۔ آپ کی کاوش و کوشش کو نہ سراہنا ظلم ہوگا۔ سرپنچ حیدرآبادی، پاگل عادل آبادی، جوہر سیوانی اور الیاس صدیقی کے کلام نے بھی طبیعت کو باغ و بہار کردیا۔ عابد معز کا پہلا تجربہ شاندار تو ہے مگر اندازِ تحریر میں اگر مزید جان ہوتی تو مضمون اور جاندار ہو جاتا۔

مختار یونس۔ مالیگاؤں

شگوفہ

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

جلد ۱۵ — شمارہ ۶

ایڈیٹر
سید مصطفیٰ کمال

مجلسِ ادارت:
حمایت اللہ
مسیح انجم
منظور احمد
منیجر: سمیع جلیل

مجلسِ مشاورت
راجندر سنگھ بیدی
بھارت چند کھنہ
نریندر لوتھر
مجتبیٰ حسین

قیمت فی پرچہ: ۲ روپے ۵۰ پیسے
زرِ سالانہ: انفرادی: ۲۵ روپے
لائبریری: ۳۰ روپے
بیرونِ ہند سے: ۹۰ روپے

طباعت: اعجاز پرنٹنگ پریس
حیدرآباد۔

کتابت: فہیم احمد، مسعود انور

خط و کتابت کا پتہ

شگوفہ ۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱
فون: 57716

PURANDAS RANCHHODDAS
SONS
کشمیری قوام

اس تھیلی کے چٹے بٹے

فہرست

خط لکھیں گے گرچہ (مکتوب)

چوکھن

رضا نقوی واہی ۱۰	ڈاکٹر انعام الحق ۲۵	مختار یونس ۲۵
سرپٹ ۳۰	پاگل ۳۰	سید کرمانی [illegible]
احسان ۴۵	کرشن پرویز ۴۵	شفیع منیر ۴۶

خواجہ عبدالغفور
(مکتوب واشنگٹن)

ہم عصر امریکی مزاح

عزیز من۔ السلام علیکم۔

بمبئی سے نیویارک کی پرواز میں PANAM کی ہندوستانی نژاد ایرہوسٹس نے دبئی۔ استنبول۔ فرانکفرٹ۔ لندن پر اُردو میں ضروری اعلانات کئے اور کرسی کی سیٹاں سیدھی رکھنے کی ہدایت کی تو سچ مچ لگا کہ اُردو زبان بھی ہمارے ساتھ مغرب کی طرف پرواز کررہی ہے۔ موری دیکھتے، سوتے اور کئی بار ناشتہ، لنچ اور ڈنر کھاتے ہوئے نیویارک پہونچ گئے وہاں سے ڈھائی سو میل کی مسافت کار سے طئے کرکے، راتے رات واشنگٹن پہونچ گئے۔ موسم بہت ہی خوشگوار، رشتہ دار دوست احباب اور ہمارے یونین کے پچھلے ساتھی سب ہی ملے۔ وائس آف امریکہ کے اُردو ڈپارٹمنٹ نے دو انٹرویو لیے۔

ہم نے اس بار یہ محسوس کیا کہ امریکیوں میں ظرافت لطیف کوٹ کوٹ کر بھری ہے اس لئے کہ ہم انہیں ہمیشہ مسکراتے ہی دیکھتے ہیں لیکن ہمیں بتایا گیا کہ یہ مسکان ویسے ہی غیر اختیاری اور لاشعوری ہے۔ جیسے گفتگو کے دوران اطالوی اپنے دونوں بازو اور ہاتھ ہلائے بغیر بات ہی نہیں کرسکتے۔ امریکیوں کا مسلسل منہ چلانا Chewing gum کے سبب ہے بات چیت کی وجہ سے نہیں۔ امریکی خود کہتے ہیں کہ جو صدفی صد امریکن ہوتا ہے وہ فہم و فراست سے ۰۰ فیصد بے بہرہ ہوتا ہے۔ انگلستان کا مزاح نگار ٹونی ہنڈرا کا کہنا ہے کہ برطانوی اپنے

حکمران، اپنے چرچ اور اپنی حکومت کا کھلے دل سے مذاق اُڑاتے ہیں جب کہ امریکی اپنے ملک اور اپنی املاک کے تحفظ میں لگے رہتے ہیں اور اپنی کسی بات کا مذاق اُڑانا ہو تو وہ اپنے ضمیر کی آواز پر ضرور دھیان دیتے ہیں۔

ہم نے یہاں کے چند مشہور اور منفرد مزاح نگاروں سے ربط قائم کر کے ان کی تخلیقات اور جدت طرازیوں کا مطالعہ کیا ہے۔ جس کی مختصر روئیداد مرسل ہے۔

خواجہ عبدالغفور
واشنگٹن

٭ ٭ ٭

SAM LAVENSON امریکہ کے مزاح نگار کی حیثیت سے کافی مقبول ہیں۔ خوش فہمی اور فراست ان کی تخلیقات میں بدرجۂ اتم موجود ہیں جس کی وجہ سے ہنسی اور انبساط کے ساتھ دماغی تربیت بھی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ یہ قلم چلاتے ہوئے معاشرہ پر طنز کے وار بھی کرتے ہیں۔ ٹی وی پر بھی یہ گل افشانی کرتے ہیں۔

"You don't have to be in who is who to know what is what"

ان کی بے حد دلچسپ تصنیف ہے۔ نیویارک شہر کے تعلیمی بورڈ کے یہ Teacher Emeratus ہیں۔

آرتھر بلاک کا مزاح بالکل نئے انداز کا ہے جس میں فکر و دانش کا عنصر ملتا ہے۔

Murphy's Law & other reasons why things go wrong میں انہوں نے پارکنسن لا۔ Cole's Law اور Peter Principles (دگرگی) وغیرہ کو اس طرح پیش کئے ہیں کہ اس لامعقولوں کی کتاب کہا جانے لگا ہے۔ کوئی معقولوں پر یقین کرے کہ نہ کرے ان کا سہارا ضرور لیتا ہے۔ ان کا مفروضہ ہے اگر کسی کو قائل نہ کر سکو تو اس کو اُلجھن میں ضرور پھنسا دو۔ بے وقوف سے بحث نہ کرو کہ سننے والے بے وقوف میں اور آپ میں فرق محسوس نہیں کر سکیں گے۔

Mica Fran Lebowitz بھی اچھی طنز نگار ہیں۔ تبصرہ نگاروں کا کہنا ہے کہ جو صبح نیند سے ہشاش بشاش بیدار نہیں ہوتے انہیں Metropolitan Life کو پڑھ کر دن کی شروعات کرنا چاہیئے۔ یہ بنکنگ، موسم، موسیقی، خوراک سب ہی موضوعات پر قلم برداشتہ لکھتی ہیں۔

یہاں کے سب سے زیادہ ہر دلعزیز صحافی آرٹ بک والڈ کو ان کی چالیس سالہ صحافتی تخلیقات پر

پلٹزر اوارڈ دیتے ہوئے پلٹزر بورڈ نے بتایا کہ ان کا مزاح شراب کی طرح ہے کہ وہ جتنی پرانی ہوتی ہے اتنی ہی پسندیدہ ہوجاتی ہے۔

ان کی تخلیقات کے منجملہ یہ بہت مقبول ہیں۔

1. Down the seine up the Potomac with Art Buch wald.
2. The Establishment is alive & well in Washington.
3. I am not a crook.
4. Washington is leaking.

پانچ سو سے زیادہ رسائل ان کی تخلیقات کو شائع کرتے ہیں اور ان کا کالم پانچ سو سے ہزار الفاظ پر مشتمل ہوتا ہے جس سے صرف گدگدی ہی نہیں ہوتی بلکہ لوگ سوچ بچار میں پڑ جاتے ہیں۔ یہ امریکہ کی زندگی پر نشتر چلاتے ہیں۔ عنوان ہوگا Honey moon is over لیکن صدر ریگن کی معاشی پالیسی کی ناکامی اصل موضوع ہوگا۔

All Prophet and Loss کے تحت کمپیوٹر پر قلم چلائیں گے۔
عنوان ہوگا Zerobase Luncheon اور اس کے تحت امریکی سرکار کی طرف سے اسکول کے بچوں کے لنچ کو بند کرنے پر سخت احتجاج ہوگا۔

— —

رضا نقوی واہی

نقّاد کے نام خط

(ماہنامہ 'شگوفہ' کے بعد 'قومی آواز' میں جب میری ایک نظم شایع ہوئی تو ایک مشہور نقّاد نے مجھے خط لکھا جس کا اقتباس درج ذیل ہے۔ "'قومی آواز' میں شعرستان کے شعراء کے اغوا کی جانکاہ خبر پڑھ کر بڑی تشویش ہوئی۔ چنانچہ آپ کی خیریت جاننے کے لیے شعرستان کے علاقے گردنی باغ میں قریب ۳ بجے حاضر ہوا تو معلوم ہوا کہ مغویہ ہستیوں میں ایک آپ کی ذاتِ باتخلیقات بھی ہے۔ تعلق خاطر ہے۔ واپسی ڈاک سے اپنی خیریت اور اس قید خانے کے پتے سے مطلع کیجئے جہاں نقّادوں نے آپ کو محبوس کیا ہے")

○

کیا بود و باش پوچھو ہو اے ناقدِ سخن — "ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے"

دو چار چھوٹے چھوٹے جزیرے جنوب میں — تھے متصل جو انڈمن و نیکوبار کے

بہرِ سخن گری تھے جو عالم میں انتخاب — "رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے"

واللہ کیا زمانہ تھا، بے روک ٹوک ہم — دن رات شعر کہتے تھے ٹانگیں پسار کے

گھر والیوں کا خوف، نہ نقّاد ہی کا ڈر — راتیں شبِ برات تھیں، دن تھے بہار کے

مچھلی پکڑ کے کھاتے تھے، لگتی تھی بھوک جب — بجھتی تھی پیاس، تاڑ سے بلبنی اتار کے

اسمگلروں سے کر کے تبھی لوگ ساز باز — قصّاب گھر میں لائے ہمیں گھیر گھار کے

اب پھر ہے ناقدوں کی چھُری اور گلوئے شعر — اب پھر ہدف ہیں ہم قلمِ بے مہار کے

صد حیف، کیا خبر تھی کہ پھر ایک بار ہم — ہوں گے اسیر، گردشِ لیل و نہار کے

"ناقد" نے جس کو لوٹ کے ویران کر دیا
"ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے"

◎

پرویز یداللہ مہدی

ایک نہ شُد دو شُد

اُستاد فصاحت جنگ جلیل مانکپوری کا شعر ہے ؎

ایک سے جب دو ہوئے تو لُطفِ یکتائی نہیں
اس لیے تصویرِ جاناں ہم نے کھنچوائی نہیں

شعر کے پردے میں اُستاد نے بڑا فلسفیانہ نکتہ بیان کر دیا ہے کہ جب تک ایک ہے "اکائی" ہے اور جب بات ایک سے آگے بڑھی یعنی ایک سے دو ہوئے تو پھر "دہائی" شروع۔ گویا یک نہ شد دو شد ہوتے ہی ناشدنی حادثات کا سلسلۂ لامتناہی شروع ہوجاتا ہے اسی لیے کسی استاد نے جب اپنے شاگرد کی زبانی یہ سُنا کہ وہ بہت جلد شادی کے بندھن میں بندھ کر ایک سے دو ہونے جارہا ہے تو اُستادِ عالی مقام نے فوراً اس لڑکی کو دعا سے نوازا ———

"اے میرے شاگردِ رشید، ہونی کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔ یوں بھی یہ "ٹیکس" عموماً سب پر واجب الادا ہے تاہم میری دعا ہے کہ تم جو ایک سے دو ہونے جارہے ہو خدا کرے کہ زندگی بھر "ایک" ہی رہو۔" ———

شاگرد نے گھبرا کر پوچھا ——— "کیا مطلب اُستاد ———؟"

استاد نے فصاحت فرمائی ——— "بے وقوف! ایک سے دو تو سبھی ہوتے ہیں لیکن زندگی کا مزہ تو ایک سے دو ہوجانے کے بعد "ایک" ہوکر رہنے میں ہے۔!"

استادوں کی یہ [illegible] ہوتے ہوئے بھی
بے اثر ہے کیونکہ نہ تو بچ سکتی ہے نہ طاقت پرواز، بلکہ
ایک سے دو ہونے کے بعد "بے شمار" کی منزل اس
تیزی سے بڑھتی ہے کہ محکمۂ مردم شماری کے وسیع
تجربے بھی "گنتی کی ناکامی کا اعلان" کرنے پر مجبور ہو جاتے
ہیں۔ اس "مجبوری" کی چھوٹی سی جھلک ملاحظہ فرمائیے،
ایک نوجوان "میٹرنٹی ہاسپٹل" کے ویٹنگ روم میں
بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ قریب ہی ایک اور شخص صوفے پر
بیٹھا اطمینان سے اخبار چاٹ رہا تھا، دونوں ہی ایک
ہی خوشخبری کے منتظر تھے، مگر ایک مضطرب تھا دوسرا مطمئن،
مضطرب نوجوان یقیناً پہلی بار "باپ" بننے کے مرحلے سے گزر رہا
تھا اس لیے بے چین تھا جبکہ دوسرے شخص کا اطمینان اس بات
کی دلیل تھا کہ "عادی مجرم" ہے چنانچہ اس مصرع کی تعبیر بنا
ہوا تھا۔ ع

مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

تھوڑی دیر بعد نرس نمودار ہوئی۔ مضطرب نوجوان
لپک کر اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ نرس نے مسکرا کر خوشخبری
سنائی۔ "مبارک ہو! مسٹر چوناوالا، آپ کی بیوی کے
جڑواں بچے پیدا ہوئے ہیں ——"

ڈبل دھماکے کی خبر سن کر چوناوالا کا اچھا خاصا چہرہ چونے
کی طرح سفید رنگ "کتھئی" ہو گیا، اسے شاید یہ توقع ہرگز
نہیں تھی کہ پہلے ہی "راؤنڈ" میں مسز چوناوالا اسے ڈبل
[illegible] لگا دے گی —— مطمئن شخص نے اس کی یہ
دگرگوں حالت دیکھ کر چوٹ کی —— "ایک ساتھ دو بچے
یعنی یک نہ شد دو شد۔ اتنا کہہ کر اس نے ایک زوردار
قہقہے کا اسٹارٹ لیا ہی تھا کہ نرس نے اسے ٹوک دیا۔

"مسٹر کانچ والا جن کے اپنے گھر شیشے کے ہوں
وہ دوسروں پر پتھر نہیں پھینکتے۔" نرس نے فلمی اسٹائل
میں یہ ڈائیلاگ ارشاد فرمانے کے بعد اصلی بم پھینکا:
"مسٹر چوناوالا کی بیوی نے تو صرف دو ہی بچے پیدا کیے
ہیں، آپ کی بیوی نے ایک ہی کھیپ میں آپ کو ایک
ساتھ چار چار لڑکیوں کا باپ بنایا ہے —— "

اس دھماکو انکشاف پر چوناوالا نے جواباً چوٹ کی
"گویا یک نہ شد چہار شد —— !" —— بے چارے کانچ والا
کے وجود میں ایسا "چھناکا" ہوا کہ ہوش حواس، تاب و تواں
ایک ایک کر کے "غائب شد" ہو گئے —— !

کہاوت ہے کہ جہاں ایک سے دو برتن اکٹھے ہوں
وہاں ٹکراؤ ناگزیر ہو جاتا ہے، یہ اور بات کہ اس ٹکراؤ
کے نتیجے میں عموماً برتنوں کو کم سے کم اور شوہر نامدار کو زیادہ
سے زیادہ نقصان پہنچتا ہے۔ ہمارے پڑوسی شری
چرونجی لال کشمش اس کی زندہ مثال ہیں، بے چارے
آئے دن اپنی دھرم پتنی کی "ڈسکس تھرو پریکٹس"
(Discuss Throw Practice) کا نشانہ
بنتے رہتے ہیں، چنانچہ اکثر یہ کہتے ہوئے پائے گئے ہیں
"اگر اوپر والے کو میری موجودہ پتنی کے تعلق سے کوئی
"کمپرومائز" (Compromise) نہیں کرنا تھا تو کم از کم
مجھے اس زمانے میں پیدا کیا ہوتا جب لوگوں کو "زرہ بکتر"
پہننے کی آزادی حاصل تھی۔" موصوف کا خیال ہے کہ زرہ
پانی پت کی جنگ سے زیادہ روزمرہ کی خانہ جنگی کے لیے
مفید ہے، اور اس کی ایجاد یقیناً بیوی کے ستائے کسی مظلوم
شوہر ہی نے کی ہے۔
شری مان چرونجی لال کشمش کی یہ "دُردشا" کیا

کہ ہم ان نوجوانوں کو جو تاحال کنوارے ہیں بغیر فیس کے یہ مشورہ دینے کی جسارت کرتے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو کسی صورت ایک سے دو نہ ہوں" اور اگر غلطی سے یک نہ شد دو شد ہو گئے تو کوشش اس بات کی کریں کہ پھر سے ایک ہو جائیں، خیال رہے کہ یہ کوشش جوانی ہی میں بارآور ہونی چاہیئے ایسا نہ ہو کہ جوانی کی کوشش کا "پھل" بڑھاپے میں ہاتھ لگے جبکہ نہ تو منہ میں دانت باقی رہتے ہیں نہ پیٹ میں آنت، ـــــ حال ہی میں ایسے ہی ایک بوڑھے جوڑے سے ہم مل چکے ہیں، واقعہ یوں ہے کہ ہم ایک ہوٹل میں، ایسی میز پر بیٹھے تھے جو "فیملی کیبن" سے لگی ہوئی تھی چنانچہ کیبن کے اندر ہونے والی گفتگو صاف سنائی دے رہی تھی، پہلے پوپلی مردانہ آواز ابھری۔

"تمہیں میرے سر کی قسم، بیگم پہلے تم خاصا تناول فرماؤ ـــ!"

جواب میں پوپلی زنانہ آواز سنائی دی۔ "نہیں میرے سرتاج تمہیں میری جان کی قسم پہلے تم کھاؤ ـــ!!" اس کے بعد کافی دیر تک "پہلے آپ، پہلے آپ" کی تکرار ہوتی رہی۔ پھر اچانک بڑے میاں کی فیصلہ کن آواز ابھری "ایک ترکیب آئی ہے ذہن میں، پہلے میں تمہیں ایک نوالہ کھلاتا ہوں اپنے ہاتھ سے پھر تم مجھے ایک نوالہ کھلاؤ۔ اس طرح ہم دونوں ایک ساتھ "خاصے" سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں ـ!!" پھولی ہوئی سانسوں کی لے پر ہونے والی اس گفتگو اور پوپلی آواز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ بوڑھا جوڑا قبر کے دہانے تک پہنچ چکا ہے لیکن اس کے باوجود "باہمی محبت" میں کمی نہیں آئی ہے۔ ان کی ایسی ہی باتیں سن کر اس جوڑے پر رشک ہونے لگا۔ جیسے ہی دونوں میاں بیوی لکڑی ٹیکتے ہوئے کیبن سے [illegible] ہم نے ان کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ "میں آپ [illegible] کی بے لوث محبت کو سلام کرتا ہوں، عمر ڈھلنے [illegible] تو میاں بیوی اکثر ایک دوسرے کو کھانے [illegible] اور آپ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ سے نوالے [illegible] کھلاتے ہیں، آفرین ہے ـــ" بڑے میاں نے [illegible] بُرا سا منہ بنا کر پوپلے منہ سے جواب دیا۔

"تمہیں شاید غلط فہمی ہو گئی برخوردار [illegible] نہیں مجبوری ہے، دراصل ہم دونوں کے [illegible] "بتیسی" ہے ـــ!" اتنا کہہ کر بڑے میاں نے [illegible] کوٹ کی جیب سے مصنوعی دانتوں کا ایک عدد [illegible] نکال کر دکھایا اور ہم تصویرِ حیرت بنے اس [illegible] کے بارے میں سوچتے رہے جو مصنوعی دانتوں [illegible] میں سمٹ آئی تھی، اب تک تو بتیس دانتوں [illegible] صرف زبان ہوا کرتی تھی، اب محبت کی شامت [illegible] بھی دانتوں کے شکنجے میں لے آئی ہے، بلکہ [illegible] ابتدا میں دو اجنبی ازدواجی بندھن میں بندھتے ہیں تو اس بندھن کو محبت کا نام دیا جاتا ہے لیکن [illegible] محبت کی جگہ مجبوری لے لیتی ہے، مجبوری جس کا دوسرا نام ہے مصنوعی بتیسی ـــ خیر یہ بھی غنیمت ہے مشرقی ممالک کے جوڑے کسی نہ کسی بہانے ایک [illegible] بندھے تو رہتے ہیں جبکہ مغربی ممالک کے جوڑے [illegible] ہے اس مجبوری سے بھی محروم ہیں بلکہ ازدواجی زندگی جو کبھی ایک عمر پر محیط ہوا کرتی تھی اب مغربی معاشرے میں اس کا عرصۂ حیات اس قدر تنگ ہو گیا ہے کہ عمر [illegible] کا ساتھ، منٹوں اور سکنڈوں کے ساتھ میں تبدیل ہو گیا

ہے۔ تاہم بعض مغربی جوڑوں کی ازدواجی زندگی کی مدت بھی قدر طویل ضرور ہوتی ہے لیکن اس طوالت کی وجہ باہمی محبت نہیں بلکہ وہ زائد مصروفیات ہیں جن میں یہ جوڑے اس قدر اُلجھے ہوتے ہیں کہ میاں بیوی ہفتوں بلکہ مہینوں ایک دوسرے سے نہیں مل پاتے اور ظاہر ہے ایک ساتھ رہنے کے باوجود جب میاں بیوی مل ہی نہ پائیں تو پھر یک نہ شد دو شد والی تکرار کا سوال پیدا ہوگا اور نہ ہی ازدواجی تعلق ختم شد ہوگا گویا تعلق برقرار رکھنے کے لیے بے تعلقی پہلی اور آخری شرط ہے ایسے بے تعلق جوڑوں کے بارے میں اکبر الٰہ آبادی برسوں پہلے فرما گئے ہیں ؂

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذب ہیں
حجاب ان کو نہیں آتا، انھیں غصہ نہیں آتا

یک نہ شد دو شد کا یہ سلسلہ بڑا دراز ہے، گھریلو معاملات، ادب، سیاست، مذہب کوئی بھی شعبہ اس کی دسترس سے محفوظ نہیں، ایک بار ایک مولانا اپنے واعظ میں لوگوں کو عذابِ قبر سے ڈرا رہے تھے کہ لوگو اس وقت سے ڈرو جب تمہارا مُردہ جسم قبر کی تہوں میں دفنا دیا جائے گا، پھر تمہاری پُرسش کو منکر نکیر پہنچیں گے۔" منکر نکیر کے حوالے پر مجمع میں سے کسی نے بے ساختہ کہا۔ "یعنی ایک ساتھ دو فرشتے ہمارا انٹرویو لیں گے، گویا قبر میں بھی یک نہ شد دو شد۔!!"

بات خود بخود قبر اور عذابِ قبر تک پہنچ گئی ہے تو ذرا اور آگے بڑھیں ــــ ایک مظلوم شوہر مرنے کے بعد جنت کے دروازے تک پہنچ گیا، متعلقہ فرشتے سے داروغۂ جنت سے سفارشی لہجے میں کہا۔ "بے چارا بڑا دُکھی پریم نگری ہے، بیوی کا ہر ستم اس نے چپ چاپ برداشت کیا ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی نیکی ہے جس کی بنا پر اسے جنت میں داخل کیا جاسکتا ہے ــــ!!" اس سے پہلے کہ داروغۂ جنت کوئی فیصلہ صادر فرماتے، شوہروں کی لمبی چوڑی کیو میں سب سے پیچھے کھڑے ہوئے ایک عدد شوہر صاحب کیو کو توڑ تاڑ کے آگے بڑھ آئے اور داروغہ سے بولے۔

" داروغہ صاحب! محض بیوی کے ستم سہنے کی وجہ سے اگر اسے جنت میں داخل کیا جا رہا ہے تو اس سے پہلے مجھے جنت میں داخل کیجیے کیونکہ میں نے ایک ساتھ دو، دو بیویوں کے دُہرے ستم سہے ہیں۔"

اس کی عرض سُن کر داروغۂ جنت نے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔ "نادان، جنت میں بے وقوفوں کا داخلہ ممنوع ہے، ایک بار غلطی کرنے کے باوجود تجھے عقل نہیں آئی اور تو نے دوبارہ وہی غلطی دہرائی، تیری اسی ایک نہ شد دو شد، والی حماقت کے سبب تجھے دوزخ کا ایندھن بننے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔"

یہ تو خیر ایک لطیفہ تھا لیکن طرفہ تماشہ ملاحظہ فرمائیے یک نہ شد دو شد کی جس حماقت پر آپ ہم سبھی ایک دن پکڑے جائیں گے وہ سلسلہ شروع بھی تو اسی جنت سے ہوا۔ کتنے اچھے دن تھے جب بابا آدم بالکل اکیلے تھے نہ تو زندگی کے جھمیلے تھے نہ دکھوں کے ریلے تھے لیکن جیسے ہی ایک سے دو ہوئے اپنے گھر سے بے دخل ہوئے اور پھر بات یک نہ شد دو شد پر ہی ختم نہیں ہوئی بلکہ از آدم تا ایں دم زندگی کا کاروان یک نہ شد دو شد کی گردان کرتا بڑھتا چلا آرہا ہے اور جب تک دم میں دم ہے بڑھتا ہی رہے گا۔!!

ڈاکٹر غیاث صدیقی
حیدرآباد

ایک شاگرد شاعر

میں اپنے مطب میں بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ لنچ کے بعد قیلولہ میرے لیے ضروری ہے لیکن ایک نظم جس نے کو تیار تھی
ذہن میں قلم اور میز پر فل اسکیپ سائز کا پیڈ رکھا تھا۔ مطب کے دروازے پر کھٹکا ہوا۔ احمد ندیم قاسمی کا یہ شعر ذہن میں
ابھر نکلا:

خلعت جو ہو تری آواز پا کا تھا
دیکھا نکل کے گھر سے تو جھونکا ہوا کا تھا

یہاں تو ایک آٹو رکشا سے خوشبو کے جھونکے چل رہے تھے۔ پوچھا۔ "کون ہے۔" کہا۔ "مریضہ" "اندر آئیے" کہہ کر میں
مطب میں واپس آ گیا۔ بش شرٹ کا کالر درست کیا۔ نظم والے پیڈ کو میز کی ایک جانب سرکا دیا۔ اور اسٹیتھو سکوپ
سنبھال کر بیٹھ گیا۔

ایک بجلی چمکی۔ ایک نغمہ گونجا۔ "تسلیم" میں ہکلایا۔ "تشریف رکھیے"۔ اب جو سر سے پاؤں تک سرسری جائزہ لیا
تو محترمہ قطعاً مریضہ نہیں لگ رہی تھیں بلکہ میں "نروس بریک ڈاؤن" کے مرض میں مبتلا ہو چکا ہوں۔ سیکڑوں مریضاؤں کو
حسین سے حسین بد صحت سے بد صورت، پڑھی لکھی فیشن ایبل سے لے کر جاہل اور [illegible] نظروں سے
دیکھ چکا ہوں۔ لیکن یہاں صحت ہی کچھ اور تھی جیسے فراق ؎

سر سے پا تک بھری ہوئی جیسے

ابر [illegible] ایسا لباس، ایسا میک اپ، جھمکے، جھانجھن، سب مل کر ایک [illegible] ؎

ساغر کیف بدن [illegible] کا سمندر [illegible]

پوچھا "محترمہ آپ کو کیا تکلیف ہے؟" جواب ملا۔ "دل میں درد ہوتا ہے۔" [illegible] بلڈ پریشر دیکھا۔ معمول سے
کچھ زیادہ ہی تھا۔ اب اسٹیتھو سکوپ سے دل کا جائزہ [illegible]

حالات۔ ساری بلاغت کی وہ ذہین ہماری عزیز شاگرد شاعرہ، پھولوں سے لدی شاخ گل لجاتی جا رہی ہے۔ ہر دو منٹ سے میں کی استدعا کہ ہم اس کے برابر میں بیٹھیں۔ لیکن ہم اس کے روبرو بیٹھنے پر مصر۔ سامنے بیٹھنے میں افادیت یہ ہے کہ غزل کے منہ سے غزل سن سکتے ہیں آواز تو تھی ہی اپنی۔ نقادوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ یہ سب نقاد میرے جانی دوست تھے۔ کھانے پینے اور آمد و رفت کے اخراجات کے علاوہ ایک ایک سو روپے لے کر آئے تھے۔ کسی نے کہا محترمہ سارے ہندوستان میں منفرد آواز ہیں۔" کسی نے کہا: "جدیدیت کی علم بردار ہیں۔" کسی نے کہا محترمہ اردو کلاسیکی سرمایے کی حقہ نواز ہیں۔ کسی نے کہا: "ہند و پاک کی ساری شاعرات میں سب سے زیادہ سماجی شعور صرف محترمہ کے ہاں ملتا۔" اس جملہ پر ایک جدیدیت کے حامی نقاد بگڑ گئے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ محترمہ نے ایک سو ہار پھولوں کے بنوائے تھے۔ یہ کام میرے ایک شاعر دوست بہبود داؤد نے انجام دیا تھا۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے مختلف انجمنوں اور شخصیتوں کی جانب سے صرف پچھتر ہار پہنائے۔ باقی رقم جیب میں رکھ لی۔ جلسہ برخواست ہوا تو محترمہ نے میرے کان میں چپکے سے کہا ڈاکٹر صاحب آپ کے دوست نے پچیس ہاروں کے پیسے بچا لیے۔ میں ابتدا ہی سے ہاروں کو گن رہی ہوں۔ آج خوشی کے موقع پر خاموش ہو جائیے۔ ان کا شکریہ ادا کیجیے۔ پچیس ہاروں کی رقم اور ایک مسکراہٹ انعام میں دے دیجیے۔! اب محترمہ کے قلم کے منہ کو خون لگ گیا تھا۔ ارادہ دوسرا مجموعہ شائع کرنے کا ہوا۔ ایک سے ان کی تسکین کیا ہو سکتی تھی۔

میں نے سمجھایا دخفہ دیجیے۔ اس قدر جلد بازی ٹھیک نہیں۔ آپ پہلے مجموعے کی غزلوں کو صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنے کی مشق جاری رکھیے۔ جب کامل عبور ہو جائے تو میں ایک دوسرا مجموعہ کلام نذرانہ میں پیش کر سکتا ہوں۔ میں بھی تھک چکا ہوں۔ آپ بھی تھک چکی ہیں۔ ہم پہاڑی کی چوٹی سر کر چکے ہیں۔ اب سلامتی کے ساتھ دوسری جانب اترنا ہے۔ چڑھنے سے زیادہ اترنا مشکل کام ہے۔ ہر لمحہ پاؤں پھسلنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ قدم سنبھال کر رکھنا ہوگا۔ احتیاط کا تقاضہ یہی ہے کہ احتیاط کو بالائے طاق رکھنے کی عمر تو گئی۔

فی الحال وہ مان گئی ہیں۔ اب بغیر غزل کے بھی چیک وصول ہوتے ہیں۔ مجھے خود جا کر کسی نہ کسی طرح حاصل کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اس کار لطیف کو میں نے عام نہیں کیا ہے۔ ایک ہونہار شاگرد صابر ہوں اور وہ بھی۔ یک و گیر دھکم گیرت کی قائل ہیں۔ جنھیں کتنے ہی شعراء ان کی قربت کے آرزو مند ہیں۔ کبھی تمکنت سے کبھی محبت سے قدرت طلب کر کے دبوچ جاتی ہیں۔

شمیم ناصح
ورنگل

پانی مرگیا

چاروں طرف سے آوازیں بلند ہو رہی ہیں کہ پانی مرگیا —— پانی مرگیا ہے —— ہم سوچ رہے ہیں کیا واقعی پانی مرگیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ پانی مر نہیں سکتا بلکہ یہ تو مرنے والوں کے بھی کام آتا ہے۔ اگر یہ مان بھی لیں کہ پانی مرگیا ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کس کی آنکھ کا پانی مرگیا۔

کتنے افسوس کی بات ہے کہ ادیبوں اور شاعروں کو پانی جیسے موضوع پر لکھنا پڑ رہا ہے۔ ممکن ہے بعض شعراء و ادباء اس بات پر خوش ہوں کہ انہیں ایک دلچسپ عنوان ہاتھ لگ گیا ہے۔ لیکن ہماری تو یہ حالت ہے کہ پانی پر قلم اٹھاتے ہوئے شرم سے پانی پانی ہوئے جا رہے ہیں۔ ایک ایسے دور میں جبکہ کوئی بھی شرم سے پانی پانی نہیں ہوتا ہمارا یہ فعل لوگوں کی نظروں میں انتہائی مضحکہ خیز ہے۔ اس کے باوجود ہم تو ہر چھوٹی بڑی غلطی پر، ہر چھوٹی بڑی برائی پر، ہر چھوٹے بڑے گناہ پر جو ہم سے سرزد ہوتے رہے! ہمیشہ شرم سے پانی پانی ہوتے رہے۔ اور ہوتے رہیں گے۔ ہمارے ایک قریبی دوست نے کہا کہ دیکھو بھئی تمہاری اس عادت سے میں بہت نالاں ہوں کہ تم موقع بے موقع بات بے بات پر شرم سے اتنا پانی پانی ہو جاتے ہو کہ مجھے تو خدشہ لاحق ہو گیا کہ اگر تمہاری یہی حالت رہی تو مستقبل قریب میں تم پبلک نل کی حیثیت حاصل کر لو گے" دوست کی اس بات پر ہم چونک پڑے اور ہم نے کہا" تم نے تو ہم پر طنز کیا مگر باتوں باتوں میں پانی کی قلت کے مسئلہ کا حل پیش کر دیا۔" ہمارے اس جواب پر ہمارے دوست بھی چونک پڑے۔ پوچھے وہ کیسے" ہم یوں گویا ہوئے "ابھی آپ نے کہا کہ ہم موقع بے موقع بات بے بات پر شرم سے اتنا پانی پانی ہو جاتے ہیں کہ آپ کو خدشہ لاحق ہو گیا کہ کچھ ہی دنوں میں ہماری حیثیت پبلک نل کی ہو جائے گی۔ ہمارے سمجھنے سے دماغ میں یہ بات آئی ہے کہ اگر ہر آدمی ہماری طرح ہو جائے تو سماج کا ہر فرد اگر مکمل طور پر پبلک نل نہ بن سکے تو بعض آدھا پبلک نل اور بعض پاؤ پبلک نل ضرور بن جائیں گے" اگر اتنا بھی نہ ہو سکا تو اپنی ضرورت کے دو چار گھڑے تو انہیں ضرور میسر آ جائیں گے۔ جناب ہمیں تو شکایت ہے کہ آج کے دور میں کوئی بھی فرد کسی بھی بات پر شرم سے پانی پانی نہیں ہوتا۔ اس بات پر نہ صرف ہمیں بلکہ پانی کو بھی بڑا غصہ آیا۔ اس نے بھی ایک چال چلی وہ یہ کہ اپنا منہ چھپا لیا اور اچھے اچھوں کے چھکے پانی کر ڈالے۔

ہماری زندگی پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات واضح ہوگی کہ ہماری زندگی از ابتدا تا انتہا تلاش ہی تلاش اور تلاش میں گذرے گی۔ بچپن میں خوبصورت کھلونوں کی تلاش تھی۔ ذرا بڑے ہوئے تو دوست احباب کی تلاش شروع کی۔ تھوڑے باشعور ہوئے تو علم (علم سے یہاں مراد کم سے کم کلرک بنانے والا علم) اور اہل علم کی تلاش شروع کی۔ مطلوبہ علم سے فارغ ہوئے تو تلاش روزگار کے چکر میں پھنسے، کئی برسوں کی لگاتار دوڑ دھوپ کے بعد ادھر سے بے فکری نصیب ہوئی تو ایک عدد محبوبہ کی تلاش میں لگ گئے۔ جب اس سے بھی فرصت ملی تو ایک عدد بیوی کی تلاش کر ڈالا اب تو صاحب اولاد ہیں۔ اب بہوؤں اور دامادوں کی تلاش میں سرگرداں ہیں اور جب قطعی بڑھاپا ہوگا تو دو گز زمین کی تلاش کریں گے یا نہیں تو مرنے کیلئے چلو بھر پانی کی تلاش میں مصروف ہو جائیں گے اور کیا تعجب کہ چلو بھر پانی کی تلاش میں ختم ہو جائیں۔ اس طرح ہم گویا سرتا پا تلاش ہیں۔ ہم نے اتنی چیزوں کی تلاش کی ہے کہ اب ہماری حالت قابل رحم ہو چکی ہے۔ اس کے باوجود ہم پر تلاش آب کا بوجھ لاد دیا گیا ہے جو ہماری قوت تلاش کیلئے ایک زبردست چیلنج بن چکا ہے یوں لگتا ہے جیسے ہمارے جذبۂ تلاش کا استحصال کیا جا رہا ہو۔ ان تمام چیزوں کی تلاش نے ہمیں ادھ موا کر دیا تھا۔ اب تلاش آب کے سلسلے میں ہماری یہ کیفیت ہو گئی ہے کہ ہم دوست احباب کی محفل میں موجود ہوتے ہیں اور دوست احباب ہمیں تلاش کرتے پھرتے ہیں۔

پانی کی تلاش کیلئے ہمیں کتنی خفت اٹھانی پڑی بس سمجھ لیجئے کہ ہمارا دل ہی جانتا ہے۔ ہماری حالت اس اُلّو کے پٹھے عاشق کی سی ہو گئی جسے نہ دن کو چین میسر آتا ہے نہ رات کو نیند آتی ہے گذشتہ چند دنوں سے یہ کیفیت ہو گئی ہے کہ جہاں دس بارہ آدمیوں کا مجمع دیکھا تو فوری گمان ہوا کہ یہاں کوئی پانی کا چشمہ یا نل ہوگا تو جناب بعض مرتبہ تو یوں ہوا کہ آدمیوں کی بھیڑ دیکھی تو گھڑا لئے گھس پڑے تو معلوم ہوا کہ ایک سیاسی جلسہ ہو رہا ہے جس میں کوئی لیڈر صاحب پانی پر دھواں دھار تقریر کر رہے تھے اور لوگ بڑے انہماک سے سنے جا رہے تھے۔ لوگوں کو بڑی بری لت ہے کہ وہ بڑے انہماک سے تقریر سنتے ہیں خواہ ان کے آگے چوہے اور گھبارے والی کہانی ہی کیوں نہ دہرائی جائے۔ ایک دن ہاتھ میں مٹکا لٹکائے پانی کی تلاش میں نکل پڑے اچانک ایک مجمع پر نظر پڑی ہم نے دل میں کہا چلو اچھا ہوا زیادہ دوڑ دھوپ نہیں کرنی پڑی۔ مگر جب مجمع میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ مشاعرہ ہو رہا ہے اور تمام شعراء نے پانی پر طبع آزمائی کی ہے۔ پھر ایک دن اسی حالت میں ایک بھیڑ میں گئے تو ایک صاحب عوام کو لیکچر پلا رہے تھے۔ یہ شاید ڈاکٹر ہیں۔ وہ بتلا رہے تھے کہ ایک آدمی کو اوسط درجے کی صحت کی برقراری کیلئے دن میں کتنے گیلن پانی چاہئے۔ انسانی جسم میں پانی کی کمی سے کس قسم کے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ زیادہ تفصیلات میں گئے تو معلوم ہوا کہ "انسانی زندگی میں پانی کی اہمیت" کے زیر عنوان ایک سمپوزیم منایا جا رہا ہے۔ ہم نے سوچا پھر کوئی ایسی دعوت جانے کی ضرورت ہی ہے۔ لہٰذا

اس کو سیاسی مسئلے کا روپ دیکر اپنی سیاست کی دکان چمکانا چاہتا ہے۔ شاعر اس موضوع پر اشعار قلمبند کرتے ہوئے اپنی قابلیت کا لوہا منوانا چاہتا ہے۔ ڈاکٹر یا سائنسداں پانی کی افادیت پر ایک پُر مغز معلومات افزاء لیکچر پلانا چاہتا ہے۔ لیکن کوئی ایک گلاس پانی نہیں دیتا۔

ایک دن کا واقعہ ہے کہ ہم ہاتھ میں حسب معمول گھڑا لئے دربدر کوچہ بہ کوچہ پھر رہے تھے لیکن پانی کا ایک قطرہ کہیں نہ ملا۔ اس دن یقین مانیئے ہمیں اپنے انسان ہونے پر بڑی دیر تک غصہ آیا۔ ہم سوچنے لگے کاش ہم انسان کی بجائے اونٹ ہوتے اور کئی دن کا پانی جمع کر لیتے تو کم از کم ہمیں ہر روز کے اس بے تکے چکر سے تو نجات حاصل ہو جاتی۔ اس دن ہم نے دیکھا کہ راستے میں دو آدمی یوں محوِ گفتگو تھے۔ "پانی کیا ہو گیا" دوسرے نے جواب دیا "پانی ہوا ہو گیا" ان الفاظ کا ہمارے کان میں پڑنا تھا کہ ہم نے کہا "معاف کرنا آپ کی گفتگو میں مخل ہو رہا ہوں۔ اجی جناب! اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ پانی ہوا ہو گیا ہے تو پھر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہوا پانی کیوں نہیں ہو سکتی؟" اپنے اس دانشمندانہ سوال پر ہم خود بڑی دیر تک محظوظ ہوتے رہے۔ پہلے آدمی نے دوسرے سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "حد ہو گئی ——— آپ" ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے "اردو کا ایک معمولی سا محاورہ بھی سمجھ نہیں سکتے" ہم نہایت ہی شرمندگی کے ساتھ سر جھکا کر آگے بڑھ گئے۔ ہم نے دل میں کہا یہ بے فکرے لگتے ہیں۔ محاوروں کا ریہرسل کر رہے ہیں۔ ذرا آگے بڑھے تو ایک صاحب دوسرے صاحب سے کہہ رہے تھے۔ "بھئی میرا اتنا کہنا تھا کہ اُس پر گھڑوں پانی پڑ گیا" اور ہمارا اتنا سننا تھا کہ ہم ششں و پنج میں پڑ گئے۔ ہماری نظر اچانک ہمارے جسم پر پڑی تو جسم سوکھی ہوئی گھاس معلوم ہو رہا تھا۔ گویا پانی کا طلب گار ہے۔ ہم اسے پچھلے کئی دنوں سے کسی پیشہ ور لیڈر کی طرح بہلا رہے تھے۔ ہم نے سوچا چلو اچھا ہوا اِن صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ اب ہمارے جسم کی پیاس بجھ جائے گی۔ پھر اچانک خیال آیا کہیں یہاں بھی کسی محاورہ کی شوٹنگ تو نہیں ہو رہی ہے۔ دل نے کہا نہیں دونوں حضرات کی صورتیں سیدھے سادھے الفاظ کی سی ہیں۔ ٹیڑھے میڑھے یا پیچیدہ محاورہ کی سی نہیں۔ وہ حضرت فرشتہ لگ رہے تھے۔ نہ جانے انہوں نے پانی کے اس قلت کے دور میں کتنے جسموں کو نہلایا۔ وہ تو کوئی چلتا پھرتا واٹر ٹینک ہیں۔ ہم نے کہا ایسے مواقع بار بار نہیں آتے' موقع کو غنیمت جانا اور اُن سے دست بستہ التجا کی "قبلہ! ایک ننھی سی خواہش خاکسار کو بھی آپکے اعلیٰ کردار سے توقع کرتا ہوں کہ پوری کریں گے۔ انہوں نے بزرگانہ لہجے میں کہا "فرمائیے بابا" اتنا کہنا تھا کہ ہم کہنے لگے۔ "آپ ہمیں بھی کوئی ایسی بات کہہ دیجئے کہ ہم پر گھڑوں نہ سہی ایک آدھ گھڑا ہی پانی پڑ جائے۔ اور یہ بنجر جسم تھوڑا سیراب ہو جائے۔ لہٰذا اس خشک جسم پر رحم کھائیے بندہ آپکے حق میں تا زیست دعا گو رہے گا" ہم بالکل فقیر کی طرح گڑگڑانے لگے۔ اسی بیچ انہوں نے ہمارے سارے جسم کا جائزہ اس انداز سے لیا کہ ہمیں محسوس ہوا جیسے وہ ہماری بات کی تصدیق چاہ رہے ہوں۔ ان کے

انہوں نے کہا "تیری بیٹی رامو دادا کے ساتھ بھاگ گئی۔" ہم نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے پوچھا
"کب؟" "جواب ملا" "آج صبح" ہم نے کہا "اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ وہ بھاگ گئی۔ لڑکے کی تلاش
نے حلیہ بگاڑ دیا ہے۔ اب اس کے لیے "وٹ" کہاں تلاش کرتا پھرتا۔ اگر صرف ور تلاش کرنا ہوتا
تو کر بھی لیتا۔ لوگ کہتے ہیں تلاش کرنے پر خدا بھی مل جاتا ہے کیا مجھے ور نہ ملتا مگر یہاں معاملہ تلاش
کا نہیں ہے۔ خریدنے کا ہے۔ میں کہاں سے خرید سکتا۔ اگر قوت خرید اتنی بڑھی ہوئی ہوتی تو پانی کی
تلاش میں یوں مارا مارا کیوں پھرتا خرید نہیں لیتا۔ اچھا ہوا تو چلی گئی —— اپنے مجبور باپ کی پریشانی
سمجھ گئی۔ تو بڑی ہوشیار اور بہت سمجھدار ہے بیٹی" اس کے بعد ہم نے اپنے جسم کا جائزہ لیا تو جسم
وہی ریگستان بنا ہوا تھا ہم نے کہا "اجی جناب! آپ کی اس بات پہ گھڑوں پانی تو کجا قطرہ پانی بھی نہیں
پڑا کوئی دوسری بات کہئے" انہوں نے غصہ سے "بے غیرت کہیں کا! میری اس بات پہ تیری جگہ کوئی
دوسرا ہوتا تو گھڑوں پانی کا کیا سوال، اس پہ دنیا کے سات سمندر پڑ جاتے" "آپ بہت عجیب ہیں پتہ
نہیں کس دور کی پیداوار ہیں" اتنا کہتے ہوئے ہم آگے بڑھ گئے۔

اچانک ہماری نظر ہمارے ایک پرانے رفیق پہ جا ٹکی۔ علیک سلیک کے بعد ہم نے دریافتِ حال
کرتے ہوئے پوچھا: رشید بڑی جلدی میں معلوم ہوتے ہو۔ کیوں بھئی خیریت تو ہے نا۔ انہوں نے
بڑے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ذرا بازار کی طرف جا رہا ہوں۔ گلیسرین لینا ہے" ہم نے کہا "کیا سرکاری
ملازمت چھوڑ کر کسی تھیٹریکل کمپنی میں کام کرنے لگے ہو۔ کیا کہیں ناٹک رچانا ہے" انہوں نے اپنے لہجے میں
تھوڑی افسردگی پیدا کرتے ہوئے کہا "نہیں بات دراصل یہ ہے کہ میرے ایک قریبی عزیز اللہ کو پیارے ہوگئے
پانی کی قلت سے تو آپ بخوبی واقف ہیں۔ اس کی وجہ سے جسم تو جسم میری آنکھیں بھی خشک ہوگئیں۔ اب
آپ ہی کہئے کہ رونے دھونے کا کچھ نہ کچھ سامان کرنا چاہیئے نا

"کسی کی موت پہ کسی کی آنکھ بڑی مشکل سے بھر آتی ہے۔ سب کے آنسو نقلی اور مصنوعی ہوگئے ہیں
اصلی اور حقیقی آنسو تو کم ہی بہتے ہیں۔ ہمارے جذبے، ہمارا خلوص، ہماری دوستی، ہمارا پیار، ہماری محبت
اس صنعتی دور میں ہمارا سب کچھ مصنوعی ہوگیا ہے۔ ہاں اب تو آنسو بہانے کیلئے گلیسرین کا سہارا لینا پڑ رہا ہے
بالکل کسی منجھے ہوئے فلمی اداکار کی طرح رونے کی زبردست ایکٹنگ کرنی پڑ رہی ہے۔" ہم نے ہنستے ہنستے کہا
اور پانی کا وہی پرانا گھڑا ہاتھ میں لئے آگے بڑھ گئے۔

کچھ آگے ہی بڑھے تھے کہ ہمارے ایک عاشق دوست مل گئے۔ ان کے ہاتھ میں پانی کا گھڑا
دیکھا تو ہم نے کہا "کیا شیریں، فرہاد کی آزمائش یوں کر رہی ہے۔ انہوں نے انتہائی مغموم لہجے میں کہا
"اس کی بات مت کرو، سالی نے میرے ساتھ فراڈ کیا۔" ہم نے کہا کیوں بھئی خیریت ہے تو ہے۔ ہوا کیا ہے
"اور کیا ہوتا" لہجے کی پچھلی اداسی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا "میں نے اس کی ہر خواہش پوری کی
اس کی ہر تمنا کو اپنی تمنا جانا سمجھا پسینے کو پانی کی طرح بہا دیا۔ اس کا صلہ میں نے یہ پایا کہ آج ایک گھڑا

پانی مانگا تو سالی نے آنکھیں پھیر لیں۔ ہم نے کہا "صاف صاف کہنا واقعہ کیا ہے۔"
انہوں نے کہنا شروع کیا "سنو! مقصد یوں ہے کہ دو دن سے مکان میں پانی کی بڑی قلت
آج بیٹھے بٹھائے ذہن میں ایک نئی اسکیم آگئی جس پہ میں بہت خوش ہوا۔ اور ہاتھ میں پانی کا گھڑا
اٹھائے سیدھے محبوبہ کے گھر کا رخ کیا۔ وہ پلنگ پہ لیٹی تھی۔ ہم اس پہ جھک پڑے اور آنکھوں
جھانکنے لگے۔ ہماری اس حرکت سے وہ قدرے پریشان ہوگئی۔ اُس نے ہماری اس حرکت کا مقصد
جاننا چاہا تو ہم نے کہا "ایک گھڑا پانی چاہیئے" پھر اُس نے پوچھا "لیکن میری آنکھوں میں کیوں جھانک
ہم نے کہا "پانی دیکھ رہا ہوں" اُس نے منھ پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "ہائے اللہ تم بڑے وہ ہو"
ہم نے کہا "اندھے کو کیا چاہیئے دو آنکھیں۔ میں بھی تمہاری محبت میں اندھا بن چکا ہوں مجھے تمہاری
آنکھیں چاہیئے کیونکہ میں نے پڑھا ہے کہ تمہاری دو آنکھیں دراصل دو آنکھیں نہیں دو خوبصورت جھیلیں ہیں
میں تمہاری آنکھ کی جھیل سے روز پانی لیا کروں گا۔" میری آنکھیں خشک ہو گئیں۔ اس نے ایک خاص
سے کہا "تم پہ یہ انکشاف دیر سے ہوا کہ میری آنکھ بھی جھیل ہے تم سے پہلے ہاشم ___ شکیل ___ ا
نہ جانے کتنے لوگ میری آنکھ کی جھیل سے سیراب ہوتے رہے۔ تم ہی کیوں؟ اب تمہارے لئے کیا بچا
میں نے غصہ سے کانپتے ہوئے کہا "سالی تو محبوبہ ہے ___ یا ___ جو سب کو اپنی آنکھ کی جھیل
سے سیراب کرتی ہے اس نے انتہائی ڈھٹائی سے جواب دیا میں ماڈرن محبوبہ ہوں ___ اچھا میں چلا
ملتا ہوں" اتنا کہتے ہوئے عاشق صاحب نے مصافحہ کیا اور آگے بڑھ گئے۔

ہماری نظر ایک لمبی کیو پہ پڑی۔ کچھ لوگوں کے ہاتھوں میں پانی کے گھڑے دیکھ کر جان میں جان آ
لیکن کچھ لوگ خالی ہاتھ بھی تھے۔ دل کو یقین ہو گیا کہ اب مہاراج پانی کے درشن ہو جائیں گے۔ کیو بڑی
کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی لیکن کوئی بندۂ خدا پانی کا گھڑا کاندھے یا سر پہ اٹھائے واپس نہیں جا
ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اب سوچنے کی سکت بھی نہ رہی۔ ہم نے زیادہ غور کرنا مناسب نہ سمجھا
کھڑے ہوئے صاحب کسی سے پوچھ رہے تھے "یہ واٹر گیٹ اسکینڈل کیا بلا ہے؟" دوسرے صاحب ا
قیمتی سیاسی معلومات کا اظہار یوں کر رہے تھے۔ پانی کی قلت کا دور ہے۔ سب اچھی طرح جانتے
کہ اس سال بارش نہ ہونے کے باعث پانی کا کال پڑا ہے۔ مگر اپوزیشن پارٹیاں جن کا کام شور م
ہے کہتے ہیں درحقیقت پانی کا کوئی کال نہیں ہے بلکہ چند افراد نے پانی کا ذخیرہ کر لیا ہے اس مقام
جہاں پہ پانی کا ذخیرہ کیا گیا اُسے واٹر گیٹ کے نام سے پکارا جاتا ہے اور اس حرکت کو اسکینڈل کہ
رہا ہے واٹر گیٹ اسکینڈل" دوسرے صاحب نے جواب دیا۔ "خوب تشریح کی۔ روزنامہ اخبار میں پ
پڑھ کر پریشان ہوا جا رہا تھا کہ آخر یہ بلا کیا ہے۔ یہ سیاسی اصطلاحات بھی بڑے غضب کی ہوتی
عام آدمی کی سمجھ میں بالکل نہیں آتیں" باتوں باتوں میں ہماری باری آئی۔ قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ ہم
نل کے پاس نہیں بلکہ سینما کی بکنگ کی کھڑکی کے پاس ہیں۔ ہمیں یوں لگا جیسے ہم بھی کسی اسکینڈ

مشہور ہو گئے۔ ہم نے کہا چلیئے دن بھر کی تھکن تو مٹا ڈالیں۔ ایک نچلے درجہ کا ٹکٹ لیا اور تھیٹر میں گھس گئے پکچر ختم ہونے کے قریب تھی کہ ہیروئن نے ایک عریاں قسم کا رقص پیش کیا۔ ہماری پچھلی سیٹ والے صاحب اس رقص پر تبصرہ کرتے ہوئے کہنے لگے "کتنی بے حیائی سے کتنا عریاں رقص پیش کر رہی ہے اس عورت کی آنکھ کا پانی مرگیا" دوسرے صاحب نے کہا "پانی کی قلت اسی وجہ سے ہے۔ اگر عورت کی آنکھ کا پانی نہ مرتا تو کبھی پانی کا کال نہ پڑتا۔"

سنیما ہال سے باہر نکلے تو گھڑا خالی تھا۔ مگر ذہن کا گھڑا بھرا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ "پانی کی قلت اسی وجہ سے ہے۔ اگر عورت کی آنکھ کا پانی نہ مرتا تو کبھی پانی کا کال نہ پڑتا۔"

ڈاکٹر انعام حسین حریف
کراچی

روزوں کا احترام

شہر ہوٹل ہوئے ہیں پردہ پوش
اللہ اللہ احترام خورد و نوش

کھانے پینے کا ہے کیا کیا اہتمام
کیوں نہ ہو، مہمان ہے ماہ صیام

رونق افطار و سحری کوبہ کو
جس طرف دیکھو 'کلو' اور خوشبو

نو بہ نو خیرات کے لنگر کھلے
مانگ کھانے کے نرالے ڈھنگ کھلے

ہر قدم پر وہ فقیروں کا ہجوم
کر بھلا ہوگا بھلا وہ جھوم جھوم

گھر سے باہر منہ پہ روزے کا نقاب
تخلیے میں قورمے، شامی کباب

جب کہیں یکجا ہوئے چند آشنا
ذکر چل نکلا وہیں رمضان کا

اب جو پوچھا مل کے آپس میں حساب
کتنے روزے کھائے بیٹھے ہیں جناب

سر جھکا کر مسکرا کر رہ گئے
کچھ نہ کہنے پر بھی سب کچھ کہہ گئے

کیا کریں دکھا کے دل میں چور ہے
پان سگریٹ کی طلب کا زور ہے

عارضہ پھر اب کے افطاری کا ہے
یہ مہینے ان کی بیماری کا ہے

جیب پر روزہ کشائی بار ہے
روزہ خوری ہی سے بیڑا پار ہے

یعنی مہنگائی نے توڑی ہے کمر
نرخ جا پہنچے ہیں گویا عرش پر

روزہ کھانے کو سفر بھی خوب ہے
سندھ میں خالہ کا گھر بھی خوب ہے

یاد رکھئے گا یہ نسخہ کام کا
قصہ ہے اپنا بھی "نقد" و جام کا

○

غزل

مختار یونس (مالیگاؤں)

نگاہِ ناز یہ کیسا ترا نشانہ ہے
مرے خیال سے عینک تجھے لگانا ہے

تری گلی میں [illegible] کی پڑتا ہے
جنوں کا ایکسٹینشن ہمیں بڑھانا ہے

یوں بجلیاں نہ گرا، دل کا فیوز اڑ جائے
دھڑکتے قلب میں میٹر نیا لگانا ہے

تری اداؤں پہ بھیجا ہے پارسل دل کا
بہت سنبھال کے وی پی تجھے چھڑانا ہے

حسین پلکوں کے سائے میں وادیٔ کہسار
اسی مقام پہ پکنک ہمیں منانا ہے

چلیں گے شان سے ہم عاشقی [illegible]
وفا کی روڈ پہ محمل [illegible]

نہ جانے کتنے محبت [illegible]
کہ ان حسینوں کا جیل [illegible]

تو اپنے دل میں بسا عاشقو [illegible]
مگر یہ سن لے کہ ڈرسٹی [illegible]

جفا کے داؤ سے مختار جیت [illegible]
کراٹے جوڈو کا وہ [illegible]

قصہ ہمارے بیاک ورڈ ہوجانے کا

محمد یوسف مرزکی ایم اے
حیدرآباد

کل ہی کی تو بات ہے۔ نوکری کی چکر میں چھوٹے بڑے چھوٹے سچے صداقتناموں کا ایک پلندہ بغل میں دبائے شہر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک شنٹنگ (Shanting) کرتے پھرتے تھے لیکن کسی نے التفات نہیں برتا تھا۔ یہاں تک کہ اپنا پیدائشی اور رہائشی شہر چھوڑ کر اطراف واکناف کے بھی کئی شہر کھنگال ڈالے مگر کوئی بھی مائی کا لال ایسا نہ ملا جو اس "گوہر نایاب" کو پرکھ سکتا۔ ہم یہ سوچنے لگے تھے کہ تعلیم حاصل کر کے ہم نے اپنے آپ پر بہت بڑا ظلم کیا ہے' خود پر زیادتی کی ہے۔ اور یہ کہ اب ایک آفت زدہ زندگی گذارنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ اگر اسکول ہی نہ جاتے تو اچھا ہوتا۔ آج کسی فٹ پاتھ پر کچھ بیچتے ہوئے یا نیم میکانک بن کر' کم از کم الجھنوں سے آزاد زندگی تو گذار لیتے! لیکن پھر یہ حال تھا کہ جسے کہتے ہیں کہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے۔ یعنی کہیں کے نہیں رہ گئے تھے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد' ہفتے' مہینے' سال یوں ہی گذر گئے۔ لیکن قسمت نے یاری نہ کی اور وہ دن نہ آیا کہ ہم کسی سرکاری یا غیر سرکاری دفتر میں ملازم ہو کر اتراتے پھر سکتے۔ "میٹرک" کے بعد شروع ہونے والی ایک غمناک بلکہ اندوہناک زندگی کے تقریباً آٹھ سال عجیب وغریب خواب دیکھتے گذر گئے۔ بالغ ہونے کے باوجود نابالغوں کے سے انداز میں سوچتے اور احمقانہ خواب دیکھتے تھے۔ ذہن کے ہر گوشہ میں ہر وقت مختلف اقسام کی چھوٹی بڑی نوکریوں ہی کے تذکرے چھڑے رہتے تھے۔ ہر وقت یہی کوشش ہوتی کہ اچھے سے اچھا خواب دیکھیں تاکہ بہتر سے بہتر زندگی گذارنے میں دقتیں نہ ہوں ویسے تو تقریباً ہر نوجوان عمر کے اس حصہ میں قدم رکھتے ہی اس قسم کے خیالات اور تصورات سے دوچار ہوتا ہے۔ لیکن ہمارا معاملہ کچھ الگ ہی تھا۔ سوچنے اور نتائج نکالنے کے انداز اتنے نرالے تھے کہ بسا اوقات ہم خود ہی محسوس کرتے تھے کہ چیزے دیگر است!

مثلاً ایک دن یعنی دن کے اوقات ہی میں کچھ اس طرح کا خواب دیکھا۔ ملاحظہ ہو۔ کسی آراستہ وشائستہ دفتر میں ہم داخل

ہو رہے ہیں۔ صداقت ناموں کا پلندہ بغل میں بدستور موجود ہے۔ ہم ملازمت کے لئے انٹرویو دینے جا رہے ہیں۔ منہ میں سگریٹ دبا ہوا ہے۔ اور ناک سے محدود مقدار میں دھویں کا مدمانی انداز میں اخراج عمل میں آ رہا ہے۔ بال بکھرے ہوئے ہیں۔ پتلون اور شرٹ کی وضع و قطع عجیب اور بے ڈھب یعنی جدید ترین قسم کی ہے۔ ہم اندر داخل ہوتے ہیں۔ قارئین کرام ذرا غور سے ملاحظہ فرمائیں۔

ملازمت کے لئے انٹرویو لینے والے آفیسرس ہمیں دیکھتے ہی ادب کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ "آئیے تشریف لائیے جناب!" ہم یہ سن کر مسکرا دیتے ہیں اور کہتے ہیں۔ "ٹھیک ٹھیک ہے۔ بیٹھئے! فرمائیے مزاج کیسے ہیں آپ لوگوں کے؟"

وہ سبھی یک زبان ہو کر خوش ہوتے ہوئے گویا ہوتے ہیں۔

"بس مہربانی ہے، آپ کی!"

ہم کہتے ہیں "بہت خوب!"

اب انہیں ہمارا انٹرویو لینا ہوتا ہے۔ لیکن وہ کوئی سوال کرنے سے ہچکچا رہے ہیں۔ ہم اُن کی ہمت بڑھاتے ہوئے "اگر کوئی سوال ہے تو پوچھئے اور ——— نڈر ہو کر پوچھئے! میں کوئی لیڈر کا بیٹا تو نہیں ہوں!؟"

اس پر اُن میں سے ایک آفیسر لڑکھڑاتی زبان سے مگر ہمت کر کے پوچھ ہی بیٹھتا ہے۔

"جناب ہمیں جغرافیہ کے سوالات ..... پوچھنے کا ...... ؟"

"ہاں، ہاں - پوچھنے کا کیا؟ آگے بولئے!" ہم قدرے تحکمانہ انداز میں استفسار کرتے ہیں۔

آفیسر ڈرتے ہوئے "پوچھنے کا ..... موقع دیں گے؟"

ہاں ——— بالکل!" ہم کہتے ہیں۔

آفیسر (خوش ہوتے ہوئے کافی ہمت کے ساتھ) "ہندستان کے محل وقوع کے بارے میں کچھ فرمائیے گا؟"

"یہ کیا بے ہودہ سوال کیا ہے آپ نے؟" ہم برہم ہوتے ہوئے پرسش کرتے ہیں "کون نہیں جانتا ہندستان کا محل وقوع؟! یہاں کا ہر ہر بچہ واقف ہے کہ ہندستان آج کل کہاں موجود ہے بلکہ وہ یہ تک جانتا ہے کہ ہندستان کیا ملک ہے ——— اور ——— اور (آواز میں غصہ کے عناصر جھلکتے ہیں) اور یہ کہتے ہوئے جب ہم ان سب پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ سبھی کانوں پہ اپنے ہاتھ رکھے ہوئے ہیں لیکن یہ کہہ نہیں پا رہے ہیں کہ بس کیجئے جناب بس کیجئے! ہمیں ہمارے سوال کا جواب مل گیا۔ اس لئے ہم خود ہی خاموش ہو جاتے ہیں۔ وہ سبھی اٹھ کر ہمیں مبارکباد دینے لگے۔ ہیں مبارک ہو آپ کو اس "ملازمت" کے لئے نامزد کرنے کا ہم ایک عظیم شرف حاصل کر رہے ہیں!"

"ہاں آں ——— ٹھیک ہے ٹھیک ہے" ہم اٹھ لئے بغیر ایک اندازِ بے نیازی سے کہتے ہیں۔

اس طرح ہمیں وہ نوکری مل جاتی ہے ——— اور ——— ایک دم آنکھ بھی کھل جاتی ہے لیکن

...م پر یہ بات آشکارہ ہو جاتی ہے کہ ہم گھر میں ٹوٹی ہوئی آرام کرسی پر چار گھنٹوں سے دراز
...ے ہوئے پائے گئے ہیں۔

تو جناب آٹھ برسوں کی اس کنگال زندگی میں ہم نے زمانے کی ٹھوکروں کے کئی نشیب و فراز
...۔ مانا کہ طبیعت تو ہم نے "شاہانہ" پائی تھی۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ زمانے کا ماحول اس
...لئے سازگار نہیں معلوم ہوتا تھا۔ آخر کار ایک دن ہماری مراد ایک الگ انداز سے ہی بر آئی
...دن ہم ملازمت کے ایکسچینج گئے تھے کہ پھر کسی نوکری کا "عنوان" تلاش کریں اور گھر آکر اس عنوان
...عنوان کے تحت خواب دیکھنے کا سلسلہ شروع کریں کہ ہائے! وقت نے بھی غضب کر دیا کہ اتفاقاً
...ایسے ہم حال شخص سے مل بیٹھے جس کا مشورہ ہم زندگی بھر نہیں بھول سکتے بلکہ وساطت کے
...ہماری اگلی نسلیں بھی کوشش کے باوجود نہ بھول پائیں گی۔ باتوں باتوں میں رسمی گفتگو کے دوران
...نے ہم سے ایک "زندگی ساز" سوال کیا ــــ "اپنا نام پسماندہ طبقہ کی فہرست میں کیوں نہیں
...شریک کروا لیتے؟" کیا کہا؟ ــــ اپنا نام ــــ پسماندہ طبقہ میں؟ ــــ شامل" یکلخت اس کے
...ل سے ہم گھبرا گئے۔

"ہاں ہاں ــــ شریک کروالو!" ستمگر نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"ایں ــــ نام شریک کروانے سے کیا ہم پسماندہ بن جائیں گے؟" ہم نے بے انتہا استعجاب کے
...لم میں پوچھا ــــ

"ارے صرف نام ہی تو پسماندہ ہو جائے گا۔ تم تھوڑے ہی پسماندہ ہو جاؤ گے! ...... بس۔
دیکھ لینا چند ہی دنوں میں تاناشاہ بن جاؤ گے!"

"جی کیا کہا ــــ تاناشاہ؟!" جی ہاں، بالکل!

"اچھا ــــ تو اس کے لئے کیا کرنا ہوگا؟" اب تو ہماری دلچسپی آسمان کی بلندیوں کو چھونے
...تھی۔ "ارے کچھ نہیں ــــ آج ہی سے ہر ایک کے سامنے کہنا شروع کر دو کہ میں پسماندہ یعنی
...ب ورڈ ہو گیا ہوں ــــ"

"یعنی کہ ــــ یعنی اچانک ہی؟!"

"ارے ہاں بابا اچانک ہی! تم نہیں جانتے تاریخ ساز واقعات اکثر اچانک ہی ہوتے ہیں۔ اچھا
...اور پھر دو چار دن بعد کسی صدق گو، ایماندار لیڈر سے اس کی تصدیق کروالو اور ... پھر زندگی
...تمہارے قدم چومنے لگے گی۔ تمہیں خود سے کسی قسم کی کوشش یا سعی کرنے کی کوئی ضرورت باقی
...نہ رہے گی" ــــ تو جناب ہمیں یہ بات اتنی اچھی معلوم ہوئی کہ بس پوچھئے مت۔ ستمگر نے بڑا
...سیدھا سا طریقہ بتا دیا تھا۔ ایک ایسے راستے کا پتہ دے دیا تھا جس پہ ساری زندگی کسی قسم کے

ار توڑ (Speed breaker) کے آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔
ہم تقریباً دوڑتے ہوئے گھر گئے۔ گھر پہ ہمارے ایک "بیکار" دوست ہمارا انتظار کر رہے تھے
نے ہمیں سیدھے ہوتے دیکھ کر پوچھا "ارے کیا ہوا؟" ہم نے سوچا وضاحت کیوں کی جائے۔ ابتداء
نہ کسی طرح کرنی ہی تھی اور پھر کسی نے سوال بھی کر ہی دیا ہے۔ تو ـــ کہا "کچھ نہیں ـــ میں
ورڈ ہو گیا ہوں!"
بیاک ورڈ؟ کیا مطلب؟" وہ ذرا بوکھلا سے گئے۔ پھر ہمارے دوست نے یہ سمجھ کر کہ میں ذہنی
ں کرتے کرتے شاید پاگل ہو گیا ہوں ہم سے پوچھا "ارے کہیں دماغ تو خراب نہیں ہو گیا تمہارا؟"
"خبردار جو پھر کوئی سوال کیا تو! آج سے میں بالکل بیاک ورڈ ہو گیا ہوں"۔
"یعنی کہ سماجی لحاظ سے یا تعلیمی لحاظ سے؟ شیڈول کاسٹ ہو گئے ہو یا پھر ـــ کیا ہو گئے ہو
تفصیل تو بتاؤ"۔

یہ سوال ہمارے لئے ذرا نازک، ٹیڑھا اور غیر متوقع تھا۔ اس وقت جبکہ ہمارے اندر خطرناک
ں عمل میں آ رہی تھیں۔ اس قسم کے سوالات کے لئے ہم ہرگز تیار نہ تھے۔ ہم چند لمحوں تک سوچ
پڑ گئے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا "اعلان" کیا جائے۔ پھر یہ بھی خدشہ تھا کہ دیر ہونے سے ہمارے
ستے کہیں ہم پر کسی قسم کا شبہ نہ ہو جائے اس لئے کہا "بس ـــ بیاک ورڈ
لو کہ ہر طرح سے بیاک ورڈ!"
مطلب ـــ ہمارے دوست نے کچھ پھر پوچھنا چاہا لیکن اُن کے اس ظالمانہ تفتیشی اسٹائل
ارے تیور خاصے بگاڑ دیئے تھے اور وہ ہم کو دیکھ کر جیسے ہی کچھ رک گئے ہم نے جھٹ سے کہا۔
"مطلب وطلب کچھ نہیں! آج میں بہت خوش ہوں۔ اس لئے کہ آج میں بہت بہت بیاک ورڈ
ہوں۔ اتنے دنوں سے جو نہیں ہو سکا تھا نا اس لئے اب شدت سے ہو گیا ہوں!"
پھر اس کے بعد کیا ہوا؟ یہ مت پوچھئے۔ سبھی باتیں بتانے کی نہیں ہوتیں۔ چند
باتیں تو پردے کے اندر رہ کر ہی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ اگر آپ بضد ہیں تو آپ کے اطلاع کے لئے
عرض ہے کہ آگے ایک دلچسپ مگر طویل کہانی ہے۔ پھر کبھی سہی ـــ لیکن چلتے چلتے اتنا سن
کہ وہ خواب جنہیں ہم دن کے اُجالے میں بھی دیکھا کرتے تھے۔ نا تو سے نیند سے بھی زیادہ
حقیقت کا روپ دھارنا شروع کر چکے تھے۔ ▲

غزلیں

...ب حیدرآبادی

منمنانے، گنگنانے، ناچنے، گانے لگے
رفتہ رفتہ ہم سمجھ میں اپنی خود آنے لگے

دیدہ و دانستہ دُرگت اپنی بنوانے لگے
پھنس کے اُن کے عشق میں ہم جوتیاں کھانے لگے

خود ہمارے دِل نے ہم کو آج انفٹ کر دیا
ہم جو چادر سے زیادہ پاؤں پھیلانے لگے

جس کو ہم سمجھے تھے اپنا اُس نے نظریں پھیر لیں
جو لگے کل تک یگانے آج بیگانے لگے

جب بہ فیضِ میکشی، مجبور و مفلس ہو گئے
ہم کو اپنے ہاتھوں کے چلّو ہی پیمانے لگے

صلح مشرب جو ملے ان کو کیا مائل بہ جنگ
جو سلجھنے پر تلے ہم ان کو اُلجھانے لگے

کمسنی ان کی نہ بھولے ہم کسی تدبیر سے
ان کے نخرے تو بڑھاپے میں بھی بچکانے لگے

غالباً وہ پھر ہمیں اُلّو بنانے والے ہیں
ورنہ ہم کیوں بیٹھے بیٹھے ان کو یاد آنے لگے

یہ بڑھاپے کا اثر، ناقابلِ تردید ہے
ہم سے شرماتے تھے جو، ہم ان سے شرمانے لگے

وہ تصنّع ہی سہی، بہر ثبوتِ میکشی
ہم بھی سرپٹ، لڑکھڑانے ٹھوکریں کھانے لگے

○

پاگل عادل آبادی

صرف باوا ہی اکیلے ہیں کمانے والے
ہیں جواں بیٹے مگر بیٹھ کے کھانے والے

تیر تلوار نہ بندوق چلانے والے
رہ گئے اب تو فقط ڈھول بجانے والے

خود کو بتلاتے ہیں گاما کے گھرانے والے
ڈر سے کھٹمل کے پلنگ اپنا جلانے والے

کھول کر بیٹھے ہیں جوتوں کی دکانیں وہ بھی
جوتیاں دوستو مسجد سے چراتے والے

وہ بھی دیتے ہیں صفائی کا مسلسل بھاشن
سال میں دو ہی دفعہ پانی نہلانے والے

کر رہے ہیں وہی اُبلے ہوئے انڈوں سے پرہیز
مُرغیاں اپنے پڑوسی کی چرانے والے

جب سے بیگاری ہوئی ختم، کہاں ملتے ہیں
بکریاں مفت میں ماموں کی چرانے والے

اب تو "میڈ ٹرم الیکشن" کا بھی چرچا ہے بہت
پوچھنا اُن سے، ہیں وہ آنے یا جانے والے

ایسے ہوئے بھی کبھی ہم کو ملیں گے شاعر
کھیت سے گاجے کے مہتاب اُٹھانے والے

سُن کے پاگل کا ترنّم یہ کہا، رات ڈھلے
آ گئے لیجئے "سحری" کو جگانے والے

ڈاکٹر وزیر آغا

شام کا وقت ہے لیکن ابھی شام کا ستارہ نمودار نہیں ہوا۔ رات کے پنچھی بھی غائب ہیں۔ آسمان پر کوئی سست رو آوارہ حال لکہ ابر بھی موجود نہیں۔ پورا آسمان ایک سفید رنگ مچھر دانی کی طرح مجھ پر جھک آیا ہے۔ میرے پاؤں کے نیچے سبز اور مٹیالے رنگوں والی دھرتی ایک بستر کی طرح ہے جس کے عین درمیان ایک سیاہ نقطہ چمک رہا ہے۔ یہ سیہ نقطہ میں خود ہوں۔ زمین اور آسمان کے ملتے ہوئے ہونٹوں کی لکیر نے میرے چاروں طرف ایک طلسمی دائرہ کھینچ دیا ہے۔ جس طرح اندھیرے میں موم بتی جلا دی جائے تو وہ اپنے گرد از خود نور کا ایک دائرہ سا بنا لیتی ہے، ٹھیک اسی طرح میں نے اپنے وجود کی روشنی سے اپنے گرد بست کا ایک دائرہ سا تعمیر کر لیا ہے۔ یہ دائرہ اپنے مرکز کے سیہ دھبے سے اس درجہ منسلک ہے کہ اگر یہ دھبا اپنی جگہ سے سرک جائے تو اسی نسبت سے ... بھی اپنی جگہ تبدیل کرلے گا۔ عجیب معاملہ ہے! میں ... قدم اٹھا کے ایک طرف کو چل دیتا ہوں اور پھر رک کر چاروں طرف دیکھتا ہوں۔ آسمان کی مچھر دانی بدستور مجھ پر جھکی ہوئی ہے اور میں بدستور زمین کے بستر کے عین درمیان بے حس و حرکت پڑا ہوں، تو کیا میں کائنات کے وجود کا مرکزی نقطہ ہوں، خود اپنے وجود کی قید میں اسیر ہوں؟

مگر قید اور آزادی تو محض اضافی ... ہیں ... تسے بشتی آبادی کے گرد بھی تو ایک دائرہ سا موجود ... ہر آزاد ملک اپنی سرحدوں میں قید ہے۔ بات شاید ... کی ہے۔ میرے لیے کبھی تو میرا چھتا ... کی ... کنارہ اور لامتناہی ہے اور کبھی لامحدود کائنات بھی ایک بندی خانہ ہے

اور کبھی کبھی مجھے یہ بھی محسوس ہوا ہے کہ جیسے میں خود اپنے آپ کی چار دیواری میں بند ہوں مگر دوسرے ہی لمحے ایک اور احساس نے مجھے گدگدایا ہے کہ اگر میری تحویل میں میرا بدن نہ ہوتا تو میں اپنے پانچوں حسّی آلات سے محروم ہونے کے باعث اپنے اردگرد کی دنیا کا ادراک تک نہ کرسکتا۔ تو کیا میرا احساسِ آزادی محض اس لیے نہیں کہ میں اپنے جسم کی قید میں ہوں؟
صحیح بات تو یہ ہے کہ ہر دائرہ ایک گھونسلے کی طرح ہے جس میں اس کا مرکزی نقطہ ایک پرندے کا سا منقار زیرِ پر ہے یا شاید فطرت نے ہر مرکزی نقطے کے لیے ایک دائرے کا اہتمام کیا ہے۔ پرندے کو گھونسلا، بچے کو ماں کی گود اور زندگی کو زمین کی کوکھ عطا کی ہے۔ فطرت کی نظروں میں دائرہ بیک وقت زندگی کے لیے ایک ناقابلِ تسخیر فصیل بھی ہے اور ایک آرام دہ جھولا بھی! فطرت نے "زندگی" کا کس قدر خیال رکھا ہے!!
مگر خود فطرت کی سرشت میں بھی تو یہ بات موجود ہے کہ وہ گاہے گاہے اپنے گرد لپٹے ہوئے دائرے کو ایک کینچلی کی طرح اُتار پھینکتی ہے۔ پرندہ گھونسلے کو، بچہ گود کو، اور میں اپنے گھر کو خیرباد کہنے کے لیے بےقرار ہو جاتا ہوں۔ ہجرت فطرت کی ایک ناقابلِ فہم ادا ہے جو بیک وقت ایک کرب انگیز تجربہ بھی ہے اور تازہ معانی سے لبریز ایک واردات بھی!
مجھے فطرت کی یہ ساری ادائیں پسند ہیں ——— اس کی وہ ادا بھی جب وہ بڑے پیار سے مجھے اپنے پروں میں سمیٹ لیتی ہے اور وہ بھی جب وہ پَر مار کر مجھے اُڑا دیتی ہے۔ مگر اُڑنے کا یہ عمل ہے بالکل عارضی نوعیت کا! کیونکہ جب میں تھکا ہارا اگلے پڑاؤ پر پہنچتا ہوں تو کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرتا کہ میں دوبارہ مرکزِ ہست بن جاتا ہوں۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے نور کی ایک لکیر سی میرے اندر سے نکل کر ایک دائرے کی صورت میرے چاروں طرف گھوم گئی ہے اور میں پھر سے اپنے وجود میں قید ہو گیا ہوں۔ شاید زندگی کی کہانی اس طوائف کی کہانی سے مختلف نہیں جسے شہر کے معززین نے شہر بدر کر دیا تھا۔ مگر جس کے کچھ ہی عرصہ بعد ایک پورا شہر اُگ آیا تھا۔
جب میں فطرت کے پروں تلے ہوتا ہوں تو زندگی ایک بنے بنائے ضابطے کے تحت بسر ہوتی ہے۔ خود مجھے ہر دم یہ وہم ستائے رکھتا ہے کہ اگر میں نے ضابطے کو چھوڑا یا دائرے کی لکیر کو توڑا تو مجھ پر کوئی بلائے ناگہانی نازل ہو جائے گی۔ صبح سویرے اُٹھتا ہوں تو ہمیشہ شیو کرنے سے پہلے دانتوں پر پیسٹ کرتا ہوں، جیسے اگر میں نے پہلے ٹوتھ پیسٹ اور پھر شیو نہ کی تو قیامت آجائے گی۔ باہر جانے کے لیے کپڑے پہنتے ہوئے اس بات کا اطمینان کر لیتا ہوں کہ میں نے اپنی قمیص کا تیسرا بٹن بند نہیں کیا، کیونکہ کسی غیبی آواز نے مجھے یہ بتا دیا ہے کہ اگر غلطی سے کبھی یہ بٹن بند ہو گیا تو خوش بختی کی دیوی مجھ سے ناراض ہو جائے گی۔ گھر سے نکلتے وقت سڑک کے کنارے کے پتھر کو بوٹ کی نوک سے ہلکی سی ٹھوکر لگانا ضروری ہے۔ واپسی پر اسی کھمبے پر تھوکے بغیر گھر میں داخل ہونا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ میں اپنے معمولات کی ایک ایک شق پر نظر رکھتا ہوں۔ اُٹھنا، بیٹھنا، چلنا، کھانا، ورزش کرنا یا نہانا یہ سب کچھ ایک خاص ضابطے ایک خاص RITUAL کے تحت ہو تو جان کی سلامتی ہے ورنہ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کسی بھی وقت کیا نہ ہو جائے! اگر کبھی اس قاعدے اور روش میں ذرا سی بھی تبدیلی آتی ہے تو دل کسی

انجانے خطرے کو محسوس کرکے کانپ اٹھتا ہے۔ فطرت نے اس بات کا خاص اہتمام کیا ہے کہ میں اس کی بنائی ہوئی حد بندیوں
سے ہرگز باہر نہ آؤں۔ جس طرح ستارے کے طلوع و غروب میں ایک باقاعدگی ہے اور موسم ایک کامل ترتیب میں ایک دوسرے
کا تعاقب کرتے ہیں بلکہ اسی طرح فطرت کا یہ تقاضا ہے کہ میں اس کے ضابطۂ حیات سے سرِمو انحراف نہ کروں۔ خود مجھے
فطرت کی نرم اور ملائم انگلی کو تھام کر چلنے میں ایک عجیب سا سکون ملتا ہے۔ جیسے میری نبض فطرت کی نبض سے ہم آہنگ ہو گئی ہو
لیکن کیا میں نے یہ ضابطہ، یہ پیٹرن، یہ زندان اپنے لیے خود نہیں تعمیر کیا؟ یا شاید فطرت نے میرے لیے تعمیر کیا ہے
ہو سکتا ہے کہ خود فطرت اپنے ہی ضابطے کی قید میں ہو۔ سو جب میرے دل میں یہ آرزو کسمساتی ہے کہ میں اپنے زندان کی
دیوار کو توڑ دوں اور دانۂ گندم کی لذت سے خود کو آشنا کروں اور پھر ایک طویل ہجرت میں مبتلا ہو جاؤں تو کیا یہ بغاوت
خود فطرت کی طرف سے نہیں ہوتی؟ چلو مان لیا کہ یہ بغاوت فطرت کی طرف سے ہے، کرتی ہے؟ کیا بغاوت کرنا بھی اسی سرشت کا ایک زاویہ ہے
—— امکان تو یہی ہے، ورنہ اس کا ارتقا کبھی کا رک چکا ہوتا۔ سو اصل چیز ہجرت ہے۔ ہر ہجرت سے ایک نیا امریکہ دریافت
ہوتا ہے، نئے رشتے وجود میں آتے ہیں۔ نئے معانی اُجاگر ہوتے ہیں۔ ہجرت میں مبتلا ہوئے بغیر آئینۂ دل روشن نہیں ہو سکتا
ہجرت سے صدیوں کا زنگ اُترتا ہے۔ آنکھوں میں چکاچوند پیدا ہوتی ہے۔ اپنے پرائے کا فرق دکھائی دینے لگتا ہے۔
ہجرت کے بغیر زندگی نامکمل ہے، چاہے ہجرت ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف ہو۔ ایک حویلی سے دوسری حویلی کی
جانب یا ایک بدن سے دوسرے بدن کی اور —— وہ شخص جو کھجور کے درخت کی طرح نخلستان کے چشمۂ شیریں میں
صبح و مسا اپنا عکس دیکھتا ہے، اس چمک کو کیسے جان سکتا ہے جو ایک نخلستان سے دوسرے نخلستان میں پہنچنے پر تھکی
ہاری اونٹنی کی آنکھوں میں نمودار ہوتی ہے۔ ہر کوندا دراصل حیرت کا کوندا ہے اور حیرت، ہجرت کے بغیر ممکن نہیں۔

مگر ہجرت کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ انسان ایک درخت کی طرح ہے جو دھرتی کے بدن سے اپنے لیے غذا کشید کرتا
ہے۔ لہٰذا جو خاصیت کسی خطۂ زمین کے دودھ، نمک اور پانی میں ہوگی، لازم ہے کہ وہ اس کے باسیوں میں بھی پیدا
ہو جائے گی۔ آخر میں تو دھرتی اپنے بدن سے لپٹی ہوئی مخلوق کو خود سے اس طور پر چپٹا لیتی ہے کہ من تو شدم تو من شدی
کا منظر دکھائی دینے لگتا ہے۔ سارے لوگ ایک ہی رنگ میں رنگے جاتے ہیں اور ایک ہی نمونے کے مطابق بنے ہوئے
نظر آنے لگتے ہیں۔ ایسے میں اگر ہجرت کی نوبت نہ آئے تو انسان کی ساری اپج اور انفرادیت ختم ہو جائے۔ سو جب
انسان کسی خطۂ زمین سے ہجرت کرکے کسی دیارِ غیر میں اپنی جڑیں اُتارتا ہے تو اپنے بدن اور روح کو ایسے نئے ذائقوں
سے آشنا کرتا ہے جو نئی سرزمین کے دودھ، نمک اور پانی کی تاثیر سے عبارت ہوتے ہیں۔ ہجرت ایک کرب انگیز
تجربہ ہے کیونکہ جب کوئی ہجرت کرتا ہے تو دھرتی سے اپنی ساری جڑیں نکال نہیں پاتا، کچھ جڑیں زمین کی کوکھ میں
ہی رہ جاتی ہیں۔ اور ان کی یاد مدتوں درِ دل پر دستک دیتی رہتی ہے۔ مگر ساتھ ہی ہجرت ایک کیف انگیز واردات بھی
ہے، کیونکہ آپ ایک نئے خطۂ زمین کے خزائن اور اثمار سے اپنی جھولیاں بھر لیتے ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ کیا یہ ضروری
ہے کہ آپ جسمانی طور پر بھی ہجرت کریں۔ آپ اپنے پلنگ پر لیٹ کر بھی تو ہجرت کر سکتے ہیں۔ میری طرف دیکھیے

میں شاید ہی کبھی اپنے گھر سے باہر جاتا ہوں۔ مگر ہر شب جب آسمان پر ستارے چمکتے ہیں تو میں اپنی زمین سے منقطع ہو کر لاکھوں کروڑوں روشنی کے سالوں کا سفر کر کے نئی نئی سرزمینوں میں پہنچ جاتا ہوں اور پھر وہاں کے نمک، پانی اور دودھ سے خود کو تر و تازہ کر لیتا ہوں، اگر ایسا نہ کر سکوں تو ہوا کے اس سمندر کی تہہ ہی میں بیٹھا ہی رہ جاؤں جو میرے اس کرۂ ارض کے گرد پھیلا دیا گیا ہے اور جس کی گہرائی چند ہزار فٹ سے زیادہ نہیں۔ سوچتا ہوں یہ کیا بندش ہے! ہوا کا زندان!! جو بیک وقت میری آزادی کا دشمن بھی ہے، اور اس کا معاون بھی۔ کیونکہ اگر ہوا نہ ہو تو میں سانس کیسے لوں؟ سانس نہ لوں تو دیکھ کیسے سکوں؟ دیکھ نہ سکوں تو پھر ہوا کے اس زندان کو توڑ کر ستاروں کی دور افتادہ دنیاؤں تک کیسے جا سکوں؟ زندہ کیسے رہوں؟؟

اس لئے ہاں اسی لئے اے دھرتی کے سینے سے چمٹے ہوئے لوگو! آؤ ہجرت کریں! ایک دوسرے کی طرف پل بھر کے لئے ملیں اور پھر جدا ہو جائیں۔ جدا ہوں تو اس عزم کے ساتھ کہ ایک بار پھر ملاقات ہوگی۔ ہر ملاقات ہجر کا ثمر شیریں ہے۔ تجدید ذات ہے۔ مگر اس کے اختصار ہی میں اس کا سارا حسن پنہاں ہے۔ کیونکہ اگر ملاقات طویل ہو جائے تو پھر کہنے سننے کو کچھ نہیں رہتا۔ سب لوگ ایک دوسرے کے لئے کھلی کتاب بن جاتے ہیں۔ بلکہ ایک دوسرے کو حفظ ہو جاتے ہیں۔ کوئی اسرار کوئی حیرت زا بات باقی نہیں رہتی اور جب زندگی سے حیرت منہا ہو جائے تو باقی وہ ٹیلی فون ڈائریکٹری بچتی ہے۔ ہر شخص کا ایک ٹیلی فون نمبر مقرر ہے۔ اسرار صرف اسی وقت نمودار ہوتے ہیں جب کسی دلچسپ سے رانگ نمبر سے رابطہ قائم ہو جائے مگر رانگ نمبر ڈائریکٹری میں درج نہیں ہوتا۔

--

فٹ نوٹ

انور سدید

میرے محقق دوست "س" کا خیال ہے کہ فٹ نوٹ علمی اور ادبی کتاب کا زیور ہوتا ہے۔ ان کا قول ہے کہ جس کتاب کو مصنف نے فٹ نوٹوں سے آراستہ نہ کیا ہو وہ ایسے نظر آتی ہے جیسے دلہن سنگھار کے بغیر آرسی مصحف کے لیے بیٹھ گئی ہو۔ میں دوستوں سے اختلاف کو گناہ تصور کرتا ہوں۔ میرے مخالفین میرے اس موقف سے کبھی متفق نہیں ہوئے اور اسے ہمیشہ میری فطری بزدلی پر محمول کرتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اختلاف صحت مند ذہن کی نشانی ہے اور مدلل اختلاف نئے خیال کو جنم دیتا ہے۔ میں ہزار خواہش کے باوجود اپنے مخالفین سے کبھی متفق نہیں ہو سکا۔ میرا تجربہ ہے کہ غیر متعارف لوگوں سے بامعنی یا بے معنی اختلاف کرنا عقلمندی کی نشانی ہے۔ لیکن یہی اختلاف جب دوستوں پر عمل میں لایا جائے تو قرض کی طرح محبت کی قینچی ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ دوستوں کے معاملے میں اختلاف سے گریز میں اپنا سماجی فرض شمار کرتا ہوں اور جب سے میں نے گریز کی یہ منفعت بخش روش اختیار کی ہے، امن عامہ کبھی خطرے میں نہیں پڑا اور میں چین کی بانسری بجا رہا ہوں۔ میرے دوست میری تعریف میں رطب اللسان ہیں اور میں ان کے لیے نئے مرکب توصیفی وضع کر رہا ہوں۔

اس صادق وضاحت کے باوجود مطلب یہ ہرگز نہیں کہ میں نے اپنی ذاتی رائے کا گلا گھونٹ دیا ہے اور اب اسے تحفظ مہیا کرنے کے بجائے دوستوں کی رائے میں ضم کر دیتا ہوں۔

بھلا سوچیے کہ ایک آزاد قوم کے آزاد اور ذمہ دار فرد کی حیثیت میں اپنی انفرادیت کو تج کر میں دوسروں کا حلقہ بگوش کیوں کر ہو سکتا ہوں۔ میں اس ملک کا اوّل درجے کا شہری ہوں اور ثانوی حیثیت اختیار کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں۔ خوشا حجو! آج آپ کے علم اور اطلاع کے لیے میں یہ بات برملا کہتا ہوں کہ "مجھے دوست کی دوستی بے حد عزیز ہے۔ لیکن اپنی اچھی اور قیمتی رائے کو دوست کی نذر کرنے پر ہرگز تیار نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے صرف اعلانِ گناہ ہی نہیں کیا بلکہ اس کا بار بار ارتکاب بھی کیا ہے اور حد یہ ہے کہ ہر گناہ کے بعد میرا "ذوقِ عصیاں" کچھ زیادہ ہوا ہے اور تادم تحریر میں اس پر نادم نہیں ہوا۔ چنانچہ یہ عرض کرنا مناسب خیال کرتا ہوں کہ سنگار دلہن کا حسن ضرور ہے لیکن دلہن سنگھار کی محتاج ہرگز نہیں۔ اسی طرح فٹ نوٹ علمی کتاب کا زیور ضرور ہے لیکن علمی کتاب کو فٹ نوٹ کی احتیاج ہرگز نہیں۔ جس طرح دلہن سنگھار کے بغیر بھی اپنی انفرادیت قائم رکھتی ہے، اسی طرح کتاب فٹ نوٹ کے بغیر بھی اپنی ذاتی حیثیت میں پہچانی جاتی ہے۔ دلہن سنگھار کے بغیر بھی دلہن ہی کہلائے گی زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ محلے کی کوئی شوخ و شنگ لڑکی جو کنوار پنے کی دہلیز پر کھڑی ہو کر دلہن کو حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہی ہے، ناک پر انگلی رکھ کر کہے گی۔ "تو دیکھو! دلہن نے ابھی سے زیور اُتار کر محفوظ کر لیا۔"

یہ تیز جملہ بظاہر "زہرناک" طنز کا حامل ہے، تاہم اگر آپ ذرا باریک بینی سے دیکھیں تو اس میں دلہن کے سگھڑاپے کا پہلو بھی موجود ہے۔ ایسے مواقع پر دلہن زیور کے ڈبے کو اپنے زانو تلے دبا لیتی ہے اور اس کی نظر بچا کر بالعموم اس مصرعے کا اظہار لیتی ہے کہ: ؎

نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی

پس زیور دلہن کی ضمنی خوبی اور اس کے حسن کی اضافی جہت ہے۔ زیور اس کی شخصیت کے داخلی زاویوں کو نہ اجاگر کرتا ہے اور نہ اس کے اوصاف پر اثر ڈالتا ہے۔

کتاب کی شخصیت بھی دلہن کی شخصیت کے مترادف ہے۔ کتاب میں بنیادی اہمیت تو متن کو حاصل ہوتی ہے اور اسی سے کتاب کے داخلی اوصاف کے مختلف زاویے نمایاں ہوتے ہیں۔ فٹ نوٹ تو بڑے درخت کے سائے میں پروان چڑھنے والا وہ پودا ہے جو خود روئیدگی کے باعث شجر کے قد آور جسم کا حصہ بن نہیں پاتا۔ بلاشبہ اس خود رو پودے کی شکل و صورت اور برگ و بار بڑے درخت جیسے ہی ہوتے ہیں۔ یہ پودے بڑے درخت سے غذا کشید کرتے ہیں اور ہمہ وقت اس کی صحت پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ یہ خود رو پودے درحقیقت وہ جونکیں ہیں جو درخت ہی کا خون پیتی ہیں۔ چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جوں ہی مالی کی نظر ان جونکوں پر پڑتی ہے وہ تندہی سے ان پر لپکتا ہے اور پھر ایک ایک کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینکنا شروع کر دیتا ہے۔ اس قسم کے پودوں پر مالی کی درانتی کس تیزی سے چلتی ہے اور زیاں کا احساس کیے بغیر وہ انہیں کس تیزی سے کاٹتا ہے؟ کیا درخت کو ان جونکوں سے بچانا مالی کا فرض نہیں؟ فٹ نوٹ بھی کتاب کے زیرِ سایہ پلنے

والا وہ پودا ہے جو ایک خونخوار جونک کی طرح اپنا رزقِ حیات درخت سے ہی کشید کرتا ہے۔ کتاب کے بغیر فٹ نوٹ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ البتہ فٹ نوٹ اگر جونک کی طرح فربہ ہو جائے تو پوری کتاب کو کھا جاتا ہے پھر مستقبل کا تساہل پسند قاری کتاب کو تو نظر انداز کر دیتا ہے اور فٹ نوٹ کی جونک کو موضوعِ گفتگو بنا کر دھواں دھار مباحث اُبھارنے لگتا ہے۔ چونکہ یہ عمل کتاب کے ساتھ صریحاً بے انصافی کا عمل ہے، اس لیے ہر اچھا قاری مطالعے سے پہلے فٹ نوٹ سے نجات حاصل کرنے کی سعی کرتا ہے۔ اسے کالی روشنائی سے مٹاتا ہے یا اس کا وجود ختم کرنے کے لیے اس پر کاغذ چپکا دیتا ہے اور پھر اس عمل کے بعد دوستانہ تبادلۂ خیال کے لیے کتاب کے ساتھ مصروفِ گفتگو ہو جاتا ہے۔ اس عالم میں کتاب کی صحت واپس عود کر آتی ہے۔ جونک کی طرف بہتا ہوا خون کتاب کی رگِ حیات میں دوڑنے لگتا ہے اور قاری اس حدت اور حرارت کو پا لیتا ہے جسے خود مصنف نے کتاب تخلیق کرتے وقت محسوس کیا تھا۔ چنانچہ ایک چراغ سے دوسرا چراغ جلتا ہے، اندھیرا چھٹ جاتا ہے اور روشنی طلوع ہونے لگتی ہے۔

کتاب مصنف کے تخلیقی کرب کا خوبصورت ترین ثمر ہے۔ اس کے بطون میں مصنف کا برسوں کا مطالعہ، تجربہ اور مشاہدہ خونِ گرم کی طرح گردش کرتا رہتا ہے۔ جس طرح شجرِ سایہ دار ہر راہ گیر کو سایہ اور ٹھنڈک عطا کرتا ہے اسی طرح کتاب ہر قاری کو روشنی، رہنمائی، حرارت اور تحرک عطا کرتی ہے۔ فٹ نوٹ نہ صرف قاری کے تحرک اور روانی کو روکتا ہے۔ بلکہ اسے روشنی کے ماخذ تک براہِ راست پہنچنے کی اجازت بھی نہیں دیتا اور اس کے راستے میں دبیز رکاوٹ بن کر کھڑا ہو جاتا ہے اور یوں اچھی بھلی کتاب کا مطالعہ رکاوٹوں والی دوڑ بن جاتا ہے۔ چنانچہ یہ تجربہ تو آپ نے بھی کیا ہوگا کہ کتاب کی رواں تحریر میں دوسری یا تیسری سطر پر جوں ہی کوئی اشارہ برآمد ہوا آپ فٹ نوٹ کی طرف مڑ گئے۔ خیالات کا تسلسل رک گیا اور مصنف قاری سے اپنی انگلی چھڑا کر کسی اور سمت میں محوِ خرام ہو گیا اور جب لاکھ کوشش کے بعد قاری مصنف کو منانے میں کامیاب ہوا تو اس پر مایوسی اور بے چارگی کی چادر نے اپنا سایہ ڈال دیا۔ چنانچہ اب قاری کبھی جھنجھلاتا ہے اور کبھی کتاب سے الجھنے لگتا ہے۔ بھلا یہ بھی سنجیدہ مطالعے کا کوئی انداز ہے؟

کتاب کی تخلیق ایک نامیاتی عمل ہے۔ اس میں ایک خیال دوسرے خیال کو جنم دیتا ہے۔ ایک شاخ کے اکھوے سے دوسری شاخ پھوٹتی ہے۔ اس کی جڑیں مصنف کے دل میں ہوتی ہیں لیکن اس کے پھول قاری کے نہالِ خیال پر کھلتے ہیں۔ مصنف قاری کی ضرورت اور ذوق کو پیشِ نظر نہ رکھے تو کتاب کا تخلیقی عمل لاشعور میں سرانجام پاتا ہے۔ مطالب غیب سے روحِ دل پر اترتے ہیں اور صریرِ خامہ نوائے سروش بن جاتا ہے۔ قاری کے تقاضے مصنف کے سامنے نہ بھی ہوں تو وہ کتاب کی داخلی وحدت اور تسلسل کو ہر قیمت برقرار رکھتا ہے۔ چنانچہ جب کتاب تکمیل کی منزل تک پہنچتی ہے تو ایک ایسے مرقعِ کل کی صورت اختیار کر لیتی ہے جس کے

حسن کا تجزیہ کرنا ممکن نہیں۔ اس کے برعکس فٹ نوٹ لکھنا خوردہ نگاری کا فیرنامیاتی عمل ہے۔ اس کے لیے تخلیقی تموج قطعاً ضروری نہیں۔ بلکہ جب اور جہاں چاہے آپ فٹ نوٹ کی داغ بیل ڈال سکتے ہیں اور جس جگہ اکتا جائیں اسے وہاں ختم کرسکتے ہیں۔ فٹ نوٹ تو جا بجا اینٹیں ہیں۔ جنھیں فٹ نوٹ لکھنے والا جا بجا بکھیر دیتا ہے تاکہ خلقِ خدا ٹھوکر کھائے منہ کے بل گرے اور پھر اُٹھ نہ سکے۔ چنانچہ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ فٹ نوٹس سے اُلجھا ہوا شخص اصل کتاب کی طرف بہت کم متوجہ ہوتا ہے۔ فٹ نوٹ میں آورد کا اتنا خطیر عنصر شامل ہے کہ آمد کا ایک شائبہ تلاش کرنا بھی ممکن نہیں۔ فٹ نوٹ میں کتاب کی مرصّع وحدت یکسر ختم ہوجاتی ہے اور اس کے برعکس ایک ایسی کثرت جنم لیتی ہے۔ جس کی ہر شاخ خاردار ہے اور کتاب سے اُلجھ اُلجھ کر اسے لہولہان کر رہی ہے۔ چنانچہ میں نے اکثر محسوس کیا ہے کہ اچھی کتاب مجھے اپنا دوست بناتی ہے لیکن فٹ نوٹ مجھ پر نہ صرف حکمراں ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ بلکہ مجھے مرعوب بھی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں فٹ نوٹ سے ہر وقت خوفزدہ رہتا ہوں اور ایسی کتاب خریدنے سے گریز کرتا ہوں جس میں فٹ نوٹوں کی کثرت ہو۔ شومئی قسمت سے زندگی کی حسین راہ گزر پر کسی ایسی کتاب سے مجھے واسطہ پڑجائے تو فٹ نوٹ پر نظر ڈالے بغیر میں کتاب کا مطالعہ شروع کردیتا ہوں اور یوں ان نوادرات کو پالیتا ہوں جن کو نظرِ بد سے بچانے کے لیے مصنف نے فٹ نوٹ کی کالک جا بجا بکھیر رکھی ہے۔ اس عالم میں کتاب مجھے وہ دلہن نظر آتی ہے جو کلنک کے ٹیکے سے محفوظ ہے اور جسے تمام خوبیاں خدا نے دے رکھی ہیں۔

میں یہاں تک لکھ چکا تھا کہ میرے دوست "راش" جن کا شمار ملک کے معروف ترین فٹ نوٹ لکھنے والوں میں ہوتا ہے، تشریف لائیے۔ انہوں نے پہلے تو میری اس تحریر پر نفرت کی نگاہ ڈالی اور پھر بے اختیار کھلکھلا کر ہنسنے لگے، بولے "آخر دھوکا کھا گئے نا!" میں نے نگاہِ استعجاب سے ان کی طرف دیکھا تو انہوں نے آنکھوں میں شرارت بھر کر کہا:

"بھائی جان! آپ فٹ نوٹ سے نجات کس طرح حاصل کرسکتے ہیں۔"

پھر انھوں نے اپنی ایک آنکھ میچ کر کہا،

"حضرت جی! مصنف کتاب نہیں لکھتا۔ بلکہ اپنی حیاتِ مختصر کا ایک طویل فٹ نوٹ تحریر کرتا ہے۔"

اب میں دانتوں میں انگلی دبائے سوچ رہا ہوں: "کیا واقعی؟"

الف حسنین
پٹنہ

تبدیلیٔ جنس ہی مداوا کیوں؟

ناف میں
ے لے رہا تھا کہ دروازہ
کی آواز سن کر نیند ٹوٹ گئی۔ میں نے
ن سنی کر دوں اور ـــــــ مگر دروازہ پر
لے سے پڑتی رہی۔ سوچا کہ چور اچکا تو ہو نہیں
نیم پلیٹ (NAME PLATE) ہی دیکھ کر
۔ اگر واقعی بے حیا نکلا اور گھر میں در آیا
لے گا ـــــــ ایک ادیب کے گھر میں سگریٹ
ئے ٹکڑے (اس حد تک مختصر کہ انگلیوں کے
نکل گھڑے) اور بکھرے ہوئے بلیک اینڈ
غذات ۔ مرزا غالب کے یہاں تو مرنے کے
نکلا ع
ند تصویر بتاں کچھ حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے میرے گھر سے یہ ساماں نکلا
ما زیر لب بڑبڑایا۔ ہمون
اس رات

نازل ہو گیا
دروازہ پر ضرب کاری
ہوتی ہی رہی۔ میں لحاف پھینک
کر اٹھا اور حلق پھاڑ کر چیخا۔ "اتنی رات
گئے کسی شریف آدمی کا دروازہ پیٹتے ہوئے
شرم نہیں آتی .... دستک دینے کا یہی طریقہ
ہے؟" دروازہ کھولا، باہر دیکھا کہ میرا ایک دوست اہم
با مسمی شمیم اختر چہرے پر ناگواری اور تھکن کے آثار
پیدا کئے کھڑا ہے اور مجھے بے وقت ڈسٹرب کر کے
نادم بھی ہے۔ وہ (بغیر اجازت لئے) بجے قدموں سے
اندر داخل ہو گیا۔ میں نے جھنجھلاہٹ کو دباتے ہوئے
پوچھا "کہئے حضرت! اتنی رات گئے تشریف آوری کیونکر
ہوئی؟" اس نے کہنا شروع کیا گویا پھٹ پڑا: "کیا کہوں
میاں اب مجھ میں ذرا بھی برداشت کرنے کی ہمت
نہیں۔ پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا ہے۔ ٹرٹر میں میں کرنا نہیں
چاہتا۔ اب لے دے کر مجھے ایک ہی
راستہ نظر آ رہا ہے
اور

جنس تبدیل کرانے کی ترکیب روز روز کی پریشانی سے چھٹکارا مل جائیگا۔ اس سر دردی سے نجات
پائیگی ـــــ آج کل کے زمانہ میں شوہر ہونا ایک جرم ہے دوست۔ ایک جرم ـــــ بہت بڑا جرم۔
جھنجھلاہٹ مجھ سے اس تیزی سے رفع ہوئی جیسے گدھے کے سر سے سینگ ـــــ اور حیرانی نے
گھیر لیا۔ شمیم کے چہرے کا بغور جائزہ لیتا رہا۔ اب اس کے چہرے پر غصہ کی لکیریں رونما ہونے لگی تھیں۔
میں نے پوچھا "مگر پیارے اس رات گئے خدا کا کونسا فرمان نازل ہوا ہے کہ تمہیں جنس تبدیل کرانے
کی ضرورت آن پڑی .... لگتا ہے کوئی انگریزی فلم دیکھ کر آرہے ہو۔"
وہ قدرے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔ "نہیں میاں، یہ بات نہیں ہے بلکہ بات ہی کچھ اور ہے
رات کو دس بجے جاؤں تو وہی بات ـــــ اور آج قریباً ایک بجے گیا تو وہی بات۔ ذرا تم ہی بتاؤ (سوچ کر
) یہ برداشت کرنے کی باتیں ہیں۔ دفتر میں دن بھر سر ماری کرتا ہوں اور آفس ٹائم کے بعد تھوڑی بہت
تفریح کر لیتا ہوں ـــــ اور کبھی کبھی کلب چلا جاتا ہوں تو میری بیوی کو ناگوار گذرتا ہے، بہت ناگوار
بھنویں چڑھا لیتی ہیں ـــــ اور کبھی کبھی اس طرح سلوک کرتی ہیں کہ اللہ کی پناہ ـــــ تن بدن میں
آگ لگ جاتی ہے۔ یقین کرو دوست! سچ کہہ رہا ہوں۔ (ایک تم ہی تو میرے ہمراز ہو۔"
شمیم مجھے مخاطب کئے کہتا رہا۔ "ذرا تم ہی ٹھنڈے دل سے سوچو کہ تفریح بھی ضروری ہے یا نہیں
نائٹ شو فلم دیکھ کر آیا۔ نصف گھنٹہ تک باہر سردی میں کھڑا بل (گھنٹی) دباتا رہا تو آپ اٹھیں اور جلی کٹی
سنانے لگیں جیسے میں ان کا شوہر نہیں گھر جمائی ہوں۔ جانتے ہو انہوں نے کیا کہا؟ انہوں نے چنچناتی ہوئی آواز
میں حکم صادر فرما دیا۔ "جس کے پاس سے اتنی رات گئے آرہے ہو اس کے پاس جا کر سو رہو؟ دروازہ نہیں کھلے گا
میں نے بہتیرا کہا کہ پکچر دیکھنے گیا تھا، یقین کرو ـــــ مگر اس بے رحم ظالم نے مجھ پر اعتبار نہیں کیا اور مجھے برفیلی
ہواؤں سے لڑتے لڑتے مر جانے کے لئے باہر چھوڑ دیا۔
میں نے شمیم سے ازراہ ہمدردی کہا۔ "یہ بات تو بہت غلط ہے (اگر یہ سچ ہے) تمہاری بیوی کا
طریقہ بہت ہی جابرانہ ہے۔ اسے ایسا ہرگز ہرگز نہیں کرنا چاہیئے تھا ـــــ مگر .... میں تم سے ایک بات
پوچھوں۔" "پوچھو، ضرور پوچھو؟" اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کا تمہیں ایک ہی طریقہ کیوں نظر آیا، تبدیلی
جنس کا طریقہ، جبکہ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے طریقے ہیں۔ کتنی شرم کی بات ہے کہ تم مرد سے عورت
بننا چاہتے ہو۔" شمیم نے وضاحت کی۔ "تم شاید نہیں جانتے (حالانکہ بھی کیسے تمہارے سائے سے عورت کا
سایہ بھی نہ ٹکرا سکا۔) کہ عورت بننے میں بہت فائدہ ہے۔ گھر میں بیٹھ کر قتالی کرونگا، زلفیں بناؤنگا، اپنے
شوہر کو خوب تنگ کرونگا اور بات بات پر ڈانٹ پلاؤنگا ـــــ یعنی وہ ساری حرکتیں کرونگا جو میری بیوی
میرے ساتھ کرتی ہے۔ مجھے نہ آفس جانے کی زحمت اٹھانی پڑے گی، نہ سودا سلف لانا پڑے گا۔ نہ فکر
بندوبست کرنا ہوگا، نہ گردش روزگار کا غم ہوگا۔ نہ بڑھتی ہوئی مہنگائی کے بارے میں سوچنے کی ضرورت محسوس
ہوگی نہ افسروں کے بے سر پیر کے حکم بجا لانے کی نوبت آئے گی اور یار، بہت سارے فائدے ہیں۔"

یں نے ٹوکا۔ "پھر بھی اتنا تا عورت بننا کوئی اچھی بات نہیں - یہ مرد کی ذات پہ ایک داغ ہے
داغ - مردانگی کو چیلنج، بہت بڑا چیلنج۔"
شمیم کو ایک ترکیب سوجھی۔ فوراً بول پڑا۔ "تب جانتے ہو کیا کروں گا؟ اس سے ہمیشہ کے لئے کنارہ کشی
کر لوں گا ـــــ اور بن باس لے لوں گا ـــــ اور سادھو سنتوں کی طرح بھگوان کے دھیان میں خوشی
بقیہ زندگی گذار دونگا۔"
یں نے کہا۔ "دوست، ایام جوانی میں ہی خلوت گزیں ہو جانا شباب کی توہین ہے۔ ابھی تم نے دنیا
ہے کہاں - تم نے سنا نہیں کہ گناہ کرنے کو زندگی کم ہے۔
میرے خیال سے تمہیں ایسا سوچنا زیب نہیں دیتا۔"
اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ گوشہ نشینی اختیار کرنا میرے بس کی بات نہیں
بس تبدیل کرانا بس کی بات ہے اور آسان، اس عمل سے دنیاوی لذتیں اور مسرتیں حاصل ہوتی رہیں گی۔"
یں نے اسے سمجھایا۔ "شمیم، اتنی عجلت بازی اور جذبات میں آکر کوئی فیصلہ نہیں کرتے۔ اگر تم میری مانو تو
ہ ابری کی شکایت دور ہو جائیگی۔" "وہ کیا؟"
وہ یہ کہ تم آفس آورز کے ذرا بعد بچوں اور بیوی کو ساتھ لے کر سیر و تفریح کو چلے جایا کرو۔ کبھی پکچر دیکھنے کی خواہش
انہیں بھی ہمراہ لے لیا کرو ـــــ پھر وہ بھول جائیں گی کہ گھر دیر سے آنا کیا ہوتا ہے۔"
شمیم بھنا اٹھا۔ "تم بھی کمال کی بات کرتے ہو۔ میں اسے اپنے ساتھ گھمانے لے جاؤں اور بغل میں بٹھا
دکھاؤں، لوگ دیکھیں گے تو کیا کہیں گے (خدا کا ڈر نہیں لوگوں کا تو ڈر ہے) اور یہ گوارا بھی کر لیا تو
داری کون سنبھالے گا۔ اتنی عادی ہو گئی ہے نہیں کہ ہوٹل بازی کریں گے۔ ایک پانچ سالہ بچہ ہے اس کی دیکھ
ل کون کرے گا۔ اور اس کے علاوہ اور بھی گھریلو کام ہیں۔"
مجھے اندر ہی اندر کوفت ہونے لگی۔ میں نے کہا "اب تم یہیں سو جاؤ۔ رات کافی ہو چکی ہے، صبح دیکھا جائے
دونوں ایک ہی تخت پر دراز ہو گئے۔ مجھے تو نیند آنے لگی مگر شاید شمیم اچھی طرح سو نہیں سکا۔ "میری تنخواہ کا
ہے۔ اس کی ہر بے اعتنائی یاد آ رہی ہے۔ جیب میں پانچ دس رکھ کر سوتا ہوں اور صبح تلاش کرنے پر
ب، پوچھنے پر ٹکا سا جواب کہ دودھ والے کو دیدیا، یا اسٹنگ پاؤڈر منگا لیا۔ ایک ہی تو لاڈلا ہے، دس لگے
ملنے کو ضد کر رہا تھا، منگا دیا۔ تمہارا سگریٹ پینا تو کوئی ضروری نہیں۔ اس سے تو کئی بیماری ہوتی ہے۔ کبھی
ہے کہ ایک فقیر آیا تھا اسے دیدیا۔ (پتہ نہیں اتنی سخاوت اور ہمدردی اس کے دل میں کہاں سے آ گئی) ایک
م اور ٹائمز کے دو سو روپے ملے تھے اور میں اسے جیب میں رکھے ہی ہینگر پہ ٹانگ دیا اور سو گیا۔ اس
رخرچ کرنے کا پلان بھی مرتب کر چکا تھا۔ سویرے دیکھا تو رقم غائب۔ دریافت کرنے پہ، بغیر اجازت
تم کیوں نکالی، کم از کم پوچھ لیا ہوتا کہ کس مد کے لئے محفوظ کر رکھی ہے۔ تنک کر کہنے لگی۔ جانتی ہوں تم اس کا
یا کروگے۔ دوستوں یاروں اور کلبوں میں خرچ کروگے ـــــ اس کے علاوہ اور کروگے بھی کیا؟ میں اس کا جا

[illegible] لیتی ہوں تو تمہیں بڑا لگ جاتا ہے۔ تم نے کبھی میرے حال پہ غور بھی کیا۔ کسی اعلیٰ تقریب میں جا نہیں [illegible]
[illegible] ۔ اگر سوتی کپڑے وغیرہ پہن کر جاؤں تو دیگر کی نگاہیں اٹھیں گی کہ ایک ایڈورٹائزنگ بیورو کے چو[illegible]
[illegible] نوں کے مترجم کی بیوی سوتی (تھرڈ کلاس) کپڑے پہنے ہوئی ہے۔ اس لئے میں نے وہ ساڑھی جو تم نے دوما[illegible]
[illegible] لے ڈی سی ایم سے لی تھی' ایک مصیبت زدہ عورت کو دے دی اور وہ میرے لئے موزوں بھی نہ تھی۔"

شمیم نے اب پھر مجھے مخاطب کیا۔ "اب تم ہی بتاؤ" یہ برداشت کرنے کی باتیں ہیں۔ آخر میرے بھی تو [illegible]
دوست ہیں۔ ملاقاتی ہیں۔ ان کے درمیان اپنی عزت کیسے بچے گی۔ دفتر جلدی سے نہ جاؤں تو سو دس آدمی سنا[illegible]
[illegible] سنے والے ہیں۔ بغاوت کردیں گے۔ میرے ایسا (شریف) آدمی ہے جو ایک لفظ بھی تلخ و ترش نہیں کہتا
[illegible] سب کچھ چپ چاپ برداشت کرتا ہے۔ وہ میری اس مہربانی کو میری کمزوری سمجھتی ہے۔ دوسرا ہوتا تو گردن میں
[illegible] تب انھیں سمجھ میں آتا کہ نازنخرے کی مدت اور قیمت کتنی ہوتی ہے۔

وہ بیوی ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہے۔ کبھی کبھی چولھا بھی گرمی کو ترس جاتا۔ گھر میں ایک ماما [illegible]
[illegible] سے بھگا دیا۔ اور اس پہ یہ طرہ کہ بیٹھی جاسوسی ناول پڑھ رہی ہے۔ پوچھنے پہ غصہ سے بولتی کہ اور رات کو گھوم[illegible]
[illegible] اؤ! پورے شہر میں میں ہی تو ایک آوارہ گرد ٹھہرا) گھر میں سامان لانے والا کوئی نہیں ہے۔ میں ایسی قسمت [illegible]
[illegible] ملی کہ بچے کو کیک کھلا کر سلا دیا۔ تمہاری وجہ سے پپّو بھوکا سو گیا —— میں پوچھتا کہ ماما کو کیوں چھٹی دے د[illegible]
اس کا پارہ اور چڑھ جاتا کہ تم نہیں سمجھتے۔ دو روز امورِ خانہ داری سنبھال کر دیکھو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے
[illegible] نانی یاد آنے لگے گی۔ وہ تو اللہ کی مہربانی کہو کہ تمہاری قسمت اچھی تھی کہ میری جیسی بیوی تم کو مل گئی اور ہوم منسٹ[illegible]
سنبھالے ہوئے ہے۔ (ورنہ ویسے اور تمہاری ہوم منسٹری میں کوئی خاص فرق تو تھا نہیں) دوسری لاتے تو [illegible]
[illegible] دنوں میں ہی چندیا کا بال اڑ جاتا......"

اس طرح وہ اپنی بیوی کی شان میں قصیدے پڑھتا رہا۔ میں نے اکتا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اور کسی طرح نیند [illegible]
کی آغوش میں چلا گیا۔ صبح آنکھ کھلتے ہی میں نے سوچا کہ معاملہ رفع دفع کرا دیا جائے۔ اس وقت شمیم پہ غصہ کا [illegible]
سوار ہے۔ ممکن ہے دونوں میں نا اتفاقی کی کوئی بات ہو جائے اور تیلی شہتیر بن جائے۔ بستر سے اٹھا اور [illegible]
گھسیٹتے ہوئے کمرے سے باہر نکلا۔

شمیم کا گھر میرے گھر سے قریب بیس گز کے فاصلہ پر ہے۔ آواز دے کر گھر میں داخل ہوا' دیکھا کہ محتر[illegible]
ہاتھ پہ ہاتھ دھرے گم صم بیٹھی ہیں۔ چہرہ پہ اداسیوں کا اچھا خاصہ اجارہ ہے اور اس بات کا [illegible] کر[illegible]
میں ابھی پورے طور پر ان کے روبرو ہوا بھی نہیں تھا کہ بول پڑیں۔ "میں آپ کے دوست سے [illegible]
آچکی ہوں۔ پہلے اگر زیادہ دیر کرتے تو رات کے گیارہ بجے تک آجاتے۔ میں نے بہت سمجھایا مگر نہ ما[illegible]
دل پہ جبر کر کے ان کی اس حرکت کو بھی گوارا کر لیا۔ مگر اب آدھی رات کو آنے کا معمول بنا رہے ہیں۔ آ[illegible]
رات لگ بھگ ایک بجے آئے۔ ان کے انتظار میں بارہ بجے تک جاگتی رہی (حتیٰ کہ تاریخ بھی بدل گئی) مگر و[illegible]
آئے' رات کے ایک بجے گھنٹی کی آواز سے کانوں کا پردہ پھٹنے لگا۔ اٹھ کر [illegible] آواز سنائی [illegible]

پتو برش کر چکا تھا۔ میں نے اسے قریب کر لیا اور سرگوشی کی۔ پتو گیا اور شمیم دوڑا ہوا آیا۔ مجھے اپنی بیوی کے ساتھ
بیٹھے دیکھ کر ھکا بکا رہ گیا۔ اس نے بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے حیرانی سے پوچھا۔ "تمہیں تو بچھو نے ڈنک مار دیا؟"
بیگم شمیم جل کر بولیں۔ "مارے تمہارے دشمن کو۔ تمہیں کس نے کہہ دیا۔"
میں نے بھابی کو آنکھ سے اشارہ کیا وہ بول پڑیں۔ "ہاں، تھوڑی دیر پہلے بچھو نے ڈنک مارا تھا اب ٹھیک
ہو کر موڈ آف کر لیا۔" مگر حسنین بھائی کے کمرے میں تم کیا کر رہے تھے؟ کیا وہیں سو گئے تھے؟ انھیں تنگ کر کے
دیا ہوگا۔ تمہاری ہوائی باتوں کو سچ مان کر ہمدردی میں گھر گئے ہوں گے تم نے میری خوب شکایت کی ہوگی؟
میں نے محسوس کیا کہ اب دونوں میں کچھ ہونے والا ہے۔ "کیا ہی بہتر ہو تا کہ آپ دونوں اپنی جنس تبدیل
ں۔" میں نے شمیم سے کہا۔ "تم بھی رات کہہ رہے تھے کہ جنس تبدیل کرا لینا چاہتا ہوں اور بیوی بن کر مزے
پا ہتا ہوں اور یہاں بھی الٹی گنگا بہہ رہی ہے۔ آپ بھی فرما رہی ہیں کہ تبدیلیٔ جنس ہی آخری مداوا ہے۔ اور
بن کر کیف حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ میرے خیال سے، یہ کیس نہایت ہی سیریس ہے۔ اگر تم واقعی تنگ آ گئے ہو تو
تبدیل کرا ہی لو اور بھابی کی بھی کرا دو۔
ان کی شکایت (انکے خیال سے) رفع ہو جائے گی۔ کچھ روز اس طرح گذارہ کرو، اس کے بعد بھی اگر سکون
ملے تو پھر یہ خیال بھولے سے بھی دل میں نہ لانا کہ جو پہلے تھے وہی بہتر تھے۔ تبدیلی سے کوئی لطف نہیں آیا۔"
دونوں ایک دوسرے کو چور نظروں سے دیکھنے لگے۔ یا دونوں ایک دوسرے کی چوری پکڑنے کی کوشش
نے لگے۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ دونوں چوری چھپے چوری پکڑنے میں اس قدر مشغول ہوئے جا رہے ہیں کہ میری
دگی معدوم ہوئی جا رہی ہے۔ میں نے اپنا گلا صاف کیا۔ وہ دونوں چونک گئے اور بیک وقت دونوں میرا منہ تکنے لگے
شمیم تم نے فرمایا درست، بالکل درست۔ عورت بن جاؤ۔ کل ہی مجھ سے کوئی کہہ رہا تھا کہ اٹلی میں چار ہزار
عورت بن گئے۔ عورت پن کے مزے بھی ہیں مگر سرکار انکے عورت پن کو تسلیم کرتے ہوئے ان کی بنیادی
ں کو نہ ماننے کا کوئی طریقہ ڈھونڈ نہ پائی ہے۔ اور محترمہ آپ! نہ معلوم تبدیلیٔ جنس کے بعد آپ کون سا بڑا نامی پہلوان
بنیں گی، جس سے دیش کا نام روشن ہوگا اور پردیشیوں میں آپکے دیش کا نام آپکی وجہ سے فخریہ لیا جائیگا۔"
"اگر ڈاکٹرز یادہ تیز طرار نکلا اور اس کے کمال سے آپریشن نے نیا رخ لیا تو سمجھ رہے ہیں آپ لوگ کیا ہوں گے؟
ں بیک وقت بول پڑے۔ "کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے؟" "ایسا ہونا کون مشکل کام ہے؟ ابھی چند دن پہلے کی بات ہے
رجن نے اپنے اسسٹنٹ کو ایک آپریشن کا کیس دیا اور سرجن نے جب مریض کو دیکھا تو اپنے اسسٹنٹ پر پھٹ پڑا۔ ایڈیٹ! تم نے
دیا؟ اسسٹنٹ نے جواب دیا۔ "سر، پوسٹ مارٹم" مگر یہ تو کیس آپریشن کا تھا۔" وہ دونوں بھونچکا سے ایکدوسرے
کھنے لگے جیسے ان دونوں میں کوئی چوکا یا کسی کو موقع ملا تو نکل جائیگا۔ "آپ لوگوں کے بدل جانے سے میرا تو کچھ
نقصان نہیں ہوگا۔ میری تو دونوں سے دوستی ہے۔ مسٹر شمیم سے اور مسز شمیم سے بھی۔"
میں واپس ہونے لگا تو دیکھا کہ دونوں ایک دوسرے کو غور سے تک رہے ہیں اور مسکرائے بھی جا رہے ہیں
ن انکھیوں سے میری طرف اشارہ بھی کئے جا رہے ہیں جیسے کہہ رہے ہوں زیادہ نگاہوں سے دیکھنے میں ذرا بھی دیر نہ کی۔

ڈاکٹر حیدر کرمڑی
دھارواڑ

ٹوٹتا ہے جو سو بہانوں سے — ایسے رہبر سے راہ زن اچھے
جو زباں کو کبھی لگام نہ دیں — کب ہوں ایسوں کے پھر سخن اچھے
شیخ جو کہیں، نہ گر کہیں مل جائیں — سیم بر اچھے سیم تن اچھے
جن میں مجنوں کبھی رہا نہ کوئی — جنگل اچھے وہ اور نہ بن اچھے

وہ جو ٹوٹے دلوں کو جوڑتے ہیں
وہ ہنرور وہ اہلِ فن اچھے

.....اور باقی خیریت

احسان نظام آبادی

٭ ٭ ٭

سب کے سب بیمار ہیں ہم اور باقی خیریت — ہو رہا ہے گھر میں ماتم اور باقی خیریت
بھو کے بچے بھو کی بیگم اور باقی خیریت — لڑ رہے ہیں روز باہم اور باقی خیریت
سارے کپڑے بک گئے اب شادی کی شروانی ہے — بن گئی وہ بیل باٹم اور باقی خیریت
ہو گیا ہوں دُبلا پتلا کلیجے کھا کھا کر مگر — بن گیا ہوں خالی کالم اور باقی خیریت
جب بھی میں لیتا ہوں تنخواہ جیب کتروں کا ہے ڈر — ان سے ہے پولیس کو انکم اور باقی خیریت
گھر میں کچھ بھی نہیں تو نہیں دل میں مدھو بالا کی یاد — جا رہی ہیں مغل اعظم اور باقی خیریت
ہنڈیاں ہیں لوٹ پوٹ اور چمچہ کرتا ہے سلوٹ — پھر بھی میں بولوں گا دِل کم اور باقی خیریت

ہے گرانی بھی زیادہ اور ہیں بچے بہت
ہو گا اب احساںؔ کا چہلم اور باقی خیریت

غزل

کرشن پرویز

گھر میں جب بیوی ہمارے آئے گی — کام سب چوپٹ یہاں پر پائے گی
گھر میں راشن ہے نہ بستر دوستو — وہ کہاں بیٹھے گی اور کیا کھائے گی
اُس کی آرائش کا بل جس دن ملے — نیند آنکھوں سے مری اُڑ جائے گی
صبح کو جلدی چلیں گے اُن کے گھر — ورنہ اپنی چائے ماری جائے گی

کار، کوٹھی، تو ہمیں ملتی نہیں
زندگی فٹ پاتھ پر کٹ جائے گی

عمر حنیف (امراوتی)

"میں ایک کلرک ہوں"

میں ایک نیم سرکاری (SEMI GOVT) آفس میں کلرک ہوں! میں خوش نصیب ہوں یا بدنصیب اس کے فیصلے کا اختیار تو مجھے ابھی تک حاصل نہیں ہو سکا۔ ہاں کچھ عرصہ پہلے اس اختیار کو ہاتھ میں لے کر میں نے فیصلہ کیا تھا۔ واقعی میں ایک بدنصیب انسان ہوں!! میری قسمت پھوٹی تھی جو میں ایسی جگہ آ بیٹھا، قلیل تنخواہ، مہنگائی سر توڑ اوپر کی آمدنی مختصر!

لیکن اب یہ اختیار میرے ہاتھوں سے نکل چکا ہے۔ اب میں یہی فیصلہ کرنے کے قابل نہیں رہا کیونکہ ابھی کچھ دن پہلے ہی میری حالت بدل چکی ہے۔ اب تنخواہ قلیل تو نہیں لیکن کبھی تنہائی میں سوچتا ہوں تو مختصر ضرور لگتی ہے شاید [illegible] لگتی ہو مگر جب سے کچھ اضافہ ہاتھ آیا ہے ایک نئی مصیبت سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ جس وقت گورنمنٹ کے کمیشن نے یہ اعلان اخبار کے ذریعہ شائع کیا [illegible] تنخواہیں بڑھ چکی ہیں۔ اس اعلان کے ساتھ ہی [illegible] اور اسی مقررہ وقت پہ ایک اور اعلان شائع ہوا [illegible] میں بھی پڑھ سکا کیونکہ یہ میرے اپنے گھر سے شائع ہوا تھا۔

جی ہاں! اس اعلان کی پبلشر میری اپنی بیوی [illegible] اس اچانک دھماکے سے تو ایسا لگتا ہے کہ دونوں اعلانوں کی کارروائی ایک ساتھ ہی ہوتی رہی ہوں گی۔ پبلشر (بیوی) نے یہ اعلان شائع کیا کہ "آج کے بعد صرف [illegible] کی ساڑیاں ہی باندھوں گی۔" —— یہ میری مختصر بیوی کا میری معقول تنخواہ کا بجٹ کر دیکھ کر مختصر اعلان تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جتنا بڑھاوا ہاتھ آیا

...یری کاٹ کی ساڑیوں اور سلک کے بلاوزوں کی نذر ہو گیا ـــــ اِدھر سے آیا اُدھر چلا گیا اور میں صرف سُوتی سن فرائزڈ کی قمیص کا منہ تکتا رہ گیا۔ بار بار قمیص کو اُتارتا۔ جھٹکتا۔ پھر پہنتا۔ پھر اُتارتا۔ پھر... !! میری بیوی نے میری یہ اوچھی حرکت دیکھی تو مجھے تیکھی نظروں سے گھورتی ہوئی یوں گویا ہوئی۔

"میں اچھی طرح سمجھتی ہوں تمہارے ان چھنوں کا مطلب، تمہیں میری یہ ساڑیاں کھٹک رہی ہیں نا ! لو ایسا کرو کہ یہ ساڑیاں واپس کر دو اور اس کے بدلے اپنی قمیص خرید لاؤ !"

لیکن یہ میری قوتِ مردانہ تھی (غیرتِ مردانہ بھی کہا جا سکتا ہے) جس کی بنا پر میں ایسی گھٹیا حرکت نہ کر سکا۔ ورنہ مرد کے نام کی ہتک ہو جاتی۔ خیر، میں اب پھر سوچ رہا ہوں کہ گورنمنٹ پھر کوئی ایسا گرما گرم اعلان کر دے تو میں بھی ایسے موقع پر اپنی طرف سے بھی اپنے گھر میں ایک گرما گرم اعلان شائع کر دوں ! ـــــ خیر ! اِدھر تنخواہ بڑھی اُدھر بیوی نے زمانے کا بیڑا اُٹھا لیا۔ !

اس مہنگائی کے دور میں، میں کبھی کسی فرمائش پر حامی نہ بھرتا۔ لیکن کیا کروں کمبخت مجھ سے وعدہ خلافی نہیں ہوتی اس لئے میں کوئی وعدہ بھی نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن کیا کروں زبردستی کرنا پڑتا ہے۔ کیوں کرنا پڑتا ہے ؟ کہاں کرنا پڑتا ہے بلکہ کس کا پڑتا ہے ؟ ـــــ معاف کیجیے میں اس راز کا پردہ فاش نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اگر میں ایسا کر گیا تو مجھے اُمید ہی نہیں پورا یقین ہے کہ میری انٹری کل ہی سے بند ہو جائے گی۔

تنخواہ معقول ہونے کے بعد میرا ایک بڑا نقصان یہ بھی ہوا کہ لوگوں نے مجھے (اوروں کو بھی) چائے پلانی ختم کر دی۔ اُدھر تنخواہ بڑھی اِدھر چائے گھٹ گئی ! معاملہ برابر ہو گیا۔ میرا تو دونوں ہی طرف سے نقصان ہوا ؟

بالائی بہ شکل اضافہ تدریجی ملی تھی۔ سو، وہ بیوی ہضم کر گئی۔ سوچا تھا تنخواہ کے بڑھتے ہی لوگ بھی زیادہ چائے پلائیں گے۔ لیکن افسوس کہ معاملہ اُلٹا ہو گیا۔ اب انہیں یہ بات کون سمجھائے کہ اضافہ تدریجی کی شکل میں جو زائد تنخواہ ملی وہ بیوی کی ساڑیوں اور اس کے دیگر اخراجات کی ادھیڑ بُن میں ہضم ہو گئی

چائے کا ذکر چل نکلا ہے تو یہ بھی بتانا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ چائے ہی میری سب سے بڑی کمزوری ہے۔ بلکہ یہ ہے بلکہ دیکھا بھی ہے کہ اگر کسی آدمی کو مارنا ہو تو اُسے بندوق کی گولی کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن آپ کو بتا دوں (راز کی بات ہے) مجھے مارنے کے لیے میری چائے بند کر دینی ہوگی ! میں نے کبھی خودکشی کرنے کے متعلق سوچا نہیں۔ لیکن اگر مجھے کسی دن خودکشی کرنی پڑی تو میں زہر نہیں کھاؤں گا ـــــ صرف مجھے آٹھ روز پہلے سے اپنی چائے بند کر دینی ہو گی ! ـــــ چائے کا شیدائی ہوں۔ بلکہ میں ہی کیا میرے پیشے کا ہر آدمی چائے کا ایسا شیدائی ہوتا ہے جیسے مکھیاں گڑ کی، بھنورا پھول کا، کیول کیچڑ کا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے اس وقت میری سروس بارھویں سال کے تیسرے مہینے کی دوسری تاریخ میں داخل ہو چکی ہے۔ آپ کو تعجب ہوگا لیکن مجھے کوئی تعجب نہیں ـــــ اس طویل عرصہ میں میں نے اپنی جیب کے پیسوں

بھی جائے اپنے حق میں نہیں انڈیلی، ڈیوٹی کے اوقات میں! یہ ہم لوگوں کا اصول ہے کہ ڈیوٹی کے اوقات میں اپنی
کی چائے نہیں پیتے۔ یہاں ایک راز کی بات بتا دیں کہ ڈیوٹی کے اوقات میں جو اہل غرض دفتر میں آتے ہیں ہمیں ان
کی دل شکنی منظور نہیں۔ ہماری اپنی چائے نوشی کے لیے تو ہمیں ۱۶، ۱۷ گھنٹے کا وقت باقی رہتا ہے۔ ویسے جو اہل غرض
ڈیوٹی کے اوقات میں ہم سے ملنے آتے ہیں۔ ان کا بھی تو خیال رکھنا ایک مہذب انسان کا فرض ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ
ان کی آفر کی ہوئی چائے بخوشی قبول کر لیتے ہیں۔ لیکن لوگوں نے کچھ اور ہی سمجھ رکھا ہے۔ اب انہیں کون کہاں تک
سمجھاتا رہے۔

ایک اور چیز سے آپ کو متعارف کراتا چلوں تو بہتر ہوگا ــــ ایک اور چیز جس سے میں بے حد محبت کرتا ہوں
ہے "اوپر کی آمدنی"۔ اس کا اور میرا (یعنی ہم دونوں کا) چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہی تو وہ شے ہے جس نے میری سا
دوائیوں کے بوجھ کو متوازن کر رکھا ہے۔ یہ میرا اپنا ذاتی تجربہ ہے کہ جیسے جیسے میری اوپر کی آمدنی بڑھتی ہے، ویسے
میرے گھر میں دوائی کا انبار بڑھنا شروع ہوتا ہے۔

بس آپ اب اتنا ہی سمجھ لیجیے کہ فی الحال کی پوزیشن میں میں بد نصیبوں اور خوش نصیبوں کے درمیان ایک مقام
معلق ہو کر رہ گیا ہوں ـ نہ اِدھر کا ہوں نہ اُدھر کا! خوش نصیبوں کی طرف چھلانگ لگانے کی کوشش کرتا ہوں تو ڈاکٹر پیچھے
کھینچ لیتا ہے۔ پھر بد نصیبوں کی طرف لڑھکتا ہوں تو "اوپر کی آمدنی" مجھے خوش نصیبوں کی طرف تھوڑا سا اچھال دیتی ہے
لیکن پتہ نہیں یہ کام راز داری میں ہونے کے باوجود بھی اس بات کا پتہ ڈاکٹر کو کیسے لگ جاتا ہے؟ ــــ اگر پتہ نہ لگتا
معلق پن کب کا ختم ہو چکا ہوتا ــــ نہ جانے میرا یہ معلق پن کب ختم ہوگا؟
ــــ میں آج ان دونوں کے درمیان لڑکھڑا رہا ہوں! لڑکھڑانے سے فرصت نہیں ملتی، یہی وجہ ہے کہ
میرے ساتھ فائلوں کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ طبیعت کچھ کرنے کو نہیں کہتی۔ ہاں صرف چائے پینے کو طبیعت چاہتی

ابو الکلام (کلکتہ)

"تیر و تیشہ"

* [illegible] ـــــ ہوتا ہے
غریبوں کو دولت کا
رئیسوں کو مال کا

اور

بنیاؤں کو اپنے علم کا

٭ ٭ ٭

* بہادری ـــــ دیکھی جاتی ہے
عالم دین کی حاکم وقت کے سامنے
سپاہی کی میدان جنگ میں

اور

مرد کی بیوی کے روبرو

٭ ٭ ٭

* امتحان ـــــ ہوتا ہے
طلبا کا امتحان گاہوں میں
دوست کا مصیبت کے وقت

اور

سیاسی لیڈروں کا الیکشن میں

٭ ٭ ٭

* [illegible] ـــــ ہوتی ہے.
عام آدمیوں کو آفیسروں کے پاس جانے سے
آفیسران کو قرضدار کا سامنا کرنے سے

اور

قرضدار کو ووٹروں سے

٭ ٭ ٭

* یاد ـــــ آتی ہے
شادی شدہ عورتوں کو مائیکے کی
شادی شدہ مردوں کو سابق معشوقاؤں کی

اور

بوڑھوں کو عہد شباب کی

٭ ٭ ٭

* محبت ـــــ دیکھی جاتی ہے.
دکھ درد کے وقت اپنوں کی
برے دنوں میں دوستوں کی

اور

عشق کا راز کھلنے پر بیوی کی

٭ ٭ ٭

* فکر ـــــ ستاتی ہے.
ریاض کو اسلام آباد کی
ماسکو کو افغانستان کی

اور

آچاریہ ونوبا بھاوے کو گائے کی.

٭ ٭ ٭

* ذکر ـــــ ہوتا ہے
حسینوں کا نوجوانوں کی مجلس میں
مئے و مینا کا رندوں کی محفل میں ـــــ اور
مزدوروں کے مسائل کا سرمایہ داروں کے میٹنگ ٹیبل پر

مصباح الدین ہاشمی (علی گڑھ)

دو شکار

بچپن میں بزرگوں سے یہ فقرے اکثر سنا کرتا تھا۔ "ایک تیر دو شکار" اور "ایک پنتھ دو کاج"۔ تو عجیب اُلجھن سی ہوا کرتی۔ سمجھ میں ہی نہ آتا کہ ایک تیر سے دو شکار کیسے کئے جا سکتے ہیں! ایک پنتھ سے دو کاج کیسے ہو سکتے ہیں؟

پھر میں بڑا ہو گیا۔ میرا حلقۂ احباب وسیع ہو گیا۔ ایک دن اپنے ایک جگری دوست کے پیروں میں خستہ حال چپل دیکھی تو میں نے بڑے ہی افسردہ لہجے میں وجہ دریافت کی۔ کہنے لگا کیا کروں یار! بہت دنوں سے مسجد جانا چھوڑ دیا ہے۔"

اپنے ایک اور جگری دوست کو دوپہر کی کڑی دھوپ میں کالج سے آتا دیکھا تو میرا دل تڑپ کر رہ گیا میں نے اسے اپنے پاس بٹھا کر بڑے ہی پیار سے سمجھایا کہ "ارے یار! چھوڑو کالج وا لج کا چکر۔ تمہیں کلرک تھوڑے ہی بننا ہے۔ تمہارے پاپا اکیلے پریشان ہو رہے ہیں اب تم اپنا کاروبار سنبھالو۔ کچھ دنوں کے بعد جھوٹ بولنے میں ماہر ہو جاؤ گے پھر الیکشن میں کھڑے ہونا اور منسٹر بن جانا، پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟"

انہوں نے مجھے الٹا ہی سمجھایا۔ "تم نہیں سمجھتے ہو یار! یہ سب تو بعد میں کرنا ہی ہے۔ ابھی مجھے ڈگری لینے دو جس سے ڈرائنگ روم کی خوبصورتی کے ساتھ میری قیمت میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔"

چچا محترم کو ایک اجنبی لڑکے پہچان پوچھتے دیکھا تو مجھے اچنبھا ہوا ــــ اور آخر چچا سے پوچھ ہی بیٹھا۔ "چچا جان! ایک غیر آدمی کے لئے آپ اتنا پریشان کیوں رہتے ہیں؟"

چچا جان کہنے لگے۔ "تم ابھی ناسمجھ ہو بیٹا، اس وجہ سے تو میری اتنی شہرت ہے کہ میں خیر خواہ ہوں۔ ایک طرف شہرت بھی ہو گی۔ دوسری طرف بیٹی کی شادی بھی اس لڑکے سے کر دوں گا اور میرا بوجھ بھی ہلکا ہو جائے گا۔"

اب میں ناسمجھ نہیں رہا۔ اب میرے ذہن میں "ایک تیر دو شکار" اور "ایک پنتھ دو کاج" کا مطلب پوری طرح واضح ہو چکا ہے۔

- ہاں یہ ایک اچھی رسم ضرور شار ہوتی ہے۔ بیکار سجاوٹ کا دکھاوا اور بجلی کا فضول استعمال بھلا کہاں کی عقلمندی ہے۔ جب کوئی بیچارا بیٹی والا جہیز کی پھانسی کے تختے پر چڑھ رہا ہوتا ہے تو اسے روشنیوں کا ایک ایک بلب بچھو کے ڈنک کی طرح کاٹتا ہے۔
- ہم جہیز کو گناہ سمجھتے ہیں، تبھی تو لوگ چوری چھپے جہیز لینے دینے لگے ہیں۔ مگر یہ فضول کی تڑک بھڑک بھی بند ہونی چاہئے۔ سماج کے لئے بجلی اتنی ہی ضروری ہے جتنا جسم کے لئے خون۔ کیا کوئی ناحق اپنا خون بہاتا ہے۔
- 1980-81 ء میں ہم نے 118 ارب 50 کروڑ یونٹ بجلی پیدا کی تھی۔
1981-82 ء میں ہمارا نشانہ 130 ارب یونٹ بجلی تیار کرنے کا ہے۔ مگر منزل ابھی دور ہے۔

سماجی برائیاں دور کرنا اور ملک کے مفاد کے لئے محنت کرنا ہمارا سب سے بڑا فرض ہے۔

نیا 20 نکاتی پروگرام

تفصیلی معلومات کے لئے درج ذیل کوپن استعمال کریں:

ڈپٹی ڈائریکٹر،
ماس میلنگ یونٹ،
ڈائرکٹوریٹ آف ایڈورٹائزنگ اینڈ وژول پبلسٹی،
L-1 کسٹمر بلڈنگ، ماتا سندری مارگ، نئی دہلی 110001

20 نکاتی پروگرام سے متعلق معلوماتی کتابچہ اردو / ہندی / انگریزی میں بھیجیں۔
نام ....
پتہ .... پن نمبر ....

شگوفے

مرسلہ :- ✱ محمد عبدالباسط دکھنی عنبرپیٹ (حیدرآباد) — ● صادق علی فریدی۔ محبوب نگر

✱ ایک آدمی کو مکان کی ضرورت تھی۔ اُس نے اخبا
ین خالی فلیٹوں کا اشتہار پڑھا اور فلیٹ دیکھنے پہنچ
لیا۔ فلیٹ دیکھنے کے بعد اُس نے کرایہ دریافت کیا۔ مالک
نے کہا۔ فرشی منزل کا کرایہ چار سو روپے، پہلی منزل کا کرایہ
ین سو روپے اور دوسری منزل کا ڈھائی سو روپے۔"
"اد معاف کیجیے گا۔ آپ کی عمارت میری حیثیت سے
طابق اونچی نہیں ہے۔" وہ واپس آگیا۔

.....◆.....

✱ کسی مقدمے کا ذکر ہے۔ پنڈت موتی لال نہرو
وئی بات سمجھانے کے لیے اُس کو بار بار دہرا رہے تھے۔
جج نے درمیان میں کہا۔ "آگے بڑھیے۔"
موتی لال آگے نہیں بڑھے بلکہ اُنہوں نے وہی
بات پھر دہرائی۔ جج نے جھلا کر کہا۔ "مسٹر نہرو!
کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں بے وقوف ہوں؟"
"قطعی نہیں مائی لارڈ! لیکن میں غلط بھی ہو سکتا
ہوں۔"

.....◆.....

✱ ہندوستان کے مشہور وکیل سر تیج بہادر سپرو ایک
راجہ کے مقدمے کی پیروی کر رہے تھے۔ عدالت میں بحث
کر رہے تھے۔ عدالت میں بحث کرتے ہوئے اُنہوں نے باندی
کا لفظ کئی بار دہرایا۔ جج انگریز تھا۔ وہ اس لفظ کا مفہوم
نہیں سمجھ سکا۔ اُس نے پوچھا۔ "باندی کے کیا معنے ہوتے
ہیں؟"
"مائی لارڈ!" سپرو نے جواب دیا۔ "راجاؤں کی
شادی شدہ زندگی کی جو موٹر ہوتی ہے باندی اس کی
اسٹپنی کا کام کرتی ہے۔"

● ٹرین دھیرے دھیرے اسٹیشن چھوڑ رہی تھی۔ دو آدمی
ٹرین کے ساتھ تیزی سے بھاگ رہے تھے۔ اندر بیٹھے ہوئے ایک مسافر
نے ایک کو بڑی مشکل سے اندر کھینچ لیا اور کہنے لگا۔ "خدا کا شکر ہے
کم از کم تم اکیلے تو گاڑی میں آسکے۔" اُس آدمی نے افسوس کیسا تھ کہا
"لیکن میرے دوست کو سفر کرنا تھا میں تو اُسے سوار کرانے آیا تھا۔"

.....●.....

● ٹرین میں جگہ نہیں تھی۔ اسٹیشن پر ٹرین ٹھہری تو ایک
خوبصورت لڑکی سوار ہوئی۔ اس لڑکی کو وہاں ٹھہرنے کیلئے جگہ
نہیں تھی پھر بھی بمشکل تمام وہ کھڑی رہ سکی۔ ایک نوجوان نے اُٹھ کر
اپنی سیٹ دینی چاہی لیکن لڑکی نے اسکا شکریہ ادا کیا اور اُسے اپنی
جگہ بیٹھے رہنے کیلئے کہا۔ جب بھی نیا اسٹیشن آتا تھا مسافر آتے تھے
جاتا ایک بھی نہیں تھا اور ہر بار وہ لڑکا اُٹھ کر اس لڑکی کو بیٹھنے
کہتا لیکن لڑکی زبردستی اُسے بٹھا دیتی شکریہ ادا کرتی۔ آخر ایک اسٹیشن
پر لڑکا اُٹھا اور کہنے لگا۔ "محترمہ تشریف رکھیے۔" لڑکی بولی
"جی نہیں آپ ہی بیٹھیے۔" لڑکا غصہ سے بولا "یہ کیا مذاق ہے ہر
اسٹیشن پر مجھے آپ بٹھا دیتی ہیں۔ مجھے تو پچھلے دو اسٹیشن سے پہلے
ہی اُترنا تھا۔ آپکی زبردستی تھی کہ میں بیٹھا رہا۔"

برق و شرر : مستقل کالم

برق آشیانوی

پاجامہ

معلوم ہوا ہے حکومت اسپین نے امریکہ سے منگوائے جانے والے پائجاموں پر مکمل پابند
کر دی ہے۔ کیونکہ ڈاکٹروں کے مطابق ان پائجاموں کے پہننے سے سرطان کا مرض پیدا ہوتا ہے۔ ج
ریشے سے یہ کپڑا بنایا جاتا ہے اس کے جسم سے لگنے سے سرطان پیدا ہوتا ہے۔
یہ جان کر ہمیں بے حد رنج ہوا۔ کیونکہ یہ بڑی بے جا حرکت ہے۔ اگر امریکہ کو ایسے جامے بھی
تھا کہ جن کے پہننے سے سرطان کا مرض لاحق ہوتا ہے تو کوئی اور جامہ بھیجتا تھا لیکن پائجامہ نہیں بھیجنا
اس کی تفصیلات میں جانے سے کئی ناگوار پہلو نکلتے ہیں اس لئے ہم اس کی تفصیلات میں نہیں جاتے۔ البتہ امریکہ
مقصد دینا چاہتے ہیں کہ وہ پائجاموں کے ذریعہ کسی ملک کے باشندوں کو کسی موذی مرض میں مبتلا کر
کوئی کھانے کی چیز یا پینے کی شئے بھیج کر بھی یہ مقصد حاصل کیا جاسکتا تھا۔ یا پھر پہننے کی چیز ہی بھیجنا
تو کرتے بھیجتا یا پھر ٹوپی بھیجتا۔ ٹوپی پر ایک بات یاد آگئی۔ امریکہ کئی ترقی پذیر ممالک کے سر پر ٹوپی ڈال
چکا ہے اور کئی ممالک کو ٹوپی ڈال کر مفید نتائج حاصل کر چکا ہے۔ ٹوپی سر پہ پہنی جاتی ہے اور سر
پیدا کر کے بھی اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے۔ ٹوپی پہنانے سے سر کو اپنی طرف
جاسکتا ہے۔ اگر ٹوپی کے ذریعہ بھیجوں میں ایسے خیالات پیدا کر دیئے جائیں۔ جن سے ٹوپی پہننے وا
حکومت سے بغاوت کر کے حکومت کا تختہ الٹ دیں تو امریکہ اس تختے کو پلٹنے کے لئے حکمران طبقہ کو امداد
کھل کر سے نہ صرف ہتھیار فراہم کر سکتا ہے بلکہ ہتھیاروں کے استعمال کی غرض سے خود بھی اس ملک
جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ امریکہ کے تیار کردہ ہتھیاروں کا استعمال جاننے والے اس ملک میں نہیں ہوتے۔
کسی ملک کے داخلی معاملات میں بہ ذات خود دخل انداز ہو کر پوری طرح اپنی گرفت میں لے سکتا ہے۔
روس نے افغانستان میں بڑی کامیابی کے ساتھ کھیلا اور ابھی کھیلا جا رہا ہے۔
ٹوپی کے علاوہ کرتا بھیجنا بھی کچھ کم کارآمد نہیں ہوتا۔ کرتے کے ذریعہ سینے کے اندر کے اعضا

مرض میں مبتلا کر دیا ہے۔

لیکن ہمارے ملک میں ہمارے ملکی بھائی خود اپنے بھائیوں کو زہریلی غذائیں، نقلی دوائیں دے کر خطرناک امراض میں مبتلا کر رہے ہیں بلکہ بعض اشیاء سے تو بالاقساط روح بھی قبض کر رہے ہیں۔ بلکہ ایسی چیزیں ملتی ہیں کہ اقساط کا بھی انتظار نہیں کیا جاتا بلکہ یکمشت ہی جان لے لیتے ہیں۔ اس کے ثبوت میں ہم آئے دن کی خبروں کی طرف توجہ منعطف کرواتے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مقام پہ زہریلی غذا کے استعمال سے کئی لوگ گھروں پہ فوت اور کئی لوگ دواخانوں میں شریک ہو کر "جاں بحق" نہ ہو سکے۔ ونیز زہریلی شراب پی کر بھی کئی لوگوں نے اپنی جانِ عزیز 'جان آفریں' کے حوالے کر دی۔ ان میں عورتیں بھی شامل ہوتی ہیں، حالانکہ ایک زمانہ تھا ہمارے دیس کی عورت شراب کے نام سے تک واقف نہ تھی۔

ہمارے ملک کے حالات پہ جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں امریکہ سے کوئی شکایت باقی نہیں رہتا۔ ... لئے کروہ "اسپین" کو ایک خطرناک مرض میں مبتلا کر رہا ہے۔ ہمارے ملک میں تو خود اپنے ملکی بھائیوں کو نہ صرف خطرناک امراض میں مبتلا کیا جاتا ہے بلکہ اُن کی جانوں سے کھیلا جاتا ہے۔ ▲

(مراسلے)

خرافات

نمبر پی۔ اے/گورنر۔ ۸۲/۱۶۹
راج بھون۔ پنجاب، چنڈی گڑھ
کیمپ ہیم کنج۔ شملہ
۱۶ مئی ۱۹۸۲ء

عزیزمن۔

میرے پرانے کاغذات میں آپ کے ماہنامہ جریدہ شگوفہ اکتوبر ۱۹۸۰ء میں شائع شدہ ایک کارٹون "پھر ملیں گے" میری نظر سے گذرا۔ میں نہیں جانتا کہ "پھر ملیں گے" سے مراد آپ کے ذہن میں واضح طور پر کیا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس کا مطلب صرف حیدرآباد یا آندھرا پردیش میں اقتدار پر واپسی ہے۔ میں اب پنجاب میں کافی دور ہوں۔

مجھے اُمید ہے کہ آپ بخیر ہونگے

بہترین خواہشات کے ساتھ

آپ کا مخلص
دستخط
ایم چنا ریڈی

[ڈاکٹر ایم چنا ریڈی آندھرا پردیش کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے تو ہم نے شگوفہ کے ٹائیٹل پر تصویری کارٹون شائع کیا تھا۔ جسے عنوان "پھر ملیں گے" دیا گیا تھا۔ ہمیں یقین تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو بہت جلد کسی نہ کسی اہم عہدہ کا پیشکش ہوگا۔ چنانچہ پنجاب کے دھماکو سیاسی حالات کے پیش نظر ڈاکٹر ایم چنا ریڈی کا گورنر کی حیثیت سے انتخاب ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے گورنری کے جائزہ کے بعد "پھر ملیں گے" والے کارٹون کی یاد تازہ کرتے ہوئے ہمیں مذکورہ بالا خط لکھا۔ جس سے ان کی اردو رسالوں پر نظر، نکتہ رسی اور بیدار مغزی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہم نے اس خط کے جواب میں ڈاکٹر صاحب کو لکھا ... "بحیثیت ایڈمنسٹریٹر و سیاستداں آپ کی کارکردگی و عظمت کے پس منظر میں "پھر ملینگے" والا کارٹون بنایا گیا تھا کہ سیاسی اُتھل پتھل تو مرتی ہوتی ہے۔ لیکن کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جو پانی کے جھاگ کی طرح اُبھر کر عام سطح میں مل نہیں جاتیں، بلکہ سکوت ہو کہ طوفاں، مقتدر ہوں کہ بحیثیت عام انساں، اپنی کامیابی کے دائم انفرادیت کو قائم رکھ کے اپنے عزائم کے ساتھ آگے بڑھتی جاتی ہیں۔ سیاسی اُفق پر نمودار ہونے والی ایسی روشن شخصیتوں میں آپ کا نام آتا ہے" ــــ مدیر]

❖ ❖ ❖

ـــ مصطفےٰ بھائی۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔
آپ کا شگوفہ متواتر مل رہا ہے۔ شکر گذار ہوں۔
بہتر سے بہتر ہوتا جارہا ہے۔ یقیناً ایک دن بہترین ہو کر رہیگا

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر
نئی دہلی

— مشفق جناب مصطفیٰ کمال صاحب، تسلیمات۔
[illegible] صاحب کی نوازش اور آپ کی بدولت
شگوفہ کے چند شماروں کا پارسل مع عنایت نامہ موصول
ہوا۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔ دفتر سے
[illegible] پر سرسری نظر ڈالی مگر کمبخت "پکوڑ نمبر"
[illegible] تھا کہ رات کی نیند غارت ہوگئی۔ بیگم نے
[illegible] ہرچند کہ خلاف وضع و دستور نہ تھیں، کیں۔
دوسرے دن دفتر میں اونگھتے رہنے کا شغل دیکھ کر اکثر
[illegible] کو افیون نوشی کی لت کا شبہ بھی ہوا۔ مگر یہ سب
ہنستے ہنستے خوشی گوارہ کیا۔ اور آپ کی مغفرت کی صدق دل
سے دعا کی۔ زندگی میں مسکراہٹوں کی اس قدر کمی ہے کہ
[illegible] معمولی کوشش بھی قابل قدر ہے۔ پکوڑ نمبر تو
[illegible] کی چیز ہے۔ دوسرے پرچوں میں بھی یقیناً
[illegible] ہوں گی۔ بانگی دیکھ جی خوش ہوگیا۔ برادرم
[illegible] صاحب سے مدت سے یاد اللہ تھی لیکن موصوف
کے کمال سے کہ ایسی شگفتہ نثر لکھتے ہیں میں بالکل واقف
نہ تھا۔ اس سے موصوف کے کمال پر تو کوئی حرف نہیں
آتا لیکن میری اپنی جہالت کا مکمل ثبوت بہم پہنچتا
ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں علم و فضل کا دعویدار بھی نہیں ہوں۔

وارث رشید قدوائی
(نئی دہلی)

❖ ❖ ❖

— مارچ اور اپریل کے شمارے بہت اچھے رہے۔
اُمید کرتا ہوں کہ شگوفہ اسی طرح ملتا اور کھلتا رہے گا

سید انیس احمد ۔ دوحہ (قطر)

❖ ❖ ❖

— شگوفہ کا تازہ شمارہ نظروں سے گزرا۔ ماشا اللہ
بہت خوب تھا۔ غزلوں اور نظموں کا انتخاب خوب ہے۔
خدا سے دعا ہے کہ یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہے۔

اقبال شانہ ۔ نظام آباد

زندہ دلانِ حیدرآباد
کا ترجمان
ماہنامہ
شگوفہ
حیدرآباد
جلد ۱۵
شمارہ ۷
ایڈیٹر:
سید مصطفیٰ کمال
مجلسِ ادارت:
حمایت اللہ
منظور احمد
مسیح انجم
جولائی
۱۹۸۲ء
ٹائیٹل: طالب خوندمیری
کتابت: فہیم احمد۔ مسعود انور
قیمت فی پرچہ ۳ روپے
زرِ سالانہ: انفرادی: ۲۵ روپے
لائبریری: ۳۰ روپے
بیرونِ ہند سے: ۹۰ روپے
مجلسِ مشاورت:
راجندر سنگھ بیدی
بھارت چند کھنہ
خواجہ عبدالغفور
نریندر لوتھر
مجتبیٰ حسین
منیجر:
مسیح انجم
طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان حیدرآباد ۲
شگوفہ ۴۳۔ میجسٹک کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱
فون: 57716

چاہیئے کہ جو بھی مستقبل کو جیلوں کی نذر کرنے کے لئے تیاریاں کرتے رہیں انہیں اس بات کا بھی تیقن ہو کہ جیل میں ان کی زندگی نہ صرف امن چین کی ہوگی بلکہ ان سے مالی منفعت کے کام بھی لئے جائیں گے تاکہ جب وہ باہر آئیں تو ان کے ساتھ سرمایہ بھی ہو۔

تجویز کی گئی ہے کہ اسی طرح جیلوں کے اندر بھی اس کے مکینوں کے لئے وقتاً فوقتاً ایسے امتحانات رکھے جائیں جن سے ان کی فکر و فراست اور سوجھ بوجھ کا محاسبہ ہوتا رہے اور دماغی اعتبار سے ذرا سی بھی خامی نمایاں ہو تو ماہر نفسیات سے ان کا علاج معالجہ بھی ہونا چاہیئے اور جو کبھی یہ معلوم ہو کہ جیل میں رہنے والے یا جو جیل بیمار تندرست بااعتبار سے گنے جا سکتے ہیں تو جیل سے ان کی فوراً چھٹی کر دی جانی چاہیئے تاکہ بلند معیار قائم رہے۔ اور پھر زندان محض "زندہ درگور" کا ٹھکانہ ہی نہ بنا رہے باقاعدہ امتحان معائنہ کے علاوہ شخصی طور پر سرکاری پرسش اور زبانی سوال جواب بھی ہونے چاہئیں کہ جیل خانہ کی زندگی اور وہاں کے ماحول میں اس کو کیا خوبیاں ملتی ہیں جن کی وجہ سے وہ داخلہ چاہتا ہے اور کن وجوہات کی بنا پر وہ سمجھتا ہے کہ اس کو وہاں کی زندگی راس آئیگی۔ اگر امتحان میں وہ کامیاب نہ ہو اس کا انٹرویو اس کی اہلیت کو ثابت نہ کر سکے تو ایسے امیدوار کو داخلہ نہ دیتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ کچھ عرصہ کے بعد پھر سے درخواست پیش کرے اور اس درمیان میں ہو سکے تو مزید کچھ جرائم کا وہ مرتکب ہو سکتا ہے کسی بینک کو لوٹ سکتا ہے چوری ڈکیتی کر سکتا ہے۔ تاکہ اس کی کارگزاری کے پیش نظر اسکو از سر نو موقعہ دیا جا سکے۔

یہ اعتراض بجا طور پر ہو سکتا ہے کہ اس طرح کی باریکیوں سے بہت کم لوگوں کو داخلہ کا موقعہ ملے گا۔ یہ ٹھیک ہے لیکن حکومت کو ٹیکس دینے والوں کو اس کا اطمینان ضرور ہونا چاہیئے کہ ان کے روپیہ پیسہ کا صحیح صرف ہو رہا ہے اور سرکاری اداروں کی کارکردگی کا معیار نہ صرف بلند ہوا ہے بلکہ اطمینان بخش بھی ہے آج کل ہم ہر طرف یہی دیکھ رہے ہیں کہ جیلوں کے باہر کی دنیا سے بڑھ کر اندرون زندان ناشائستگی، اور قابل نفرت جرائم ہو رہے ہیں۔ فی الواقعی ضرورت ہے کہ اصلاح کے اس قسم کے اقدام کئے جائیں تاکہ ہمارے معاشرے میں گھناؤنے مرکز باقی نہ رہیں۔

مجوزہ بالا تجاویز کی روشنی میں ہم ہندوستان کے اس دور کو یاد کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ جب ہماری جیلیں مہاتما گاندھی، پنڈت موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، [illegible] گاندھی وغیرہ جیسی سینکڑوں عظیم المرتبت ہستیوں کا مسکن رہا کرتی تھیں اور یہاں [illegible] مشہور اور معرکۃ الآرا کتب لکھی گئیں۔ اگر آج بھی جیلوں کو یہ معیار نصیب ہو تو [illegible] کی کمی نہیں، کبھی وجود میں نہ آتی!

طارق جامی
(حیدرآباد)

زندہ دلانِ حیدرآباد

[* یہ مضمون ہمیں مئی ١٩٨٠ء میں ملا تھا۔ دو سال تک کاغذات میں کہیں گم رہا۔ اور جناب طارق جامی نے سمجھا کہ مضمون کی "ترشی" اس کی اشاعت میں مانع رہی۔ ایسا ہوتا تو ہم کس منہ سے زندہ دلانِ حیدرآباد کی ترجمانی کا حق ادا کرتے! ——— (مدیر شگوفہ)]

ایک زمانہ تھا کہ لفظِ مرکب "زندہ دلان" کا استعمال صرف اہلِ لاہور کے لئے کیا جاتا تھا۔ (یا کم از کم ہم نے ایسا ہی سُنا) اور پھر مختلف موقعوں پہ اہلِ لاہور کی کارکردگیوں کے پیشِ نظر اس لقب کی تجدید و توثیق بھی ہوتی رہی۔ کھانے پینے کا معاملہ ہو یا گپ شپ کی منزل، اہلِ لاہور زندہ دلی کی ایک مبالغے سے بھرپور مثال بن کر سامنے آتے رہے ہیں۔ مشاعرہ ہو یا جلوہ، اہلِ لاہور کے حوصلے اور ولولے ہمیشہ یکساں رہے ہیں۔ اسلئے لاہور کے مشاعرے اور [illegible] شاعر اور پہلوان بھی خاصے نامور ہوئے ہیں۔ مگر اب ایک عرصے سے (جب سے ہم نے شگوفہ پڑھنا شروع کیا) حیدرآباد میں بھی "زندہ دلان" کا سابقہ سُن سُن کر ہمارا اشتیاق بڑھتا ہی جا رہا ہے کہ کہیں حیدرآباد [illegible] ہے۔

لاہوریوں کی زندہ دلی میں نو گز لمبے تہمد، تقریباً اتنی ہی بھاری بھر کم پگڑی اور تین فٹ طویل لسی کے گلاس کو بھی بہت دخل ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہاں جملے، جگت، اور گالی کی بھی قریب قریب یہی ترتیب ہوتی ہے۔ معلوم نہیں، حیدرآباد کو یہ شرف حاصل ہے یا نہیں۔ دوسری خاص بات یہ کہ لاہور میں صرف دو طبقے ہی زیادہ مشہور اور مقبول ہیں، شاعر اور پہلوان۔ اور اس میں بھی اہم پہلو یہ ہے کہ لاہور کا شاعر دوسرے علاقوں کے پہلوانوں جیسے ڈیل ڈول کا مالک ہوتا ہے اور لاہور کی پہلوان دلی کے شاعروں جیسی صحت کا حامل۔ اسی لئے وہاں ایک دوسرے کو "پہلوان جی" کہنے کا رواج اب محاورے کی طرح عام ہے۔ باہر کے لوگ اپنی غیر معمولی صحت کے پیشِ نظر لاہور کو زندہ دل قرار دیتے ہیں۔

حیدرآبادی زندہ دلی سے پہلے ہم صرف اس روایت اور تہذیب سے آشنا تھے جو
حیدرآباد کے علاوہ صرف لکھنؤ کو حاصل ہے۔ اور جس کے بارے میں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے
[illegible] تھا کہ ہندوستان میں صرف دو شہر ہیں لکھنؤ اور حیدرآباد باقی سب گاؤں ہیں۔ مگر کافی عرصے سے
[illegible] جو اخباروں رسالوں کی بازگشت پر غور کیا ہے تو معلوم ہوا ہے کہ حیدرآباد ایک تہذیبی علامت
[illegible] نہیں، زندہ دلی کی اقامت بھی ہے۔ پھر حیدرآباد کے مسالے تھے۔ جو دال سے لیکر بریانی تک اور
نرگسی کوفتوں سے [illegible] قسم کے افسانوں تک [illegible] میں ملوث تھے۔ یوں یہ بات طے سمجھی جانے
لگی کہ دنیا بھر میں جہاں اور جس جگہ بھی کسی کو [illegible] آتی ہوں، سمجھ لیجئے کہ وہ حیدرآبادی ہے یا
وہ کسی حیدرآبادی کی زد میں ہے۔ اس حد تک تو سب ٹھیک ہے کہ زندہ دلی کیلئے ایسے فرسودہ سہاروں
کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔

پھر ایک دن ہمیں کچھ یوں سوجھی کہ حیدرآبادی زندہ دلی کا تجزیہ کیا جائے۔ ہمارے تجزیے
کے نتیجے میں انکشافات ہونے لگے، جن میں سے کچھ سنسنی خیز بھی تھے۔ اپنے [illegible] پر شبہ
ہونے لگا۔ کبھی اپنی پنجابی دانی پر شک کی نگاہ ڈالتے اور کبھی ایسا لگتا حیدرآباد کا ہر شہری اپنے
الگ لب و لہجہ کا حامل ہے۔ ہم نے آغازِ گفتگو کے طور پر ایک قریبی ہمسائے کو پکڑا کہ عرصہ دراز سے جدہ
میں مقیم ہیں اور ہماری اقامت گاہ کے قریب ہی رہتے ہیں۔ عرض کیا: "السلام علیکم" جواب ملا۔
"مسا الخیر! ایش [illegible]؟" آپ اردو جانتے ہیں؟ "لا انا ما ادری" [illegible] "زبان یار من عربی" یہ عجب کرشمہ ہے
ہم اردو بولتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں مگر جواب نہیں دیتے۔ حالانکہ اوپر ان کے گھر میں بچوں کا ایک
پورا پرائمری اسکول قائم ہے اور جو دن رات والدین کی اردو سمجھتے ہیں اور ٹھیک ٹھیک عربی میں
جواب دیتے ہیں، خیر ہم نے انہیں چھوڑ دیا۔

شام کو ان کے غریب خانے پر پھر دستک دی کہ ان کے والد صاحب موجود ہوں گے۔ وہ تشریف لائے
سلام کیا، وعلیکم [illegible] دل باغ باغ ہوا کہ چلو کوئی تو ہم زبان ملا۔ گفتگو شروع کی کہ [illegible] اب
جواب ندارد، [illegible] ہو گیا۔ توقف سے اور قدرے زور سے بولے "کیا چاہیے؟" ہم سمجھے اونچا سنتے
ہوں گے۔ عرض [illegible] کہ جواب ذرا [illegible] گرج کر بولے "آپ بولو میں کوئی
بہرہ تو نہیں!" [illegible] کان [illegible] پھر توقف سے ارشاد ہوا "آپ کو کیا چاہیے"
عرض کیا [illegible] "دیکھیے، وہ چاول پکانے کیلئے" ساتھ ہی ہاتھوں سے [illegible] کی وضاحت
کرنے کی کوشش کی، بولے "اچھا تو [illegible] کے لئے۔ تو بھئی چاول بولنا" ہم ذہن کے ذہن
دھرے رہ گئے۔ [illegible] ریڈیو [illegible] سنتے ہیں [illegible] میں یہ لہجہ
کا وقت ہوتا ہے۔

دوسرا [illegible] زندہ دلی کو [illegible] حیدرآبادی [illegible] کے خوب

"کہ ہمارے اگلی پچھلی زندہ دلی کو نذر نیند ہو جاتا ہے۔

...کے ہمراہ تکیۂ کلام کے طور پر سرگانی میں تھا مگر بات کا مطلب ہو حیدرآبادی زندہ دلی کا ایک لازمی جزو ہے۔ مخاطب سمجھتا ہے آپ سوال کر رہے ہیں۔ احمد میاں نہیں آئے نا! اور ہوگا یہ کہ وہ ہیں بیکار سے ہو رہے گے کہ احمد میاں نہیں آئے۔ اس میں گھبراہٹ یوں ہوتی ہے کہ سر یوں ہلتا ہے جیسے ہم نا اہل زبان کسی سے استفسار کرتے وقت ہلاتے ہیں۔

زندہ دلانِ حیدرآباد میں مدیر شگوفہ کا "شگوفہ" بطور وزنِ کلام شامل رہتا ہے اور غالباً یہ واحد سبب ہے کہ زندہ دلان کے مجادلے اور مشاعرے جاری و ساری رہے ہیں اور زندہ دلی کے جشن منائے جاتے ہیں۔ حیدرآباد سے ہماری یادداشت صرف اسی ماہنامے کے بدولت چلی آتی ہے ورنہ زندہ دلوں کو ہم بہت عرصے سے ملتے چلے آئے ہیں۔ مگر اب محسوس ہوتا ہے کہ جو بات زندہ دلوں میں ہوتی ہے وہ "شگوفہ" میں نہیں ملتی۔ ایک صاحب پچھلے سال کا واقعہ سنا رہے ہیں مگر پچھلے سال کو پرسوں کہے جا رہے ہیں اور یوں سب شمار زندہ دلوں کو جب ماضی کی پوری تاریخ پرسوں کے حوالے سے بیان کرتے پایا تو لگا کہ دلی دکنی ابھی پرسوں ہی گزر رہے ہیں۔ اور غالب یہیں کہیں ہمارے پڑوس میں رہ رہے ہیں۔ حیدرآباد سے منسوب ان زندہ دلیوں کی وجہ سے جی چاہتا ہے کہ اب حیدرآباد کو "حیدرآبادِ زندہ دلاں" کہا جائے۔

"شگوفہ" ان زندہ دلیوں کی تصویریں کھینچتا رہتا ہے مگر کبھی کبھی دھوپ تیز ہونے کے سبب روشنی بڑھ بھی جاتی ہے اور تصویر دھندلا بھی جاتی ہے۔ ہم حیدرآباد سے محبت کرتے ہیں۔ لہٰذا جی چاہتا ہے تصویریں صاف آئیں۔ ہم نے ایک آدھ تصویر صاف کرنے کی کوشش کی ہے۔ ▲

اسمٰعیل ظریف

پتی پڑھا کے لوگوں کو محفل میں لائیے
چار غزل سنائیے اور چھت اڑائیے
بلبل لڑائیے کبھی مرغے لڑائیے
دنیا کو یہ کمال بھی کر کے دکھائیے
جینے کا کچھ سلیقہ انہیں بھی سکھائیے
بچوں کو اپنے ہر نئی پکچر دکھائیے
جو کچھ وہاں سلوک ہوا بھول جائیے
اب بھول کر بھی ان کی گلی میں نہ جائیے
منڈی کھلی ہے لڑکے کو بکواتے جائیے
بولی جہاں لگے وہاں شادی رچائیے
دعوت ہو شمع محل تو اُسے ٹال جائیے
لیکن اکیلے جائیے کھانا نہ کھائیے
فرصت نہ ہو تو عقد میں شرکت نہ کیجئے
اخلاق حیثیت سے ولیمہ میں جائیے
دعوت کے ماہرین میں ہے بھائی کا شمار
چوتھی میں ان کے ساتھ سنبھل کر ہی جائیے
شب خون مارتے ہیں یہ کھانے کی میز پر
حملے سے ان کے مرغ کی ڈش کو بچائیے
گر ان کے ہاتھ لگ گیا چمچہ تو پھر حضور
بریانی کو بگھاری سمجھ کر ہی کھائیے
نمبر پرانی کار کا آتا نہیں نظر
اب تو حضور نمبری چشمہ لگائیے
جھکتی ہے دنیا اس کو جھکانے کے واسطے
چہرے پہ اپنے الٹا ہی چہرہ سجائیے
ہم سنتے سنتے آپ کو بور ہو چکے ظریف
اب آپ اپنے بیٹے کو شاعر بنائیے

سوز گڑھوی

شادی نامہ

والدِ محترم نے ڈٹ کے کہا / "میرے لڑکے کو کار دیجئے گا"
منمنا کر کہا یہ سمدھی نے / "مجھ کو بے موت مار دیجئے گا"
والدِ محترم نے رحم کیا / "نقد ہی دس ہزار دیجئے"
گڑگڑا کر کہا یہ سمدھی نے / "مجھ کو لڑکا اُدھار دیجئے"
والدِ محترم گرج اُٹھے / "کیا یہ ہے مہر جو قصہ
ناں نقد بھی مجھ کو دینا ہے / خود کو بنیوں کا زیرِ بار
تنگ آکر کہا یہ سمدھی نے / "میری غلہ کی اک دکان ہے
آکے رہیئے بھی آپ میرا
میرا اک دوسرا مکان بھی

مجیب الرحمٰن بزمی

طبیعت ہے بہت بیکل تمہارے بن اجی جانم
سکوں دل کو نہیں اک پل تمہارے بن اجی جانم
تم آئے تھے تو اپنے گھر میں رونق تھی، بہاریں تھیں
وہی گھر بن گیا جنگل تمہارے بن اجی جانم
گزر جاتا ہے دن میرا مگر جب رات آتی ہے
بہاتا اشک ہوں ہر پل تمہارے بن اجی جانم
خیالوں اور خوابوں میں تمہاری یاد آتی ہے
سنو! ہو جاؤں گا پاگل تمہارے بن اجی جانم
یقیں ہے اپنے بزمی کو نہیں پہچان پاؤ گی
سراپا ہے بنا سائل تمہارے بن اجی جانم

غزل

فراز وارثی

قطعات

چندہ

کبھی یہ شیخ لوگ اس طرح رقمیں پیش کرتے ہیں
کبھی افسر کو حاصل ہوں تو یہ رشوت کا دھندا ہے
مگر شخصیتوں کے ساتھ لیبل بھی بدلتے ہیں
سیاست کی زباں میں تمام انہیں رقموں کا چندا ہے

شجرہ

ہدف ہر ایک کو طنز و تمسخر کا بناتے ہیں
نہایت فخر سے افضل اپنے شجرہ کو بتلاتے ہیں
یہ حضرت ہنستے ہیں جب دوسروں کے چاک داماں پر
تو اپنے گھر کے روشن دان و دروازے بھول جاتے ہیں

ناکارہ اولاد

آبدیدہ ہو کے بولے شیخ جب پوچھا مزاج
کیا بتاؤں دونوں لڑکے باعث آزار ہیں
پہلا بیٹا آرٹسٹ صاحب ہو گئے
جی ترا جاتا ہے لیکن دونوں بیکار ہیں

حالات سازگار کریں

ہیں فکر پر دانے قلم منتظمین ناخوش
مطالبہ ہے کہ حالات سازگار کریں
ہمیشہ بس وہی دقیانوسی پٹی باتیں
کبھی تو فلم کے ہیرو کی طرح پیار کریں

دودھ اور مکھی

مفلسی کے دن گزر جانے کے بعد
مفلسوں سے پھر بشر ملتا نہیں
دودھ سے مکھی نکل تو آتا ہے
دودھ میں مکھی مگر ملتا نہیں

جھوٹے وعدے

مرمریں لوحوں پہ حروف جلی
لکھ دیں پُر شکوہ و عالی شان
کاش کہ اس ملک میں کہیں ہوتا
جھوٹے وعدوں کا ایک قبرستان

نشہ بندی

بعض لوگوں کے قول و طرز عمل
شیخ جی کو ملامت کرتے ہیں
بادہ نوشی کے تو شائق ہیں لیکن
نشہ بندی کی بات کرتے ہیں

سو سکتے ہیں۔ اکثر خود ہی چائے بنا کر پی لیتے ہیں، بچوں کو کھانا بھی دے ہی دیتے ہیں۔ شریمتی جی کو کوئی فکر ہے تو کلب کی، کوئی کام ہے تو کلب کا۔ . . . گھر بستی بھاڑ میں جائے ہیں۔

لیڈیز میں چلتی چلتی ہے ساڑیوں، گہنوں اور گھر کی اشیاء کو لے کر۔ (وہ تو کہیے کہ صورت شکل بنانا انسان کے اپنے ہاتھ میں نہیں ورنہ آنکھیں نرگسی، ناک تیکھی، دانت چمکیلے اور ہونٹ رسیلے پتلے بنانے میں بھی ہوڑ چلتی) ایک اگر عید پر چھ سو روپے کی ساڑی خریدے گی تو دوسری سات سو روپے کی ساڑی خریدے گی (خریدے گی نہیں اتنی قیمت کی بھی، تو بتائے گی ضرور) ایک سنکرات کے دان (مہاراشٹر میں سنکرات کے تیوہار میں دیا جانے والا تحفہ) میں اسٹیل کے چمچے دے گی تو دوسری کا اسٹیل کی کٹوریاں دینا ضروری ہو جائے گا۔

ستیہ نارائن کی کتھا میں ایک خاتون پرساد کے ساتھ چوڑا اور برفی کا ناشتہ کرائے گی تو دوسری نہ صرف یہ کہ ستیہ نارائن کی کتھا کرائے گی بلکہ چوڑا اور برفی کے ساتھ رس گلا نہیں رکھے گی تو شان میں بٹہ لگنے کا ڈر رہے گا۔ ایک کے یہاں نئے ڈیزائن کا صوفہ سیٹ آئے گا تو دوسری صوفہ سیٹ تو بنوائے گی ہی، ساتھ میں دیوان اور شوکیس کا بھی آرڈر دے گی۔ ایک کے یہاں تجری ان ون آیا نہیں کہ دوسری کا اپنے شوہر سے ویڈیو کے لیے اصرار شروع ہو جائے گا۔ شوہر کی حیثیت ہے یا نہیں، وہ نہیں دیکھے گی۔ اس طرح اچھی خاصی گرہستی برباد ہو کے دہانے پر آکھڑی ہوگی۔

لیڈیز کلب کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہم نے بمبئی منڈلی میں دیکھی تھی۔ ایک اچھے خاصے چلتے کلب میں پھوٹ ڈال کر کچھ لیڈیز نے یہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائی تھی۔ فلمی گانوں کی دھن پر بھجن کی مشق [illegible] ہوتی۔ مخالف گروہ کی خواتین کی غیبت [illegible] . . . وہ راز ہائے سربستہ سامنے آتے کہ شیطان بھی پناہ مانگے۔

یہ تو ان درمیانی طبقے کی لیڈیز کے کلب تھے جو ہم نے دیکھے تھے اور بھول کر بھی اُن کے قریب نہ پھٹکے تھے مگر جب شوہر نامدار کلاس ون آفیسر بن گئے تو ہمیں اوکھلی میں سر دینا ہی پڑا۔ ایک کلب کی ممبری قبول کرنی پڑی۔

جب سے ہم نے کلب کی تیسویں ممبر کے روپ میں قدم رکھا تھا لیڈیز کلب کے بارے میں قائم شدہ ہمارے نظریات بُری طرح مجروح ہو گئے تھے۔ دس ماہ ایک ہفتہ تین دن علانیہ یا خفیہ جنگ کے بغیر چل کر اس کلب نے خواتین کی پیشانی سے بدنامی کا داغ مٹا ڈالنے کی پوری تیاری کرلی تھی۔ ہم نے تو یہ تجویز پاس کردی تھی کہ یہ مرد ہیں جو عورتوں کو خواہ مخواہ بدنام کرتے ہیں۔

برتن کھڑکنے کے لیے حرکت کی ضرورت ہوتی ہے۔ کوئی کہے کہ کچھ فاصلے پر دو برتن رکھ دیے جائیں اور وہ اپنے آپ کھڑکنے لگیں تو ناممکن۔ نیوٹن کی تھیوری کا اطلاق یہاں نہیں ہوتا ورنہ آدھی دنیا سر پھٹول میں مصروف نظر آتی۔

جیسے جیسے دن بیتنے لگے ہمیں لگا ہے وہ توقع

کا احساس ہونے لگا (ہم سب کو ٹھیک سمجھ لیتے ہیں) ہمارا
خیال تھا اعلیٰ نسل کے کتے پالنے والے کیا ہو سکتے ہیں نہ کاٹتے
ہیں .... ہم اپنے آپ کو بڑا تیس مار خاں سمجھتے تھے،
پھر فیس ریڈنگ کا بھی دعویٰ تھا، کچھ علم نجوم میں بھی
دخل رکھتے تھے مگر سارے علم پر پانی پھر گیا جب .....
نہیں ٹھہریئے ..... ابھی سے کیا پول کھول دیں ؟
پہلے کلب کی کچھ ممبروں سے مل تو لیجیے۔

ایک مسز شریمتی ایلا بھڑے تھیں۔ اگر وہ پاکٹ
سائز میں ہوتیں تو ممکن ہے کچھ جاذب نظر ہوتیں
مگر یہاں کوزہ ہی کوزہ تھا (جتنی خرابیاں زبان، میٹر وغیرہ
میں ہو سکتی تھیں، سب موجود تھیں) ایسے تلخ لہجے میں
بات کرتیں کہ سننے والا کلیجہ تھام کر رہ جاتا ..... باتیں
ایسی ہوتیں کہ ہر کوئی یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہو جاتا
کہ پوری دنیا میں اگر کوئی مرد اچھا ہے تو وہ ہیں اُن
کے شوہر۔ اگر کہیں بچے ذہین اور اسمارٹ ہیں تو اُن کے
بچے۔ کوئی سگھڑ گرہستی ہے تو اُن کی گرہستی......
'میرے پتی، میرے بچے' میرا گھر' اُن کی تمام گفتگو کا محور
یہی ہوتا۔ ایک دن (اُن کی شامت جو آئی) اُنہوں نے
اپنے طنز کے تیروں کا ہمیں نشانہ بنایا۔ جب کافی کچھ کہہ
چکیں تو ہم بھی اپنی کہنے پر جم گئے۔ کہا "اچھا جی آپ کا سر
نیم "بھڑے" ہم اُردو والوں کی نظر سے بہت خطرناک
ہے۔"

"وہ کیسے ؟"

ہم نے عرض کی "آپ کا سر نیم اگر ذرا سی ناک
کی آواز کے ساتھ ادا کیا جائے تو ... لا جائے
کی اجازت دیجئے ... یا آپ کے سر نیم میں

سے آخری ... شادی ہو جائے تو ایک خطرناک "ڈنک
مارنے والا" بچھو بن جاتا ہے۔"

وہ نہیں سمجھیں۔ سمجھ جاتیں تو ہماری خیر دیتی کال
شروع کر گیا ہو گیا ہوتا)

شریمتی سرلا وہیا اور شریمتی کملا پٹرسے کر ۳۶ کا
ہندسہ تھیں۔ ایک کا منہ اِدھر تو دوسری کا منہ اُدھر۔ بنتا
نہیں بنتی تھی دونوں میں۔ مگر محلے دونوں کے ایک جیسے
تھے۔ خواتین کی عام کمزوریاں اُن کا موضوع ہوتیں۔ کون
چہرے کی جھریوں کو میک اپ کی تہوں میں چھپاتا ہے؟
کون یوگا کی مدد شیں کر کے اپنے جسم کو سڈول بنائے
رکھتی ہے؟ کون اپنے شوہر سے بڑی دکھائی دیتی ہے؟
کون نجی کاموں میں آفس کار کا استعمال کرتی ہے؟
کس کا اپنے شوہر کے سرکاری کاموں میں دخل ہوتا ہے؟
کس کے یہاں دفتر کا چپراسی رسوئی بناتا ہے۔ وغیرہ
ظاہر ہے ایک دوسرے کی نقل و حرکت کا حساب بھی اُسی
مستعدی سے رکھتی ہوں گی۔

شریمتی کملا سب سے کہتیں۔ "یہ سرلا اپنے آپ
کو 'بلو تھرٹی فائیو' کہتی ہے۔ حالانکہ اس کا بڑا بیٹا
ایم۔ کام میں پڑھ رہا ہے۔ پوچھے کوئی اس سے 'کیا پندرہ
برس کی عمر میں وہ ماں بن گئی تھی؟ اچھا چلو مان لیا
چھوٹی سی عمر میں شادی ہو گئی تھی پھر نام کے آگے
'ملی' اسے کیوں لگاتی ہے؟ شادی کے بعد بی۔ اے کیا
ہو! ایسی صورت تو نہیں ہو سکتی اس کی ..... جاہ رہے
بہت سمجھی اپنی، بہت بھی اپنی۔"

شریمتی سرلا منہ توڑ جواب دیتیں۔ "وہ پچھلے پانچ
گیہ بیان میں جھانکنے دے، دوسروں کو جو کوتا مارنے سے

چلا گیا، کانوں میں سیٹیاں بجنے لگیں، چہرے کا رنگ اُڑ گیا، [illegible] کے طوطے اُڑ گئے، جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے، پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔ قریب تھا کہ ہم زمین پر [illegible] تے، پیلا سرکار نے ہمیں سنبھال لیا۔ تسلی دیتے ہوئے بولی: "آپ فکر کیوں ہیں؟ وہ درمیان میں رہے گی، زیادہ ٹس مس کرے گی تو ہم دونوں اس کا سینڈوچ بنا ڈالیں گی۔"

شریمتی آشا پتہ نہیں کہاں کھڑی سن رہی تھیں ڈرامائی انداز میں سامنے آکر بولیں۔ "تم دونوں میرا سینڈوچ بناؤ گی؟ اس خیال میں نہ رہنا۔ ایک ڈھشوم میں تم دائیں ونگ سے اور دوسری ڈھشوم میں تم بائیں ونگ سے اسٹیج کے پیچھے جا پڑو گی۔"

ہم دونوں اپنی خستہ حالت (جو ڈھشوم کے بعد ہوتی) کے تصور سے دو دن بخار میں پڑے رہے۔ اسٹیج پر ہم تینوں کا معاملہ ایسا تھا جیسے سرکس میں شیر کے ساتھ بکریوں کو کھڑا کر دیا جاتا ہے۔

سہولت کے لیے تمام پروگرام کو دو حصوں میں بانٹ دیا گیا تھا۔ سول لائن والوں نے ہندی ڈراما اور قوالی تیار کی۔ پانی کی ٹانکی کے علاقے والوں نے مراٹھی ڈراما اور گجراتی گربا ڈانس تیار کیا۔ ریڈیو پر آنے والے ایک مزاحیہ پروگرام ایس کمار کی عدالت کے ڈھنگ پر 'نور جہاں کی عدالت' پروگرام تیار کیا گیا جس میں دونوں علاقوں کی خواتین نے حصہ لیا۔ اس عدالت میں شوہروں کی خبر لی گئی تھی۔

پروگرام میں سب کو اپنے اپنے جوہر دکھانے کا موقع ملا لیکن دیکھنے والوں نے جو تبصرے کیے خصوصیت سے بڑے آئیٹم تھے، قوالی اور ہندی ڈرامے کو خوب سراہا۔ تینوں بڑے انعامات مسز کاملی نے جیت لیے

"جی ہیں دیکھیے" آگے کی بات مت پوچھیے۔ کچھ تو پردہ رہنے دیجیے۔ اب ایسی بھی کیا ضد؟ اتنی ساری باتیں ہم نے بتا تو دیں۔ آپ تو گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے کا الزام ہم پر لگا کر ہی چھوڑیں گے لیجیے اب قسم بھی ڈال دی۔۔۔۔۔۔ آپ تو بتانا ہی پڑے گا۔ اچھا سنیے ..... اس جنگ کو شروع ہوئے ایک عرصہ بیت چکا ہے۔ (جو پروگرام ختم ہونے کے بعد شروع ہوئی تھی)۔ جنگ کی ایسی ایسی اسکیمیں بن رہی ہیں کہ ملک کے دفاع کو ہشیار ہو جانا چاہیے (ان عورتوں سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے) اختلاف یہ ہے کہ سول لائن والوں ہی کے پروگرام کیوں پسند کیے گئے۔ جہاں پہلے پروگرام کے چرچے تھے وہاں اب جھگڑوں کے چرچے ہیں۔

ہمیں لوگ بزدل سمجھتے ہیں کیونکہ اس پروگرام کے بعد سے ہم نے کلب کی ممبری کو خیرباد کہہ دیا ہے۔ ٹیلی فون کا کنکشن کٹوا دیا ہے (کہ فون پر کوئی گالی نہ دے سکے) دوپہر کو بڑے گیٹ پر تالا لگا کر سو جاتے ہیں (تاکہ کوئی گھر میں گھس کر مار نہ سکے) یہاں تک کہ کوئی خاتون ممبر بازار میں دکھائی دے جاتی ہے تو نظریں نیچی کر کے اپنا راستہ لیتے ہیں (مبادا جوتے نہ کھینچ لے) بالوں اور ہاتھوں کا انشورنس کروا لیا ہے پھر بھی ہمیں رات کو ڈراؤنے خواب دکھائی دیتے ہیں۔

ڈبل غزل

"دردِ منت کشِ دوا نہ ہوا"
کچھ میڈیسن سے افاقہ نہ ہوا

ڈاکٹر کا جو بل ادا نہ ہوا
"میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا"

"جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو"
لو میں محفل سے خود روانہ ہوا

چیخ کر سب کو کیوں سناتی ہو
"اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا"

"کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب"
کل "شگر" سے عدم روانہ ہوا

یہ تو معمول ہے کہ، بیوی کی
"گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا"

"ہے خبر گرم ان کے آنے کی"
لاک کر کے میں گھر، روانہ ہوا

تیرا مردہ لپیٹنے کے لیے
"آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا"

"جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی"
حملہ، فادر کا قاتلانہ ہوا

نذرِ غالب کیا سراج اس کو
"حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا"

سراج قزلی

ظفر کمال

رات دن کی میزبانی دعوت تری
اور اس پہ یہ گرانی دعوت تری
شیخ جی کی دخترِ انگور سے
ہے شناسائی پرانی دعوت تری
ان کے سر پر کس طرح آنچل ٹکے
مرگیا آنکھوں کا پانی دعوت تری
جس نے جنتا کا پیا خوں عمر بھر
آج ہے وہ آنجہانی دعوت تری
کم سنی پہ اپنی جن کو ناز ہے
لگتی ہیں آدم کی نانی دعوت تری
میرے ہمسایہ کو مجھ سے دوستو
ہے عداوت خاندانی دعوت تری
مانگ کر لائے پہننے کو ظفر
وقتِ شادی شیروانی دعوت تری

ساغر شولاپوری

جب بھی پھر جائے تیرا سر تو مجھے خط لکھنا
گر بسانا ہے تجھے گھر تو مجھے خط لکھنا
تجھ کو چھیڑے کوئی لوفر تو مجھے خط لکھنا
زور سے دے کوئی ٹکر تو مجھے خط لکھنا
دن میں گھر کام بہت ہیں تو کوئی بات نہیں
دو بجے رات کو اٹھ کر تو مجھے خط لکھنا
بعد شادی کے اگر پیار کا پھوٹے بھانڈا
اور پیٹے تیرا شوہر تو مجھے خط لکھنا
ہوں گا حاضر میں اسی وقت تری [illegible]
تیرا ڈیڈی جو گیا مر تو مجھے خط لکھنا

غزلیں

دکانوں پہ پلنگ پڑتے اور نعرہ لگاتے۔ "غیر سیاسی مزدور یونین زندہ باد" اور نیچے بخشو[1] سینہ کوبی کرتا ہوتا۔

کامریڈ مولانا "حسرت" کافی زمانہ استعمال بدل گیا ہے۔ اور اکثر اخبارات میں نظر نواز ہوتا ہے۔ "حسرت ان غنچوں سے ہے ......" "وائے حسرتا وہ پر ......" "ہائے حسرت کہ لب بام وہ چاند آیا ......" وغیرہ وغیرہ۔ اور کبھی کبھی کسی سیاسی جلسے میں ہمارا کوئی بھیا "ایک سیر ارج کرتا ہوں" کہہ کر سیر پڑھتا ہے جیسے "حسرت اُن کے غنچوں سے ہے ......" تو ہماری شعر سماعت فرمانے کی حسرت ہی رہ جاتی ہے اور وہ سیر سوا سیر بن کر اوپر گرتا ہے۔

لیکن مجھے یقین ہے کبھی نہ کبھی کوئی نہ کوئی بے چارہ آپ لوگوں کی طرح کامریڈ مولانا حسرت موہانی کو بھی یاد کرتا ہی ہوگا۔ ورنہ اتنی حسرت سماج میں کیوں پھیلتی۔ آپ پھیلاتے تب ہی نا ــــ

ہم نے یہ بھی سُنا ہے کہ مولانا حسرت کے قلم میں ایسی روانی تھی کہ دریا کی روانی اپنی چال بھول جاتی تھی اور مولانا کا قلم آگ اُگلتا تھا۔ اور لفظ چنگاریاں بن کر انگریز کے کانوں میں گھستے تھے۔ لیکن ہمیں حیرت ہے کہ کوئی انگریز بہرہ نہیں ہوا۔ بلکہ وہ تو مولانا کے پیچھے پیچھے رہتا اور جب مولانا نظر نہیں آتے تو اُن کے ساتھیوں سے پوچھتا "مولانا حاسرت کِدر گئے"۔ ویسے مولانا بہت بہادر تھے۔ بلکہ خان بہادر تھے اور خان بہادر انگریز سے نہیں ڈرتے تھے۔ اس لئے جلدی چھپتے بھی نہ تھے۔

ہم نے مولانا کے بارے میں پڑھا ہے کہ اُنہوں نے علی گڑھ کالج میں تین مرتبہ نعرۂ حریت بلند کیا تھا، جب کہ وہاں انگریز پرنسپل تھا اور غلامی کا طوق ہمارے گلے میں لٹکا ہوا تھا۔ اور جب ہم کالج میں تھے تو وہاں ہمارا ہم قوم پرنسپل تھا۔ آزادی کی ہوا میں ہم سانس لے رہے تھے اور کچھ غلامانہ رویہ دیکھ کر ہم نے بھی پہلا نعرۂ حریت لگایا ہی تھا کہ پہلے ہی دن "دسے دنا دن" لاٹھیاں تحفے میں ملیں اور دوسرے دن ہم جیل کی چار دیواری میں بند کر دیئے گئے اس لیے ہم کو مولانا حسرت سی حسرت ہی رہی کہ ہم مزید دو مرتبہ نہ سہی ایک مرتبہ اور نعرۂ حریت بلند کرتے لیکن جب سی آر پی والوں کا بھیانک راکششی مکھوٹا اور راون کا ڈنڈا ہماری نظروں میں گھوم جاتا ہے تو ہماری یہ خواہش حسرت بن کر ہمارے ذہن کے کسی نہاں خانے میں بربنائے مصلحت چوہا بن کر دبک جاتی ہے۔

کامریڈ حسرت جب چلتے پرزے تھے، میرا مطلب جب زندہ تھے تب بھی اُن کے معاصر مخمصے میں رہتے تھے کہ کون بلا ہے۔ مولانا تھری پی (3 P) یعنی پرنٹر، پبلشر اینڈ پروپرائٹر تو تھے ہی ایڈیٹر اور لیڈر بھی تھے اور مختلف کاروبار بھی فرماتے تھے۔ اُنہیں سودیشی مال سے بے حد عقیدت تھی اس لیے وہ اپنوں سے قرض لے کر کاروبار چلاتے تھے۔ ایک بار سر فاضل بھائی کریم بھائی سے قرض لے کر مختلف محلوں پر کھادی کے کپڑوں کا اسٹور کھولا۔ مولانا شبلی نعمانی نے کہا۔ "حسرت تم آدمی ہو یا جن۔ پہلے شاعر تھے پھر پالیٹیشن بنے اور اب بنیے ہو گئے۔"

---

[1] : بخشو ایک پاگل ہے جو شہیدوں کی یادگار پر کسی کو آنے نہیں دیتا۔

ہماری خواہشوں میں ایک خواہش کا اضافہ ہو گیا ہے کہ ہم بھی حسرت کی طرح کھادی نہ سہی جاپانی یا کوریائی
...روں کا استعمال کریں کہ ان کا چلن عام ہے لیکن اب یہاں سنہ فاضل اعلاق تو ہیں نہیں اور ہماری نظریں سر باعث
...ا سٹے پر جا ٹکتی ہیں۔ خیر صاحبو! ہم بہک گئے۔ دراصل یہ قیر اور خیر دونوں حسرت کے یہاں سے آیا ہے۔ مولانا
...ا کئی بار بہکے۔ وہ ایسے ہرجائی تھے کہ کسی در پر انہیں شانتی (یہاں شانتی سے مراد اطمینانِ قلب ہے ورنہ آپ اسے
...لانا کی محبوبہ سمجھ کر گڑبڑ کردیں گے) نہیں ملی۔ ان کی طبیعت ہی کچھ ایسی تھی کہ کسی سے نہیں پٹتی تھی۔ بیوی کے بارے
...ں ، ہمیں معلوم نہیں کہ یہ گوشہ ہنوز کس گوشے میں سر نہوڑائے پڑا ہے۔

مولانا حسرت جب تھے تو ہندوستانی اور انگریز لوگ صرف یہ کام کرتے تھے۔ ہندوستانی لوگ کانگریس کے
...لاس اور شعر و شاعری انگریز بادشاہ تاج پوشی کروا لیتے تھے اور مرتے تھے۔ اور کچھ لوگ کچھ نہیں کرتے تھے
...استوں کے ڈھیلے میں تھے۔ مولانا کے زمانے میں شاعری بھی بڑے معرکے کی ہوتی تھی۔ مثلاً مولانا فرماتے
...ں ؎

نام سے قانون کے ہوتے ہیں کیا کیا ستم
جبر بزیر نقاب دیکھیے کب تک رہے

...ہلی کے بارے میں داغؔ فرماتے ہیں ؎

پڑی ہے آنکھیں وہاں جو جگر تھی نرگس کی
خبر نہیں کہ کہاں گئی اسے تلاش کس کی

...ولانا حالیؔ رقمطراز ہیں ؎

گر نہیں سنتے قول حالیؔ کا　　پھر نہ کہنا کوئی یہ کہتا تھا

...بر الہ آبادی کو بھی سن لیجیے ؎

مشرقی پیکروں میں تھی خدمت گزاری کی امنگ
مغربی شکلوں سے شانِ خود پسندی آ شکار

...سرت جوشؔ کی طرح ملاحظہ فرمائیں ؎

تاج پوشی کا مبارک دن اے عالم پناہ
اے غریبوں کے امیر اے مفلسوں کے بادشاہ

...اقبالؔ کہتے ہیں ؎

پرانی سیاست گری خوار ہے　　زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے

ا۔ بار بار نالی، حسرت ڈسٹ کے موجب مدان بیگیٹر جیسے باک، مدرس بھی رہ چکے ہیں۔

مخدوم مرحوم کی چیخ سنیے ؎

زندگی کا رقص سود و زیاں کا رقص ہے
ہر گلی کوچہ میں مرگ ناگہاں کا رقص ہے

اپنے فیض بھیا کی تسلیاں (جو اب تک جاری ہیں)۔

چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز . . . . .

کامریڈ مولانا حسرت شاعری میں تو نہیں لیکن لیڈری میں تقریر و تحریر میں بلکہ کبھی کبھی شاعری میں بھی سب سے نبرد آزما تھے۔ وہاں مولانا آزاد کی قوم پرستی اور اسلام نوازی بھی تھی تو مسٹر جناح کی انگریز پرستی اور ہوس ملک گیری بھی۔ مولانا کس کس سے لڑتے۔ کس کس سے بھڑتے۔ لیکن مولانا نے یہ کام اپنے آخری ایام تک بحسن و خوبی انجام دیا۔

مجھے آج تک یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ سید فضل الحسن حسرت کو "مولانا" کے لقب سے کیوں نوازا گیا وہ آزادیٔ نسواں کے زبردست علمبردار تھے اور اُن کی بیگم نشاط النساء کو پنڈت جواہر لال نہرو تک کو چانٹا رسید کرنے کی آزادی تھی۔ اسی لئے میں نے مولانا کے آگے "کامریڈ" بڑھا دیا ہے۔ ویسے بھی مولانا کامریڈ بھی تھے اور بھارت میں ٹریڈ یونین کی "ٹریڈ" کے بانی بھی تھے لیکن وہ ہماری آپ کی طرح بند کیا و نذ پر یقین نہیں رکھتے بلکہ اُن کی جگہ شاہراہیں تھیں کہ تحت دکین وہیں چلتی بھی ہیں بلد مرتی بھی ہیں۔

میں کامریڈ مولانا حسرت موہانی کو زبردست خراج عقیدت پیش کرنے کے موڈ میں ہوں۔

— —

- مدا نہیں میٹھا معدہ تھا۔
- اوہ۔ شاید میرا دماغ خراب ہوگیا ہے۔
- دماغ نہیں زبان۔
- ہاں ہاں۔ وہی وہی۔ کہتے ہوئے میں نے چادر سے منہ ڈھانپ لیا۔

جب صورت سے بے وقوفی برسنے لگے تو خوبصورت لڑکیوں سے چھپا لینا چاہیے۔

چادر اوڑھنے کے بعد آس پاس کے لوگ یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ دنیا سے بے فکر سو رہا ہوں۔ لیکن میں اس سمندر کی طرح تھا جو اوپر سے پُرسکون اور اندر سے پُرطوفان ہوتا ہے۔ میں چادر کے اندر آنکھیں کھولے بہت سنجیدگی سے یہ سوچ رہا تھا کہ اب کی دفعہ مسرور سے دوستی ختم ہی کیوں نہ کرلوں۔

مسرور جاوید ہمارے اطراف پائے جانے والے ان لوگوں میں سے ہیں جن سے تعلقات ہوں تو آدمی تکلیف میں پڑا رہتا ہے۔ لیکن تعلقات قطع کرنے تو اور بھی زیادہ تکلیف میں پڑ جاتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ یہ بلیک میل کرتے ہیں۔ بلکہ اس لیے کہ ان کی عدم موجودگی میں محفلیں سونی ہوجاتی ہیں۔ بات بات پر شگوفے چھوڑنے والا، حاضر جوابی کا مظاہرہ کرنے والا دوستوں کے لیے ساری دنیا سے اکیلا لڑنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ مسرور کی شخصیت رنگا رنگ ہے۔ آپ ان کے بارے میں کوئی ایک رائے قائم نہیں کرسکتے۔ کبھی شعلہ کبھی شبنم۔ ان پر ہمیشہ ہنسی مذاق کا بھوت سوار رہتا ہے۔ جو بلا اس کو دو تین فقرے کہہ کر تلملا دیں گے اور ہنستے ہوئے آگے بڑھ جائیں گے۔ ایسے ویسے لوگ ان کے قریب پھٹکنے سے ڈرتے ہیں۔ اس لیے کہ نوبت آنے پر یہ جیمس بانڈ کی طرح اکیلے ہوکر بھی کئی آدمیوں سے لڑ سکتے اور ان پر حاوی ہوسکتے ہیں۔

ان کا سب سے زیادہ عتاب دوستوں پر نازل ہوتا ہے ہر چند کسی نہ کسی کی دل شکنی کریں گے۔ اُسے منائیں گے۔ مان جائے تو پھر ستائیں گے۔ کبھی کبھی تو دوستوں کو اجنبی آدمی سے لڑا دیتے ہیں۔ نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ جائے تو خود اجنبی سے لڑنے تیار ہوجاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دوست ہمیشہ ترک ہوا اختیار کی اُلجھن میں پھنسے رہتے ہیں۔ یہ نہ محبت کرنے دیتے ہیں نہ نفرت۔

آج بھی میں سنجیدگی سے غور کر رہا تھا کہ اب کی دفعہ مسرور سے صاف صاف کہہ دوں کہ آئندہ تم سے دوستی ختم۔ سوچتے سوچتے نیند لگی۔ صبح جاگا تو چاروں دوست دواخانے میں موجود تھے۔ دوستوں اور غیر دوستوں کی عیادت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ غیر دوست حادثے سے خوش ہوکر غم کا اظہار کرتے ہیں اور دوست غمگین ہونے کے باوجود خوش نظر آتے ہیں۔ میرے چاروں عزیز دوستوں نے جو عیادت کی وہ اس طرح ہے۔

۱۔ کچھ ہماری پریشانی کا تو خیال کرو۔ ہر مہینہ پندرہ دن میں کام کاج ملتوی کرکے تمہاری عیادت کے لیے آنا پڑتا ہے۔ ایک بار مر ہی جاؤ۔

۲۔ میں تو رات بھر اس ناکارہ ٹرک ڈرائیور کو کوستا رہا جو تمہاری پھٹیچر سائیکل کو زور دار

دھکا بھی دے سکا۔

۲۔ تمہاری اس گندی عادت سے ڈر کر کہ تم بیمار پڑتے ہو اور پھر اچھے ہو جاتے ہو۔ میں ایک ناول شروع کر نہیں پا رہا ہوں جسے یکسوئی سے لکھنا چاہتا ہوں۔

۴۔ مجھے بھی یہ سن کر بے حد افسوس ہوا یار کہ تم ایک خطرناک حادثے کا شکار ہو کر بھی زندہ بچ گئے۔

۱۔ دوسروں کو نا اُمید کرنا ان کی پرانی عادت ہے

۲۔ خیر چھوڑو یہ بتاؤ آخری عیادت کو کب بلا رہے ہو۔ ؟

(آخری جملہ مسرور نے کہا تھا)

میں کچھ کہنے ہی کو تھا کہ میرے ایک شناسا خواجہ موٹے تازے ہیں، عیادت کی غرض سے کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ ان لوگوں میں سے ہیں جنھیں دیکھ کر خواہ مخواہ شرارت کرنے کو جی چاہتا ہے۔ مسرور نے انھیں دیکھتے ہی پوچھا۔

- آپ ڈبل روٹی کا کاروبار کرتے ہیں ؟
- جی نہیں۔ ایکسپورٹ کا دھندا ہے۔
- تو آپ ڈبل روٹی ایکسپورٹ کریں۔ بہت منافع ہوگا۔
- یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں ؟
- آپ کی شکل و شباہت ڈبل روٹی سے ملتی جلتی ہے۔

وہ "اچھا" کہہ کر غور کرنے لگے تو ہم نے ان سے کہا کہ آپ ان کے کہنے میں نہ آئیں۔ انھوں نے گزشتہ برس انھوں نے ایک کا جناب بیوپاری سے کہا تھا کہ آپ کی صورت کڑک مرغیوں سے ملتی جلتی ہے آپ مرغیوں کا کاروبار کریں اور وہ شخص ان کی ہدایت پر عمل کر کے ان دنوں پھٹے حال گھوم رہا ہے۔

دوست قہقہے مار کر ہنسنے لگے۔ یہی ان کا واحد مشغلہ ہے۔ کسی نے کوئی بات کی اور یہ ہنسنے لگے کبھی کبھی تو بات سے پہلے ہنس دیتے ہیں۔ دوستوں کی ہنسی سے موٹے صاحب سٹپٹا گئے۔ موٹے لوگ عموماً خوش مذاق ہوتے ہیں لیکن شرارتوں سے گھبراتے بھی ہیں۔ وہ عیادت کئے بغیر گدھے کے سر سے سینگ ہو گئے۔ میں نے مسرور کو منع کیا کہ وہ میرے ملنے والوں سے بدتمیزی نہ کرے۔ وہ بولے "تم ایسے لوگوں سے تعلقات بالکل مت رکھو جنھیں دیکھ کر شرارت کرنے کو جی چاہے۔ ساری دنیا کے مفلوک الحال، مظلوم صورت اور بے وقوف صفت تمہاری شاگردی میں آتے جا رہے ہیں۔ ہم تو شرارتوں سے باز نہیں آئیں گے۔"

بحث کچھ اور بڑھتی لیکن خلاف توقع اسنو پاؤڈر اور عطریات کی مسحور کن خوشبو نے کمرے پر قبضہ کر لیا۔ پھر چند آنچل لہرائے بعد میں پھولوں کی طرح شگفتہ اور نرم و نازک چہرے نظر آئے ان کے پیچھے میری اسکول لائف کے ایک ساتھی بھی تھے۔ وہاں اسکول میں جس لڑکی سے پیار کرتے تھے میں نے اس کو ایک طمانچہ رسید کر کے جانے [illegible] اظہار محبت کر دیا تھا۔ جب

بھی ان کو اس طمانچے کی تکلیف ہوتی ہے بہ دانست خود، ہم
کو شرمندہ کرنے ایک مجوبہ لے کر چلے آتے ہیں۔ آج
شاید زیادہ تکلیف ہو رہی ہوگی اس لئے تین کے ساتھ
تھے۔ ہر چند کہ ان سے میرے تعلقات خوشگوار نہیں تھے
تاہم میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ مسرور ان سے کوئی شرارت
کرے لیکن اس کو کیا کیجئے کہ بندر کی شامت آتی ہے تو
وہ کچھار میں شیر کے سامنے ہی کود پڑتا ہے۔ ایک تو وہ
صاحب پہلے ہی ہم سے احساس کمتری میں مبتلا۔ دوسرے
تین لڑکیوں اور میرے چار دوستوں کی موجودگی نے انھیں
یہ اکسایا کہ خواہ مخواہ ہر بات میں رعب جمائیں خود کو
سب سے زیادہ تجربہ ثابت کریں۔ چنانچہ وہ اوٹ پٹانگ
بکنے لگے۔ مسرور پہلے تو خاموش رہے لیکن جب دیکھا کہ
وہ انھیں بھی بے وقوف ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں
تو ان سے برداشت نہ ہوا۔ تھوڑی دیر بعد ان دونوں
میں جو گفتگو ہوئی وہ کچھ اس طرح ہے۔

- ہم چاہتے ہیں کہ شکیل بھائی کی صحت یابی کی
خوشی میں ایک پارٹی کا اہتمام ہو۔ اس میں ہم
سب شریک ہوں۔ ہم اپنی طرف سے تمام
لوگوں کے لیے سینڈوچ لانے کا اعلان کرتے ہیں

لڑکیاں: میں سالن لے آؤں گی
میں کراکری لے آؤں گی
میں مٹھائی لے آؤں گی

(مسرور کی طرف تحقیر آمیز نظر سے) اور آپ مسٹر!
- میں اپنے تین دوستوں کو لے آؤں گا۔ (مسرور نے
جواب دیا)

لڑکیاں اس جواب سے محظوظ ہو کر مسرور کو پیار
سے دیکھنے لگیں تو وہ صاحب مسرور سے بولے۔

- آپ کی تعریف؟
- دوست احباب کو مسرور صاحب کہتے ہیں۔
- اور لوگ مجھے ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں۔ ہا ہا ہا۔
- خوشی ہوئی۔ میرے کتے کی طبیعت ذرا خراب ہے
اسے دیکھ لیں تو .....
- آپ مجھے کتوں کا ڈاکٹر سمجھتے ہیں؟
- صورت سے تو یہی دکھائی دیتا ہے ویسے آپ
کون سے ڈاکٹر ہیں؟
- میں نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد پر
- پی۔ ایچ۔ ڈی کی بھی تو اُن پر جو زندگی بھر ڈپٹی
ہی رہے۔ نذیر احمد نہ بن سکے۔
- کیا مطلب؟
- مطلب یہ کہ جس طرح ڈپٹی کلکٹر ترقی کر کے کلکٹر
بنتا ہے۔ یہ ڈپٹی نذیر احمد سے نذیر احمد کیوں
نہیں بنے؟
- آدمی کو عقل نہ ہو تو بات نہیں کرنی چاہیے۔
- آپ خود سوچیے: میں آپ کو بات کرنے سے کیسے
روک سکتا ہوں؟
- آپ واہیات آدمی ہیں۔
- آئینہ میں دیکھ کر کہیے

لڑکیاں ہنسنے لگیں تو ان کو احساس ہوا کہ مسرور
سے دلکشی ہی میں عافیت ہے۔ انھوں نے خوشگوار موڈ بنا
کر مسرور کی کمر پہ بندھے ہوئے قیمتی بیلٹ کو تعریفی نظروں
سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
- مسرور صاحب! اس بیلٹ کی کیا قیمت ہوگی؟

ولادو۔ اور اس کی ایک نیم زندہ مثال آپ کے سامنے ہے (میری طرف اشارہ کرتے ہوئے) ان کا نام شکیل ہے۔ یعنی خوبصورت۔ آپ ان کی صورت دیکھئے اور نام۔ دونوں میں کتنا تضاد ہے

تمام دوست اور لڑکیاں میری صورت دیکھ کر زور زور سے ہنسنے لگے۔ میں شرمندگی کے مارے صورت چھپا بھی نہ سکا۔ بس نظریں نیچی کرلیں۔ پھر مسرور کی طرف دیکھا تو وہ مجھ سے زیادہ ستم رسیدہ صورت بنائے بیٹھے تھے۔ جیسے سوچ رہے ہوں ——— پتہ نہیں یہ سب کیوں ہنس رہے ہیں؟

ہنسی ختم ہوئی تو مسرور ایک لڑکی کی طرف اشارہ کرکے بولے۔

• اب دیکھئے۔ ان کا نام شگفتہ ہے۔ لیکن صورت پر بارہ بجے ہوئے ہیں۔ اور آپ کا نام نفیسہ ہے۔ لیکن یہ اُجلا لباس پہننے سے پہلے آپ نے جو کپڑے اُتارے ہوں گے وہ کتنے غلیظ ہونگے

لڑکیاں تھوڑی دیر منہ پھلائے بیٹھی رہیں پھر ناراض ہوکر چلی گئیں۔ اور اس ہنسی مذاق کا اختتام میری توقع کے عین مطابق ہوا۔

میں نے کہا۔ دیکھا کیسی حسین حسین لڑکیاں ہم سے ملنے آتی ہیں۔ اچھا یہ بتاؤ ان تینوں میں کون سی سب سے اچھی تھی۔ بولے "چوتھی"

یہ ان کی پرانی عادت ہے۔ کسی کی جان جلانا ہو تو یہی کرتے ہیں۔ ایک دن بہت محنت سے بنائی ہوئی دو تصویریں ان کے سامنے رکھ کر میں نے بڑے فخر سے پوچھا۔ "بتاؤ ان دونوں میں اچھی کون سی ہے؟"

"تیسری"۔ (انھوں نے جواب دیا تھا) اور زور زور سے ہنسنے لگے تھے۔

ہم چڑ کر خاموش ہو گئے اور تہیہ کر لیا کہ کل اپنے کسی ایسے چرب زبان اور دست دراز شناسا کو بلا لیں جو مسرور سے دو دو ہاتھ نمٹ سکے۔

دوستوں کے چلے جانے کے بعد ہم نے دلیر نامی ایک پہلوان کو پیغام بھجوایا کہ وہ کل شام ۵ بجے دواخانہ پہونچیں۔ دلیر ان لوگوں میں سے ہیں جو کسی کے ساتھ تاش میں ہار جائیں تو کسی دوسرے بہانے سے فاتح سے جھگڑا کر کے اس کو دو تین دفعہ اٹھا کر پٹخ دیں گے۔ پھر دوبارہ تاش کھیلنے بیٹھیں گے۔ اس مرتبہ مقابل جان بوجھ کر ہارنے میں عافیت سمجھتا ہے۔ ہمیں اُمید تھی کہ مسرور سے نمٹنے کے لیے ان سے زیادہ مناسب آدمی کوئی اور نہ ہوگا۔ اور مسرور کل بھی ضرور دواخانہ آئیں گے، وہ ضدی طبیعت کے آدمی ہیں کسی کا پیچھا پکڑلیا تو اس کی خیر نہیں۔ ویسے یہ ہر چیز سے بے نیاز نظر آتے ہیں۔ خوشی سے بے نیاز، دوستی سے دشمنی سے۔ تعریف سے محبت سے لاپرواہ۔ ان کو احسان جتانے کی عادت بھی بالکل نہیں ہے۔ شکریہ ادا کرنے والے سے اُلٹا ناراض ہوجاتے ہیں۔ لوگوں کو مشورے دینا ان کی خاص ہابی ہے۔ ایک پریشان حال شخص نے باتوں باتوں میں ذکر کیا کہ "یار! اپنے نئے فوٹو اسٹوڈیو کا افتتاح ولیپ کمار سے کروانا ہے۔ لیکن وہ آکولہ آئیں گے نہیں۔"

مسرور بولے۔ "ایسا کرو ایک دروازے کی فریم دلیپ کمار کے گھر لے جاکر ربن کٹواؤ۔ پھر اس کو

لہ کے اسٹوڈیو میں لٹکا کر رکھ دو۔ آر کی پلکیں بھی تک
ٹے یا ناک پر چونکہ رکھ دو۔ بات یہ کچھ بھی ہے۔"
ایک مرتبہ مجھے بڑی مصیبت سے چھٹکارا دلایا۔ ہوا
کہ ایک صاحب نے ان کے مرحوم والد کی تصویر بنانے
لیے دی اور خوب تاکید کی کہ اس کے سوا دوسری
تصویر نہیں ہے اس لیے حفاظت لازمی ہے۔ وہ مجھ
سے کھو گئی۔ موصوف میرے والد کے دوست ہیں۔ اس
لیے اتنی ہمت نہ تھی کہ کھو جانے کی خبر سنا دوں۔ اس
لیے ٹالتا رہا۔ رفتہ رفتہ انھوں نے چلنا پھرنا مشکل
کر دیا۔ جب بھی ملتے اصرار کرتے۔ ایک برس کے بعد
کہنے لگے۔ "تصویر بنانی نہ ہو تو واپس ہی کر دو۔"

ایک دفعہ مسرور کی موجودگی میں زیادہ ناراضگی
دکھائی تو مسرور مجھے الگ لے جا کر بولے۔

"ایک ترکیب ہے ان کی لیکن پہلے چار روپے
کو فلم دکھاؤ۔"

فلم دکھانے کے بعد ترکیب پوچھی تو بولے۔
"ابھی میں نے نہیں سوچی۔ کل بتاؤں گا۔"

کل ملاقات کی تو بولے۔

"ان صاحب کے والد کی صورت اندری سے
ملتی ہے۔ تم ان کی تصویر بنا کر اس میں داڑھی
مونچھ کا اضافہ کر دو۔"

میں نے ایسا ہی کیا اور تصویر بنا کر دے دی۔
جسے انھوں نے خوبصورت فریم کروا کر دیوار پر سجا
دیا۔ اب یہ عالم ہے کہ وہ ہر آنے جانے والے کو تصویر
دکھاتے اور "مرحوم مرحوم" کہہ کر تعارف کراتے
ہیں۔ مسرور [illegible] ہیں۔ [illegible]

سے انکار کر دوں تو کہتے ہیں۔

"کہہ دوں ان سے کہ تصویر تمہارے والد کی نہیں
تمہاری ہے۔ اور تم خود کو مرحوم کہتے ہو؟"

کچھ معاملات میں یہ بے حد سنجیدہ بھی ہو جاتے
ہیں۔ کسی کے وہاں موت ہو جائے۔ یہ کام کاج میں
مصروف۔ تعزیت کر رہے ہیں۔ بعض حالات کو پانی
پلا رہے ہیں۔ کسی دوست کے وہاں شادی ہو تو دو
دن پہلے سے کام کاج میں جٹے ہیں۔ دوسروں کی
ذمہ داریاں اپنے سر لے رہے ہیں۔ تھکاوٹ سے
چور چور لیکن ہنسی قہقہے جاری۔ دلہن کی روانگی کے
بعد جب اہل خانہ ہنگاموں کا اعادہ کرنے بیٹھے ہیں یا
کھانے کا وقت ہوتا ہے تو مسرور غائب۔ نہ گھر پر نہ
دوستوں میں۔ لوگ انھیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں اور
یہ کسی دوسرے درجے کے ہوٹل میں خود کے خرچ سے
کھانا کھا رہے ہیں۔ تھکاوٹ دور کرنے کے لیے سگریٹ
پھونک رہے ہیں۔ اور اس عالم میں کوئی شناسا کا
مارا پہنچ جائے (مل جائے) تو اس کو ستانا شروع۔

ہاں ــــ تو دوسرے دن شام میں مسرور
ذرا پہلے آ گئے۔ دلچسپ موڈ میں آئے۔ شروع شروع
میں مسرور نے کوئی شرارت نہیں کی۔ اس لیے معمول
گفتگو چلتی رہی۔ موسم خوشگوار تھا اس لیے پتہ
نہیں کہاں سے شاعری کا دور شروع ہو گیا۔ غالب۔
مومن۔ میر۔ فیض۔ یگانہ۔ فراز وغیرہ کے اشعار
سنائے جا رہے تھے کہ مسرور نے [illegible] واہیات
شعر پڑھ دیے اور آنکھیں پھاڑ کر مسرور سے پوچھا۔

"کیسے ہیں؟"

* بہت بڑے شاعر کے معلوم ہوتے ہیں۔
* کیسے معلوم ؟
* بالکل سمجھ میں نہیں آرہے ہیں
* جناب یہ میرے ہیں۔
* اب پتہ چلا کہ آپ نے شاعری شروع کردی ہے اور اعلیٰ قسم کے واہیات شعر کہہ رہے ہیں۔

دلگیر غصے کے مارے سُرخ ہوئے اور میرے دل میں مسرت کی لہر دوڑ گئی کہ اب آئے گا مزا۔ دلگیر بولے۔

* شاعری سمجھ میں نہ آئے تو لوگ اُسے واہیات کہتے ہیں۔
* زیادہ سے زیادہ تو شاعر کہتا ہے کہ سامعین واہیات ہیں۔

دلگیر کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ غصہ میں صحیح اُردو نہیں بول سکتے۔ اَلٹ پلٹ کردیتے ہیں۔ بگڑ کر بولے۔

* دیکھیے میاں! آپ ہم سے مذاق نہ کریں۔
* کیا قباحت ہے ؟
* آپ مذاق کرتے ہیں تب کچھ نہیں۔ اور ہم مذاق کریں تو آپ برہنہ (برہم) ہو جاتے ہیں۔
* کیا مذاق کیا ہم نے ؟
* کل ہم نے سلام کیا تو آپ اِس پاس کیوں دیکھ رہے تھے ؟
* آپ کی بھینگی آنکھوں کی وجہ سے دیکھنا پڑتا ہے کہ مخاطب کوئی اور تو نہیں۔
* دس برس سے میونسپل کمیٹی (میونسپل کمیٹی) میں سروس کررہے ہیں۔ آج تک ہم کو کسی نے بھینگا نہیں کہا۔
* بزدل ہوں گے سب۔
* بزدل ہوتے تو ہر سال تین آدمی خودخوشی (خودکشی) نہ کرتے۔
* آپ کیسے کررہے ہیں اب خودخوشی ؟
* سالے تم تو میرا پرسٹیج پوائنٹ (Prestige Point) بن گئے ہو۔

اور اُنھوں نے مسرور کو ایک گھونسہ رسید کرنے کے لیے ہاتھ اُٹھایا۔ مسرور نے وہ ہاتھ پکڑ کر طمانچہ لگا دیا۔ چٹاخ کی آواز آئی۔ آس پاس کے لوگ جمع ہوگئے۔ اب دلگیر نے زوردار لات ماری تو مسرور بازو میں سرک گئے اور ایک اجنبی شخص نیچے گر پڑا۔ یہ دونوں لڑنے لگے مسرور ریفری کا کام کرنے لگے۔ میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا کہ ؎

جن پہ تکیہ تھا وہی . . . . .

وارڈ بوائے، پہلوان نما چوکیدار کے ساتھ دوڑتے دوڑتے آئے دونوں کو الگ کیا۔ پھر دلگیر کی درگت بنائی کہ ان کی وجہ سے اسپتال کا پُرسکون ماحول خراب ہوا۔ انھیں دھکیلتے ہوئے گیٹ کے باہر چھوڑ آئے۔ مسرور پیچھے ہنستے جاتے اور میری رونہاسی صورت دیکھتے جاتے تھے۔

اگلے دن اسپتال سے چھٹی ہونے والی تھی۔ میں حاجت سے فارغ ہوکر باہر نکلا کہ شاعر مسرور آگئے۔ صورت

ستی ہوئی۔ بال بکھرے ہوئے، آنکھیں سوجی سی۔ جیسے روئے بھی ہوں اور جاگے بھی ہوں۔ گلوگیر آواز میں بولے ۔

* میں نے ہمیشہ تم کو تکلیف دی ہے۔ اتنے پیارے دوست کو ستایا ہے۔ مجھ ناچیز کی طرف سے یہ پھل کھا لو تاکہ مجھے سکون ملے۔

میں نے چڑ کر کہا

* میں سنترے نہیں کھایا کرتا۔
* یہ سنترے نہیں ہیں
* میں سیب بھی نہیں کھاتا
* میں سیب بھی نہیں لایا
* تو کیا لائے ہو ؟
* تم کیا کھاتے ہو ؟

میں نے نایاب سمجھ کر لال انار کا نام لے دیا۔ انھوں نے تھیلی سے لال انار ہی نکالے اور طشتری مانگی پھر انار چھیلنے لگے۔ دانے نکل چکے تو خود ہی کھانا شروع کر دیا۔ اور خالی طشتری واپس کر کے ہنستے ہوئے زور زور سے ہنسنے لگے۔ میں دل برداشتہ گھر پہنچا مگر وہ میرے ساتھ ہی تھے۔ حالانکہ انھوں نے ہی سارا اسباب رکشہ میں رکھا اور گھر پہ اتارا۔ مجھے آرام سے بستر پر لٹایا۔ اپنے خرچ سے موسمی کا رس پلایا کافی دیر تک سر سہلاتے بھی رہے۔ اس کے باوجود میں ان سے اتنا ناراض تھا کہ تمام رات ان کو زخمی کر کے ایک دفعہ اسپتال بھجوانے کے منصوبے بناتا رہا۔

تیسرے دن ان سے ملاقات کی۔ ان کو ایک سائیکل پر بٹھایا۔ خود ایک سائیکل لے لی۔ اور طے شدہ مقام پر (جہاں نسبتاً گھنا جنگل اور ڈھلوان تھی)، ان کی سائیکل کو اپنی سائیکل سے زوردار دھکا دے مارا

تھوڑی دیر بعد وہاں ایک ایمبولینس دکھائی دی ۔ وارڈ بوائے ایک زخمی کو اسٹریچر پر لے جا رہے تھے۔ دم بھر میں حواس بجا ہوئے تو یہ جان کر بہت تعجب ہوا کہ اسٹریچر پر مستعد نہیں ہیں

میں خود ہی لیٹا ہوا ہوں۔

* *

غزلیں

مرزا کھونچ

گھر میں مارا ماری ہے ایمان سے
سب پہ بیوی بھاری ہے ایمان سے
دستِ نازک میں ہے بیلن الاماں
جنگ کی تیاری ہے ایمان سے
گھر میں مہمانوں کو آتا دیکھ کر
مجھ پہ سکتہ طاری ہے ایمان سے
اب تو ہاں کہہ دیجئے، سچ مانئے
نوکری سرکاری ہے ایمان سے
راہِ الفت اور یہ سینڈل کے ہیل
اک یہی دشواری ہے ایمان سے

اقبال ہاشمی

ہر اک دکان سے فوراً ادھار لیتے ہیں
اسی طرح سے ہمیشہ گزار لیتے ہیں
اسی ادھار کے صدقے ہیں کہ پھرے
جدھر سے گزریں تڑپ کر پکار لیتے ہیں
تڑپتے رہتے ہیں ماچس کی ایک تیلی کو
اکڑ کے منہ میں وہ جب بھی سگار لیتے ہیں
یہ فن کی بات کہ بگڑے مزاج آقا کو
بڑے سلیقے سے چمچے سنوار لیتے ہیں
اگر ادھار کی امید ہاشمی کم ہو!
ہم ان کی جیب سے بٹوہ ہی مار لیتے ہیں

مجید عارف

خوابوں میں ان کے مرغی کی ہے ران دوستو
ہے زندگی میں، کھانے کا ارمان دوستو
فٹ بال کھیلنے کے لیے اب جگہ نہیں
خالو کے سر پہ ہے کھلا میدان دوستو
گڑ سے پرہیز اور یہ کھاتے ہیں گلگلے
پھیلا ہے خاندان میں یرقان دوستو
شادی سے پہلے ہر گھڑی عارف تھا خوش مزاج
شادی کے بعد ہے یہ پریشان دوستو!

واصل کیسر مڑوی

ایک دو فرلانگ بھی چلنے سے کتراتے ہیں لوگ
ساتھ میت کے بھی موٹر کار میں جاتے ہیں لوگ
زندگی بھر کپڑے کپڑے کو ترس کر جو مرے
اس کی میت کو بہت اچھا کفن لاتے ہیں لوگ
فاتحہ خوانی سے کرتے "سود" کا دھندا شروع
اور برکت کو خدا سے مانگتے ہیں لوگ
آدمیت کر گئی واک آؤٹ واصل آج کل
باپ کو بھی باپ کہنے سے جو شرماتے ہیں لوگ

انیس احسن خان
(نئی دہلی)

ایک انٹرویو بلا عنوان

بال پیارے نہایت ہی شریف آدمی ہیں۔ لوگ باگ تو یہاں تک کہا کرتے ہیں کہ جو کہیں شریفوں کے سینگ ہوتے تو صرف مزدور بارہ سنگھا ہوتے۔

لیکن آج کل لوگ ان کی شرافت پہ شک کرنے لگے تھے۔ کیونکہ وہ نیتا ہو گئے تھے اور نیتا بھی ایسے جو دن بدلنے سے پہلے دل اور صبح کی پہلی ضرورت سے فارغ ہوتے ہی خیال بدلتے تھے ایسا لچکدار مزاج انھوں نے ورثے میں پایا تھا۔ دورِ برطانیہ میں ان کے آباء و اجداد رانی کے سر پہ رکھے تاج کے گن کچھ اسی طرح مگن ہو کر گاتے تھے جیسے آجکل وہ کھدر کی ٹوپی یا ساڑی کے پلو کے مدح سرا ہوتے ہیں۔ تازہ تازہ ہوئے چناؤ میں جب بال پیارے کی اس لچکیلی عادت کے مدِنظر کسی پارٹی نے انھیں اپنے لائق نہ سمجھا تو انھوں نے دستورِ آزادی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے "آزاد طور پر" چناؤ لڑا اور سام۔ دام۔ دنڈ۔ بھید کا استعمال کرتے ہوئے ہماری تہذیب کے "گو بدر ہیں کا پانی" کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے آدمیوں کی مدد سے تمام ووٹ اپنے حق میں ڈلوا کر ایک بار پھر چناؤ جیت لیا۔

اسے آپ ہمیں چاہے جتنا بڑا نیتا ہم اخبار والوں سے بھلا کب تک چھپتا۔ لہٰذا ہم نے ایک دن ان کا انٹرویو لینے کی خاطر ان کے گھر کا راستہ پکڑا۔ ساتھ میں ایک عدد فوٹوگرافر بھی۔ جو ان مہان ہستی کے فوٹو کھینچ سکے۔

بال [illegible]

ہو گیا۔ لیکن انہوں نے بالی سپر تی سے مسکرا کر بائیں آنکھ دباتے ہوئے کہا۔
"بھائی یہ ٹریڈ سیکریٹ (TRADE SECRET) ہے۔"
"تو کیا دل بدلنا آپ کا بیوپار ہے؟"
"اور کیا۔ اگر یہ بیوپار نہ ہوتا تو ہم لاکھوں روپے یوں ہی خرچ نہ کرتے۔"
"مگر آپ تو چناؤ کے موقع پر یہ کہتے گھومتے تھے ہمیں ووٹ دیجئے اور دیش کی ترقی میں ہاتھ بٹائیے۔"
"وہ تو میں آج بھی کہتا ہوں۔" بالی پیارے نے کہا۔ "دیش کی ترقی تبھی ہوتی ہے۔ جب وہاں کی عوام خوشحال ہو۔ اور عوام اسی وقت خوشحال رہ سکتی ہے۔ جب ملک کے رہبر و رہنما یعنی ہم خوش ہوں۔ اور ہم یعنی نیتا تبھی خوش رہ سکتے ہیں۔ جب ان کے پاس پیسہ اور پیسہ تبھی آسکتا ہے جب ہم چناؤ لڑ کر کوئی منتری بن جائیں۔"
"لیکن یہ تو خود غرضی ہوگی۔ آپ تو عوام کی غریبی دور کرنے کے لئے سبھی جتن کیا کرتے؟"
"وہ تو اب بھی ہوں۔ اب دیکھئے اگر کہیں میں منتری بن گیا تو آپ چند دنوں میں دیکھئے گا کہ میرے تو میرے ساتھ ہی میرے تمام رشتے داروں کے جو کہ عام جنتا کا ہی ایک حصہ ہیں دلدر کیسے دور ہوتے ہیں۔"
"لیکن یہ تو "پرجا تنتر" کی ہتھیا ہے۔"
"غلط — ہتھیا صرف "پرجا" کی ہو رہی ہے "تنتر" تو اپنی جگہ اب بھی سلامت ہے۔"
"مگر آپ منتری بننے کیلئے اس طرح کب تک دل بدلتے رہیں گے؟"
"کرم کئے جا پھل کی اچھا مت کر تو انسان!
یہ ہے گیتا کا گیان یہ ہے گیتا کا گیان" انہوں نے بڑے ہی فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ▲

منظر بیباک گیری (گیا)

میرٹ لسٹ

"سیاست نگر ہائی اسکول کے لیے ایک تاریخ داں مدرس کی ضرورت ہے" ـــــ ایک اشتہار

لیاقت علی خاں، میر سفارش علی اور تقدی شاہ تینوں انٹرویو میں پہونچے۔ ڈاکٹر منظور رشوت پیری پوری انٹرویو بورڈ کے چیرمین تھے۔ انٹرویو کے لیے لیاقت خاں چیمبر میں بلائے گئے۔

ڈاکٹر منظور رشوت : (لیاقت خاں کے کاغذات کو حیرت سے دیکھتے ہوئے۔ میٹرک فرسٹ ڈویژن آئی۔ اے فرسٹ ڈویژن، بی۔ اے آنرز (ہسٹری) فرسٹ کلاس، ایم۔ اے ہسٹری فرسٹ کلاس، بی۔ ایڈ فرسٹ ڈویژن، سرکاری اسکول میں پڑھانے کا تجربہ دو سال)

ڈاکٹر رشوت پیری پوری :۔ فرانس میں انقلاب کب ہوا تھا؟

لیاقت علی خاں :۔ فرانس میں انقلاب ۴ اگست ۱۷۸۹ء کو شروع ہوا۔

(اسی طرح کئی سوالات تابڑ توڑ کیے گئے اور سبھوں کا جواب لیاقت خاں نے ٹھیک دیا۔ پراشنڈ دیئے)

ڈاکٹر رشوت : (لیاقت خاں کو چیمبر سے جانے کا اشارہ کرتے ہوئے) ٹھیک ہے، میرٹ لسٹ تیار ہوگا۔

(لیاقت خاں تسلی سر ہلاتے ہوئے باہر آجاتے ہیں۔ میر سفارش علی کا نام پکارا جاتا ہے۔ میر سفارش علی چیمبر میں داخل ہو کر کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں۔)

ڈاکٹر رشوت : آپ کی سندی لیاقت؟

میر سفارش علی : (مسکراتے ہوئے) F.A.B.A.

ڈاکٹر رشوت : یہ ڈگری کہاں سے پائی؟

سفارش علی: شہرت بلند اقبال دانش گاہ سے ہے۔
ڈاکٹر شوکت: [illegible] F کا مطلب کیا ہے؟
سفارش علی: میرا مطلب بالکل صاف ہے یعنی
Bachelor appeared but Fail
ڈاکٹر شوکت: (مسکراتے ہوئے) اس سند کے علاوہ کوئی
[illegible]؟
سفارش علی: حضور! میرے کارنامے پر شاباشی دیجیے
میں نے سیاست کے ہونے والے کسی منتری
کی تیسری صاحبزادی کا دل جیت لیا ہے وہ
بہت جلد مجھ سے بیاہی جانے والی ہیں۔
ڈاکٹر شوکت: (پہلو بدلتے ہوئے حیرت سے)۔ ایسی بات
ہے؟ اس کا کوئی ثبوت؟
سفارش علی: (پاکٹ سے ایک کاغذ نکالتے ہوئے) منتری جی کا
اُن کے لیٹر ہیڈ پر آپ کے نام یہ خط۔
ڈاکٹر شوکت: (خط پڑھنے کے بعد انکساری سے) یہ
اُن کا کرم ہے کہ خاکسار کو خدمت کرنے
کا موقع عنایت فرمایا ہے۔ یہ ہمارے
لیے فخر کی بات ہے۔ اطمینان رکھیں۔
میرٹ لسٹ بناتے وقت آپ کا نام
ذہن میں ضرور رہے گا۔
(سفارش علی مسکراتے ہوئے باہر چلے
آتے ہیں۔ نقدی شاہ کو بلایا گیا۔ نقدی شاہ
چیمبر میں داخل ہوتے ہیں)
ڈاکٹر شوکت: (نقدی شاہ کے کاغذات کو دیکھتے ہوئے)
[illegible]
[illegible]

بی۔ اے پاس سیکنڈ ڈویژن
بی۔ ایڈ ریزلٹ پینڈنگ
ڈاکٹر شوکت: لگتا ہے، آپ کو کہیں دیکھا ہے؟
نقدی شاہ: ہاں حضور! آج ہی صبح میں آپ کی ہوم
سیکریٹری نے میرا تعارف کرایا تھا۔
ڈاکٹر شوکت: (مسکراتے ہوئے)۔ پانی پت کی پہلی جنگ
کب ہوئی؟
نقدی شاہ: حضور! میں ذات کا سائیں ہوں۔
انٹرویو میں جنگ لڑائی کی باتیں نہ کریں
دل گھبراتا ہے۔
ڈاکٹر شوکت: اچھا، یہ تو بتلائیے۔ سراج الدولہ کون تھا؟
نقدی شاہ: آپ نام بھول رہے ہیں سر! سراج الدولہ
نہیں بلکہ سراج الہدیٰ، جس نے اپنے باپ
نورالہدیٰ کا اندھیری کوٹھڑی میں گلا گھونٹ
دیا تھا۔ اس الزام کو چھپانے کے لیے اس
نے باپ کے نام پر لائٹ ہاؤس تعمیر کرلیا۔
تاریخ میں یہ واقعہ 'سانحۂ بلیک ہال' کے
نام سے یاد کیا جاتا ہے۔
ڈاکٹر شوکت: آپ نے اپنی مالی حالت کا ذکر نہیں کیا؟
نقدی شاہ: میری مالی حالت آپ سے پوشیدہ نہیں
ہے۔ ہفتہ میں چار دن فاقہ میں گزرتے
ہیں اور تین دن چندے پر۔ پھر بھی خدا
کا شکر ہے کہ کچھ بچا کر رکھا تھا جس کے
پائی پائی کا حساب آپ کی ہوم سیکریٹری کو
دے چکا ہوں۔
ڈاکٹر شوکت: ٹھیک ہے، گھر جاکر ریزلٹ کا انتظار

[illegible]

مستقل فیچر

برق آشیانوی

مکھی مارنا

ایک انگریزی روزنامے کے مراسلات کے کالم میں ایک مراسلہ ہماری نظر سے گزرا۔ مراسلہ نگار نے لکھا ہے کہ ٹینک بنڈ حسین ساگر پر شام کے وقت مکھیوں کا اس قدر ہجوم بلکہ ہنگامہ یا یوں کہئے کہ ہنگامۂ محشر برپا رہتا ہے کہ سیکلوں، اسکوٹروں پر یا پیادہ ٹینک بنڈ پر سے گزرنے والے راہگیروں کو راستہ سجھائی نہیں دیتا اور ہر لمحہ اس بات کا خطرہ رہتا ہے کہ کوئی ایکسیڈنٹ نہ ہو جائے۔

یہ مراسلہ پڑھ کر ہمیں حیرت ہوئی۔ کیونکہ آج تک ہم نے مکھیوں کے تعلق سے اس قسم کی نازیبا شکایت نہیں سنی تھی۔ البتہ مچھروں کے بارے میں ایسی شکایتیں ضرور سنتے اور پڑھتے ہیں آئے ہیں بلکہ ہم خود بھی ان کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ جب مچھروں کے خلاف مہم چلائی گئی اور ان کا قلع قمع کر دیا گیا تو اب مکھیوں کا درپے آزار ہونا ہمیں ایک خاص قسم کے شبہ میں مبتلا کر رہا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ جب انسانوں نے مچھروں کو بھنگ آزادی کے ساتھ اڑنے اور راہگیروں کے سروں پر منڈلانے ناک اور کان اور آنکھوں میں داخل ہو جانے کے پیدائشی حق سے محروم کر دیا تو انہوں نے مکھیوں سے سازش کر کے اب انہیں اس بات پر آمادہ کر لیا ہے کہ وہ مچھروں کی جگہ لے لیں اور ٹینک بنڈ پر راہگیروں کو ایسا ہی تنگ کریں جس طرح مچھر کیا کرتے تھے۔ تاکہ انسانوں کو پتہ چلے کہ مچھروں کے ساتھ بے رحمی کرنے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے بہرحال اب مکھیوں کی وجہ سے ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ ہم مضامین میں لطیفے استعمال کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ لیکن چونکہ ایک لطیفے میں مکھیوں کے آزار سے نجات کا پہلو نکل آتا ہے اسلئے ہم بیان کر دیتے ہیں۔ لطیفہ یہ ہے کہ ایک رئیس زادے کی شادی کے بعد اس کا یہ حال ہو گیا کہ ناک پر مکھی بیٹھے تو اڑانا اس کے لئے دوبھر ہو گیا۔ ایک مکھی اس کی ناک پر آ بیٹھی تو اس نے داہنے ہاتھ سے اڑا دیا۔ مکھی پھر آ کر ناک پر بیٹھ گئی تو اس نے بائیں ہاتھ سے اڑایا۔ جب تیسری بار مکھی آ کر ناک پر بیٹھ گئی، تو نوجوان نے مکھی سے کہا کہ اگر تو ناک پر سے نہ اڑے گی تو تیری شادی کر دی جائے گی۔ یہ سنتے ہی مکھی اڑ گئی۔ چنانچہ ان راہگیروں کو جو ٹینک بنڈ پر سے گزرتے ہیں۔ ہمارا یہ مشورہ ہے کہ

وہ مکھیوں کو جو دھمکی دیں کہ اُن کی شادیاں کر دی جائیں گی۔ اس کے بعد ہمیں امید ہے کہ مکھیاں ڈر کر بھاگ جائیں گی۔ اگر یہ تدبیر کارگر نہ ہوئی تو پھر اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرنے کے بعد بلدیہ سے رجوع کرنا پڑے گا۔ لیکن اس میں دشواری یہ ہے کہ بلدیہ سے یہ مسئلہ سال دو سال میں حل ہونے والا نہیں اس لئے کہ محکمۂ بلدیہ کو اقتدارِ اعلیٰ کے ملاحظۂ عالی میں اس مسئلہ کو پیش کرنا پڑے گا۔ جہاں سے دو تین سال تک اس کے بارے میں کوئی فیصلہ صادر نہ ہوگا۔ جب زیادہ زور دیا جائیگا تو احکام جاری کر دیئے جائیں گے کہ "مکھیاں مارنے" کی اجازت ہے۔

جب اجازت مل جائیگی تو اس کیلئے اخراجات کا مسئلہ پیدا ہوگا۔ چنانچہ مکھیاں مارنے کے ماہرین کا ایک کمیشن مقرر ہوگا۔ اور اس سے رپورٹ طلب کی جائے گی کہ کیا تدابیر اختیار کی جائیں اور ان پر فی آدمی میں تخمیناً کتنا خرچ آئیگا۔ کمیٹی کی رپورٹ وصول ہونے پر اخراجات کا ایک تخمینی اندازہ قائم کیا جائیگا۔ جو دو چار کروڑ روپے سے کم نہ ہوگا۔ محکمہ کے اقتدارِ اعلیٰ کی خدمت میں رپورٹ پیش کی جاکر اخراجات کا مطالبہ کیا جائیگا۔ محکمہ کا اقتدارِ اعلیٰ محکمہ فینانس سے رقم کا مطالبہ کرے گا لیکن محکمہ فینانس سے جواب آئیگا کہ اس نئے "مد" کے اخراجات کی گنجائش بجٹ میں موجود نہیں ہے۔ چنانچہ سالِ آئندہ اس کو بجٹ میں شریک کر کے اسمبلی میں پیش کیا جائیگا۔ پھر اسمبلی میں مکھیاں مارنے کے مسئلہ پر بحث ہوگی۔ جب اسمبلی میں بحث ہوگی تو بعض اراکین "مکھیاں مارتے" بیٹھے رہیں گے مطلب یہ کہ وہ گفتگو میں حصہ نہ لیں گے۔ اس لئے کہ اُن کی مانے کوئی [illegible] بعض اراکین تو صرف اراکین ہوتے ہیں۔ رائے دینے کے بجائے صرف مکھیاں مارنے کے ہی اہل ہوتے ہیں۔ غرض اسمبلی میں مکھیاں مارنے کے مسئلے پر بڑی گرما گرم بحث ہوگی اور آخر کار کچھ نئے محاصل مثلاً برقی اور آبرسانی کے ٹیکس میں اضافہ کر کے مکھیاں مارنے کے لئے ایک رقم مختص کی جائے گی جو محکمہ بلدیہ کے مطالبہ کے عشر عشیر کے برابر ہوگی۔ جب محکمہ بلدیہ والے اسی آفس سے رقم کا مطالبہ کریگا تو وہاں سے جواب آئیگا کہ ابھی اس سلسلے میں کوئی گورنمنٹ آرڈر جس کو عرفِ عام میں جی۔ او کہا جاتا ہے وصول نہیں ہوا۔ پھر محکمہ فینانس کی خدمت میں عرضداشت پیش کی جائے گی۔ وہاں سے احکام وصول ہونے تک سال گذر جائیگا اور جو رقم سال زیر بحث کے لئے منظور ہوئی تھی وہ ضبط ہو جائیگی۔ چنانچہ پھر ایک سال تک انتظار کرنا پڑے گا۔ چنانچہ دوسرے سال جب رقم منظور ہوگی تو مکھیاں مارنے کے مسئلے پر عمل آوری کے طریقۂ کار پر غور کیا جائے گا اور جو رپورٹ ماہرین کمیشن کی ہوگی وہ تلاش کی جائیگی تو وہ دستیاب نہ ہوگی۔ چنانچہ کسی نئے طریقۂ کار پر غور کیا جاکر فیصلہ کیا جائیگا کہ ریاست میں جتنے بیروزگار ہیں انہیں مکھیاں مارنے پر مامور کر دیا جائے۔ لیکن انہیں باقاعدہ تنخواہ نہیں دی جائیگی کیونکہ اس صورت میں وہ ٹھیک طور پر مکھیاں مارنے کے بجائے گھروں میں بیٹھ کر مکھیاں مارا کریں گے اور مہینہ ختم ہوتے ہی تنخواہ لے لیں گے جس کی بہترین مثال [illegible] ہے۔ چنانچہ طے یہ کیا جائیگا کہ جو شخص جتنی مکھیاں مارے گا اسی حساب سے اس کو اجرت دی جائیگی۔ [illegible] ایک ہزار مکھیاں

مارنے کا ایک روپیہ اجرت ہوگی۔ اس حساب سے جو شخص جتنے ہزار مکھیاں مارے گا اتنے ہی روپے اجرت اس کو دی جائیگی۔

غرض تین چار سال کے بعد جب بیروزگار نوجوانوں کی فوج مکھیوں کی فوج سے مقابلہ کرنے کے لئے آئیگی تو اس وقت تک مکھیاں واپس ہو جائیں گی اور ٹڈیوں کی فوج کو روانہ کرے گی۔ جب بیروزگار نوجوان ٹڈیوں کو مار کر فی ہزار ٹڈی ایک روپیہ کے حساب سے مطالبہ کریں گے تو آڈٹ آفس سے یہ اعتراض ہوگا کہ میجر ہیڈ آف (Major Head Health) "حفظانِ صحت" اور مائنر ہیڈ (Minor Head) "مکھیاں مارنا" کے تحت موازنہ منظور ہوا تھا۔ ٹڈیاں مارنے کی کوئی "مد" یعنی منظورہ نہیں ہے۔ لہٰذا ٹڈیاں مارنے کی اجرت قابلِ واپسی ہے یعنی ( ) چنانچہ جن بیروزگار نوجوانوں نے ٹینک بنڈ پر ٹڈیاں ماری تھیں اپنی محنت کا معاوضہ حاصل کئے بغیر پھر گھروں میں بیٹھ کر مکھیاں مارا کریں گے۔

آخر میں ہم مراسلہ نگار کو رائے دیتے ہیں کہ وہ سرکار کے کسی انتظام کے بھروسہ پہ نہ بیٹھے بلکہ نہ صرف وہ خود بلکہ ٹینک بنڈ پر سے گذرنے والے وہ تمام راہ گیر بھی جو پاپیادہ گذرتے ہوں یا سیکلوں اور اسکوٹروں پر گذرتے ہوں وہ بھی ایک ایک مکھی کو پکڑ کر مارنا شروع کر دیں۔ انشاء اللہ بہت جلد مکھیاں ختم ہو جائیں گی اور اس کے بعد ٹڈیوں کا دور شروع ہوگا۔ جس کا انتظار کریں۔

میرزا ادیب

کنہیا لال کپور

کنہیا لال کپور ——— بس کنہیا لال کپور تھے۔ ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں ایک۔ بڑے سے بڑے مجمع میں بھی الگ تھلگ نظر آتے تھے۔ لمبی لمبی ٹانگیں لمبے لمبے بازو مگر چہرہ ان کے مقابلے میں بہت چھوٹا۔ جیسے ایک چھوٹے سے معصوم بچے کا ہو ——— اس چہرے پر سدا ایک مسکینی سی چھائی رہتی تھی۔ پتلے دبلے نحیف و نزار۔ کرشن چندر نے ایک مرتبہ پوچھا۔ "کپور ——— ! اتنے دبلے پتلے کیوں ہو۔" بولے "کرشن جی ——— انھیں تو تمھاری گوپیاں مکھن کھلایا کرتی ہیں، ہم غریب کو کوئی نہیں پوچھتی۔" کرشن خاموش رہنے والے آدمی کہاں۔ فوراً کہنے لگے۔ "کنہیا جی۔ بس نام ہی کے کنہیا ہو۔ مکھن یوں نہیں، چرا کر کھایا جاتا ہے۔" کپور نے جواب دیا۔ "جی ہاں، درست کہا۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ ہم کچھ شریف قسم کے کنہیا ہیں۔ چور کرشن کنہیا نہیں ہیں۔" اس فقرے کی چوٹ کرشن چندر نے ضرور محسوس کی ہوگی۔

کپور واقعی بہت دبلے پتلے تھے۔ اوپندر ناتھ اشک کہتے تھے — "اگر کبھی آندھی زور سے چلی تو کپور اڑ کر نہ جانے کہاں پہنچ جائے گا۔" یہ بات کہیں سے کہیں پہنچ گئی ——— ایک بار ایسا ہوا کہ کپور، اشک، کرشن، راجہ مہدی علی خاں، گوپال متل ادب لطیف کے دفتر میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ باہر تیز ہوا نے آندھی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ یکایک کپور نے چائے کے دو تین گھونٹ بھر کر پیالی میز پر رکھ دی اور جلدی کرسی سے اٹھ بیٹھے۔ اشک نے پوچھا۔ "کہاں کپور جی؟" جواباً بولے۔ "یار ایک بہت ضروری کام یاد آ گیا ہے۔" اور یہ کہہ کر دروازے کی طرف جانے لگے۔ راجہ مہدی علی خاں بھی اپنی پیالی خالی کر کے اٹھ بیٹھے اور کپور سے کہنے لگے — "چلیے کپور صاحب!" کپور نے پوچھا۔ "آپ کو کہاں جانا ہے؟" راجہ نے کہا۔ "جہاں آپ کو جانا ہے!" کپور کچھ نہ سمجھتے ہوئے حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔ راجہ نے مسکرا

کی بلندیوں کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے ہر افسانے کی اشاعت پر کئی خطوط دفتر میں آجاتے تھے۔ ایک آدھ خط میں اشک کے افسانے کی بھی تعریف نکل آتی تھی۔ ہاں تو دونوں کے افسانے چھپے۔ اب کپور کی بزرگی ملاحظہ فرمائیے کپور کرشن چندر سے ملے اور انھیں اطلاع دی۔ "کرشن! یار حیرت ہے تمہارا اتنا خوبصورت افسانہ چھپا ہے اور پڑھنے والوں نے اسے بالکل پسند نہیں کیا۔ اشک کے افسانے کو بے پناہ داد دی ہے۔"

کرشن کے لیے یہ بات بالکل خلاف توقع تھی مگر دل بڑا وسیع تھا۔ خاموش رہا۔ ظاہر ہے کہ کرشن کو وہی کچھ کرنا چاہیے تھا جس کی کپور کو امید تھی اور جس کے لیے انھوں نے یہ چکر چلایا تھا۔ کرشن نے اشک کو بہت بہت مبارکباد دی۔ اشک دل میں بہت خوش ہوا۔ اوپر سے صرف یہ کہتا رہا۔ "میں نہیں مانتا ——— ایسا نہیں ہو سکتا" کپور کو اپنی کارروائی کے نتیجے کا علم ہو گیا ——— شام کو کرشن اور اشک دفتر میں آئے تو کپور بھی پہنچ گئے اور آتے ہی بولے "میرزا یار! کرشن اور اشک کے افسانوں کے بارے میں جو خطوط آئے ہیں وہ ذرا دیکھیے" "مجھے کیا معلوم تھا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ میں نے سارے خطوط اشک کے سامنے پھیلا دیئے۔ اب اشک جو خط بھی اٹھاتا ہے اس میں کرشن کے افسانے کی بے پناہ تعریف اور اس کا کوئی ذکر نہیں۔ کپور ان کے چہرے کو بڑے غور سے دیکھ رہے ہیں اور مسکراتے جا رہے ہیں ——— دوسری طرف کرشن بھی ایک ایک خط کا مطالعہ کر رہا ہے لیکن چہرے سے بے نیازی نمایاں ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ معاملے نے اس وقت دگرگوں صورت اختیار کرنی شروع کر دی جب اشک نے کپور کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھا۔

"وہ خط کہاں ہیں جو میرے افسانے کی تعریف میں آئے ہیں؟" اس نے کپور سے پوچھا۔

کپور نے بڑے اطمینان سے فرمایا۔ "اشک! میں نے تو ان سارے خطوط میں تمہاری تعریف ہی پڑھی تھی ——— نہ جانے اب کیا ہو گیا ہے ——— میرزا کے پاس ضرور کوئی 'جھرلو' ہے۔" ———

"بکواس ———" اور اشک اٹھ بیٹھا ——— بڑی مشکل سے اُسے منایا گیا۔

کپور کو کوئی اجنبی شخص دیکھتا تھا تو انھیں ایک معمولی آدمی ہی سمجھتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی مسکراہٹ بڑی معنی خیز ہوتی تھی مگر یہ مسکراہٹ غور سے دیکھنے پر ہی معنی خیز اور طنزیہ محسوس ہوتی تھی۔ ویسے وہ بڑے مسکین اور یتیم سے آدمی نظر آتے تھے۔

ایک بار دفتر میں آئے تو باہر کے کچھ اہل قلم میرا انتظار کر رہے تھے۔ ایک کرسی بھی خالی نہ تھی۔ کپور دیوار کے قریب کھڑے ہو گئے۔ مہمانوں نے انھیں دیکھا اور غالباً انھیں دفتر کا کوئی کارکن سمجھا۔ [illegible] چپراسی ہی سمجھ لیا ہو۔ میں آیا تو بہت شرمندہ ہوا۔ جب مہمانوں کو ان کی شخصیت کا علم ہوا تو وہ [illegible] معذرت کرنے لگے کپور بولے۔ "آپ خواہ مخواہ اپنے الفاظ ضائع کر رہے ہیں۔ ندامت اور معذرت کے [illegible] سنبھال کر رکھیے آئندہ کسی وقت ضرور کام آجائیں گے۔"

پھر وہ کسی کی تعریف نہیں کرتے تھے اور میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ خود بھی اپنی تعریف سن کر خوش نہیں ہوتے تھے۔ کم از کم مجھے انھوں نے کبھی ایسا تاثر نہیں دیا تھا کہ وہ اپنی تعریف سن کر خوش ہوتے ہیں۔ قارئین انھیں تعریفی خطوط لکھتے تھے تو وہ کرشن چندر کے برعکس ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔

سالنامہ چھپنے والا تھا۔ میں نے ان سے اصرار کر کے ان کا مضمون حاصل کیا۔ دوسرے دن آئے تو میں نے بڑی تعریف کی۔ مسکراتے رہے، آخر میں بولے، "آپ نے مضمون سمجھ لیا ہے؟" سخت غصہ آیا۔ کہا۔ "پھر صاحب اگر مضمون سمجھ میں نہ آتا تو اس کی تعریف کیوں کرتا۔" ایک دو لمحے مسکراتے رہے پھر بولے۔ "اچھا یہ معاملہ ہے — میں تو سمجھتا ہوں جس چیز کی زیادہ تعریف کی جاتی ہے — اسے انسان سمجھا نہیں ہوتا۔"

ایک واقعہ مجھے ڈاکٹر وحید قریشی نے بتایا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد کپور "موگا" چلے گئے تھے۔ وہاں کالج میں انگریزی پڑھاتے تھے۔ "میری لائبریری" کے مالک چودھری بشیر احمد نے کپور کے مضامین کا انتخاب چھاپنا چاہا تو مظفر علی سید سے کہا کہ وہ مضامین کا انتخاب کریں اور ساتھ دیباچہ بھی لکھ دیں۔ ظاہر ہے اس کے لیے کپور سے اجازت لینا ضروری تھا۔ مظفر علی سید نے کپور کو اس سلسلے میں خط لکھا اور اجازت کی درخواست کی۔ کپور نے جو جواب لکھا اس میں کہا — "اس سے زیادہ میری خوش قسمتی کیا ہوگی کہ ایک سید کے ہاتھوں مارا جاؤں۔ ضرور انتخاب چھاپیے۔"

میں کنہیا لال کپور کی طنزیہ اور مزاحیہ تحریروں کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہوں گا۔ اس وقت یہ میرا منصب ہے بھی نہیں۔ میں تو ان لمحوں میں اس کنہیا لال کپور کو یاد کر رہا ہوں جس سے آخری ملاقات کو چھتیس سینتیس برس کی مدت گزر گئی ہے مگر وہ میری تنہائیوں میں ہمیشہ قریب رہا ہے۔

میں اس کنہیا لال کپور کو یاد کر رہا ہوں جسے بار بار دیکھنے کے بعد بھی ایک بار دیکھنے کی ہوس رہتی تھی۔ میں اس کنہیا لال کپور کے بارے میں سوچ رہا ہوں جو لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا، لہراتا ہوا، بل کھاتا ہوا جب دفتر ادب لطیف میں آتا تھا تو اس کی مسکراہٹیں سارے ماحول میں پھیل جاتی تھیں۔

یہ کنہیا لال کپور تھا — جو قہقہہ نہیں لگاتا تھا — بس مسکراتا رہتا تھا اور مسکراتا بھی [illegible] کی طرح نہیں، کھل کر نہیں، مگر اس مسکراہٹ نے اس کی مکمل شخصیت کو گویا اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

[illegible] کا سا انسان کنہیا لال کپور — [illegible] پیارا انسان تھا۔ اتنا پیارا، اتنا منفرد انسان [illegible] — بس کنہیا لال کپور تھا!

—

[illegible] کے کالموں سے

کنہیا لال کپور

لغاتِ جدید

آلو ایک ترکاری جس کے کھانے سے قبض، موٹاپا اور گنٹھیا ہو جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی ان تمام خطروں کے باوجود کھایا جاتا ہے۔

آلو بخارا وہ آلو جو بخارا میں ہی نہیں ہر ایک شہر میں ملتا ہے۔ خدا جانے پھر اسے آلو بخارا کیوں کہتے ہیں؟

آمدنی وہ کمائی جو آدھی ڈاکٹر اور آدھی محکمہ انکم ٹیکس لے جاتا ہے۔

ادیب ۱۔ وہ شخص جو اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ شیکسپیئر اور کالی داس کے بعد ادب کو فروغ دینے کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے۔

۲۔ وہ آدمی جو "بھوا" یا "واہ واہ" پر پلا پنپا اور جیا ہے۔

۳۔ وہ سادہ لوح جسے یہ غم کھائے جاتا ہے کہ اگر اس نے غزل یا کہانی نہ لکھی تو دنیا کے تمام کام بند ہو جائیں گے۔

باپ وہ گھٹیا اور تھکا ماندہ شخص جو سارے گھر کے لئے کماتا ہے۔ لیکن جسے اس کی بیوی نکھٹو اور بچے چغد سمجھتے ہیں۔

بیوی (ہندستانی) دھوبن۔ باورچن [illegible] اور باندی کا قابلِ رحم مرکب۔

(انگریز یا امریکن) وہ عورت جس کے نزدیک شوہر اور شوفر میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔

(اطالوی یا فرانسیسی) وہ عورت جو طلاق حاصل کرنے کے لئے ہی شادی کیا کرتی ہے۔

پان ایک سبز پتہ ہے جسے اہلِ [illegible] بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ حالانکہ اس میں کھانے والی کوئی بات نہیں ہوتی۔

پاسبان وہ بدقسمت جو عشق کے رنگ میں بھنگ ڈالنے کی غرض سے عاشق کو معشوق سے ملنے نہیں دیتا کیونکہ وہ خود معشوق سے عشق کرتا ہے۔

پانی شہنشاہ [illegible] کے زمانے تک پینے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن اب [illegible] منہ دھونے یا کپڑے دھونے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ پینے کے لئے [illegible] شراب عام ملتی ہے۔

[illegible] [illegible] کا دریا [illegible]

پڑوسی وہ شخص جو آپ کے گھر کو اپنا گھر سمجھتا ہے اور جس

لیکن جس کی یہ آرزو کبھی پوری نہیں ہوتی۔

* وہ اخبار نویس جس کا ایڈیٹوریل اس کے علاوہ صرف ایک اور شخص پڑھتا ہے یعنی پروف ریڈر

* ایک قسم کا ہرفن مولا جو گھاس پھوس سے لیکر چین اور روس تک ہر موضوع پر اظہار خیال کرسکتا ہے اور جس پر یہ مصرع صادق آتا ہے

کس چیز کی کمی ہے خواجہ تیری گلی میں

امرود اکبر الٰہ آبادی اور مہادیوی ورما کے بعد الٰہ آباد کی ہندوستان کو تیسری دین۔

بادام ایک خشک میوہ جسے صرف وہ لوگ خرید یا کھا سکتے ہیں جن کے پاس نمبر ۲ کا پیسہ ہوتا ہے۔

بچے چلتی پھرتی روتی پیٹتی لعنتیں جو جتنی کم ہوں زیادہ ہیں۔

بیوی آپ کے بچوں کی ماں جس سے عموماً آپ اور بچے دونوں پناہ مانگتے ہیں۔

بیوہ وہ عورت جو چاہے خوبصورت ہو یا بدصورت ہر شخص کی بھابی ہوتی ہے۔

پیٹو ایسا شخص جس کا پیٹ پیٹ نہیں ہوتا مال گودام ہوتا ہے۔

پردہ بقول اکبر الٰہ آبادی کبھی صرف مردوں کی عقل پہ پڑ گیا تھا۔ آجکل مردوں اور عورتوں دونوں کی عقل پہ پڑ گیا ہے۔ چنانچہ بیویاں نیم عریاں لباس پہنتی ہیں اور شوہر غیرت قومی سے زمین میں گڑ جانے کی بجائے زمین پر پاؤں نہیں رکھتے۔

تالی وہ آواز جسے سننے کیلئے مقرر اور اداکار ترس جاتے ہیں۔

تفریح دن رات اپنے ہمسایوں پہ تنقید کرنا۔

چاند وہ خوبصورت چیز جسے بدصورت ثابت کرکے سائنس نے ایک بہت بڑا گناہ کیا ہے۔

چمچہ وہ بے غیرت شخص جس کی سب سے بڑی کوالیفکیشن چاپلوسی ہوتی ہے۔

حکیم وہ شخص جو کہتا ہے ڈاکٹر لوگ مرض کی تشخیص اور علاج نہیں کرسکتے اور جس کے متعلق ڈاکٹر لوگ بھی اسی قسم کی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔

خودکشی خود غرضی کا ایک نہایت شیریں نام۔

دماغ وہ بھوسہ جو لوگوں کی کھوپڑیوں میں بھرا ہوتا ہے

دوست وہ شخص جسے مخاطب کرکے کہا جاسکتا ہے کہ

وہ ارماں جو نکلے دشمنی سے
نکالے جا رہے ہیں دوستی سے

ساون وہ مقبول مہینہ جس میں چھت ٹپکتی ہے سیلاب آتے ہیں اور ہیضہ پھیلتا ہے۔

سالی سالا دو مقبول ترین گالیاں جن کا استعمال وہ لوگ کثرت سے کرتے ہیں جن کی کسی وجہ سے شادی نہیں ہوسکی۔

سانپ جس کو دیکھ کر آدمی کی روح فنا ہوجاتی ہے حالانکہ بہت سے سانپوں میں اتنا زہر بھی نہیں ہوتا جتنا ایک عام آدمی میں پایا جاتا ہے۔

شراب وہ مائع چیز جو انسان اپنے کو جانور میں تبدیل کرنے کیلئے پیتا ہے۔

صبر [illegible]

عقل وہ [illegible]

[illegible]

انور سدید
پاکستان

مزاحیہ سفرنامے

(گذشتہ دس سال کا پاکستانی ادب)

گذشتہ دس برسوں میں اُردو سفرنامے میں مزاح کو بھرنے کی کامیاب کاوش کی گئی ہے۔ اس ضمن میں اولیت محمد خالد اختر کو حاصل ہے، ان کے دو سفرنامے "سواتی مہم" اور "کاغانی مہم" اُردو ادب میں نمایاں حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ محمد خالد اختر کی پرورش انگریزی ادب کے سائے میں ہوئی ہے۔ ان کے ہاں مزاح کا بے حد لطیف اور تہذیبی نامیہ موجود ہے۔ "سواتی مہم" اور "کاغانی مہم" میں اگرچہ مزاح مقصود بالذات نہیں تاہم محمد خالد اختر نے اسے مناسب مقامات پر خاطر خواہ اٹھایا ہے۔ ان کی خامی یہ ہے کہ ان کے اسلوب نے ایک جامد کیفیت اختیار کر لی ہے اور اکثر اوقات یوں محسوس ہوتا ہے کہ اختر انگریزی میں سوچتے ہیں اور [illegible] کے ترجمے کو اُردو میں منتقل کر دیتے ہیں۔ [illegible] اصل مطلب کو قبول کرنے سے [illegible] ہے کہ [illegible] ہیں اور وہ ماحول کو تو صرف قلم کے آئینے میں اُتارنے کا فن جانتے ہیں بلکہ ان کے ہاں منظر سے مسکراہٹ کو بیدار کرنے کا سلیقہ بھی موجود ہے۔ "سواتی مہم" اور "کاغانی مہم" جزل محمد کاظم اپنے سادہ اور پامال ناموں کے باوجود اُردو کے بہترین سفرنامے ہیں۔

سفرنامے میں مزاح کو ایک اور زاویہ کرنل محمد خان نے پیدا کیا ہے۔ ان کی کتاب "بسلامت روی" میں برما سے لے کر تہران تک کے سفر کو شگفتہ مزاحیہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ کرنل محمد خان کی خوبی یہ ہے کہ وہ داخل سے خارج کی طرف اور پھر خارج سے داخل کی طرف مسلسل محوِ سفر رہتے ہیں۔ ان کی نگاہ پہلے گرد و پیش پر نظر ڈالتی، وہ [illegible] مکان، وسائل اور راہ و منزل کو ایک خوش سلیقہ [illegible] سے دیکھتے ہیں اور پھر اپنے داخل میں [illegible] تلاش کرتے ہیں [illegible] کرنل محمد خان [illegible]

کیا آپ جانتے ہیں؟
ہر پیدائش اور موت کا اندراج کرانا لازمی ہے
پیدائش کا سرٹیفکیٹ مختلف مقاصد کے لئے عمر کا ثبوت ہوتا ہے:
• اسکول میں داخلے کے لئے • مُلازمت کے حصول کے لئے • ڈرائیونگ لائسنس کیلئے
• ووٹ دینے کے حق کے لئے • پاسپورٹ کے حصول کے لئے • بیمہ پالیسی کے حصول کے لئے
موت کے سرٹیفکیٹ کی ضرورت ہوتی ہے:
• ترکے میں جائیداد کے حصول کے لئے • بیمے کی رقم کی وصولیابی کے لئے
مُلک کا مُفاد:
پیدائش اور اموات کا اندراج مُستقبل میں "بہتر صحت اور بہتر زندگی" کی پیش بندی اور منصوبہ بندی کرنے کے لئے بُنیادی معلومات مُہیا کرتا ہے۔
اندراجِ پیدائش و اموات کے قانون 1969ء کے بموجب پیدائش و اموات کا اندراج کرانا لازمی ہے۔
پیدائش اور اموات
کا بروقت اندراج یقینی بنائیے

R. No. 15822/68 Postal Regd. No. H. HD 6

Shugoofa

Vol 15 Copy 7 31 Bachelor Quarters, M.J. Market, Hyderabad-1 July 1982 Phone : 57716

AUGUST 1982 Rs. 3-00

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

یوم آزادی مبارک

جلد ۱۵ ——— شمارہ ۸

ایڈیٹر
سید مصطفیٰ کمال

مجلسِ ادارت:
حمایت اللہ
منظور احمد
مسیح انجم

مجلسِ مشاورت
راجندر سنگھ بیدی
بھارت چند کھنہ
خواجہ عبدالغفور
نریندر لوتھر
مجتبیٰ حسین

منیجر: سمیع جلیل
ٹائیٹل: شعیب

زرِ سالانہ: انفرادی ۲۵ روپے
اداروں سے ۳۰ روپے
قیمت فی پرچہ: ۳ روپے
کتابت: محمد سلیم۔ مسعود فہد۔ نعیم احمد
بیرونی ممالک سے: عرب ممالک ۹۰ روپے امریکہ و برطانیہ ۱۱۰ روپے

طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

خط و کتابت کا پتہ: شگوفہ ۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد
فون 57716

اِس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

ڈاکٹر [illegible] شیخ

استاذیِ مرحوم

ع اُٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون

آج استاذی مرحوم پروفیسر [illegible] کے جلسہ تعزیت میں ان کے دوست، عزیز اور شاگرد ہزاروں کی تعداد میں شریک تھے۔ اس مجمع کو دیکھ کر [illegible] مرحوم کی جوتیاں سیدھی کرتا تھا، بڑا تعجب ہوا کیونکہ میں نے مرحوم کی ادبی اور علمی تقریروں میں پچیس سے زیادہ افراد کبھی نہیں دیکھے تھے۔

جلسہ میں شریک ہر شخص اشکبار تھا۔ یوں تو مرحوم کی عنایتوں اور حرکتوں کی وجہ سے ہر آنکھ ہمیشہ نم رہی لیکن آج اس نمی میں ایک عجیب کیفیت تھی۔ ہر شخص پر ایک طرح کا اطمینان اور سکون طاری تھا، اور بہتے ہوئے آنسوؤں میں ایک لذت سی تھی۔ مرحوم کے بعض نااہل شاگردوں کا یہ خیال تھا کہ کبھی کبھی شدت مسرت سے بھی آنسو چھلک پڑتے ہیں۔ بہرحال مرحوم کی یاد آتے ہی ہر شخص کلیجہ مسوس کر رہ جاتا تھا۔ اور بے اختیار ان کے سامنے یہی سوال ابھرتا تھا کہ

ع اُٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون؟

مرحوم کے ایک عزیز شاگرد ڈاکٹر فدوی [illegible] سے یقین کے ساتھ یہ کہہ رہے ہیں کہ [illegible] اقبال نے یہ مصرعہ استاد داغ کے بجائے استاذی مرحوم کے لئے کہا تھا۔ وہ اسے علامہ اقبال کی دور بینی اور مرحوم شناسی پر محمول کرتے تھے کہ انہوں نے پچاس سال پہلے علمی و ادبی دنیا میں [illegible] چلانے والے ایک استادوں کے استاد کو [illegible] پچاس سال قبل ہی یہ مصرعہ [illegible] تخلیق کیا تھا۔ ڈاکٹر [illegible] کے اس خیال کو اگر تسلیم کیا جائے تو اردو فارسی کا [illegible] شاعر [illegible] اور مرحوم شناس ثابت ہوگا کیونکہ مرحوم اردو فارسی شاعری کی مجسم تفسیر تھے اور ان کی زندگی اور شخصیت کا ہر گوشہ اور ہر پہلو کسی نہ کسی استاد کے شعر کی ترجمانی کرتا تھا۔ [illegible] تو مرحوم

ح پھونک دی۔

ع بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

آج استاد باذجی کی بے وقت رحلت پر اُردو زبان بھی اپنے آپ کو یتیم محسوس کر رہی تھی
ں تو مرحوم زندگی بھر ہر کام بے وقت ہی کرتے رہے لیکن ان کی بے وقت موت پر اردو
زدہ ہو کر مجسم سوال بن گئی اور مرحوم سے گلہ کر رہی تھی کہ ع کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور
اُردو زبان کا یہ اضطراب نامناسب بھی نہیں تھا کیونکہ یہ استاد باذجی ہی تو تھے جن کے متعلق
کہا جا سکتا تھا کہ ع آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری!

مرحوم نے نہ صرف یہ کہ نئے نئے پینتروں اور قلابازیوں سے اُردو ادب کو مالا مال کر دیا
تھا، بلکہ اُردو کے لئے یہ امتیازی کارنامہ بھی انجام دیا تھا کہ اپنی لاعلمی اور عدم واقفیت کے باوجود
دھی صدی تک تعلیم و تدریس کی گدی پر براجمان رہے تھے۔ ستاروں کی چھاؤں میں خونِ جگر
ا استعمال کر کے تحقیقی مقالہ لکھنا کوئی بڑی بات نہیں تھی، لیکن دوسروں کے مال کو اپنا کر تحقیق
تنقید کے بیش بہا خزانے پیدا کرنا، مرحوم ہی کا حصہ تھا۔ اُردو کے لئے یہ اعزاز کیا کم تھا اور
یا ہے کہ اس کا ایک جاں نثار کسی سادے نسخے کی طرح کورے ہوتے ہوئے بھی ادبی، معاشی
سیاسی اور تہذیبی جلسوں کی صدارت کر رہا تھا۔ استاد مرحوم سے پہلے اردو دنیا نے کبھی ایسا
یالا اور باہمت انسان نہیں دیکھا تھا جو یومِ اقبال پر طوائفوں سے انیس کے مرثیے پڑھوا کر اور
یومِ حالی پر رقص و سرود کا اہتمام کر کے اردو کے دشمنوں کو منہ توڑ جواب دے رہا ہے۔

مرحوم بلاشبہ اردو غزل کی آبرو تھے کہ خود اپنی بے آبروئی کے باوجود غزل کا مستقبل سنوارنے
کے لئے جہاد کرتے رہے۔ اپنے شاگردوں کی ہمت افزائی کی خاطر مرحوم، بچوں کے لکھے ہوئے مضامین
کو خود کے نام سے چھپواتے رہے، اور اس طرح اردو زبان و ادب میں گھٹیا مضامین کا ایک انبار لگا کر
تنقید نگاروں کے لئے سنہری موقع فراہم کرتے رہے، سچ ہے اگر استاد کی تحریریں نہ ہوتیں تو کلیم
احمد کا یہ گمان صحیح ثابت ہو جاتا کہ اردو میں تنقید مشرق کی مرہون [illegible] ہے۔

ع بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق

استاد کی مرحوم کے پاس عقل نام کی کوئی چیز تھی ہی نہیں، اس لئے محو تماشائے لبِ بام
کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ عشق و عاشقی مرحوم کی زندگی کا سب سے تابناک پہلو تھا۔ جگر
نے اپنی آپ بیتی میں دعویٰ کیا ہے کہ عشق کے بغیر آدمی انسان بن ہی نہیں سکتا، لہٰذا وہ بارہ سال کی عمر
میں بارہ سال کی ماما سے عشق کرنے لگے تھے اور اونچے اٹھارہ سال کا شباب معاشقوں کے سبب اپنے
آپ کو انسان محسوس کرنے لگے تھے۔ لیکن مرحوم استاد کا نظریۂ عشق جگر سے جداگانہ تھا، معاملات
عشق میں جوش اور ٹھہراؤ کے قائل تھے۔ جبکہ مرحوم حالات کے مطابق کبھی عشق ہر راستے عشق اور

اور احتیاطاً ایک بھی کاپی کسی پبلیشر کے حوالے نہیں کی' تاکہ اسے کتابوں کی فروخت سے ایک پیسے کا بھی فائدہ ہو۔ اس طرح ایک لاکھ کاپیاں مرحوم کے اناج کے گودام میں محفوظ تھیں۔ کیا دنیا کسی ایسے ادیب کی مثال پیش کر سکتی ہے جس کی کتابوں کی لاکھ کاپیوں میں سے ایک بھی فروخت نہیں ہوتی ہو یہ عالمی ریکارڈ نہیں تو اور کیا ہے!

۶۔ چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط

دنیا کے ہر برگزیدہ شخص کی سوانح عمری لکھی جاتی ہے۔ اور اس کے لئے اس کے افکار' اعمال اور تحریروں کو ماخذ بنایا جاتا ہے' لیکن مرحوم کی سوانح عمری ترتیب دینے کے لئے وہ تصویریں ہی کافی تھیں جو انہوں نے اپنے شاگردوں کو دکھلانے کے لئے چھوڑی تھیں۔ مرحوم کی زندگی کیا تھی ایک مسلسل رنگین تصویر تھی۔ رنگین اس لئے کہ وہ اپنی تصویر میں ایک حسین صورت کی موجودگی ضروری سمجھتے تھے۔ مرحوم نے اپنی زندگی کے ہر لمحے کو تصویروں میں گرفتار کر رکھا تھا۔ اور ساتھ ہی تصویروں میں موجود حسیناؤں کو بھی مرحوم کے چند نالائق شاگردوں کو استاد کا حسینوں سے یہ جائز تعلق بھی کھٹکتا تھا۔ اور وہ ان پر طرح طرح کی تہمتیں تراشتے تھے۔ ان ناسمجھ لڑکوں کو کیا معلوم کہ مرحوم استاد کا احساس جمالیات کس قدر نازک تھا۔ اگر وہ شاکی شاگردوں کی باتوں میں آکر حسن سے ناطہ توڑ لیتے تو آج ان کی تحریریں حسن کی اس بلندی پر نہیں ہوتیں جتنی کہ آج ہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ استاد ادب برائے حسن کے زبردست حامی تھے اور اپنے فن کی لطافت اور نزاکت کو مجروح کرنے پر کسی طرح تیار نہیں تھے۔ تحریروں میں حسن پیدا کرنے کیلئے حسینوں کی قربت کس قدر ضروری ہوتی ہے اسے میر' غالب' داغ اور جگر تو سمجھ سکتے ہیں' کالج کے ناسمجھ طلباء نہیں۔ استاد کے ادبی خزانے میں ہزاروں تصویریں دیکھ کر یہ کہنا پڑتا کہ "چند تصویر بتاں" ہی ان کا سرمایہ حیات تھا۔ یہ خیال مرحوم کی روح کو تکلیف پہونچانے کے مترادف ہے۔ جنہیں ہم صرف تصویریں سمجھتے ہیں وہ مرحوم کی زندگی کا حاصل تھیں۔ ان بے جان تصویروں میں میں چند صورتیں ایسی ہیں جو غالباً مرحوم کو حوران خلد میں بھی میسر نہ ہوں گی۔ اور ان کا ذوق نظر تسکین کے لئے رو رہا ہوگا

۷۔ لیے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر

خاکسار مرحوم استاد کے قریبی شاگردوں میں شمار ہوتا تھا۔ مجھے اس پر فخر ہے کہ استاد کی صحبت بابرکت سے جتنا فیض میں نے پایا کسی اور شاگرد کے حصہ میں نہیں آیا۔ اپنی دس سالہ طالب علمی کے زمانے میں اپنے جیب خرچ سے ہر دوپہر کو استاد کو کھانا کھلانے کا شرف صرف مجھے ہی حاصل تھا اسی طرح ہر کلاس میں اوّل آنے کا اعزاز بھی مجھ غریب ہی کو ملا تھا۔ کون کہتا ہے کہ استاد کی خدمت ضائع ہوتی ہے۔ ایک راز البتہ آج تک حل نہیں کر سکا کہ مرحوم کی ذات کے علاوہ ہر شخص "خفا" مرحوم کا کیوں تھا' مجھے تو استاد کا کوئی دوست یا شاگرد ایسا نہیں ملا' جو مرحوم کو جھوٹا بھلا کہہ کر ہی دوستی یا

یں بھی ایک زبردست فلسفیانہ نکتہ پوشیدہ ہے فرمایا جس طرح چنگاریاں پیدا کرنے کے لئے دو پتھروں کا
ضروری ہے اسی طرح مقبولیت اور شہرت حاصل کرنے کے لئے دوسروں کی دل آزاری اور دل شکنی بھی
ری ہے۔ لوگ محبت اور شفقت کا برتاؤ تو جلد ہی بھول جاتے ہیں لیکن دل آزاری کے کچوکے زندگی بھر
رکھتے ہیں اور اس طرح دل آزار بھی مشہور اور لافانی ہو جاتا ہے۔ تفریحاً سن کر میں تو
ک ہی گیا، جی میں آیا کہ اس ایک نکتہ پر ہی پیارے استاد کو "ارسطوئے دور حاضر" کہہ کر پکاروں لیکن حاسدین
کے خیال سے لب کھولنے کی ہمت نہیں پڑی۔ مجھے تو استاد مرحوم سے ہمدردی تھی، ظالم
انے بڑے بڑے سورماؤں اور یہ دگوں کو نہیں بخشا تو مرحوم اگر نا سمجھ لوگوں کے ہاتھوں ستائے
ئے تو کون سے تعجب کی بات ہے
ع وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے
مرحوم کو کتابوں سے جنون کی حد تک عشق تھا، عشق اور جنگ میں چونکہ ہر چیز جائز ہوتی ہے اس لئے
ناد اپنے دوستوں اور شاگردوں کی کتابوں کے چرانے کو جائز سمجھتے تھے۔ اور کتابیں خرید کر پڑھنے کو وہ
وب سمجھتے تھے کیونکہ ادب کی تاریخ میں کسی بھی عظیم فنکار کی کتابیں خرید کر پڑھنے کی مثال نہیں ملتی۔ مرحوم
اپنی ساٹھ سالہ زندگی میں دوسروں کی خریدی ہوئی تقریباً پچاس ہزار کتابیں جمع کرلی تھیں۔ اردو فارسی
عربی کے علاوہ چینی، بنگالی اور فرانسیسی زبانوں کی کتابیں بھی استاد کی لائبریری میں موجود تھیں کیونکہ مرحوم
کہ چینی، بنگالی اور فرانسیسی زبان کی کتابیں پڑھنے والے کو دنیا اسکالر سمجھتی ہے۔ استاد کے اسکالر ہونے میں اس وقت
شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی، جب علی گڑھ والوں نے انھیں معاشیات کے ایک سیمینار کی صدارت سے نوازا میرا خیال
ف بمبئی ہی میں استاد کے پرستار موجود ہیں لیکن اب پتہ چلا کہ علی گڑھ میں بھی سخن فہم اور علم دوست حضرات کی کمی
ور کیوں نہ ہو اللہ کے نیک بندے تو ہر جگہ موجود رہتے ہیں۔
بات چلی مرحوم کی کتب نوازی کی اور پہنچی مسند صدارت پر، بہرحال مرحوم کتابوں کا احترام اس طرح
کرتے کہ کبھی انہیں ہاتھ لگانے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔ انہیں دوسروں کی نظر سے اس طرح پوشیدہ
رکھتے جیسے کوئی نوبیاہتا دولہا اپنی البیلی دلہن کو دنیا کی نظروں سے چھپا کر رکھتا ہے۔ اپنے عزیز ترین شاگردوں
کو بھی لائبریری نہیں دکھاتے تھے، کہتے ان کے ادبی خزانے کی نوے فیصد کتابیں جنسیات پر ہیں، لہٰذا
لائبریری میں نابالغوں کا داخلہ ممنوع ہے۔
مرحوم کی پہلودار شخصیت اور علمیت کا تذکرہ کہاں تک کیا جائے "بے رحم موت نے استاد کو ہم سے
چھین لیا اور دنیا کو ایک عظیم انسان محقق، ممتاز نقاد، صاحب دل استاد، بے مثال مترجم، محقق، فلسفی اور یگانہ روزگار
انسان سے محروم کر دیا۔

قمرالزماں قمر

بھوشش بانی

اِک منجم کی بھوشش بانی چھپی اخبار میں
پیش کرتا ہوں جسے میں ذیل کے اشعار میں

جب قیامت کے قریب آجائے گی دُنیا مِری
عورتیں سب مرد ہوں گی، مرد ہوگا اِستری

کر سکے گا مرد قوت میں نہ اُن کی ہمسری
مرد تو بس مرد ہے، وہ ہوگی چیزے دیگری

مرد سب زینت بنیں گے بس کچن کے لئے حضور
چارج ہر دفتر کا لیں گی عورتیں اک دن ضرور

جب کچہری میں آئیں گی کاہے وہ گھوڑے پر سوار
حسرتوں سے دیکھ کر گھورے گا چولہا بار بار

حد سے زائد شاعروں کی سنکھیا بڑھ جائے گی
مختلف اصناف میں ہوتی رہے گی شاعری

آج جو لائے نہیں جاتے ہیں چشمِ غور میں
وہ جدید اشعار سمجھے جائیں گے اس دَور میں

مثلِ انساں اور اک مخلوق کا ہوگا ظہور
فرق یہ ہوگا کہ اِک چھوٹی سی دم ہوگی ضرور

شاعری سے شوق وہ سب اس قدر فرمائیں گے
بیشتر مرحوم شاعر بھی بُلائے جائیں گے

جان لیجئے پھر کتابوں میں ملیں گی پڑیاں
یعنی ہوگا جوتیوں میں دال بٹنے کا سماں

آدمی کے سر سے غائب بال سب ہوجائیں گے
کان کے سوراخ نتھنوں میں کہیں کھوجائیں گے

اور سبھی مردوں پہ پھر یارو قیامت آئے گی
کاہے کو کہئے قیامت اُن کی شامت آئے گی

آسماں کے چاند تارے بر زمیں ہوجائیں گے
اور زمیں کے لوگ گہری نیند سب سوجائیں گے

اس طرح دنیا خود اپنے سیل میں بہہ جائے گی
اے قمرؔ سب شاعری تیری دھری رہ جائے گی

"دوبارہ عنایت ہو"

کمر بیگ بتیاوی
مغربی چمپارن (بہار)

سن کر میرے اشعار ہر اک چہرہ پکارا
دوبارہ عنایت ہو عنایت ہو دوبارا

مہنگائی نے ہر سمت بجایا ہے نقارا
حلوے کے عوض اب کرو ستو پہ گزارا
چکرا کے نہ گر جائے کہیں کر کے نظارا
میدہ تو بس اکلوتی ہے ایسے میں سہارا
دوبارہ عنایت ہو عنایت ہو دوبارا

کس شخص نے اس زور سے نعرہ یہ مارا
دوبارہ عنایت ہو عنایت ہو دوبارا

کھاتے تھے وہ پہلے کبھی چستہ و کلیجی
اور ناشتہ کرتے تھے فقط دودھ جلیبی
مت ماری گئی شیخ کی جب آئی ضعیفی
کھا جاتے ہیں آلو کے عوض آلو بخارا
دوبارہ عنایت ہو عنایت ہو دوبارا

ہر وارڈ میں راشن کی ہے دلچسپ کہانی
ملتا نہیں اب وقت پہ ہو رنگ کا بھی پانی
بجلی کی تو ہر روز ہی مر جاتی ہے نانی

بانو سرتاج
(چندرا پور)

کچھ دنوں سے اُڑتی اُڑتی خبر ہمارے کانوں میں پڑ رہی تھی کہ ہمارے نام وارنٹ نکلا ہے۔ اب صاحب! وارنٹ نکلنا کوئی انعام کے اعلان جیسی قابلِ فخر بات تو نہیں کہ ہم خوشی سے پھول کر سب سے ذکر کرتے پھرتے۔ شرم آنے کی بات تھی (پتہ نہیں لوگ کیا سوچیں) اس لیے گھر میں بند ہو کر بیٹھ رہے۔ شہر میں چوری، ڈکیتی، قتل کی کوئی سنگین واردات ہو جائے تو علاقے کے معمولی چور اُچکے بھی (اصل مجرم کے ساتھ) پولیس کی نظروں سے بچنے لگتے ہیں۔ پولیس سب کو دَھر جو پکڑتی ہے۔ لیڈیز کلب کی داستان پُر لطف ہم نے قلم بند تو کر دی تھی مگر اپنے انجام سے ہراساں بھی تھے۔

گھر میں خود کو نظربند کر لیا تھا۔ کوئی آتا بھی تو اپنی جنت نشین ساس کی آواز کی طرح بوڑھی آواز بنا کر اندر ہی سے پوچھتے "کون؟" کسی مشتبہ شخصیت کے باہر ہونے کا احساس ہوتے ہی ابھی لرزتی کانپتی آواز میں (جو ڈر سے خود ہی ہو جاتی تھی) کہہ دیتے "بہو بیگم بازار گئی ہیں"۔

شرم آتی تھی اس ڈرامے پر، مگر کرتے کیا؟ ایک دن شامت آ ہی گئی۔ شوہر نامدار کے آفس جاتے ہی ہم تمام کھڑکیاں دروازے بند کر کے سونے کے لیے لیٹ گئے۔ دس پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ دروازے پر دستک ہونے لگی۔ ہم نے دروازے سے کان لگا کر سن گن لی تو باہر چار پانچ خواتین کی موجودگی کا احساس ہوا۔ ہم ڈر گئے۔ شریف آدمی ملنے آتے ہیں تو تنہا آتے ہیں۔ جلوس میں چار پانچ

کھولے کر چلنے والوں کی شرافت کی گارنٹی نہیں دی جاسکتی ہم نے دروازہ نہ کھولنے کا تہیہ کرلیا اور دوبارہ لیٹ گئے۔ وہ بھی آخر عورتیں تھیں (سونے پہ سہاگہ لیڈیز کلب کی ممبر) ہماری خواب گاہ کی کھڑکی پر آکر دستک دینے لگیں یہاں تک کہ کھڑکی کی چولیں ہلنے لگیں، ہم خوفزدہ ہوکر پلنگ کے نیچے گھس گئے......
عین اسی وقت کھڑکی ٹوٹ کر اندر آرہی....
ساتھ ہی وہ پانچوں خواتین بھی اندر آگئیں.....
انھوں نے آتے ہی ہمارا پلنگ اُلٹ دیا۔ بس اسی وقت ہماری آنکھ کھل گئی ورنہ خدا جانے کیا حشر ہوتا ہمارا۔

پسینے میں تر بتر تھے ہم۔ کئی منٹ دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے میں لگے۔ ہوش بجا ہوئے تو دروازے کی دستک کی طرف خیال گیا جو اب کافی شدت اختیار کرچکی تھی۔ ہم نے پوچھا "کون ہے؟"

آواز آئی "پوسٹ مین، منی آرڈر لے لیجئے۔"

ہم خوش ہوگئے۔ دوڑ کر قلم اُٹھایا اور لپک کر دروازہ کھول دیا۔ باہر سرکاری وردی میں ملبوس ایک چپراسی کھڑا تھا۔ ہم نے ڈپٹ کر کہا "جھوٹ کیوں بولا؟"

وہ دانت نکال کر ہی ہی کرتا ہوا بولا "تین دن سے آپ مل کر جو نہیں رہی تھیں۔"

ہم نے ڈانٹا "دانت مت دکھاؤ، بات کیا ہے وہ کہو"
وہ ایک کاغذ آگے بڑھاتا ہوا بولا "آپ کے نام وارنٹ ہے۔"

خواب کے چکر میں ہمارے ذہن سے ہر وقت چپکے رہنے والے وارنٹ کو ہم بھول ہی گئے تھے۔ گھبرا گئے۔

"وارنٹ؟ کس نے بھیجا ہے؟"

"کلب کی صدر صاحبہ نے۔"

چپراسی سے کیا بحث کرتے۔ خاموشی سے دستخط کرکے کاغذ لے لیا۔ کھول کر پڑھا "ماہنامہ شگوفہ جولائی ۸۲ء کے شمارے میں شائع شدہ مضمون "بیان ایک لیڈیز کلب کا" نے ہماری بہت سی ممبرس کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ تین جولائی کو ہونے والی میٹنگ میں حاضر ہوکر الزامات کے جواب دیں۔

تین جولائی آج ہی تھی۔ ہم سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ اندھیرے میں اُمید کی ایک کرن کی طرح شوہر نامدار کا خیال آیا۔ اُٹھ کر انہیں فون کیا۔ اس نئی مصیبت کی اطلاع دی۔ روتے روتے کہا "آکر ہم سے مل جائیے۔ بچوں کو اسکول سے ساتھ لیتے آئیے خدا جانے پھر ملنا ہو یا نہ ہو۔"

شوہر نامدار بولے "روتی کیوں ہو؟ جاؤ، بالکل ڈرنا نہیں۔"

ہم نے اَن سُنی کرتے ہوئے کہا "ہماری آخری دو خواہشات ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہمیں ہمارے ابا جان کے پہلو میں دفن کرنا۔ دوسری یہ کہ ہمارے بچوں کی خاطر دوسری شادی نہ کرنا۔"

شوہر نامدار نے میٹھی جھڑکی دی "دماغ خراب ہوا ہے۔ مورچے پہ جارہی ہو؟ عدالت ہی میں جانا ہے۔"

ہم نے زار و قطار روتے ہوئے کہا "یہ وارنٹ نہیں، ہماری موت کا پروانہ ہے۔ وہ لوگ ہمیں کچا کھا جائیں گے۔ دیکھ لینا ہم زندہ واپس نہیں آئیں گے۔ آپ سے التجا ہے، ہماری خطاؤں کو معاف کردیجے گا ہمارے لیے دُعائے خیر کیجے گا۔

وہ بولے "ہمت مرداں، مدد خدا۔ تمہاری تسلی کے لیے دو سپاہیوں کو وہاں بھیج دیتا ہوں... جاؤ اب"

انھوں نے بچوں کی طرح پچکارا "جیت کر آنا شاباش"

ہم نے بجھے دل سے ریسیور رکھا، وضو کرکے نماز پڑھی — خدا سے اپنے گناہوں کی معافی چاہی۔ بچوں کی تصویروں کو پیار کیا۔ شوہر نامدار کے نام ایک خط لکھ کر رکھا۔ وصیت بھی لکھ دی کہ ہمارے تمام قیمتی زیورات اور ساڑیاں ہماری بہنوں اور بھابیوں اور تمام نقلی زیورات اور سوتی ساڑیاں نندوں اور دیورانی جٹھانی کو دے دی جائیں ۔ ۔ ۔ ۔ پھر نکل پڑے گھر سے۔

میٹنگ ہال میں پہنچے تو حیرت کہ ہمیں باہر ہی روک دیا گیا۔ ہمارے آنے کی اطلاع اندر پہنچا دی گئی۔ کوئی دس منٹ بعد اندر سے آواز آئی "ملزمہ بالو سرتاج حاضر ہوں!"

ہال میں پہنچے تو پسینے آنے لگے ہیں — بالکل عدالت کا سا سماں تھا۔ صدر صاحبہ درمیان میں ٹیبل کرسی لگائے بیٹھی تھیں ۔ دائیں بائیں دو کرسیاں رکھی تھیں۔ حاضرین کی طرف دیکھنے کی ہماری ہمت ہی نہیں ہوئی۔ خاموشی سے نظریں جھکائے ایک کرسی کے پیچھے جاکر کھڑے ہوگئے۔

صدر صاحبہ نے کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے کاغذوں کا ایک پلندہ ہمیں دکھا کر پوچھا

"آپ اسے پہچانتی ہیں؟"

ہم نے کہا "نہیں"

انھوں نے اُلٹ پلٹ کر پلندہ دوبارہ ہمیں دکھایا۔ "یہ جولائی ۱۹۸۲ء کا "شگوفہ" ہے"

ہم حیرت زدہ رہ گئے۔ ظاہری حالت سے وہ ۱۹۸۲ء کا نہیں ۱۸۸۲ء کا پرچہ لگ رہا تھا۔ یقیناً ایک دوسرے سے چھین کر مزاحیہ پڑھنے کی کوشش میں پرچے کی یہ حالت ہوئی ہوگی۔

ہم نے کہا "ہمیں افسوس ہے"

صدر صاحبہ فوراً بولیں "مضمون لکھنے پر"

ہم نے تردید کی "نہیں، پرچے کی اس خستہ حالت پر"

وہ کھسیا گئیں، پوچھا "اس پرچے میں "بیان ایک لیڈیز کلب کا" آپ نے لکھا ہے؟"

اس بے ہودہ سوال پر ہم بہت جھلائے۔ کسی طرح خود کو سنبھال کر کہا "ہمارا نام وہاں چھپا ہوا ہے۔ وارنٹ پر آپ نے خود اس کا اقبال کیا ہے۔ بار بار یہ سوال پوچھنے میں کیا تک ہے؟"

وہ ڈھٹائی سے بولیں "عدالتی کارروائی ایسی ہی ہوتی ہے"

"ٹھیک ہے" ہم نے کہا "وکیل کہاں ہے جو ہم سے جرح کرے گا؟"

صدر صاحبہ نے فرمایا "ہر وہ خاتون جسے آپ سے شکایت ہے خود جرح کرے گی۔

ہم نے زیر لب کہا "دیکھیں ان کی صورتیں اٹھی آئیں جرح کرنے والی"

"آئی آبجکٹ یور آنر" سب کی سب ایک ساتھ چیخ پڑیں تو ہم نروس ہوگئے (ان لوگوں کی قوت سماعت کے مطابق ہمارا اندازہ غلط تھا)

صدر صاحبہ نے زور زور سے میز بجائی "آرڈر آرڈر . . ." ہم سے مخاطب ہوکر بولیں "کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے عدالت کی توہین ہو . . ."

پھر حاضرین کی طرف دیکھ کر اعلان کیا۔

"ایک ایک خاتون باری باری سے آئیں اور اپنی شکایت . . . . . .

ابھی جملے کے آخری الفاظ ابھی پورے

طرح ادا بھی نہیں ہونے تھے کہ شریمتی "ش" اس قدر تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھ کر آئیں کہ جیسے لگا، آخری وقت آگیا، گنے چنے دو باقی ہیں اب، مگر غالباً انہوں نے اتنی تیزی اس لیے دکھلائی تھی کہ کہیں کوئی دوسرا ان سے پہلے نہ اٹھ جائے۔ دوسری کرسی کے پیچھے کھڑی ہوکر بولیں:

"آپ نے اپنے مضمون میں ہمارا ذکر کیا ہے؟"

ہم نے الٹا سوال کیا "کون کہتا ہے؟"

بولیں "میں کہتی ہوں، سب کہتے ہیں۔"

ہم نے ثبوت مانگا۔ کہا "آپ نے شریمتی شالنی کی ہنسی اڑائی ہے۔ یقیناً میری طرف اشارہ ہے کیونکہ میرا نام بھی "ش" سے شروع ہوتا ہے۔"

ہم نے جرح کی "اس طرح تو شبانہ، شاہینہ، شاردا، شوبھا، شہلا، شکیلہ، سب ہمارے پیچھے پڑ جائیں گی۔"

"سب کیوں پیچھے پڑیں گی؟ کیا سب نے نقلی دانت لگوائے ہیں؟" وہ بے اختیار کہہ گئیں۔ پھر چند لمحے خاموش رہ کر بولیں "ویسے مجھے آپ سے یہ بھی پوچھنا ہے کہ یہ بات کس نے بتائی ہے آپ کو؟"

"وہ بعد کی بات ہے۔ ابھی پہلا الزام ہی ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔"

وہ جھلا کر بولیں "آپ نے لکھا ہے شریمتی شالنی بڑھاپے نے منہ میں بچے دو دانتوں کو نکلوا کر بتیسی لگوائی .... ایسا ہی جملہ ہے نا!"

ہم نے اقرار کیا۔

شریمتی "ش" نے صدر صاحب سے کہا "مجھے اس پر سخت اعتراض ہے۔"

"آخر کیوں؟" ہم نے درمیان میں کہا "ابھی آپ نے بتیسی لگانے کا اقرار کیا ہے۔"

وہ تیزی سے بولیں "یہ صحیح ہے۔ مگر غلط یہ ہے کہ اس وقت میرے منہ میں دو نہیں تین دانت تھے۔"

خواتین کی کھنکتی ہنسی سے ہال گونج اٹھا۔ ہم بھی کسی طرح اپنی ہنسی نہ روک سکے۔ شریمتی "ش" کچھ دیر کھسیانی سی کھڑی رہیں پھر اپنی جگہ جاکر بیٹھ گئیں۔

ہمارے حوصلے بڑھ گئے۔ ایسی کھسیانی سی حالت میں تو ہم سنو سے نپٹ لیتے۔

شریمتی "س" اور شریمتی "ک" ایک ساتھ اٹھ کر آئیں۔ چند لمحے ایک دوسرے کو خونخوار نظروں سے گھورتی رہیں۔ پھر ہمیں ٹارگٹ بنایا۔ چاند ماری ہونے لگی۔ شریمتی "س" آنکھیں نکال کر ہم سے بولیں "میں شریمتی ورما ہوں؟"

شریمتی "ک" ان سے زیادہ آنکھیں نکال کر بولیں "میں شریمتی بیڑے کر ہوں؟"

ہم نے سر جھکا کر کہا "ہم کیا کہیں" آپ لوگ خود کو بہتر جانتی ہیں۔"

شریمتی "س" شریمتی "ک" کی طرف دیکھ کر غرائیں "تم نے مجھے بڑھیا کہا۔"

شریمتی "ک" شریمتی "س" کی طرف دیکھ کر غرائیں "تم نے مجھے ٹکلی کہا۔"

شریمتی "س" چیخ کر بولیں "تم میری عمر کا حساب رکھنے والی کون ہوتی ہو؟"

شریمتی "ک" بھی چیخ کر بولیں "تم مجھے وِگ خریدنے کا مشورہ دینے والی کون ہوتی ہو؟"

صدر صاحب نے میز ٹھونکی "آرڈر.... آرڈر.... شور نہ چاہیے.... جو کہنا ہو آہستہ آہستہ کہیں۔"

صدر صاحب کی دخل اندازی سے ان دونوں نے اپنا

رُخ پھر ہماری طرف پھیرلیا۔

شریمتی "ک" ہم سے بولیں "آپ بڑی فتنہ ہیں۔ میں نے اپنا سمجھ کے آپ سے ایک بات کہی "آپ نے ڈھنڈورا پیٹ دیا۔ یہ تب سے میری جان کھا رہی ہے"

شریمتی "س" ہم سے بولیں "آپ نے چکنی چپڑی باتیں کرکے میرے مُنہ سے اس کے خلاف باتیں اُگلوالیں... صورت سے تو بڑی بھولی دِکھتی ہیں آپ"

"وہ کیوں اُگلوانے لگیں..." شریمتی "ک" ان پر اُلٹ پڑیں "تیری عادت ہی ہے چغلیاں کرنے کی"

ہم نے فوراً ہاں میں ہاں ملائی "اور کیا۔۔ ہمیں کیا غرض کسی سے کچھ اگلوانے کی۔ ہم صورت ہی کے نہیں، دل کے بھی بھولے ہیں۔ اسی لیے سب اپنی باتیں ہمارے پاس کہہ جاتے ہیں لیکن ایک بات ہم واضح کردیں۔ ہمارے اس مضمون میں نام، مقام، واقعات اور ادارے قطعی فرضی ہیں۔ حقیقی افراد، مقامات، واقعات اور اداروں سے کسی بھی قسم کی مطابقت محض اتفاقیہ ہے جس کے لیے ہم پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ ہم لکھنا چاہتے تو آپ دونوں کی وہ باتیں ضرور لکھ دیتے جو آپ دونوں نے ہمیں یہ کہہ کر بتائی تھیں کہ دوسرے کو نہ بتانا۔

"میں نے کیا کہا اس کے بارے میں؟" شریمتی "ک" کے کان کھڑے ہوئے "میری کون سی بات؟"

ہم نے رازدارانہ انداز میں کہا "یاد کیجیے اُس دن کی پارٹی میں کیا کہا تھا آپ نے؟"

شریمتی "س" کی قوتِ برداشت جواب دے گئی "کیا کہا تھا اس نے میرے بارے میں؟"

ہم نے کہا "بے صبری نہ کیجیے پہلے آپ کی ... والی بات تو بتادیں"

شریمتی "س" بے حس و حرکت کھڑی رہ گئیں پھر "میری بلا سے" کہہ کر واپس لوٹ گئیں۔ شریمتی "ک" نے بھی اُن کی تقلید کرنے ہی میں بہتری سمجھی اور وہ بھی لوٹ گئیں۔

آپ کو راز کی بات بتائیں، ہم نے یوں ہی اندھیرے میں تیر چلا دیئے تھے جو نشانے پر لگے۔ چور کی داڑھی میں تنکا۔ دونوں ڈر گئیں کہ پتہ نہیں کیا بات سامنے آئے۔

شریمتی "م" اٹھیں تو ہم نے دماغ پر کافی زور ڈالا پھر بھی ہمیں یاد نہ آیا کہ ہم نے ان کے بارے میں کیا لکھا تھا۔ کچھ لکھا جائے ایسی کوئی خوبی اُن میں تھی ہی نہیں۔ وہ صدر صاحبہ کی طرف دیکھ کر بولیں "میں اپنی سہیلی کی طرف سے بولنے کھڑی ہوئی ہوں" پھر ہماری طرف دیکھ کر چیلنج بھرے انداز میں بولیں "میری سہیلی 'ر' کے شوہر کا ٹرانسفر ہوگیا ہے مگر میں نے اُسے لکھ دیا ہے کہ آپ نے اُس کا نام پُرانے محل کی ہیروئن یعنی چڑیل رکھا ہے جیسے ہی اس کے شوہر کا یہاں کوئی کام نکلے گا وہ بھی ساتھ آئے گی اور آپ کی چٹنی بنائے گی"

ہم ان گیدڑ بھبکیوں میں آنے والے نہیں تھے۔ ہتکِ عزت کا دعویٰ کرنے کا خوف دلائیں تو اور بات تھی۔

وہ واپس گئی ہی تھیں کہ شریمتی "د" آکر ہم سے لپٹ گئیں۔ صدر صاحبہ نے آرڈر... آرڈر کی آواز لگائی تو ہنستے ہنستے بولیں "نو میڈم اُم کو کوئی کمپلینٹ نہیں۔ آئی وانٹ ٹو...

...تھا نگر یجویٹ ہر شی انڈر یلی ٹا ئیلینٹڈ ...."

ہم نے کہا "مہربانی کر کے اردو ہندی بولیں تا کہ سب سمجھ سکیں اور کچھ سیکھ بھی سکیں ۔

وہ بولیں "اچھا... اچھا... آج یہی بات ہم تمہارا ہسبنڈ سے بھی بولا "ہم سب جب گھُم گیا تھا تو وہ چلا تھا ۔

ہم نے کہا "گھُم گیا تھا نہیں، گھومنے گیا تھا" سب ہنسنے لگیں (جو یہ تعریف سُن کر جل گئی تھیں انھیں چھوڑ کر) کچھ دیر کے لئے ماحول شگفتہ ہوگیا مگر جیسے ہی صدر صاحبہ کو یاد آیا کہ وہ عدالت کی کرسی پر رونق افروز ہیں انھوں نے میز ٹھونک کر اس خوشی میں بریک لگا دیا ۔

ہماری نظریں شریمتی 'ب' کی تلاش کر رہی تھیں وہ کہیں نظر نہ آئیں ۔ حالانکہ وہ ایسی ہستی تھیں کہ قبر میں بھی سکون سے نہ لیٹتیں ۔ ان کے بارے میں ہم سے سُن سُن کر ان کے نام کو بچوں نے ہماری چڑ بنالی تھی ۔ کبھی کبھی ہمیں ڈرانے کو کہہ دیتے "ممی چھپ جاؤ ۔ شریمتی 'ب' آرہی ہیں" ایک بار تو حد کردی ۔ ہم نے انھیں پکچر لے جانے سے انکار کردیا ۔ امتحانات قریب تھے ۔ تو کہنے لگے "ممی چلتی ہیں سینما یا شریمتی 'ب' کو بُلائیں ۔

بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ وہ کشمیر ٹور پر گئی ہوئی تھیں ۔ اس لیے اس سارے معاملے سے بے خبر تھیں ۔ اچھا ہوا ورنہ کاشمیر کی سیر چھوڑ کر وہ ہمیں یم لوک پہنچانے آجاتیں ۔

بیگم 'ب' بار بار اٹھ کر فون کی طرف جارہی تھیں ۔ تھوڑی دیر بعد ان کی بے چینی کا راز سمجھ میں آگیا جب ان کے میاں ہال میں داخل ہوئے ۔ بڑے جھینپو قسم کے آدمی تھے ۔ بیگم ب سے وضع قطع اور ڈیل ڈول میں آدھے سینکیا پہلوان ۔ سب عورتوں کی نگاہیں ان کی طرف اُٹھ گئیں تو شرمانے لگے ۔ بیگم ب نے میدان میں اتارنے کے لیے شاید ان پر کافی محنت کی تھی ۔ انھیں یوں جھینپتے دیکھا تو ڈانٹ لگائی :

"دیکھتے کیا ہو؟" وہاں کھڑے ہو کر کہو جو کچھ کہنا ہو

وہ ایسے ہولے ہولے آگے بڑھے جیسے پیروں میں مہندی لگی ہو ۔ بولے "وہ جو بانو سرتاج صاحبہ نے لکھ دیا ہے کہ بشیرا بیگم نے مرغیوں، بھینسوں اور بکریوں کی ذمہ داری اپنے شوہر کو سونپ دی، اس پر میری بیگم کو سخت اعتراض ہے ۔"

ہم نے نہایت سعادت مندی سے کہا "بھائی صاحب کیا یہ غلط ہے؟"

وہ بولے "نہیں غلط تو نہیں ۔"

"کیا کہہ رہے ہو، ذرا سنبھل کر کہو" بیگم ب نے اُدھر سے آنکھیں دکھائیں تو گڑبڑا کر بول پڑے

"بیگم کا کہنا ہے کہ آپ ہمارے گھریلو معاملات پر تبصرہ کرنے والی کون ہوتی ہیں ۔

ہم نے اکڑ کر کہا "ہم خدائی فوجدار ہیں ۔ آپ جرح کرنے آئے ہیں ۔ آپ کو کیا اعتراض ہے، وہ بتائیے

وہ نہایت سادگی سے بولے "مجھے کوئی اعتراض نہیں بلکہ آپ کی ایک غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں کہ صرف پروگرام کے دنوں ہی میں بیگم نے یہ ذمہ داری مجھے نہیں سونپی ۔ یہ ذمہ داری تو شادی کے دوسرے روز سے میرے روزانہ کے فرائض میں داخل ہے ۔

سب خواتین مسکرانے لگیں ۔ بیگم ب گرم ہوگئیں ۔ جاؤ جاؤ اپنا آفس سنبھالو بچوں کی طرح چار جملے بھی یاد نہیں رکھ سکے ۔

وہ گئے تو ہم نے صدر صاحبہ سے پاؤں میں درد کی شکایت کی۔ وہ بولیں ....." ذرا رک جایئے۔ کبھی اور کر آنا ہو تو آئیے ...."

ایک بہت موٹی خاتون لڑھکتی ہوئی آگے بڑھیں پہلے تو ہمیں اپنی ہاتھی کی سی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے گھور کر ڈرانے کی کوشش کرتی رہیں، پھر ایک ایک لفظ چباتی ہوئی بولیں " یہ مسز رمیتی کاظمی کون ہیں؟" ہم نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ " مسز رمیتی کاظمی، شرمیتی کاظمی ہیں۔"

" میرا مطلب ہے ہم میں سے کون ہے؟"

ہم نے کہا " آپ لوگ خوامخواہ سب کرداروں کا اطلاق اپنے اوپر کر رہی ہیں۔ ہم کلب کے ممبر پہلی بار بنے ہیں، کلب تو پندرہ دیکھ چکے ہیں — گھوڑی نہیں چڑھے تو کیا بارات بھی نہیں دیکھی۔ ہم اس سے پہلے بہت سے شہروں میں رہے ہیں، بہت سے کرداروں سے ملے ہیں۔ وہ بولیں " بات نہ اڑایئے شرمیتی کاظمی آپ ہیں۔"

ہم نے خوش ہو کر کہا " شکریہ ... شکریہ"

وہ حیران، " شکریہ کس بات کا؟"

ہم نے کہا " آپ اس بات کا اعتراف کر رہی ہیں کہ ہم میں ہزاروں خوبیاں ہیں۔"

وہ لاجواب ہو گئیں۔

صدر صاحبہ نے حاضرین کی طرف دیکھا مگر کوئی نہ اٹھا۔ دراصل سب جان گئی تھیں کہ ہم قلم کے دھنی ہی نہیں زبان کے بھی تیز ہیں۔

اُس کے بعد صدر صاحبہ نے ہمیں باز و والے کمرے میں بھیج دیا تاکہ سب کے ساتھ مشورہ کر کے ہمارے لیے کوئی مناسب سزا تجویز کی جا سکے۔ ہم جا کر اطمینان سے پلنگ پر لیٹے رہے ... بیس منٹ بعد ہمیں بلایا گیا۔ صدر صاحبہ نے فیصلہ سنایا:

ملزمہ — آپ کو شک کا فائدہ دے کر باعزت بری کیا جاتا ہے .... لیکن آپ صاحبِ قلم ہیں۔ آپ نے اپنے مضمون میں ہم میں سے بہت سی خواتین کو نظر انداز کر کے ناقابلِ معافی جرم کیا ہے۔ اس لیے ہم سب نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا ہے کہ آپ کو ایسی سزا دی جائے جس سے آپ کے لکھنے کا شوق پورا ہو اور ہمارا ذکر بھی کسی رسالے میں ہو جائے کیونکہ بقول شاعر " ع

" ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے"

آپ کو سزا دی جاتی ہے کہ آپ فوراً —

" بیان ایک لیڈیز کلب کا نمبر ۲ " لکھیں اور فوراً سے پیشتر اُسے شائع کرائیں۔

ہم نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے وارنٹ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ... ہماری اکلوتی سہیلی لیلا نے ہپ ہپ ہُرّے کا نعرہ لگایا اور سب کی سب خواتین ہم سے گلے ملنے کو دوڑ پڑیں۔ ■

روز مرّہ

رشید عبدالسمیع جلیل

کرنوں کی فوج صبح کے دھرتی کے آر پار
سورج سنبھال لیتا ہے ہر صبح اقتدار
بچے بلک بلک کے مچاتے ہیں شور و غُل
اٹھتی ہے ہم سے پہلے ہماری بساطِ کُل
بیگم بھی ہڑبڑا کے سُناتی ہیں آفتاب
ہم سو رہے ہیں اور سرہانے ہے انقلاب
دستک سنائی دیتی ہے گولن کی دفعتاً
دیتی ہے تازہ دودھ جو پانی ہے نسبتاً
غربت میں کیا لحاظ رہے سوجھ بوجھ کا
جلنا کا راج ہے تو کسے غم ہے دودھ کا
رس گھولتی ہے کان میں آواز "اجی اٹھو"
"منصف" بھی آگیا ہے فقط سُرخیاں پڑھو
ہم ملتجی کہ چائے سے ہم کو نوازیئے
بے دم ہیں آدھی رات سے آکر اٹھائیے
بستر پہ جو شکن ہے سُناتی ہے یومیہ
شعر و ادب، سیاست و مذہب کا مرثیہ
بیگم کا فل غپاڑہ جو ہے کائنات میں
آنکھیں کہیں، دماغ کہیں، گم ہیں ذات میں

"خلوت گہِ خلا" میں ہے ہر فن کا ارتقا
ہم پہ اسی مقام سے بابِ سخن کھُ
مُنہ دھوئیے تو ذہن میں جاگے نیا خی
گلی، غرارے اپنے ترنّم کی ہے مثا
نکلے جو باتھ روم سے آتی ہے یہ صا
دس بج چکے ہیں آج کا دفتر تو بس گ
سالانہ امتحان ہے بچّے ہیں بے کتا
اردو کے واسطے بھی ہے آخر کوئی نصاب
اسکول جا کے پوچھئے تعلیم کیا ہوئ
تدریس کے نظام میں ترمیم کیا ہوئ
بچے اگر ہوں فیل تو ہے کون شرمسا
ماں باپ، گورنمنٹ کہ استاذ ذمّہ دا
ہم ناشتے میں خاک نہ پھانکیں تو کیا کریں
بغلیں "حضورِ نصف" نہ جھانکیں تو کیا کریں

○

حمید الظفر صدیقی رفیق
(عادل آباد)

سڑکوں پہ بیرجہ ننگا فیشن نظر آتا ہے
بھارت بھی مجھے اب تو فارن نظر آتا ہے
نادر سے بڑا اب تو ہر سن نظر آتا ہے
خطروں کا مجھے اب تو ہارن نظر آتا ہے
لیلیٰ نہ رہی لیلیٰ، مجنوں نہ رہا مجنوں
بدلا ہوا الفت کا سیزن نظر آتا ہے
جب بزم میں آتا ہوں ساقی یہی کہتا ہے
یہ بزم معمہ کا ڈوکن نظر آتا ہے

رؤف رحیم ایم اے
(حیدرآباد)

"مفت راچہ گفت"

عیادت ایک عبادت ہے۔ عیادت باعثِ رحمت بھی ہے لیکن ہمارے کچھ کرم فرماؤں نے اپنی نکتہ نوازی سے اس رحمت کو زحمت بنا دیا ہے۔ ہر گھر میں کوئی نہ کوئی فرد کسی نہ کسی مرض کا شکار ہو ہی جاتا ہے اور عموماً ہمارے ملک اور قوم میں افراطِ زر کی طرح افرادِ خاندان کا بھی اضافہ ترقی پر ہے۔ ہمارے مخلصین کو تو صرف بہانہ چاہیے کہ وہ ہماری عیادت کریں۔ ہم اپنی بیماریوں اور دُکھوں کو مسکراہٹ میں چھپانے کے ماہر ہونے کے باوجود بھی اُن کی جاسوسی نگاہوں سے نہیں بچ سکتے۔ اتفاقاً ہم کچھ مہمان نواز واقع ہوئے ہیں۔ ہماری مہمان نوازی کے چرچے سُن کر انجانے لوگ بھی ہماری عیادت کو آ دھمکتے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل کی بات ہے ہم اپنی کھٹارا اسکوٹر کی مہربانی اور ہمارے دوست کی قدر دانی کے باعث کچھ زخمی ہوئے۔ ہماری اسکوٹر بھی اکثر خواتین کی طرح ضدی واقع ہوئی ہے ہمارے اشارے پر چلنے کا نام نہیں لیتی۔ ہر وقت میکے یعنی میکانک کے پاس جانے پر مُصر رہتی ہے۔ ہم اُس پُراسرار سواری پر جا رہے تھے کہ ہمیں اپنے ایک دوست نے پکارا اور خیریت دریافت کی (ایسا لگتا ہے ہمارے چہرے سے ہمیشہ کچھ پریشاں حالی ٹپکتی ہے کہ جو بھی ملتا ہے خیریت پوچھ ہی لیتا ہے) ہم اپنی خیریت بولنے سے قبل ہی زمین پر آ پڑے۔ اُنھوں نے ہمیں اس حالت میں دیکھنے کے باوجود بھی خیریت پوچھی۔ ہمیں بے حد غصہ آیا لیکن کیا کیجیے۔ جب کوئی اتنے خلوص اور محبت سے خیریت دریافت کر رہا ہو خیر! بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا تو ہمارے اُس مخلص دوست نے پُرخلوص مشورہ دیا کہ ہم کچھ دیر کے لیے قریبی ہوٹل میں بیٹھ جائیں تاکہ تکلیف کم ہو سکے۔ ہمیں اُن کے مشورے پر بہت خوشی ہوئی ہم لنگڑاتے ہوئے ہوٹل پہنچے۔ ہمارے دوست نے بے تکلف آرڈر دے دیا۔ یہ کہتے ہوئے کہ "شاید تم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ اس لیے اسکوٹر پر قابو نہ پا سکے" ہم

انھیں کیا بتائیں کہ گاڑی اور عورت پر قابو پانا کتنا مشکل کام ہے۔ کھاتے ہی ہمارے دوست ہم سے زیادہ ہماری گاڑی کی جانب متوجہ ہو گئے اور ہم کو بیرے نے اپنی طرف متوجہ کیا۔ بل چکا کر نکلے تو دوست نے ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہا۔ اب ہم تھے اور ہماری کھٹارا اسکوٹر گھر پہنچے تو احباب کا ایک مجمع نظر آیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اُسی دوست نے ہماری عیادت کا سامان کیا ہے اور بہت بڑے پیمانے پر ہمارے حادثہ کی تشہیر کی گئی۔ عیادت کرنے والوں کو دیکھ کر واقعی ہمیں اپنا درد یاد آیا جب کہ ہم اُسے بھول چکے تھے۔ اب ہمارا فرض بن گیا تھا کہ اُن کی ضیافت کریں۔ ہم اُچھلتے کودتے اُن کی مہمان داری میں منہمک ہو گئے۔

رفتہ رفتہ احباب اور رشتہ داروں کی اِن عیادتوں کو دیکھ کر ہمارے منہ میں بھی پانی بھر آیا۔ اب ہم بھی روزآنہ کسی نہ کسی کی عیادت کو جا کر انھیں پریشان ضرور کرتے ہیں۔ اس کے لیے ہم نے اپنے ملازم کے ذمہ یہ کام تفویض کر دیا کہ وہ کسی بھی طرح روزآنہ ایک دو رشتہ داروں کی خرابیٔ صحت کی اطلاع لے کر آئے۔ خوش قسمتی سے ہمارا خاندان بہت بڑا ہے اس لیے اس کارِ خیر میں اُسے کوئی دشواری نہیں ہوتی ہے۔ وہ اکثر کسی نہ کسی مکان کی بُری خبر (ہمارے لیے نیک خبر) لے کر آجاتا ہے اور ہم علی الصبح بیمار کی عیادت کا پروگرام بنا لیتے ہیں ناشتہ کسی طرح سے کرنے کے بعد اپنے خاندان کے ساتھ اُس مکان پر پہنچ جاتے ہیں۔ اب بیمار کی صحت خود بخود بہتر ہونے لگتی ہے۔ اُسے اپنی تکلیف سے زیادہ ہماری مہمان داری کا خیال تکلیف دینے لگتا ہے۔ سارے تیمار دار بیمار کو چھوڑ کر عیادت کرنے والوں کی ضیافت میں مصروف رہتے ہیں اور بیچارہ بیمار۔ اُس کا تو خدا ہی حافظ رہتا ہے۔

ہمیں اس عیادت میں بہت سے فوائد ہیں۔ ایک تو بیچارے مریض کو خوشی ہوتی ہے کہ اُس کا کوئی خیر خواہ بھی باقی ہے۔ دوسرے ہم ایک دن کے پکوان اور اُس کے صرفہ سے بچ جاتے ہیں اور ہمیں گھر سے بہتر کھانے کو مل جاتا ہے۔ ہماری خاتونِ خانہ کچھ کاہل واقع ہوئی ہیں اُن کی تکلیف کا خیال کچھ زیادہ ہی ستاتا ہے۔ اس دورِ گرانی میں ایسی عیادت ہمارے لیے باعثِ رحمت ہے جب کہ بیمار اور اُس کے تیمار داروں کے لیے باعثِ زحمت ہوگی۔

ہمیں ایسی عیادتوں کا خیال اپنے اُن احباب اور رشتہ داروں کی طرف سے آیا ہے جنھوں نے ہمارے گھر کو سرائے بنا رکھا تھا۔ اب وہی رشتہ دار ہمارا شکار بنے ہوئے ہیں۔ ہمیں یاد ہے کہ وہی رشتہ دار ہمارے گھر والوں کی عیادت کے لیے جب بھی آتے خالی ہاتھ آتے نہ ہاتھوں میں میوے کی تھیلی نہ دوا کی گولیاں۔ بس گیارہ بجے اور آدھمکے عیادت کے لیے (کوئی اُن سے پوچھے کہ عیادت ظہرانہ کے بعد، عشائیہ سے پہلے عصرانہ پر نہیں کی جا سکتی؟) اور ہم بیمار سے زیادہ اُن کی طرف متوجہ ہو جاتے اور اُن کی ضیافت کے لیے معمول سے بہتر پکوان کے لیے سرگرداں رہتے۔ آخری تاریخوں میں اُن کی عیادت قیامت سے کم نہیں ہوتی۔ ادھار ہی سہی لیکن گھر آئے ہوئے مہمان کی مہمان داری تو ضروری ہے۔ صاحبِ مذکور جو اپنے پورے خاندان کے ساتھ تشریف فرما ہوتے۔ بے تکلف مرغن غذاؤں کا شوق فرماتے اور کچھ نہ کچھ خرابی

ل کر دل کو مزید تکلیف دے جاتے۔

جب مفت خوری کا ذکر آیا ہے تو یہ بھی کہتا
ں کہ آج کل اکثر خاندان لڑکی دیکھنے کے بہانے مفت
ری کرتے نظر آ رہے ہیں جس طرح عرب ممالک میں
ی کی پیدائش ایک چیک سے کم نہیں جو بار بار کیش
وایا جا سکتا ہے اُسی طرح ہمارے ملک میں ہونہار
کا ایک ڈرافٹ سے کم نہیں جسے دکھا کر ہم بڑی رقم
ساتھ مختلف گھروں سے عصرانے اور عشائیے وصول
سکتے ہیں۔ چنانچہ ہمیں اس وقت ہمارے ایک رشتہ دار
یاد بے حد آ رہی ہے جنھوں نے اپنے لڑکے کے لیے لڑکی
تلاش میں شہر کے تقریباً نصف مکانات کا ذائقہ
ھا۔ اُنھیں لڑکیوں سے زیادہ وہاں کے کھانے پسند
ئے اور لڑکی بھی کس طرح پسند آئے جب کہ اُن کی
رطیں ہیں کہ لڑکی کا حُسن قلوپطرہ سے کم نہ ہو۔ وہ
ارون کی بیٹی کی طرح مالدار ہو اور سرسوتی کی طرح
علم سے مالا مال ہو۔ یہ تینوں گُن ایک ہی لڑکی میں ملنا
شاید اس جنم میں ممکن نہیں۔ محترمہ ہر لڑکی میں
س آسانی سے نقص نکالتی ہیں۔ جس طرح کوئی
ہمان سالن میں نمک کی کمی یا زیادتی کا نقص نکالے
ئی سال گزرنے کے باوجود بھی ابھی اُنھیں اپنے
ڑکے کے لیے لڑکی پسند نہیں ہے۔ ہمیں تو اب اُس
لڑکے پر ترس آ رہا ہے جو تلاشِ یار میں عرصہ گزرنے
کے بعد تقریباً ادھیڑ ہو چکا ہے۔ ہمیں تو ڈر ہے کہ
اب لڑکی پسند بھی آ جائے تو لڑکی والے لڑکے کو
ناپسند نہ کریں۔

بہرحال اس دور میں مفت خوری عام ہو گئی
ہے۔ جو کئی صورتوں میں وقوع پذیر ہوتی ہے۔
چاہے اُسے عیادت کا نام دیں یا کسی لڑکی کی رونمائی
کا نام۔ اب ہمیں عیادت کو جانے سے بھی ڈر لگنے
لگا ہے کہ کہیں یہ فارمولا سب احباب اور رشتہ
داروں تک پہنچ جائے تو ہمارا حال بھی بُرا ہو جائے
گا اور ہمیں اُن سے بچنے کے لیے ہر روز صبح سے گھر
پر قفل ڈال دینا پڑے گا۔ یا ؎

طاقتِ مہماں نہ داشت خانہ بہ مہماں گذاشت

پر عمل کرنا پڑے گا۔

▬ ▬

غزل

نور محمد یاس
(بھوپال)

وہ گھنٹے تک وہ کھا کے مرے کان تو گیا
لیکن کِھلا کے چار عدد پان تو گیا

مانا، بڑے سراغ رساں ہیں، مگر حضور
دوں کیا میں آپ کو؟ مرا سامان تو گیا

کس ڈر سے اب چھپے ہوئے بیٹھے ہو گھر میں تم
دروازہ پیٹ پیٹ کے مہمان تو گیا

رُسوا نہ کر دے شامتِ اعمال آپ کو
دامن کی فکر کیجئے گریبان تو گیا

اب کیسے نظم ہوگی رُباعی شراب پر
"لاحول" اپنے پڑھتے ہی شیطان تو گیا

پہچان اُس کو قاف کے نقطوں کی بھی نہ تھی
پھر بھی وہ شوشہ باز پرستان تو گیا

اب مانگنے کو آئے ہو تم حقِ انتساب
چھپنے کے واسطے مرا دیوان تو گیا

راشن مہینہ بھر کا ہُوا ختم، کیا کریں
دو چار روز رہ کے وہ مہمان تو گیا

ڈر کر ہی قرض آپ کا لَوٹائے کوئی، نورؔ
ایمان کی تو یہ ہے کہ ایمان تو گیا

نظر برنی

ڈرائیور کی بپتا

صاحب بدل گیا تو لیا پھر نیا حساب
وہ لاگ بک کہاں ہے وہ پٹرول کا حساب
جب خوب سوچ ساچ کے میں لکھ چکا حساب
"ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا"

افسر کا ہم پہ ہوگیا جو قہرِ آرزو
ہم کو چلم اٹھانی پڑی بہرِ آرزو
خوں کرکے گھونٹ پی کے رہا زہرِ آرزو
"اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو
توڑا جو تم نے آئینہ تمثال دار تھا"

یہ ہارن ہر قدم پہ بجاتے چلو کہ بس
دائیں طرف کو ہاتھ اٹھائے رکھو کہ بس
پیچھے کی گاڑیوں کو نہ روکا کرو کہ بس
"گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ بس
جاں دادۂ ہوائے سرِ رہگذار تھا"

"اُڈٹی" کا ہے خیال نہ وردی کی کچھ طلب
پھٹکار ہم پہ پڑتی ہے ہر روز بے سبب
افسر کی کھچکلا ہی سے واقف ہی ہم تھے کب
"کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پہ اب
دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا"

نام

ڈاکٹر کے بھکتہ وتسل راؤ
(حیدرآباد)

دیکھئے میں تین حروف ہیں اس لفظ کے لیکن اس کے کرشمے کچھ عجیب ہیں۔ نام رکھنے کے طور و طریق الگ الگ ہیں۔ صلاح مشورے لیے جاتے ہیں۔ پنڈت سے مولوی سے، پادری سے۔ کافی رقم بھی خرچ کی جاتی ہے اس رسم کی تقریب میں۔ روح پرواز بھی کرجائے نام رہ جاتا ہے دنیا میں۔ نیک کام کریں تو مجسمے کھڑے کر دیے جاتے ہیں۔ قبر پر تختیاں نصب کر دی جاتی ہیں۔ تصاویر کی نقاب کشائی کی جاتی ہے۔ سوانحی کتابیں چھپ جاتی ہیں۔ بدکام کا بھی اعادہ ہوتا ہے نام سے۔ پولیس کے ریکارڈ میں اندراج ہوتا ہے، خونی کا نام ہو یا ڈاکو کا۔ کمپیوٹر کے ذریعہ نام کی نشان دہی ہو جاتی ہے۔

آئیے ہمارے سماج کے چند نام ملاحظہ کریں۔ اوتار کے نام، پیغمبر کے نام، صوفیوں کے سنتوں کے نام رکھ دیتے ہیں اوصاف حاصل کرنے۔ نام تو خوبصورت رہتا ہے لیکن ہوتے کچھ اور ہی، مثلاً سندرلال، شمس النسا ان کا پیغام برمعلوم ہوتے ہیں نام سے۔ لیکن بات کرتے ہیں تو گرجتے برستے ہیں بجلی بجاتے ہیں مثلاً شانتی سوروپ۔ ایک کوڑی خیرات نہیں کرتے مگر نام رکھ لیتے ہیں دین دیال۔ رات کے وقت ذرا سی آہٹ سے ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔ ٹھٹھر جاتے ہیں۔ ڈر جاتے ہیں۔ بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں۔ کھڑکی سے کوئی جھانکے تو چور چور کہہ پاتے ہیں لیکن نام ہے شیر سنگھ، شمشیر علی جنگ بہادر، نپولین کہلاتے ہیں سماج میں۔ بنک میں ایک روپیہ کھاتہ میں نہیں رہ پاتا لیکن نام دیں میں دھنی رام، اشرفی مل، عشرت کی حیثیت سے۔ چڈی، بنین، کرتہ، پائجامہ شیروانی یا کوٹ پہن لیتے ہیں لیکن نام کے دگمبر سنگھ، دگمبر لال، دگمبر شاستری۔ کیا تاثیر ہے نام میں انسان کو ننگا کر دیتا ہے۔ دیو ہیکل قد ہے لیکن والدین نے رکھ دیا ہے نام چھوٹو رام، چھوٹو لال، چھنو میاں، چھوٹے میاں ہر بات میں لچک ہے لیکن تخلص رکھ لیا ہے معتبر۔ کلام پڑھتے ہیں تو متلی ہوتی ہے۔ کانٹوں پر چلنے کی کیفیت نمودار ہوتی ہے لیکن تخلص رکھ لیا ہے فرحت۔ حروف تہجی نادرد، کوشش بھی نہیں سیکھنے کی لیکن نام رکھ لیا ہے واچپتی، ودیا بھوشن، عالم خاں وغیرہ۔

زبان کھلتی ہے تو گالیوں کے سوا کچھ آتا ہی نہیں مگر وہ کہلائے جاتے ہیں

پریتم سنگھ۔ دن بھر محنت کرتے ہیں۔ خون پسینہ ایک کرنے پر بھی مشکل سے گزارا ہوتا ہے۔ سونے کو جگہ نہیں فٹ پاتھ پر زندگی کٹ جاتی ہے لیکن دنیا میں کہلائے جاتے ہیں چین سنگھ، بخت آور، عشرت علی، سکھی رام سکھدیو، شانتی، دھن لکشمی، سوبھاگیہ لکشمی وغیرہ۔ بات کرتے ہیں تو بار بار چلّانا پڑتا ہے "زور سے بولو، زور سے بولو" لیکن نام رکھ لیا ہے بھارگو مورتی، جوالا پرشاد۔

عورتوں کے نام بھی بڑے عجیب انداز میں خوبصورت دیئے جاتے ہیں۔ خاوند پر گرجتی ہیں تو وہ ایک کونے میں دبک کر سو جائے۔ لیکن نام ہیں نہایت شریلے مثلاً کُسم، شمیم، کمل، پُشپا وغیرہ۔ ایک مزاحیہ واقعہ، ایک لطیفہ، ایک حکایت بھی سُنا نہیں سکتے لیکن کہلائے جاتے ہیں 'وِنود'۔ دل لبریز ہے زہریلے تاثرات سے، محبت کا نام و نشان نہیں لیکن نام رکھ لیا ہے امرت بائی۔ دیکھتے ہیں تو خواب میں بیدار ہو جاتے ہیں لیکن نام رکھ لیتی ہیں شمس النسا، مس لِلی، روپ وتی، روپ کلا، چندر کلا وغیرہ۔

ناموں کے لیے دیوی دیوتاؤں کو چھوڑ کر سیاروں کو بھی اپنا لیتے ہیں۔ مثلاً چندو لال، وساکھیشور، روہنی، وردھیشور راؤ وغیرہ۔ ہیرے جواہرات کو بھی چھوڑا نہیں جاتا مثلاً موتی لال، زمرد، ہیرا چند، یاقوت نگینہ بی وغیرہ۔ سمندر کا بھی ذکر ہے ناموں میں۔ شانتی ساگر، ودیا ساگر۔ لومبا کا قتل ہوا تھا اُن کا نام بھی امر ہو گیا۔ کئی بچے اس نام کے ہو گئے۔ جان کینیڈی کا نام بھی دنیا کے کئی علاقوں میں عام ہو گیا ہے۔ چند نام زبان پر لانے سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں مثلاً سردار بھگت سنگھ، ستیہ راما راجو، سبھاش چندر بوس، پرکاشم جوش و خروش آجاتا ہے چند ناموں کے الاپنے سے، مثلاً فیض، نذرالاسلام، سجاد ظہیر، ہری ہری۔ چند نام کے سُنتے ہی بادِ صبا کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ صبر و تحمل کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً گوتم بدھ، اشوک، گرونانک ابراہیم، گاندھی، آزاد، ذاکر حسین۔ انسان کی خاصیت، صفت نام سے بھی پہچانی جا سکتی ہے مثلاً جواہر لال لال بہادر شاستری، شوکت علی، لالہ لجپت رائے، راجہ رام موہن رائے وغیرہ۔

غرض نام کوہ کا ہو، دریا کا ہو، شہر کا ہو، روح کا، ایک ایسی چیز ہوتی ہے۔ بعض اوقات نام کی قدر موت کے بعد زیادہ ہوتی ہے۔ فنڈ بھی جمع کیا جاتا ہے۔ بیوہ کو تمغہ بھی دیا جاتا ہے۔ خراجِ عقیدت تو ضروری ہوتا ہے۔ چاہے غالب ہو یا جوش۔ گاندھی ہو یا جناح۔ اقبال ہو یا گورو جارا۔ تلک ہو یا شیواجی۔ آزاد ہو یا قدوائی۔ بنرجی ہو یا رائے۔ ہر ایک مقید ہے ان تین حروف میں نام کے۔ روح بھی نام کے بوجھ میں پھنسی ہوئی ہے زندگی بھر۔ نجات نہیں۔ نروان نہیں اس نام کو۔ ماضی اس کا طویل ہے۔ داستان بھری پڑی ہے حال درست ہے مستقبل بھی خوش آئند ہے اس نام کا۔

* * *

بارے ناموں کا کچھ بیاں ہو جائے

جہانگیر انس
(سیوان، بہار)

* * * *

شیکسپیئر نے کہا ہے "نام میں کیا رکھا ہے" ـــــ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ نام ہی میں سب کچھ رکھا ہے۔ یہ دنیا جب سے عالم وجود میں آئی ہے "نام" کے پیچھے دیوانہ وار بھاگتی رہی ہے۔ آج بھی بھاگ رہی ہے اور مستقبل میں بھی بھاگتی رہے گی۔ اس دنیا میں ایک بھی ایسا آدمی نہیں ملے گا جو "نام" کے پیچھے دیوانہ نہ ہو۔ کچھ لوگ تو اس دیوانگی میں اتنا آگے بڑھ جاتے ہیں کہ نام کے لیے "بدنام" ہونا بھی گوارا کر لیتے ہیں ؎

بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

دنیا کی اکثر باتیں تہذیب و تمدن کی ترقی کے سبب وجود میں آئیں لیکن نام کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ نام کی تاریخ دنیا کی تاریخ سے بھی قدیم ہے۔ اس قول کی صداقت کے لیے اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام کے متعلق جان لینا کافی ہے۔ جب کچھ نہ تھا اس وقت بھی اللہ اپنے ننانوے نام کے ساتھ موجود تھا۔

قواعد کی رُو سے نام کی بہت سی قسمیں ہیں لیکن میری یہ بدقسمتی ہے کہ آج کل کے لیڈروں کی طرح مجھ سے بھی کسی قسم کے اُصول کی پابندی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اس مضمون میں آپ کو قواعد کی پابندی نہیں ملے گی۔

ہاں تو ذکر ہو رہا تھا نام کی قسموں کا ـــــ مشہور ہے کہ ایک چالاک دیہاتی (دیہاتیوں کو شہری لوگ عام طور سے بے وقوف سمجھتے ہیں) نے اپنے لڑکے کا نام "کمشنر جی" رکھا۔ جب کسی نے اس سے ایسا بے تکا نام رکھنے کا سبب دریافت کیا تو اس نے دیہاتی معصومیت (دیہاتی اور شہری معصومیت میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے) سے جواب دیا قریب

کی حیثیت "گتا بلی" سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اگر میں اس کا نام "رفعت" رکھ دوں تو بھی لوگ اسے "رفو" ہی کہیں گے۔ اس لیے اچھے نام کی مٹی پلید کرنے سے کیا فائدہ ہے؟

یعنی اچھا یا برا نام امارت اور غربت، پستی اور بلندی پر منحصر کرتا ہے۔ غربت اور پستی اچھے نام کی بھی مٹی پلید کر دیتی ہے اور امارت اور بلندی "لنگوا" کو لنگٹا سنگھ بنا دیتی ہے ـــ لیکن اس کے برعکس بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ "نام" کا ہی اثر انسان کی شخصیت پر پڑتا ہے۔ "نام" ہی کے طفیل کوئی اعلیٰ یا ادنیٰ بنتا ہے۔ کسمپرسی کی حالت میں پیدا ہونے والا بچہ "مغل اعظم" اس لیے بنا کہ اس کا نام "اکبر" تھا۔ اس نظریہ پر یقین رکھنے والے لوگ اپنے بچوں کا نام خوب سوچ سمجھ کر اور معنی و مطلب پر غور کر کے رکھتے ہیں تاکہ مستقبل میں یہ اپنے نام کے طفیل "فاتح جہاں" "رستم زماں" "ارسطوئے وقت" اور "ثانیٔ یوسف" بنیں۔ اب یہ بچوں کی قسمت، صلاحیت اور والدین کی تربیت پر منحصر ہے کہ وہ مستقبل میں اپنے نام کی لاج رکھتے ہیں یا اس کی مٹی خراب کرتے ہیں۔ ویسے عام طور سے مشاہدہ میں یہی آیا ہے کہ رستم میاں کو اگر کسی نے ایک چھانپڑ رسید کر دیا تو بیچارے نے بھر منہ مٹی اٹھالی عالمگیر صاحب اپنے خاندان والوں پر بھی اپنی گرفت رکھنے سے قاصر ہیں۔ یوسف صاحب کو دیکھ کر شب تاریک بھی پانی پانی ہو جاتی ہے۔ ارسطو صاحب کے لیے کالا اکھر بھینس برابر ہے۔

بڑھتی ہوئی آبادی کا اور چیزوں کے ساتھ نام پر بھی زبردست اثر پڑا ہے۔ اس لیے ہم فیملی پلاننگ کے کٹر حامی ہیں۔ آبادی بڑھ رہی ہے اور نام کی تعداد جہاں تھی وہیں ہے جس کا نتیجہ ہے کہ آج بہت سے گھروں میں جانور نما بچے نظر آنے لگے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بچوں کی شکل و صورت تو انسان جیسی ہی ہوتی ہے لیکن نام جانوروں کے۔

آج جب کسی خاندان میں کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو سب سے بڑا مسئلہ نام کا اٹھتا ہے۔ خاندان کے تمام لوگ دنوں، ہفتوں، کبھی کبھی تو مہینوں سر جوڑے بیٹھے مشورہ کرتے رہتے ہیں کہ اس نومولود کا کیا نام رکھا جائے۔ جو بھی نام تجویز کیا جاتا ہے اس نام کا کوئی فرد پہلے ہی سے خاندان میں موجود ہوتا ہے اگر خاندان میں نہ ہو تو پڑوس میں ضرور کوئی ہوگا۔ اب بھلا ایک ہی خاندان میں یا ایک ہی محلے میں ایک نام کی دو ہستیاں کیسے رہ سکتی ہیں ـــ لیکن سیکڑوں احتیاط کے باوجود بھی دس بیس نہیں تو دو چار ہم نام ہستیاں ہر محلہ میں فرود ہوتی ہیں۔ اور اس ہم نامی کے سبب اکثر دلچسپ واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں ـــ ایک محلے میں دو لڑکیوں کا نام سلمیٰ تھا۔ سلمیٰ نمبر ایک (احتیاط کے لیے نمبر دیا جا رہا ہے) کا رومانس جاوید سے چل رہا تھا۔ قاصد نے (محبت کرنے والوں کے درمیان جو قاصد کے فرائض نا سمجھ بچے انجام دیتے ہیں یا گھر کے نوکر) غلطی سے سلمیٰ نمبر ایک کا خط سلمیٰ نمبر دو کو دے دیا۔ اس کے بعد کیا ہوا ہوگا اس کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔

سلیم میاں کو ایک دن اپنے لڑکے کی موت کا تار ملا۔ اکلوتا لڑکا گھر سے کالے کوسوں دور نوکری کرتا تھا۔

بیچارے کو بیٹے کا آخری دیدار بھی نصیب نہیں ہوا ۔ خیر، ہونی کو کون روک سکتا ہے۔ گھر والوں نے بعد وضو کر صبر کر لیا دسواں، بیسواں، چالیسواں سب کچھ ہو گیا —— دو مہینے کے بعد وہی لڑکا جس کی موت کا تار سلیم میاں کو ملا تھا زندہ سلامت گھر پہنچا ۔ گھر والوں نے اسے اپنے بیٹے کا بھوت سمجھ کر دروازہ بند کر لیا ۔ کافی منت سماجت کے بعد دروازہ کے ساتھ یہ عقدہ بھی کھلا کہ تار "اس" سلیم میاں کا نہیں "اُس" سلیم میاں کا تھا ۔ اَب اُس سلیم میاں کے یہاں رونے دھونے کی باقاعدہ محفل منعقد کی گئی ۔ اس کے بعد دسواں، بیسواں اور چالیسواں کی محفل منعقد ہوئی۔ غرباء، فقراء اور مدرسہ کے طلباء نے شکم سیر ہو کر کھایا اور یہ دعا کی کہ "اے اللہ ہمنامی کے سبب اس قسم کی اُلٹ پھیر ہمیشہ ہوتی رہے تاکہ ایک نام پر بار بار کھانے کو ملے"

ایک صاحب کا کہنا ہے کہ دنیا میں جتنا بھی دنگا فساد ہوتا ہے سب نام ہی کے طفیل ہوتا ہے ۔ جانور آپس میں انسانوں کی طرح اس لیے نہیں لڑتے کہ ان کا نام نہیں ہوتا ہے ۔ اگر جانوروں کی طرح انسانوں کے یہاں بھی نام رکھنے کا رواج ختم ہو جائے تو پھر کبھی لڑائی نہیں ہوگی —— انسانوں کو چاہئیے کہ اپنی پہچان کے لیے نام کے بجائے نمبر استعمال کریں ۔ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری ۔

زمانۂ قدیم میں امیروں کے یہاں نام رکھائی کی رسم نہایت ہی دھوم دھام سے منائی جاتی ۔ دوست احباب کو مدعو کیا جاتا تاکہ نومولود کے نام سے سبھی واقف ہو جائیں ۔ اس رسم سے کوئی اور فائدہ ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو ۔ اتنا فائدہ تو ضرور تھا کہ دوست احباب کو ایک وقت لذیذ طعام مل جاتا تھا ۔ غرباء اور مساکین کا بھی کچھ بھلا ہو جاتا تھا اور سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ جس کی نام رکھائی کی رسم ادا ہوتی تحفہ میں اسے بہت کچھ مل جاتا —— لیکن بھلا ہو اس دورِ جدید کا جس نے اس رسم کا خاتمہ کر کے کتنوں کے ارمانوں کا خون کر دیا ۔

میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ ہر شخص نام کا بھوکا ہوتا ہے ۔ ہر شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کا نام سب سے اوپر رہے ۔ نام کے لیے کوئی "خادم قوم" بنا ہوا ہے تو کوئی "بہی خواہِ ملت" ۔ فلمی دنیا میں لوگ اپنا نام سرِ فہرست رکھنے کے لیے وہ سب بھی کر گزرتے ہیں جو ایک ہوش مند انسان کے شایانِ شان نہیں ہوتا ۔ ہمارے لیڈران شاہ سرخیوں میں اپنا نام شائع کرانے کے لیے آئے دن اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتے رہتے ہیں ۔ دوسروں کی بات کیا کہوں میں نے بھی تو یہ مضمون اس لیے لکھا ہے کہ میرا نام ہو جائے ۔

بعض لوگ یہ سوچتے ہیں کہ بڑوں کا نام اختیار کر لینے سے بڑائی حاصل ہو جائے گی ۔ آج آپ کو ہر گھر میں نیتاجی سبھاش چندر بوس سے لے کر راج نارائن اور دلیپ کمار سے لے کر جانی واکر تک کا درشن ہو سکتا ہے ۔ لیکن معاملہ وہی ہوتا ہے —————— "نام بڑے درشن چھوٹے"

علامہ شفیع منیری
بھوجپور (بہار)

کرسیٔ صدارت

جیسے تیسے اس نے اک دن کرلیا جو ہائی پاس
اتفاقاً مل گئی اس کو کہیں نقلی سند
اس نے قبرستان میں پھر کھول لی ڈسپنسری
وہ کفن کے ساتھ دیتا ہے مریضوں کو دوا
چار پیسے کی دوا کے لیتا ہے دس دس روپے
زر دیا اللہ نے جو اس کو چھپڑ پھاڑ کے
نبض سے پہلے وہ ظالم دیکھتا ہے جیب کو
سائیکل موٹر خریدی بینک بیلنس بڑھ گیا
متو مسجد کا جو لوگوں نے اس کو چن لیا
ان دنوں اس پر مسلط شاعری کا بھوت ہے
وہ غزل کہلوالیا کرتا ہے اک استاد سے
مرغ و ماہی وہ کھلایا کرتا ہے استاد کو
پھر ہوا یوں کہ کیا لوگوں نے باہم مشورہ
وہ ذرا سا تن کے شاخِ گل کی صورت جھک گیا
ایک کہنہ مشق شاعر نے عجب ترکیب کی
جھرجھری سی اس نے لی پھر بولا آنکھیں کھول کر
اہلِ محفل نے اسے حالات جب سمجھادیئے
گا رہا تھا جھوم کر محفل میں وہ طرحی غزل
میں نے جب لقمہ دیا تو سامعین ہنسنے لگے
ڈاکٹر ہے یہ کوئی بنیا نہیں ہے دوستو
وہ مسلسل چیختا تھا شعر تلتا ہے کہیں
شاعرِ بے وقت ہٹ دھرمی سے باز آیا نہیں

مرگئی مارے خوشی کے پھر تو بے چارے کی سا
ڈاکٹر صاحب وہ کہلانے لگا ابلہ شو
مرنے پر جو چیزیں ہوتی ہیں طلب وہ بھی رکھ
تاکہ جھٹ پٹ کام ہوجائے اگر ہو دم
دو مکاں بنوالیے پیرو میں اس نے بے
پڑگیا وہ مفلسوں کے پیچھے پنجہ جھاڑ
سر پہ رکھتا ہے سدا قارون کے آسیب
گن خریدی تو دماغ اس کا فلک پر چڑھ گ
داڑھی رکھ لی طوعاً وکرہاً نمازی ہوگ
دودھ سے زیادہ مفید اس کے لیے اب موت
خود تو لکھتا ہے پریشاں کثرتِ اولاد
چاشنہ پر ٹرخا دیا کرتا ہے "اہلِ داد"
محفلِ شعر و سخن کا صدر اس کو چن لی
اس کا دم فرطِ مسرت سے اچانک رک
ناک پر اس کی الٹ کر رکھ دیئے جوتے
سامعین نے جوتے پھینکے ہیں مرے کس شع
آگیا مائک پہ وہ استاد کی غزلیں
ایک مصرعہ پڑھ گیا بے وزن بہ بانگِ
اور اس کنجوس پر آواز یوں کسنے
ایک مصرعہ پڑھ گیا بے وزن تو جانے بھی
میں جہاں دیدہ ہوں لیکن ایسا دیکھا ہی
جب تلک لونڈوں نے اس کو ہوٹ فرمایا

سب نے پھر تو جل کے کرسی صدارت چھین لی
بخشدی اس کو رذالت ساری شہرت چھین لی.

مجید عارف نظام آبادی

ذکر اُس پری وش کا .....

اُس سے ہماری پہلی ملاقات بس اسٹیشن پر ہوئی اور وہ لمحہ ہمیں ابھی تک یاد ہے۔ وہ سرور اور شادمانی کا عالم جس سے پہلے آشنا نہ تھے۔ اس سے ملاقات کرنے پر معلوم ہوگیا، ہوا کچھ یوں کہ بس دو گھنٹے لیٹ تھی اور ہم نے وقت گزارنے کے لیے ایک فلمی رسالہ خریدا اور اس کو ہضم کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ سارے اشتہارات، فلمی خبریں اور لطائف سب چاٹ لیے لیکن وقت ہے کہ ٹالے نہیں ٹل رہا تھا۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ بس آنے میں ٹھیک ایک گھنٹہ اور باقی ہے۔ بوریت کے عالم میں 'میں' ٹہلنے لگا۔ اس وقت کچھ حضرات اپنی "اس" سے شغل فرما رہے تھے۔ ہم نے بھی ایک نظر "اس" پر ڈالی تو سکتہ میں آگئے۔ سفید براق سے لباس میں وہ جنت سے اُتری ہوئی اپسرا لگ رہی تھی۔ سراپا ایک ہی جسامت اور اس کی ساڑی کا بارڈر زرد رنگ کا تھا۔ شوق نے کہا کہ آگے بڑھو اور ہونٹوں سے لگالو، خوف نے کہا کہ کھلے عام یہ بہت بُری بات ہوتی، بالآخر خوف پر شوق غالب آگیا اور ہم نے اس کے قدموں پر کئی بوسے ثبت ہی کر دیئے۔ لوگ ہماری اُنسیت، دیوانگی، عاشقی کو دیکھ کر ہنسنے لگے، اور بعض مسخروں نے تو فقرے بھی ہم پر کسے لیکن وہی بات ہوئی کہ۔ ع

جب پردہ ہٹیں کو خدا نے بندوں سے پردہ کرنا کیا ۔ جب پیار کیا تو ڈرنا کیا - !!

اور اب یہ حال ہے کہ بغیر اس کے ہمارے دانت اور ہونٹ پھیکی پھیکی اور سُونی سُونی سی لگتی ہیں۔ ع

چھٹتی نہیں ظالم منہ سے لگی

غالب کے دور میں ہماری محبوبہ کی دادی یا پڑدادی کا وجود ہوتا تو ہمیں یقین ہے کہ وہ اپنا دقیانوسی اور قدیم حقہ چھوڑ کر اسی پر مائل ہو جاتے۔

ذکر اس سگریٹ کا اور بیاں اپنا ۔ نصف تک جل گیا گریباں اپنا

غزلیں

بے تکے شیر کوٹی
امروہہ (یوپی)

ہم ہیں مقتل میں بے چارگی کی طرح
موت ہم سے ملی زندگی کی طرح

وہ نہ ہتّھے چڑھے مثلِ انگور کے
ہم اُچھلتے رہے لومڑی کی طرح

بچ کے چل ان کے کمرے کی دیوار سے
حسنِ دل خود ہے چھپکلی کی طرح

بیٹھے ہیں جیسے ابّا کی جاگیر ہے
دِل کی چوپال میں چودھری کی طرح

دِل لگانے سے بے تکے پریشان ہیں
پیار کرنا پڑا نوکری کی طرح

طالب عرفانی
سرونج ۔ مدھیہ پردیش

مجھ کو تمہارے عشق نے ایسا دیا سبق
دُنیا پکارنے لگی مِن شرِّ ما خلق
مُلّا ہو، مولوی ہو کہ یا ہو کوئی سفیر
سب قوم کی کمائی کو کھاتے ہیں بے حلق
پڑھتا ہوں اپنے نام سے اُستاد کا کلام
میرے علاوہ کون ہے اس فن کا مستحق
کس کس مزے سے ذکر کیا ہے شراب کا
آنکھوں میں شیخ جی کی ہے پھولی ہوئی شفق
آ علم و فن کے تجھ کو سکھاؤں میں داؤ پیچ
پہلی کتاب میں نے پڑھی ہے ورق ورق
اللہ رکھے شاعرِ خبط الحواس کو
اہلِ سخن کی بزم میں مُنہ ہو رہے ہیں فق
مہنگائی کے عذاب سے ٹکرا رہے ہیں لوگ
یہ زندگی ہے یا کوئی صحرائے لق و دق
شاباش! سر کی آخری ٹکّر بھی مار دے
دیوار اُن کے کمرے کی ہونے لگی ہے شق
ضرباتِ ہوٹ نے اُسے بے جان کر دیا
اب زندگی کی اس میں نہیں ہے کوئی رمق
طالبؔ وہ مرثیہ لکھو اب اس کی لاش پر
جس کی ردیف سخت ہو اور قافیے ادق

○

ہم بوجھ ظرافت کا اٹھایا نہیں کر
ہنستے ہیں مگر دانت دکھایا نہیں کر

گنجے بھی ہیں، ناخن بھی خدا نے دیا ہ
یہ ظرف ہے پھر بھی کہ کھجایا نہیں کر

بیوی کی ہر اک ڈانٹ پہ اک چپ سے
ہم اہلِ خرد بات بڑھایا نہیں ک

پانی میں ملاتے ہیں بڑی شان سے ہم
ہم دودھ میں پانی کو ملایا نہیں

تنگ آ گئے مہمانوں کے پرہیز سے
گڑ کھاتے ہیں وہ گلگلے کھایا نہیں

حیدر بیا
آچل پور - امراو

ڈاکٹر معین الدین عقیل
(پاکستان)

(گزشتہ دس سال کا پاکستانی ادب)

طنز و مزاح

گذشتہ دس برسوں میں، جہاں تک اُردو نثر میں طنز و مزاح کا تعلق ہے لکھنے والوں میں نمایاں نام تو پُرانے ہی ہیں جو پچھلی دہائیوں میں لکھتے رہے ہیں اور ایک عرصہ پہلے ہی اپنے مقام و منصب پر پہنچ چکے تھے۔ ان میں شفیق الرحمٰن، کرنل محمد خان، مشتاق احمد یوسفی اور ابن انشا خاص طور پر ممتاز ہیں۔ بعض معروف مزاح نگار جنھوں نے گزشتہ دہائیوں میں ممتاز حیثیت حاصل کر لی تھی، اس دہائی میں یا تو منظر سے ہٹ گئے یا پہلے کے مقابلے میں اُنھوں نے بہت کم لکھا۔ جیسے شفیق الرحمٰن، مسعود مفتی اور ابراہیم جلیس۔ جلیس نے اس دہائی کے نصف آخر میں وفات پائی۔ شفیق الرحمٰن نے بہت کم لکھا۔ مسعود مفتی نے طنز و مزاح کی طرف توجہ بہت کم کر دی ہے۔ اب وہ ایک کامیاب افسانہ نگار ہی ہیں لیکن ایک عرصہ قبل وہ افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ مزاح نگاری کی طرف بھی توجہ دیتے رہے ہیں۔ "محدب شیشہ" اور "سر راہے" کو طنز و مزاح کے ادب میں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ انھیں کی طرح امجد حسین نے بھی اس عرصے میں طنز و مزاح کو کوئی قابل ذکر چیز نہیں دی۔ ان کے مضامین کا ایک مجموعہ "میرا گریبان" گزشتہ دہائی کے عین اختتام پر شائع ہوا تھا۔ کم لکھنے کی تو ان کی روایت رہی ہے۔ اس عرصہ میں بھی ان کی بہت کم تحریریں دیکھنے میں آئیں۔ "ادب کے بابا لوگ" جیسی کوئی تحریر انھوں نے پیش نہیں کی، لیکن پھر بھی منفرد انداز نظر اور اسلوب کے لحاظ سے ان کے چند مضامین اہمیت کے حامل ہیں۔

اس سلسلے میں متعدد ایسے معروف اور غیر معروف مزاح نگار بھی ہیں جو گزشتہ دہائیوں میں جس انداز سے لکھ رہے تھے، اس عرصے میں بھی انھوں نے اسی انداز اور روایت کو برقرار رکھا۔ ایسے لکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد انشائیہ نگاری کے ضمن میں اپنی صلاحیتوں کا اظہار کرتی رہی۔ جیسے مشتاق قمر، نظیر صدیقی، غلام جیلانی اصغر، انور سدید، سجاد نقوی، منصور قیصر وغیرہ۔ لیکن یہ ایک علیحدہ جائزے کا موضوع ہے کیونکہ انشائیہ بہر صورت طنزیہ و مزاحیہ مضامین سے ایک الگ شئے ہے۔ اور اس لیے اسے طنز و مزاح کے معیار سے پرکھنا جائز نہیں ہوگا، ویسے بعض انشائیہ نگاروں نے انشائیہ لکھتے ہوئے بھی خالص طنزیہ و مزاحیہ مضامین لکھے ہیں۔ طنز و مزاح کے یہ گزشتہ دس سال گو سابقہ دہائیوں کی روایات پر استوار رہے لیکن پھر بھی اس روایت میں ایک نمایاں

حد تک اضافہ ہوا اور اس کے موضوعات اور اس کے اسلوب میں وسعت پیدا ہوئی۔ عام طور پر ادب میں طنز و مزاح کے ارتقا کا جائزہ لیتے ہوئے اسے معاشرے کے مزاج اور منہاج سے وابستہ کیا جاتا ہے اور اس ضمن میں بالعموم یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ مزاح دراصل ایک متناسب اور خوش آہنگ معاشرے کی تہذیب و شائستگی کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن اس نقطۂ نظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ بات پاکستانی معاشرے کے ساتھ کم از کم ان دس برسوں میں، درست معلوم نہیں ہوتی۔ یہاں کا معاشرہ ان دس برسوں میں سیاسی اور تہذیبی صورت حال کے نتیجے میں متناسب اور خوش آہنگ نہیں رہا۔ سیاسی اور تہذیبی انتشار، اضطراب اور بحران نے زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا۔ سیاسی اور قومی سطح پر المناک صورت حال بھی رونما ہوئی اور قومی زندگی کے منظر پر بے یقینی کی فضا چھائی رہی۔ لیکن اس کے باوجود طنز و مزاح میں مشتاق احمد یوسفی، کرنل محمد خان، ابن انشا، نثر میں اور ضمیر جعفری اور سید محمد جعفری شاعری میں اپنے سبک، شگفتہ اور شائستہ اسلوب کے ساتھ اس کے ارتقا میں حصہ لیتے رہے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ خیال بھی ہو کہ معاشرے کا اضطراب، یاس، محرومی اور دستور زباں بندی جب کھل کر بات کرنے نہیں دیتے تو طنز و مزاح کا روپ دھار لیتے ہیں۔ بات چاہے کچھ ہو، واقعہ یہ ہے کہ ان دس برسوں میں طنز و مزاح اور اس کی مختلف صورتوں کو بہت نکھار اور استحکام حاصل ہوا۔ بعض پختہ لکھنے والوں نے ادب کو چند اچھی اور معیاری تخلیقات دیں، متعدد اہم اور کم اہم ناموں کا اضافہ ہوا اور بالخصوص نثری اسلوب میں بعض دل پذیر مثالیں دیکھنے میں آئیں۔

یہ دس سال بھی کرنل محمد خاں، مشتاق احمد یوسفی اور ابن انشا کے لیے بڑی کامیابی کے سال رہے۔ شفیق الرحمٰن نے اس عرصے میں جو کچھ لکھا، اس سے ان کے فن میں بظاہر کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ بلکہ اس میں ایک ٹھہراؤ سا رہا۔ کرنل محمد خاں نے اس عرصے میں "بسلامت روی" کا اضافہ کیا۔ ویسے ان کی اور مشتاق احمد یوسفی دونوں کی اصل شہرت و اہمیت ان کی پہلی کتابوں "بجنگ آمد" اور "چراغ تلے" کی وجہ سے ہوئی ہے۔ ان دونوں کے بارے میں یہ کہنا کہ ان پہلی کتابوں کے بعد جو دوسری تصانیف منظر عام پر آئیں وہ بھی اسی معیار کی تھیں یا اس زیر نظر عرصے میں ان کے فن میں مزید توانائی پیدا ہوئی تو شاید یہ درست نہ ہوگا ——— اس حد تک ضرور ہے کہ اگر ان کے فن نے ارتقا کے مزید مراحل طے نہ کیے تو اس میں ٹھہراؤ بھی نہیں آیا۔ ان دونوں نے اپنی روایات کے استحکام کو برقرار رکھا۔ کرنل محمد خاں نے اس عرصے میں "بسلامت روی" کا جو اضافہ کیا اس میں مزاح نگاری کے لحاظ سے بڑی سلامت روی کا ثبوت دیا۔ یہ بنیادی طور پر تو ایک سفر نامہ ہے جس میں پاکستان سے انگلستان کے درمیان چند ممالک کا احاطہ کیا گیا ہے، لیکن دراصل اس میں سفر نامہ نگاری سے قطع نظر ہمسفر شخصیات میں مزاح کے پہلو تلاش کیے گئے ہیں۔ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں انھیں دشواری پیش نہیں آئی۔ کیونکہ وہ جس طرح مختصر مختصر جملے تحریر کرتے ہیں اور سلاست اور روانی پیدا کرتے ہیں اور بظاہر جتنی آسانی اور چستی کے ساتھ مزاح نگاری کے جوہر دکھاتے چلے جاتے ہیں، یہ ان کی تحریر کا مزاج بن گئے ہیں اور اس مزاج کی تشکیل میں انھیں یقیناً بڑی محنت اور ریاضت سے گزرنا پڑا ہوگا۔ اس کتاب کو تحریر کرتے ہوئے کرنل محمد خاں نے جس سادگی، بے ساختگی اور شگفتگی سے کام لیا ہے، وہی ان کی بنیادی خوبیاں ہیں۔ معمولی سے معمولی بات ان کے انداز بیان سے ایک لطیف تجربے اور ایک فن کارانہ

اظہار کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس میں مشاہدے کا تنوع اور احساس کی رنگارنگی کا کمال بھی شامل ہے۔ اگرچہ وہ روزمرہ زندگی سے مزاح پیدا کرتے ہیں لیکن اس میں زندگی کے اہم مسائل کا بھی عمل دخل ہے۔ بنیادی طور پر وہ مزاح نگار ہیں اور ان کی تحریروں میں طنز کی آمیزش عنقا ہے۔ ان کی حالیہ تصنیف سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے مزاح میں کسی قدر تازگی ہر جگہ نظر آتی ہے۔

مشتاق احمد یوسفی کے مزاح میں بالعموم پطرس اور رشید احمد صدیقی کے اثرات تلاش کیے جاتے ہیں اور اس کا ایک بڑا سبب ان کا اپنی ذات کو بھی مزاح میں شامل کر لینا ہے۔ اس عرصے میں ان کی جو واحد تصنیف " زرگزشت " شائع ہوئی وہ ان کی " سوانح عمری " ہے۔ اس میں یوسفی نے مزاح کو بطور حربہ اپنے آپ پر آزمایا بلکہ " زخمایا " ہے۔ ان کی تحریروں میں لفظ، خیال اور واقعہ سے مزاح پیدا کرنے کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ آج کے دور میں برجستگی، فطانت اور ذہانت کے ساتھ ساتھ الفاظ اور محاوروں کے ردّ و بدل اور لفظوں کے صوتی اثرات سے مزاح پیدا کرنے کی روایت کے غالباً وہ تنہا امین ہیں۔ " زرگزشت " ان کے مخصوص اسلوب کا ایک اچھا اور نمائندہ اظہار ہے۔ اس کی بنیاد ان کی ذات پر استوار ہوئی ہے۔ انھوں نے زندگی کے مختلف واقعات، مشاہدات اور کرداروں کو جس رُخ سے دیکھا اور پرکھا ہے۔ ان کے خد و خال نمایاں کرتے ہوئے انھوں نے شگفتگی، ذہانت اور صداقت کا ہر جگہ لحاظ رکھا ہے۔ وہ انسانی نفسیات اور روزمرہ زندگی کی صداقتوں سے پوری طرح آگاہ ہیں اور ان کا مزاح ایک شائستہ اور پُروقار فضا میں جنم لیتا ہے۔ اس میں عام طور پر ایک تو خوش گوار طنز ہے، جس میں تلخی اور ترشی کے بجائے لطافت کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ " زرگزشت " ایک توانا اور شگفتہ تصنیف ہے۔

یوسفی کے ساتھ ساتھ اس دہائی میں ابن انشا کا نام بھی ممتاز اور نمایاں نظر آتا ہے۔ گو اس دہائی کے آخر میں ان کی وفات خود طنز و مزاح کے لیے بھی ایک المیہ ہے، لیکن اس عرصے میں انھوں نے " اردو کی آخری کتاب " " آوارہ گرد کی ڈائری " " ابن بطوطہ کے تعاقب میں " " دنیا گول ہے " جیسی متنوع اور شگفتہ کتابیں لکھیں۔ تنوع پسندی ان کی نمایاں خصوصیت رہا ہے۔ چنانچہ موضوعات میں اور اسالیب میں دونوں جگہ اس کا اظہار ہوا ہے۔ طنز، پیروڈی، لفظوں کے اُلٹ پھیر اور ... سے بات پیدا کر کے مزاح پیدا کرنا ان کا امتیازی وصف ہے، چنانچہ مذکورہ کتابوں میں ان کے مخصوص اسلوب کو ہر جگہ دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کتابوں میں مختلف واقعات و حالات اور انسانی اعمال سے مزاح پیدا کرنے کا کام لیا گیا ہے۔ اس طرح ان کے ہاں علامات کا استعمال بھی زیادہ ملتا ہے۔ ان کے مزاح کے اس تناظر میں بڑی وسعت ہے اور ان کے اسلوب اور ... کے استعمال میں بڑی برجستگی ہوتی ہے۔ ان کا مطالعہ اور مشاہدہ دونوں وسیع ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے اسلوب سے بہت سی باتوں کا پس منظر بھی بیان کرتے ہیں اور بالکل سادہ اور معمولی واقعات سے بھی طنز و مزاح تخلیق کرنے کی بھرپور قدرت رکھتے ہیں۔ مختصر مضامین، صحافیانہ کالم اور سفرنامے، وہ ہر جگہ ایک کامیاب طنز و مزاح نگار کے طور پر نمایاں رہے۔

محمد خالد اختر نے اس عرصے میں اپنے اسلوب کی سابقہ روایات کو برقرار رکھا۔ ان کا لہجہ اور اسلوب پختہ رہا ہے اور ہمیشہ ہی کی طرح وہ دھیمے دھیمے لہجے میں بات کرتے رہے ہیں۔ ان کے موضوعات اور ان کا اسلوب قاری کو تبسم

زیرلب سے آگے نہیں لے جاتا۔ بعض اوقات آورد کا احساس ہوتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے زبردستی مزاح پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مستقل تصانیف کے علاوہ مختلف رسائل میں ان کے متعدد مضامین اور خطوط بھی شائع ہوئے۔ آج کے دور میں خطوط کی صورت میں پیروڈی لکھنے میں غالباً سب سے زیادہ مستقل مزاج ثابت ہوئے ہیں۔ چند سالوں بالخصوص "فنون" (لاہور) میں ان کی ایسی کئی پیروڈیاں شائع ہوئیں۔ اسی میں پاکستانی سندوں پر ان کا ایک سلسلہ مضامین شائع ہوا، جو ان کے مخصوص اسلوب کا حامل تھا۔ اگرچہ ان کے اسلوب میں روانی ہے لیکن الفاظ کے انتخاب میں خاص احتیاط اور ہنرمندی کا عنصر نظر نہیں آتا۔ چنانچہ دوسرے مزاح نگاروں کے مقابلے میں ان کی تحریریں کسی دیرپا تاثر اور شگفتگی کی حامل نہیں ہیں۔

سابقہ دہائیوں میں مزاح نگاری میں جو چند نئے نام اُبھرے تھے اور جن کی ایک بڑی تعداد دراصل انشائیہ نگاری کے توسط سے طنز و مزاح کی طرف آئی ہے۔ مثلاً نظیر صدیقی، باقر حلیم، منصور قیصر، مشتاق قمر، اسرار اشفاق، انور سدید، وغیرہ، ان مزاح نگاروں نے کوئی مستقل اہمیت کی تصنیف پیش نہیں کی۔ متفرق مضامین اور انشائیوں میں طنز و مزاح کی مختلف صورتوں کی تخلیق ضرور کرتے رہے۔ لیکن اب ان مزاح نگاروں کا عادی رجحان طنز اور مزاح سے ہٹ کر انشائیہ نگاری کی طرف ہے۔ گو منصور قیصر، سجاد نقوی، مشتاق قمر، انور سدید نے بعض اچھے مزاحیہ مضامین بھی تحریر کیے۔ غلام جیلانی اصغر، رضیہ فصیح احمد، فرخندہ لودھی، احسان ملک گاہے گاہے مزاحیہ مضامین تحریر کر لیتے ہیں لیکن ان ناموں میں زیادہ نام ایسے ہیں جنھوں نے دراصل انشائیے ہی کے ضمن میں اپنی بھرپور صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے۔

مشکور حسین یاد بھی بیک وقت طنز و مزاح اور انشائیہ نگاری کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں۔ "دشنام کے آئینے میں"، "جوہر اندیشہ" اور "اپنی صورت آپ" اس عرصے میں شائع ہونے والی ان کی طنزیہ و مزاحیہ اور انشائیہ تحریروں پر مشتمل ہیں۔ ان کی تحریریں بالعموم شگفتگی کی حامل ہوتی ہیں۔ ان تصانیف میں انھوں نے بعض معاشرتی ناہمواریوں اور شخصی بوالعجبیوں کو ہدف بنایا ہے۔ "ستارے چہچہاتے ہیں" ان کی حال ہی میں شائع ہونے والی دلچسپ تحریروں کا مجموعہ ہے۔ اس میں انھوں نے مزاحیہ زائچے تحریر کر کے بہت شستہ مزاح تخلیق کیا ہے۔

سجاد نقوی نے اس عرصے میں چند اچھے طنزیہ و مزاحیہ ڈرامے لکھے ہیں۔ اور اس روایت کو آگے بڑھایا جسے ڈراموں یا تمثیلوں میں خواجہ معین الدین، اصغر بٹ اور مرزا ادیب نے اپنے طنزیہ و مزاحیہ ڈراموں سے تشکیل دیا تھا خواجہ معین الدین کے مقبول اور دلچسپ ڈرامے "لال قلعہ سے لالو کھیت تک" اور "مرزا غالب بندر روڈ پر" اس عرصے میں کتابی صورت میں بھی شائع ہوئے۔ ان کے یہ ڈرامے موضوع اور اسلوب نگارش کے لحاظ سے عام دلچسپی اور مثالی مقبولیت کا باعث بنے۔ ان کے موضوعات تمام تر معاشرتی زندگی اور قومی تہذیب کے نشیب و فراز پر مبنی ہیں۔ ہر ڈرامے کے کردار عملی زندگی کے جیتے جاگتے افراد ہیں اور ان کے مکالمے انھیں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کی طنز نگاری میں ندرت بیان اور شوخی کا انوکھا انداز پایا جاتا ہے۔ مکالموں میں الفاظ کے اُلٹ پھیر سے وہ بہت گہرے اور تیکھے طنز کا کام لیتے ہیں

مسٹر دہلوی نے، جنھوں نے زیادہ شہرت اپنی مزاحیہ شاعری کے سبب پائی، اس عرصے میں اپنی مزاحیہ شاعری نثری
تحریروں کے دو مجموعے "سوادب" اور "دوپہر قلم" ترتیب دیئے۔ ان کے یہ مضامین اس اعتبار سے اہم ہیں کہ انھوں نے ان کے
ذریعے عصری رجحانات، حالات اور شخصیات کا پر مزاح اور متنوع جائزہ پیش کیا ہے۔ ان کے اسلوب میں طنز اور مزاح کی خوشگوار
آمیزش ہے۔ ان کا لہجہ بہت دھیما دھیما اور محض تبسم زیر لب کا حامل ہوتا ہے۔ لیکن عام طور پر وہ ایک بات کو بہت وضاحت اور
تفصیل کے ساتھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ اس کا تاثر محدود ہو جاتا ہے اگر ان مضامین میں اختصار سے کام لیا جاتا تو وہ زیادہ
شگفتہ اور دلچسپ ہو سکتے تھے۔ ایک اور وجہ سے بھی مسٹر دہلوی کے مضامین کا تاثر محدود ہو جاتا ہے کہ وہ مقصدیت کے پیش نظر
طنز و مزاح کو خیرباد کہہ کر خطابت پر اتر آتے ہیں۔ ضمیر جعفری بھی بنیادی طور پر ایک مزاحیہ شاعر کی حیثیت سے شہرت رکھتے
ہیں۔ لیکن نثر میں بھی ان کی چند تصانیف منظر عام پر آئی ہیں۔ خصوصاً سابقہ دہائی میں فکاہی مضامین کا ایک مجموعہ "اڑتے ہوئے
خاکے" اپنی شگفتگی کے سبب توجہ کا مرکز بن چکا ہے۔ اس عرصے میں ان کی دو کتابیں "آنریری خسر" اور "کتابی چہرے" شائع
ہوئیں۔ اول الذکر ایک مزاحیہ اور دلچسپ ناول ہے اور دوسری کتاب شخصی خاکوں اور تعارفی مضامین پر مشتمل ہے۔ ان کتابوں
میں ضمیر جعفری نے اپنی شگفتہ نگاری سے نثری اسلوب میں اپنی قائم کی ہوئی روایتوں میں مزید کئی خصوصیات کا اضافہ کیا ہے۔
ان کی تحریر بہت دلکش ہے اور وہ بعض اوقات لفظوں کے خاص استعمال سے اپنے اسلوب کو کہیں زیادہ توانائی اور نکھار دیتے ہیں۔

اس عرصے میں نئے لکھنے والوں میں ایک خاصی بڑی تعداد ان مزاح نگاروں کی ہے۔ جو فوج سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور
ان میں سے بھی بعض محض فوجی زندگی سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ اس ضمن میں افواج پاکستان کے مجلہ "ہلال" کو امتیاز حاصل
رہا ہے کہ اس کے توسط سے افواج پاکستان سے ایسے اہل قلم اور مزاح نگار عام ادبی دنیا کو فراہم ہو رہے ہیں جو بالخصوص طنز و
مزاح میں آج ممتاز سمجھے جاتے ہیں۔ اس روایت میں جس کا ایک اچھا آغاز سید ضمیر جعفری، شفیق الرحمن اور کرنل محمد خان سے
ہوا تھا، اب متعدد ناموں کا اضافہ ہوا ہے۔ چنانچہ کیپٹن صولت رضا، کیپٹن اشفاق حسین، کیپٹن محمد ادریس، کرنل مسعود اور میجر
صدیق سالک کی کاوشوں کو مزاحیہ ادب میں خوشگوار اضافہ کہا جا سکتا ہے۔ ان مزاح نگاروں نے اپنی تحریروں کے ذریعے
موضوعات کے تنوع اور اسلوب میں خاصا دلچسپ اضافہ کیا ہے۔ کیپٹن صولت رضا کی تصنیف "کاکولیات" پاکستان ملٹری
اکیڈمی کاکول، (نو وارد فوجیوں کی تربیت گاہ) میں زیر تربیت ایک "جنٹلمین کیڈٹ" کی آپ بیتی ہے۔ مصنف نے اس میں نہایت
شگفتہ اور شائستہ طریقہ سے [illegible] دنیا کی سیر کرائی ہے۔ اپنے مشاہدات اور محسوسات کو بیان کرنے کے لیے مصنف
نے پرکشش زبان استعمال کی ہے۔ بے ساختہ انداز بیان، اشعار اور جملوں کا برمحل استعمال بھی ان کے اسلوب کی خوبیاں ہیں
کیپٹن اشفاق حسین کی تصنیف "جنٹلمین بسم اللہ" بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ بھی فوجی تربیت اور فوجی زندگی سے
پیدا ہونے والے مزاح کی ایک عمدہ مثال ہے۔ مصنف نے اپنی فوجی زندگی کی ابتدا سے لے کر اپنی فوجی تربیت کے
مکمل ہونے تک کے دوران پیش آنے والے واقعات، حادثات، مناظر، معمولات، شخصیات کا تذکرہ بڑے دلچسپ انداز
میں کیا ہے۔ مصنف کی زبان، الفاظ کا استعمال اور جملوں کی ترتیب بھی ان کے طرز تحریر اور اسلوب کی انفرادی خصوصیت

کو ظاہر کرتی ہے۔ صدیق سالک کی تصنیف " ہمہ یاراں دوزخ " مشرقی پاکستان کے المیہ کے زیر اثر وجود میں آئی۔ مصنف نے دو سال کا عرصہ ایک فوجی افسر کی حیثیت سے بھارت کی قید میں گزارا تھا۔ یہ تصنیف انھیں مراحل کے واقعات اور تاثرات پر مشتمل ہے۔ مصنف کا اسلوب شستہ اور دلچسپ ہے اور بالعموم واقعات، شخصیات اور جملوں کے ذریعے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ ان کے مزاح کا انداز دھیما لیکن پرکیف ہے۔ " قلم اور کوڑے " کرنل مسعود احمد کی مزاحیہ تحریروں پر مشتمل تصنیف ہے۔ مصنف نے اس میں زندگی کے عام مسائل پر قلم اٹھایا ہے۔ وہ بالعموم الفاظ اور جملوں کی مدد سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ طنز کی آمیزش بھی موجود ہے لیکن بہت نمایاں نہیں۔

کچھ ایسے نام جو طنز و مزاح کی دنیا میں سنے ہیں لیکن اپنی کاوشوں کے سبب انھوں نے جلد ہی ادبی دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا، اس عرصے میں ابھرے اور بجا طور پر ان میں سے چند نام ایسے ہیں جن سے طنز و مزاح کے ادب کو بہت کچھ توقعات ہو سکتی ہیں۔ مرزا محمد منور معروف نقاد اور شاعر ہیں، لیکن اپنی نیم مزاحیہ تحریروں کے مجموعے " اولاد آدم " کے توسط سے طنز و مزاح کی دنیا میں وارد ہوئے ہیں۔ انھوں نے یہ تحریریں جو مضامین اور قصوں پر مشتمل ہیں، مختلف وقتوں میں تحریر کی تھیں۔ ان کا یہ مجموعہ سات سال قبل شائع ہوا تو بجا طور پر لوگوں کی توجہ کا باعث بنا۔ ان کی یہ تحریریں متنوع موضوعات کی حامل ہیں، جن میں کہیں احباب کا تذکرہ ہے، کہیں ذاتی وارداتوں کا ذکر ہے اور کہیں معاشرے کے مختلف کرداروں پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ یہ سب تحریریں نیم مزاحیہ موضوعات کی حامل ہیں جن میں مزاح کی تخلیق کے لیے زیادہ تر الفاظ کی معنویت، شوخ جملوں کے استعمال اور لفظی تحریف سے کام لیا گیا ہے۔ اس مجموعے کے بعض مضامین اپنے موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے طنزیہ اور مزاحیہ ادب میں قابل قدر اضافہ قرار دیے جا سکتے ہیں۔

عصمت اللہ خاں کا مجموعہ مضامین " گندم نما " بھی بڑی حد تک خوش گوار قسم کی چونکا دینے والی تحریروں پر مشتمل ہے۔ چونکا دینے والی اس اعتبار سے کہ مصنف نے بعض اچھوتے اور انوکھے موضوعات کو طنز و مزاح کا موضوع بنایا ہے۔

" چودہ طبق " شمس کاشمیری کے چودہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ سب مضامین مختلف پہلوؤں سے ان مسائل کا احاطہ کرتے ہیں جن سے ہمارے معاشرے کی اکثریت دوچار رہتی ہے۔ زندگی کی متعدد دشواریاں اور ناہمواریاں ان مضامین میں مختلف صورتوں میں نظر آتی ہیں۔ گستاخی معاف " مظفر بخاری کے ان مضامین کا مجموعہ ہے ———— جو اولاً تکراری مکالموں کی صورت میں ۷۴ء ۱۹ کے دوران روزنامہ " مغربی پاکستان " میں شائع ہوئے تھے اور بعد میں ترمیم و اضافہ کے بعد مضامین کی صورت میں لکھ کر شائع کیے گئے۔ یہ مضامین دلچسپ موضوعات، زندگی کے عام مسائل کے نتیجے میں پیدا ہونے والے حادثات، عام واقعات اور کرداروں کے بارے میں لکھے گئے ہیں۔ " دوست کہانی " آفتاب احمد شمسی کے مضامین کا مجموعہ ہے، جو بہت ہلکے پھلکے انداز میں لکھے گئے۔ ماجد صدیقی کی نثری کاوش " صورت احوال آنکہ " بظاہر مصنف کی زندگی کے ایک مخصوص دور کے واقعات پر مشتمل ہے لیکن یہ ان کی مکمل آپ بیتی نہیں ہے۔ مصنف نے نفس مضمون کے ساتھ ساتھ لطف زبان کا بھی خیال رکھا ہے۔ کرم الٰہی فاروقی کے مضامین کا مجموعہ " تحفہ زیر لب " تنوع

موضوعات پر مشتمل ہے۔ ان میں مصنف نے سادہ اور سلیس زبان میں مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس مجموعے کے بعض مضامین اپنے دلچسپ موضوع کے سبب جاذبِ نظر ہیں۔ اقبال ساغر صدیقی کے مضامین کا مجموعہ "شوخئ تحریر" عوامی مسائل سے متعلق ہے۔ مصنف نے اس میں خطابیہ اسلوب اختیار کیا ہے۔ بظاہر یہ تحریریں کسی اخبار کے کالم کے انداز میں لکھی گئی ہیں، لیکن دراصل یہ مضامین ہی ہیں۔ صلاح الدین حیدر نے "حماقتیں میرے مقدر کی" کے نام سے اپنا مجموعۂ کلام شائع کیا ہے۔

ان کے موضوعات میں بھی تنوع اور اسلوب میں دلکشی ہے۔ "باتوں کے خربوزے" مختار زمن کی تحریروں کا مجموعہ ہے۔ مصنف نے واقعات و حالات کے ساتھ کرداروں کو بھی ظرافت کا موضوع بنایا ہے۔ سب یہ مضامین مصنف کے سماجی شعور کی پیداوار ہیں جس کے تحت وہ واقعات، مسائل اور کرداروں کو طنز و مزاح کے پہلو سے دیکھتے ہیں۔ یہ مجموعۂ مضامین دلکش اور متنوع ہے اور اس بات کا مظہر ہے کہ طنز و ظرافت سے مصنف کو خاص اور فطری لگاؤ ہے۔ لفظوں کی تحریف اور الفاظ کی بندش سے بھی انھیں مزاح پیدا کرنے کا ملکہ حاصل ہے۔

اس عرصے میں طنز و مزاح میں مستقل تصانیف اور مضامین کے مجموعوں کے علاوہ بعض ایسی کتابیں بھی منظرِ عام پر آئیں جن میں کہیں زیادہ اور کہیں کم، طنز و مزاح کا شائبہ ملتا ہے۔ اس قسم کی مثالوں میں بعض بہت عمدہ طنز و مزاح کے نمونے بھی تخلیق ہوئے۔ مرزا ظفر الحسن کی تصانیف اس ضمن میں خصوصی ذکر کی متقاضی ہیں۔ مرزا ظفر الحسن نے اپنی معروف اور مقبول تصنیف "ذکر یار چلے" جس دلکش نثر اور پر لطف اندازِ بیان کو تخلیق کیا تھا، اسی روایت کا اظہار ان کی حالیہ تصانیف میں بھی ہوا ہے۔ "عمرِ گزشتہ کی کتاب" اور "دکن اُداس ہے یارو" میں تبسم زیر لب کے حامل مزاح کا متعدد مقامات پر دیکھا جا سکتا ہے۔ مصنف نے دلچسپ واقعات کو دلکش پیرائے میں بیان کیا ہے۔ ان کی نثر خوبصورت اور اسلوب بے ساختہ ہے۔ ان کے بعض مضامین بھی جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے، ان کے اسی دلکش اور خوبصورت اسلوب کے حامل ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مصنف کا مزاج سے فطری لگاؤ ہے اور جو مزاح وہ تخلیق کرتے ہیں وہ اکتسابی نہیں۔

دیگر مصنفین میں جن کی تصانیف میں طنز و مزاح کا شائبہ ملتا ہے، رحیم گل کا نام قابلِ ذکر ہے۔ ان کی ایک دو مثالوں بالخصوص ان کے تحریر کیے ہوئے شخصی خاکوں کے مجموعے "بلا تبصرہ" میں جا بجا مزاح کا پہلو نظر آتا ہے۔ ان خاکوں میں مصنف نے مختلف افراد کے ساتھ وابستہ مزاح کو دلچسپ پیرائے میں تحریر کیا ہے۔ سید مشتاق علی کی کتاب "یادوں کی خرافات" اسی نوعیت کی تصنیف ہے۔ یہ ذاتی یادوں اور تاثرات پر مشتمل ہے۔ اور مصنف کے بقول برق ملیح آبادی کی تصنیف "یادوں کی برات" کے ردِ عمل کے طور پر وجود میں آئی ہے۔ اسی مصنف کی دوسری تصنیف "بھیا بیگم سے جناح بیا بننے تک" بھی اسی قسم کی تصنیف ہے۔

اس عرصے میں کالم نگاروں میں احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین، ابراہیم جلیس، نصر اللہ خاں اور ابن انشاء اپنی قائم کردہ سابقہ روایات پر کم و بیش قائم رہے۔ احمد ندیم قاسمی نے "امروز" کے علاوہ "جنگ" میں بھی کالم لکھنے شروع کیے اور

کچھ عرصے تک روزآنہ اور پھر اب ہفتہ وار کالم لکھتے ہیں۔ "امروز" کے کالم لکھتے ہوئے انھوں نے جو پیرایہ اختیار کیا تھا وہ طنز و مزاح کے تعلق سے "جنگ" میں برقرار نہ رکھ سکے۔ اب ان کی تحریریں اس لحاظ سے شگفتگی اور انفرادیت کی حامل نہیں رہیں۔ "امروز" میں "حرف و حکایت" کے زیر عنوان ان کے جو کالم اس عرصے میں شائع ہوئے وہ ان کے مخصوص اسلوب کے حامل رہے۔ ان کے انداز میں جو نمایاں خصوصیت نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ لفظوں کے الٹ پھیر سے معنویت پیدا کرنے میں بڑی خلاقی کا ثبوت دیتے رہے ہیں۔ انتظار حسین نے طنز و مزاح کو کالم نگاری میں بڑی شائستگی اور نکھار دیا ہے۔ وہ اخبار "مشرق" میں "لاہور نامہ" کے عنوان سے جو کالم لکھتے رہے ہیں وہ اب ان کے نام اور اسلوب کے ساتھ مخصوص ہو کر رہ گیا ہے۔ ان کے بعض منتخب کالموں کا ایک مجموعہ "ذرے" چند سال قبل شائع ہوا ہے۔ کالموں میں انتظار حسین کا لہجہ بڑا دھیما اور متین اور انداز واقعہ نگاری اور قصہ گوئی کا سا ہے۔ تہذیبی اور معاشرتی مسائل ان کے خاص موضوعات ہیں۔ جو ان کے کالموں میں تبسم زیرلب مزاح اور کبھی کبھی شوخی آمیز طنز کا انداز اختیار کرتے ہیں۔ ابن انشاؔ نے کالم نگاری میں سب سے الگ راہ نکالی ہے۔ ان کا باغ و بہار کا اسلوب ان کی انفرادیت کا آئینہ دار ہے۔ وہ اپنے معاصر کالم نگاروں سے اس لحاظ سے مختلف نظر آتے ہیں کہ وہ بالکل سادہ اور معمولی واقعات سے بھی طنز اور مزاح پیدا کرنے کی پوری قدرت رکھتے ہیں۔ سنجیدہ اور خشک مسائل کو سیدھے سادے انداز میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ایک طرف ان کے الفاظ اور جملوں کی برجستگی اور دوسری طرف ان کا گہرا طنز قاری کے لیے بڑا موثر اور دلنشیں ہوتا ہے اور وہ اسے فکر انگیز بھی محسوس کرتا ہے۔ ان کے کالموں کی ایک خاص علمی سطح بھی ہوتی ہے جس میں ان کے مزاح اور طنز میں چھپے ہوئے لطیف اشارے پنہاں ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان سے لطف اندوز ہونے کے لیے بعض اوقات قاری کا ان کے پس منظر سے واقف ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اپنی متعدد خصوصیات کے لحاظ سے انھوں نے مزاحیہ کالم نگاری کو نئی جہت دی تھی، افسوس کہ وہ انھیں پر ختم بھی ہوئی۔

ابراہیم جلیس کے کالموں میں بالعموم معاشرتی اور تہذیبی مسائل کے مقابلے میں سیاسی موضوعات کی کثرت ہوتی ہے۔ ان کے طنز و مزاح کا نشانہ عام طور پر سیاسی قائدین اور سرکاری افسر بنتے رہے ہیں۔ ان کے انداز میں لطیف اشاروں کے بجائے پھبتی کا عنصر نمایاں ہے اور پھر وہ اپنی بات مکمل کرنے کے لیے پوری وضاحت سے کام لیتے ہیں، چنانچہ قاری کو پورا کالم پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ ان باتوں کے ساتھ ساتھ وہ بسیار نویس رہے ہیں، لیکن اس کے باوجود ان کے طنز کی چبھن اور مزاح کی شادابی ہمیشہ برقرار رہی۔ ان کے کالموں پر مشتمل اس عرصے میں چند کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں۔ نصر اللہ خاں بھی اپنے کالموں کے سبب خاص شہرت رکھتے ہیں۔ ان کے کالموں میں جو اخبار "حریت" (کراچی) میں شائع ہوتے ہیں۔ واقعات اور شخصیات کے اعمال و افعال سے مزاح پیدا کرنے کا عنصر نمایاں ہے۔ لیکن یہ مزاح ہلکی سی مسکراہٹ سے آگے نہیں بڑھتا اور اس میں بالعموم شائستگی اور متانت کی ایک فضا موجود رہتی ہے۔ الفاظ اور جملوں سے بھی مزاح کی تخلیق میں وہ مدد لیتے ہیں۔ ان کے کالموں کا

یک انتخاب " بات سے بات " کچھ عرصہ قبل شائع ہوا ہے۔ دیگر کالم نگاروں میں ایک نام ارشاد احمد خاں کا بھی ہے جو
والی مزاح پر مشتمل مزاحیہ کالم لکھ کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ کراچی کے اخبار " مشرق " اور " اخبارِ خواتین " میں ان کے
کالم مستقل شائع ہوتے ہیں۔ بالعموم مختلف سماجی مسائل پر قلم اٹھاتے ہیں اور معاشرے کے مختلف طبقات اور افراد کے مضحک
پہلوؤں کو پیش کرتے ہیں۔ وہ اکثر مبالغے سے کام لیتے ہیں اور اسی کے ذریعہ مزاح پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس عرصے میں جن نئے کالم نگاروں نے اپنی تحریروں سے شگفتہ اور متنوع طنز اور مزاح کی اچھی مثالیں پیش کیں، ان
میں رفیق ڈوگر، عطاالحق قاسمی کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کالم نگاروں نے اپنے اسلوب نگارش تازگی اور تنوع کا ثبوت
دیا ہے۔

رفیق ڈوگر کی تحریروں کے دو مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ " دید شنید " ان کے ان کالموں کا انتخاب ہے جو انھوں
نے مختلف جریدوں میں لکھے۔ مزاحیہ کالم نگاری میں جو چند نام ان دس برسوں میں دنیائے صحافت و ادب میں ابھرے ان
میں ڈوگر کا نام بہت ممتاز اور مقبول ہوا۔ ان کے موضوعات زیادہ تر سیاسی ہیں۔ اور ان کے مزاح میں طنز کا عنصر زیادہ
نظر آتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ صحافتی ضرورتوں اور تقاضوں کے ماتحت ایسا ہو ——— لیکن ان میں تخلیقی عنصر کی کمی بھی
کبھی محسوس نہیں ہوتی۔ ان کے کالموں کی انفرادیت مشاہدے کی بے پناہ تازگی ہے۔ ان کا اسلوب بہت تازہ ہے اور ان کے
جملے بہت تیکھے اور چست ہوتے ہیں۔ " دید شنید " کے علاوہ ان کے لکھے ہوئے شخصی خاکوں کا ایک مجموعہ " چالیس چہرے "
بھی ان کے مخصوص اسلوب نگارش کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ یہ شخصی خاکے سیاست دانوں کے ہیں۔ ان میں رفیق ڈوگر کا
قلم بہت تیکھا ہے۔ ان کے الفاظ بہت نپے تلے اور جملے بہت پہلو دار ہیں۔

عطاالحق قاسمی کے کالم اخبار " نوائے وقت " میں " روزنِ دیوار سے " کے عنوان کے تحت چند برسوں سے شائع
ہو رہے ہیں۔ اور اسی نام سے ان کے ان کالموں کا ایک انتخاب بھی شائع ہوا ہے۔ ان کے موضوعات ہماری تہذیبی اور
ادبی زندگی سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں اور کہیں کہیں سیاست بھی ان میں شامل ہو جاتی ہے۔ ان کا مشاہدہ بہت گہرا اور
وسیع ہے اور اسی وجہ سے ان کے کالم کتابی صورت میں بھی خاصے پسند کیے گئے ہیں۔

اس عرصے میں فکاہی کالم نگاری میں کچھ اور نئے اور پرانے نام بھی ہیں جو اپنی خصوصیات کے سبب نمایاں رہے
ان میں ظفر اقبال، خانی خاں (پروفیسر محمد اقبال ؟) کو ان کے دلچسپ اور منفرد اسلوب کے سبب مقبولیت حاصل ہوئی۔
یہ کالم نگار " زندگی " (ہفت روزہ) اور دوسرے جرائد میں گاہے گاہے کالم لکھتے رہے ہیں۔ لالہ صحرائی نے بھی اس عرصے
میں کئی اچھے کالم مختلف جرائد میں تحریر کیے ہیں۔ یہ سب کالم نگار زندگی اور معاشرے کے متنوع مسائل پر قلم اٹھاتے ہیں۔
ان میں سے بعض کالم نگاروں نے کچھ زیادہ اچھی اور قابلِ توجہ تحریریں بھی طنز و مزاح کے ادب کو دی ہیں۔

شاعری میں طنز و مزاح کے تعلق سے یہ دس سال کسی تازہ روایت کے حامل قرار نہیں دیے جا سکتے۔ اس میں
تنوع اور دلچسپی ضرور برقرار رہی۔ ضمیر جعفری، سید محمد جعفری اور مزاح نگار کی حیثیت تو پہلے ہی سے مستحکم تھی! اس

عرصے میں بھی یہ ممتاز اور نمایاں رہے۔ لیکن اس دہائی کے نصف میں سید محمد جعفری کی رحلت طنز و مزاح کی شاعری کے لیے ایک بڑا سانحہ ثابت ہوئی۔ معاشرتی ناہمواریوں کو شگفتہ انداز میں نظم کے پیرائے میں بیان کرنے میں انھیں امتیاز حاصل تھا۔ وہ اجتماعی زندگی کی کمزوریوں اور سیاسی حالات کے اضطراب اور ناہمواریوں پر بڑے شوخ انداز میں ہنستے اور ہنساتے رہے ہیں۔ گو معاشرے کے دوسرے مسائل سے وہ بے نیاز کبھی نہ رہے لیکن سیاسی بے اعتدالیاں ان کا خاص موضوع رہیں۔ ان کے طنز کا انداز بہت شائستہ اور ان کا مزاح بہت پرکیف ہوتا تھا۔ اسلوب میں شوخی اور زندہ دلی کا عنصر بالعموم غالب رہا۔ غالب اور اقبال کے اشعار کی تضمین اور انھیں نئے معنی دینے میں انھوں نے بڑی خوش اسلوبی اور مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ زندگی کے آخری چند برسوں میں انھوں نے متعدد دلچسپ نظمیں لکھیں۔

سید ضمیر جعفری نے نظم اور نثر پر یکساں قدرت کی ایک اچھی مثال پیش کی ہے۔ اس دہائی کے اوائل میں ان کے طنزیہ و مزاحیہ کلام کا مجموعہ "مافی الضمیر" شائع ہوا اور پھر انگریزی کی منتخب مزاحیہ نظموں کے منظوم تراجم کا مجموعہ "ولایتی زعفران" بھی شائع ہوا۔ بلاشبہ انھوں نے اس عرصے میں کامیاب مزاح نگاری کی اپنی قائم کی ہوئی روایتوں کو بخوبی برقرار رکھا۔ انھوں نے سماجی ناہمواریوں اور انسانی حماقتوں کو اپنی مزاحیہ اور طنزیہ شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ ان کے موضوعات متنوع اور دلچسپ ہیں اور ان کا اسلوب برجستگی کا حامل ہے۔ اس اسلوب کے تحت وہ نئے مضحک الفاظ اختراع کر کے مزاح کی صوتی کیفیت تشکیل دیتے ہیں۔ اور یہ انداز انھیں کے ساتھ مخصوص ہے۔ دلاور فگار پوری مستعدی سے سرگرم عمل رہے۔ "انگلیاں فگار اپنی" اس دہائی کے اوائل میں اور "مطلع عرض ہے" اس دہائی کے آخر میں شائع ہونے والے ان کے شعری مجموعے ہیں۔ زندگی کے عام مسائل ان کے موضوعات میں بہت زیادہ دخیل رہے ہیں۔ ان کے علاوہ قومی اور سیاسی سطح پر بھی ان کے احساس کو مضطرب دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک عام قاری کو ان کی نظمیں پڑھتے ہوئے ان کے مخصوص ماحول اور اس کے مسائل سے اچھی طرح واقفیت ہو جاتی ہے۔ طنز اور مزاح کا ان کا اپنا مخصوص اسلوب ہے، ان کے الفاظ بھی ایک حد تک ان کے اپنے ہیں، جنھیں وہ مختلف معنی دیتے رہتے ہیں۔ یہی تنوع اور ہمہ جہتی مسٹر دہلوی کے کلام کا بھی خاصہ ہے "عطر فتنہ" ان کے طنزیہ اور مزاحیہ کلام کا مجموعہ ہے۔ اس کا ایک امتیازی وصف اس کا اخلاقی پہلو بھی ہے۔ مسٹر دہلوی کو معاشرے کی اخلاقی اقدار کی زبوں حالی اور ان کے ادبار کا بڑا قلق ہے، چنانچہ ان کے کلام کا بڑا حصہ اخلاقی موضوعات پر مشتمل ہے۔ اس لحاظ سے آج کے دور میں انھوں نے مزاح میں نئے امکانات پیدا کیے۔ ان کا اسلوب بہت دھیما اور محض زیر لب مسکراہٹ کا متقاضی ہے۔ یہی اسلوب انعام احسن حریف کے کلام کی خصوصیت ہے۔ ان کی منظومات کا ایک مجموعہ "چشم دید" اس دہائی کے آخر میں شائع ہوا ہے۔ ان کے کلام میں طنز کا پہلو قدرے معدوم ہے۔ تاہم انھوں نے معاشرتی اور سیاسی موضوعات پر بعض اچھی نظمیں لکھی ہیں۔

مستقل فیچر
برق و شرر

برق آشیانوی

گڈس ٹرین اور گارڈز

ایک تازہ خبر کے مطابق یہ حیرت ناک انکشاف ہوا ہے کہ محکمۂ ریلوے نے گڈس ٹرینوں یعنی مال گاڑیوں کو اب بغیر " گارڈ " کے چلانے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے ۔ تجربہ کے طور پہ چار مال گاڑیاں چلائی جا چکی ہیں ۔ ساتھ ہی یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ بغیر گارڈ کے گڈس ٹرینوں کو چلانا خطرہ سے خالی نہیں ۔ اس اندیشے سے ہمیں اختلاف ہے کیونکہ گارڈس کی نگرانی میں چلائی جانے والی ٹرینوں کو بھی بے شمار حادثے پیش آئے ہیں ۔ ایسی صورت میں بغیر گارڈ کے ٹرین چلانے میں اگر حادثے پیش آئیں تو یہ محکمۂ ریلوے کا کوئی نیا کارنامہ نہ ہو گا ۔ ہمیں ایک دلچسپ واقعہ یاد ہے ۔ ایک عرصہ گذرا جب کہ ایک گڈس ٹرین گارڈ تو کجا بغیر انجن کے چل پڑی تھی ۔ اس گڈس ٹرین کے تیس ڈبے تھے جن کو دو اسٹیشنوں کے پار کر جانے پہ بڑی مشکل بلکہ منت سماجت اور خوشامد کے بعد روکا جا سکا ' ہم نے کہانیوں میں پڑھا تھا کہ ہاتھی مست ہو جاتا تھا اور بغیر مہاوت کے بستیوں میں دہشت پھیلاتا ہوا گذرنے لگتا تھا ۔ ایسے ہاتھی کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ مستی کے عالم میں ایسا کر گذرتا تھا ۔ اب جبکہ گڈس ٹرین بغیر انجن کے جس کو ہم گڈس ٹرین کا مہاوت کہہ سکتے ہیں چل پڑی تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ گڈس ٹرین مست ہو کر چل پڑی تھی اس کا مطلب یہ ہے کہ اب ٹرینوں کو بھی مستی آنے لگی ہے ۔ اس واقعہ پہ ہم نے ایک نظم بھی کہی تھی جو درج ذیل ہے ۔ اس کا عنوان ہے ۔ " بغیر انجن کے ریل گاڑی " ۔

مرحبا اے ریل گاڑی مرحبا صد مرحبا
تو نے کذب انجن تو نے ثابت کر دیا

اس طرح آزاد ہوتے ہیں غلامان کہن
جانبِ منزل رواں باندھے ہوئے سر سے کفن
تیس ڈبے گڈس کے نکلے ہیں انجن کے بغیر
گردنیں بے طوق جن کی اور بے زنجیر پیر
یوں نظر آیا ہمیں ان تیس ڈبوں کا یہ عزم
شاعرانِ ریلوے کی ہے یہ اک آزاد نظم

گڈس ٹرین کے بغیر انجن کے چل پڑنے کے عرصہ بعد حکام ریلوے کے ذہن میں سوچنے کی نئی نئی راہیں کھل رہی ہیں۔ چنانچہ دیباچہ کے طور پہ انہوں نے پہلا قدم یہ اٹھایا ہے کہ اب بغیر گارڈ کے گڈس ٹرینوں کو چلایا جائے اور تجربہ کے طور پہ کچھ ٹرینیں چلائی گئی ہیں جس سے امید پیدا ہو گئی ہے کہ اب تمام گڈس ٹرینوں کو بغیر گارڈس کے چلایا جائے گا۔ ہماری نظر میں یہ ایک اچھا اقدام ہے۔ وہ لوگ جو اس اقدام پر اس اندیشے کا اظہار کر رہے ہیں کہ حادثات میں اضافہ ہوگا تو ان کی خدمت میں ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ وہ حادثوں کا سوال نہ اٹھائیں، اس لئے کہ حادثات تو گارڈس کی موجودگی میں بھی ہوتے ہیں بلکہ اگر سالہائے ماسبق کے حادثات کا ایک گرافک چارٹ (GRAPHIC CHART) تیار کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر سال حادثات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس لحاظ سے ہر نئے سال کے بجٹ میں اخراجات میں حادثات سے ہونے والے اخراجات کا ایک تخمینی اندازہ قائم کر کے اس کو بھی اخراجات کے مد میں شامل کر لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جہاں کروڑوں بلکہ اربوں کا خسارہ ہوتا ہے وہاں ایک آدھ ملین کا خسارہ حادثات کے نقصانات سے ہونے والے اخراجات کی وجہ سے بھی ہوتا ہے۔ اور اس کی پابجائی میں ٹرینوں کے کرایوں میں دوگنا سہ گنا چار گنا اضافہ کر دیا جا کر اس کی پابجائی کر دی جا سکتی ہے۔ غرض گڈس ٹرینوں کو بغیر گارڈ کے چلائے جانے سے ہمیں کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوئی۔ بلکہ ہم تو اس سے آگے اور بھی کئی مفید تجاویز پہ غور کر رہے ہیں۔ جن میں سب سے پہلی یہ ہے کہ گڈس ٹرینوں کو بغیر انجن کے ڈرائیور کے بھی چلایا جانا چاہئے کیونکہ جہاں بغیر گارڈز کے چلانے سے تنخواہوں کی بچت ہو رہی ہے وہیں انجن ڈرائیوروں کی تنخواہوں کی بھی بچت ہوگی اور اس بچت سے حادثوں میں ہونے والے نقصانات کی ایک حد تک پابجائی بھی ہو جائیگی یا کم از کم ایکس گریشیا کی رقم کا بار ہلکا ہو جائے گا۔ ہماری اس معقول تجویز پہ وہی نامعقول اعتراض کیا جائیگا کہ اس سے حادثات میں اضافہ ہو جائے گا۔ حالانکہ ہم اوپر اعداد و شمار کے بغیر یہ ثابت کر چکے ہیں کہ حادثوں کو نہ تو گارڈز روک سکتے ہیں نہ انجن ڈرائیور بلکہ حادثے تو ان لوگوں کی پروا کئے بغیر خود ہی ہو جاتے ہیں اور گارڈز

اور انجن ڈرائیور منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ یہاں منہ دیکھنا سے ہماری مراد صورت کا تکنا ہے۔
یہاں تک تو گڈس ٹرینوں اور ان کے گارڈز کی بات ہوئی۔ اب ہم پاسنجر ٹرینوں کی بات کرتے ہیں۔ جن میں مال کے بجائے مسافر سفر کرتے ہیں۔ ہماری رائے یہ ہے کہ مسافر گاڑیوں کو بھی بغیر گارڈز کے چلانا چاہیئے۔ کیونکہ ہم آئے دن ریلوں میں سفر کرتے ہیں تو یہی دیکھتے ہیں کہ گارڈ اپنے ڈبے میں سوائے آرام لینے کے کوئی کام نہیں کرتے، البتہ جب کوئی اسٹیشن آجائے تو اتر کر اسٹیشن ماسٹر یا دوست احباب سے باتیں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اگر ٹرین زیادہ دیر تک رک جائے تو ہوٹلوں میں بیٹھے نظر آتے ہیں۔
جب ٹرین کی روانگی کا وقت آتا ہے تو یہ دیکھے بغیر کہ تمام مسافر ٹرین میں سوار ہو گئے ہیں یا نہیں ہری جھنڈی یا ہری لائٹ دن اور رات کی مناسبت سے دکھا کر اپنے ڈبے میں سوار ہو جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے مسافر گاڑیوں میں سے بھی گارڈز کو برخاست کر دیا جا سکتا ہے۔ اگر اس سلسلے میں بھی کوئی حادثات کا سوال اٹھائے تو ہمارا وہی جواب ہے کہ حادثات کو روکنا گارڈ کے بس کی بات نہیں، بلکہ اگر ذرا وسیع النظری سے کام لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ زندگی خود حادثات کا نام ہے۔ چنانچہ حادثہ کا ذکر ہی خارج از بحث ہے۔
گارڈز کو برخاست کر دینے کے بعد ہماری ایک اور تجویز ہے وہ یہ کہ مسافر گاڑیوں سے ٹی ٹی آئی کو بھی برخاست کر دیا جائے اس سے مسافروں کو خاطر خواہ فائدہ ہوگا۔ جہاں تک فاسٹ یعنی تیز رفتار گاڑیوں کا مسئلہ ہے اس میں ٹی ٹی آئی تو کوئی خدمت ہی انجام نہیں دے سکتے یا یوں کہیئے آجکل ٹرینوں میں مسافر ڈبوں میں بھر جانے کے بعد ڈبوں کی چھتوں پر بیٹھ کر سفر کرتے ہیں ایسی صورت میں ٹی ٹی آئی کے کسی مسافر تک پہونچ کر ٹکٹ کی چیکنگ کرنا اس قدر دشوار ہو جاتا ہے کہ بیچارہ کسی ایک ڈبے میں مسافروں سے بھی زیادہ مصیبت میں پھنس کر ملکہ لٹک کر (اللہ نہیں) اپنی زندگی اور عاقبت کی خیر مناتا ہوا نظر آتا ہے۔ چنانچہ بغیر ریزرویشن کے جتنے ڈبے ہوتے ہیں ان میں ٹی ٹی آئی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس لحاظ سے ٹرینوں سے ٹی ٹی آئی کو بھی برخاست کر دیا جائے تو محکمہ ریلوے کو کافی بچت ہوگی اور اس رقم سے حادثوں میں جو نقصانات ریلوے کو برداشت کرنے پڑتے ہیں ان کی پابجائی بھی ہو جائیگی۔
اب رہا سوال ان بوگیوں کا جو عقبی حصہ یا ملحقہ ہوتے ہیں تو ان ہم اسے بھی کنڈکٹر کو برخاست کر دینا چاہیئے اس لئے کہ ان کا وجود اکثر مسافروں کے لئے بے فائدہ ثابت ہوتا ہے البتہ خود کنڈکٹروں کے لئے کافی فائدہ مند ہے۔ کنڈکٹروں کو اسٹیشن پر مسافر اس طرح گھیرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جس طرح حسین ستارہ کالاب کے جو پہ راہگیروں کو تکتیاں۔
(حوالے کے لئے ملاحظہ ہو ہمارا مضمون "تکیاں" مطبوعہ ماہنامہ شگوفہ بابتہ ماہ [illegible])

کنڈکٹروں کے اطراف مکھیاں کیوں بھنبھناتی رہتی ہیں یہ تو مکھیاں یعنی مسافر اور کنڈکٹر ہی جانتے
ہیں اور عوام ان سے زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔ ویسے تھرڈ کلاس اور ٹو ٹائیر بوگیوں میں کنڈکٹروں
کا وجود اور عدم وجود دونوں برابر ہیں۔ اس لئے کہ ان بوگیوں میں ایسے مسافر بھی بلا روک
ٹوک رہتے ہیں جن کا ریزرویشن نہیں ہوتا۔ جس کی وجہ سے ریزرویشن کروا کر سفر کرنے والے
اپنی بے وقوفی پر افسوس کرتے ہیں کہ ہم نے خواہ مخواہ ریزرویشن کروایا۔ شکایت کرنے کیلئے
کنڈکٹر کو تلاش کیا جائے تو کنڈکٹر کا اسٹیشن پر دُور تک پتہ نہیں چلتا۔ (ہم نے اسٹیشنوں
کا لفظ محکمۂ ریلوے کی رعایت سے میلوں کے بجائے استعمال کیا ہے۔ اور میلوں دور کے بجائے
اسٹیشنوں دور لکھا ہے) گارڈز کو برخاست کرکے ٹی ٹی آئی اور کنڈکٹروں کو بھی برخاست
کر دینے کے بعد ہم دیگر ایسے امور پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ جن کا برخواست کر دینا ضروری ہے
جن سے محکمہ ریلوے کے اخراجات میں کمی ہو، چنانچہ ہم ٹائم ٹیبل کو بھی برخاست کر دینے کی
تجویز پیش کرتے ہیں۔ اس لئے کہ ہم نے کسی ٹرین کو آج تک ٹائم ٹیبل کے مطابق چلتے نہیں دیکھا
ہم بعض ٹرینوں کے اوقات ٹائم ٹیبل میں دیکھ کر گھر سے دوپہر کا کھانا کھا کر نکلتے ہیں۔ لیکن
اسٹیشن پر پہونچنے کے بعد معلوم ہوتا ہے ٹرین چھ گھنٹے لیٹ ہے۔ ہم اپنے آٹھ بچوں اور بیوی
کو افسوس بلکہ رنج و غم ہے کہ صرف ایک ہے۔ لے کر ویٹنگ روم میں اس طرح بیٹھ جاتے ہیں
جیسے وہ اپنا گھر ہی ہے۔ سسرال کا گھر ہم اس لئے نہیں سمجھتے کہ آج کل سسرال کے تکڑوں کے معنے کچھ
اچھے نہیں ہیں۔ ان چھ گھنٹوں میں بیوی اور بچوں کی مختلف تحریکات سامنے آتی ہیں۔ بیوی
تحریک پیش کرتی ہیں کہ وہ اپنے ماموں صاحب کے گھر جا کر آجائیں گی۔ کیونکہ گھر اسٹیشن سے
صرف ایک میل دور ہے (مخفی مباد کہ ہم اپنے گھر سے چھ میل کا سفر طے کرکے اسٹیشن
آئے ہیں۔ اس لئے گھر واپس جا کر آنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے) بچوں کو اس تحریک سے
اختلاف ہوتا ہے، چنانچہ ایک کہتا ہے کہ میٹنی شو دیکھ لیں گے کیونکہ تھیٹر اسٹیشن کے سامنے
ہی واقع ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ کرکٹ کا ٹسٹ چل رہا ہے، چنانچہ اتنے وقت میں جتنا کھیل دیکھ سکتے
ہیں دیکھ لیں گے۔ تیسرا کہتا ہے کہ میونسپلٹی کا پبلک گارڈن بھی اسٹیشن سے آدھے فرلانگ
کے فاصلے پر ہے وہیں جا کر وقت گذاریں گے۔ کیونکہ وہاں تفریح کے مختلف سامان موجود
ہوتے ہیں اس تمام گفتگو کے دوران بڑے صاحبزادے اچانک غائب نظر آتے ہیں جو اپنی
امی جان سے یہ کہہ کر چلے جاتے ہیں کہ وہ اپنے ایک دوست سے مل کر آئیں گے۔ یہ باتیں تو
اہل و عیال سے متعلق ہیں مگر ایسے وقت میں پریشانی اُن لوگوں سے بھی ہوتی ہے جو نہ
ہمارے "اہل" ہوتے ہیں۔ نہ "عیال" لیکن وہ ہم کو اپنے اہل و عیال سمجھ کر حفاظتی دستے کے
طور پر استعمال کرتے ہوئے اپنا سامان ہماری نگرانی میں یہ کہہ کر چلے جاتے ہیں کہ "صاحب گاڑی

پھر ہمارے سامان کی نگرانی کیجئے۔ ہم سامنے کے ہوٹل میں کھانا کھا لیتے ہیں۔ ایسے لوگ زیادہ تر صرف میاں بیوی یا زیادہ سے زیادہ ایک بچے تک محدود ہوتے ہیں۔ واپسی میں اتنی دیر کر دیتے ہیں کہ گاڑی کے لیٹ ہوکر آنے کا وقت قریب آجاتا ہے۔ اس سے ہماری پریشانی ناقابل بیان ہو جاتی ہے۔ ہم نے ویٹنگ روم میں ایک صاحب سے شکایت کی تو انہوں نے ایک معقول تجزیہ پیش کی اور کہا "جناب میری رائے تو یہ ہے کہ آپ اس کی سزا اس طرح دیں کہ اپنے ٹکٹ واپس کر کے ان کا سامان لے کر اپنے گھر چلے جائیں تاکہ وہ کبھی آئندہ کسی کو اس طرح کی تکلیف نہ دیں۔" غرض کچھ گھنٹے کے انتظار کے بعد پلیٹ فارم پر ایک مزدوری اعلان نشر ہوتا ہے کہ جو ٹرین چھ گھنٹے دیر سے آنے والی تھی وہ مزید چار گھنٹے اور دیر سے آئیگی۔

اب تو رات ہو جاتی ہے اور ہم نے جو توشہ اپنے ساتھ اٹھائے رکھا تھا کہ ٹرین میں کھائیں گے اسٹیشن پر ہی کھل جاتا ہے۔ اور سب کھا لیتے ہیں۔ اب ذرا ایک نیند کا جھپکا لینا چاہتے ہیں تو یہ دشواری پیش آتی ہے کہ جن صاحب نے اپنا سامان ہماری نگرانی میں دے رکھا تھا وہ انکوائری میں یہ معلوم کر کے کہ ٹرین مزید چار گھنٹے دیر سے آئے گی۔ کینٹین میں کھانا کھا کر سکنڈ شو دیکھنے چلے جاتے ہیں۔ مخفی مبادا کہ اس سے پہلے انہوں نے اطمینان کے ساتھ میٹنی شو دیکھ لیا تھا چنانچہ ہم بیوی بچوں کو آرام سے سلا کر سامان کی حفاظت کے لئے پہرہ دیتے رہتے ہیں۔ غرض جب رات کے ایک بجے ٹرین آنے کا یقین ہو جاتا ہے تو وہ لوگ جن کے سامان کی ہم حفاظت کر رہے تھے آکر ہمارا شکریہ ادا کئے بغیر اپنا سامان اٹھا کر روانہ ہو جاتے ہیں۔ ہم اپنے اہل وعیال کو بیدار کر کے اپنا سامان لے کر پلیٹ فارم پر پہونچتے ہیں تو پھر ایک اعلان ہوتا ہے کہ ٹرین مزید دو گھنٹے دیر سے آئے گی۔ اب ہم اس کوفت میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ اگر یہ بات پہلے ہی معلوم ہوتی تو مزید دو گھنٹے ہم ویٹنگ روم میں گذارتے۔ ادھر بیوی ہماری نادانی پر طعنے دینا شروع کر دیتی ہیں کہ ہم ہر معاملہ میں خواہ مخواہ عجلت سے کام لیتے ہیں۔ ہمارا فریضہ تھا کہ پہلے اطمینان کر لیا جاتا کہ ٹرین حقیقت میں کب آئے گی۔ اس کے بعد سب کو پلیٹ فارم پر لے آتے، غرض دو گھنٹے کے بعد ایک ٹرین آتی ہے اور ہم اپنا سامان لے کر ٹرین کی طرف لپکتے ہیں اور تیزی سے سب کو سوار کرانے کے بعد جب ہم سوار ہونا چاہتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ وہ ٹرین نہیں ہے جس سے ہم کو سفر کرنا ہے۔ ہماری ٹرین تو اس ٹرین کے مسافروں کے اترنے کے بعد جب پلیٹ فارم چھوڑ کر آگے بڑھ جائے گی، تب کہیں آئے گی۔ چنانچہ ہم پورے خاندان کو معہ سامان کے اتار لیتے ہیں۔ ادھر پھر بیوی ہماری نادانی کا شکوہ لے بیٹھی ہیں کہ ہم نے ٹرین پر لگی ہوئی تختی کو تک نہیں پڑھا۔ حالانکہ یہ ہماری زبردست بھول تھی لیکن اس بھول کا وہی لوگ اندازہ کرسکتے ہیں جو ٹرین کے انتظار میں ہماری طرح دس بارہ گھنٹے اسٹیشن پر گذارنے کے بعد ہوش و حواس

کر دیتے ہیں۔ جب پلیٹ فارم خالی ہوتا ہے اور ہماری ٹرین آتی ہے تو ہم بے بوگی پر لگی تختی کو پوری احتیاط کے ساتھ بچے اور مسٹر کے ساتھ غور سے پڑھ کر سوار ہو جاتے ہیں اور اطمینان کا سانس لینے بھی نہیں پاتے کہ ایک اور ضروری اعلان سنائی دیتا ہے کہ یہ ٹرین منسوخ کر دی گئی ہے کیونکہ اس کے بریک ناقص ہو گئے ہیں، جن کو درست کرنے تک صبح کے آٹھ بج جائیں گے۔ چنانچہ اتر کر ہم پھر ویٹنگ روم کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ پھر صبح آٹھ کے بجائے دس بجے ٹرین ہماری منزل کی طرف روانہ ہوتی ہے تو ہم جس شادی کی تقریب میں شریک ہونے والے تھے وہ شام کو ہو چکی اور اس ایک پلیٹ آئسکریم سے بھی "منہ دھو بیٹھے" ہیں۔ (محاورہ تو "ہاتھ دھونا" ہے) لیکن ہم نے آئسکریم کی مناسبت سے "منہ دھونا" لکھا ہے اگر اس پر کسی صاحب کو اعتراض ہو تو وہ "ہاتھ دھولیں" ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ جو گذشتہ شام تقسیم ہوئی۔

غرض منشاء اس تمام بحث کا یہ ہے کہ ٹائم ٹیبل کو بھی اسی طرح برخاست کر دینا چاہیئے جس طرح کہ گڈس ٹرینوں سے گارڈز کو برخاست کر دیا جا رہا ہے۔ اس سے جو بچت ہوگی اس کو تقریباً روزانہ ہی ہونے والے حادثات کے نقصان کی پابجائی میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ہماری ان تمام تجاویز کو سن کر ملا جزا لیہو دنے کہا "میاں میرا خیال ہے کہ تم کو وزیر ریلوے بنا دینا چاہیئے کیونکہ تم وزیر نہ ہوتے ہوئے بھی محکمۂ ریلوے کو اتنی منفعت بخش تجاویز بخشتی ہیں۔ اگر وزیر بنا دیا جائے تو یہ جو ریلوے کا سالانہ بجٹ خسارہ کا بن رہا ہے۔ کروڑوں روپے کی بچت کا بنے"

ہم نے جواب دیا۔ "قبلہ ہم اگر وزیر ہوتے تو ادیب نہ بنتے کیونکہ ایک میان میں دو تلواریں نہیں سما سکتیں۔ ——— ▲!!

پ۔ل۔ دیشپانڈے

محمد اسد اللہ (ورودھ، مہاراشٹرا)

پگڑی

(مراٹھی مزاحیہ)

بچپن میں دادی سے ایک کہانی سنی تھی جس میں ایک
یاسی اپنے دن بھر کے معمولات مختلف علاقوں میں انجام
رتا تھا۔ مثلاً کاشی میں اشنان کرو کشیتر میں بھیک
ن، شرولی میں پیٹ پوجا وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے سنیاسیوں
یک عجیب سی عقیدت تھی جو مختلف جگہوں پر مختلف کام
رتے تھے۔ مگر دوسری جنگ عظیم نے اس نوعیت کے
ئی سنیاسیوں کو جنم دیا۔

اسی قسم کا ایک ہمارا گورے گاؤں والا بھی ہے جو
شنان کے لیے اندھیری، کپڑے تبدیل کرنے کے لیے
رہ، کھانا کھانے کے لیے دادر اور نوکری کے لیے بوری بند
زندگی گزارتا ہے۔ اور چھٹی کے دن، دن بھر راستوں پر
لتا رہتا ہے کیونکہ اسے سونے کے لیے گورے گاؤں میں
اصطبل مل چکا ہے۔ دن بھر اصطبل بند رہتا ہے اور
ں کے دن ٹانگے کو بے شمار سواریاں ملتی ہیں۔ لہٰذا ٹانگے
گھوڑوں کے انتظار میں وہ بیٹھا رہتا ہے۔ چھٹی کے دن

اسے نائٹ ڈیوٹی والوں کا سا چہرہ بنا کر بھٹکنے کے سوا کوئی
چارہ نہیں ہوتا۔ جس اصطبل میں وہ سوتا ہے وہاں بلا کرایہ
زندگیاں بسر کرتے ہوئے چند ہم نفس بھی ہیں مثلاً
چوہے اور چوہیوں کو تنہائی کا احساس نہ ہو اس لیے گھونس
بھی ہے۔ ٹانگے کے نرم نرم گدوں میں چھپے کھٹمل رات بھر
ہمارے دوست کے جسم کی خیریت دریافت کرتے رہتے
ہیں۔ اور گھوڑے کے فراق میں بے قرار مکھیاں کچھ دیر گھوڑے
سے محبت کا اظہار کرتی ہیں تو کچھ دیر ہمارے دوست سے
پیار جتاتی ہیں اور وہ تاریخی ڈرامے کے بہادر ہیرو کی طرح
ان تمام حالات سے ٹکر لیتا ہے کہ ہر ملنا جلنا گھاٹوں کا پانی
پی پی کر اس میں ایک عجیب سی قوت پیدا ہو چکی ہے اور
اصطبل کے ہم نشینوں کی عادتوں اور حلقوں کو اپنا کر وہ
بڑا سخت جان ہو چکا ہے۔ البتہ اس اصطبل کے حصول کے
لیے بھی اسے پگڑی دینی پڑی یعنی اسے یہ جگہ لی بھی تو اس
وعدے پر کہ وہ روزانہ گھوڑے کو باقاعدگی سے کھریرا کرے گا

شروع میں اس نے نئی جگہ کے لیے بہت ہاتھ پیر مارے مگر کامیاب نہ ہوا۔ اب اس جگہ کو مضبوطی سے تھامے رہنا ہی اس کی زندگی کا اولین مقصد ہے۔ خوش قسمتی سے اس کا واسطہ ایک جانور سے ہے۔ "مالک" نامی مخلوق کو سنبھالنے کا کام ہوتا تو بڑی مشکل ہوتی۔

ایک شخص کو ایک اچھی نوکری ملی اور فوراً شادی بھی ہوگئی لیکن ابھی روٹی کپڑے کا مسئلہ حل ہوا نہ ہوا کہ چھت کا مسئلہ آکھڑا ہوا۔ وہ اس طرح کہ اس سے قبل وہ جہاں رہتا تھا اس مکان مالک کو یہ لکھ کر دے چکا تھا کہ شادی کرتے ہی فوراً مکان خالی کردے گا۔ مالک مکان کی شادی چونکہ ایک مدیرہ سے ہو چکی تھی لہٰذا اس کے ہاتھوں کا کھانا اور مضامین ان دو طرفہ حملوں سے وہ بے چارہ پہلے ہی بُری طرح گھائل تھا۔ اس کو یقین تھا کہ پھونکنی اور قلم دونوں ایک ہاتھ میں رہنا ناممکن ہے۔ لہٰذا جب وہ کسی کی شادی دیکھتا تو بُری طرح جل اُٹھتا۔ ہمارے دوست نے اس حال میں اس کے گھر رہ کر شادی کی، رات کے دو بجے بارات نکالی اور نہ نبے قاعدہ جلوس گاتا بجاتا ہوا جب اس کے گھر کے سامنے پہنچا تو مالک مکان نے اسے روک دیا اور عہد شکنی کی وجہ سے اس کا گھر میں داخلہ ممنوع قرار دیا۔ بالآخر بینڈ باجے والوں کو مزید دو گھنٹوں کا محنتانہ دے کر دوارشیو پیٹھ سے شکرواری پیٹھ اور وہاں سے اُلٹے پاؤں قصبہ پیٹھ وغیرہ وغیرہ گھما پھرا کر صبح پانچ بجے سنگم پر آکر بارات ٹھہری اور اس نوبیاہے جوڑے کو سنگم پر چھوڑ کر بارات واپس ہوئی۔ ازدواجی زندگی کی ابتدا سنگم سے ہو۔ یہ عجیب اتفاق تھا۔ خدا خدا کرکے صبح ہوئی۔

لڑکی کو اس کا باپ گھر ملنے کو تیار نہ ہوا اور شوہر کو گھر نہ ملا۔ کئی دن بعد حال ہی میں انہیں گھر ملا مگر گھر سے مراد وہ جگہ ہے جہاں گھر کا مالک کوئلہ کی بوریاں، پیاز، بابا گاڑی وغیرہ کا ٹھو کباڑ رکھا کرتا تھا۔ اس عجیب الخلقت کمرے کے لیے پگڑی لینا تو ممکن نہ تھا۔ لہٰذا کمرے کے کرایہ کے علاوہ مالک مکان کے گھر کا کھانا پکانا، اس کی پوری نسل کو پروسنا، مالکن سے خود اس کی شان میں تعریفی کلمات سننا۔ خالی اوقات میں اس کی چولیاں سینا اور چولی سیتے ہوئے ہر بار "آپ کے کچھ دبلی ہوگئی ہو شالنی بائی۔" کہنا۔ نیز پڑوسن پرمیلا بائی کی فیشن پرستی کو کوسنا اور مالکن کے سادہ پن کی داد دینا۔ اس قسم کے کئی کام کرنے تھے مگر اس سے زیادہ خستہ حالت ہمارے دوست کی تھی کہ مالک مکان کو طبلہ بجانے کی لت تھی وہ اسے ٹوٹی ہوئی پیٹی تھما کر خود طبلہ کوٹتا بیٹھتا۔ مالک کی فرمائش پر "کرشن مراری" بجا بجا کر اس کا یہ حال ہو چکا ہے کہ کوئی اس کے قریب جا کر صرف "کرشن مراری" کہہ دے تو وہ چکرا کر گر پڑے۔

سادھو سنتوں کا یہ قول کہ بھگوان جس حال میں رکھے خوش رہو، بجا ہے مگر وہ کہیں بھی رکھنے کو تیار نہیں تب کیا کیا جائے۔

دنیا کی تمام سکونت گاہیں کہاں چلی گئیں اس کا جواب دینے والا صرف ایک ہی طبقہ ہے جو نہ اُٹھائی جا سکنے والی پگڑیاں پہنا تا ہے اس فرق کے ساتھ کہ اس پگڑی کا بوجھ پگڑی دینے والے کے سر پہ ہوتا ہے لینے والا بے فکر ہوتا ہے جگہ کے لیے رشوت کو پگڑی کا نام

...نے والا آدمی اس قابل تو قطعی نہ رہا ہوگا کہ اس کی
...ستار بندی کی جا سکے۔ سرکاری مصیبت آنے پر وہ
...یہ اس چابکدستی سے ادھر اُدھر کیا جا سکتا ہے کہ
...ے پگڑی گھمانے ہی سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ شروع
...بمبئی میں پگڑی دینے پر جگہ ملتی ہے اس خبر کے عام
...تے ہی لوگ باگ بہت خوش ہوئے۔ کئی پنشنروں
...اپنی پرانی پگڑیاں درست کروائیں۔ پچھلے دنوں پگڑی
...کے جرم میں ایک عورت کی گرفتاری کی خبر چھپی
...ہماری دادی ناک سکوڑ کر بولی ــــ پگڑی پہننے کی
...ایک فیشن عورتوں میں رہ گئی تھی اب وہ بھی آ گئی۔
...مہنگائی اور تنگدستی کے زمانے کی باتیں ہیں اب تو
...بچہ پگڑی سے واقف ہے۔

کہا جاتا ہے کہ فلاں نے اتنے روپے کی پگڑی
...لیکن یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اسے ہزار روپے
...پگڑی سر پر چڑھانے کے بعد جگہ ملی۔ پہلے جب سرکاری
...نہیں تھی یہ کام کھلے عام بڑی بے شرمی سے ہوا
...تا تھا۔ تب اس پگڑی سے مراد صرف روپیہ تھا مگر اب
...کا معاوضہ کیا کیا نہ دیا جائے گا، یہ کہنا مشکل ہے۔
...ے ایک دوست کو مالک مکان کی بھینگی لڑکی سے شادی
...نی پڑی۔ مکان کو دیکھ کر اس نے آنکھوں کو نظر انداز
۔ مگر اس جگہ کے لیے اسے "پتی" کی جو پگڑی پہننی
...ی وہ اسے بیوی سے آگے "نہیں" ہٹنے دیتی۔ کسی کو
...کے لیے مالک مکان کے لڑکوں کو پڑھانا، شام میں
...سرکس کے لیے لے جانا، اتوار کو سینما دکھانا وغیرہ کام
...کرنے پڑتے ہیں۔

میرے پہچان کے ایک بڑے ڈاکٹر کو اس شرط
پر دواخانہ کھولنے کے لیے جگہ ملی کہ وہ صاحب مکان کی
پوجا پاٹھ کی ضروریات پوری کر کے شام کو "بھگتی وچن"
پڑھ کر سنائے گا۔ نیز مالک اور اس کی آل اولاد کو
دوائیاں مفت دے گا۔ مالک مکان کو روزانہ
[illegible] کا انجکشن دیتے ہوئے ڈاکٹر کے دل میں
خطرناک قسم کی تمنائیں انگڑائیاں لیتی ہیں۔ دن بھر انقلاب
کی باتیں کرنے والا ڈاکٹر پوجا کو جاتے ہوئے سرکس کا شیر
دکھائی دیتا ہے۔ مگر مالک کو اس کی حالت پر رحم نہیں
آتا۔ آج کل اس کے یہاں پوجا پاٹھ کے لیے ڈاکٹر، پانی
بھرنے کے لیے وکیل، گھر کی صفائی کے لیے لیکچرر ہے۔ اس
طرح کی شاندار زندگی گزار رہا ہے۔ اس کے باوجود یہ کہنے
کے لیے تیار ہے کہ پھوٹی کوڑی پگڑی نہیں لی۔

"شادی کر کے دیکھو اور گھر باندھ کر" آج کل
اس زبان زد فقرے میں تھوڑی تبدیلی کر کے "گھر ڈھونڈ
کے دیکھو" کہنے کی نوبت آ گئی ہے۔ گھر ڈھونڈنے والوں
کو انسانی مزاج کے نادر نمونے دیکھنے کے عجیب عجیب
اتفاقات ہوتے ہیں۔ گھر کے مالک کی جانب سے پوچھے
جانے والے سوالوں میں یہ سوال عام ہے کہ کیا آپ کی
شادی ہو چکی ہے۔ غافل کرایہ دار اطراف کا جائزہ
لیے بغیر سچ بول گیا تو معاملہ ہی ختم۔ بظاہر یہ کوئی
مشکل سوال نہیں ہے، اس کے دو جواب دیے جا سکتے
ہیں۔ ہو چکی ہے یا نہیں ہوئی لیکن جب آپ بحیثیت
کرایہ دار تشریف لے جاتے ہیں تو اس جواب یا
سادگی جواب سے بات نہیں بنتی بلکہ یہ اس بات پر
منحصر ہے کہ گھر کے مالک کا زاویۂ نظر کیا ہے۔ ذات،
آمدنی اور شادی ــــ سوالات اس ترتیب سے کیے

تو خبردار، خطرہ ہے۔ مالک مکان آپ کو کرایہ دار نہیں رشتہ دار بنانا چاہتا ہے۔ یعنی کمرہ لینے کے لیے آپ کو داماد بننا پڑے گا لہذا جواب دینے سے پہلے ہوشیار اگر آپ کی شادی ہو چکی ہے تو بیوی جتانے سے مالک مکان ہچکچاتا نہیں۔ اس آڑے وقت جگہ پسند نہیں کہہ کر اپنی عزت بچا لینا اچھا۔ گھر کا مالک اگر کرایہ دار سے پہلی ملاقات میں اپنی دختر نیک اختر کی اوصاف شماری شروع کر دے تو اس بلائے بے درماں کو گلے لگانے سے بہتر ہے کہ فٹ پاتھ پر بستر لگایئے۔ بعض اوقات شادی شدہ ہونا مفید ہوتا ہے۔ صرف پیداوار بڑھی ہوئی نہ ہو لیکن شادی شدہ ہونا اور گھر ملنا لازم و ملزوم نہیں۔ کئی مرتبہ جگہ نہیں اس لیے شادی نہیں اور کہیں شادی نہیں اس لیے جگہ نہیں۔ اس قسم کے Dilemma سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔

مختصر یہ کہ دوسری جنگ عظیم نے جن اشیاء کو جنم دیا ان میں سب سے مشہور ایٹم بم ہے۔ مگر ایٹم بم کے بھی سر پر سوار ہو سکے ایسی شئے پگڑی ہے۔

انگریزوں کے بعد ایک طویل جدوجہد کر کے ہم نے پگڑی کے جس بھوت کا گلا گھونٹ دیا تھا وہ اس طرح ہماری گردن پر سوار ہو جائے گا یہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ رہا ہوگا۔

(مراٹھی سے ترجمہ)

تبصرہ

ن اطہر جاوید

مصنفہ: یوسف ناظم

عصرِ حاضر میں طنز و مزاح کو بلاشبہ خاصا فروغ حاصل
ہے. نظم میں بھی اور نثر میں بھی! اور وہ جو چند نام اُردو طنز و
ں میں نمایاں ہیں، یوسف ناظم ان ہی میں ایک ہے۔ یوسف ناظم
دو طنز و مزاح کو ندرت اور نکھار کا حامل بنا دیا ہے۔ اُردو طنز
ح میں جو روایت رشید احمد صدیقی اور مشتاق احمد یوسفی
ام کی ہے، یوسف ناظم اُسی کے امین ہیں۔ وہ اُن لوگوں میں
و اپنے مضامین کو لطیفوں کا شوکیس بنا دیتے ہیں۔ لطیفوں
ی ہنسا ضرور ہے لیکن یہ طنز و مزاح پیدا کرنے کا کوئی وقیع
ل دار فع طریقہ نہیں۔ طنز و مزاح میں رنگ و نور اور بانکپن تو
قت پیدا ہوتا ہے جب کہ فنکار واقعات اور لطیفوں سے نہیں
پنے اندازِ تحریر اور اسلوب سے کام لیتا ہے۔ تحریر تو سب کی ہوتی
ن اندازِ تحریر بہت کم کو نصیب ہوتا ہے۔ یہی وجہ طنز و مزاح
نگی اور طرحداری بہت کم کے حصّے میں آتی ہے۔

یوسف ناظم، خیر بسیار نویس تو نہیں، ہاں اُنھوں
ی نہیں لکھا ہے۔ اسی لیے اُن کی تحریروں میں ایک دلکش
ز توازن ملتا ہے اور چونکہ اُن کے ہاں فکر کی کار فرمائی بھی
ن کے طنز و مزاح میں ایک وقار اور عالمانہ انداز بھی پایا
ہے۔ وہ صرف طنز و مزاح کی خاطر اور صرف تفریح و دلچسپی کے
ں لکھتے بلکہ اپنے اطراف و جوانب اور احوال و کوائف کا جائزہ
ریں کو اُن کرتا ہیوں، خامیوں اور کجیوں کی سمت متوجہ
کرانا چاہتے ہیں جو معاشرے کو بدنما، بیمار اور نحیف و نزار بنا رہے
ہیں۔

"البتہ" یوسف ناظم کے مضامین کا نیا مجموعہ ہے اور
اُن ساری خصوصیات کا حامل، جو یوسف ناظم کے طنز و مزاح کو اپنے
بیشتر ہمعصر لکھنے والوں سے ممیز اور ممتاز کرتی ہیں اور خود اُردو طنز
و مزاح کو بھی۔ یوسف ناظم کے موضوعات بھاری بھر کم، متاثر
کرنے والے اور گمبھیر بھی ہوتے ہیں اور چھوٹے موٹے، معمولی اور بعض
تو قابلِ نظر انداز بھی، لیکن یوسف ناظم کا رویہ ان سب سے
اپنے انداز کا ہوتا ہے وہ ہر موضوع کو غیر معمولی پُرکشش، قدآور اور
متاثر کن بنا دیتے ہیں۔ کہیں کہیں وہ واقعات اور لطیفوں سے بھی
کام لیتے ہیں لیکن کہیں کہیں ہی اور بہت کم (مثلاً "البتہ" میں
مضمون! "کبھی ہم میں تم میں قرار تھا") ورنہ وہ تو بات بناتے،
بات میں بات پیدا کرتے، بات نہ بھی ہو تو بات کی صورت
نکالتے کبھی بات کو نیا موڑ دیتے، جملہ معترضہ سے کام لیتے۔ جملوں
کی ترتیب اور الفاظ کی نشست و برخاست کو نیا رنگ دیتے، کہیں
رُکتے، کہیں سنبھلتے اور آگے بڑھتے ہوئے وہ شگوفے کھلاتے،
پھلجھڑیاں چھوڑتے اور گلکاریاں کرتے ہیں کہ قاری تبسم بر لب،
فرحت و کیف اور سرور و نشاط کی نئی دنیا میں پہنچ جاتا ہے اور
تھوڑے سے غور و فکر کے بعد ایک کسک اور درد بھی اُس کے حصّے
میں آتے ہیں۔

"البتہ" میں پردیسی کے دو سفرنامے شامل ہیں مزاح
سے قاری لطف اندوز ہوگا ہی لیکن معاشرتی زندگی کو جس
باریک بینی کے ساتھ طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے اس کا جواب
نہیں چنانچہ طوالت کے باوجود، ان سفرناموں کی دلچسپی کم
نہیں ہوتی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بعض اوقات جب غور و فکر کی تہہ
دبیز ہو جاتی ہے اور صرف طنز کے وار ہوتے ہیں تو قدرے
سپاٹ اور پھیکا پن محسوس ہوتا ہے اسی کے ساتھ ان کے مضامین

ن حیدرآباد اور حیدرآبادی تہذیب کے حوالے اس شہر شوق کہ
یہ اُن کے عشق کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے یہ حوالے
اشارے اُن کی تحریروں میں "علاقائیت" کو راہ دے کر
ن کی قبولیت کے دائرے کو محدود کردیتے ہوں لیکن جو
ن حوالوں اور اشاروں تک رسائی رکھتے ہیں اُن کے لیے طنز و
ح دو آتشہ ہوجاتا ہے۔ ایسی تحریروں میں یہی خامی بھی
تی ہے اور یہی خوبی بھی ! اور لگ بھگ ہر فنکار کے ہاں
یسے عناصر ملتے ہیں۔ کسی کے ہاں کم اور کسی کے ہاں زیادہ۔

یوسف ناظم، کسی کو اپنے طنز و مزاح کا نشانہ بنانے
ے نہیں چوکتے۔ حتیٰ کہ اپنی ذات کو بھی۔ یہ غیر جانبدارانہ رویہ
س طور پر طنز و مزاح نگاروں کو فن کی رفعتوں سے ہمکنار کردیتا
ہے —— ویسے یوسف ناظم کا طنز نہ تو جارحانہ ہوتا ہے
ر شکاری۔ وہ بے حد خوش گوار انداز سے کام لیتے ہیں۔ "اصناف
ب کا دائرہ" "دولت خانہ" "بالائے طاق" "ہندوستانی
س" "تختی سے تختے تک" "شیرخرمے کے دو ایڈیشن" ——
ی بھی بڑے دلچسپ اور منتخب مضامین ہیں۔ "مقطع میں آپڑی
ہے سخن گسترانہ بات" طنز و مزاح سے ہٹ کر بھی ایک زاویہ
ے کلام غالب کا اچھا مطالعہ ہے۔ ان سے قطع نظر یوسف ناظم
ی خصوصی تحریریں ("البتہ" میں ان کا عنوان "مغز بچے" ہے)
لاآویز ہیں جن میں مزاح پر طنز کا پلہ بھاری ہے۔ اجمال نے
ن مضمونوں کے رنگ کو اور چوکھا کردیا ہے، پُرکشش اور دیاؤ
بن بھی۔ ان ہی مضمونوں سے چند اقتباسات درج ہیں۔

"غربت لاعلاج مرض ہے۔ اس مرض کا علاج کرنے
لے ڈاکٹر اپنی غربت دور کرکے سمجھتے ہیں سب کا بھلا ہوگیا۔"

٭ ٭ ٭

"آدمی کی تخلیق کو کتنے قرن گزر گئے اور آدمی آج
ں اشرف المخلوقات ہے۔ اتنے عرصے تک اشرف المخلوقات
بنے رہنا معمولی بات نہیں۔"

٭ ٭ ٭

"ڈاکٹر ہر ٹریٹمنٹ بعد اپنے ہاتھ دھولیتے ہیں۔ ہاتھ
پیچھے پڑنا اسے ہی کہتے ہیں۔"

٭ ٭ ٭

"ایک بچے سے پوچھا گیا۔" آدمیوں اور جانوروں
فرق بتاؤ۔ وہ پریشان ہوکر رونے لگا۔"

٭ ٭ ٭

"مردوں میں پیدائشی شاعر تو پیدا ہوسکتے ہیں لیکن
اُن کا پیدائشی مقرر ہونا مشکل ہے۔ پیدائشی مقرر صرف
عورتیں ہوتی ہیں۔"

٭ ٭ ٭

—— جناب مصطفیٰ کمال نے سلسلۂ مطبوعات زندہ دلان
حیدرآباد کے تحت "البتہ" کو، ہر زاویہ صاف ستھرے طور
پیش کیا ہے۔ قیمت دس روپے ہے۔ اِن ہی سے حاصل
کی جاسکتی ہے۔ ●

خرافات

(مراسلے)

٭ ٭ ٭

جناب مصطفیٰ کمال صاحب۔ تسلیمات۔

ایک عرصہ سے آپ کو خط لکھنے کی کوشش کرتا رہا ہوں مگر کچھ اس بلا کی سستی اور تساہل کی کیفیت چھائی رہتی ہے کہ دن ہفتوں میں، اور ہفتے مہینوں میں بدل جاتے ہیں۔ جبکہ میں آپ کو شگوفہ کے سالنامہ کی اشاعت پر جلد ہی مبارکباد کا خط لکھنا چاہتا تھا۔ سالنامہ واقعی بڑا شاندار ہے۔ اکثر و بیشتر شعراء اور لکھنے والوں کی تصاویر، حسبِ معمول معیاری مضامین اور میرے خیال میں کتابت بھی بہت عمدہ ہے۔

جناب عزیز صاحب آرٹسٹ کے ہم سب مشکور و ممنون ہیں انہوں نے اس سالنامہ کو ایک نئی چیز بنا دیا ہے۔ خاکسار کی طرف سے بھی اُن کو شکریہ پہنچا دیجیے۔ اُمید ہے کہ آئندہ بھی اُن کا تعاون آپ کو حاصل رہے گا ـــــ سب زندہ دلانِ حیدرآباد کی خدمت میں تسلیمات عرض کرتا ہوں۔

بھارت چند کھنہ
۱۴۱۔ سنٹرل ایونیو۔ نیو پراویڈنس
نیوجرسی۔ امریکہ

٭ ٭ ٭

٭ ڈیر سید مصطفیٰ کمال۔ سلام مسنون!

ماہ جون کا "شگوفہ" پڑھ رہا ہوں۔ شروع ہی ورق پر قیمت میں اضافہ کی خبر دیکھ کر دل کی رفتار ناشگفتہ ہو گئی۔ مگر شاید زمانہ کا یہ کرشمہ ہی تو ہے کہ اردو رسائل جتنی کم تعداد میں فروخت ہوتے ہیں اتنا زیادہ ان کی قیمتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔

مزاحیہ رسالوں میں سب سے زیادہ بکنے والا بلاشبہ "شگوفہ" واحد رسالہ ہے۔ اس کا معیار آپ اپنا مقام رکھتا ہے۔ اچھے اچھے فنکاروں کی تخلیق سے بھرپور ہر ماہ ذہن کو ایک نیا مزاح عطا کرتا ہے۔

ـ کریک چمپاولی

٭ ٭ ٭

٭ کل صبح ہی صبح کاگے نے صدا دی۔ میں نے بھی فوراً ہی بیوی کو ندا دی۔ ارے او اللہ کی بندی۔ دیکھو آج صبح ہی صبح کاگا بولا۔ جل کر رہ گئی وہ لاڈلی۔ کہنے لگی مارے گئے نرے گنوار دیہاتی کالج میں جو تم کو میں ایسا پاتی، تو کبھی نہ تم سے میں بیاہ رچاتی۔ ہم دونوں میں ٹھن گئی۔ کچھ ہی دور رہ گیا تھا پانی پت کہ ڈاکیہ آیا کیچڑ میں لت پت۔ "شگوفہ" اس نے چھوڑا اور میں نے بیوی کا گھیرا توڑا۔ ہم دونوں ہی من گئے۔ "تیر و تیشہ" اپنا دیکھا۔ جی خوش ہو گیا کہ پرچہ دیکھا۔

ابو الکلام ـ کلکتہ

٭ ٭ ٭

اپریل کے ٹائیٹل کی طرح اگر ہمیشہ ٹائیٹل پیج جاذب رہے تو شگوفہ لکھنے کی ضرورت شاید پیش نہ آئے گی۔ غالب خوند میری صاحب کو مبارکباد کہہ دیجیے گا۔

فاروق نشتر۔ گلبرگہ

قوم کی جانب سے آزادی کا

۳۵ واں سال

منائے جانے کے موقع پر

آندھرا پردیش

۲۰ نکاتی پروگرام کا

خیر مقدم کرتا ہے

جس سے ہماری اُمیدیں وابستہ ہیں

(جاری کردہ: ڈائرکٹر اطلاعات و تعلقات عامہ)

), 16822/68 Postal Regd. No. H. HD 6

SHUGOOFA

15 Copy 8 31 Bachelor Quarters, M. J. Market, Hyderabad-1 August 1982 Phone: 57716

IRAN
IRAQ
FALKLANDS
ISRAEL
LEBANON
SYRIA
حیدرآباد
شگوفہ
ماہنامہ
GOOD LUCK
ALL DACOITS WILL BE HELD WITHIN A WEEK
shoeb
SEPTEMER
Rs. 3-00

زندہ دلانِ حیدر آباد کا ترجمان

جلد ۱۵ ○ ستمبر ۱۹۸۲ء ○ شمارہ ۹

ایڈیٹر :
سید مصطفیٰ کمال

مجلسِ ادارت :
حمایت اللہ
منظور احمد
مسیح انجم
مینجر : سمیع جلیل

ٹائیٹل : شعیب

مجلسِ مشاورت
راجندر سنگھ بیدی
بھارت چند کھنہ
خواجہ عبدالغفور
نریندر لوتھر
مجتبیٰ حسین

قیمت فی پرچہ : ۳ روپے
زرِ سالانہ : ۳۰ روپے ، انفرادی ۲۵ روپے
بیرونِ ہند سے : ۹۰ روپے

کتابت : نعیم احمد ، مسعود انور ، رؤف
طباعت : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس حیدر آباد ۔۔۔۔

خط و کتابت کا پتہ : شگوفہ ۳۱ ، بیچلرز کوارٹرز ، معظم جاہی مارکٹ حیدر آباد ۵۰۰۰۰۱ فون 57716

اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

اڑیں گے پُرزے (تعارف)

مالِ مفت (انشائیے)

مالِ مسروقہ (ڈائجسٹ)

برق و شرر (مستقل کالم)

قاضی جی دُبلے (رپورتاژ)

چوُرن (نظمیں)

* — یوسف ناظم

"طنز و مزاح بدستِ شفقت"

یاد نہیں ان سے پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی لیکن اتنا یاد ہے کہ ان سے پہلی ملاقات کہیں نہ کہیں ضرور ہوئی تھی۔ شرقاً میں پہلی ملاقات کی کوئی اہمیت ہوتی بھی نہیں ہے یا یہ صرف اس صورت میں اہم ہوتی ہے جب ملاقاتوں کی جملہ تعداد ایک سے زیادہ نہ ہو۔ شفیقہ فرحت (جنھیں میں اپنا بھائی جانتا ہوں) کوئی ربع صدی سے تو میدانِ ادب میں سرگرمِ سفر ہوں گی ہی اور ابھی اپنی آبلہ پائی سے تھکی نہیں ہیں ——— ان سے غائبانہ تعارف ان کی ایک کلاس فیلو نے ۱۹۵۸ء میں کروایا تھا اور بڑی تعریفیں کی تھیں۔ میں اس وقت جل گاؤں میں تھا اور یہ شاید بھوپال میں تھیں۔ ذہن کے کسی گوشے میں ان کا نام ضرور تھا (میرے ذہن کے کئی گوشے ہیں جن میں سے اکثر خالی ہیں)۔ غائبانہ تعارف بھی تعارف ہوتا ہے اور اتنی ہی تکلیف دہ ہوتا ہے جتنا کہ روبرو والا تعارف ہوا کرتا ہے بلکہ غائبانہ تعارف میں خلش زیادہ ہوتی ہے۔ واضح رہے، ذہن نہ ہو کر انہیں

پڑھا۔ معلوم ہوا لکھتی کم ہیں اور چھپتی اور بھی کم ہیں۔ (پردہ نشینی نہ بھی ہو تو رہتی ہی ہے)۔ دو ایک مضمون پڑھنے کو ملے تو تحریر میں کچی کلیوں کی دبی دبی خوشبو کا احساس ہوا (یعنی ایسی خوشبو جو نتھنوں تک محدود رہے) خیال ہوا کہ شاید یہ وہی کلیاں ہوں گی جن کے بارے میں کسی شاعر نے کہا تھا ؎

بافشاں کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی

شفیقہ فرحت اپنی تحریر کو ایسے ہی ہلکے رنگوں میں ڈبو کر فوراً باہر نکال لیتی ہیں کہ کہیں رنگ زیادہ نہ چڑھ جائے

پتہ نہیں کنہیا لال کپور کبھی شفیقہ فرحت سے ملے تھے یا نہیں۔ انہیں اپنی نیم بدنی اور باریک تنی کا بڑا دعویٰ تھا اور وہ کہا کرتے تھے کہ ——— یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ وہ کیا کہا کرتے تھے۔

شفیقہ فرحت جو غالب کی اُستانی ہیں (یعنی کالج میں دیوانِ غالب پڑھاتی ہیں) ناتوانی کے سبب سے میں کنہیا لال کپور سے کئی قدم آگے ہیں۔ وزن کم کرنے کی

مشین پر کھڑی ہوتی ہیں تو مشین کی سوئی جنبش تک نہیں کرتی۔ کیا مجال جو ٹس سے مس ہو جائے۔

انگلستان میں چیمبرلین نے دُبلے پن میں شہرت حاصل کی تھی لیکن اُن کی شہرت کی وجہ یہ تھی کہ اُن کا مقابلہ چرچل سے پڑ گیا تھا (ہم معصروں میں یہی گڑبڑ ہو جاتی ہے)۔ چرچل نے اُنہیں اپنی نظروں سے دیکھا اور اپنے معیار سے جانچا تھا، یہ چیمبرلین یقیناً دُبلے نظر آتے ہوں گے۔ ہماری شفیقہ فرحت تو دُبلے لوگوں کو بھی نہیں نظر آتی ہیں اور وہ انہیں رشک بھری نظروں سے دیکھتے ہیں۔ سُنا ہے مدرسے میں پڑھتی تھیں تو حاضری کے رجسٹر میں ان کے نام کے آگے ہمیشہ 'غ' لکھ دیا جاتا تھا۔ کلاس میں بیٹھی ہیں اور دکھائی نہیں دے رہی ہیں۔ یہ بھی سُنا ہے ان کے مدرسے میں بلکہ کالج میں بھی، جب بھی طالبات کی آنکھوں کا معائنہ ہوتا اُن کے سامنے کوئی بورڈ نہیں رکھا جاتا تھا، شفیقہ فرحت کو کھڑا کیا جاتا تھا۔ یہ جسے بھی نظر آجائیں اُس کی بینائی معقول تسلیم کر لی جاتی تھی۔ شفیقہ فرحت، غالب اور اقبال کے دو مصرعوں سے بنی ہیں۔ غالب نے کہا ہے؎

ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

اور اقبال نے تو حسبِ معمول 'شکوہ' کیا ہے۔ ؎

بجلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

کچھ دنوں پہلے پاکستان کے سفر پر گئی تھیں (ٹکٹ بہرحال ان سے پورا لیا جاتا ہے)۔ بمبئی میں بڑے سے طیش (وہاں خوب میلا آیا) میرے گھر سے ایک پرچہ بھی لے گئی تھیں غالب نامہ لیکن کراچی کا خاص نمبر تھا۔ اب تک واپس نہیں ... میں نے ان سے کہا کراچی جا رہی ہیں تو مشفق خواجہ سے ضرور ملئے۔ غالب لائبریری جائیے۔ ایوان اُردو دیکھئے۔ مرزا ظفر الحسن اور خواجہ حمید الدین شاہد سے ملاقات ہو جائے گی۔ ان دونوں سے ملیں یا نہیں پتہ نہیں۔ مشفق خواجہ نے البتہ ان کی رسید ان الفاظ میں بھیجی۔

"کل صبح محترمہ شفیقہ فرحت تشریف لائیں۔ اُن سے مل کر بے حد خوشی ہوئی ایک تو اس لئے کہ وہ آپ کا خط لائی تھیں دوسرے اس لئے کہ اُن سے دیر تک ملاقات رہی۔ بہت ہنس مکھ اور خوش اخلاق خاتون ہیں۔ اُنہوں نے ازراہِ کرم اپنی تصنیف عنایت فرمائی۔ البتہ اُنہیں دیکھ کر اس بات کا افسوس ہوا کہ ہندوستان میں طنز و مزاح کا حال پتلا ہے ـــ اب میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں نے جاتے وقت ہی ان سے کہا تھا کہ وہاں موسم خواہ کوئی ہو چسٹر پہنے رہیں۔ نہیں سُنا۔ ڈرگئی ہوں گی کہ چسٹر پہن کر گر نہ پڑیں۔ گرتیں تو کیا ہوجاتا کم سے کم یہ شکایت تو سُننے میں نہ آتی ـــ لیکن کچھ ہو میرے بھائی شفیقہ فرحت نے یہ ضرور ثابت کر دیا کہ صحیح الدماغ ہونے کے لیے تندرست و توانا جسم ضروری نہیں ہوتا۔ یہ مردانہ وار جیتی ہیں۔ کوئی حادثہ کوئی ہنگامہ ان کے نزدیک پھٹک نہیں سکتا۔ آواز بھی ان کی اُستادانہ ہے یعنی ایسی ہے جیسی کہ اساتذہ حضرات کی ہونی چاہیئے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ ان کی آواز میں طالع یار خاں یا منصور علی خاں پٹوڈی کی آواز کی کھنک اور دھمک ہے لیکن ہے بہرحال کسی شیر ببر کی آواز۔ زندگی کو ایسی ہی آواز سے للکارا جا سکتا ہے۔"

ان کے بارے میں ایک بات البتہ تشویش ناک ہے۔

یہ بھی ، ناگپور کی اور بھوپال کا وطن تھا لیکن ہندوستان میں جہاں ہر قسم کی نقل و حمل اور نقل کا انتظام ہے وہیں نقل مکانی بھی بہت آسان ہے ۔ یہ ناگپور سے بھوپال چلی گئیں ۔ گئیں غالباً اُس وقت جب ناگپور مدھیہ پردیش سے جڑا ہوا تھا ۔ یہ اگر ناگپور ہی میں ٹھہر جاتیں تو آج ہم بھی کہتے کہ دیکھو یہ ہیں ۔ مہاراشٹرا کی واحد اکیلی اور اکلوتی مزاح نگار ادیبہ ۔ لیکن تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو ـــ انہیں مدھیہ پردیش نے اور خود انھوں نے مدھیہ پردیش کو اپنا لیا ـــ ان کی تصنیف " لو آج ہم بھی ..." وہیں کی اُردو اکادمی کی جانب سے اس اہتمام سے چھپی ہے کہ کتاب کو دیکھتے ہی جی چاہا ـــ اب جانے بھی دیجیے کہ کیا جی چاہا ـــــــــ تاہم یہ کوئی ایسی خواہش نہیں تھی کہ اس پر دم نکل جاتا ۔

کہتے ہیں مزاح نگاری کے لئے بڑے سلیقے اور رکھ رکھاؤ کی ضرورت ہے ۔ مزاح نگاری اصل میں احتیاط نگاری ہے اور اس لحاظ سے شفیقہ فرحت نے بڑی احتیاط سے کام لیا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے مزاح نگاری پر انھوں نے دستِ شفقت رکھا ہے ۔ اسے آگے بڑھانے کے لئے ڈھکیلا نہیں ہے ۔ تحریر میں نسوانیت کا پرتو ہے یہ نہیں کہ ڈھیٹ مردوں کی طرح بے محابا مکھی چلی جارہی ہیں ۔ آنچل کی اوٹ سے جھانکتا ہوا مزاح اور امریکی جارجٹ کی طرح ہلکا پھلکا طنز ۔ ان کی تحریر یت طنز نگارش کا خاصہ ہے ۔ خدا سے مخاطب ہوتی ہیں تو کچھ اس طرح ۔

" میں تجھے حاضر و ناظر جان کر وعدہ کرتی ہوں کہ اب کی شب معراج میں دس بارہ پیالی چائے پی کر میں بھی جاگوں گی اور تمام رات جاگ کر کرشن چندر کے افسانے یا فیض احمد فیض کی غزلیں پڑھنے یا جاگنے میں خواہ مخواہ کی بجائے خضوع و خشوع سے نمازیں پڑھوں گی ۔ سجدے میں سر رکھ کر کسی تازہ فلم کی ہیروئن کے بلاؤز کے سنے ڈیزائن کے متعلق نہیں سوچوں گی اور تسبیح پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آئندہ اتوار کو سہیلیوں کو دی جانے والی پارٹی کا مینو بھی نہیں بناؤں گی اور جب کسی دھارمک فلم کے پوتر سین کی طرح در و دیوار سے نور برسنے لگے گا اور جیسے ایوننگ ان پیرس کی شیشی کھولے ، سارا کمرہ بھینی بھینی خوشبو سے مہک اُٹھے گا اور سر خود بخود جذبۂ عبودیت سے سجدے میں جا پڑے گا یعنی وہ گھڑی آجائے گی جب میری ایک جنبشِ لب سے دنیا کی ہر نعمت میرے قدموں پر آسکتی ہے تو اے خدائے دو جہاں میں تجھ سے صرف یہ التجا کروں گی کہ مجھے میری روم میٹ سے نجات دے ۔"

مزاح میں تفصیل مشکل ہے اور اسی لئے اکثر مزاح نگار مختصر مختصر جملوں میں کام چلا لیتے ہیں لیکن شفیقہ فرحت اتنی سہل انگار نہیں ۔ وہ پھلجھڑی کی نہیں ، آتش بازی کے انار کی قائل ہیں ۔ یہ دیر تک روشنی دیتا ہے ۔

" اور لکھنا ناول کا ..... " پڑھیے اور داد دیجیے ۔ اس مضمون میں اُنھوں نے ذرا بے جگری دکھائی ہے ۔ بیہودگی کا بھی مظاہرہ کیا ہے لیکن مزاح کا دامن چھوڑا نہیں ہے ۔ کہتی ہیں ۔

" اگر ناول کو المیہ بنانا ہے تو فٹافٹ سب کے ہاتھوں میں ملکِ عدم کا ٹکٹ (حسبِ مناسب برتھ کے ساتھ) تھما دیجیے کہ کامیاب ترین ناول وہی ہے جس میں سب کا خاتمہ ہو جائے ۔ نتیجتاً پڑھنے والوں کا مرنا یقینی ہے تو نمونے بھی دیئے ہیں ۔ کون کہتا ہے اُردو میں ہیروڈی نہیں ہے

چے نہیں ہیں اور بہت خوبصورت پیروڈیاں ہیں۔

مجھے بہرحال یہاں اُن کا نمونۂ کلام نہیں پیش کرنا ہے کیونکہ میں سیلس مین نہیں ہوں اور نہ یہ ان کی کتاب کا اشتہار ہے۔ شفیقہ فرحت کی کتاب غالباً اس لئے اتنی خوبصورت اور دیدہ زیب چھپی ہے کہ یہ ۲۵ سال میں ان کی پہلی کتاب ہے ورنہ آج کل تو کتابیں لکھنا شروع کرنے سے پہلے ہی ایک ہی سال میں چھپ جاتی ہیں۔ اُردو کی کتابیں اور خاص طور پر مزاحیہ کتابیں آفسیٹ پر نہیں چھپا کرتیں۔ یہ آفسیٹ پر چھپی ہے۔ یہ خوش ذوقی ہی کی نہیں خوش حالی کی بھی علامت ہے۔ ۲۵ سال لکھتے رہنے کے بعد کتاب کے چھپنے کی وجہ شاید یہ بھی ہوگی کہ شفیقہ فرحت کا لکھا کوئی پڑھ ہی نہیں سکتا۔ اور ایک حضرت سکندر علی وجد ہیں جنھوں نے پوری 'بیاض مریم' بقلم خود لکھی اور ہر ورق کو دامانِ باغبان وکفِ گل فروش بنا دیا۔ یوں وہ چاہتیں تو خوش خط بن سکتی تھیں۔ نثر ہمیشہ بیٹھ کر لکھنی چاہیئے۔ شفیقہ فرحت نے ناگپور چھوڑا ہی اس لیے کہ وہاں کے کسی کاتب کی یہ جرأت نہیں ہوئی کہ ان کا ایک لفظ بھی صحیح پڑھ لے۔ خود بھوپال میں ان کی کتاب کی کتابت کے لئے ۳، ۴ خوشنویسوں کو مامور کرنا پڑا تب کہیں جاکر یہ مرحلہ طے ہوا۔ واجد علی خاں، محمد عمر خاں اور محمد الیاس انصاری صاحبان یہ تینوں خوشنویس جو دورانِ کتابت جس کرب سے گذرے ہوں گے یہ ان ہی کا دل جانتا ہے۔ کاش مصنفہ کا عکسِ تحریر بھی اس کتاب میں شامل ہوتا۔ میرے بیان کی تصدیق ہو جاتی۔ کاغذ بھی بہت نفیس ہے، روشنائی بنفشی ہے اور سرورق اُندہ آلو کے رنگ کا ہے

اس لئے کہ اس کتاب میں ایک مضمون حضرت آلو کے عنوان سے بھی شامل ہے۔ فضل تابش جو کہ مدھیہ پردیش اُردو اکادمی کے سکریٹری ہیں اپنے پیش لفظ میں اس توقع کا اظہار کرتے ہیں کہ اُردو حلقوں میں اس کتاب کی خاطرخواہ پذیرائی ہوگی۔ کیوں نہیں ہوگی۔ ہم تو سمجھے تھے کہ دقیع، خوبصورت اور دیدہ زیب کتابوں کی اشاعت میں ترقی اُردو بیورو حرفِ آخر ہے۔ لیکن یہ اکادمی تو چھپی رستم نکلی (شفیقہ فرحت کی رعایت سے)

اور ہاں شفیقہ فرحت شاعرہ نہیں ہیں لیکن انھیں اس کثرت سے شعر یاد ہیں کہ وہ پوری کی پوری کتاب مصرعوں میں لکھ سکتی ہیں۔ آئندہ یہی کریں گی۔

★★

نامور مزاح نگار

یوسف ناظم

کے مضامین کا مجموعہ

فقط

قیمت ۶/- روپے

بتوسط "شگوفہ"

پروفیسر آفاق احمد
بھوپال

دبی انکشافات

موجودہ دور کے بارے میں یہ ڈھول زور زور سے بجایا جارہا ہے کہ اسے ردّ و قبول کا دور کہا جائے مگر اس ڈھول میں پول یہ ہے کہ بجانے والوں نے اپنے چہروں پر نقاب ڈال رکھے ہیں اور یہ نقاب پوش دوسرے شعبوں کے علاوہ ادبی محاذ پر بھی شب خون مار رہے ہیں۔

ادب کے بارے میں نت نئے نظریئے عام کئے جا رہے ہیں۔ کہا جارہا ہے کہ آج کا انسان، مایوسی، ذہنی انتشار، تنہائی کے کرب اور اپنے وجود کے خول میں خود کو اس طرح گھرا پاتا ہے کہ وہ اپنی ذات کے حصار سے باہر نکلنے پر آمادہ نہیں ہے۔ اس کی اس بکھرتی خودی نے ہی ایک الجھی ہوئی گتھی میں تبدیل کر دیا ہے اور اگر وہ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے ادیب یا شاعر ہے تو اس کے ادب کو بھی ابلاغ و ترسیل کا ایک مسلسل المیہ بنا دیا ہے!

ادب پر جو بُرا وقت نازل ہوگیا ہے اور ذہن الجھے ہوئے ہیں کہ کس نظریئے کو ترک کریں اور کسے قبول کریں ——— کیا یہ بات مناسب نہ ہوگی کہ کوئی ایسا شخص جسے اپنی دانائی اور بینائی دونوں پر بھروسہ ہو اٹھے اور ان جالوں کو توڑ کر رکھ دے۔

مگر کیونکہ ہم ایسے دانا و بینا انسان کا پتہ چلانے میں ہنوز ناکام ہیں۔ اس لیے بغیر کسی تحقیق [illegible] بلکہ غلط فہمی کے سبب جو بارِ گراں ہے اسے اپنی ناتوانی کے باوجود اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں [illegible] [illegible] کا فریضہ سر انجام دینے کی سعی کرتے ہیں جس سے بہتوں کا بھلا ہوگا۔

ایک سوال جو ترقی پسندی پر برا وقت آنے سے لے کر جدیدیت کی نام نہاد لہر کے زمانے تک بار بار اٹھایا جا رہا ہے، وہ

"ادب میں جمود آگیا ہے؟"

ہم حیران ہیں کہ جب زندگی میں کوئی جمود نہیں ہے بلکہ وہ پہلے سے کہیں زیادہ تیز رفتار ہوگئی ہے — اتنی تیز رفتار کہ رشید احمد صدیقی کے الفاظ میں کوئی "مرکز گریز" ہی باقی نہیں رہا ہے — تو پھر ادب میں جمود بھلا کہاں سے وارد ہوگا؟ ہاں! جمود کسی شخص کا نام ہے تو یقین مانئے ہم کسی ایسے ذات شریف سے قطعاً واقف نہیں ہیں۔ اور نہ اُن کے مسکن کا اَتا پتا معلوم۔ ورنہ ان سے بہ نفسِ نفیس مل کر صحیح صورتِ حال کے بارے میں اِنٹرویو لے سکیں۔ لیکن جمود سے مراد وہی جمود ہے جس کا رونا ہمارے بعض ادبی "تحقیق کاروں" اور تنقید نگاروں کو ہے تو بڑے ادب کے ساتھ عرض ہے کہ جمود قسم کی کوئی شئے ادب میں موجود ہے البتہ بڑے بڑے لکھنے والے ضرور "منجمد" ہوگئے ہیں کہ انہیں دوسری ضروری مصروفیتوں یعنی فلموں، کمیٹیوں، جلسے، جلوس، پد ویوں کے حصول کے لیے بھاگ دوڑوں اور کرم خوردہ ذخیروں کی دیا نتوں سے صبح وشام گھرا رہنا پڑتا ہے تو وہ تخلیق کے لیے وقت کہاں سے لائیں۔ اس لیے وہ جمود کے نعرے لگا لگا کر یہ باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ مرغ کے بغیر صبح نہیں ہوتی ہے — مگر سچ بات تو یہ ہے کہ سورج کے ہوتے صبح کی دلیل کے لیے مرغ کی بانگ کی سند ضروری نہیں!

دوسرا اہم سوال یہ پوچھا جاتا ہے کہ:

"صحت مند ادب کی پہچان کیا ہے؟"

ہمیں اس استفسار کرنے والوں پر ترس آتا ہے کہ انہیں اتنی سی بات معلوم نہیں کہ جس ادب کو کوئی ڈاکٹر لکھے وہ صحت مند ہوا۔ البتہ اتنی احتیاط ضروری ہے کہ وہ ادیب نیم حکیم نہ ہو کہ اُسے خطرۂ جان کہا جاتا ہے اور اس کے نسخوں کو ادبی دائرہ سے باہر رکھا جائے۔

صحت مند ادب سے جُڑا ہوا ایک اور سوال ہے:

"مریضانہ ادب سے کیا مراد ہے؟"

ہمارے خیال میں اس اجمال کی تفصیل تو صحت مند ادب والے سوال کے جواب میں ہی موجود ہے۔ پھر بھی اگر تشفی نہیں ہوتی ہے تو وہ اطمینان سے ہر ایسی تخلیق بلکہ تحقیق اور تنقید کو مریضانہ ادب کے حساب میں ڈال سکتا ہے جسے بیار دوران لکھا جائے اور بیماری کے بارے میں اس نکتے کو دھیان میں رکھئے کہ وہ جسمانی ہی نہیں بلکہ ذہنی بھی ہوتی ہے اور آخر الذکر سے زیادہ خطرناک ہے کہ اس کے جراثیم ایک سے دوسرے کو اُڑ کر لگتے ہیں۔

سوال: "جدید ادب کے بارے میں کوئی پرانی کہاوت استعمال کیجئے؟"

جواب: "ہر چمکتی ہوئی چیز سونا نہیں ہوتی"

آخری سوال: "آفاقی ادب سے کیا مراد ہے؟"

جواب: کمال ہے کہ اتنی چھوٹی سی بات بھی نہیں معلوم! ہم آفاقی ادب سے قطعاً وہی سمجھتے ہیں جو سمجھنا چاہیئے۔ آپ نے سُنا ہوگا کہ ادب اپنے خالق کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ اس حساب سے کوئی بھی ادیب یا شاعر آفاقی ہو تو وہ جو ادب تخلیق کرے گا وہ آفاقی ہوگا۔

ممکن ہے آپ اسے فقط سمجھ رہے ہوں کہ اس بہانے میں اپنی تخلیقات کو آفاقی قرار دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہ بات نہیں! شاید اس لطیفے سے اس باریک نکتے کی تہہ تک آپ پہنچ سکیں۔

ایک امریکی اداکار نے عدالت میں بیان دیتے ہوئے خود کو امریکہ کا سب سے خوب صورت اور مقبول اداکار کہا۔ کسی نے اُس سے کہا آپ کو اپنے بارے میں اپنے مُنہ سے یہ تعریفی الفاظ نہ کہنا چاہئے تھے۔

وہ بولا: "آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں خود اسے پسند نہیں کرتا۔ مگر کیا کروں، میں نے سچ بولنے کا حلف جو اٹھایا ہے!!"

▲▲

مضطر مجاز

کہہ مُکرنیاں

(نذرِ حضرت امیر خسروؒ)

[یہ صنفِ سخن طوطئ ہند حضرت امیر خسروؒ کی ایجاد ہے جو دو سہیلیوں کے درمیان ایک پُر لطف مکالمہ ہے۔ ابتدائی تین مصرعوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ محبوب کے بارے میں کہا جا رہا ہے لیکن بات کچھ اور ہی ہوتی ہے، کہہ کر مُکر جانے کی وجہ سے اس میں مزاح پیدا ہو جاتا ہے۔]

تن من میں اک آگ لگا دے
آنکھیں، گال، بدن دہکا دے
ڈھیلے کر دے انجر پنجر
اے سکھی ساجن؟
نا سکھی فیور! (FEVER)

⊙

جیون کے سب بھید وہ کھولے
بستر میں بھی ساتھ وہ ہو لے
ہاتھ نہ چھوڑے نیند آنے تک
اے سکھی ساجن؟
نا سکھی پُستک!

⊙

گال چھوئے، پیشانی چومے
لپٹا لپٹا ساتھ ہی گھومے
ساتھ نہ چھوڑے اک پل اک تل
اے سکھی ساجن؟
نا سکھی آنچل!

⊙

تب بھر جاگے اور جگائے
کانوں میں کچھ کہتا جائے
سونے دے پل بھر کو نہ شب بھر
اے سکھی ساجن؟
نا سکھی مچھر!

⊙

پہنچا پکڑے، ہاتھ مروڑے
پکڑے ہاتھ تو ہاتھ نہ چھوڑے
دُکھ دُکھ جائے کلائی پاپن
اے سکھی ساجن؟
نا سکھی کنگن!

دیدۂ بینا نہ ہوا

رؤف خوشتر، ایم اے
(گوجرہ)

اپنے مختصر دورِ عروج کی بنا پر طوائف اور سیاست داں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں اس لیے اگر اوّل الذکر اپنی
ل اور آخر الذکر حسین وعدوں سے سادہ لوح انسانوں کی چاہت اور دولت لوٹ رہے ہیں تو کیا بُرا کر رہے ہیں۔ طوائف
جاب دکھلا کر نوٹ اور سیاست داں خواب دکھلا کر ووٹ حاصل کرتے ہیں ــــ فی زمانہ نوٹ اور ووٹ کا بہت قریبی رشتہ
جمہوریت کے دو پہیے ہیں۔

بعض منچلے اور باریک بیں اخباری نامہ نگار یہ سوال کر بیٹھتے ہیں کہ حسینائیں کاجل اور سیاست داں گاگل (سیاہ چشمہ)
سے آراستہ کیوں ہوتے ہیں؟

اب انہیں کون سمجھائے کہ کاجل سے لوٹنے اور گاگل سے چھپنے کا کام لیا جاتا ہے۔

ہمارے ایک قریبی دوست نے جو وزیر کے پی۔ اے ہیں بتلایا کہ وزراء چونکہ بہت حساس، نرم دل اور مخلص ہوتے ہیں۔
سیلاب کی تباہ کاری، فسادات سے خون کی گلکاری دیکھنے کی تاب نہیں رکھتے۔ چنانچہ ان کے ماہرِ چشم ہمیشہ سیاہ چشمہ پہننے کا
مشورہ دیتے ہیں۔ اب حاکم و محکوم کے درمیان شیشے کی دیوار حائل ہے۔ یہ معروف وزراء کبھی کبھار وقت نکال کر جب اپنے حلقہ
انتخاب کا دورہ کر کے پریس کانفرنس میں اپنے تاریخی و تاریکی (سیاہ چشمہ کی بدولت) دورہ کا نچوڑ پیش کرتے ہیں

سُنتا ہوں بڑے بورے افسانۂ بستی

معلوم ہوا کہ سیاستداں ہمہ وقت سیاہ چشمہ عوام کی غضبناک نگاہوں سے چھپنے اور دانشور اپنی بارعب نگاہوں سے عوام
کو ڈرانے کے لیے پہنتا ہے ـــ قومی و بین الاقوامی کانفرنس ناکام ہونے کی ایک صاف وجہ ہمیں نظر آرہی ہے۔ کانفرنس میں
مندوبین اپنی آنکھوں پر موٹے موٹے سیاہ چشموں کی نقاب لگائے بیٹھے ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ اقوام متحدہ میں مندوبین کی شرکت
مشروط ہونی چاہیے کہ وہ کھلی آنکھیں (اور کھلے ذہن) کے ساتھ شریک ہوں۔

موجودہ نظامِ حیات چشم پوشی و سیاہ چشمی کے سہارے چل رہا ہے۔ اہلکار افسروں کی، اعلیٰ افسران، وزیروں کی وجہ

...وں کی لغزشوں، خامیوں اور کوتاہیوں کی چشم پوشی کر رہے ہیں تو دوسری طرف افسران اپنے ماتحتین سے، وزراء عوام سے ...
نوجوان اپنے والدین سے طوطا چشمی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ معاشرہ کا ہر فرد اس دور میں ان دو مخالف رویوں میں مبتلا ہے۔ و...
...مقصد سے چشم پوشی اور کمزوروں سے طوطا چشمی کا برتاؤ کر رہا ہے۔

اگلے وقتوں میں لوگ کھلی آنکھیں رکھتے ہوئے بھی دوسروں کی کمزوریوں اور غلطیوں سے چشم پوشی کرتے تھے۔ اب ہم
آنکھیں بند کرکے (چشمہ پہن کر) دوسروں کی کمزوریوں اور غلطیوں کی تاک میں لگے رہتے ہیں اور معاشرے میں ان کی تشہیر کرتے
رہتے ہیں — اب عینک والے بھی عینکوں میں سیمابی صفت لا رہے ہیں۔ فوٹوسن شیشوں میں یہ گرگٹی صفت پائی جاتی
...چھاؤں میں سفید اور دھوپ میں سیاہ رنگ لاتا ہے۔ ایسے نمبردار چشمہ پہننے کا چلن اب عام ہوتا جا رہا ہے۔

ہمارے پڑوسی مرزا ودود کو دھوپ چھاؤں کا چشمہ پہنے دیکھا تو ہمیں تعجب ہوا۔ کیونکہ نہ تو وہ سیاستدان ہیں ا...
...ان کا شمار دانشوروں میں ہوتا ہے۔

ہم نے اُن سے اس گرگٹی صفت چشمہ آنکھوں پر لٹکانے کی وجہ دریافت کی۔ تو کہنے لگے۔

" میاں سچ بات تو یہ ہے کہ جب بھی آئینہ دیکھتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ آنکھوں کا پانی مرگیا ہو۔ نفسیات پر کتاب
لکھ کر اور عصری شاعری سُن کر ذات کا کرب اُبھر کر آگیا ہے۔ اس لیے اپنے آپ سے چھپنے کے لیے چشمہ خریدنا پڑا۔ اور ...
...س نقاب سے فائدے ہی فائدے ہیں — آپ اسے پہن کر سب کو دیکھ رہے ہیں۔ مگر کوئی یہ نہیں دیکھ پاتا کہ آپ
کہاں دیکھ رہے ہیں۔ اس طرح آپ اپنی نصف بہتر کے ہمراہ ہوتے ہوئے بھی آزادی سے دیدارِ عام کا لطف اُٹھا سکتے ہیں۔ ...
...ٹالنا ہو یا کسی سے کترانا ہو۔ سلام سے بچنا ہو تو یہ چشمہ کارآمد ہے۔ مفلوک الحال دوستوں (گرانی کے سبب ایسے دوستوں ...
تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے) چندہ خواہوں اور قرض خواہوں سے بچنا ہو تو یہ چشمہ آنکھوں کا نقاب ہو کر ان کی آنکھوں پر ...
ڈالتا ہے۔ ہوٹل میں داخل ہونے سے پہلے ہوٹل کے محل وقوع کا جائزہ لیتے ہوئے چشمہ آنکھوں پر سجائے محتاط انداز میں
ہوٹل کی طرف بڑھیے۔ خدانخواستہ کوئی شناسا مل جائے تو ساحر مرحوم کے گیت کا ٹکڑا ع چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم ...
گنگناتے ہوئے ہوٹل میں داخل ہو جائیے۔ بصورت دیگر وہ آپ کے ہمراہ ہوٹل میں آپ کے ساتھ ہوگا۔ اور آپ پھر ساحر [illegible]
کیجیے۔ ع اُن کا بھی بل ہے اپنا بھی بل ہے۔ اب پرس بچنے کی اُمید کم ہے۔
اس دور میں مادی ترقی و خوشحالی کے لیے چشم پوشی و طوطا چشمی جیسی صفات سے لیس ہونا ضروری ہے۔ اس دھوپ چھاؤں
چشمہ میں یہ دونوں صفات چھپی ہوئی ہیں۔ اس سے آپ اپنے محسن و مربی سے آنکھ چرا سکتے ہیں اور ضرورت مندوں سے آ...
بچا سکتے ہیں۔"

مرزا کی یہ باتیں سن کر ہماری آنکھیں کھل گئیں۔ عصری تقاضوں کو پورا کرنے اور چشم پوشی و طوطا چشمی کا مظاہرہ
کرنے کے لیے ایسا چشمہ لگانا ضروری ہوگیا۔

ہم بھی موسم و حالات کے تحت رنگ بدلنے والا چشمہ خریدے۔ سچ مانیئے تب سے دوستوں، فقیروں اور چندہ
حضرات سے بچنے لگے ہیں۔

اور تو اور پچھلے دنوں ہم نے بازار میں خسر صاحب کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ مگر وہ جہاں دیدہ تھے۔ ہماری یہ حرکت اُن کو آنکھ نہ بھائی۔

مکان آکر بیگم صاحبہ کے سامنے شکایت کر دی اور کہا کہ تمہارے میاں تو مجھے اور چند خواہ حضرات کو یک آنکھ سے رہے ہیں۔ یہ سیاہ نقاب صرف سیاستدانوں کے لیے مناسب ہے۔

گویا ہمارا چشمہ پہننا اُن کے نزدیک ______
کھیل لڑکوں کا ہوا، دیدۂ بینا نہ ہوا۔

— ** —

نقیت اعظمی
(دھولیہ)

التجا ایک شاعر کی!

ہم کون ہیں اور کیا ہیں کچھ اس کی خبر نہ تھی
یوں تو ہمارے شعر و سخن تھے عروج پر
اب تو ہماری فکر پہ ایمان لائیے
الہام کیوں نہ کہیئے ہمارے کلام کو
چپ بیٹھ سکے نہ سنئے ہمیں داد دیجئے
آپ اپنا "عہدِ پیری" ابھی بھول جائیے
سمجھے نہ سمجھے کوئی مگر ہے یہ التجا
ہر اک مشاعرہ کی صدارت ہمیں ملے

کل تک ہمارے فن پہ کسی کی نظر نہ تھی
شہرت خود اپنے شہر میں اپنی مگر نہ تھی
اقبال و میر کیا تھے سب بھول جائیے
رسوا کریں گے ہم بھلا حافظ کے نام کو
ہیں ہاتھ بے قرار ہمارے "سلام" کو
دیوان شاعری کا ہمارا چھپا دیجئے
بکواس ہی سہی لئے پڑھئے پڑھائیے
آخر میں شعر پڑھنے کی دعوت ہمیں ملے

سب مل کے واہ واہ کریں تو پھر اے نقیت
شہرِ سخن میں شہرت و عزت ہمیں ملے

رشید عارف
فینانس ڈپارٹمنٹ (اکاؤنٹس) پٹنہ ۸۰۰۰۱۵

جنگل کا چلن چھوڑنا بغاوت اس کو کہتے ہیں
نئے FASHION کو اپنایا رعایت اس کو کہتے ہیں

کلب میں اور ہوٹل میں لٹا دی باپ کی دولت
یہی GENEROSITY ہے اور سخاوت اس کو کہتے ہیں

نظر کے سامنے انجام ہے فرہاد و مجنوں کا
EVEN THEN, I LOVE YOU MUCH حماقت اس کو کہتے ہیں

مکان گروی اثاثہ NIL علاوہ CASH قرضے بھی
کہیں گے کل مرے بچے وراثت اس کو کہتے ہیں

مجھ سے دن آئے جب برے تو تھے جتنے رفیق اپنے
ہوئے سب OUT OF SIGHT رفاقت اس کو کہتے ہیں

تمہاری گالیاں سن کر بھی میں ہنستا رہا دیکھو
TRUE LOVE اس کو کہتے ہیں شرافت اس کو کہتے ہیں

اخبار

صابر بہاری
ہاشمی خانہ، رانچی ۸۳۴۰۰۲

دُم نہیں لنگور جیسی پھر بھی میں دُم دار ہوں
"مجھ کو پڑھ لو، میں تمہارے ملک کا اخبار ہوں"

بسکہ ہے مطلب پرستی "ازم" میرا روز و شب
جیسے بلّی کی نگاہوں میں ہو چھیچھڑے کی طلب

گرگٹ ہی مرے کردار کی بنیاد ہے
جھوٹ سازی میرے خوں میں کشتۂ فولاد ہے

سچ کو سچ کہہ دوں تو میرا کام چل سکتا نہیں
یعنی بے تیغی سے یہ حجام چل سکتا نہیں

آگ پانی میں لگانا میرا ادنیٰ کام ہے
سنسنی خیزی میں میرا سوڈا واٹر نام ہے

میرے آقا دن کو ہی جب رات فرمانے لگیں
کیوں نہ مجھ کو دن میں پھر تارے نظر آنے لگیں

رخ ہوا کا دیکھ کر اس سمت مڑ جاتا ہوں میں
وقت کی ہے بات ابن الوقت کہلاتا ہوں میں

غیر چلتے ہیں جسے شطرنج کی وہ چال ہوں
سیٹھ دھنا مل، گھسیٹا رام کا [illegible] ہوں

جی میں جب آتا ہے بے پر کی اڑا دیتا ہوں میں
فرقہ وارانہ سیاست کو ہوا دیتا ہوں میں

کیا کروں بے بس ہوں میں مجبور ہوں لاچار ہوں
"مجھ کو پڑھ لو میں تمہارے ملک کا اخبار ہوں"

سید نثار احمد
دوم

ایواہ

ہمیں گمان اغلب بلکہ یقین محکم تھا کہ جیسے ہی ہم سرزمین عرب پر قدم رنجہ فرمائیں گے عربی گفتگو کرنا بھی شروع کر دیں گے۔ ویسے بھی ہمیں اپنی عربی دانی پر کچھ زیادہ ہی فخر تھا۔ بلکہ کبھی کبھی اپنی گردن بھی اکڑا لیتے تھے' یہ اور بات ہے کہ گردن سیدھی کرنے کے لئے ہمیں کسی ڈاکٹر سے رجوع کرنا پڑتا تھا عربی سیکھنے کے لئے کافی پاپڑ بیلنا پڑا تھا۔ ضرب یضرب کو طوطے کی طرح رٹنا پڑا تھا۔ واحد جمع کے ساتھ تثنیہ کو بھی اپنے حلق سے اتارا تھا۔

مگر ہمارا یہ خواب کہ ہم عربی فرفر بولنا بھی شروع کر دیں گے' شرمندۂ تعبیر ہو سکا۔ ہم پر پہلا وار ہی اتنا شدید تھا کہ ہم سنبھل نہیں سکے تھے۔

ائیرپورٹ پر ہمارے ایک عزیز دوست نے جو ہمیں ریسیو کرنے کا اخلاقی فریضہ ادا کرنے کے لئے موجود تھے ازراہ محبت ہمارا تعارف اپنے فلسطینی ڈرائیور سے کرا دیا۔ انہوں نے خیریت پوچھی۔ ہم نے بڑے ہی قرأت کے ساتھ "الحمدللہ" کہا۔ ہمارے اس "الحمدللہ" پر ڈرائیور نے کافی تعجب سے ہمیں دیکھا۔ اب راستہ بھر ہمارے دوست ڈرائیور سے کچھ پوچھتے رہے اور وہ جواب میں "ایواہ" کہتا رہا۔ اور ان کی باتوں پر ہمارے کرم فرما بھی ایواہ کہتے رہے۔ اور ہم حسرت کی صورت بنا کر ادھر ادھر تکتے رہے۔ آخر ہم سے رہا نہ گیا۔ ہم نے اپنے دوست سے پوچھ ہی لیا یعنی آخر یہ ایواہ کیا بلا ہے۔ فرمانے لگے یہ ایک گرگٹ جیسا لفظ ہے ان کے تم اس لفظ کو کسی طرح [illegible] ہے۔ ہمیں یہ لفظ اتنا پسند آیا کہ اب ہم اس سے اتنے مانوس

ہو گئے کہ "ایواہ" اب ہمارا تکیہ کلام بن چکا ہے اور ہر برمحل و بے محل موقع پر یہی ہمارا ساتھی ہے اپنے حیدرآبادی "ہو" کا صحیح نعم البدل بھی ہے۔

ہمارا دوسرا مرحلہ عرب دوستوں میں گھل مل جانے کا تھا۔ سب سے پہلے سابقہ پڑا۔ مقامی عرب ساتھیوں سے جو "ایواہ" سے زیادہ "نعم" کو ترجیح دے رہے تھے۔ اب ہم ذرا ماحول سے مانوس ہو چلے تھے۔ عربی فر فر بولنے کا خواب چکنا چور ہو چکا تھا۔ ہم کچھ کہتے تو ہمیں خود ہی لگتا کہ جیسے کتاب پڑھ رہے ہیں۔ اب ہمیں شدت سے احساس ہونے لگا کہ مقامی لہجہ اور مقامی بولی بھی سیکھنی پڑے گی۔ مقامی بولی سیکھنے کے چکر میں ہم خود ہی گھن چکر ہو کر رہ گئے۔ یار لوگوں نے مشورہ دیا کہ ٹی وی دیکھنا شروع کرو تو شاید کچھ سیکھ سکو گے۔ اب ہم عربی ڈرامے بھی حلق سے اتارنے کی کوشش کرنے لگے۔ جس میں ہیروئن ہر لڑکی تھوڑی تھوڑی دیر بعد روتے رہنا اپنا پیدائشی حق تصور کرتی ہے۔ ڈرامے سے تو کچھ پلے نہ پڑا، ہاں البتہ خیریت دریافت کرنے کا انداز سیکھ گئے۔ ہم نے دیکھا کہ دو عورتیں آپس میں خیریت دریافت کر رہی ہیں۔ ویسے یہ انوکھی بات نہیں عورتیں بھی کبھی کبھی خیریت دریافت کر لیتی ہیں۔ ہم نے تو کئی عورتوں کو الوداع کہتے وقت بھی خیریت دریافت کرتے دیکھا ہے۔ بہرحال ہم نے دیکھا پہلی عورت نے خیریت پوچھی۔ جواب میں کچھ حیدرآبادی "جاتیچ" "اتیچ" قسم کی زبان سننے کو ملی۔ فرمایا گیا "اللہ یسلمچ" "اللہ یعافیچ" وغیرہ۔ ادھر ہم حیران کہ "اچ" عربی میں کہاں سے آ کودا، گمان ہوا کہ ہو نہ ہو یہ اپنے حیدرآبادیوں کی ہی کارستانی ہوگی۔

بہرحال ہم نے اس "اچ" پہ دوسرے دن تجربہ کرنے کی ٹھانی اور ایک صاحب کو جواباً عرض کر دیا "اللہ یسلمچ" موصوف مسکرانے لگے۔ دریافت کرنے پہ کہنے لگے کہ "چ" یہ عورتوں کے لئے مخصوص ہے۔ اور ہم خجل سے ہو کر رہ گئے۔ پھر سوچا چلو عورتوں پہ ہی آزمایا جائے۔ آفس میں فلسطینی، شامی، مصری لڑکیاں کام کرتی ہیں۔ مصری لڑکی کے دریافت حال پہ ہم نے فوراً رٹا ہوا فقرہ دہرا دیا کہ "اللہ یسلمچ" اب منہ کا وہ فوارہ چھوٹا کہ ہم شرم سے پانی پانی۔ پتہ چلا کہ مصریوں اور شامیوں میں یہ انداز نہیں ہے۔

اب ہم محتاط ہو چکے تھے۔ کیف الحال کے جواب میں صرف الحمدللہ پہ ہی اکتفا کر لیا۔ مگر جیسے جیسے مختلف علاقوں کے عربوں سے سابقہ پڑتا گیا انداز بھی بدلتا گیا۔ پھر کیف حالک کا پوسٹ مارٹم کرنے والوں میں شامل ہو کر ہم بھی کیفک کہنے لگے۔ مقامی حضرات سے ملتے تو صرف شونک پہ اکتفا کرتے۔ ہمارے ایک تیونسی دوست جب بھی بات شروع کرتے تو "لاباس" سے شروعات ہوتی۔ ہم نے سمجھا کہ لاباس شاید ان کے دوست کا نام ہوگا مگر جب وہ ہر کس و ناکس کو لاباس ہی کہتے گئے تو ہمارا ماتھا ٹھنکا۔ آخر پوچھ ہی لیا کہ یہ لاباس کیا آپ کے کسی دوست کا نام ہے۔ ہنس کر فرمانے لگے کہ یہ تیونس کی مقامی عربی ہے جس کا مطلب ہے کہ کیسے ہو۔ یعنی پھر وہی "کیف الحال" اور ہم سے خیریت پوچھا ہوتا تو بڑے پیار سے

سید مصطفیٰ تاج
(بھوپال)

پیٹرو ڈالر

کتنا خوبصورت نام ہے، جیسے اپنی محبوبہ کا نام، جیسے کسی صحیفہ کا نام، جیسے قارون کے خزانے یا الہ دین کے چراغ کا نام، پیٹرو ڈالر، جیسے برلا ٹاٹا کا نام، جی چاہتا ہے اس نام کو ٹکڑے ٹکڑے کر دوں کتنا عجیب نام ہے۔ اس نام کے ٹکڑے کر دو پھر بھی اس کی طاقت برقرار رہتی ہے۔ پیٹرول جو ساری دنیا کا چکہ جام کر سکتا ہے۔ ڈالر جو دنیا کی اقتصادیات تباہ کر سکتا ہے۔ یہ سکندر کی تقدیر کی طرح ساری دنیا پر چھا گیا ہے۔ اگر پیٹرو ڈالر کا نام شباب آور گولی رکھا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ اس کے استعمال سے شباب انگ انگ سے پھوٹنے لگتا ہے۔ گردن میں تناؤ چہرے پر سرخی آنکھوں میں چمک، سینے پر ابھار، چال میں وقار کے ساتھ ساتھ پسینہ تک میں قارون کے سینٹ کی خوشبو مہکتی ہے۔ ان لوگوں کی خوشحالی دیکھ کر اب تو اللہ سے رات دن ایک ہی دعا مانگتے ہیں کہ اللہ سب پر پیٹرو ڈالر کی بارش کر دے اور سب کے صدقے میں مجھ گنہگار کو بھی نہلا دے (آمین)

صاحب قدریں بدل گئیں، پہلے زمانے میں ماں باپ اپنی اولاد کے لئے دعا کرتے تھے کہ خدا ان کو علم کی دولت سے مالا مال کرے، انکو انجینئر بنا دے۔ ڈاکٹر بنا دے، کلکٹر بنا دے، لیکن صاحب یہ پیٹرو ڈالر سب پر ہی بھاری ہوگیا۔ آج کے ماں باپ کے منہ سے تو صرف ایک ہی دعا نکلتی ہے کہ اللہ میرے بچے پر بھی پیٹرو ڈالر کی بارش کر دے چاہے اسے ڈرائیور ہی بنا دے۔ کیونکہ صاحب پیٹرو ڈالر دولت کے ساتھ ساتھ عزت بھی دیتا ہے! ڈاکٹروں اور انجینئروں کے پاس کیا رکھا ہے۔ تھوڑی بہت عزت اور میاں جن کے پاس دولت ہے، اس کے سامنے بڑے سے بڑے ڈاکٹر انجینئر ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔

ابھی کل ہی کی بات ہے نصیبن لیا کا لڑکا مجو (جو اب فضل الرحمٰن انصاری کہلاتا ہے) عرب میں کسی شیخ کی گاڑی پر ڈرائیور ہے۔ وہ عرب سے واپس آیا تو اس کے دوستوں نے اسے ہوٹل میں لے جا کر بڑی اور چودہ سو کی چائے پلا دی۔ جس سے اُس کے حلق میں خراش پیدا ہوگئی۔ پہلے تو اسے شک ہوا کہ شاید

[illegible] ان سگریٹ پینے کی وجہ ہو لیکن جب برنی کا خیال آیا تو اسے اپنے دوستوں پر بہت غصہ آیا' جلانے کے
الابلا کھلا دیتے ہیں۔ یہ انصین دوڑی ہوئی گئیں اور حکیم صاحب سے جوشاندہ لکھوا لائیں۔ لیکن انصاری صاحب
نے گھر میں پینے سے انکار کر دیا اور کھڑے دم ٹیکسی بھیج کر ڈاکٹر کو بلا لیا۔ قریب سعودیہ کی دعائیں لکھوائیں
یہ ہوا ہے پیٹرو ڈالر کی طاقت' ایک ہمارے یہاں کے نوٹ ہیں' جس کے پاس جاتے ہیں' بس اسی کے ہو رہتا
یا پھر [illegible] کا تو نام ہی نہیں لیتے' کیا کہا! ان کی وفاداری کا مرتے وقت بھی سینے سے چمٹے رہتے ہیں۔ ایک پیٹرو
ڈالر ہیں' جو عشق و مشک کی طرح چھپائے نہیں چھپتے۔

بڑی سے بڑی محفل میں اگر ایک پیٹرو ڈالر آ گیا تو اس کی موجودگی کا احساس اس کے بدن سے پھوٹ پھوٹ
کر [illegible] والی فارن کے سینٹ کی خوشبو سے پوری محفل کو ہو جاتا ہے اور ہر طرف سے پیٹرو ڈالر' پیٹرو ڈالر کی آوازیں آنا
[illegible] اس کی طرف سانس لے کر اس طرح آتی ہیں' جیسے بھوتوں کی محفل میں آدم زاد کی موجودگی کے احساس
کے بعد مانس گندھ مانس گندھ کی آوازیں!! پیٹرو ڈالر کو اپنا تعارف کرانے کی ضرورت نہیں' صرف فارن کی
سگریٹ یا گیس کے لائیٹر سے جلا لینا ہی کافی ہے۔ بڑے فیاض ہوتے ہیں یہ استاد پیٹرو! اسپیٹ تو پانی کی طرح
جسم پر [illegible] جلتے ہیں۔ اگر ایسی فیاضی اپنے یہاں کا کوئی [illegible] کرے تو لوگ اسے رشوت خور اور اس کی
کمائی کو حرام کی کمائی کہتے ہیں اور اللہ کے یہاں بھی سانپ بچھو اس کے پیٹ میں اترنے کو تیار بیٹھے رہتے ہیں۔

اور استاد پیٹرو! ایسے میاں! ان کی تو دنیا میں بھی چاندی اور عقبیٰ میں بھی چاندی' دنیا میں بھی گلچھڑے
پر عمل رہتے ہیں اور اللہ کے یہاں بھی فرشتے ان کو ہار پہنانے کے لئے تیار کھڑے رہتے ہیں۔ کیونکہ ایک سے زائد
حج کے سرٹیفکیٹ ان کی جیب میں رکھے رہتے ہیں۔ وہاں دیکھنا جیسے یہ دنیا میں FINE ، OK بولتے ہیں' اللہ
کے یہاں بھی ہر ملاقاتی سے یہی بولیں گے۔ ایک حساب سے دیکھا جائے تو یہ استاد پیٹرو تو اپر کلاس کے جنتی ہیں
کیونکہ کعبہ کا طواف روزی اس طرح کر لیتے ہیں۔ جیسے جامع مسجد کے کبوتر چوک کا چکر لگا لیتے ہیں۔ بڑے خوش
قسمت ہیں یہ لوگ جن کی دنیا بھی فائین اور جنتی بھی فائین!

پہلے زمانے میں لوگ حج کر کے آتے تھے تو لوگ ان کو بڑی عزت' احترام اور رشک کی نگاہ سے
دیکھتے تھے اور دل ہی دل میں دعا کرتے تھے کہ خدا ان کو بھی کعبہ کی زیارت کرا دے۔ ان حاجیوں کے قریبی
رشتہ دار اپنے دوستوں کو ان کے سفر کے قصے بالکل آنکھوں دیکھے حال کی طرح بیان کرتے تھے۔ ان کے لائے
ہوئے تحفے' زم زم' تسبیح' کھجور وغیرہ دکھاتے تو لوگ حیرت و تقدس کے ملے جلے جذبات سے ان متبرک
چیزوں کو دیکھتے' احترام سے ان کو آنکھوں سے لگاتے' ہونٹوں سے چومتے... لیکن صاحب ان استاد پیٹرو
تو ان حاجیوں کی عزت بھی کم کر دی۔ کیونکہ پہلے کے حاجی تو صرف میدان عرفات اور منیٰ کے قصے ہی بیان
کرتے تھے لیکن آج کا استاد پیٹرو تو ان مقامات کی چلتی پھرتی تصویریں اور اذان نماز کی آوازیں تک سنا
دیتا ہے اس لئے استاد پیٹرو کی عزت موسمی حاجیوں سے زیادہ ہے!

صاحب ایک بات اور ہے حاجیوں کو تو خدا نے صرف اتنی مراعات بخشی ہیں کہ وہ شیر خوار بچے کی طرح پاک ہو جاتے ہیں۔ لیکن کوئی بھی حاجی اپنی نسل نہیں بدل سکتا۔ خاندان نہیں بدل سکتا۔ برادری نہیں بدل سکتا۔ حاجی گیتو، شیخ ہی۔ اگر قصائی ہے تو قصائی رہیگا۔ یہ حاجی کی ڈگری اس کے فرقے برادری کو نہیں بدل سکتی اور نہ دنیا کی بڑی سے بڑی ڈگری ان کی ذات بدل سکتی ہے بچہ سقہ ہندستان کا بادشاہ بننے کے بعد بھی سقہ ہی رہا، ہاں ایک پیٹرو ڈالر میں یہ طاقت ہے کہ وہ صورت شکل جسم عمر کے ساتھ ساتھ ذات برادری بھی بدل دیتا ہے

کل کا گجو لالا گجو جب دو سال کے بعد عرب سے امریکن پینٹ جرسی جاپانی ٹیپ ریکارڈ جیسی لائیٹ پریس کے سیٹ اور ڈھیر سارے پیٹرو ڈالر لیکر اپنے شہر واپس آیا تو پھر وہ گجو نہیں رہا بلکہ حاجی فضل الرحمن انصاری بن گیا، صرف یہی نہیں بلکہ اس کی عمر بھی بیس سال کم ہو گئی۔ وہ بچپن کا نہیں بلکہ پینتیس ۳۵ کا لڑکا با عزت خاندان کا چشم و چراغ بن گیا جس کی تصدیق ایک بڑی پرکھ خاندان نے اپنی لڑکی بیاہ کر کی۔ یہی نہیں اس نے اپنے بھائیوں کے بچوں کے نام بھی بدل دیئے اب وہ "بو" "کلو" جمو کے بجائے یاسر، فیصل اور فہد کہلائے جانے لگے۔

غرض کہ پیٹرو ڈالر میں بڑی طاقت ہے وہ طاقت دور نہیں جب لوگ اپنے نام کے آگے ڈاکٹر انجینئر یا پروفیسر کی طرح پیٹرو بھی لگانے لگیں۔ اب کوئی محمود دادا قلعی گر کا لڑکا عرب جانے کے بعد گجو نہیں کہلائیگا بلکہ حاجی غضنفر علی خاں پیٹرو کہلائیگا اور اسی نام کو اور بھی ماڈرن کرنا ہوگا تو ایچ جی خاں پیٹرو ہو جائیگا ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے کتنے انو عنایت علی اور بھتے ہی محمد مظفر علی خاں بن گئے۔ اگر یہی سلسلہ رہا تو وہ وقت دور نہیں جب شیخ سید مغل پٹھان سے بھی اونچی ذات پیٹرو کہلائے گی۔ پھر محمود و ایاز کا فرق بھی باقی نہیں رہے گا لیکن صاحب میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ فرق تو رہے گا۔ محمود، محمود ہی کہلائیگا اور ایاز ایاز ہی لیکن محمود کون ہوگا اور ایاز کون؟ تو صاحب میرے خیال میں نوٹ والا ایاز کہلائیگا۔ اور پیٹرو والا محمود

زمانہ عہد میں اس کے ہے محو آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

▲

پاگل عادل آبادی

مہرباں ہو رہا ہے کیوں یہ سُسرا دیکھتے جاؤ
یقیناً دال میں ہے کچھ تو کالا دیکھتے جاؤ

میرے گن دیکھ کر دادلے [illegible] کوئی
بنے گا نیتا اِک دن میرا پوتا دیکھتے جاؤ

نہ دیکھو داغ لگنے کو ہے کیوں سالن کی ہانڈی کو
وہ کھلتی ہے بتا کا گیت ما لا دیکھتے جاؤ

میزائل اور ایٹم کے زمانے میں وہ لڑنے کو
چلے ہیں لے کے اِک جھاڑو کا کانٹا دیکھتے جاؤ

بجا کرتا تھا جن کے نام کا ڈنکا تو ملنے میں
ہوا ہے آج ڈبہ گول اُن کا دیکھتے جاؤ

نئی جورو ہوئی چمپت پُرانی چھوڑ کر چپل
گیا خط رہ گیا باقی لفافہ دیکھتے جاؤ

جنہیں سیکل چلانا تک نہیں آتا مگر وہ بھی
سلامی میں طلب کرتے ہیں جاوا دیکھتے جاؤ

کہو خرگوش کو خرگوش تو اس دور کے لیڈر
سمجھتے ہیں مجھے اُلّو کا پٹھا دیکھتے جاؤ

وہ سمجھتے ہیں کہ جھگڑا اس کا اندازہ نہیں مجھ کو
ہے سالم مرغ اُن کا اِک نوالہ دیکھتے جاؤ

بھری ہے جیب جب تک چاپلوسوں سے بری یارو
سمجھتے ہیں مجھے سب دُم کا مُرغا دیکھتے جاؤ

تمہارا تو فقط اک سر ہی گنجا ہو گیا پاگل
یہاں تو آدے کا آوا ہے بگڑا دیکھتے جاؤ

غزل

غم میرے سب بھلا دیجئے
تھوڑی وہسکی پلا دیجئے

دام بریانی کے ہیں بہت
صرف اِڈلی کھلا دیجئے

کام منٹوں میں بن جائے گا
نوٹ اودی دِکھا دیجئے

کام تو آپ سے ہے ہمیں
ہم کو اُن سے مِلا دیجئے

یوسف یکتا

چوا

کیوں ہے وہ بدگماں نہیں معلوم
کون ہے درمیاں نہیں معلوم
مرغ و ماہی کے بعد بھی یکتا
"آئیں کیوں ہچکیاں نہیں معلوم"

جمیل نظام آبادی

یونان کے نام سے کون واقف نہیں۔ اس ملک کو
قبل مسیح سے شہرت حاصل ہے۔ یہاں جو بڑے بڑے حکما پیدا
ہوئے، ان حکماؤں سے کون واقف نہیں۔ لقمان، سقراط، بقراط اور جالینوس
کے نام آج بھی دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ قدیم زمانے ہی سے یونانی فن طب میں کامل مہارت
رکھتے تھے۔ چنانچہ یونانی طریقۂ علاج یونان سے نکل کر رفتہ رفتہ ساری دنیا میں پھیل گیا حالانکہ اس
زمانے میں دنیا اتنی مختصر نہیں تھی۔ آدمی کو ایک ملک سے دوسرے ملک جانے کے لیے مہینوں بلکہ برسوں لگ
جاتے تھے۔ اس یونان کی شہرت سن کر ایک سیاح ادھر اُدھر کی سیر کرتا یہاں پہنچا۔ وہ دن بھر یونان کے
بازاروں میں گھوم پھر کر وہاں کی رونق دیکھتا رہا۔ جب رات ہوگئی تو اسے یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ شہر کے
ہزاروں مکانوں میں سے بعض مکان ایسے ہیں جن پر چراغاں روشن ہیں۔ بعض مکانوں پر سینکڑوں اور بعض پر
ہزاروں چراغاں جگمگا کر جشنِ چراغاں کا سماں پیش کر رہے ہیں۔ سیاح نے ایک شخص سے دریافت کیا کہ شہر
کے مکانوں میں جہاں کسی بھی مکان پر کوئی چراغ نظر نہیں آتا، تو بعض مکانوں پر چراغاں کیوں روشن ہیں؟
جواب ملا کہ یہ مکانات جن پر چراغ روشن ہیں حکیموں کے ہیں۔ یہاں کے حکیموں کا طریقہ ہے کہ جب کوئی
مریض اُن کے پاس بغرضِ علاج رجوع ہوتا ہے اور اگر وہ صحت یاب ہونے کی بجائے اللہ کو پیارا
ہوجاتا ہے تو یہ اس کی روح کو سکون پہنچانے کے لیے اس کے نام کا ایک چراغ اپنے
مکان پر روشن کر دیتے ہیں ——— سیاح کئی دن تک یونان میں مقیم رہا
اتفاق سے ایک روز اُسے شدت کا بخار آگیا اور وہ کسی حکیم سے
رجوع ہونے کے لیے مجبور ہوگیا۔ اب وہ کسی ایسے

طبیب حاذق کی تلاش میں نکل پڑا جس کے مکان پر کم سے کم چراغ روشن ہوں۔ اُس نے خیال کیا کہ جس حکیم کے مکان پر کم چراغ ہوں گے یقیناً اُس کی دواؤں سے زیادہ سے زیادہ مریض صحت یاب ہوئے ہوں گے۔ اُسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے کافی وقت گزر گیا تب کہیں جاکر ایک ایسا مکان نظر آیا جس پر صرف ایک چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ سیاح بہت خوش ہوا کہ اُسے بالآخر طبیب حاذق کا گھر مل ہی گیا۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر طبیب صاحب باہر تشریف لائے اور بیمار سیاح کو اپنے مطب میں لے گئے۔ پیٹ بجا بجا کر دیکھا۔ زبان کو کھینچا، دیدے پھاڑ کر جھانکا اور پھر دوا بنانے میں مصروف ہو گئے۔ اس اثنا میں سیاح نے کہا حکیم صاحب! مجھے آپ کا مکان تلاش کرنے میں بڑی دقت اُٹھانی پڑی۔ جس حکیم کے گھر پر گیا وہاں چراغاں ہی چراغاں دیکھ کر اُن سے رجوع ہونے کی ہمت نہیں ہوئی۔ آپ ہی ایک ایسے نظر آئے جس کے مکان پر صرف ایک چراغ جل رہا ہے۔"

یہ سُن کر حکیم صاحب خوش ہونے کی بجائے کبیدہ خاطر ہوئے اور جھنجھلائے ہوئے لہجے میں فرمایا کہ "بھائی مجھے ابھی مطب کھولے ایک ہفتہ بھی تو نہیں گزرا ہے۔ اِس دوران میں صرف ایک مریض رجوع ہوا تھا جس کے نام کا چراغ میں جلا رہا ہوں۔ دوسرے مریض آپ ہیں اگر اسی طرح مریضوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہا تو بہت جلد میرے مکان پر بھی چراغاں ہی چراغاں نظر آئیں گے۔

ہمارے ملک میں بھی زمانئہ قدیم سے آج تک ایک سے ایک نامور اور تیر بہدف علاج کرنے والے حکما کا سلسلہ چلا آرہا ہے۔ چنانچہ یہ حکیم صاحب بھی ہر مرض کا چاہے وہ اندرونی ہو یا بیرونی شرطیہ علاج کرنے کے دعویدار تھے اور جب کوئی مریض ان سے رجوع ہوتا تو وہ اُس کی صحت کا یقین دلا کر اپنی فیس اور ادویات کی جملہ قیمت پیشگی وصول کر لیا کرتے تھے۔ اِن حکیم صاحب کے پاس ایک مریض کو اس کے متعلقین لے کر رجوع ہوئے حکیم صاحب نے مریض کا تفصیلی معائنہ کیا اور فرمایا کہ میں شرطیہ طور پر اسے صحتیاب کر دوں گا لیکن اس کے جو اخراجات ہوتے ہیں وہ آپ کو پیشگی دینے ہوں گے ظاہر ہے کہ مریض کو اور اس کے متعلقین کو خدا کے بعد حکیم پر ہی بھروسہ ہوتا ہے، وہ بخوشی تیار ہو گئے اور حکیم صاحب کے منہ مانگے روپیہ اُن کی خدمت میں پیش کر دیئے۔ حکیم صاحب نے اُنھیں دوائیں دیں اور طریقہ استعمال بتا دیا۔ پانچویں دن مریض کے متعلقین روتے پیٹتے حکیم صاحب کے پاس پہنچے۔ حکیم صاحب کو انھیں دیکھ کر بڑا تعجب ہوا۔ حیرت سے پوچھنے لگے۔ "کیوں بھئی تم لوگ رو کیوں رہے ہو!"

اُنھوں نے کہا۔ "حکیم صاحب آپ نے تو شرطیہ علاج کرنے کو کہہ کر ہم سے اپنی جملہ فیس پیشگی وصول کر لی۔

حکیم صاحب نے بڑے اطمینان سے کہا۔ "ہاں ہاں بھئی! میں نے جملہ فیس پیشگی لی ہے اور اب بھی کہہ رہا ہوں کہ مریض کو شرطیہ شفا ہوگی۔"

اُنھوں نے روتے ہوئے کہا۔ "کیا خاک شفا ہوگی حکیم صاحب وہ تو مرگیا۔"

"مرگیا — ؟" حکیم صاحب تقریباً چیخ پڑے۔

ایسا نہیں ہو سکتا۔"
متعلقین نے کہا۔ "نہیں ہو سکتا کیا حکیم صاحب' ایسا ہو چکا ہے۔"
حکیم صاحب نے فرمایا۔ "تعجب ہے! آپ لوگوں نے دوائی کھلائی تھی۔"
انہوں نے کہا۔ "ہاں کھلائی تھی۔"
حکیم صاحب نے پوچھا۔ "کتنے دن کھلائی تھی؟"
اُنہوں نے کہا۔ "پانچ دن کھلائی تھی حکیم صاحب۔"
یہ سن کر حکیم صاحب نے تمسخر سے کہا۔ "پانچ دن کھلائی! پانچ دن کھلانے سے مریض مرتا نہیں تو اور کیا ہوتا ہے۔ میں نے تو آپ سے سات دن مسلسل دوا کھلانے کو کہا تھا!"

ایک اور حکیم صاحب کا قصہ سُنیے۔ انھیں اپنے کسی بھی دواساز پر اعتماد نہیں تھا۔ وہ ہر دوا اپنے ہاتھ سے یا اپنی موجودگی میں اپنے دواسازوں سے تیار کروا کر مریضوں کو دیا کرتے تھے۔ ایک دن حکیم صاحب مکان میں پچھلے حصہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ باہر دروازے پر دستک ہوئی۔ معلوم ہوا کہ مریض آیا ہے۔ حکیم صاحب مریض کو دیکھنے اپنے مطب میں آ گئے، جو آپ کے دیوان خانے ہی میں تھا۔ مریض کو دیکھ کر اور دوا دے کر رخصت کیا تو کپڑا جلنے کی بو آنے لگی۔ حکیم صاحب نے اپنے دواساز سے کہا کہ دیکھو اندر کیا جل رہا ہے۔ دواساز اندر بھاگا۔ اس کے پیچھے پیچھے حکیم صاحب بھی اندر پہنچ گئے۔ دیکھا تو حقہ کی چلم آن کے غالیچہ پر گر گئی تھی اور غالیچہ جل رہا تھا یہ دیکھ کر دواساز فوری پانی لانے کے لیے بھاگا۔ لیکن حکیم صاحب نے بڑے اطمینان سے اُسے روکا اور کہا کہ میاں پہلے ہی غالیچہ کا نقصان ہو چکا ہے اور تم اس پر پانی ڈال کر اور نقصان کے درپے ہو۔ جلنے دو پورے غالیچہ کو۔ جب غالیچہ جل کر راکھ ہو جائے تو یہ راکھ تمام چینی کے فلاں مرتبان میں بھر دو اور اُس پر چِٹھی چسپاں کر دو۔ "ھو الشافی، ھو الکافی سفوفِ غالیچہ"

ایک دوسرے حکیم صاحب کا قصہ سنیے۔ ایک مریض ایک حکیم صاحب سے رجوع ہوا۔ حکیم صاحب نے اس کا معائنہ کیا اور ضروری استفسارات کرنے لگے۔
"کھانسی ہے؟"
مریض نے کہا۔ "ہاں حکیم صاحب کبھی کبھی کھانسی آتی ہے۔"
"کھانسی کے ساتھ بلغم آتا ہے؟"
"کبھی کبھی آتا ہے حکیم صاحب۔"
حکیم صاحب نے پوچھا۔ "پیشاب صاف ہے؟"
مریض نے کہا "ہاں حکیم صاحب۔"
حکیم صاحب نے پھر پوچھا۔ "پائخانہ صاف ہے؟"
مریض نے کہا۔ "بالکل صاف ہے حکیم صاحب۔ ہمارے گھر میں ڈرینج کا پائخانہ ہے جس کی دن میں دو مرتبہ صفائی کی جاتی ہے۔"
یہ سُن کر حکیم صاحب کو غصہ آ گیا، بگڑ کر بولے "آپ مذاق کر رہے ہیں۔"
"نہیں حکیم صاحب میں حقیقت عرض کر رہا ہوں آپ چل کر خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجیے۔"
اب حکیم صاحب سٹپٹا گئے، بولے، اجابت صاف ہے۔؟
مریض نے کہا، "نہیں حکیم صاحب، اجابت صاف

نہیں ہے۔ دو، دو، تین تین دن قبض رہتا ہے۔"

ایک آخری قصہ اور سُنیے کہ: ایک صاحب ایک حکیم صاحب سے رجوع ہوئے اور فرمایا۔ "حکیم صاحب میرے پیٹ میں شدت کی تکلیف ہے۔"

حکیم صاحب نے اُن کا پیٹ دبا دبا کر دیکھا اور پوچھا "آج آپ نے کیا کھایا؟"

اُنھوں نے کہا "حکیم صاحب میں دن میں دو بار کھانے کا عادی ہوں۔ آج صبح حسب معمول پیٹ بھر کر کھا چکا تھا کہ میرے سالے صاحب آگئے۔ اُن کی بہن نے اپنے بھائی کو دوپہر کے کھانے کے لیے روک لیا۔ اب ظاہر ہے حکیم صاحب مہمان اور وہ بھی سالا۔ اُس کے لیے کچھ خصوصی پکوان کا انتظام کرنا ہی تھا۔ سو وہ پکایا گیا۔ جب سالے صاحب کھانے کے لیے بیٹھے تو کہنے لگے، دولھے بھائی آپ بھی آئیے، آپ کے بغیر میں بھی نہیں کھاؤں گا اُن کے اصرار پر بیٹھنا ہی پڑا۔ چونکہ سالن والن مزیدار پکے تھے۔ اس لیے میں نے پھر ڈٹ کر کھا لیا۔ شام کو جب وہ رخصت ہونے لگے تو بھلا اُن کی بہن اُنہیں بغیر کچھ کھلائے کیسے جانے دیتی۔ چنانچہ پھر کچھ حسب حیثیت پکوان ہوا، اور میں پھر دسترخوان پر بیٹھنے کے لیے مجبور ہو گیا، اور اب پیٹ کی تکلیف سے بے چین ہو رہا ہوں۔

حال احوال سننے کے بعد حکیم صاحب نے ایک شیشی میں اُنہیں تھوڑا تیل دیا اور کہا، "روزانہ رات کو سوتے وقت سر پر اس تیل کی مالش کیا کیجیے۔"

اُنھوں نے کہا۔ "حکیم صاحب درد تو میرے پیٹ میں ہے اور آپ سر کی مالش کا تیل دے رہے ہیں۔"

حکیم صاحب نے کہا۔ "ہاں۔ ٹھیک ہے لیکن میں نے آپ کے لیے صحیح نسخہ تجویز کیا ہے اس استعمال سے آپ آئندہ کھانے کے معاملہ میں محتاط رہیں گے، یہ دماغ کو طاقت پہنچانے والا تیل ہے۔"

* *

غزلیں

پوری جوانی بیت گئی شانتی کے ساتھ
پیری گزر رہی ہے مگر کرکری کے ساتھ

رکھتا ہوں خیر و شر سے مساوی تعلقات
ہر راستے پہ چلتا ہوں میں ہر کسی کے ساتھ

معشوقِ کہنہ سے نظر آتا ہے کچھ زنشٹ
دل چاہتا ہے عشق کرے اب نئی کے ساتھ

چھا جائے گا جہاں میں اندھیرا، اگر ہو ختم
مہتاب خان کی عاشقی، مہتاب بی کے ساتھ

جب تک جوان رہا نہ چلا راہِ راست پر
پیری میں ہوں قدم بہ قدم راستی کے ساتھ

رہتا ہے اب بڑھاپے میں جو مجھ سے دور دور
رہتا تھا میں جوانی میں اکثر اسی کے ساتھ

اس برقی لائٹ میں نظر آتا نہیں کہیں
پروانوں کو خلوص جو تھا روشنی کے ساتھ

ہمراہ اس کے بارہا دیکھا گیا ہے مجھے
اک سر پھرا ہو جیسے کسی سر پھری کے ساتھ

چھوڑوں گا میں نہ آپ کو جب تک ہے دم میں دم
ہو کر رہوں گا دفن بھی میں آپ ہی کے ساتھ

سرپٹ رواں دواں ہے یہ ہر گام و ہر نفس
فکرِ معاش، مشغلۂ شاعری کے ساتھ

★

پیری میں جوانی کی ادا میرے لیے ہے
رہ رہ کے کھنکنے کی صدا میرے لیے ہے

غیروں کے لیے نان بھی، مکھن بھی، مٹن بھی
ہانڈی میں فقط بھات بچا میرے لیے ہے

ہر سال چلا آتا ہے مہمان مبارک
اس دور میں شادی کی سزا میرے لیے ہے

ان کے لیے توشک بھی ہے اور مخملی کمبل
اور بوریا بوسیدہ پھٹا میرے لیے ہے

انڈے کی طرف میں نے جو للچائی نظر کی
بیگم نے مجھے ہنس کے کہا میرے لیے ہے

★

برا الفت کا ہو جس نے مجھے برباد کر ڈالا
نہیں ہے جیب میں پائی نکالا میرا دیوالا

گئے ہیں ڈانس میں "بیگم" میاں بیٹھے ہیں ہوٹل میں
یہی فیشن پرستی ہے تو اس فیشن کا منہ کالا

مہرباں دیکھ کر ٹش ٹش کو میں نے کہہ دیا اک دن
اسی کا نام الفت ہے تو پھر بخشو میری خالا

تیری محفل میں آیا ہوں ظرافت نذر کرنے کو
تیری محفل سے اٹھوں گا لیے پھولوں کی جے مالا

مہرباں جب سے قینچی جان مجھ پہ ہو گئی نشتر
کبھو مرے کبھی چھٹنی سے اپنا پڑ گیا پالا

ترقی اُردو بیورو کی 1981ء کی مطبُوعات

1۔ قومی تہذیب کا مسئلہ

(ڈاکٹر سید عابد حسین) ہندوستانی تہذیب کے تشکیلی عناصر اور ارتقائی سفر کو سمجھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے 220 صفحات، دیدہ زیب سرورق، آفسٹ طباعت، قیمت 9.60 روپے

2۔ اترپردیش کے گیت

(اظہر علی فاروقی) اترپردیش کے لوک گیتوں کا سیر حاصل جائزہ، بہت سے گیت بھی اس میں شامل ہیں 633 صفحات دلکش سرورق آفسیٹ طباعت

قیمت: 29.25 روپے

3۔ قدیم لکھنؤ کی آخری بہار

(مرزا جعفر حسین) لکھنوی تہذیب کے مٹتے ہوئے نقوش کو اس کتاب میں محفوظ کر دیا گیا ہے جس سے یہ ایک اہم تاریخی دستاویز بن گئی ہے۔ 560 صفحات خوبصورت سرورق، آفسٹ طباعت

قیمت: 27 روپے

4۔ ہندوستانی مصوری، ایک خاکہ

(ڈاکٹر انیس فاروقی) ہندوستانی مصوری کی فنی خصوصیات اور تاریخ پر ایک جامع باتصویر کتاب 187 صفحات خوبصورت سرورق آفسٹ طباعت۔ قیمت 10 روپے

5۔ سخنورانِ گجرات

(ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی) گجرات میں اردو شاعری کے فروغ و ارتقاء کی ایک معتبر و مستند تاریخ۔ 340 صفحات، دیدہ زیب سرورق، آفسٹ طباعت قیمت: 17 روپے

6۔ گلستاں کی کہانیاں

(مولفہ سید امیر حسن نورانی) شیخ سعدیؒ کی مشہور کتاب سے سبق آموز کہانیوں کا انتخاب۔/ 80 صفحات۔ دیدہ زیب سرورق آفسٹ طباعت۔ قیمت 4 روپے

7۔ اصولِ تعلیم

(خواجہ غلام السیدین) تعلیم جیسے اہم موضوع پر بنیادی کتاب جو پہلی بار 1935ء میں شائع ہوئی تھی اور عرصے سے نایاب تھی۔ 544 صفحات، خوبصورت سرورق آفسٹ طباعت۔ قیمت 22 روپے

8۔ اصولِ تعلیم اور عمل تعلیم

(مترجم ڈاکٹر خلیل الرحمٰن سیفی بریمی) تعلیم کے نظری و عملی پہلوؤں کا محاکمہ کرنے والی ایک اہم کتاب، 336 صفحات خوبصورت سرورق آفسٹ طباعت۔ قیمت 16/75 روپے

9۔ درسِ بلاغت

شائقینِ ادب اور بی اے اور ایم۔ اے کے طلبہ کے لیے علومِ بلاغت پر ایک جدید اور مکمل کتاب جس میں صنائع بدائع عروض قافیہ اور نظم و نثر کے اقسام پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ 192 صفحات، دیدہ زیب سرورق، آفسٹ طباعت۔ قیمت 7 روپے

10۔ نئی اردو قواعد

(ڈاکٹر عصمت جاوید) لسانیاتی اصولوں پر مبنی اردو زبان کی پہلی توضیحی قواعد جس میں اردو زبان کے مختلف عناصر کو سائنٹفک انداز میں درجہ بند کیا گیا ہے۔ 324 صفحات خوبصورت سرورق آفسٹ طباعت قیمت 17 روپے

11۔ ہمایوں نامہ۔ گلبدن بیگم

(مترجم عثمان حیدر مرزا) شہنشاہ بابر کی بیٹی اور ہمایوں کی بہن گلبدن بیگم کی تصنیف کردہ اہم تاریخی دستاویز۔/ 96 صفحات، دیدہ زیب سرورق، آفسٹ طباعت

قیمت 6.25 روپے

12۔ قدیم ہندوستان کی تاریخ

(مترجم سید سخی حسن نقوی) قدیم ہندوستان کی تہذیب و ثقافت کی ایک مستند تاریخ۔ 581 صفحات خوبصورت سرورق آفسٹ طباعت قیمت 27.75 روپے

13۔ اکبر سے اورنگ زیب تک

(مترجم جمال محمد صدیقی) عہد مغلیہ کی مستند تاریخ 436 صفحات، خوبصورت سرورق آفسٹ طباعت قیمت 21.50 روپے

14۔ نوریات (آر کے رستوگی)

OPTICS کے علم پر ایک معتبر و مستند کتاب 569 صفحات۔ خوبصورت سرورق آفسٹ طباعت قیمت 32 روپے

[سلسلہ اگلے صفحہ پر]

ٹسٹ ٹیوب بے بی

ڈاکٹر مجید آذر
۱۲۴، مسجد اسٹریٹ
پہلی منزل روم (۲)، بمبئی ۴۰۰۰۰۳

سحر چھوٹی شبِ غم کی آندھی ٹلی — صبحدم چل رہی ہیں ہوائیں بھلی
شمعِ نو آرزو کے صحن میں جلی — ہر تمنا حقیقت میں اب تو ڈھلی
درد ہوگا رہے گی نہ اب بے کلی
بچہ جننے لگی امتحانی نلی!

مونچھ پر تاؤ نامرد دینے لگے — باپ بننے کا اعزاز لینے لگے
ڈاکٹر ان کی کشتی کو کھینے لگے — بانجھ عورت کے انڈے بھی سینے لگے
اب ہے جشنِ ولادت گلی در گلی
بچہ جننے لگی امتحانی نلی!

ماں کرالا میں ہے باپ بنگال میں — اور بچہ کو رکھا ہے بھوپال میں
اب فقط ڈاکٹر جی ہیں جنجال میں — ماں کلب میں پھنسی، باپ فٹبال میں
اب، دوا، گولی سوئی کی جھنجھٹ ٹلی
بچہ جننے لگی امتحانی نلی!

اب جوانی کے ڈھلنے کا خطرہ گیا — اپنی فیگر بدلنے کا خطرہ گیا
فکر میں جان جلنے کا خطرہ گیا — پیٹ میں کچھ مچلنے کا خطرہ گیا
جو کلی ہے ہمیشہ رہے گی کلی
بچہ جننے لگی امتحانی نلی!

چار جس اب ولایت کے بڑھ جائیں گے — ٹسٹ ٹیوب اب ولایت سے بھی آئیں گے
ماہرین اہمیت اپنی جتلائیں گے — مائیں مسکائیں گی باپ چلائیں گے
چھوڑ بھاگیں گے دولہا دلھن کی گلی
بچہ جننے لگی امتحانی نلی!

عورتیں شادماں ہیں کہ پائی نجات — قضیے کا نام و نشاں ہے نہ متلی کی بات
اب نہ پیروں پہ بوجھل نہ بھاری ہے رات — اب نہ درد کمر اور نہ بچہ کے ساتھ
بھینس کوئی اب نہ اور کھائے کھلی
بچہ جننے لگی امتحانی نلی!

کا پیٹ پر ٹیکس کا ریٹ بڑھ جائے گا — اب وزارت میں عہدہ نیا آئے گا
کوئی بچہ منسٹر بھی کہلائے گا — ٹسٹ ٹیوب کے صدقے میں پلنگا
اب حکومت میں ہوگی بڑی کھلبلی
بچہ جننے لگی امتحانی نلی!

گیدڑ کی جب موت آتی ہے تو شہر کی طرف بھاگتا ہے۔ ہماری جب کبھی آئی تو ہم نے دولہا بننے کی ٹھانی
کہا جاتا ہے "دور کے ڈھول سہانے" لفظ "دولہا" جس کے کانوں میں پڑتے ہی کنوارے دلوں کی دھڑکن تیز
ہو جاتی ہے اور شادی شدہ لوگوں کے جسم پر جھرجھری آجاتی ہے۔ لیکن مرتا کیا نہ کرتا بے چارہ اپنی کمزوری کو چھپا کر
زبردستی خوشی ہی کا اظہار کرتا ہے۔ جب جوانی کے دن مرادوں کی راتوں کو ملا لو کی تذکر کے تین چار جھٹکوں
بعد بل لیے ہوئے اور اپنے حلیے پر نظر کی تو آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک سر میں چاندی نظر آنے لگی۔ اور
کی دیوانی کھسکتی ہوئی معلوم ہوئی۔ تو ہم نے گھبرا کر بڑے زور و شور سے گھر اور دوستوں میں اعلان کیا کہ ہمیں دولہا
بننا منظور ہے۔ ہمارا اعلان کرنا تھا کہ ایٹم بم پھٹ پڑا۔ یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح ہر گھر میں پھیل گئی۔ کئی آنکھیں
حیرت سے گھورنے لگیں اور کئی تمسخر کی نظروں سے دوست احباب تمام ہمارے گھر کی طرف دوڑ پڑے۔ اور ہم پر لرزہ
طاری ہو گیا ابھی ابتداء ہے تو یہ حال ہے۔ بعد میں کیا ہوگا؟ کالج کے زمانے میں اپنے ساتھیوں کے عشق لڑانے اور
چلبلے پن سے ان کی ناکامی کے واقعات سے ہی ہمت جواب دے چکی تھی۔ بڑی ہی جرأت کر کے جب ہاں کی تو
نئی مصیبت سامنے دکھائی دی۔

ایک کہنے لگے واہ بھئی واہ! کمال کر دیا' کب فیصلہ کیا ہمیں خبر بھی نہ ہوئی۔ لیکن چلو بہت اچھا کیا۔ واقعی اب تمہیں کیا بتائیں ازدواجی زندگی کا مزہ' بغیر جیون ساتھی کے یہ زندگی بالکل ادھوری ہے۔ وہ صاحب ایسے کہنے لگے جیسے انکی زندگی بہار بے خزاں کی طرح ہے لیکن صرف ہم ہی جانتے ہیں کہ یہ بیوی سے بچنے کے لئے کہاں وقت گذارتے ہیں اور روزانہ ان کے گھر کے کتنے برتن ٹوٹتے ہیں اور کب پڑوسی ہمدردی کی خاطر ان کے گھر میں جمع ہوتے ہیں۔

ایک صاحب ازدواجی زندگی کے سارے نشیب و فراز سے واقف کرانے لگے جن میں الجھ کر ہمارے عزیز دوست نے سر کے سارے بال گنوا دیئے۔ اور جن کو سلجھانے میں' قوم کے مسائل حل کرنے والے ماہر سیاستدانوں کی طرح ان حضرت نے بھی اپنا پیٹ بڑھا لیا تھا۔

ایک صاحب مجھ سے رازدارانہ انداز میں پوچھنے لگے۔ ارے بھائی پہلے یہ تو بتاؤ کہ کوئی لڑکی بھی پسند کی ہے یا نہیں۔ رشتہ کہاں چل رہا ہے؟

ہم نے شرماتے ہوئے کہا' ابھی تو کہیں نہیں۔ تم ہی کوئی لڑکی بتلاؤ۔

کہنے لگے تم جانتے نہیں۔ ارے وہی اپنے ساتھ جو بی اے میں پڑھتی تھی۔ شوبی' اور ہم سوچنے لگے کب جب ہم پہلی بار بی اے میں پڑھتے تھے تب یا پھر دوسرے' تیسرے .....

کہنے لگے بھئی بہت اچھی ہے۔ سوشل ہے اور پھر مخلوط کھانے پکانے میں ماہر ہے۔ بی اے میں ان کا مضمون ہوم سائنس بھی تھا اور پھر کھانے سے لے کر ناچنے تک سب کچھ آتا ہے۔

دوسرے صاحب نے زور دار مخالفت کر کے کہنے لگے' نہیں نہیں بالکل نہیں۔ یہ شوبی کے بالکل لائق نہیں۔ یوں لگا جیسے شوبی سے ہم نہیں شوبی ہم سے شادی کرنا چاہتی ہو۔

دوستوں اور رشتہ داروں کی پسندیدہ ناپسند ہمارے ارادوں کو ڈانوا ڈول کرنے والی تھی' اور ہم مراقبے کی حالت میں تھے کہ کیا کریں اسی وقت دروازے کی کنڈی دور سے کھڑکھڑائی جیسے منکر نکیر گرز مار کر مردے کو جگا رہے ہیں۔ ہم گرتے پڑتے دروازے تک پہونچے۔ ایک ادھیڑ عمر کے حضرت' لکھنوی کرتہ' پاجامہ پہنے سامنے کھڑے دکھائی دیئے۔ کچھ پوچھنے سے پہلے ہی وہ حضرت اپنا تعارف کراتے ہوئے اندر داخل ہوئے "بڑی خوشی ہوئی میاں آپ سے مل کر ہم مرزا صاحب ہیں۔ ہمیں معلوم ہوا کہ آپ شادی کرنے جا رہے ہیں ہم نے کہا "جی ہاں آپ کو کوئی اعتراض" "نہیں نہیں میاں" ارے تو بہ ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے اس نیک ارادے پر' میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ لڑکی وڑکی دیکھی یا نہیں۔ ویسے سچ کہتا ہوں میاں' اس خاکسار کو لوگوں کے گھر بسانے میں بڑا سکون ملتا ہے اور ابھی تک تقریباً ۹۹ گھر بسا چکا ہوں اور پورے سو کر لوں تو اس کار خیر سے کنارہ کشی کر لوں"۔ اب ہم سمجھے حضرت کا مقصد نزول کیا ہے۔ یہ بھی کرکٹ کے کھلاڑیوں کی طرح سو کے چکر میں پڑے ہوئے ہیں۔ چاہے کتنا ہی وقت لگے' ٹیم کا کچھ بھی ہو ہارے یا جیتے یہ اپنا سینکڑہ ضرور پورا کریں گے' اسی طرح لڑکے کی زندگی برباد ہو یا پھر لڑکی والوں کا دیوالیہ نکلے ان کا سینکڑہ

پو اکرنا ہے۔ ہم نے ازراہِ ہمدردی پوچھ ہی لیا کیا آپ کی نظر میں کوئی لڑکی ہے۔ سنتے ہی مرزا صاحب کی باچھیں کھل گئیں 'ارے میاں تم ایک لڑکی کا کہہ رہے ہو' کہو تو لائین لگا دوں ہم نے گھبرا کر جلدی سے کہا' نہیں مرزا صاحب ہم ایک ہی سے شادی کرنا چاہیں گے' ہمارے راستے پر چیتے کی پوندیں ہماری گھبراہٹ کی غمازی کر رہی تھیں' مرزا گویا ہوئے دیکھو میاں ابھی ابھی تم بی اے ہوئے اگر کہو تو آگے کی تعلیم کا بندوبست کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد اگر تم چاہو تو تمہیں باہر بھی بھجوا دیں گے۔ بڑے اچھے لوگ ہیں۔ یا پھر کیش چاہو تو کیش بھی مل جائے گا۔ بس میاں تمہاری ہاں کی ضرورت ہے۔ ہماری سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا تھا' مرزا صاحب کیا کہہ رہے ہیں' رشتہ طے کر رہے ہیں یا پھر سودا کر رہے ہیں۔ اب سمجھ میں آیا لڑکے تو بھولے بھالے ہوتے ہیں۔ دراصل انھیں رشتہ دینے والے یہ پیسے والے لوگ اور اس قسم کے دلال ہیں۔ ہم نے کہا لڑکی کی تعریف تو کیجئے' کہنے لگے ارے میاں اتنا سب کچھ دینے کے بعد لڑکی کی تعریف کی کیا ضرورت وہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ ڈنلپ کمپنی کا چلتا پھرتا اشتہار ہے اور قد کے متعلق شہر کے منچلوں کی رائے ہے کہ اگر آپ کے ساتھ سیر کو نکل جائے تو وہ ایک کے ساتھ آدھا لگانا نہ بھولیں گے۔ ہم نے مرزا صاحب کے گھر جا کر ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی کہ اب کبھی شادی کا خیال دل میں نہ لائیں گے۔

ابھی مرزا صاحب سے کسی طرح ہم نے پیچھا چھڑایا تھا کہ ہمارے ایک خیر خواہ وارد ہوئے یہ بھی ویسے شادیاں کروانے میں ماہر ہیں لیکن کہا جاتا ہے نا کہ چراغ تلے اندھیرا بس یہی مثال ان حضرت پہ صادق آتی ہے ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ روزانہ ان کے گھر میں اسمبلی ہال کا منظر ہوتا ہے' کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی اور سارے برتن اِدھر اُدھر بکھرے نظر آتے ہیں' لیکن یہ ہیں کہ شادیوں پہ شادیاں کروا رہے ہیں۔ ہمیں تو ڈر لگتا ہے کہ کہیں انتقامی جذبہ کے تحت یہ کارِ خیر تو انجام نہیں دیتے کہ ہم تو ڈوبے ہیں صنم' ان کو دیکھتے ہی ہمارا ماتھا ٹھنکا وارد ہوتے ہی مبارک سلامت کے نعرے لگانے شروع کر دئے۔ ارے بھائی تم تو بڑے خوش قسمت ہو ویسے لہلے پاس لوگ تو گیوں گلی مل جاتے ہیں۔ آجکل تو میاں ان پڑھ لوگوں کا شا ستیع ہے۔ لیکن کہتے ہیں خدا جب دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے ایسا سمجھو لاٹری لگ گئی۔ تم جانتے ہو حاجی اکمل کو' بریار الیکشن میں لاکھوں روپیہ چندہ دیتے ہیں لڑکی کیا خوبیاں گنواؤں میاں تم نہیں جانتے یہ لڑکی خوبصورت ہے۔ نظریں تو بالکل دو دھاری تلوار ہیں' تم نہیں جانتے میاں' ناوک انداز بیویاں کتنی خوبصورت ہوتی ہیں۔ اسکول کے زمانے میں دراصل دو سو میٹر دوڑ میں حصہ لیا تھا اور سب سے پہلا نمبر حاصل کیا تھا۔ لیکن دیکھو قسمت کے کھیل بھی کیا نرالے ہوتے ہیں کہ جب منزل پہ پہنچی تو ٹانگ میں ٹانگ اٹک گئی تب سے لنگڑا کر چلتی ہیں۔ وہ کہے جا رہے تھے اور ہمارا دل سو میٹر کی رفتار سے دوڑ رہا تھا' اور ہم سمجھ رہے تھے ہمارا شادی کا خمار تیزی سے نیچے اتر رہا تھا۔ میاں یہ عیب لا کم کچھ لوگ اسے لنگ کہتے ہیں لیکن میں تو یہی کہوں گا کہ اس سے اس کی خوبصورتی میں چار چاند لگ گئے تم نہیں جانتے جب وہ چلتی ہے تو بدن کا ہمہ اور رکشا دیکھنے کا لطف آتا ہے اور ان کا لم گردن کے ارتعاش سے تو قیامت ڈھاتی ہے کہ بس ان کا دل بھی کہتا ہے تو ...

لگتا ہے۔ بتلاؤ اس سے زیادہ حسین روتے زمین پہ کوئی ہوگی اور پھر ہارڈ کیش ایک لاکھ ساتھ میں منظور (لا) ہے جی سارا اچھے رسوخ ہیں تجھیں کہیں نہ کہیں ضرور فٹ کردیں گے۔

ہم نے بڑی مشکل سے اپنے آپ پہ قابو پایا اور کسی نہ کسی طرح انھیں رخصت کیا۔ ان کے جانے کے بعد محسوس ہوا ہم نے اپنے آپ کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کروایا ہے۔ آزادی کی لمبی سانس لی۔ رات گئے تک ہمارے مخلص گڈن میاں سے مشورہ کرتے رہے۔ علی الصبح غسل کیا فجر کی نماز ادا کی۔ گڈن میاں اپنے ساتھ مٹھائی اور پھولوں کا ہار لائے تھے۔ اور قاضی صاحب نے محلہ کے ایک غریب لیکن باعزت گھرانے کی دختر نیک اختر کو ہمارے نکاح میں دے کر ہمارے دولہا بننے کے ارمان پورے کردیئے۔ ●!

افضل حیدرآبادی

کب تلک؟

مفت کی پیتے ہو تھے یہ بادہ نوشی کب تلک
غیر کے بھرتے پہ اتنی فاقہ مستی کب تلک

مُرغ و ماہی لیڈروں کو 'دال کھانا آپ ہم
ناتواں جنتا کے بابو سیر شکی کب تلک

بے وفائی کس کو کہتے ہیں وفا کیا چیز ہے
یہ سبق رٹوائے گا پبلک کو لیڈر کب تلک

ہے ہنر روزی کمانا پیٹ بھرنا مختصر
یہ گراں مایہ گرانی بندہ پرور کب تلک

ہیں دیہاتاں خالی خالی، ہور کساناں کو یہ کو
دیش بھگتو یہ تمھاری مرغ زاری کب تلک

ہم نے مانا تم رہیں افلاک پر لیکن حضور
ہم کریں افلاس میں گریہ وزاری کب تلک

وہ نئی کاروں میں بیٹھیں اور ہم بے بس رہیں
ہائے اس سرکار کا یہ گول گپا کب تلک

اِس کی ٹوپی اُس کے سر ہے اُس کی ٹوپی اس کے سر
اِن کی پولی ٹکس میں آخر ڈھول ڈھپا کب تلک

ایم صلاح الدین ایم اے

عید کی فہرست

پروگرام سننے سے زیادہ روزہ بہلانے کے خیال سے ریڈیو آن کئے ہوئے تھا کہ دفعتاً بیگم آدھمکیں اور میز پر پڑے ہوئے رومال سے نہایت بے تکلفی سے اپنے مسالہ پیستے ہوئے ہاتھ کو پونچھتی ہوئی گویا ہوئیں۔ "ہاں! تو کیا عید کی لسٹ لکھوا دوں؟"

میں نے بھی نہایت بے تکلفی سے اُن کے ہاتھوں سے اپنا صاف و شفاف رومال جو اب مانجے میں بیٹھے ہوئے کسی دولہا کے رومال کا روپ دھارن کر چکا تھا اُچک لیا اور اُن کی پہونچ سے پرے رکھتے ہوئے کہا۔ "ازراہِ کرم بندہ کو یہ بتانے کی زحمت گوارا کریں کہ آخر یہ سعید کی لسٹ کیا بلا ہوتی ہے؟"

"آپ ذرا زیادہ بننے کی کوشش تو مت کیجئے گا۔ میں عید کی لسٹ کہہ رہی ہوں سعید کی لسٹ نہیں۔"

"اچھا اچھا اس اصلاح کا شکریہ۔ اور اب شروع ہو جائیے۔ ہاں تو یہ عید کی لسٹ کیا ہوتی ہے؟"

"تو کیا واقعی آپ اتنے بھولے بابا ہیں کہ سمجھ نہیں پا رہے ہیں کہ عید کی لسٹ کیا ہوتی ہے؟"

"آپ کے سر......"

"بس رہنے دیجئے۔ جب دیکھئے میرے ہی سر کی قسم کھائی جاتی ہے۔ جب ہی میرے سر کے بال گرتے جا رہے ہیں آپ کو قسم کھانے کے لئے لے دے کر میرا ہی سر رہ گیا ہے کیا؟"

"تو پھر آپ کے دشمنوں کے سر کی قسم کھاؤں واللہ بڑا مزہ آئے گا جب آپ کے سارے دشمنوں، جو کہ بالعموم خواتین ہی ہیں سر خزاں رسیدہ چٹیل میدان ہو جائیں گے۔"

"میرے کوئی دشمن ہی نہیں ہیں۔ میں نہایت شیریں زبان....."

"اچھا اچھا آپ کی اس صفت کا انکشاف آج ہی ہوا ہے.... تو پھر اگر آپ کے منّا بھیّا کے سر کی قسم کھاؤں؟ ــ واللہ اُس کے سر کے بالوں کے گھنا ٹوپ گچھّے دیکھ دیکھ کر الجھن سی ہوتی رہتی ہے چٹیل میدان ہو جائے۔"

"بس رہنے دیجئے گا۔ میرے منّا بھیّا کے گھنے بالوں پر نظر بد مت ڈالئے۔ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میرا بھائی آپ ہی کی طرح گنجا ہو جائے۔ ماشاءاللہ چشم بد دور خدا اُسے تاحیات گھنے بالوں والا رکھے۔ یہ گنجے سر والا آدمی بھی کوئی آدمی ہوتا ہے لگتا ہے جیسے کھال اُتاری ہوئی بٹیر ہو ـــــ خیر تو باتوں میں ٹالنے کی کوشش مت کیجئے اور لیجئے عید کی لسٹ لکھ لیجئے۔"

"لیکن بیگم میں تو ابھی تک یہی نہیں سمجھ سکا کہ عید کی لسٹ کیا ہوتی ہے؟"

"نہ جانے آپ دفتر میں کیسے اور کیا کام کرتے ہیں جب کہ آپ کو ایک معمولی سی بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے!"

"دفتر میں تو آپ کی دعا سے میرے کاموں کی بڑی ستائش ہوتی ہے۔ اور اب تو میرا جلد ہی پروموشن ہونے والا ہے۔"

"پروموشن؟ اور آپ جیسے لوگوں کا؟ جب آپ ایک چھوٹی سی بات سمجھ نہیں پا رہے ہیں تو باریک باتیں کیا خاک آپ کے پلے پڑتی ہوں گی۔ سچ پوچھئے تو اگر میں آپ کے دفتر میں افسر ہوتی تو آپ کو پروموشن کے بجائے ڈیموشن کی سفارش کرتی ــــ کمال ہو گیا کہ عید کی لسٹ آپ کی سمجھ میں نہیں آ سکا ہے۔"

"سمجھ میں کیوں نہیں آ رہا ہے۔ خوب سمجھ میں آ رہا ہے۔ بلکہ سمجھ میں بھی آ گیا ــــ"

"تو پھر بتلائیے۔" وہ خوش ہو گئیں۔

"عید کی لسٹ یعنی مختلف اقسام کی عیدیں جیسے عید میلاد، عید الضحیٰ، بقرعید، جیسے عید مرگ، جیسے عید ملن، جیسے عید کارڈ جیسے عید بنگر وغیرہ۔"

بیگم ہنسی سے دوہری ہوتی ہوئی بولیں۔ "سجدا قربان جائیے آپ کی عید کی لسٹ کے۔ کیا اقسام بیان فرمائے ہیں آپ نے۔ طبیعت عش عش کر اٹھی ہے۔"

"عش عش میں کہیں غشی نہ طاری ہو جائے۔" لیکن میری باتوں پر توجہ دیئے بغیر بیگم نے کہا "آپ زیادہ باتیں مت بنائیے۔ اور لکھئے عید کی لسٹ۔ قلم کاغذ سنبھال لیجئے۔ اور (زیر لب مسکرا کر) اور دل کو تھام لیجئے۔"

"بہت خوب ....." میں نے دل کو بھلا کر بیگم تھام کر مری ہوئی آواز میں کہا۔ وہ اس لئے کہ اس فتنہ کو ٹالنے کی ہر کوشش ناکام ہو چکی تھی۔

"ببلو کے دو سوٹ ایک گرم ایک سرد میرا مطلب ہے ٹھنڈا سوٹ۔"

"ٹھنڈا سوٹ یا ٹھنڈا گوشت؟" میں نے وضاحت چاہی۔

"ٹھنڈا گوشت؟ یہ کیا ہوتا ہے؟" منہ دا کئے بیگم نے پوچھا۔

"ٹھنڈا گوشت ایک کہانی کا عنوان تھا اور اس ٹھنڈے سوٹ کے نام سے میں ٹھنڈا ہوا جا رہا ہوں۔"

بھول بھلیوں کی سیر کرتی ہوئی بیگم نے کہا۔

"ہاں تو ببلو کے دو سوٹ ایک گرم ایک ٹھنڈا۔"

"اس گرمی کے موسم میں گرم سوٹ کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

"ضرورت بھلے ہی نہ ہو لیکن رمضان میں جو کپڑے سلتے ہیں اُن کا اللہ تعالیٰ آخرت میں حساب نہیں لیں گے۔"

"تو کیا اللہ تعالیٰ وہاں ہر چیز کا حساب لیں گے؟"

"قطرہ قطرہ کا حساب لیں گے اور دریا در یا بخش دیں گے۔"

"تو میں آج ہی سے اپنے اکاؤنٹ کو درست رکھونگا اور کم سے کم خرچ کروں گا تاکہ کم سے کم حساب دینا پڑے۔"

"مگر میں نے کہا نا کہ رمضان کے اخراجات کا حساب اللہ تعالیٰ نہ لیں گے اس لئے گھبرانے کی ضرورت نہیں ــــ ہاں تو ببلو کے دو سوٹ۔"

"آپ بھی ایک ٹھنڈا ایک گرم پہنیں گی کیا؟"

"نہیں میرے لئے اتنی ضرورت نہیں۔ ایک عید کے روز کے لئے ایک عید کے دوسرے دن کے لئے .... بس۔"

"جب آپ کے میکا سے لوگ آئیں گے۔ کیوں کیسی کہی؟"

"ماشاءاللہ آپ کی سمجھداری لمحہ لمحہ ترقی پر ہے ..... ہاں تو آگے نوٹ کیا جائے۔ کچھی سیوئیاں کم از کم پانچ کیلو اور سادہ عام سیوئیاں ــــــ"

"..... کم از کم بیس کیلو" میں نے لقمہ دیا۔

مسکرا کر بیگم بولیں۔ "نہیں اس قدر نہیں۔ میں دس کیلو سیوئیوں سے کام چلا دوں گی۔"

"شکریہ! مگر کیا اس میں سے نصف میکا کے سلسلے میں تو نہیں؟"

"چشم بددور کیا دماغ پایا ہے آپ نے؟ کیوں نہ ہو آخر تو آپ ایم اے پاس ہیں۔"

"مگر ابھی چند لمحات پیشتر تو آپ فرما رہی تھیں کہ میری عقل موٹی ہے اور یہ کہ آپ میری افسر ہوتیں تو بجائے پروموشن کے ڈیموشن۔"

"نہیں اب ایسا نہیں ہوگا اطمینان رکھئے۔ ہاں آگے لکھئے دو عدد دو دو کیلو کے مرغ ....."

"دو عدد کیوں بھلا؟"

"پھر آپ کند ذہنی کا ثبوت دینے لگے۔"

اوہ! اوہ! سمجھ گیا سمجھ گیا۔ دوسرا دوسرے دن کے لئے جب آپ کے میکا والے نمودار ہوں گے۔ یہ کند ذہنی کے کچوکے بیچ بیچ میں ضرور دیتے رہا کیجئے۔ اس سے میری عقل کو جِلا آتی ہے۔"

گھی ایک کیلو کا ٹن نوٹ کر لیجئے باقی ڈالڈا کا میں خود انتظام کر لوں گی۔"

"گھی صرف ایک کیلو ہی کیوں۔ عید کے دوسرے دن کے لئے ایک کیلو اور کیوں نہیں"؟

"گھی تو میں دوسرے دن ہی کے لئے منگوا رہی ہوں۔ عید کے دن تو میں ڈالڈا سے ہی کام چلا دوں گی۔ مہنگائی کمر توڑ ہے سبھوں کو ن گھی کے پلاؤ کہاں سے کھلاتی رہوں گی۔"

پھر تو آپ کے میکا والوں کے لئے بھی ڈالڈا ہی بہتر رہے گا کچھ اور کفایت ہو جائے گی۔"

میں نے ڈرتے ڈرتے تجویز پیش کی جو مسترد کر دی گئی۔

"نہیں ان لوگوں کا ہاضمہ کمزور ہے وہ ڈالڈا ہضم نہ کر سکیں گے۔"

"تو پھر مرغا بھی ایک ہی کا رہنے دیجئے۔ مرغ ہضم کرنا تو اور بھی مشکل ہوگا اُن کے لئے عجب نہیں اُن کے معدوں میں جا کر لک دینا شروع کر دے گا!"

میری باتوں پر توجہ نہ دیتی ہوئی گویا ہوئیں۔

"نہیں مرغ بہت زود ہضم غذا ہوتی ہے۔ ڈاکٹر پرہیزی میں لکھتے ہیں۔ زیادہ بحث کر کے آپ پھر کند ذہنی کا ثبوت مت بیجئے۔ ہاں تو آگے نوٹ کیجئے۔ کشمش۔ کھری۔ بادام۔ پستہ وغیرہ ایک ایک سو گرام اور خرمہ ڈھائی سو گرام اور بس۔"

"یہ سب کس دن کے لئے ہیں۔ عید کے روز کے لئے یا ....."

"پھر آپ کند ذہنی کا ثبوت دینے لگے ـــــــ یہ عید کے دوسرے دن کے لئے ہے۔"

وہ تو ہے مگر ان سبھی آئٹموں کے لئے فنڈ کہاں سے آئے گا؟

میں نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

"فنڈ مہیا کرنے کی ذمہ داری آپ مردوں پر ہے۔ میں ہفتہ روز پیشتر اسی لئے آپ کو عید کی لسٹ لکھا دے رہی ہوں تاکہ وقت پر آپ یہ نہ کہیں کہ فنڈ نہیں ہے۔" یہ کہہ کر بیگم اُسی تیزی سے چلتی بنیں جس تیزی سے نمودار ہوئی تھیں۔ ریڈیو بج رہا تھا مگر میرا ذہن اُس کے پروگرام سے دور فنڈ کی فراہمی کے سلسلے میں غلطاں و پیچاں تھا۔

احمد حسین حیات
(ہنگ نڈہ)

کہتے ہیں کہ انسان کو تیسری بار ہارٹ اٹیک ہو جائے تو اس کا مرحوم ہو جانا یقینی ہو جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں دوست احباب فاتحہ کے بہانے دہم و چہلم کا کھانا میسر آجاتا ہے۔ چنانچہ ایک دن ہمیں بھی ایک عجیب و غریب بیماری نے آگھیرا۔ دوستوں کو یقین ہو گیا ہمارے چل چلاؤ کا وقت آگیا ہے۔ ہمارا دماغ فلسفیوں جیسا ہو گیا کائنات کی ہر چیز میں ہمیں قدرت کا جلوہ نظر آنے لگا ہر چیز حسین و جمیل نظر آنے لگی۔ حد تو یہ کہ ہمیں بیماری کی حالت میں گدھے کا بچہ بھی پیارا نظر آنے لگا۔ اگر ہمیں جگ ہنسائی کا ڈر اور جیل جانے کا خوف نہ ہوتا تو گدھے کے بچے کی "خوبصورتی" پر ایک بوسہ ثبت کر دیتے۔ خیر صاحب یہ تو بیماری کے اٹیک کے پہلے دن کا تھا لیکن جیسے جیسے دن گزرتے گئے اور بیماری بڑھتی گئی ہماری حالت صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھتی گئی۔ گال پچک گئے آنکھیں اندر دھنس گئیں۔ قد سے کوب نکل آئی۔ مختصر یہ کہ بھری جوانی میں بوڑھے نظر آنے لگے۔ کھانا فقط دو وقت ہی بڑی مشکلوں سے کھایا۔ ہمارے دوست واحباب ہمیں مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے ہمیں قطعہ تاریخ کہنے کی فرمائش کرنے لگے۔ ادھر گھر میں والدہ صاحبہ ہماری حالت کو دیکھ دیکھ کر نیم سوختہ ہو گئی تھیں چونکہ ہمیں کھانے سے نفرت سی ہو گئی تھی اس لئے گھر میں پھل پھلاری آنے لگی تھی۔ لیکن ہر چیز بدمزہ معلوم ہونے لگی تھی اس بیماری میں ہمیں ایک عادت سی ہو گئی تھی کہ ہم بس خلاء میں گھورتے رہتے۔ ہم ہمیشہ سوچوں میں غرق رہتے جیسے پیرو مرشد اپنے مراقبہ میں غرق رہتے ہیں۔ ہمارے رشتہ داروں کے مشوروں پر ہماری والدہ صاحبہ مقامی عامل کے پاس جھاڑ پھونک بھی کروا لائیں لیکن نتیجہ وہی صفر۔ چنانچہ وہ اوپر والے پر آس لگائے بیٹھی تھیں۔

ہماری یہ حالت زار دیکھ کر اور ہماری والدہ صاحبہ پر ترس کھا کر ہمارے محلے کے ایک بزرگ جنہیں سارے محلے والے نانا جی کہتے ہیں ہمارے مکان تشریف لے آئے اور ہماری والدہ صاحبہ کو دلاسہ دیا بھلا کسی کے دلاسے سے کیا ہوتا ہے ہماری والدہ صاحبہ تو زار و قطار آنسو بہائے جا رہی تھیں۔ آخر کار "نانا صاحب" کو ایک تدبیر سوجھی میں آئی اور وہ ہماری والدہ صاحبہ سے بولے "بیٹی میری زندگی کا کیا بھروسہ ہے پتہ نہیں کب سانس اکھڑ جائے کیوں نہ اس دنیا سے جاتے جاتے ایک نیک کام کر جاؤں مجھے ایک تاریخی واقعہ یاد آیا"۔ یہ کہتے ہوئے انھوں نے والدہ صاحبہ کو ایک مٹی کا دیا لانے کو کہا۔ نانا صاحب کے الفاظ "تاریخی واقعہ" اور "مٹی کا دیا" پر ہمیں شہنشاہ بابر کی قربانی یاد آئی جو انہوں نے اپنے بیٹے کے لئے دی تھی۔ نانا صاحب کے کہنے پر ہماری والدہ صاحبہ دوڑتی گئیں اور جھٹ مٹی کا دیا لے آئیں نانا صاحب کے ہاتھوں میں تھما دیا۔

... ت ہوتے ہی نانا صاحب اس دیا کو جلائے اور اپنے ہاتھوں میں تھامے ہماری چارپائی کے اطراف طواف کرتے ہوئے

ورد کرنے لگے۔ "خدا میرے بیٹے کو تندرستی عطا فرمائے اور اس کی ساری بلائیں، آفتیں اور بیماری مجھے لگ جائے . . . ." نانا صاحب آدھی رات تک اسی طرح ورد کرتے رہے اور میری چارپائی کے اطراف چکر لگاتے رہے۔

تو صاحب! خدا کی قدرت دیکھئے کہ صبح جو ہوئی تو ہم چارپائی سے اُٹھ بیٹھے اور چاق و چوبند سے دکھائی دینے لگے۔ ہماری اس تبدیلی پر والدہ صاحبہ خوشی سے پھولی نہ سمارہی تھیں۔ اب ہم جب یہ مضمون لکھ رہے ہیں تو ہمیں خوشی ہے کہ بیماری سے چھٹکارا پاچکے جس کے لئے ہم اپنے محلے کے نانا صاحب کے احسان مند ہیں۔ لیکن افسوس ہمیں اس بات کا ہے کہ ہمارے نانا صاحب ہماری "بیماری" میں مبتلا ہوگئے ہیں۔ اور وہ ہمارے محلے ہی کی ایک نانی صاحبہ کے "عشق" میں مبتلا ہو کر نانا صاحب نانی کے گھر کے چکر کاٹ کاٹ کر محلوں کا ریکارڈ توڑنے پر تلے ہوئے ہیں۔

●●

شکیل رضا بنگلوری

بڑھاپے کے شوق

انسانوں کو الگ الگ عمریں نصیب ہوتی ہیں۔ کم اور زیادہ کا پیمانہ قانونِ قدرت کا ایک امتیازی نشان رہا ہے۔ کبھی اس قدر کم عمر کہ آنِ واحد میں دنیا کی ایک جھلک دیکھی اور لوٹ گیا۔ اور کبھی سنچری مکمل کر لی۔ لیکن بھلا ہو قانونِ وقت کا کہ انسان کی عمر ۵۸ یا ۶۰ سال ہوئی اور ملازمت سے سبکدوش کر دیا گیا اور ثابت کر دیا گیا کہ قدرت کے نزدیک انسانوں کی عمریں کتنی ہی کیوں نہ ہوں لیکن حکومت کے نزدیک ساٹھ سال سے زیادہ نہیں ہو سکتی!! لہٰذا انھیں ذمہ داریوں سے ریٹائر کر دیا جائے، ہمیں اس طرح کا قانون بنانے والوں کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ صرف سبکدوش کر دیا جاتا ہے۔ اگر کہیں ساٹھ سال کی عمر کے بعد سبکدوشی کی بجائے گولی سے اُڑا دیا جاتا تو ہم اور آپ کیا کر لیتے؟ ویسے یہ تو قبول کرنا پڑتا ہے کہ ساٹھ سال کے بعد انسان بوڑھا ہونے لگتا ہے۔ اور بقولِ حکومت اِس عمر میں انسان کسی کام کا نہیں ہوتا لیکن اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی ہے کہ اس عمر میں کسی کام کے نہ ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ کام کے آدمی بن جاتے ہیں!! اپنے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی!!

آیئے ہم مذکورہ امر پر غور کریں! ہمارے خیال میں یہ لوگ دنیا کے سارے دھندوں اور اپنی ساری مصروفیات اور ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو کر یعنی کہ روزی، روزگار سے لے کر بچے پیدا کرنے اور گھر بار سنبھالنے تک کی ساری جھنجھٹوں سے آزاد ہو کر صرف اور صرف اپنی ذات یعنی کہ خود کو بنانے اور سنوارنے میں اپنا سارا وقت گزارنے لگتے ہیں۔ ویسے یہاں ایک بات قابلِ ذکر ہے۔ وہ یہ کہ دنیاوی امور سے اپنے آپ کو آزاد کرانے کے باوجود دانستہ یا نادانستہ طور پر اپنی ذات کو بنانے اور سنوارنے کی کوشش میں یہ لوگ ایک بار پھر دنیاوی امور کے دلدل میں پھنس کر رہ جاتے ہیں۔ بوڑھا گھوڑا لال لگام کے مصداق۔ صحت عامہ اور فیملی پلاننگ والوں کے لاکھ روکنے، منع کرنے اور سر پھوڑنے کے باوجود یہ لوگ اپنا سر اپنی ناک اور خاندانی ناموس کو بحال رکھنے کی کوشش میں از سرِ نو بلوغت کے زینے پھلانگنے لگتے ہیں۔ اور گھر کی بہو بیٹیاں اپنی ساسوں کے پیر بھاری دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جاتی ہیں۔ ہم نے سنا ہے کہ بڑھاپا جوانی کا اصل روپ ہوتا ہے۔ اور ازدواجی زندگی کا صحیح لطف تو بڑھاپے میں ہی ملتا ہے۔

آیئے کچھ بوڑھوں کے مشغلوں کے بارے میں غور و فکر کریں۔ اس عمر میں یہ لوگ "ارلی مارننگ" اپنے بستر سے اُٹھ جانے کو اپنا مشغلہ بنا لیتے ہیں۔ اس لئے کہ دنیا سے اُٹھ جانا تو حضرتِ انسان کی بس کی بات نہیں ہے لیکن یہ بات تو قابلِ غور ہے کہ یہ لوگ خصوصیت کے ساتھ عمر کے اس حصے میں بستر سے اِتنی جلدی کیوں کر اُٹھ جاتے ہیں؟ سونا تو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ جنہیں سونا نصیب نہیں ہوتا۔ وہاں نہ خوشبودار ریشمی زلفیں ہوتی ہیں۔ اور نہ ہی کم خواب کا بستر۔ یہ لوگ صبحِ صادق سے پہلے اس لئے بستر سے اُٹھ جاتے

ہیں کہ یہ لوگ رات میں سوتے ہی نہیں۔ اس بات سے قطع نظر کہ راتوں میں نہ سونے والوں کو کس نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ زندگی کے سفر میں یہ لوگ اس قدر جاگے ہوئے ہوتے ہیں کہ ان کی آنکھوں سے نیند ہی نو دو گیارہ بلکہ اٹھارہ ہو جاتی ہے۔ ثبوت کے طور پر ہم آپ سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ نے ان لوگوں کو اکثر و بیشتر بے خوابی کی شکایت کرتے ہوئے ضرور دیکھا ہوگا۔ ایسے ہی ایک بزرگ کی شکایت پر کہ جب سے وہ ریٹائر ہوئے ہیں۔ آنکھوں سے نیند ہی غائب ہو گئی ہے، ہم نے اپنے خاندانی حکیم سے جو خود بھی ایک بڑے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور راتوں میں کم سوتے ہیں۔ نیند کے مسئلے پر ان کی رائے معلوم کی تو حکیم صاحب نے اپنی سفید ریش پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے بڑے ہی مدبرانہ انداز میں کہا کہ یہ نیند کا مسئلہ ایسا ہے جیسے معشوق کا مسئلہ، آج تک بڑے بڑے حکماء اس مسئلے کا حل نہیں ڈھونڈ سکے ہیں۔ ویسے جہاں تک ہمارا خیال ہے اکثر قبض کی وجہ سے بھی ایسا ہوتا ہے!!

مشغلوں کی بات تو خیر ہوتی رہے گی اب آیئے زمانے کی وضع قطع پر بھی ایک طائرانہ نظر ڈالیں آپ بوڑھاپے کی چال سے تو خوب واقف ہوں گے۔ یہ بھی خوب ہے کہ بڑھاپے کی چال کے ساتھ ایک عدد ڈھال یعنی کہ ایک عدد لاٹھی، بھالا، تیغ و تلوار یا کم از کم چھڑی کا ہونا تو ضروری ہے۔ اس پیرانہ چال ڈھال کے ساتھ اک انداز تکلم بھی تو ہونا چاہیئے۔ کیوں کہ ساری عمر تو دنیا والوں سے تو تو میں میں کرتے ہوئے گزر گئی۔ اب جو زندگی کے چند دن باقی رہ گئے ہیں۔ ان دنوں کو پیار و محبت خلوص و وفا۔ ایثار و قربانی کی حلاوت میں گھول کر کیوں نہ پی جائیں خصوصیت کے ساتھ صنف نازک سے گفتگو کا انداز تو بہت ہی خاکسارانہ ہوتا ہے، جیسے ساری تہذیب اور شائستگی تو صنف نازک کے لئے وقف کر دی گئی ہے۔ اب رہا دیکھنے دکھانے اور کھانے پینے کا کیا اسٹائل ہونا چاہیئے۔ جہاں تک دیکھنے کا سوال ہے اس کے لئے تو ایک عدد چشمہ ل ہی جاتا ہے۔ اب یہ چشمہ چاہے آنکھ پر رہے یا ناک پر کوئی فرق نہیں پڑتا!! رہی کھانے پینے کی بات۔ یعنی کہ غذا کا مسئلہ تو ایک عالمگیر مسئلہ بن گیا ہے۔ آخر ہم کھانے کے لئے ہی تو پیدا ہوئے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ لوگ جینے کے لئے یعنی کہ زندہ رہنے کے لئے کھاتے ہیں۔ اگر کچھ لوگ کھانے کے لئے زندہ رہتے ہیں تو کیا حرج ہے۔ اور پھر یہ لوگ کھاتے ہیں تو کسی کو کیا فکر ہو سکتی ہے کیوں کہ ان کی زندگی کی ریل گاڑی ایک دن اسٹیشن سے نکل کر سیدھے جنت کے پلاٹ فارم پر جاکر رکے گی۔ خون عموماً اس عمر میں زیادہ جوش مارتا ہے۔ تو پھر کیوں نہ لباس کا رنگ بھی سرخ ہی رکھا جائے۔ مگر من کی سیاہی چھپانے کے لئے بالوں کا سفید ہو کی سلائیں تو کیا حرج ہے۔ اس لئے کہ اس عمر میں جو بھی کام ہوگا وہ سفید ہی ہوگا سیاہ نہیں ہوگا لیکن سفید ریش کی رنگائی ضرور ہوگی یعنی کہ مہندی لگائی جائے گی۔ مہندی کے ساتھ جنت الفردوس کی خوشبو سیدھے جنت میں پہنچا دے گی۔ لہٰذا خود بھی لگائیں گے اور دوسروں کو بھی لگائیں گے۔ کیوں کہ آج کل مسکہ مارنے کی جگہ عطر لگانا شروع ہو گیا ہے۔ شام کی سیر و تفریح کے لئے نکلا جانے کا گھومنا پھرنا تو صحت کی نشانی اور بوڑھاپے کے لئے جزو لازمی ہے سڑکوں، پارکوں کو آباد کیا جائے گا۔ اور کبھی طبیعت اوب جائے تو ذائقہ بدلنے کے لئے کسی کالج، لائبریری یا کسی بڑے دواخانے کے دو چار چکر بھی لگائے جائیں! اکثر لوگ بڑھاپے میں دوسروں کے ٹکٹ کٹ کر رہ جاتے ہیں۔ لیکن ایسے بھی لوگوں کی کمی نہیں ہے، جو بڑھاپے میں یہ سوچتے ہیں کہ اب تو کچھ نیک کام کرلیں۔ کچھ تو انسانوں کی خدمت کرلیں۔ آخر ایک دن تو خدا کو بھی منہ دکھانا ہے۔ کیا منہ لے کر جائیں گے جبکہ ساری عمر تو قوم میں پھوٹ ڈال کر لڑاتے رہے۔ بے گناہ اور معصوم انسانوں کا خون بہاتے رہے۔ یہ بے چارے اس بات کا دعویٰ نہیں کرتے کہ وہ قوم کا بیڑا پار لگا دیں گے۔ قوم کی قیادت کے لئے اگر وہ اپنی وضع قطع نہ بدلیں۔ جلسوں کی خیرات وغیرہ اپنی شخصیت نہ ابھاریں تو آپ انہیں کہاں پوچھیں گے۔ علاوہ ازیں سے کا اہتمام کیوں کر کریں گے۔ دوسروں کی خدمت کے پردے میں خود ان ہی کا فائدہ پوشیدہ ہوتا ہے اور شہرت پانے کے لئے آدمی کو کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ اگر آدمی مشہور نہ ہو تو اسے کوئی گھاس نہیں ڈالے گا۔ لہٰذا شہرت پانے کے لئے زمی رہنا، لیڈر، سیاستدان، فلاسفر، دانشور یا کم از کم شاعر و ادیب کا سوانگ بھرنا ضروری ہے ورنہ ملک و قوم کی خدمت کس طرح کی جا سکتی ہے!

■■

شفیق الرحمٰن
(پاکستان)

آئینۂ تقدیر

(واضح رہے کہ یہ باتیں محض قیاس پر مبنی نہیں بلکہ ہمارے ماہر علم نجوم و جوتش نے اپنے قیمتی تجربے اور تحقیقات سے اخذ کی ہیں)

چاہیئے تو یہ تھا کہ ہم اس قسم کے متعدد زائچے پیش کرتے۔
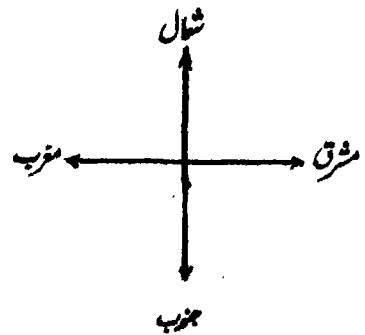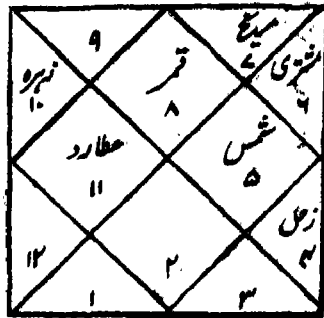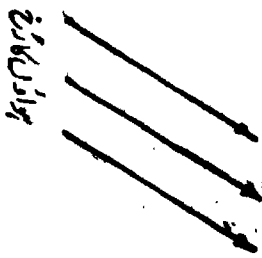
اسکیل: ایک انچ = کئی ہزار بلکہ کئی لاکھ میل

لیکن ہمیں افسوس ہے کہ جگہ کی قلت کی وجہ سے ایسے دیدہ زیب اور عام فہم زائچے شامل نہیں کئے جاسکے۔ البتہ ان کی جگہ ایک سادہ سا عملی زائچہ ضرورت مندوں کے لئے درج ہے۔
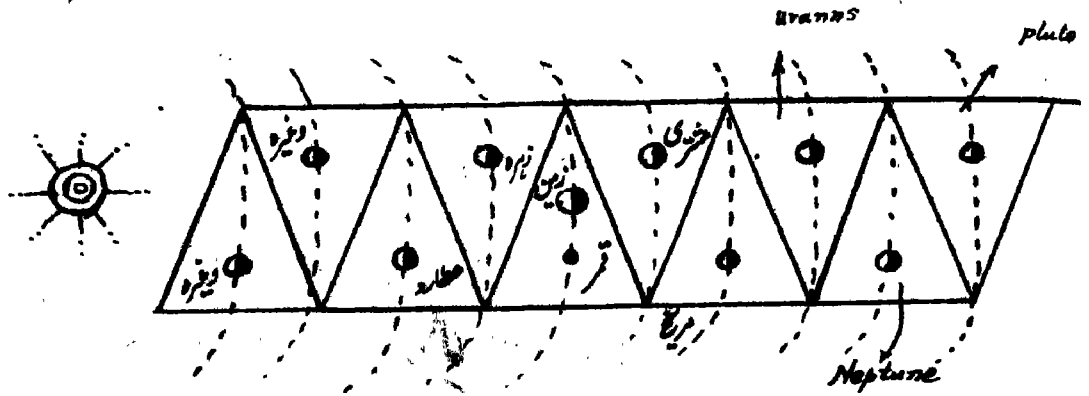
لت سیارگان:۔۔۔ بادشاہِ سال شمس ملک فلک چہارم (اور پنجم و ششم) حاکم اقلیم خراسان ہے۔ مہینے کا
ر یعنی چندرماں مالک فلک اول قرار دیا گیا ہے اور دسویں استھان میں پڑتا ہے، برچھک راس والوں کا ستارہ
ہے جس کا پایہ زحل ہے اور برنج شمد ۔۔۔ اتفاق سے تلا راس والوں کا بھی یہی ستارہ ہے۔ لطف یہ ہے کہ
س متعین راس۔ یہاں تک کہ کرک راس والوں پر بھی اس کا اثر پڑ سکتا ہے۔ البتہ دھن راس اور
س والوں کی اور بات ہے۔

جو اس مہینے میں پیدا ہوئے ہیں۔ ان میں بے شمار خوبیاں ہوتی ہیں، یہ لوگ حسن کے شیدائی اور لذیذ
ں کے دلدادہ ہوتے ہیں خصوصاً شیریں اشیاء سے ذوق کامل ہوتا ہے (لہذا خوش خوراکی سے امراض شکم میں
مبتلا ہو جاتے ہیں اور اول الذکر خوبی کی وجہ سے اوائل عمر میں شادی ہو جاتی ہے) شرمیلے ہوتے ہیں اگرچہ
دماغی برتری اور قوت بازو کا ہر وقت احساس رہتا ہے پھر بھی ان دونوں خوبیوں کا مظاہرہ شاذ و نادر ہی
ہیں۔ یہ نہایت ہی حساس ہوتے ہیں۔ کوئی دوسرا ان پر سبقت لے جانے کی کوشش کرے تو خفا ہو جاتے
ور عمر بھر اس کی جسارت کو معاف نہیں کرتے۔ قدرے وہمی ہوتے ہیں۔ تیرہ کے ہندسے کو منحوس اور سات کو
۔ سمجھتے ہیں۔

پیری مریدی کا بھی چسکا ہوتا ہے۔ کم گوئی ان کی فطرت کا خاصہ ہے۔ (لیکن اس وقت تک افواہوں کا لب کشا
ا شروع نہیں ہوتا) قوت برداشت رکھتے ہیں۔ لیکن اس قوت کا استعمال بہت کم کرتے ہیں۔ کٹھن سے کٹھن
میں بھی رجائیت اور خوش فہمی کا دامن نہیں چھوڑتے اور ناگہانی دولت ہاتھ آ جانے پر پورا یقین رکھتے ہیں
انہیں لاٹری، کالے جادو، سٹہ، گھوڑ دوڑ، معموں، ہیروں اور زمینوں پر کامل اعتقاد ہوتا ہے۔ انہیں
ں سے خاص رغبت ہوتی ہے۔ اور ریڈیو سیلون باقاعدگی سے سنتے ہیں۔ دیگر فنون لطیفہ کا شغف انھیں

بار بار فلمیں دیکھنے پر مجبور کرتا ہے۔ ان میں ذہنی تجسس کا مادہ بہت پایا جاتا ہے۔ (لہذا پڑوسیوں اور دوسرے لوگوں کے متعلق تازہ ترین اور قدیم ترین معلومات فراہم کرنے کی لگن لگی رہتی ہے)۔ کبھی کبھی گفتگو میں شیرینی اور انداز میں سلیقہ شعاری نمایاں ہوتی ہے۔ حصول علم میں بڑی سرگرمی دکھاتے لیکن فقط امتحانوں تک۔ تعلیم سے فارغ ہو چکنے یا ملازمت مل جانے کے بعد علم کے پاس بہت کم پھٹکتے ہیں۔ ماضی کا بڑا خیال رکھتے ہیں اسی لئے بھولے بسرے دنوں کی یاد میں اکثر کھوئے رہتے ہیں (خصوصاً شوہر) طبیعت میں ..... بلا کی سادگی ہوتی ہے۔ ذرا سی بات پر خوش ہو جاتے ہیں اتنی سی بات پر غمگین ہو جاتے ہیں۔ ویسے دھن کے پکے ہوتے ہیں۔ خط ڈالنا ہو تو سڑک اور موٹروں اور لاریوں کی طرف نہیں دیکھتے۔ دور سے سیدھے لیٹر بکس کی طرف لپکتے ہیں خواہ راستے میں حادثہ ہی کیوں نہ ہو جائے بیشتر اوقات تو رومانی ہوتے ہیں۔ اور طرح طرح کے جدت آمیز منصوبے باندھتے ہیں خصوصاً دوسروں کے لئے نہایت ہی اعلیٰ درجے کے منصوبے تیار کر سکتے ہیں۔

دیگر خصوصیات : ــــ ان کا قد پانچ سے چھ فٹ تک ہوتا ہے۔ رنگ سفید یا گندمی یا مشکی یا سیاہ وزن ایک من سے تین من تک۔ جسمانی لحاظ سے ان کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ دبلے پتلے اور موٹے تازے، اول الذکر باتیں کرتے رہتے ہیں۔ آخر الذکر کھاتے اور سوتے رہتے ہیں۔"

مبارک پھول ۔ گوبھی کا پھول　　　　مبارک دن ۔ اتوار

مبارک مہینہ ۔ چھٹی کا مہینہ　　　　مبارک وقت :۔ لنچ اور ڈنر کا وقت

مبارک ہندسے :۔ ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، اور ۱۰

مبارک نگ :۔ یاقوت، فیروزہ یا نیلم (اگر خریدنے کی توفیق ہو تب ورنہ نہیں)

شادی خانہ آبادی : ــ جن کا نام الف سے شروع ہوتا ہے ان کی شادی ان لڑکیوں سے مبارک ثابت ہوگی جن کے نام "ب" سے شروع ہوتے ہیں (اگر بزرگ رضامند ہوئے تب) ب والوں کی شادی الف والیوں سے سعید رہے گی (اگر بزرگ رضامند ہوئے) بقیہ ناموں والے لڑکے لڑکیاں اسی فارمولے (اور بزرگوں کی رضامندی) کے مطابق حساب لگالیں ویسے شادیاں سب کی ہو جائیں گی۔ Career Girls کو بھی اس سلسلے میں خوشخبریاں ملیں گی۔

یہ مہینہ کیسا ہے؟

اس مہینے میں شمس، قمر اور مریخ خیریت سے ہیں (سوائے قمر کے جس پر راکٹ وغیرہ بھیجے جا رہے ہیں) دیگر سیارگان بھی اچھی حالت میں ہیں لہذا شائقین کسی عجیب و غریب پیشن گوئی یا سنسنی خیز انکشاف سے محروم رہیں گے۔

اس مہینے میں صبح علی الصبح طلوع ہو کر مغرب کے وقت غروب ہوگا۔ پہاڑی علاقوں میں خشکی اور صحرائی

فصلوں میں تمازت رہے گی۔ کہیں کہیں بارش کے چھینٹے پڑیں گے۔

شادی کرنے، آپریشن کرانے، عاشق ہونے اور دیگر جرأت مندانہ اقدام کے لیے یہ بہترین مہینہ ہے۔ فلم سازی کے لئے بھی بہت موزوں ہے (کیونکہ فلم کیسی ہی اوٹ پٹانگ ہو۔ دیکھنے والے ہر شام جوق در جوق پہنچ جاتے ہیں) فلم ایکٹروں اور ایکٹریسوں کو بھی یہ مہینہ راس آئے گا۔ ان کی صحت ماشاء اللہ اور بھی بہتر ہو جائے گی اور تین چار سیر وزن بڑھ جائے گا۔ البتہ شائقین کو بار بار سینما ہال میں تین چار گھنٹے بیٹھنے سے امراض بلغمی ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

گمشدہ بخیریت گھر واپس پہنچ جائیں گے (روپے ختم ہونے پر) صنف نازک سے دلچسپی برقرار رہے گی۔ لوگ تعمیری کاموں میں حصہ لیں گے۔ یعنی ان کا رجحان عمارتیں بنانے کی طرف بہت ہوگا۔ یہاں تک کہ وہ جو پہلے کئی عمارتیں کھڑی کر چکے ہیں نہایت جوش و خروش سے مزید تعمیر میں منہمک رہیں گے۔

چند اچھے لوگوں سے تعلقات پیدا ہوں گے (اگر ان سے خلوص سے ملے اور کوئی مطلب نہ ہوا) مال مویشی کی تجارت نفع بخش ثابت ہوگی۔ کسی قسم کے تنازع سے (جو بالکل بے معنی ہوگا) طبیعت چند دنوں تک گری گری سی رہے گی۔ اولاد کی طرف سے چند گھنٹے سکھ اور چین نصیب ہوگا۔ کوئی دلی مقصد پورا ہوگا۔ (اگر اس کے حصول کے لئے پسینہ بہائے تب) کوئی نیا کام شروع کرنا —— نفع بخش ثابت ہوگا۔ لیکن وہی کام دوسروں کی شرکت سے کیا تو پتہ نہیں نفع ہوگا یا نقصان - پانچ چھ مرتبہ خوش کن خواب نظر آئیں گے۔ لیکن انعامی معموں کا حل خلاف توقع کچھ اور نکلے گا۔ چند الجھنوں کی وجہ سے ادھر اُدھر جانا پڑے گا۔

کچھ لوگ ناحق جوش میں آکر بیاہ شادیوں پر بے تحاشہ خرچ کر بیٹھیں گے اور آٹھ مہینے تک زحل کے قریب عطارد اور قمر کا اجتماع ہوگا تو دل کھول کر پچھتائیں گے (وہ لوگ) کچھ نقاد آپس میں بدگمان ہو جائیں گے۔ جس سے ادب کو فائدہ ہوگا۔ چند ناشر ایک دوسرے کو شبہ کی نگاہ سے دیکھیں گے جس سے کتابیں زیادہ چھپیں گی۔ اہل قلم کی حالت حسب معمول رہے گی لیکن وکیل، ڈاکٹر، حکیم و سوداگر نفع میں رہیں گے۔ اگر اپنے آپ کو صبر و ضبط کی حدود میں پابند نہ رکھا تو بیوی کے عزیزوں سے کشیدگی کے امکانات روشن ہیں۔ کوئی مہربان نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا۔ لیکن یکایک آپ کو چھوڑ کر کسی مشتری ستارے والے کے پیچھے پڑ جائے گا۔ اگر بچوں کو حدود میں رکھا تو کسی شدید پریشانی کا سامنا ہوگا۔ بعض اوقات اپنے کام سے جی اچاٹ ہونے لگے گا۔ پھر عزیزوں، دوستوں سے جی اُچاٹ ہوگا اور آخر میں اپنے آپ سے (لیکن اس میں سیاروں کا کوئی قصور نہیں ہوگا)۔

گزشتہ ماہ کی طرح کوئی دم دلاسہ دے کر روپے اینٹھنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اس مہینے یہ عجیب بات ہوگی کہ سونے میں ہاتھ ڈالا تو سونا ہی رہے گا مٹی میں ہاتھ ڈالا تو مٹی ہی رہے گی۔ دشمنوں کا خوف لگا رہے گا۔ اُدھر دشمن آپ سے خطرہ محسوس کریں گے۔ چنانچہ اسی خوف میں متعلقین کا کافی وقت ضائع ہوگا، اندرون خانہ کچھ

...ں رہے گی۔ (اگر بیرونِ خانہ کچھ پریشانی نہ رہی تب) طفلانِ خوردسال و مستورات کو کچھ اسرارِ مددوں کی ...یت رہے گی۔ حیوانوں پر خصوصاً تانگے کے گھوڑوں پر ظلم و ستم ڈھائے جائیں گے۔ بنے بنائے کام کے لئے فالتو مدد ...ری تو رکاوٹیں پیدا ہوں گی۔ قرضدار کا قرضہ ادا نہیں ہوگا اور نہ ——— قرض خواہ مقروض سے کچھ وصول کر سکے ... بچے کافی تعداد میں پیدا ہوں گے جن میں سے تقریباً نصف لڑکے ہوں گے اور نصف لڑکیاں (لیکن پبلک کو ...ی شبہ رہے گا کہ لڑکیاں زیادہ پیدا ہو رہی ہیں)۔

دفتر میں کام کرنے والوں کو تیجر کی شکایت رہے گی۔ اور جن لوگوں کو یہ پتہ ہے کہ خون کا دباؤ کیا ہے ان کے ...ن کا دباؤ بڑھ سکتا ہے۔ گھریلو حالات میں پریشانیوں کے سبب طبع نازک میں چند دنوں تک غیظ و غضب رہے گا ...جس سے کوئی متاثر نہیں ہوگا بلکہ اُلٹا سب ہنس دیں گے۔

چند ہدایات :- سہ پہر کو صنفِ نازک سے ملنے نہ جائیں کیوں کہ وہ ابھی سو کر اُٹھی ہوں گی اور ...یک اپ بھی نہیں کیا ہوگا۔ دوسروں کو صحیح رائے دیتے وقت محتاط رہنا چاہیئے۔ اگر رائے اُن کی مرضی کے خلاف ...وئی تو فوراً خفا ہو جائیں گے۔ نظر کمزور ہے تو احتیاط سے چلیں پھریں۔ جن لوگوں نے گزشتہ ماہ والی باتیں اور ...رکتیں کی ہیں۔ ان کے حالات گزشتہ ماہ والے رہیں گے۔ منگیتروں سے ملنے کے لئے شام کا وقت چنیں (جتنے زیادہ ...نگیتروں سے مل سکیں اتنا ہی فائدہ ہوگا) کم از کم تاش کے ذریعہ جوا نہ کھیلیں۔ اگر آپ ہار گئے تو چڑ کر دوسرے ...ھلاڑیوں سے لڑیں گے۔ جیت گئے تو وہ چڑ کر آپ سے لڑیں گے۔ بس میں سفر کرتے وقت چوکنے رہیں۔ کھڑکی ...سے باہر کود جانے کے لئے تیار رہیں۔ دار چینی میں شہد ملا کر چاٹنے سے ہچکی بند ہو سکتی ہے۔

کاروباری زائچہ :- یہ تو بچہ بچہ جانتا ہے کہ برج ثور میں جب شمس اور مریخ کا اجتماع ...وگا سوداگروں کی طبیعت خوش رہتی ہے اور مارکیٹ کا رُخ دونوں طرف رہتا ہے۔ گڑ اور بعض دوسری اشیاء ...کے دام گریں گے۔ البتہ زعفران، مشک نافہ، جواہرات اور ہاتھی دانت کے بھاؤ اُوپر چلے جاتے ہیں۔ اس مہینہ کی ...سہ چارٹ کے مطابق گیہوں، مونگ، مسور، باجرہ اور سفید اشیاء گھی، دودھ، چینی، روئی، دہی، سوت، ...غیرہ کے بھاؤ ان لوگوں کو جن کے پاس روپے ہیں سستے معلوم ہوں گے۔ گھاس کی افراط سے چوپایوں کی صحت ...ابلِ رشک رہے گی۔ لیکن پانی میں دودھ کی آمیزش سے خبردار رہیں۔ گندم نما جَو فروشوں سے بچیں بلکہ جو نما گندم ...فروشوں سے بھی میل جول نہ رکھیں، شادی کرانے والوں کو سونے چاندی کے نرخ خواہ مخواہ مہنگے معلوم ہوں گے۔

مہینے کے شروع میں اگرچہ سیارگان کاروباری لحاظ سے کچھ زیادہ سعید نہیں ہوں گے۔ پھر بھی ملازمت پیشہ ...لوگوں کو بازار کی ہر چیز سستی معلوم ہوگی۔ دوسرے ہفتہ میں سیارگان سعید ہو کر بھاؤ کم کرا دیں گے لیکن تب

ہ لوگ مہنگائی کی شکایت کریں گے حتیٰ کہ مہینے کے آخری ہفتے میں تو معمولی اشیاء خریدنے سے بھی قاصر رہیں گے۔

نوٹ:۔ خوش قسمتی سے ہمارے ماہر علم نجوم و جوتش نے فقط مہینے کا ذکر کیا ہے۔ متعلقین کے سن پیدائش پر زور نہیں ڈالا۔ چنانچہ یہ پیشین گوئی اور ہدایتیں دو برس کے بچوں کے لیے بھی اتنی ہی اہم ہیں جتنی کہ ستر اسی برس والوں کے لیے، خواتین اور حضرات دونوں پر ان کا اطلاق یکساں ہے۔

ہمارے ماہر علم نجوم و جوتش نے جغرافیائی تقسیم کو بھی نظر انداز کیا ہے (غالباً اس لیے کہ آسمان کے ستارے نیا کے سارے ملکوں سے نظر آسکتے ہیں) لہٰذا یہ پیشین گوئی اور ہدایات جہاں جاپانیوں پر عائد ہوتی ہیں وہاں بلکہ دراسکیمو بھی ان کی زد میں ہیں۔ آفریقہ کے باشندے اور ولائتی لوگ بھی۔

کائنات میں لاتعداد سیارگان ہیں۔ لیکن خوش قسمتی سے ہم مجبور و فانی انسانوں پر فقط ان چند سیاروں ا اثر پڑ سکتا ہے جن کے ہم نے نام رکھے ہوئے ہیں۔ یعنی شمس، قمر، مریخ، زہرہ، عطارد، مشتری، زحل اور ئ ارض (جس پر ہم آباد ہیں اس لیے اسے کوئی اہمیت نہیں دیتے د اس کا کوئی اثر قبول کرتے ہیں)۔ ان کے علاوہ Uranus، Pluto، Neptune بھی ہمارے محبوب سیاروں کی برادری ں شامل ہو چکے ہیں لیکن ان کا ابھی تک اُردو میں ترجمہ نہیں ہوا۔ یہ ہماری زندگیوں پر اثر انداز ہونے لگے ہیں یکن پورے زور و شور سے نہیں۔ یہ مترجم کی راہ تک رہے ہیں اور اُردو نام پاتے ہی بڑی سرگرمی سے ام شروع کردیں گے۔

لطف یہ ہے کہ ستارے فقط رات کو چمکتے ہیں لیکن ان کا اثر ہم پر دن کے وقت ہوتا ہے۔

**

برق آشیانوی

برق و شرر

(مستقل فیچر)

بوڑھوں اور نوجوانوں کا تناسب

یہ جان کر ہمیں بے حد مسرت ہوئی کہ دنیا میں
ڑھوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور اس بات کا قوی
مکان ہے کہ آیندہ صدی میں بوڑھوں کی تعداد نوجوانوں
تعداد سے بڑھ جائے گی۔ یہ بات ہمیں پی۔ ٹی۔ آئی فیچر
ے معلوم ہوئی اس لیے اس میں کسی قسم کی کوئی غلطی کا
مکان نہیں ہے۔ اب تک ہم اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ
ڑھوں کی تعداد بالکل محدود ہوگی لیکن جب ایک حقیقت
امنے آگئی تو نہ صرف غلط فہمی بلکہ مایوسی بھی دور ہوگئی یا
ں کہنا چاہیے کہ اس نئے انکشاف سے ہم میں کافی تقویت
گئی ہے اور ہم محسوس کرنے لگے ہیں کہ اب ہم بوڑھے
یں ہیں بلکہ جوان ہوگئے ہیں اور نوجوانوں کے مقابلہ
کے لیے بالکل تیار ہیں۔ اب ہم اس زمانے کا انتظار کر رہے
یں جو آنے والی صدی میں واقع ہوگا جب کہ بوڑھوں
کی تعداد نوجوانوں سے بڑھ جائے گی۔ اگر ہم ہنستے کھیلتے
تیس بتیس سال اور گزار لیں تو وہ زمانہ بھی اپنی آنکھوں
سے دیکھ لیں گے۔ ہنستے کھیلتے ہم نے اس لیے کہا ہے کہ
ایک تو ہم مزاح نگار ہیں جس کی وجہ سے ہنسنا ہنسانا ہمارا
دن رات کا مشغلہ ہے۔ دوسرے ہنسنے سے توانائی آگئی یا
یوں کہیے کہ جوانی آگئی ہے۔ اس کے پیش نظر مزید اتنی
مدت اور کاٹ لینا کچھ دشوار نہیں بس ذرا قدرت کی
نظرِ رحمت درکار ہے جو حاصل ہوگئی تو پھر بیڑہ پار ہے
متذکرہ صدر فیچر میں یہ بات بھی صاف اور واضح
الفاظ میں بتلا دی گئی ہے کہ جو بوڑھے زیر بحث ہیں ان
کی عمریں ساٹھ سال سے زیادہ ہیں۔ جب ہم نے اپنی
عمر عزیز پر نظر ڈالی تو الحمدللہ ساٹھ سال سے بہت اوپر
پائی گئی۔ اس لحاظ سے ہم اپنے آپ کو "بالغ العمر"

بڑھے سمجھے جا سکتے ہیں چنانچہ اگر کچھ مراعات وغیرہ بھی
بڑھوں کو دی جائیں گی تو ہم بڑھوں کی صف میں اُن
"کم سن" بڑھوں سے بہت آگے رہیں گے جو صرف ساٹھ
سال یا ساٹھ سال اور کچھ مہینے کے ہوں گے جو ہمارے
مقابلے میں "طفلِ مکتب" بلکہ "طفلِ شیرخوار" ہوں گے۔

اس بات کا بھی انکشاف کیا گیا ہے کہ بڈھوں کی
تعداد ساٹھ فی صد ترقی پذیر ممالک میں ہے اور ۲۰۲۰ء
میں یہ تناسب ستر فی صد ہو جائے گا۔ فی الحال ساٹھ فی صد
بھی غنیمت بلکہ بہت غنیمت ہے۔ کیونکہ اگر کوئی طالب علم
امتحان میں ساٹھ فی صد نمبرات لے تو اس کو درجہ اول
میں کامیاب کیا جاتا ہے۔ چنانچہ بوڑھوں کی موجودہ تعداد
کے لحاظ سے اُن کو درجہ اول شمار کیا جا سکتا ہے۔ رہے
جوان اور نوجوان تو وہ چونکہ صرف چالیس فی صد کی تعداد
میں ہیں اُن کو درجہ سوم میں شمار کیا جانا چاہیے اس لیے کہ
وہ درجہ دوم میں بھی شمار نہیں کیے جا سکتے کیونکہ درجہ دوم
کے لیے کم از کم پچاس فی صد ہونا ضروری ہے۔ پس
بعد تحقیق ثابت ہوا کہ ملک کے سارے نوجوان "تھرڈ
کلاس" ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک میں کوئی
صدر مملکت ساٹھ سال سے کم عمر کا منتخب نہیں ہوا۔ اور
اکثر وزرا بھی ساٹھ سال سے زیادہ عمر کے ہوتے ہیں۔
ویسے دیگر ممالک میں بھی صدور مملکت اور وزرا اکثر ساٹھ
سال کے اوپر ہی ہوتے ہیں۔ بعض مثالیں ایسی بھی ملتی ہیں
کہ ستر سال، اسی سال یا اس سے بھی زیادہ عمر ہوتے ہیں
اس سے ایک بات واضح ہو گئی کہ نہایت ہی اعلیٰ عہدوں پر
فائز ہونے کے لیے بڈھے ہونا ضروری ہے۔ یعنی کم از کم
ساٹھ سال کے ہونا لازمی ہے۔ اس سے یہ مطلب نکالا جا سکتا
ہے کہ کسی کام کی اہلیت ساٹھ سال یا اس کے بعد ہی پیدا
ہوتی ہے۔ اگر کوئی ساٹھ سال سے کم عمری میں کسی منصب
اعلیٰ پر فائز ہو جائے تو اس کو گولی مار کر ہلاک کر دیا جاتا
ہے جس کی "مردہ مثال" امریکہ کے پریسیڈنٹ کینیڈی
تھے جن کا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ وہ ساٹھ سال
کے ہونے سے پہلے صدر مملکت بن گئے۔ یہ اُن کی ناعاقبت
اندیشی تھی۔ اس سے دوسرے صدورِ مملکت کو سبق لے کر
ہوشیار رہنا چاہیے۔ اور اگر اتفاق سے کہیں ساٹھ سال
سے کچھ کم عمر میں صدر یا وزیر اعظم یا وزیر اعلیٰ یا وزیر اعلیٰ
بن جائیں تو کوشش کر کے جلد از جلد ساٹھ سال کی عمر کو
پہنچ جائیں اگر کچھ کسر رہ جائے تو فوراً اپنی ساٹھ سالہ سالگرہ
منا کر ایک بڑی دعوت کر دی جائے تاکہ لوگ یہ جان
لیں کہ وہ ساٹھ سال کے ہو گئے ہیں۔ رہی یہ بات کہ ساٹھ
سال کے حقیقت میں ہوئے یا نہیں تو کون ایسا ہے کہ
جو پھاڑ کر دانت دیکھے گا۔

دانتوں پر سے ایک بات یاد آ گئی۔ وہ یہ کہ ایک
عام خیال کے مطابق کوئی آدمی چالیس سال کا ہو جائے تو
اس کو عقل داڑھ نکلتی ہے۔ ہم نے اس بات کی جانچ
نہیں کی کہ یہ کس حد تک حقیقت پر مبنی ہے۔ ویسے کوئی
داڑھ نکل آئے تو بھی یہ ضروری نہیں کہ عقل بھی آ جائے
کیونکہ ہم پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ عقل تو
ساٹھ سال کے بعد ہی آتی ہے۔ چنانچہ ہم نے فوراً اپنا
جائزہ لیا اور یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ عقل داڑھ ابھی تک
نہیں آئی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں ابھی تک عقل
نہیں آئی ہے جس کا صاف اور واضح ثبوت یہ ہے کہ ہم
شاعر کم ادیب بھی (Poet cum writer)

گئے ہیں۔ عقل داڑھ یا اس کا ایک حصہ بھی نکل آتا تو ہم ادیب و شاعر کے بجائے لیڈر بن جاتے جو منصب اعلیٰ پر فائز ہونے کا زینۂ اولین ہے چنانچہ ہم اپنی تقدیر پر صبر کر کے خاموش ہو گئے۔ لیکن اب جبکہ ساٹھ سال سے بہت آگے نکل گئے ہیں تو یہ معلوم کر کے کچھ امیدیں بندھ گئی ہیں کہ ہم ضرور کچھ نہ کچھ بن جائیں گے۔ مطلب یہ [illegible] پارلیمنٹ میں ساٹھ سال سے زیادہ عمر کے ادیبوں اور شاعروں کے لیے کچھ نشستیں محفوظ ہو جائیں تو ہم کم از کم ایم۔ پی تو ضرور بن جائیں گے۔

ایم۔ پی کا خیال آتے ہی کچھ نئی تدابیر ہمارے ذہن میں کروٹیں لینے لگی ہیں۔ اب ہم یہ سوچ رہے ہیں کہ جب ملک میں بوڑھوں کی تعداد ساٹھ فی صد ہے تو کیوں نہ ایک سیاسی پارٹی بنا لی جائے جس کی صدارت کے لیے ملک کی سب سے زیادہ معمر شخصیت کا انتخاب کیا جائے۔ چنانچہ ہم نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی تو یہ جان کر بڑی پریشانی ہوئی کہ ملک کی سب سے زیادہ معمر ہستی ایک خاتون ہے۔ جس کی عمر ایک سو بیس سال ہے۔ ہائے رے قسمت یہاں بھی ایک خاتون سر پر سوار ہو گئی۔ پھر ہم کو یہ جان کر تسلی ہوئی کہ اس وقت دنیا کی دو مملکتوں کی وزارت عظمیٰ پر دو خواتین سوار ہیں۔ تو ہماری پارٹی کی قیادت ایک خاتون کے ہاتھ میں آجائے تو کیا ہرج ہے۔ بہر حال جب ہم بوڑھے ملک میں ساٹھ فی صد ہیں تو ہماری پارٹی کا برسر اقتدار آجانا نہایت آسان ہے۔ اس لحاظ سے بھی کہ ہماری پارٹی ایک مکمل وحدت ہو گی جب کہ ساٹھ سال سے کم عمر لوگوں کی تعداد کئی پارٹیوں میں منقسم ہو کر انتخابات کے ہر میدان میں ہم سے شکست کھائے گی اور ہم اپنی فتح و نصرت کا ڈنکا بجاتے ہوئے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے لیں گے۔ سوال یہ ہے کہ ہماری پارٹی کا انتخابی نشان کیا ہونا چاہیے۔ بہت غور کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ "سفید بالوں کا وگ" ہماری پارٹی کا انتخابی نشان موزوں رہے گا۔ یا پھر ہاتھ کی ایک لکڑی جس کو "عصائے پیری" کہا جا سکتا ہے۔ مصنوعی دانتوں کا چوکھٹا بھی کچھ کم موزوں نہ ہوگا۔ بہر حال اس کا فیصلہ تو پارٹی کے ارکان ہی کریں گے۔ غرض جب ہم بآسانی انتخابات بڑی بھاری اکثریت سے جیت جائیں گے تو ہماری حکومت قائم ہو جائے گی جس کا نام "گورنمنٹ آف دی ایجڈ" "Govt of the Aged" ہوگا (جس طرح بڑھوں کے لئے جو ہوم (Home) بنائے جاتے ہیں تو ان کا نام (Home for the Aged) رکھا جاتا ہے۔

اس طرح ہماری حکومت قائم ہو جانے کے بعد صدر مملکت سے لے کر تمام کلیدی عہدوں پر بوڑھے ہی بوڑھے نظر آئیں گے۔ جن کی میزوں پر جوان چپراسی فائیلوں کے ساتھ کچھ دوائیں بھی لاکر رکھے گا اور نہایت ادب کے ساتھ کہے گا۔ "حضور! یہ دل کی طاقت کی دوا ہے۔ یہ دماغ کی قوت کی دوا ہے اور یہ گردوں کی تقویت کی دوا ہے۔ اور یہ . . . . . . یہ ... (ہنکارتا کر کہے گا) یہ معجون شباب آور ہے۔ اور مسکراتا ہوا باہر نکل جائے گا۔" اور عہدہ دار احتیاط کے ساتھ منہ میں سے چوکھٹا نکال کر میز پر رکھے گا۔ پہلے پوری دوائیں استعمال کر لے گا۔ پھر فائیلوں پر دستخط کرنے کا ارادہ کرے گا تو یاد آئے گا کہ وہ اپنا چشمہ ساتھ لانا بھول گیا ہے۔ چنانچہ چپراسی کو دوڑا کر چشمہ

منگوا لے گا۔ تب ماتحت کو بلا کر ہر فائیل پر دستخط کرنے سے پہلے یہ پوچھ لے گا کہ کس مقام پر دستخط کی جائے۔ کیونکہ ہر فائیل کو پڑھنا اور سمجھنا اس کے ماتحت کے فرائض میں داخل ہوگا۔ عہدہ دار کا کام تو صرف دستخط کرنا ہوگا۔ (ویسے اب بھی "جوان" عہدہ دار ماتحت سے پوچھ کر دستخط کرتے ہیں بلکہ یہ بھی پوچھ لیتے ہیں کہ دستخط بڑی کریں یا چھوٹی)

غرض اب جب کہ یہ بات ہمارے علم میں آگئی ہے کہ دنیا میں بوڑھے آدمی ساٹھ فی صد سے زیادہ ہیں۔ ہم آنے والے انتخابات کے انتظار میں ہیں جب کہ ہماری حکومت قائم ہو جائے گی۔

— —

مفلس قارونی (اکولہ)

کفِ افسوس

سنتے ہی دل پذیر صدائے دفِ افسوس — نقال ظریفوں میں بھی ہے صفِ افسوس
ملت کفِ افسوس کا سنتے تھے ابھی تک — اب لوگ مسرت سے پڑھیں گے "کفِ افسوس"

احساس کا بے تاہ سمندر "کفِ افسوس" — شادابیٔ جذبات کا مظہر "کفِ افسوس"
بیماریٔ غم نے جنہیں کمزور کیا ہے — ان کے لئے ٹانک کے برابر "کفِ افسوس"

مخلص رہِ اخلاص پہ چلتے ہی رہیں گے — جلتے ہیں حسد سے جو شب و روز جلیں گے
پڑھ کر "کفِ افسوس" سبھی شاد ہیں لیکن — کچھ لوگ یقیناً کفِ افسوس ملیں گے

(فیاض افسوس اکولوی کے مجموعۂ کلام "کفِ افسوس" کی اشاعت پر)

پیا، ساغر خیامی، طالب خوندمیری، استاد رام لوری اور آفتاب لکھنوی۔ وقت کی کمی کے باعث ریڈیو والوں نے پہلے دور کے بعد مشاعرے کا خاتمہ کا اعلان کر دیا۔ کچھ اچھے شعراء کو سننے کی تشنگی رہ گئی۔ وہی مشاعرہ کچھ کاٹ چھانٹ کے بعد ۲ اگست کی رات دس بجے ریڈیو بھوپال سے نشر ہوا جس میں ترتیب تھوڑی سی بدل دی گئی۔ طالب خوندمیری کی دو نظمیں آر کی ٹکٹ غالب اور کمشنروں کی فریاد استاد رام لوری اور آفتاب لکھنوی کے بعد آخر میں نشر ہوئیں۔ طنز کا خوبصورت انداز جو طالب خوندمیری کا خاص میدان ہے سامعین پر ایک خوشگوار اثر قائم کر گیا۔ اس طرح وہ اس مشاعرے کے امام بن گئے)

مشاعرے کے بعد آفتاب لکھنوی، مشتاق پردیسی، طالب خوندمیری، مصطفٰے علی بیگ، سرپٹ، سہابٹ وغیرہ نے مرتغلق صاحب کے دولت خانے پر رات کے دو بجے تک قہقہوں اور مسکراہٹوں کے چوٹے تیکھے چھینٹے۔

۴ اگست کی صبح جب میں زندہ دلان ایکسپریس پر زندہ دلان کو الوداع کہنے اسٹیشن پہنچا تو سب کے چہروں پر بے حد تھکن تھی۔ ظلم انصاری بھی ان کے ساتھ ناگپور جا رہے تھے۔ مصطفٰے علی بیگ اور طالب خوندمیری نے ان سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ شاید تھکن کے اثر کو زائل کرنے کا یہ بھی ایک انداز تھا۔

ٹرین پلیٹ فارم چھوڑنے لگی۔ اور میں زندہ دلان کی زندہ دلی کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا جو انتہائی تکلیف دہ ماحول میں بھی مسکرانے کا جواز تلاش کر لیتے ہیں۔

■■

شگوفہ
۱۵
RING...
WRONG NUMBER
RINGGG...
WRONG NUMBER
RINGGG...
WRON NUMB
WRONG NUMBER
HELLO TELEPHONES COMPLAINTS DEPT?
COURTESY : DECCAN CHRONICLE
_TOBER 1982
Rs. 3.00

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

جلد ۱۵ شمارہ ۱۰

اکتوبر ۱۹۸۲ء

قیمت فی پرچہ : ۳ روپے
زرِ سالانہ : ۳۰ روپے، انفرادی ۲۵ روپے
بیرونِ ہند سے : ۹۰ روپے

کتابت: محمود سلیم، مسعود انور، اور ایم اے رؤف

طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

خط و کتابت کا پتہ: شگوفہ ۳۱ - بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۱ فون: 57716

اِس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

مالِ مفت (انشائیے)

اُڑیں گے پُرزے .. (خاکہ)

برق و شرر (مستقل فیچر)

بال کی کھال (تبصرہ)

* * *

چُورن (نظمیں)

*

مسیح انجم

اخبار پڑھنا

ایران کے حکماء نے اپنے بادشاہ جمشید کے لئے ایک پیالہ بنایا تھا جو "جام جم" کے نام سے مشہور ہوا۔ خدا جانے اس پیالے میں کیا کمال تھا کہ بادشاہ محل میں بیٹھے بیٹھے اس کے ذریعہ سارے حالات جان لیا کرتا تھا۔ گویا "جام" نہ ہوا۔ ایک اچھا خاصہ ضخیم اخبار ہوا۔ پتہ نہیں اس میں کب ٹیکنیکل خرابی پیدا ہوئی؟ اور وہ کب ٹوٹا؟ اور وہ کون سا میونفیکچرنگ سیکریٹ (MANUFACTURING SECRECT) تھا کہ جام جم اول کے بعد جام جم ثانی وجود میں نہ آسکا۔ چنانچہ اسی میلوفیکچرنگ سیکرٹ نے غالب سے یہ شعر کہلوایا ؎

اور لے آئیں گے بازار سے گر ٹوٹ گیا
جام جم سے یہ مرا جام سفال اچھا ہے

اس شعر میں غالبؔ نے جس جام سفال کے بارے میں کہا ہے، اس کے مقصد پر کوئی اور مقصد غالب ہے لیکن اب ہم جس جام جم کے بارے میں عرض کرنے جا رہے ہیں اسے عرف عام میں اخبار کہتے ہیں۔ اگر ہم یہ کہیں تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ آج کے دور میں اخبار کی حیثیت، غالبؔ کے جام سفال کی سی ہے۔ اگر ایک ضائع ہوا تو دوسرا خرید لائیے۔ دوسرا بھی ضائع ہوا تو تیسرا خرید لائیے۔ اگر آپ کسی نیوز پیپر اسٹال تک زحمت کرنا کسر شان سمجھتے ہوں تو کسی ہاکر کی خدمات حاصل کیجئے۔ آپ کے بیدار ہونے سے پہلے ہی اخبار آپ کے گھر پر آموجود ہوتا ہے۔ جب تک جی چاہا پڑھیئے۔ پھر اُٹھاکر رکھ دیجئے۔ اور بُرا وقت آن پڑنے پر ردّی میں بیچ دیجئے۔ آم کے آم، گٹھلیوں کے دام!

اخبار پڑھنا ایک ہابی (HOBBY) ہے۔ ایک مشغلہ ہے اور ایک ضرورت ہے۔ ورنہ آپ ہی سوچئے کہ خبروں پر تبصرہ کرنے، مختلف سربراہان مملکت کو نااہل ٹھیرانے، اور اپنے آپ کو بہت بڑا سیاسی اور دانشور ثابت کرنے کے مواقع کہاں سے حاصل ہوں گے؟ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہر پڑھا لکھا آدمی صبح بیدار ہوتے ہی عالمی خبریں جاننے کے لئے بڑا بے چین رہتا ہے۔ چاہے وہ اپنے بارے میں کتنا ہی بے خبر کیوں نہ ہو!

جہاں تک اخبار پڑھنے کا تعلق ہے، ہم نے یہی دیکھا ہے کہ جو شخص پڑھنا جانتا ہے وہ اخبار خرید کر یا مانگ کر

پڑھتا ہے۔ اور جو پڑھنا نہیں جانتا وہ دوسرے سے پڑھوا کر سنتا ہے۔ اگر پڑھنے والا نہ ملے تو وہ صرف اخبار دیکھ کر ہی خوش ہو جاتا ہے کہ چلو کچھ نہیں تو کم از کم فلمی تصویریں ہی دیکھنے کو مل گئیں۔

اخبار پڑھنے والوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے گروہ میں وہ لوگ شامل ہیں جو اخبار تو خریدتے ہیں۔ لیکن پڑھنا ان کے نصیب میں نہیں ہوتا۔ وہ اس لئے کہ اخبار کے خریدتے ہی اس پر پڑوسیوں کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ اور قبضہ بھی کچھ ایسا کہ اخبار کی ملکیت کے بارے میں بار بار یاد دلانا پڑتا ہے۔ جس کے جواب میں آپ کو رسید کے طور پر جھڑکیاں سننے کو ملتی ہیں۔ اگر پڑوسی کی یادداشت اور نیت ٹھیک نہ رہی تو اخبار واپس ہونے سے رہا۔ اس کے برعکس اگر پڑوسی کی نیت ٹھیک رہی اور اخبار واپس بھی ہوا تو اس کے واپس آنے آنے تک آپ کبھی کے دفتر جا چکے ہوتے ہیں۔ ہم نے تو اپنے طور پر یہ اصول بنا لیا ہے کہ جو کبھی پڑوسی ہم سے اخبار مانگنے کے لئے آتے ہیں تو اخبار دینے سے پہلے ان کی ایک زوردار چٹکی لے لیتے ہیں تاکہ سند رہے اور وقت ضرورت کام آئے۔

دوسرے گروہ میں وہ لوگ شامل ہیں جو ہوٹلوں اور کتب خانوں میں اخباروں کی دُرگت بناتے ہیں۔ اور دُرگت بھی کچھ ایسی کہ آپ کو اخبار کے "اسم شریف" کا پتہ چلانا تک مشکل ہو جاتا ہے۔

تیسرے گروہ میں وہ لوگ شامل ہیں جو غُربا اور مساکین کے زمرے میں آتے ہیں۔ یہ لوگ اخبار کے دفتر میں دیوار پر چسپاں کئے ہوئے اخبار سے استفادہ کرتے ہیں۔ ان کی ساری عمر اسی قسم کے استفادہ پر گزر رہی ہے گھر سے نکلے۔ اخبار کے دفتر کو پہنچ گئے۔ کھڑے کھڑے دیوار پر اخبار کا مطالعہ کیا۔ کوئی کالم اپنے کام کا نکلا تو نظر بچا کر اس کا تراشہ اپنی جیب میں اتار لیا۔ اور پھر دوسرے اخبار کے دفتر کی جانب چل پڑے۔ ان کی مثال ان طالب علموں کی سی ہوتی ہے جو کتابوں کے لئے والدین سے پیسے تو وصول کر لیتے ہیں۔ لیکن اسکول میں "پور فنڈ" کے "بک بینک" سے کتابوں کا استفادہ کرتے ہیں۔ ہمیں ان کے اس طرح اخبار پڑھنے پر کوئی اعتراض نہیں۔ شوق سے پڑھیں۔ جوق در جوق پڑھیں۔ البتہ ہمیں ان سے یہی شکایت ہے کہ اخبار کے کوئی خاص کالم کو اپنی جیب میں اتار کر دوسرے غُربا کو "پور فنڈ" سے استفادہ کی سہولت نہیں دیتے۔

اخبار پڑھنے والوں کا ایک اور خاص گروہ بھی ہے۔ اس گروہ میں وہ لوگ شامل ہیں جو زندگی میں کبھی اخبار خریدتے تو نہیں۔ البتہ بسوں اور ریلوں میں سفر کرتے وقت فریضہ کے طور پر ایک اخبار ضرور خرید لیتے ہیں۔ ہمارا مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ ان کا مقصد اخبار پڑھنا ہرگز نہیں ہوتا۔ وہ دوسرے مسافروں پر یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ کوئی معمولی انسان نہیں۔ بہت ہی پڑھے لکھے اور مہذب انسان ہیں۔ لیکن جوں ہی ٹکٹ چیکر داخل ہو جاتا ہے ان پر اچانک نیند کا غلبہ طاری ہو جاتا ہے۔ اور وہ اپنے منہ کو اخبار کی آڑ میں چھپائے مصنوعی خراٹے لینا شروع کر دیتے ہیں۔ تب دوسرے مسافروں کو پتہ چل جاتا ہے کہ وہ بغیر ٹکٹ کے سفر کر رہے تھے۔

بسوں اور ریلوں میں سفر کرتے وقت اپنے ساتھ ایک عدد اخبار رکھنا بعض من چلے اور شرمیلے نوجوانوں کا بھی دلچسپ مشغلہ ہے۔ ان کا مقصد بھی اخبار پڑھنا نہیں ہوتا۔ بلکہ اخبار کی اوٹ سے مہ رخوں کا نظارہ کرنا ہوتا ہے اور وہ بھی کچھ اس طرح کہ "صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں" انھیں اس بات کا دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں کوئی "ویلن" نمودار ہو کر ان کی پٹائی نہ کر دے۔

اخبار کو پُرکشش بناتے میں اس کی "سُرخی" بڑا اہم رول ادا کرتی ہے۔ مظلوم کے خون کی سُرخی کے بعد اگر میں

کسی اور سُرخی کا قائل ہوا ہوں تو وہ ہے اخبار کی سُرخی۔ ویسے، مہ رُخوں کے لبوں کی سُرخی بھی بڑی غضبناک اور قاتل ہوتی ہے۔ بشرطیکہ وہ "لپ اسٹک" کی محتاج نہ ہو۔ کیوں کہ جب لپ اسٹک کی سُرخی لبوں سے اُتر جاتی ہے تو مہ رُخوں کے لب کسی کتاب کی اُس سُرخ جلد کی طرح نظر آنے لگتے ہیں جس کو جھینگروں نے جگہ جگہ سے چاٹ کھایا ہو۔ خیر لبوں کو چھوڑیئے۔ اخبار کی سُرخی کی طرف آیئے۔ جس طرح مظلوم کے خون کی سُرخی اپنا رنگ لاکر ہی رہتی ہے بالکل یہی حال اخبار کی سُرخی کا ہوتا ہے۔ پُرامن شہریوں میں سنسنی دوڑانا ہو تو اخبار کی سُرخی کو ذرا "جلالی" قسم کی بنا دینا کافی ہو جاتا ہے۔ دن تمام اخبار کی وہی سُرخی موضوع بحث بنی رہتی ہے۔ اور لوگوں کا جلال بھی قابل دید رہتا ہے۔

اخبار پڑھنے والوں کو اخبار کی سرخیاں بڑے نشیب و فراز سے گزارتی ہیں۔ بعض وقت تو اخبار پڑھنے والوں کے لئے اچھا خاصہ تفریح طبع کا سامان ہاتھ آتا ہے۔ حال ہی میں اخبار کی سُرخی ہمیں بے حد مزہ دے گئی:

ایک شخص نے ایک خاتون کو حسین ساگر میں چھلانگ لگانے سے بچالیا ـــــ موصوف سب انسپکٹر پولیس ہیں۔ اور آج کل فٹ بال کے ریفری کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

میں جب اخبار پڑھتا ہوں تو تفریح طبع کے لئے ایک سُرخی کو دوسری سرخی سے ملاکر مزاح کا سامان فراہم کرلیتا ہوں۔ کبھی کبھی تو یہ سُرخیاں آزو بازو، نیچے اُوپر کچھ اس طرح آجاتی ہیں کہ مزاح کا سامان خود بخود فراہم ہوجاتا ہے۔ چند سرخیاں ملاحظہ فرمایئے۔ اور دیکھئے کہ سُرخیوں کے اس امتزاج نے کیا غضب ڈھایا ہے!

پارٹی اجلاس میں تصادم، پندرہ منٹ تک گھونسوں کا تبادلہ ـــــ اس سال کا عظیم الشان مشاعرہ۔

بعض فساد زدہ محلوں میں لیڈروں کا دورہ ـــــ مجرمین ضمانت پر رہا۔

اس سال کا دلیرانہ سرقہ ـــــ ممتاز شاعر (نام اپنی معلومات کی مناسبت سے تجویز کرلیں) کے مجموعۂ کلام کی رسم رونمائی۔

پولیس اور ڈاکوؤں میں تصادم ـــــ ٹیم کو شکست سے بچنے کے لئے پانچ رن درکار۔ ایک وکٹ باقی چار رن آؤٹ، تین کلین بولڈ، دو کیچ آؤٹ۔

شادی شدہ زندگی سے مطمئن نہ ہوں تو! ـــــ خودکشی!

انتقال پُرملال ـــــ اعلان برائے حاضری۔

ضرور تشریف لایئے ـــــ طعام ولیمہ کا التوا۔

ضرورت رشتہ ـــــ اعلان برائے فروخت۔

ارکان اسمبلی بچوں کی طرح سوالات نہ پوچھیں ـــــ ناکام طلبہ کے لئے فری کوچنگ کا انتظام۔

جب کبھی میرے پاس تفریح کے لئے پیسے نہیں ہوتے تو میں ایک اٹھنی اپنی جیب میں ڈال کر کسی قریب کی ہوٹل کا رُخ کرتا ہوں۔ وہ اس لئے کہ موجودہ دور کے مکانوں میں "خلوت" نام کی کوئی جگہ باقی نہ رہی کہ کچھ دیر کے لئے ہی سہی اپنے آپ کو بھلا سکیں۔ خلوت تو دور کی بات ہوئی۔ اب مکانوں میں "کتب خانہ" نام کی بھی کوئی چیز باقی نہ رہی۔ (اگر کہیں ہوتا بھی ہے تو کرایہ پر اٹھا دیا جاتا ہے) میرا بس چلے تو میں اس لفظ کو ہی لغت سے نکلوادوں تاکہ نئی نسل کو اس کی معنی سمجھانے کی نوبت ہی نہ آئے۔ ہاں! تو میں ہوٹل میں پہنچتے ہی ایک پیالی چائے کا آرڈر دے کر

اطراف کی میزوں پر ایک اُچٹتی سی نظر ڈالتا ہوں کہ کہیں تو کوئی اخبار پڑا ہوا ملے۔ یہیں سے مجھے تفریحِ طبع کا سامان ہاتھ آتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی یہ تفریح "تباہ" بھی ہو سکتی ہے۔ کیوں کہ ہوٹل میں مطالعہ میں مصروف گاہک سے اخبار حاصل کرنا کوئی معمولی کام نہیں۔ یہ بڑے جان جوکھم کا کھیل ہوتا ہے۔ ہر پل عزت و ناموس کو خطرہ لگا رہتا ہے۔ پتہ نہیں کب کس کا موڈ بگڑ جائے۔ وہ اس لئے کہ ہوٹل میں ہر قماش کے انسانوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ ایک بار ہمیں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ اخبار میں جب کوئی خبر طویل ہو جاتی ہے تو نیچے لکھ دیا جاتا ہے — "باقی فلاں صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے"۔ اتفاق سے واقعہ مذکور کے روز ہمارے حصہ میں جو اخبار کا صفحہ آیا تھا اس میں ایک نہیں تین "باقی" موجود تھے:

"بقیہ ہیروئن بھاگ گئی" "بقیہ میری آواز سنو" "بقیہ لڑکی بوڑھے سے بیاہی گئی"۔

ایک گاہک کو ہمارے پاس جو اخبار تھا، اس کی ضرورت لاحق ہوئی۔ وہ اپنی سیٹ سے اُٹھ کر اپنے ہاتھ میں اخبار کا ایک حصہ لئے ہمارے پاس آئے۔ تاکہ اخباروں کا تبادلہ عمل میں آسکے۔ شائد ان کے پاس بھی ایک دو "بقیے" آگئے تھے۔ وہ اپنے "بقیوں" کو ہمارے "بقیوں" سے بدل لینا چاہتے تھے۔ لہٰذا آتے ہی پوچھا کیا آپ کے پاس "بقیہ ہیروئن بھاگ گئی ہے"؟ ہم نے ان کے ارادہ کو تاڑ کر مسکراتے ہوئے کہا "وہ تو ہے! اور بفضل تعالیٰ صحیح و سالم ہے۔ لیکن مجھے "بقیہ محکمے میں رشوت" کی ضرورت ہے۔ پہلے وہ دیجئے اور بقیہ ہیروئن ...... لے جائیے!" چوں کہ موصوف میں حسِ مزاح تھی، اس جملے پر مسکرائے اور فوراً "بقیہ محکمے میں رشوت" دے کر "بقیہ ہیروئن ......" لے گئے۔ جب وہ جانے لگے تو ہم نے ان سے بطورِ خاص کہا "جناب! "بقیہ میری آواز سنو" پڑھنا نہ بھولئے گا۔ اس میں اخبار کے بارے میں بڑی عالمانہ باتیں بیان کی گئی ہیں!

●●

ہوئے کلرک بن کے رسوا

فیاض احمد فیضی، [illegible]

ہمارے ملک میں دو ہی طرح کے افراد بستے ہیں۔ دیہاتوں میں کسان مقیم شہروں میں کلرک۔ اب یہ اور بات ہے کہ کسان زیادہ تر خون پسینہ ایک کرتا رہتا ہے اور صرف چند گھنٹے آرام کرتا ہے۔ کلرک کو گھنٹے بھر کے کام کے بعد پسینے چھوٹنے لگتے ہیں اس لئے وہ زیادہ تر آرام کرتا رہتا ہے۔ کسان عمر بھر ہل چلاتا ہے کلرک عمر بھر قلم چلاتا ہے اور دونوں ہی ساری عمر مفلسی کے مزے لوٹتے ہیں۔ دراصل عقل مند ڈاکٹر، انجینئر، سائنس داں، تاجر، ہنر مند ہوش سنبھالتے ہی ملک چھوڑ دیتے ہیں۔ بے چارہ کلرک بڑا ہی قوم پرست اور وطن دوست ہوتا ہے اس لئے یہیں کلرکی کو کلیجے سے لگائے پڑا رہتا ہے۔ چناں چہ ہمارے ملک کو اگر کلرکوں کا ملک قرار دیا جائے تو یہ ہمارے ملک اور ہمارے کلرکوں دونوں کے ساتھ بڑا انصاف ہوگا۔

کچھ مسکین سے جانوروں کا خیال چھوڑ دیجیے اور بستی میں چلے آئیے تو پتہ چلے گا کہ ہمارے یہاں سب سے مظلوم اور مضحکہ خیز دکھائی دینے والی دو ہی مخلوق ہیں۔ ایک ٹیچر اور دوسری کلرک۔ لیکن آبادی کے اعتبار سے کلرکوں کی تعداد ٹیچروں سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ٹیچر زیادہ تر دیہاتوں میں تخلیق کئے جاتے ہیں مگر بعد میں خللِ امن کے ڈر سے شہروں میں پھیلا کر دیے جاتے ہیں جب کہ کلرک اصلی شہر کی پیداوار ہوتے ہیں۔ ٹیچر کو جب تک ٹیوشن نہ ملے اس کا دل پڑھانے میں نہیں لگتا، کلرک کی دنیا اوور ٹائم (Overtime) کے بغیر سونی سونی نظر آتی ہے۔

عام طور پر کلرکوں کو ان کی بیچارگی اور مفلسی کی بنا پر مسکین بھی کہا جاتا

ہے حالانکہ غور سے دیکھا جائے تو ان کو دیکھ کر بیٹھے ہوئے اُلّو کا تصور اُبھرتا ہے۔ البتہ کچھ دانش مند کلرک اپنی مسکینی اور مضحکہ خیزی پر چرچلے پن کی نقاب اوڑھ لیتے ہیں اور ہمیشہ دوسروں کے ساتھ اپنے آپ کو بھی کاٹ کھانے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ شفیق الرحمٰن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ دنیا میں اُلّو سے بھی زیادہ بری چیزیں ہیں جیسے دو اُلّو۔ بالکل اسی طرح کلرک سے بھی زیادہ مضحکہ خیز لوگ اس دنیا میں موجود ہیں یعنی دو کلرک۔ جہاں ایک ساتھ دو کلرک جمع ہو جائیں وہاں تمام فائلیں تھم جاتی ہیں، سارے کاغذات اٹک جاتے ہیں، ضرورت مندوں کی قطاریں طویل ہو جاتی ہیں اور ایسے میں صرف ایک چیز چلتی ہے۔ وہ ہے زبان۔ دونوں کلرک حضرات کی زبانیں ایک ساتھ تیز رفتاری سے چل پڑتی ہیں اور آفس کے بقیہ حضرات و خواتین، ان کے اسکینڈلوں، بیوی بچوں کے قصیدوں، بس اور ٹرین کے جھگڑوں اور امورِ جنسی کی زحمتوں جیسے موضوعات کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں۔

جس طرح گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف بھاگتا ہے، عاشق کی شامت آتی ہے تو وہ شادی کر لیتا ہے اور ڈاکٹر، وکیل اور انجینئر کی عقل خبط ہو جاتی ہے تو وہ سوشل ورکنگ اور سیاست کے میدان میں کود پڑتا ہے۔ بالکل اسی طرح ایک طالب علم کی شامت آتی ہے تو وہ کلرکی کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ سچ ہے خدا شکر خورے ہی کو شکر دیتا ہے۔ عام طور پر وہی نوجوان کلرک بنتے ہیں جو انگوٹھا چوسنے کی عمر ہی سے کلرک بننے کے سہانے خواب دیکھتے چلے آ رہے تھے۔ اسی لئے وہ کلرکی ملتے ہی بغلیں بجاتے ہیں گویا جنت مل گئی ہو، عقل مندوں کی جنت۔ کلرکی کا سب سے بڑا فایدہ یہ ہے کہ یہ ملتے ہی آدمی میں ہاتھ پیر ہلانے کا مادہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی خواب آور نشیلی دوا ہے جس سے آدمی عمر بھر اونگھتا رہتا ہے اور ایک دن اپنے پیچھے ایک مدقوق بیوی اور دس بارہ آوارہ بچے چھوڑ کر دوسری دنیا میں کلرکی حاصل کرنے کے لئے روانہ ہو جاتا ہے۔

ہندوستان کی سب سے حساس مخلوق بھی کلرک ہی ہے۔ ان کے شدید حساس اور زود رنج ہونے کا یہ عالم ہے کہ خود عالمی جنگوں کا ان پر مطلق اثر نہیں ہوتا، ہندوستان پر چین حملہ کر دے، پاکستان دھاوا بول دے، کلرک چین کی بنسی بجائے گا۔ ہیروشیما پر بم گر جائے، ترکی میں زلزلہ آ جائے، لبنان میں جنگ چھڑ جائے، شاہ فیصل کا قتل ہو جائے، کلرکوں کی دنیا جوں کی توں رہتی ہے لیکن اگر بس کا کرایہ بڑھ جائے، ٹرینیں لیٹ ہو جائیں، مہنگائی الاؤنس کم ہو جائے، کوئی نیک دل خاتون ایک ساتھ چار بچوں کو جنم دے دے، کسی نوجوان لڑکی پر غنڈوں کا حملہ ہو جائے، چڑیا گھر میں کوئی نیا جانور آ جائے تو کلرکوں میں تہلکہ مچ جاتا ہے۔ ہفتوں اسی موضوع پر بڑے زور و شور کے ساتھ تبصرے ہوتے ہیں اور کئی دن تک اس کا بڑے اہتمام کے ساتھ سوگ منایا جاتا ہے۔ اخبارات کی وہ تمام خبریں جو زیادہ تر خالی دماغ رپورٹروں کی پیداوار ہوتی ہیں، کلرکوں کا جینا حرام کر دیتی ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ کلرک آفس میں بیٹھے بیٹھے صرف مکھیاں مارتے ہیں۔ جی نہیں وہ کبھی کبھی تضیع اوقات کی خاطر کام بھی کر لیتے ہیں لیکن کام کے وقت منہ پھاڑ کر جماہیاں لینا اور پڑوسی کلرک سے ہنسی مذاق کرنا ان کا

محبوب مشغلہ ہوتا ہے۔ فرصت کے اوقات میں بھی کلرک نچلے نہیں بیٹھتے۔ ظاہر ہے انہیں نچلے بیٹھنے کے لئے تو تنخواہ ملتی نہیں ہے۔ بیٹھے بیٹھے آفیسر کے کیبن میں لیڈی سکریٹری کو داخل ہوتے دیکھ کر آہیں بھرنا، کانا پھوسی کرنا، فقرے کسنا ان کا روز کا معمول ہے۔ اس کے علاوہ جو وقت بچتا ہے اسے چغل خوری، غیبت، تو تو میں میں، اور نئی نئی گالیوں کے ایجاد کرنے میں صرف کیا جاتا ہے۔ آخر کسی طرح تو سات آٹھ گھنٹے گزار لے ہی ہیں پھر اس میں وقت کیوں برباد کیا جائے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ان کلرکوں کو خود بھی اپنی کلرکی کا احساس ہے۔ آپ کسی کلرک سے پوچھ لیجئے کہ صاحب آپ کا شغل کیا ہے تو وہ اپنے سینے کو پھلانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دے گا۔ "میں ہمالیہ ڈرگ کمپنی میں ہوں" یا "میں یونین بنک میں ہوں" یا "میں ریلوے میں ملازم ہوں" پھر بھی آپ اس سے مرعوب نہ ہوں اور پوچھ بیٹھیں کہ صاحب آپ وہاں کیا کرتے ہیں؟ تو کھٹ سے جواب ملے گا۔ "وہاں میں آفس میں ہوں" یا "میں اسسٹنٹ ہوں" یا "میں فلاں ڈپارٹمنٹ میں ہوں" مگر کوئی اللہ کا بندہ یہ نہیں کہے گا کہ "صاحب میں تو کلرک ہوں، آپ کو کوئی اعتراض ہے؟ میں خاندانی کلرک ہوں۔"

کلرک اور انتظار —— یہ دونوں لازم و ملزوم چیزیں ہیں۔ بے چارہ عمر بھر کسی نہ کسی چیز کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ کچھ مستقل انتظار کچھ عارضی۔ اس کا قلم کاغذ پر آہستہ روی سے چلے یا گشت بھاگے، اس کا ذہن ہر وقت کسی بچے کی طرح خوابوں کی رنگین تتلیوں کے پیچھے دیوانہ وار دوڑتا رہتا ہے۔ نوجوانی میں کلرکی ملتی ہے تو شادی کے سوٹ کی فکر لاحق ہو جاتی ہے۔ شادی ہو جاتی ہے تو بچوں کا انتظار کرتا ہے۔ بچے بھی ہو جائیں تو فیملی پلاننگ کے محکمے کے لوگوں کا انتظار کرنے لگتا ہے۔ کچھ خوردہ سالی آجاتی ہے تو کمپنی کی طرف سے قرض پر ملنے والے فلیٹ کا انتظار شروع کر دیتا ہے۔ وہ مل گیا تو قرض کے اترنے کا انتظار، پھر لڑکی کی شادی کا انتظار، لڑکے کے برسر روزگار ہو جانے کا انتظار اور آخر میں موت کا انتظار۔ یہ تو ہوئے عارضی قسم کے انتظار۔ اب دوسری قسم بھی ملاحظہ کیجیے۔ روز آنہ بس کا انتظار، ٹرین کا انتظار، لنچ بریک، ٹی بریک اور چھٹی کا انتظار اس کی جان کو لگا ہی رہتا ہے۔ ان سب کے علاوہ ایک جان لیوا انتظار ترقی کا انتظار ہوتا ہے۔ وہ عمر بھر اسی فکر میں غلطاں رہتا ہے کہ فلاں کو پرموشن کیوں مل گیا؟ ضرور اس نے کچھ چاپلوسی کی ہوگی۔ میں سب سے عقل مند، سب سے سمجھ دار، سب سے محنتی اور ترقی کا حق دار ہوں، مجھے پرموشن کیوں نہیں ملتا، مجھے پرموشن کب ملے گا۔ مگر سب سے دل چسپ تنخواہ کا انتظار ہوتا ہے۔ تنخواہ تو بے چاری بیچ پری کا شوہر ہے —— دو تین دن میں پر لگا کر اڑ جاتی ہے۔ بقیہ ستائیس دن وہ اگلی تنخواہ کے فراق میں رہتا ہے، پھر دو تین دن آرام کرنے کے بعد دوبارہ انتظار شروع ہو جاتا ہے۔ تنخواہ کے بڑھنے کا انتظار بھی عمر بھر لگا رہتا ہے۔ دن بھر کسی ٹائپسٹ لڑکی پر نگاہ جمائے سوچتا رہتا ہے کہ اس بار تنخواہ کچھ بڑھے تو وہ اس قیامت خیز میں جھلک والی لڑکی کو کسی کافی ہاؤس یا تھیٹر میں لے جانے کی کوشش کرے۔ کبھی بونس کا انتظار

[illegible] ذہنی خلجان میں مبتلا رکھتا ہے تو کبھی مہنگائی الاؤنس کی [illegible] کے انتظار میں گھلتا رہتا ہے۔ اور اسی طرح انتظار اور ابھی اور ابھی اور ابھی کے چکر میں سوکھ کر ہڈیوں کی مالا ہو جاتا ہے اور لوگ بانگ دور ہی سے پہچان لیتے ہیں کہ کلرک چلا آرہا ہے۔ بچے دیکھتے ہی سارا کھیل چھوڑ کر یا تو چپ چاپ راستہ دے دیتے ہیں یا مارے ڈر کے گھر میں چھپ جاتے ہیں۔ گھر پہنچتا ہے تو بڑا لڑکا دیکھتے ہی تیوریاں چڑھا لیتا ہے، بیوی کے ماتھے پر شکنیں اور بڑھ جاتی ہیں۔

ہمارے ان کلرکوں میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو ماشاء اللہ فرسٹ [illegible] گریجویٹ ہیں۔ کچھ بیچاروں نے گرتے پڑتے گریجویشن بھی کر لیا ہے۔ چناں چہ اپنی اس اعلیٰ تعلیمی صلاحیت کی بناء پر ان کو انگریزی بولنے کا جنون ہوتا ہے۔ البتہ یہ اور بات ہے کہ ان کی انگریزی کئی بیساکھیوں کے سہارے چلتی ہے۔ جیسے،

"نو، نو، یو سی (No, No, You see!)"

"وہاٹ آئی مین (What I mean!)"

"ایکچولی وہاٹ ہیپنڈ
(Actually What happened!)"

"او، آئی سی
(Oh, I See! ——)"

وغیرہ وغیرہ۔

جس طرح سے آپ کسی ڈاکٹر کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ [illegible] کی مدد سے بھی نہیں پڑھ سکتے اسی "(Clerical English)" [illegible] آپ [illegible] باہر ہوتی ہے لیکن [illegible] کلرک دوسرے کلرک کی یہ انگریزی فوراً سمجھ لیتا ہے۔

بمبئی میں ایک قوم بستی ہے جس کا نام پارسی ہے۔ پارسیوں کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ ان کے ہاں زیادہ تر کلرک پیدا ہوتے ہیں جس طرح سے یوپی میں ایک جگہ ہے اعظم گڑھ، یہاں زیادہ تر ٹیچر پیدا کئے جاتے ہیں۔ بمبئی کے ان پارسی کلرکوں کی ایک دوسری ہی مخصوص زبان ہوتی ہے۔ یہ حضرات بڑی پابندی سے اپنے ہر جملے میں دو بار بہن کی گالی دینا اپنا فرض اولین سمجھتے ہیں اور اپنے مخاطب سے بھی اسی زبان کی توقع رکھتے ہیں۔

ہمارے ہندوستان میں جاسوسی اور رومانی ناولوں کا کاروبار بھی کلرکوں کے دم سے خوب چلتا ہے۔ ہر کلرک کے ہاتھ میں روزانہ اس قبیل کی کتاب آپ ضرور پائیں گے۔ انہیں معرکۃ الآرا کتابوں کی بدولت کلرک اپنی اصلی دنیا سے دور ایک خیالی دنیا میں ہمیشہ گھوڑے دوڑاتے رہتے ہیں۔ کچھ اعلیٰ نسل کے کلرک البتہ اپنی مادری زبان کی ان کتابوں کو ہاتھ نہیں لگاتے اور بڑی شان کے ساتھ انگریزی جاسوسی ناول اور خاص طور پر "جیمس ہیڈلے چیز" لئے گھومتے ہیں۔

عورتیں کہاں نہیں پائی جاتیں۔ کلرکوں کی اس دنیا میں بھی لیڈیز کلرک موجود ہیں جن کا زیادہ تر وقت اپنے ساتھی کلرکوں کو برداشت کرنے، اپنے آفیسروں کی دل جوئی کرنے اور ان کی کار میں لفٹ حاصل کرنے میں صرف ہوتا ہے۔ ہر نئی لیڈی کلرک شروع شروع میں آفس کے تمام لوگوں کو دوسری تمام لیڈیز کلرکوں اور اپنی بیویوں سے زیادہ خوبصورت نظر آتی ہے مگر کچھ دنوں بعد دوسری نئی لیڈی کلرک آجاتی ہے اور توجہ اس طرف چلی جاتی ہے۔ یہ لیڈیز کلرک بھی ہونے سے ایک گھنٹہ پیشتر سے اہتمام کے [illegible] میں

یا کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ سب سے بھاگ کر ہوٹل میں پناہ ڈھونڈیئے تو آپ کا استقبال وہاں کلرک ہی کرے گا۔ کلرکوں کے ملک ہندوستان کو چھوڑ کر جانے کا پروگرام بنا لیجئے تو ایرپورٹ پر کلرک ہی آپ کا راستہ روکے گا۔ کسی پر مقدمہ دائر کرنا ہو تو کلرک، خودکشی کیجئے تو کلرک۔ یہاں تک کہ سنا ہے قبر میں بھی اللہ میاں کے بھیجے ہوئے دو کلرک خانہ پُری کرنے آئیں گے۔ یہی نہیں جنت و جہنم کے دروازوں پر بھی کلرک موجود ہیں۔ اب بتائیے آپ بچ کر کہاں جائیں گے۔ اس سے بہتر یہی ہے کہ کلرکوں کی کلرکی تسلیم کر لیجئے۔ یہ سمجھ لیجئے کہ زندگی کے ہر کڑے مرحلے پر یہی ہمارے کام آئیں گے اور انہیں کی مرضی کے مطابق آپ کا بیڑہ پار ہوگا یا غرق ہوگا۔

**

بانو سرتاج
★
(چندرپور)

بڑے بے آبرو ہو کر......

اُس روز نعمانی کے مکان پر محفل جمی تھی۔ بات نکل پڑی اُس زمانے کی جب خواتین اپنے خاوند اور سسرال والوں کا نام زبان سے نہ لے کر اشاروں کنایوں میں واضح کرتی تھیں۔ لطیفے سُنائے جانے لگے۔

مہندر نے بتایا "سرداروں کے یہاں نئی دُلہن آئی تھی۔ دوسرے تیسرے ہی دن ساس نے مکھن بلونے پر لگا دیا۔ خود رسوئی بنانے بیٹھ گئی۔ بہو مکھن بلو رہی ہے.... ساس کو آواز دے کر کہے تو کس طرح کہ مکھن اُوپر آ گیا۔ مکھن سسر کا نام ہے۔ کافی شش و پنج کے بعد اس نے آواز دی، ساس جی! دوڑ کر آؤ، سُسر جی اوپر تیرنے لگے۔"

غلام رسول تو ایسے موقعوں کی تاک میں رہتا تھا.... فوراً بولا "ایک نیک بی بی تھیں۔ پنج وقتہ نماز کی پابند۔ شادی ہوئی رحمت اللہ نام کے شخص سے۔ نماز پڑھنے بیٹھتیں تو مشکل آن پڑتی۔ سلام پھیرتے وقت شوہر کا نام کیسے لیں؟ نماز قضا ہونے لگی۔ نیک بی بی پریشانی میں گھلنے لگیں۔ ایک دن جیسے ہی انہیں یہ معلوم ہوا کہ وہ ماں بننے والی ہیں.... انہوں نے مسئلے کا حل فوراً ڈھونڈ لیا۔ باقاعدگی سے نماز پڑھنا شروع کر دی۔ اب سلام پھیرتے وقت کہتیں "السلام علیکم مُنّے کے ابا۔ السلام علیکم مُنّے کے ابا....."

سب کے سب بے ساختہ ہنس پڑے۔ ہمارے غیر مسلم دوستوں نے یہ لطیفہ نہیں سنا تھا انھیں خصوصاً بہت مزا آیا۔ مارشی یوں بہت سنجیدہ طبیعت کا تھا مگر کبھی کبھی موڈ میں آ جاتا تھا۔ محفل کو رنگین بنانے کی غرض سے کہنے لگا "میں گھر ہی کا واقعہ سناتا ہوں۔ میرے بھائی بھابی دونوں ڈاکٹر ہیں۔ دونوں نہایت بذلہ سنج.... پُرمزاح طبیعت۔ ہر وقت ایک دوسرے کو مات دینے کو تیار رہتے ہیں۔ ایک مرتبہ بھابی کے پاس کوئی مریض آیا۔ مذاق کی شکایت تھی۔ بھابی نے بھیا کی طرف اشارہ کر کے کہا "آپ ان کا تیل چکھئے۔ فائدہ ہوگا۔ مریض ہکّا بکّا ان کی صورت دیکھنے لگا۔ بھیا سمجھ گئے مگر پھر خود ہی مریض کو سمجھا کر بتایا "میرا نام کیسٹر ہے۔ کیسٹر آئل پینے کو کہہ رہی ہیں آپ....."

ہمیں ان لوگوں کی باتوں پر قطعی یقین نہیں آ رہا تھا۔ صاف گپ مار رہے تھے۔ صدیقی نے بھی [illegible]
تم ایک دن میرے مطب میں آ کر بیٹھو۔ نہایت تعداد پست لوگوں کا محلہ ہے.... ہر روز مجھے [illegible] لڑتا ہے۔ ایک واقعہ تمہارے سامنے ہوگا تب تو مانو گے۔

دوروز بعد صدیقی نے ہمیں نائٹ شو کے لئے مدعو کیا۔ ہم ساڑھے سات بجے اُس کے مطب پہنچ گئے۔ اس روز کمپاؤنڈر چھٹی پر تھا۔ ہمیں اپنی کرسی پر بٹھا وہ مطب کے پیچھے واقع اپنے مکان میں کھانا کھانے چلا گیا، جاتے جاتے ہدایت دے گیا کہ جو مریض آئیں ہم ان کے نام اور ان کی شکایات وغیرہ درج کر کے رکھیں۔

دو اشخاص آئے۔ ایک تھے سید میر محمد کلیم اللہ بیگ ولد رفیع الزماں بیگ حیدرآبادی اور دوسرے للّو میاں دونوں باوا آدم کے زمانے کے لگتے تھے پوشاک سے ..... بات چیت کے لحاظ سے، صحت کے اعتبار سے ....! دل اور طبیعت کے گرے گرے ہونے کی شکایت تھی تو آخرالذکر کو بھوک نہ لگنے کی ہم نے انھیں انتظارگاہ میں بیٹھنے کو کہہ دیا۔

ایک برقعہ پوش خاتون آئی۔ ہم نے رجسٹر پر جھکتے ہوئے اُس کا، اُس کے خاوند کا نام پوچھا اپنا نام تو بتا دیا.... پھر شرماتے ہوئے بولی۔

"اُن کا نام وہ ہے جو رات کو نکلتا ہے"

ہم نے چونک کر کہا۔ "بھوت!"

"اے لوئی! " وہ لچک کر بولی "رات کو صرف بھوت نکلتا ہے؟"

"نہیں" ہم نے اپنی غلطی تسلیم کی "چور بھی نکلتے ہیں"

"نہیں صاحب وہ جو روشنی دیتا ہے"

"بلب"

وہ مزید شرماتی ہوئی بولی "کیسے جی آپ بلب کسی کا نام ہوتا ہے؟"

ہم نے سوچنے کی اداکاری کی۔

اس نے دوسرا کلیو دیا "...... وہ ...... وہ جو چمکتا ہے رات کو"

ہم نے خوش ہو کر کہا "جگنو"

"نہیں، جو آسمان پر چمکتا ہے"

"آسمان پر بجلی چمکتی ہے، چمکتا نہیں" خاتون کی گرامر کمزور معلوم ہوتی تھی، ہم نے درست کی۔

وہ عاجز آکر بولی "اجی وہ، آسمان پر نہیں رہتا؟ وہ ....."

ہم نے ماتھے پر بل ڈالے "ادب سے بولو، آسمان پر اللہ میاں رہتے ہیں"

"مالوم میرے کو ..... وہ اللہ میاں کی مخلوق ...... مخلوق نہیں .. کیا بولتے اُس کو ...."

ہم نے مدد کی "فرشتے ...... جن ...."

وہ زچ ہو کر بولی "اے اللہ میرے کو لکھنا بھی تو نہیں آتا"

ہم نے کہا "ہمارے کان میں آہستہ سے کہہ دو۔ ہم لکھ لیں گے"

"نکو جی۔ کوئی خاوند کا نام زبان سے لیتا بھلا؟" اچانک کسی خیال کے زیرِ تحت چونک کر بولی۔

"اچھا دن کو روشنی کاہے سے ہوتی؟"

"سورج سے" یہ آسان سوال ہمیں پسند آیا۔

"..... .... اور رات کو"

"میونسپلٹی کے بلبوں سے"۔
وہ نا امید ہو کر کچھ بجھے بجھے سے لہجے میں بولی "جیسے دن کو سورج نکلتا ویسے رات کو بھی کچھ نکلتا کہ نہیں؟"
ہم نے اعتراف کیا "ہاں تارے نکلتے ہیں"۔
تاروں سے بڑا کچھ نکلتا کہ نہیں؟
"ہاں نکلتا ہے"۔
وہ پُر مسرت لہجے میں بولی "کیا؟"
"بڑا تارہ"۔ ہم نے جواب دیا۔
اتنے میں صدیقی آ گیا "کیوں بی بی، چاند میاں ہے تمہارے خاوند کا نام؟"
خاتون نے خوش ہو کر اعتراف کیا "ان کیا ونڈر صاحب کو اتنی دیر سے سمجھا رئی۔ نئے ہیں کیا؟"
ہم اپنے لئے کیا ونڈر سن کر باغ باغ ہوا تھے۔ صدیقی نے معائنہ کر دوا لکھ دی۔ اس کے جاتے ہی صدیقی ہم پر برس پڑا۔
"بدھو ہیں جناب اتنا واضح اشارہ بھی سمجھ میں نہیں آیا؟"
"ہم جان بوجھ کر بے اعتنائی برت رہے تھے"۔ ہم نے ڈھٹائی سے کہا۔
"کیوں"؟
"دشمنی ہے ہمیں چاند سے"۔
"آخر کیوں؟ بھلے آدمی"۔
"ہم جوان ہوتے چاند کو دیکھ کر نظم کہنے کے لئے مختلف تشبیہات سوچتے ہیں۔ جب تک ہمارا موڈ بنتا ہے چاند گھٹنا شروع ہو جاتا ہے"۔
"یہاں کیا موقع تھا چاند سے دشمنی نکالنے کا؟" صدیقی ڈانٹ کر بولا۔
"چاند ہمیں نظر انداز کرتا ہے تو ہم کیوں اس کو بھاؤ دیں ..."۔ دلیل ہمارے پاس تیار تھی۔
"مریض سے ایسی الٹی سیدھی باتیں کرو گے تو مریض بھاگ نہیں جائیں گے؟"
"وہ تو بھاگ بھی گئے"۔ ہم نے اطلاع دی۔
"کیا؟" وہ منہ پھاڑ کر رہ گیا۔
"ہاں اور کیا؟" ہم نے صفائی دی۔ "عجیب پہیلیاں بجھواتے ہیں تمہارے مریض"۔
"آخر ہوا کیا؟"
"ہم گفتگو دہراتے ہیں۔ خود ہی سمجھ لو۔ وہ بھی ایک خاتون تھی۔ ہم نے دریافت کیا کیا شکایت ہے؟
بولی "جیٹھ جی کو ختم کرانا ہے"۔
ہم بھنا گئے "آپ غلطی سے تو ادھر نہیں آ گئیں؟ یہ دوا خانہ ہے"۔
وہ ٹھٹک کر بولی "یہ دوا خانہ آج کا ہے کیا؟ ہم پانچ سال سے وقت پڑنے پر یہاں آ رہے ہیں"۔
"صدیقی یار تیرے اس سائیڈ بزنس کا ہمیں پتہ نہ تھا"۔ ہم نے کہا تو صدیقی ہمیں گھور کر رہ گیا۔

"فضول بکواس نہ کرو آگے کہو۔" اس نے کہا۔

ہم نے مسکراتے ہوئے بات آگے بڑھائی "پوچھا اس خاتون سے کہ کیوں ختم کرانا ہے؟"

بولی "عاجز آگئی ہوں۔"

ہم نے گڑبڑا کر پوچھا "ہیں کہاں وہ؟"

جواب ملا "پیٹ میں۔"

ہم سمجھے قاضی پیٹ، بیگم پیٹ، بدھوار پیٹ جیسی کوئی جگہ ہوگی اس لئے خاص دھیان نہ دیا۔

"کب سے شکایت ہے جیٹھ جی کی۔"

وہ حیرت زدہ سی بولی "آپ جیٹھ جی کیوں بول رہے ہیں؟"

ہم سٹپٹا گئے۔ موضوع بدل کر بولے "ہم نے پوچھا ہے کہ شکایت کب سے ہے؟"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ پہلے سب یہی سمجھتے تھے کہ بچہ ہے پیٹ میں۔"

"ایں!! پھر معلوم ہوا کہ بچہ نہیں، جیٹھ جی ہیں۔"

"کیسے معلوم ہوا؟"

"اچھی ممانی، گوری خالہ، پیاری چچی، سب نے یہی کہا۔"

"بری ممانی، کالی خالہ، کٹکھنی چچی نہیں کوئی آپ کے یہاں؟"

وہ تیوریاں چڑھا کر بولی "آپ کو ہمارے خاندان کی عورتوں سے کیا مطلب؟"

ہم نے گردن کو رجسٹر پر اور جھکاتے ہوئے کہا "بی بی سب کی رائے معلوم ہونا ضروری ہے۔"

"نہیں ہے کوئی کالی چچی وچی۔" وہ ناراضگی سے بولی۔

ہم پھر اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے بولے "جیٹھ جی ایک ہی ہیں؟" (کسی طرح ان حضرت کا پتہ لگانا جو تھا وہ بے زاری سے بولی "ایک ہی سے تو حیران ہوں" پھر تجسس سے پوچھا "کسی کو دو بھی ہوتی ہیں کیا؟" (گرامر کی غلطی)۔

ہم نے کہا "کیوں نہیں۔ ہماری بیوی کے پانچ جیٹھ ہیں۔ ہم سب سے چھوٹے ہیں نا۔"

"اوئی ماں! کیسے ہیں آپ۔ آتا جاتا کچھ نہیں۔ سمجھنا خاک نہیں۔ بس ڈاکٹر کی کرسی پر بیٹھ گئے۔ ہمارے ڈاکٹر صاحب آئیں گے تو ان ہی سے علاج کرائیں گے۔"

وہ برقعہ پہن یہ جا وہ جا.... ہم منہ دیکھتے رہ گئے۔

صدیقی ہنسنے لگا "اور دوسرا مریض.... جو بھاگ گیا کون تھا؟"

"وہ شاید اسی کے ساتھ آئی تھی.... اس کے ساتھ خود بھی بھاگ کھڑی ہوئی۔"

"شوٹ ہو تم مجھ سے دو مریضوں کو بھگا دیا۔"

"عزت افزائی ہے جناب کی۔" ہم نے سر کو قدرے جھکاتے ہوئے کہا "اب آپ فوراً یہ بتائیں کہ جیٹھ جی کون سی بیماری ہے"

صدیقی نے ہاتھ آگے بڑھایا "لاؤ بتاؤ کیا شکایات لکھوائی ہیں اس نے۔"

ہم نے کاغذ بڑھایا۔ صدیقی پڑھ کر ہنستا ہوا بولا "جیٹھ جی یعنی رسولی۔"

ہم نے اُچھل کر کہا "وضاحت کرو ورنہ ہم اپنا پڑھا لکھا سب بھول جائیں گے۔"
صدیقی بولا "یار سیدھی سی بات ہے۔ اس عورت کے جیٹھ کا نام رسول ہوگا۔"
ہم نے سر پیٹ لیا۔
ہم نے انتظار گاہ میں بیٹھے ہوئے مریضوں کی یاد دلائی تو صدیقی نے اُن آثارِ قدیمہ کو کچھ اور عرصہ جیتے رہنے کی دوا دی پھر ہماری پیٹھ پر دھول جماتا ہوا بولا "چلو نکلو یہاں سے اب کبھی میرے دواخانے کے اوقات میں ادھر نہ آنا۔"
ہم نے دردناک آواز میں کہا "بڑے بے آبرو ہوکر تیرے کوچے سے ہم نکلے ....اور مطب سے باہر نکل گئے۔
صدیقی مسکراہٹ چھپاتا ہوا دواخانے کو قفل لگا رہا تھا۔ ▫▫

ادارۂ شگوفہ کے توسط سے حسبِ ذیل مزاحیہ کتابیں حاصل کی جاسکتی ہیں۔

کتاب	مصنف	نوعیت	قیمت
کیوڑے کا بن	سلیمان خطیب	مجموعۂ کلام	۱۵/- روپے
نقطہ	یوسف ناظم	مضامین	۶/- 〃
البتہ	〃	〃	۱۰/- 〃
تو تو میں میں	پرویز یداللہ مہدی	ڈرامے	۱۰/- 〃
سمن زار	خواجہ عبدالغفور	مضامین	۸/- 〃
دھرگھسیٹ	سرپٹ حیدرآبادی	مجموعۂ کلام	۸/- 〃
بہرحال	مجتبیٰ حسین	مضامین	۷/- 〃
آدمی نامہ	〃	خاکے	۹/- 〃
بالآخر	〃	مضامین	۱۲/- 〃
سنی سنائی	لئیق صلاح	〃	۱۰/- 〃
رقصِ تماشائی	وجاہت علی سندیلوی	〃	۱۵/- 〃
بلا عنوان	شیخ رحمٰن اکولوی	〃	۱۰/- 〃
خواہ مخواہ	رشید الدین	〃	۱۰/- 〃
چند کلیاں نشاط کی	برہان حسین	〃	۱۰/- 〃
گرہِ مشکل	ڈاکٹر حبیب ضیاء	〃	۱۲/- 〃
گڑ بڑ گھٹالہ	پاگل عادل آبادی	کلام	۱۵/- 〃

مظہر سیوانی

پھر کوئی فتنۂ سیاست کا جگاؤ یارو

تاڑ کی چھاؤں میں کچھ دیر بٹھاؤ یارو
زہد کی دھوپ سے زاہد کو بچاؤ یارو

اُن کی داڑھی کو مئے سُرخ سے رنگیں کردو
حضرتِ شیخ کو سُرخاب بناؤ یارو

ملک میں امن رہے گا تو جیو گے کیسے
پھر کوئی فتنۂ سیاست کا جگاؤ یارو

عشق کی راہ سے گذرے تو حسینہ گذرے
دل کو جذبات کا فُٹ پاتھ بناؤ یارو

سر کے اُوپر سے جب اشعار اُڑے جاتے ہیں
بھینس کے آگے نہ تم بین بجاؤ یارو

اور جو چاہو بنا ڈالو، تمھیں حق ہے مگر
اپنی اولاد کو ہپّی نہ بناؤ یارو

خرچ آمد سے جو کم ہو تو گذارا ہوگا
پاؤں چادر سے زیادہ نہ بڑھاؤ یارو

فکر کا کھیت ہی بنجر ہے تو کیا اُپجے گا
لاکھ جدّت کا کدال اِس پہ چلاؤ یارو

ہوٹ کرنے کا ہنر بزمِ سخن میں سیکھو
پھر اُسے قوم کا کردار بناؤ یارو

ٹیچروں کی کبھی ہڑتال، کبھی لڑکوں کی
یوں ہی تعلیم کی توقیر بڑھاؤ یارو

امتحاں دے کے سُبکدوش ہوئے نورِ نظر
ممتحن کے یہاں اب دوڑ لگاؤ یارو

جب غزل کہہ نہ سکو، لکھو تم آزاد غزل
میرؔ و غالبؔ سے بھی قد اپنا بڑھاؤ یارو

غزل

رشید عبدالسمیع جلیل

محبت کر کے ہم پچھتا رہے ہیں
وہ ہم کو اور ہم اُن کو کھا رہے ہیں

جوانی کو ملا ہے عہدِ پیری
ہم اپنی قبر خود کھدوا رہے ہیں

انھیں جب تیسری منزل پہ دیکھا
ہر اک منزل پہ ہم منڈلا رہے ہیں

گرانی بڑھ گئی حد سے زیادہ
ترقی کا صدیوں پار رہے ہیں

علاقہ چھوڑ کر بھاگو برادر
یہ مچھر بھی ہمیں دھمکا رہے ہیں

چھچوندر، چھپکلی، مکڑی و چیونٹی
شریکِ زندگی کہلا رہے ہیں

ادارے شہر میں اُردو کے معدود
جو ہیں آپس میں ٹکرا رہے ہیں

چلو سو جاؤ لوگو دھیرے دھیرے
جلیلؔ اب شاعری فرما رہے ہیں

حلیمہ فردوس

(بنگلور)

پیشے ہی پیشے

یہ سچ ہے کہ اختر شماری، مردم شماری اور پیشہ شماری کرنے لگیں تو سب پر بے زاری چھا جائے۔ جب سے
ماری کا سلسلہ کمپیوٹر اور کیا لکو لیٹر سے جوڑا گیا ہے انسان کسی شمار میں نہیں رہا۔ پھر بھی چند ایسی "شماریاں" ضرور ہیں
ن کے لئے صرف عقل انسانی کی ضرورت ہے۔

پچھلے زمانے کا انسان ملا کی طرح صرف مسجد کا رُخ جانتا تھا۔ اس لئے اس کی دُنیا بہت محدود تھی۔ آہستہ
ہستہ جب وہ رُخ بدلنے لگا۔ علم و ادب، صنعت و حرفت کی راہیں وا ہوئیں تو بے شمار پیشوں نے اسے پیچ
یچ میں ڈال دیا۔ پیشے آبائی۔ اعزازی۔ سرکاری۔ غیر سرکاری غرض ہر قسم کے ہوتے ہیں۔ آبائی پیشے باعث افتخار
ہوتے ہیں تو اعزازی پیشے وقت گزاری کا بہترین ذریعہ۔ آبائی پیشہ وروں کو اپنی عزت یعنی پیشہ کا بڑا پاس ہوتا ہے
رنہ غالب اپنے آبائی پیشے پر یوں نہ فخر کرتے ؎

سو پُشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

اعزازی پیشہ ور بیکاری سے بیگاری بھلی کے فارمولے پر کار بند رہتے ہیں۔ مثلاً فرشتوں کا دن رات
تعمیل کرنا، آدم کا ہر لمحہ خیر و شر کی کشمکش میں مبتلا رہنا اور شیطان کا بہکانا سب اعزازی پیشے ہیں۔ ہاں یہ اور بات
ہے کہ آج کل بیشتر نوجوان برسر روزگار نہ ہونے کی بدولت اعزازی پیشوں کو اپنانے پر مجبور ہیں۔ ان نوجوانوں کے
علاوہ وظیفہ یاب حضرات یعنی بیٹھے ہوئے مہرے بھی اعزازی پیشوں سے اپنا دل بہلاتے رہتے ہیں۔ "کوئلہ کی دلالی میں
ہاتھ کالے" یہ محاورہ تو صرف اعزازی پیشہ وروں کے لئے موزوں ہے۔ بوڑھا ہو یا بچہ پیشے کو حاصل کرنے میں
پیش پیش رہتا ہے۔ آج کا نونہال جو کل کا شہری بنتا ہے اسے بھی اسی کی فکر رہتی ہے۔

پیشے سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

سرکاری پیشہ ور سرکار کے غلام ہوتے ہیں تو غیر سرکاری پیشہ ور بادشاہ۔ سرکار بھی بدل گئی اور پیشے بھی بدل گئے
موجودہ دور میں کوئی سررشتہ دار۔ صیغہ دار۔ منصب دار۔ جمعدار نہ رہا۔ آج کا ہر فرد تو S.D.C. F.D.C.
اکاؤنٹنٹ۔ سپرنٹنڈنٹ۔ کمشنر بنا بیٹھا ہے۔ اور انھیں دیکھ کر بہ آسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہر پیشہ ور ہنرور نہیں ہو سکتا
کوئی دولت کے سہارے ڈگری لے کر ڈاکٹر بن بیٹھتا ہے تو کوئی سرکاری رشتے کے ناطے (شیڈولڈ کاسٹ۔ شیڈولڈ ٹرائب
سرکاری رشتہ دار ہی تو ہیں) بہت بڑے بڑے عہدوں پر براجمان ہوتا ہے۔ ایسے دور میں دو ہی پیشے قابلِ اطمینان ہیں۔
ایک پی۔ اے دوسرا چپراسی۔ یہی دو افراد ہیں جن کی رسائی صاحب کے میز سے لے کر گھر تک ہوتی ہے۔ یہ دونوں حضرات
آفس اور گھر کی کنجیوں اور پیسوں کے مالک ہوتے ہیں۔ یہ نصف بہتر سے کہیں بہتر ہوتے ہیں۔

پیشوں کے بغیر نہ ہم جی سکتے ہیں اور نہ پیشہ ور کے بغیر ہماری زندگی ہمارا سماج مکمل کہلاتا ہے۔ غیر سرکاری
پیشوں کا حساب ہی نہیں۔ لحد سے مہد تک کی ضروریات ان سے ہی پوری ہوتی ہیں۔ دھوبی۔ نائی۔ چمار۔ بھنگی۔ گوالا۔
کسان۔ قصاب۔ جلاہا۔ کمہار۔ درزی۔ لوہار۔ معمار۔ بڑھائی۔ مزدور۔ بھکاری۔ ان سب کے پیشے غیر سرکاری بھی ہیں اور
غیر مہذب بھی۔ معزز اور مہذب پیشہ وروں میں استاد۔ قاضی۔ وکیل۔ ڈاکٹر۔ انجینیئر۔ واعظ۔ شاعر کا شمار ہوتا ہے۔
ان کے بغیر آپ مہذب زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ استاد کے بغیر آپ بے علم اور بے عمل رہ جائیں گے۔ (یہ اور
بات ہے کہ موجودہ دور میں طالب علم استادوں سے علم حاصل کر کے بھی بے علم ہی رہتا ہے) قاضی جی نہ ہوں تو
ساری دنیا کنواری رہ جائے گی۔ وکیل نہ ہوں تو آپ جھوٹ بولنے سے محروم ہو جائیں گے۔ واعظ نہ ہو تو زندگی کے
ظاہر و باطن کا فرق مٹ جائے گا۔ شاعر نہ ہو تو خیالی دنیا سے واسطہ ختم ہو جائے گا۔ حالانکہ ہم غیر مہذب پیشہ وروں
کی مدد سے ہی مہذب بنتے ہیں۔ تن ڈھانکنے کپڑا۔ پیٹ بھرنے اناج۔ رہنے کے لئے گھر۔ نازک تلووں کو محفوظ رکھنے کے
لئے چپل۔ جانوروں اور انسان میں تمیز برقرار رکھنے کے لئے بالوں کی تراش خراش۔ کپڑوں کی صفائی۔ گھروں کی غلاظت
دور کرنا سب ان ہی کے ذمے ہوتا ہے۔ گاؤں کے یہ غیر مہذب پیشے شہروں کی رنگین فضا میں کچھ عجیب بہار دکھاتے ہیں
شہر میں ڈھونڈے سے بھی کہیں جلاہا۔ چمار۔ نائی۔ دھوبی۔ نہیں ملے گا۔ البتہ بڑی بڑی کپڑے بنانے والی ملوں کے شوروم
میں مصنوعی مسکراہٹ والے جلاہے ضرور ملیں گے۔ جو اپنی مل کا اشتہار بنے ہر آنے جانے والے کا استقبال کریں گے
چمار کا آبائی پیشہ تو اب باٹا اور کرونا کے ذمہ ہو گیا ہے۔ نائی اور دھوبی کا پیشہ بھی آبائی نہیں رہا کیوں کہ یہ پیشہ
شہروں میں بڑے سلیقے سے نبھایا جاتا ہے۔ آپ کسی پیشے میں خواہ کتنے ہی ماہر کیوں نہ ہوں وہ پیشہ اس وقت تک
مفید ثابت نہیں ہوتا جب تک کہ اس کے لوازمات کا خیال نہ رکھا جائے۔ شہر میں کسی پیشے کو مقبول بنانے کے لئے
شہر کے مرکزی حصے میں دکان کا حاصل کرنا ضروری ہے۔ اس اول شرط کے ساتھ دوسری اہم شرطیں بھی ہوتی ہیں
ان میں کی ایک CONDITION یہ بھی ہے کہ دکان AIR CONDITION ہو۔ دوسری شرط اس میں حسین لڑکیاں
اور قبول صورت لڑکے دست فروشی کے لئے رکھے جائیں جو ایر انڈیا کا مونوگرام بنے گاہکوں کا استقبال کرتے
رہیں۔ اور جب گاہک نہ آئیں تو ایک دوسرے کی دلچسپی کا سامان بنے رہیں۔ ہر شہر میں وسیع و کشادہ سڑکوں کے کنارے
ہیر ڈریسنگ سیلون اور ڈرائی کلینر کی دکانیں اپنی باہیں وا کئے ہوتی ہیں۔ ان دکانوں خاص کر اصلاح خانوں کی فضا
بڑی طلسماتی ہوتی ہے۔ جیسے ہی دکان میں قدم رکھیں جل ترنگ بجنے لگتے ہیں اور "ہر طرف میں ہی میں ہوں" کا
منظر دکھائی دیتا ہے۔ ایسی سحر انگیز فضا میں انسان پانچ پیسے کی اصلاح کے لئے پانچ روپے ہی کیا پچیس روپے

بھی دینے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ آج کل پیشے اور موسیقی کا رشتہ بہت مستحکم ہو گیا ہے۔ کپڑوں کی دکان میں موسیقی اصلاح خانے میں موسیقی غرض یہ شیطانی لوری ہر جگہ سنائی دیتی ہے۔ حتیٰ کہ کسی اچھے ٹراولس کوچ TRAVELLERS COACH میں بیٹھ کر سفر کیجئے تو رات بھر یہ گانے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برستے رہیں گے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

پیشہ میں کوئی ماہر ہو یا نہ ہو اگر دکان میں موسیقی کا انتظام کیا جائے تو پیشہ خود بخود چل نکلے گا۔

ضرورت ایجاد کی ماں ہے تو پیشہ ضرورت کا باپ۔ پہلے پہل رشتے وعدوں اور باتوں پر ہوا کرتے تھے اور ان وعدوں کے پورا ہونے تک کئی عدد چپل گھس جاتے تھے۔ آج کل اس کام کے لئے بھی دفاتر کھول دیئے گئے ہیں جہاں ایک عدد چپل گھسے بنا ہی ریڈی میڈ دلہا دلہن مل جاتے ہیں (البتہ امپورٹیڈ دلھوں کی زیادہ مانگ ہوتی ہے) اور چٹ منگنی پٹ شادی ہو جاتی ہے۔ موجودہ دور کے فائدہ مند پیشوں میں یہ بھی ایک فائدہ مند پیشہ ہے۔ بچوں کے بیٹھک خانے (BABY SITTING HOMES) موجودہ دور کا ترقی یافتہ پیشہ ہے پہلے ہر گھر میں بچہ کی دیکھ بھال کے لئے ایک انّا ہوتی تھی۔ پر اب ایک انّا اپنے گھر پر سو بچوں کی نگرانی کرتی ہے۔ اس کے باوجود بھی وہ عورت انّا نہیں کہلاتی گو کہ یہ انّا کے پیشے کی طرف پھر لوٹ آئی ہے۔ عورتوں کے لئے بہت کم پیشے موزوں و مناسب ہوتے ہیں لیکن وہ آج کل ایسے پیشوں کو اپنانے لگی ہے جس سے اس کی نسوانیت ختم ہو گئی ہے۔ ٹائپ رائٹر کے ساتھ اٹھکھیلیاں کرنا۔ فون پر سرگوشیاں کرنا اور ہر اجنبی پر مسکراہٹ کے پھول نچھاور کرنا اس کا پسندیدہ پیشہ ہے۔ اور آج کے نوجوان جن کے اعصاب پر عورت سوار ہے وہ یا تو کپڑوں کی دکان یا پھر نقلی زیورات کی دکان لگائے بیٹھے ہیں۔ کیوں کہ شہر کی ساری حسیناؤں کا ہجوم ان کی دکان پر لگا رہتا ہے۔ کچھ تو بہانہ بہر ملاقات چاہیئے۔ موجودہ دور میں کوڑا کرکٹ سمیٹنا بھی ایک پیشہ بن گیا ہے۔ یہ گھوڑ پر پڑی ہوئی چیزوں کی تجارت تو اور بھی فائدہ مند پیشہ ہے۔ ہم نے کبھی گاؤں کی گلیوں میں بوڑھی عورتوں کو گوبر سمیٹتے دیکھا تھا۔ جو اُپلیاں بنا کر روزی کماتی تھیں۔ پر آج تو نالیوں اور کچرے کی کنڈی میں پڑے کاغذ، پلاسٹک کے ٹکڑے، بالوں کے گچھے جمع کرنا مسٹنڈوں کا پیشہ بن گیا ہے۔ آج کل تو گھوڑ گو بھی مل آگیا ہے۔ سنا ہے کہ بچارے دن بھر گھوم کر کوڑا جمع کرنے والے اس قدر نفع نہیں پاتے جس قدر اس کے بیوپاری حضرات حاصل کرتے ہیں۔

ہمارے ملک میں خود سرکاری و غیر سرکاری، آبائی و غیر آبائی۔ مہذب و غیر مہذب پیشے اس قدر ہیں کہ دوسرے ممالک کے بارے میں سوچنے کی چنداں ضرورت نہیں آج کل عجمی و حجازی ہوا کی کشش پھر ہندوستانی کے قدم کو ڈگمگا رہی ہے۔ پیشہ سے زیادہ پیشہ ور کی قدر افزائی سے ان کے منہ میں پانی آجاتا ہے۔ یہاں کے نوجوان گلیز، ڈرائیور بننے کے لئے جاتے ہیں شوقیہ قسمت سے باورچی یا گورکن بن جاتے ہیں۔ صحرا کی سخت زمین کھودتے کھودتے اس میں خود دفن ہو جاتے ہیں۔ البتہ ان کی لاش بڑے اہتمام سے بذریعہ طیارہ بھجوائی جاتی ہے یا پھر مالبقین ولاحقین نعش کے نہ حاصل کرنے پر اپنے آپ کو یوں تسلی دیتے ہیں کہ ایسا مقدس مقام بھلا کسے نصیب ہو سکتا ہے۔ اور بارہا کوششوں کے باوجود جو پیشہ ور ناکام رہ جاتے ہیں وہ اپنے آپ کو یوں مطمئن کرتے ہیں کہ

چمکاتے شہر کی ساری رونق سے اپنے شہر کی آدھی رونق بھی۔

پیشہ پر شوشہ ہر زمانے میں لگایا جاتا ہے۔ کوئی پیشہ بُرا نہیں ہوتا۔ البتہ دیکھنے والوں کی نظریں ضرور بُری ہوتی ہیں۔ چند ایسے پیشے بھی ہیں جن کا نام سنتے ہی ہم کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں۔ طوائف، بھنگی، مُردہ فروش۔ جلاد ایسے ہی نفرت زدہ پیشے ہیں۔ در اصل یہ ہمارے سماج کے پاکیزہ کردار ہیں۔ انسانیت کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔ ایک عورت جو ماں بنے بغیر ماں کا پیار دینا چاہتی ہے، جو بہن بن کر کسی کا قصور اپنے ذمہ لے سکتی ہے جو بیٹی بن کر گھر کی عزت بڑھانا چاہتی ہے ہم اس کو صرف طوائف زادی رہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ چوڑیوں کی کھنک، پازیب کی جھنکار میں اس کا جنازہ نکل جاتا ہے۔ صد افسوس اس کے پیشہ کا جنازہ نہیں اٹھ سکتا۔ گلیوں کی غلاظت دور کرنے والا۔ محلوں، سڑکوں، گھروں کو پاکیزہ رکھنے والا خود گندہ اور بدنام تصور کیا جاتا ہے۔ اگر وہ اپنے پیشے کو خیرباد کہہ دے تو یہ دنیا خود گندگی کا ڈھیر بن جائے گی مُردہ فروش اس سماج میں کمتر درجے کا مستحق ہوتا ہے۔ لیکن لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ کنول کیچڑ میں رہ کر بھی پاکیزہ ہوتا ہے۔ جلاد کا نام سنتے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ روح فنا ہونے لگتی ہے۔ اس کا سامنا کرنے کی کسی میں ہمت نہیں ہوتی۔ اس کے چہرے کی وحشت۔ اس کے درد مند دل کو کہیں دفنا دیتی ہے۔ کیوں کہ مجرم کے کرتوتوں کی ساری نحوست اس کے چہرے پر ثبت ہو جاتی ہے۔ ہر جلاد قاتل ہو سکتا ہے لیکن ہر قاتل جلاد نہیں ہو سکتا۔ جلاد ایک ایسے پیشہ سے وابستہ ہوتا ہے جسے پہلے قدم پر اپنے آپ کو قتل کرنا پڑتا ہے۔ اس کا دل اس کا دماغ اس خونخوار تلوار اور تختۂ دار تلے دب جاتے ہیں۔ وہ ذوالفقار علی بھٹو کی روح کھینچ سکتا ہے۔ رنگا اور بلا کی جان لے سکتا ہے لیکن خود اپنی روح کھینچنے کی ہمت اس میں نہیں ہوتی۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کی ذمہ داری، بیوی کی پاک محبت اسے زندگی کی آخری سانس تک جلاد رہنے پر مجبور کرتی ہے۔

پیشہ میں عیب نہیں رکھیئے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

□□

شیخ رحمٰن اکولوی

ہم خواب میں دیکھتے کہ ایک بکرے کی کھال اُتار رہے ہیں۔ اس طرح کہ اکثر کھال کے ساتھ گوشت بھی اُترتا جاتا ہے۔ مسلسل ایک ہفتے تک یہی خواب دکھائی دیا تو ہم نے عالم صاحب سے رجوع کیا۔ انھوں نے کہا "ہر خواب میں کچھ اشارے ایسے مل جاتے ہیں جو تعبیر کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اب کی بار دھیان دے کر خواب دیکھنا۔ حسبِ معمول اسے قبل از وقت انجام رسید مت کرنا۔ پھر پورا خواب تفصیل سے مجھے سُنانا۔ انشاء اللہ تعبیر بتا دوں گا۔"

دوسرے دن وہی خواب پھر دکھائی دیا۔ ہم نے بہت دھیان دے کر سارا خواب دیکھا۔ صبح ہوئی تو عالم صاحب سے ساری تفصیلات بیان کردیں۔ وہ کچھ دیر آنکھیں بند کئے سر جھکائے بیٹھے رہے پھر گویا ہوئے۔

"تم نے کہا تھا کہ تم کتابوں کے ڈھیر پر کھڑے ہو کر بکرے کی کھال اُتار رہے تھے۔ کیا ادب سے تمہارا کوئی تعلق ہے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تب تو میں نے تمہارے خواب کی تعبیر اخذ کرلی۔ تم مستقبل قریب میں بحیثیت نقاد جلوہ گر ہوں گے۔" ہم گھر لوٹ آئے۔ عالم صاحب کی تعبیر پر ہمیں یقین نہ آیا۔ ایک رات پھر وہی خواب دکھائی دیا۔ ہم یکایک ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے۔ ہمیں بدہضمی کا احساس ہوا۔ حلق خشک ہوگیا۔ منہ میں کڑواہٹ سی گھل گئی۔ سر میں ہلکا ہلکا درد ہونے لگا اور یکلخت ہمیں محسوس ہوا جیسے ہمارے اندر کسی نقاد کی روح تحلیل کرگئی ہے۔ ہم بھرپور تنقیدی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ ہم نے سوچا اگر اللہ کی یہی مرضی ہے تو پھر ہمیں مصلحتِ خداوندی کے آگے سرِ تسلیم خم کرلینا چاہیے اور اپنی تنقیدی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر بگڑے ہوئے شاعروں اور ادیبوں کی اصلاح کرکے ادب کی خدمت کرنا چاہیے۔ خدا کو جس بندے سے جو کام لینا ہوتا

سہے، لیتا ہے۔ اس کے کام میں رکاوٹ ڈالنے والے ہم کون ہوتے ہیں!!

صبح اپنے دوستوں سے ہم نے اپنا خواب اور عالم صاحب کی تعبیر سنائی تو انہوں نے ایک آواز ہو کر کہا، کیوں اپنی ننھی جان جوکھم میں ڈال رہے ہو۔ کسی سر پھرے شاعر یا ادیب سے واسطہ پڑ گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ پھر آبدیدہ ہو کر بولے خدا کے لئے اپنے بیوی بچوں پر رحم کھاؤ اور اپنے ارادے سے باز آؤ۔ دوستوں کی درخواست ہم نے سنجیدگی سے سنی اور ارادے پر مزید سنجیدگی سے جمے رہے۔ آخر Risk کون سے کام میں نہیں؟

ہم نے سوچا تنقید کے میدان میں باقاعدہ تیاری کر کے اُترنا چاہیے تاکہ تنقید کا نشانہ نہ بنیں۔ ہم نے ہر دوکان پر اپنے مطلب کی کتابوں کے بارے میں پوچھ گچھ کی۔ ہمارا خیال تھا کہ "گھر بیٹھے ڈاکٹر بنیے" "اچھے شوہر بنیے" "لیڈر بنیے" وغیرہ کتابیں ملتی ہیں تو "گھر بیٹھے نقاد بنیے" کتاب بھی ضرور مل جائے گی۔ لیکن افسوس کہ ہماری اُمید بر نہ آئی۔ ایک بُک سیلر نے کہا "صاحب جادوئی پٹارہ پبلیکیشنز نے اس طرف توجہ نہیں دی ورنہ ——— خیر میں ابھی انہیں لکھے دیتا ہوں۔ ایک ماہ بعد کو اپنے مطلب کی کتاب اسی دوکان میں مل جائے گی"۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ جو آج کرنا ہے وہ "ابھی" کر۔ اس لئے ہم نے بُک سیلر کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے اپنی راہ لی۔ وہ منھ پھاڑے ہمیں دیکھتا رہ گیا۔

ہم نے اپنی سمسیا ایک خیر خواہ کو بتائی تو اس نے ہمیں ایک سیانے کا پتہ دیا۔ اور اس سے ملاقات کرنے کی تلقین کی۔ اس نے یقین دلایا کہ وہ ہماری ضرور مدد کرے گا۔ ہم بتائے ہوئے پتے پر پہنچے اور سیانے سے ملاقات کی۔ اس کی شکل بڑی بھیانک تھی۔ ہمارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بمشکل تمام ہم نے اپنے آپ کو سنبھالا اور پوچھا "آپ کی صورت اتنی ... بھیانک کیوں ہے ؟؟" وہ زیرِ لب مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ بھی زہریلی تھی۔ پھر گویا ہوا۔ "میرے بچے میں یوں ہی ہر فن نہیں بنا۔ میرے چہرے کے اُتار چڑھاؤ میرے عمیق تجربات و مشاہدات کے غماز ہیں۔ خیر ——— تم بتاؤ تمہاری سی ضرورت تمہیں میرے پاس لائی ہے؟ ہم نے اپنا مدعا ظاہر کیا تو اس نے سرتاپا ہمیں تنقیدی نظر سے دیکھا اور پوچھا "تمہارا ہاضمہ کیسا ہے؟"

"بگڑا ہوا۔"

میرے جواب سے اس کی دہشت انگیز آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ "بگڑا ہوا ہاضمہ نقاد بننے میں تمہاری بڑی مدد کرے گا" اس کی بات کا مطلب ہم سمجھ نہیں پائے تھے اس لئے ہونق بنے کھڑے رہے۔ جس کا اس نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ "کل سے تمہاری ٹریننگ شروع ہو جائے گی۔ فجر کے وقت سے ۱۰ بجے تک تم میرے ساتھ رہو گے۔ آج سے تم رات کا کھانا نہیں کھاؤ گے۔ تمہیں سامنے والی پہاڑی پر خاردار جھاڑیوں کے درمیان ایک گھنٹہ دوڑنا ہوگا۔ روزآنہ ۱۵ منٹ تک دو پہلوانوں کی مار تمہیں کھانی ہوگی۔ سانس روک کے رہنے کی ٹریننگ بھی تمہیں دی جائے گی۔ اور ہاں ذہن نشین کر لو تمہیں وہی کرنا ہوگا جو میں کہوں گا۔ تم کسی بات پر تنقید نہیں کرو گے۔ کوئی سوال نہیں پوچھو گے"۔ ہم نے سوچا یہ ہدایت

پہلے دن ہماری جانب سے پوچھے گئے سوال کا ردعمل ہے۔

دوسرے دن سے ہماری ٹریننگ شروع ہوگئی اور ایک ماہ تک چلتی رہی۔ ٹریننگ کے دوران ہماری کیا گت بنی۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہمارا وزن ۱۵ پونڈ کم ہوگیا۔ Physical Training ختم ہونے کے بعد ہماری Theoretical Classes شروع ہوئیں۔ پہلے دن کا خطبہ اُستاد ہرفن مولا نے یوں دیا۔

" Physical Training کی باتیں تمھیں عجیب سی لگی ہوں گی۔ حالانکہ وہ قطعی عجیب نہیں تھیں۔ رات میں کھانا نہ کھانے کی وجہ سے تمہیں جلد نیند نہیں آتی ہوگی۔ اس سے تمہارے مزاج میں چڑچڑاپن پیدا ہوگیا ہوگا۔ نقّاد کا چڑچڑا ہونا ضروری ہے ورنہ وہ کڑی تنقید کر ہی نہیں سکتا۔ بدہضمی سے پیدا شدہ جھلاہٹ تمہارے چڑچڑے پن کو بنائے رکھے گی۔ بدہضمی کی شکایت تنقید نگاری کے معاملے میں نعمتِ عظمیٰ سے کم نہیں۔ اچھے بڑے لوگ شاعروں اور ادیبوں میں بھی ہیں۔ کسی دن ان کی ٹولی تمہیں گھیرنے کی کوشش کرے تو خاردار جھاڑیوں کے درمیان دوڑنے کی ٹریننگ کام آئے گی۔ خدانخواستہ اگر وہ تمھیں گھیرنے میں کامیاب ہو بھی گئے تو ان کی مار کا تم پر مطلق اثر نہیں ہوگا۔ روکھی سوکھی بھی انہیں مشکل سے میسّر ہوتی ہے اور پہلوانوں کی پٹائی نے تمہارے رگ پٹھے مضبوط کر دیئے ہیں۔ سانس روکے رہنے کی ٹریننگ تمھارے اُس وقت کام آئے گی جب شاعروں اور ادیبوں کے تیچھے تمہاری پٹائی کریں گے۔ اس وقت تم سانس روک کر زمین پر پڑے رہوگے اور وہ تمھیں مُردہ سمجھ کر چھوڑ بھاگیں گے "

دوسرے دن کے لیکچر میں اُستاد محترم نے درج ذیل باتیں بتائیں۔

(۱) بحیثیت تنقید نگار ہم اپنے لئے ثقیل قسم کا نام رکھ لیں۔ کوئی ہمارے نام کے معنی جاننا چاہے تو اسے بابائے اُردو کی ڈکشنری سے استفادہ کرنا پڑے۔ علمیت لئے ہوئے ناموں کا قارئین پر رعب پڑتا ہے۔

(۲) ادب میں نئی لہر کے نام پر منفی چیزیں زیادہ پسند کی جاتی ہیں۔ اس لئے تنقید منفی ہو۔ اس قدر کہ متعلقہ فنکار سے سوالی اور جوابی خطوط کی شکل میں گرما گرم بحث کا سلسلہ شروع ہوجائے اس طرح کم وقت میں زیادہ پبلسٹی ملے گی اور اس اخبار یا رسالے کی مانگ بھی بڑھے گی۔ جسے اس لڑائی میں بطور میدانِ جنگ استعمال کیا جائے گا۔

(۳) ادب کے معاملے میں بھی ہندوستانی مغرب زدہ ہیں۔ تبصروں میں جا بجا مغربی ادب کے حوالے دیئے جائیں اس سے عمیق مطالعے کا اظہار ہوگا۔ وقتِ ضرورت ان حوالوں کو توڑ مروڑ کر اس طرح پیش کیا جائے کہ ایک نئی منطق، نیا فلسفہ، نئی تھیوری سامنے آئے اور تبصروں میں وزن پیدا ہو۔

(۴) ادبی مراکز سے تعلق رکھنے والے شاعروں اور ادیبوں کے تبصرے بہت کر لکھے جائیں تاکہ ان کے ہاں کسی ادبی فنکشن میں ہنگامی صورت حال کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

(۵) ایسے فنکاروں کی سطحی تخلیقات کو بھی جو ادب میں چاپلوسی، سرمایہ داری یا رشتہ داری کی بناء پر چل نکلے ہوں سراہا جائے تاکہ ان کے چمچوں کی حمایت حاصل ہوجائے۔ زندگی کے دوسرے شعبہ جات کی طرح ادب میں بھی گروپ ازم کی بڑی

اہمیت ہے۔

(۹) دوکان چل نکلے تو خوبصورت انداز میں لفاظی کرکے کام چلایا جائے کہ قارئین تبصروں میں تنقیدی عناصر ڈھونڈنے کی بجائے الفاظ کے سحر میں کھو جائیں۔ اس طرح ایک وقت میں کئی تبصرے قلم برداشتہ لکھے جاسکیں گے اور کم وقت میں زیادہ کام ، دام ، نام ہوگا۔

قطع کلام کی معذرت چاہتے ہوئے ہم نے اُستاد محترم سے پوچھا " آپ نے مار کھانے یا ، پچھاڑ کرنے کی ٹریننگ دی ہے مارنے کی ٹریننگ نہیں دی " جواب ملا۔ " نقاد اور سرپھرے پہلوان میں صرف یہی فرق ہے کہ پہلوان ہاتھ پاؤں چلاکر اور نقاد زبان یا قلم سے تباہی مچاتا ہے۔

اُستاد پہلوان نے ہم سے کہا کہ پہلا تبصرہ ہم اپنی کتاب بلاعنوان پر لکھیں تاکہ وہ اندازہ کرسکیں کہ ہم اپنی ٹریننگ میں کتنے کامیاب ہوئے ہیں۔ ہم نے سوچا اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ پچھلے ناقدین کہہ گئے ہیں کہ تنقید (دوسرے الفاظ میں اصلاح) کی ابتداء اپنے گھر سے ہونی چاہیے۔ بلاعنوان پر ہم نے جو تبصرہ لکھا وہ یوں لکھا تھا۔

بلاعنوان کتابت ۔ طباعت ہر لحاظ سے اکولہ میں مکمل ہوئی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف علاقائی تعصب کا شکار ہے۔ کیا کسی کام کے سلسلے میں دوسرے شہر کی خدمات حاصل نہیں کی جاسکتی تھیں ؟

ایڈیشن کے بارے میں معلومات دیتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے۔ " پہلا اور غالباً آخری " معلوم ہوا کہ مصنف میں خود اعتمادی کا فقدان ہے۔ اسے یقین نہیں کہ وہ اس کتاب کے بعد بھی چل سکے گا۔ جو مصنف اپنی پہلی تصنیف میں اس طرح عدم اعتمادی کا مظاہرہ کرے قارئین کو اس سے زیادہ اُمیدیں وابستہ نہیں کرنی چاہئیں۔

۱۳۶ صفحات کی قیمت دس روپے رکھ کر مصنف نے قارئین پر رعب ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ کیا وہ سمجھتا ہے کہ قیمت زیادہ رکھنے سے کتاب کی علمی و ادبی حیثیت بڑھ جاتی ہے ؟

کتاب کا انتساب بیگم کے نام ہے اس کے علاوہ بیشتر مضامین میں بیگم کا ذکر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف بیگم زدہ ہے اس کا تجربہ اور مشاہدہ انتہائی محدود ہے۔ اگر مصنف اپنی صفائی میں کہے کہ اس نے بیگم کی آڑ میں عورت ذات کو طنز کا نشانہ بنایا ہے تو خواتین کو عالمی سطح پر مصنف کے خلاف احتجاجی اقدامات کرنے چاہئیں تاکہ کتاب پر پابندی عائد کردی جائے اور دوسرے ادباء عبرت حاصل کریں۔

کہیں کہیں مصنف کی مبالغہ آرائی حد سے تجاوز کرجاتی ہے مثلاً مضمون " بمبئی قلم کی زد میں " لکھا ہے " فیشن پرستی کی شدت سے یہ فائدہ ہوا کہ مردانہ اور زنانہ کپڑوں کا مسئلہ ختم ہوگیا۔ مرد اور عورت سب طرح کے کپڑے پہن سکتے ہیں "۔ بمبئی میں عورتیں پینٹ بشرٹ پہنتی ہیں۔ یہ درست ہے لیکن مرد چاہے وہ کتنا ہی فیشن ایبل کیوں نہ ہو ساڑی بلاؤز میں ملبوس نظر نہیں آیا۔ اسی مضمون میں آگے رقم طراز ہیں۔ " یہاں ہاؤس کم ہاؤسنگ سوسائٹیاں زیادہ ہیں " ارے صاحب ہاؤس کم ہوں تبھی تو سوسائٹیاں زیادہ بنتی ہیں نا ؟

کتاب کی ابتدا میں کچھ طنز و مزاح نگاروں کے تعریفی تبصرے شائع کر کے مصنف نے پبلسٹی حاصل کرنے کا اچھا طریقہ اختیار کیا ہے۔ کسی فنکار کے فن کا تجزیہ کر کے اسے درجہ عطا کرنا نقاد حضرات کا کام ہے۔ طنز و مزاح نگاروں کا نہیں کیا مصنف کے پاس کسی نقاد کا کوئی سرٹیفکیٹ ہے کہ تصنیف کے ادبی مقام کا تعین کیا جا سکے ؟

ہماری کتاب پر ہمارا تبصرہ شائع ہوا تو ادبی دنیا نے اسے خوب سراہا۔ استاد محترم بہ نفس نفیس ہمارے غریب خانے پر تشریف لائے اور ہماری پیٹھ تھپ تھپائی (ان کے جانے کے بعد خود ہم نے بھی تنہائی میں کئی بار اپنی پیٹھ تھپ تھپائی) اس کے بعد ہم نے ایک تک بند شاعر کے مجموعۂ کلام پر جو کہ پہلوانِ سخن کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں اور جنھیں دیکھ کر بدمست بھینسے کی یاد آتی ہے، تبصرہ لکھا۔ یہ تبصرہ شائع ہوا تو دھوم مچ گئی اور نتیجتاً ہمیں اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ ہمارا تبصرہ ذرا منفی قسم کا تھا۔ اس لئے پہلوانِ سخن کے چمچوں نے ایک جگہ اچانک گھیر کے ہماری پٹائی شروع کر دی۔ ہم کسی طرح ان کے چنگل سے نکل کر بھاگے تو ہمیں حواس باختہ بھاگتے دیکھ کر ایک راہ گیر نے چور، چور کی آوازیں لگا دیں۔ بس پھر کیا تھا۔ راستہ چلتے لوگوں نے ہمیں پکڑ لیا اور دوسری مرتبہ ہماری پٹائی ہو گئی۔ ہوش آیا تو خود کو اسپتال میں پڑا پایا۔

اب جبکہ ہمارے سارے جسم پر پلاسٹر چڑھا ہوا ہے۔ ہم اہالیانِ ادب کو یہ نصیحت (یا وصیت) کرنا چاہتے ہیں کہ وہ شاعری میں طبع آزمائی کریں۔ افسانے لکھیں، مزاح نگاری کریں، بھولے سے بھی تنقید نگاری کی طرف مائل نہ ہوں۔ بلکہ احتیاطاً نقاد حضرات سے بھی دور رہیں۔ اگر راستے میں یہ نظر آجائیں تو ان سے کم از کم چالیس قدم کا فاصلہ رکھ کر راستہ طے کریں۔ اس پر بھی جب کبھی ذہن میں تنقید نگاری کے سانپ سرسرائیں تو ڈاکٹر سے ہاضمے کی درستی کے لئے دوائیں کہ دوسری اور بیماریوں کی طرح اس بیماری کا تعلق بھی معدے کی خرابی سے ہے۔

* *

غزلیں

مہمل لکھنوی
بمبئی

ہے خدا ہر سیاہ فام کے پاس
پر خدائی سفید فام کے پاس
ہیں صاحب نظر کہاں دیکھیں
چہرہ ہوتا نہیں عوام کے پاس
صبح پھرتی ہے ہاتھ پھیلائے
چوری کا مال سب ہے شام کے پاس
اب بھلا کون بچ کے نکلے گا
آ کے بیٹھے ہیں خود وہ دام کے پاس
ہر نئے شہریار کی پنسل
پہلے رکتی ہے میرے نام کے پاس
وہ تو راکٹ سے چاند پہ پہونچے
ہم کھڑے ہیں ابھی ٹرام کے پاس
شیخ کر لیتے ہیں حلال اس کو
جانا ہوتا ہے جب حرام کے پاس
لگنے والا ہے کرفیو آرڈر
آج وہ آ رہے ہیں بام کے پاس
دیکھتے ہیں کہار بن کے انھیں
ورنہ پہرا ہے تام جھام کے پاس
نیتا کا کام باتیں کرنا ہے
وہ پھٹکتا نہیں ہے کام کے پاس
سادگی تو اکیلی رہتی ہے
مجمع ہوتا ہے ٹیم ٹام کے پاس
معنی سب لے لیے خموشی نے
خالی مہمل بچے کلام کے پاس

عالم تاجپوری

لیلائے وزارت پہ جو قربان رہے ہیں
وہ خاکِ کفِ پائے جنوں چھان رہے ہیں
اِس دور میں ہر ذہن پہ بھباٹ ہوا ہے
سب اس لیے دولت کو خدا مان رہے ہیں
گلیوں میں دکھائی نہیں دیتے وہاں مُرغے
اک ہفتہ جہاں شیخ جی مہمان رہے ہیں
باجے مری شادی میں بجیں، ناچ بھی ہو خوب
دل میں مری امّی کے یہ ارمان رہے ہیں
جس نے ہمیں گھائل کیا کل تیرِ نظر سے
کیا آپ بھی اُس شوخ کو پہچان رہے ہیں
پوچھیں گے نکیرین نہ کچھ ہم سے لحد میں
بس لکھ دو کفن پہ کہ مسلمان رہے ہیں
مُلّا ہیں بڑے معتبر و پارسا لیکن
انسان کی صورت میں بھی شیطان رہے ہیں
سالا بھی ہمیں کہنے میں آتی تھی جنھیں شرم
کیوں آج میاں بھائی وے گردان رہے ہیں
ہوتے نہ معطل کبھی لینے سے کلکٹر
دینے میں مگر گھوس وہ نادان رہے ہیں

یک نہ شُد...

["معذرت" کی پیروڈی روحِ جوش
سے معذرت کے ساتھ]

میں کھانسا تو پڑوسن کا ہمارے چھُٹ گیا پارا
معًا اس نے مری جانب اٹھا کے اینٹ دے مارا

مجھے چکّر سا اک آیا طبیعت میری گھبرائی
بہا جو خونِ ناحق تو رپٹ میں نے بھی لکھوائی

کہا میں نے کہ اے صاحب مجھے ہے بلغمی کھانسی
اگر ہے کھانسنا اک جرم تو دلوائیے پھانسی

یہ سُننا تھا کہ تھانیدار صاحب نے مجھے ڈانٹا
یہاں کھانسا اگر کم بخت تو پڑ جائے گا چانٹا

حیدر بیابانی
بیتُل گنج (ایم۔ پی)

ایاز
(وردڑ)

لانا جوئے شیر کا

شیریں فرہاد کے قصے میں ایک کردار ہے خسرو، اسی خسرو اور ہماری بیگم کے ابا جان دونوں میں پہلے پہل تمام قدریں مشترک تھیں سوائے ایک "واو" کے جس کے خاصہ وجود کو قاضی صاحب نے بوقت نکاح کان پکڑ کر نکال باہر کیا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ خسرو کا ایک محل بھی تھا جو ہمارے خسر محترم تک آتے آتے ایک بوسیدہ جھونپڑا سا رہ گیا۔ جس کے درو دیوار ہوا پانی کے ڈر سے دن رات لرزتے رہتے اور "بے درو دیوار کا اک گھر بنانا چاہیئے" کی ایک صدائے خفی گونجا کرتی۔ خسرو نے فرہاد کو دودھ کی نہر لانے کے لئے بھیجا تھا۔ ہمارے خسر پر بھی اس کا اتباع لازم تھا۔ البتہ یہ دشتِ احتیاط میں اس سے دو قدم آگے تھے۔ لہٰذا ازراہِ احتیاط شیریں کو بھی ہمارے ساتھ کر دیا کہ مبادا کہیں کسی پیرزن کی کہی سنی سے ہم اپنا سر شیشے سے پھوڑ نہ ڈالیں۔

چنانچہ اب وہ خسرزادی دودھ کا خالی گلاس لئے ہمارے سر پہ سوار تھی — "آپ دیکھتے نہیں بچے دودھ کے بغیر بھوک پیاسے بلبلا رہے ہیں" جواباً فرمایا کہ بیگم قدرت نے یہ ڈیوٹی تمہارے سپرد کر رکھی ہے اور ہمیں معذورِ مطلق بنایا ہے لہٰذا اس سلسلے میں ہم کیا کر سکتے ہیں۔ اس پر وہ پیر پٹختی ہوئی اندر گئیں اور جھٹ دو منٹ بعد راگ سے پُر سراپا احتجاج دو سالہ بچہ ہماری گود میں لا کر ڈال دیا اور یہ کہتی ہوئی واپس ہو گئیں — "اور اب چائے بھی آپ خود ہی بنا لیجئے"۔ دراصل ہوا یوں کہ اس بار ہمارا مستقل گوالا آیا اور دودھ معاف کرا کے چلا گیا کہ ہماری بھینس گابھن ہے تم کوئی ہور ٹھکان ڈھونڈ لیو۔

بادل ناخواستہ اُٹھے تو اتنی کی آواز نے رہے سہے حواس بھی درست کر دیئے کہ بے رحم دودھ کے ایک اک قطرے کو ترسا چھوڑا اگر آج گھر میں دودھ نہ آیا تو یاد رکھ تیرا دودھ ہرگز نہ بخشوں گی۔

سوچا کہ غالب نے بڑا اچھا دور پایا تھا کہ صبح کو شام کرتے اور جوئے شیر لے آتے بھینس کے انڈے سے روغن گل نکال لانا ہوتا تو کوئی بات نہ تھی لیکن اب ہم اس دودھ کی تلاش میں کہاں جائیں۔ دودھ لانا اور چھٹی کا دودھ یاد آنا دونوں میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا تھا۔ لا محالہ خشر اوسان جمع کئے اور چل شیئاً للہ — "قدم قدم بڑھائے جا" کی دھن پر بڑھتے ہی چلے گئے۔ دوپہر کی کڑی دھوپ میں ایک ایک گوالے کا گھر اور ایک ایک ڈیری چھان ماری۔ اس محنتِ شاقہ کے نتیجے میں خون کا پانی بن کر پسینے میں ڈھل گیا دعا کی کہ یا خدا! اسی کو دودھ کا روپ دے دے تو آدھا سیر دودھ کہیں نہیں گیا۔

جب گوالوں اور ڈیریوں سے ناامید ہو چکے تو کہی سنی ہوئی ایک بات یاد آئی کہ ہندوستان میں اکثر محکموں کے ملازمین اور

بعض دفعہ پورے پورے ڈپارٹمنٹ مثلاً پولیس، عملۂ بلدیہ وغیرہ سوائے "دودھ دینے" کے کوئی کام ہی نہیں کرتے وہاں بھی قسمت آزمائی کر دیکھی اس جگہ دودھ تو نہ ملا البتہ اس کا سراغ مل گیا کہ ایک مل مزدور کارخانے میں ہونے والی ہڑتال کا خاطر خواہ فائدہ اٹھا کر ٹیمپل روڈ پر دودھ بیچ رہا ہے۔ دیوانہ وار ہم اسی دیوانگی کے عالم میں دودھ خریدا اور روانہ ہوئے اپنے گھر کی طرف۔

راستے میں ایک صاحب ملے اور یہ اکثر اسی موقع پر مل جایا کرتے ہیں جب کہ دودھ یا تنخواہ ان دونوں میں سے کوئی ایک شئے مل چکی ہو۔ پوچھا کیا لائے ہو۔ کہا "دن بھر کی سخت محنت و مشقت کا حاصل آدھا پاؤ دودھ"۔ وہ صاحب جواباً کہنے لگے کہ اگر تم کہو کہ دن بھر دودھ کا دودھ پانی کا پانی کرتے رہے تو میں مان لوں مگر یہ بتاؤ کہ تم اتنے مدھو کب سے ہو گئے کہ دودھ چھوڑ دیا اور گلاس میں آدھا پاؤ پانی لئے چلے آ رہے ہو۔ مضمحل لہجے میں جواب دیا کہ گوالے کی دو منٹ کی کوشش دودھ کو پانی بنا سکتی ہے تو کیا میری دن بھر کی محنت پانی کو دودھ نہیں بنا سکتی۔ اگر ایسا ہے تو تف ہے ہماری زندگی پر ہم ایک بھینس سے بھی بدتر ہیں کہ دودھ تک نہیں دے سکتے۔

"اور بھینس جو دیتی ہے اسے بھی پانی بنا دیتے ہیں"۔ وہ صاحب ہنس پڑے۔

آگے بڑھے تو دیکھا۔ چند بچے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں رگڑ رگڑ کر سر اوپر اٹھائے ہوئے جھوم جھوم کر گا رہے ہیں ـــ

بگلے بگلے دودھ دے ـــ آدھی روٹی چور دے ـــ

اور آسمان پر دور تک بگلوں کی قطاریں چلی جا رہی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ایک بچہ اپنی انگلیوں کے ناخن ٹٹولتا ہوا بولا۔ "ارے ابھی تک ناخن سفید نہیں ہوئے کیا تمہارے بھی نہیں ہوئے"۔

"اوں ہوں! میرے بھی نہیں ہوئے"۔ دوسرا بچہ

"یار ایسا لگتا ہے آج بگلے بھی اسٹرائیک پر ہیں"۔

"ہم چپ چاپ اپنے گھر کی طرف ہو لئے۔

عمر حنیف

(کھٹمنڈو)

ضرورتِ رشتہ

لڑکا خوبرو ہے، اور اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی (لڑکے نے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی ہے۔) خاندان کا سلسلہ مغلوں سے جا کر ملتا ہے۔ (لیکن لڑکا تاتا کو قسم کا نہیں) یہی ایک اس کی منفرد خصوصیت ہے!!
لڑکے کا قد اتنا ہے جتنا کہ ہونا چاہیئے۔ پیسے اُس سے زیادہ کماتا ہے جس سے کہ اس کی گزر اوقات راجہ مہاراجہ جیسی ہو سکے۔
عمر کے متعلق صرف اتنا کہنا بجا ہوگا کہ عمر اتنی ہے جتنی کہ شادی کے لئے ہونی چاہیئے ــــ یا پھر مشکل سے دو چار مہینے نکلتے ہوں گے اور یہ بھی اس لئے نکلتے ہیں کہ لڑکے کا کہنا تھا کہ میں کچی عمر میں شادی نہیں کرنا چاہتا! اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ایک بڑی اچھی بات ہے ہمارے خاندان کے لڑکے اور لڑکیاں ایسی ہی عقلمندی کی باتیں کرتی ہیں ــــ اور عقلمندی کے کام بھی! اسی لئے ہم اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کی طرف سے مطمئن رہتے ہیں!!"

لہٰذا ان تمام حقائق کی روشنی میں نیک سیرت، اعلیٰ تعلیم یافتہ، خوبصورت، سرو قد، متناسب جسم، نشیلی آنکھیں (جن کی گہرائی جھیل سی ہو)۔ ایسی لڑکیاں اپنی ایک عدد فوٹو کے ساتھ اپنی دیگر معلومات ہمیں فراہم کریں۔ اگر لڑکی کے خاندان کا سلسلہ مغلیہ خاندان سے جا کر ملتا ہو تو اُس لڑکی کو ترجیح دی جائے گی!

اس پتہ پر خط و کتابت کریں۔

میاں ببر علی بابر

معرفت: احمد شاہ ابدالی سمندر گنج۔ جھمری تلیا۔

اس اشتہار کے سلسلہ میں رشتہ کے متعلق جن لڑکیوں کی درخواستیں آئیں وہ کچھ اس طرح تھیں۔

درخواست نمبر ۱!

مقصد ــــ "برضرورت ایک عدد رشتہ"

نام ــــ! مہرالنساء خانم والد کا نام عبداللہ خاں۔

پتہ ــــ! محلہ رانی گنج۔ بمبئی۔

تعلیم ــــ! لڑکی بی۔ اے پاس کر چکی ہے لیکن لڑکی کو "اردو" مطلق نہیں آتی۔ ہم نے اپنی لڑکی کو بچپن ہی سے انگریزی کی

دلوائی ہے۔ کیوں کہ انسان میں "اخلاق" اور "تہذیب" اس انگریزی تعلیم کی وجہ سے ہی تو آتے ہیں! یہاں بھی لڑکی کی ضد تھی کہ اس رشتہ کے لئے (APPLICATION) انگریزی زبان ہی میں بھیجی جائے۔ لیکن ہم نے اُسے ایسا کرنے نہیں دیا۔

"دیگر تفصیلات"! ایک عدد لڑکی کی تصویر ساتھ میں ارسال کی جارہی ہے۔ جس سے آپ اس کی خوبصورتی کا صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں۔ آپ نے اشتہار میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ لڑکی کی آنکھیں نشیلی اور ان کی گہرائی جھیل سی ہونی چاہیے ___ یقین جانیئے لڑکی کی آنکھیں آپ کو نشیلی سے کچھ زیادہ ہی نشیلی ملیں گی۔ اور ان آنکھوں کی گہرائی کے متعلق تو یہ سو فی صد صحیح ہے کہ جھیل کی گہرائی کی کیا مناسبت ہے، بلکہ لڑکی کی آنکھیں سمندر کی سی گہرائی رکھتی ہیں!

یہاں ایک اور بات کا ذکر کرنا نا مناسب نہ ہوگا کہ آنکھوں کی گہرائی کی بات سے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صاحب زادے کو جھیل میں ڈوبنے کا کچھ زیادہ ہی شوق ہے ___ شاید جھیل تک پیدل جاکر انھیں جھیل میں ڈوبنے میں تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا، اسی لئے وہ یہ کام گھر بیٹھے ہی کرنا چاہتے ہیں ___ بہت اچھی بات ہے! ایسا ہونا بھی چاہیئے۔ چنانچہ میں یقین دلاتا ہوں کہ لڑکے کو ڈوبنے کا اتنا ہی شوق ہے تو ہمارا دعویٰ ہے کہ ہماری لڑکی کی آنکھوں سے زیادہ گہرائی رکھنے والی آنکھیں آپ کو اور کہیں نہیں ملیں گی!

خاندان ___! ہمارے اور آپ کے خاندان میں کچھ زیادہ فرق نہیں، کیوں کہ ہمارے آباؤ اجداد کا وطن افغانستان ہی رہا ہے۔ اب آپ اندازہ لگا سکتے ہیں ہم مغلیہ خاندان سے کس قدر قریب ہیں۔

رہی لین دین کی بات تو آپ سے کچھ لینے کی بات تو ہمیں کرنی ہی نہیں ہے، کیوں کہ آج کے اس دور میں لڑکے والوں سے کچھ لینے کی بات سوچنا یہ ایک بہت بڑا گناہ ہے۔ چنانچہ ہمارے پاس جو کچھ ہے اُسے ہم نے آپ کو دینے کے لئے ہی رکھا ہے۔ اس لئے براہ کرم جو آپ کو ہم سے لینا ہے اس کی فہرست کی ایک "سائیکلو اسٹائل" کاپی ہمیں ارسال کر دیجئے۔

ایک اور بات آپ کو بتانا اپنا اولین فرض سمجھتا ہوں، کیوں کہ معاملہ رشتہ کا ہے۔ وہ یہ کہ لڑکی ہمیشہ دھوپ کا چشمہ اپنی آنکھوں پر چڑھائے رکھتی ہے۔ جس سے کہ اس کے حسن میں اور بھی نکھار پیدا ہو جاتا ہے۔ اس چشمہ کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ لڑکی کی بائیں آنکھ کی پتلی زاویہ قائمہ سے دائیں طرف صرف "ایک درجہ" جھکی ہوئی ہے ___! لیکن موٹی آنکھ سے یہ نقص نظر نہیں آتا! اور یہ بات بھی وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ "لڑکا" یوں ہی لڑکی کی آنکھوں میں ڈوبتا اُبھرتا رہا تو یہ ایک درجہ کا بے سبب جھکاؤ اپنے آپ ہی دور ہو جائے گا ___ اور یہ بھی اس بے سبب جھکاؤ کی ہی وجہ ہے کہ اسی سال ہم نے لڑکی کے لئے ایک نئی فیئٹ کار خریدی ہے۔ یہاں اس حقیقت کو نہیں جھٹلایا جا سکتا کہ نئی کار لڑکی کے جہیز ہی میں دی جائے گی!

اپنی مختصر سی بات کو طول نہ دیتے ہوئے یہ عرض کروں کہ اپنی جوابی تحریر لڑکے کی ایک عدد تصویر کے ساتھ ارسال کیجئے تا کہ ہم شادی کی تیاری میں ابھی سے مصروف ہو جائیں!

درخواست نمبر ۲ ___!

اشتہار نظروں سے گزرا!

آپ کو رشتہ کے لئے ایک عدد لڑکی کی تلاش ہے ___ تو جناب لڑکی ہماری ہے، مطلب ہمارے ابا جان کی!! لڑکی ایم اے فائنل کی تیاری میں زور و شور سے مصروف ہے۔ ویسے دو مرتبہ ایم۔ اے کے امتحان میں بیٹھ چکی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ایک پرچہ

میں صرف ایک نمبر سے "کراس" آگیا۔ اگر آپ کو یقین نہ آئے تو ہم ثبوت کے طور پر ایم اے کا امتحان دینے کے لئے بینک کے ذریعہ بھری گئی فیس کی سلپ کی ایک عدد TRUE COPY بھی ارسالِ خدمت کر سکتے ہیں۔ صرف آپ کی ہاں کا انتظار ہے!!

لڑکی نیک سیرت تو ہے ہی اور خوبصورت بھی!

عمر یہی کوئی ۱۷، ۱۸ سال کے درمیاں رہی ہوگی۔ ہاں آپ سوچ رہے ہوں گے کہ ایسے کیسے ہو سکتا ہے؟ تو جناب ہمارے والدِ محترم صدر مدرس رہ چکے ہیں۔ انہوں نے لڑکی کو دوسرے ہی سال سے گھر پر تعلیم دینی شروع کر دی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دس سال کی عمر ہی میں میٹرک کا امتحان پاس کر گئی۔ لڑکی کی ذہانت کا اندازہ آپ اس بات سے بخوبی لگا سکتے ہیں!!

لینے کی کوئی بات نہیں۔ ہمیں تو دینا ہے ___ لڑکی بھی! لڑکی کے ساتھ بھرپور جہیز دان ہوگا ___ اور ساتھ ایک عدد السیشن کتا بھی! کیوں کہ لڑکی اس کتے کے بغیر ایک پل بھی اکیلی نہیں رہ سکتی ___! یہ اس کے پیار کرنے کا ایک ادنیٰ سا واقعہ ہے۔ اور یہ بھی عرض کر دوں کہ ہماری لڑکی میں یہی ایک منفرد خاصیت ہے کہ جب وہ کسی سے پیار کرتی ہے تو بے انتہا کرتی ہے ___ پھر وہ انسان ہو یا کتا!!

لڑکی کی دو عدد تصویریں ساتھ ہیں۔ ایک فرنٹ پوز، دوسرا بیک پوز! آگے ہمیں کچھ اور کہنا نہیں۔ براہ کرم اپنی ہاں کے ساتھ لڑکے کی ایک عدد تصویر ارسال کیجئے۔ تاکہ بقایا جہیز کا جو سامان خریدنا باقی ہے اسے خریدنا ہم ابھی سے شروع کر دیں۔

لڑکی کا نام "نکہت جہاں" ہے۔ ویسے ہم پیار سے اُسے "نکی" کہتے ہیں۔ اس کے کتے کا نام پنکی ہے۔ لیکن رشتہ کے بعد آپ کو اختیار ہوگا کہ آپ اسے "نکی" کہیں یا اور کچھ کہیں اور لڑکی کو کوئی اعتراض نہ ہوگا!

پتہ: معرفت:۔ محمد خاں ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر
ننھے خاں کی حویلی چور دروازہ رانی کھیت۔!

درخواست نمبر ۳!

لڑکی ایک مقامی کالج میں لکچرار ہے!

تعلیم ایم اے پی ایچ ڈی ___ تنخواہ معقول پانچ INCREAMENTS کے ساتھ۔ لڑکی خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ نیک سیرت بھی ہے، اور نماز روزہ کی پابند بھی۔ وہ تو اپنی تصویر بھجوانے کے بالکل خلاف تھی لیکن ہماری ضد کی وجہ سے بے چاری کو اپنی تصویر کھنچوانی پڑی۔ شرمیلی طبیعت کی مالک ہے۔ اور ہونا بھی چاہیئے ___ شرم تو عورت کا سب سے بڑا گہنا ہے!!

یوں سمجھیئے کہ تمام باتیں آپ کے اشتہار کے عین مطابق ہیں۔ ہاں رہی ہمارے خاندان کی بات ___ تو خاندان اعلیٰ کلیے ہم پٹھان لوگ ہیں۔ یہ بات ہمارے ابا کے ابا جان کہا کرتے تھے۔ لیکن اس کا کوئی ٹھوس ثبوت ہمارے پاس نہیں۔ ویسے ہمارا ایک لڑکا پی ایچ ڈی کر رہا ہے ___ "ہماری اپنے خاندان کے حسب و نسب کے بارے میں"۔ ہم نے ہی اسے اس کارِ خیر کے لئے اکسایا ہے۔ جس دن اسے پی ایچ ڈی کی ڈگری مل جائے گی ہمیں اپنے خاندان کا صحیح پتہ لگ جائے گا۔ اور پھر خاندان کا پتہ لگتے ہی ہم آپ کو اطلاع کر دیں گے لیکن پھر عرض کروں گا کہ آپ اس معاملہ میں یقین رکھیئے۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ ہمارے خاندان کا سلسلہ مغلوں ہی سے جا کر ملے گا۔ یہ بات میں اس لئے بھی یقین سے کہہ رہا ہوں کہ اکثر میں خواب میں جناب اکبر، محترم بابر، اور قبلہ ہمایوں کو گلاب کا پھول ہاتھ میں لئے دیکھتا ہوں مجھے دوسرے قسم کے خواب نظر آتے ہی نہیں ___ ظاہر ہے کہ اپنا اپنوں کو ہی دکھائی دیتا ہے ___ خیر!!

جہیز کا سارا سامان لڑکی نے خرید لیا ہے۔ دو ٹرک تو آسانی سے بھر سکتے ہیں ___! بس آپ کی ہاں کا انتظار ہے۔

پتہ: درجانہ، ایم اے پی ایچ ڈی
ٹکسی کمپاؤنڈ، شولاپور۔

درخواست نمبر ۴۔

میرا نام ترقی آرا ہے!!

دراصل میرا یہ نام میرے نانا مرحوم کی نشانی ہے۔ یہ ان کے سوچنے کا ڈھنگ تھا کہ میں اس نام کی وجہ سے ہمیشہ ترقی کی راہ پر گامزن رہوں گی۔ ابھی تک بڑھ ترقی کر چکی ہوں۔ شادی کے بعد یہ بڑھ کی ترقی بھی یقیناً ہو جائے گی۔ میں ایک گھریلو سیدھی سادی لڑکی تھی۔ بلکہ اب پھر میں ویسی ہی بن جاؤں گی! دراصل میں نے ایک اشتہار پڑھا تھا جو ضرورت رشتہ کے متعلق تھا، جس میں لکھا تھا کہ ہمیں ایک عدد ماڈرن لڑکی کی ضرورت ہے۔ جس میں شرم و جھجک بالکل نہ ہو۔ جو برقعہ پہننے کی عادی نہ ہو۔۔۔! بس اسی اشتہار کے مطابق میں اپنے آپ کو ڈھالتے میں ایک ماڈرن لڑکی بن گئی۔ برقعہ پہنا چھوڑ دیا۔ کھلے عام گھومنا پھرنا شروع کیا تاکہ شرم و جھجک دور ہو جائے لیکن افسوس رشتہ کی بات جمی نہیں۔۔۔ خیر میں پھر سے اپنے آپ کو پہلی والی ایک سیدھی سادھی لڑکی میں تبدیل کر لوں گی۔ کیوں کہ جب میں ایک سیدھی سادھی لڑکی سے ماڈرن لڑکی بن سکتی ہوں تو ماڈرن لڑکی سے سیدھی سادی لڑکی بھی بن سکتی ہوں۔۔۔ اور ہاں اس کام میں مجھے زیادہ سے زیادہ صرف دو گھنٹے لگیں گے۔

شادی بیاہ کے معاملہ میں میں بہت فری فرینک FREE FRANK ہوں (یہ مجھے میرے گھریلو ماحول کی دین ہے) اور میں چاہتی ہوں کہ اپنی شادی بیاہ کی بات میں خود ہی طے کر دوں۔۔۔ اس میں برائی بھی کیا ہے؟؟ اب وہ زمانہ تو نہیں رہا جب لڑکیوں کو جانوروں کی طرح کسی کے بھی حوالے کر دیا جاتا تھا۔۔۔ زمانے نے کروٹ بدلی ہے۔ اب اس ترقی یافتہ دور میں لڑکے اور لڑکیوں کے ایک دوسرے کو دیکھنے کا رواج عام ہو چکا ہے۔۔۔ اور ایسا بھی ہونا بھی چاہیئے۔ (کیوں کہ کھلی آنکھ رکھ کر مکھی نگلنے کا انسان کو غم نہیں ہوتا)۔

میں اپنی تصویر دو روز بعد ارسال کروں گی۔ کیوں کہ مصوّر ایک نئی پکچر کے بینرس بنانے میں مصروف ہے! میں فوٹو کھنچوانے کے خلاف ہوں۔ کیوں کہ اکثر تصویریں خراب ہو جاتی ہیں۔ اسی لئے میں ہمیشہ اپنی تصویریں مصوّر کے ذریعہ ہی تیار کرواتی ہوں۔ (رنگین)

ہمارا خاندان آپ کے خاندان جیسا ہی ہے۔ بالکل راجہ مہاراجوں جیسا! ویسے آج کل کے ماڈرن لوگ خاندانوں کے جھمیلوں میں پڑتے نہیں اسی لئے میں نے اپنے خاندان کے متعلق کوئی ٹھوس ثبوت فراہم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔۔۔ ویسے ہمارے دادا جان کہتے تھے کہ ہمارے دادا دادؤں کی سیریز میں ہمارے ایک دادا محمود غزنوی کے سیدھے ہاتھ تھے۔۔۔ ظاہر ہے کہ انھیں اتنا بڑا عہدہ رشتہ داری کی وجہ سے ملا ہوگا۔

عمر ۱۸، ۱۹ سال کے درمیان! بی اے کر رہی ہوں۔ بس آپ کی رائے کا انتظار ہے۔

پتہ: معرفت: انجمن بہبودیٔ نسواں؛ پانی پت۔

تمام درخواستیں لڑکے سے پڑھوائی گئیں۔ ہر لڑکی کی تصویر دکھائی گئی۔ اور پھر صاحب زادے نے ان تمام میں سے ایک لڑکی کا انتخاب کر ہی لیا۔۔۔ مہرالنساء خانم کیوں کہ مہرالنساء کے والد نے کار اسی سال خریدی تھی۔ اور پھر ایک عدد تصویر کے ساتھ اپنی رضامندی کا خط لڑکی والوں کو ارسال کر دیا گیا۔

پندرہ روز بعد لڑکی والوں کی طرف سے لڑکے والوں کو ایک تحریر ملی لکھا تھا۔ "یہ آپ کی ذرّہ نوازی ہے جو آپ نے لڑکی کو اس قابل سمجھا! آپ کی تحریر ہی سے ساری باتیں عیاں ہو جاتی ہیں کہ آپ کس قسم کے لوگ ہیں" آپ نے لکھا ہے کہ "لڑکی ہمیں پسند ہے۔ خاندان کے متعلق بھی ہمیں کچھ کہنا نہیں۔ اور لین دین کے متعلق جو آپ دیں گے ہم رکھ لیں گے۔ (لڑکی بھی!) آپ کی ساری باتیں ٹھیک ہیں۔

لیکن ہم نے لکھا تھا کہ آپ اپنی حامی کے ساتھ ایک عدد تصویر لڑکے کی بھجوائیے، تاکہ ہم بھی دیکھیں کہ لڑکا کیسا ہے ـــــ ویسے ہوگا تو اچھا ہی، مغل خاندان کا جو ہے! ہم اس بات پر زور بھی نہ دیتے۔ لیکن لڑکی چاہتی ہے کہ لڑکے کی تصویر ایک نظر دیکھنے کو مل جائے تو بہتر ہوگا!

ـــــ اور ہاں جو تصویر آپ نے بھیجی ہے اُسے دیکھ کر تو ایسا لگتا ہے کہ لڑکا اچھا ہی ہوگا ـــــ کیوں کہ جب باپ کی تصویر ایسی ہے تو لڑکا بھی اچھا ہی ہونا چاہیئے۔ شاید غلطی سے یہ تصویر آپ نے بھیج دی ہے کبھی کبھار ایسا ہو جاتا ہے۔ خیر جلد از جلد لڑکے کی تصویر ارسال کیجئے! ـــــ □□

اسمٰعیل آذر

کیا پُٹّا بولوں امّاں

(ایک بیٹے کی کہانی بڑی بی کی زبانی)

اماں باوا کے جان کو کھاتیئے
کیا پُٹّا بولوں امّاں
کٹھ پُتلی کا ناچ نچاتیئے
کیا پُٹّا بولوں امّاں
بے دِکتے بیٹاداں میں پڑکو
دن بھر دھنڈلاتا رہتیئے
گانے گاتیئے چٹکیاں بجاتیئے
کیا پُٹّا بولوں امّاں
باوا سارا دن مر پڑکو
کیا پیسے لاتیں سو کی
جیباں ٹٹول کو اُنے کھاتیئے
کیا پُٹّا بولوں امّاں
ثمندا کتاباں بغل میں لے کر
اسکول کو جاتوں کر کو
کھیل تماشے دیکھ لے کو آتیئے
کیا پُٹّا بولوں امّاں
بچے سر کا بچہ ہے تو
بچہ بن کو رہورے کتو
مبڑے مبڑے باتاں بناتیئے
کیا پُٹّا بولوں امّاں
کھانا کھانے کو بیٹھیا تو
پاڑ پیٹ پو مٹی پڑو
اچھا اک کنڈا بھر کھاتیئے
کیا پُٹّا بولوں امّاں

جُٹ بھر کا ہے کی نَیں ہے کی
لئے سے اب اک جورو ہونا
چھوریاں کے پیچھے منڈلاتیئے
کیا پُٹّا بولوں امّاں
باوا غصّے میں آجا کو
"غُر" کرے انے "پُر" کتا
پاڑ اُجڑو کیا مُنہ کو سہاتیئے
کیا پُٹّا بولوں امّاں
میں بڈھی تنّے کو دیکھو
گوَں میں سالیاں نئیں سَر کا
میرے سر پو ٹھولے جماتیئے
کیا پُٹّا بولوں امّاں
اسکول میں چغلیاں کھا کھا کو
میرے بچے کا دشمن
وستاداں سے ماراں کھلاتے
کیا پُٹّا بولوں امّاں
کئیکو ہمارے پیچھے پڑیا رے
اللہ تیرے پیچھے پڑو !!
دودھ ابلیا چلے میں جاتیئے
کیا پُٹّا بولوں امّاں

○

منظور وقار (گلبرگہ)

شاعروں کے خطوط

ایک کرانہ مرچنٹ شاعر کا خط اپنی بیوی کے نام — !

میری نظموں کی دلہن ! میرے تصور کے صنم

میری جانِ جانم !

تم کو میرا سلام !!

تم جس دن سے میکے گئی ہو اسی دن سے میری قسمت کانچ کی طرح پھوٹ گئی. کیونکہ گاہک ہماری دوکان کا راستہ بھول گئے ہیں. اگر غلطی سے کوئی گاہک ٹپک پڑتا ہے تو وہ وقت میری غزلوں کو مکمل کرنے کا ہوتا ہے۔ تمہارے فراق میں میرا یہ حال ہوگیا ہے کہ گاہک مرچی مانگتے ہیں تو میں نمک دے دیتا ہوں. لہسن مانگتے ہیں تو ادرک دے دیتا ہوں۔ کوئی کھانے کا تیل مانگتا ہے تو میں اس کے ڈبے میں مٹی کا تیل ڈال دیتا ہوں. میری اس غائب دماغی سے گاہک ہماری دوکان سے ڈرنے لگے ہیں پہلے کبھی کبھار کوئی گاہک ہماری دوکان کے سامنے سے گزرتا تھا مگر اب وہ مجھ سے اتنا گھبرا گئے ہیں کہ وہ ادھر کا راستہ چلنا ترک کر چکے ہیں. جانتی ہو میری اس تباہی کی وجہ کیا ہے ؟ میری غائب دماغی گاہکوں کو غزلیں سنانے کی عادت اور تمہاری جدائی. میں تمہارے فراق میں غزل لکھتا ہوں. جوں جوں غزل مکمل ہوتی ہے۔ اسی رفتار سے دوکان کے حساب میں گھاٹا ہونے لگتا ہے۔ دیکھو نہ گڑ، شکر، تیل، وناسپتی ہر چیز کی قیمتوں میں میرے بڑے بھائی کے بچوں کی طرح تیزی سے اضافہ ہونے لگا ہے۔ اس جگر سوزی اور صبر آزما دور میں مجھ سے ناراض ہوکر اپنے والدین کے گھر بیٹھنا اور مجھ کو تنہا تڑپتا چھوڑنا سراسر مجھ پر ظلم ہے کیونکہ : ابھی تو ہماری شادی ہوئے صرف دو ماہ کا عرصہ ہوا۔ آخر میں تم سے یہی التجا کرتا ہوں۔

چلے بھی آؤ شبِ غم گراں گزرتی ہے

کوئی چراغ نہیں دل میں روشنی کیلئے
شوہر نوازی کا حق یوں ادا کیا ہم نے
کیا تباہ اپنی زندگی کو تمہاری ایک ہنسی کیلئے

نوٹ:۔ دوسرا شعر وزن پر پورا نہیں اُترتا۔ لیکن تم تو جانتی ہو کہ میرا ترازو ہمیشہ غلط وزن بتاتا ہے۔ ڈنڈی مارنے کی فطری عادت میری شاعری میں بھی آگئی ہے۔

فقط
تمہارا شوہر
رمضان میاں ادرک

ایک طالب علم شاعر کا خط اپنے والد کے نام

بخدمت والد محترم ..... آداب

میں بہت دنوں سے آپ کو خط نہیں لکھ سکا، رسمی معذرت چاہنے سے بہتر ہے کہ میں آپ کو اپنے کارناموں سے آگاہ کروں تاکہ میرے خط لکھنے میں جو تاخیر ہوئی آپ اس کی بنیاد جان سکیں۔

میں یہاں اپنی تعلیم برائے نام مکمل کر رہا ہوں۔ اس لئے کہ میں شاعر بن گیا ہوں۔ میرے لیکچرار بھی اب مجھ سے گھبرانے لگے ہیں۔ کیونکہ میں اس شہر میں منعقد ہونے والے تقریباً تمام مشاعروں کے میدان میں اپنی نظموں اور غزلوں کے وہ "چوکے" اور "چھکے" لگا رہا ہوں کہ اساتذہ مشاعروں میں صرف تماشائی بن کر مجھ کو رشک سے دیکھنے لگتے ہیں۔ پھر اُن میں اب اتنی صلاحیت کہاں جو مجھ جیسے "آل راؤنڈ" شاعر کو کچھ پڑھا سکیں۔ مصروفیت کا یہ عالم ہے کہ ہر تعداد شہر کے ایک نئے شاعر یا ادیب سے ملاقات کے ساتھ ہی دوستی ہو جاتی ہے۔ میری ہوم ورک کی کاپیوں کا صحیح استعمال ہو رہا ہے۔ تمام کاپیوں کے صفحات میری شاعرانہ تحریروں سے بھرے پڑے ہیں۔ آپ کی منی آرڈر کی ہوئی رقم صرف ہوٹلوں میں چائے پینے اور میری غزلوں کی تعریف کرنے والوں کو چائے پلانے میں صرف ہو رہی ہے۔ لہذا میں کھانا ایک ہوٹل میں اُدھار کھا رہا ہوں۔ جب بھی ہوٹل والا پیسے طلب کرتا ہے میں اس کو اپنی ایک تازہ غزل سنا دیتا ہوں۔ رہا میری صحت کا حال تو سوچ سوچ کر مجھے سردرد کی بیماری ہو گئی ہے۔ راتوں میں جاگ جاگ کر آنکھیں سُرخ ہونے کے بعد دو دو انچ اندر دھنس گئی ہیں۔ ناخن پاگلوں کی طرح لمبے اور بال میری آزاد نظموں کی طرح طویل ہوتے جا رہے ہیں۔ شاید آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں نے اپنی حالت ایسی کیوں بنالی..... ؟ اب میں کیا بتاؤں مجھے ایسا بنانا ہی پڑا کیونکہ میں شاعر جو بن گیا ہوں۔ اس سے زیادہ اور کیا لکھوں باقی حالت خیریت !

فقط
آپ کا قابل فخر فرزند
جاوید میاں پاگل
بی۔ اے سال اول

ایک پوسٹ مین شاعر کا خط اپنی محبوبہ کے نام

میرے قلب کے بند لفافے ! میرے ارمانوں کے پوسٹ باکس ! میری جان ..... رقیہ
تم کو میرا رجسٹرڈ سلام و پیار — !

تمہیں گلبرگہ سے حیدر آباد گئے دو ماہ کا عرصہ ہوا۔ ان

دو مہینوں میں، میں ہزاروں خطوط، لفافے اور منی آرڈر
لوگوں تک پہنچا چکا ہوں۔ جس کی وجہ سے میرے دو عدد چپل
پھٹ گئے ہیں۔ ان دو مہینوں میں، میں شہر کے ہر بڑے
مشاعرے میں بنا دعوت پہنچ کر زبردستی غزلیں سُنا چکا ہوں۔
آج کل شہر کے ادیب و شاعر اپنے رسالے پوسٹ سے منگوانا
ترک کر چکے ہیں کیونکہ میں ان کے رسالوں کو ان تک پہنچانے
سے پہلے خود دو، دو مہینوں تک چاٹ لیا کرتا تھا۔ میں کیا
کروں! جس طرح وہ زرِ سالانہ بھر کے رسالے گھر پر منگانے
پر مجبور ہیں۔ اسی طرح میں بھی ان رسالوں کو چاٹنے پر مجبور
ہوں۔ اس لئے کہ وہ بھی شاعر اور میں بھی شاعر۔ ان دو
مہینوں میں تم میرے نام خط لکھنا تو کجا دو لفظ کا ٹیلی گرام
تک روانہ نہ کر سکیں۔ جس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔ میری
جان ...... حیدرآباد سے جلد گلبرگہ آؤ تاکہ ہم دونوں
شادی کر کے پوسٹ آفس کاؤنٹر کلرک کی طرح مصروف
ہوجائیں۔ میرا مشورہ ہے کہ تم اپنے والدین کو اطلاع دئے
بنا بیرنگ خط کی طرح میرے پاس چلے آؤ تاکہ صرف ہم ہی تم
کو حاصل کر سکوں۔ اگر تم یہاں آنے کی اطلاع اپنے والدین کو
دوگی کہ میں گلبرگہ اپنے چچا کے گھر جارہی ہوں تو وہ تمہیں
گلبرگہ (By Regd. Post. A.D) کر کے بھیج دیں گے۔
جس سے تمہارے والدین کو پتہ چل جائے گا کہ تم گلبرگہ میں اپنے
چچا کے گھر نہیں بلکہ میرے گھر آئی ہو۔ پھر تمہارے والد کا دھمکی
دینے والا خط میرے نام انڈر سرٹیفکیٹ آف پوسٹنگ آئے گا۔
جس کی وجہ سے مجبوراً تمہیں تمہارے والدین کے گھر
RE-DIRECT کرنا پڑے گا۔ اس لئے کہ میں تو صرف
ایک معمولی پوسٹ کارڈ ہوں جب کہ تمہارے والد کی حیثیت
فارین لیٹر جیسی ہے۔ کہاں ایک معمولی پوسٹ کارڈ اور کہاں
فارین لیٹر ... زمین و آسمان کا فرق ہے! اس سے زیادہ
کیا لکھوں ...... تمہارا اپنا

امیر علی مایوس

...

ایک سیاست داں شاعر کا خط اپنے دوست کے نام

میرے دوست۔ میرے عزیز کامریڈ!

تم کو میرا سُرخ سلام!

ایک طویل عرصہ ہوا میں نے تمہیں کوئی خط نہیں لکھا۔
اب میں تمہیں کیا بتاؤں۔ میں کتنا معروف ہوگیا ہوں۔ یوں
بھی تم میرے کارناموں کی خبریں اخباروں میں پڑھتے ہی
ہوں گے۔ آج کل تو میرا ایک قدم جیل کے اندر تو ایک قدم
جیل کے باہر رہتا ہے۔ ویسے بھی اب ہماری پارٹی میں
زبردست زوال آگیا ہے کیوں کہ ہماری پارٹی کے تمام
انقلابی لیڈر جن کے بدن میں خون کم جوش زیادہ تھا۔ وہ
پارٹی سے استعفیٰ دے کر برسرِ اقتدار پارٹی میں شامل ہونے کے
بعد منسٹر بن کر بے فکری اور سکون کی اس معراج پر پہنچ
چکے ہیں، جہاں پر پہنچ کر آدمی گینڈے کی طرح پھیل کر
سانڈ کی طرح سُست ہو جاتا ہے۔ اس لئے پارٹی کی پوری
ذمہ داری مجھ پر آگئی ہے۔ رہی اپنی شاعری کی بات تو
میں آج کل ہر بڑے مشاعرے میں تالیوں کی گڑگڑاہٹ
کے درمیان اپنی انقلابی نظمیں سُنا سُنا کر ملک کے نیم فاقہ و
نیم مردہ بے روزگار نوجوان کو حکومت کے خلاف بغاوت
کرنے پر مجبور کر رہا ہوں۔ ایک مشاعرے میں تو سامعین
میرے انقلابی کلام سے اتنا متاثر ہو گئے کہ انہوں نے اپنی
اُردو انجمنوں کے خستہ حال دفتروں پر سُرخ جھنڈا لہرادیا۔

آج کل پولیس خفیہ گوداموں اور کالی دولت سے بھری
ہوئی تجوریوں کو تلاش کرنے سے زیادہ میری نگرانی میں
اپنا وقت برباد کر رہی ہے۔ کچھ دن پہلے پولیس نے مجھے
پکڑ کر طویل مدت کے لئے جیل میں بند کر دیا تو فوراً میں نے
موقع کو غنیمت جان کر جیل کے اندر ایک مشاعرہ منعقد کر دیا
تمام قیدی جوش میں آکر "انقلاب زندہ باد" کے نعرے
بلند کرنے لگے ان سامعین میں سے چند قیدی اس قدر
جذباتی ہوگئے کہ وہ جیل کی سلاخیں اکھاڑ کر بیس فٹ اونچی
دیوار بندر کی طرح پھلانگ کر چھلاوے کی طرح غائب ہوگئے۔
اس واقعہ کے بعد جیل کے حکام نے مجھ کو فوراً جیل سے رہا کرنے
میں ہی اپنی بہتری سمجھی۔

کامریڈ! آج کل تم کیا لکھ رہے ہو مجھے کچھ پتہ نہیں!
کاش! تم بھی میری طرح باغی شاعر ہوتے! مگر تمہارے کلام کا
موضوع تو صرف عورت کا حسن، اُس کی زلفیں، اُسکی آنکھیں، اُسکی راتیں
اس کی آہیں اور اس کی گھاتیں ہوتا ہے۔ دوست یہ دور
بزدلوں کی طرح آہیں بھرنے اور گرمچھ کی طرح آنسو بہانے کا
نہیں بلکہ یہ دور تو جھپٹ کر چھین لینے کا ہے۔ ورنہ زمانہ آگے
نکل جائے گا اور تم اپنی جھوٹی تخیل کی دنیا میں صرف اشک
ہی بہاتے رہ جاؤ گے۔ اس لئے تم بھی میری طرح انقلابی
نظمیں اور غزلیں لکھا کرو تاکہ سامعین تمہارے کلام کو سنتے
ہی آپس میں جھپٹا جھپٹی شروع کر دیں اور دولت مند
سامعین تمہارے کلام کو سنتے ہی اپنی پاکٹ اور جاکٹ
سنبھالے مشاعرے سے بھاگ جائیں۔

اس سے زیادہ کیا لکھوں۔ اگر فرصت ملی تو تمہارے
لئے اپنے قلم کو ایک بار پھر تکلیف دوں گا۔

فقط

آپ کا دوست اور مزدوروں
کا ناخدا . . . .
کامریڈ امجد ہتھوڑا

پرویز یداللہ مہدی

سردھا تیتس آدھا بیٹر

(خاکہ)

حاضرینِ باتمکین، خواتینِ نمکین اور نقادانِ سنگین اس محفلِ بوگس ترین کو یہ خاک نشین ادنیٰ ترین عدالتِ عالیہ تصور کرتے ہوئے سب سے پہلے حلف اُٹھاتا ہے کہ خدا کو حاضر و ناظر جان کر محفلِ بوگس کے بوگس نوشہ کے بارے میں جو کچھ کہے گا بوگس کہے گا، بوگس کے علاوہ کچھ نہیں کہے گا ——— آپ حیران ہو رہے ہوں گے کہ یہ کیسا نکلا ہوا گواہ ہے جو سچ کے بجائے بوگس کہنے پر اصرار کر رہا ہے بلکہ تکرار کر رہا ہے تو صاحبو! عرض ہے اس محفل کا نوشہ چونکہ بوگس ہے اس لئے آج کی محفل میں کہی اور پڑھی جانے والی ہر بات بوگس سمجھی جائے گی ہر سچ بوگس گردانا جائے گا، اس لئے میں نے خود ہی اپنے سچ پر بوگس کا لیبل لگا دیا ——!

بوگس حیدرآبادی سے بہ نفسِ نفیس ملنے سے قبل بوگس چیزوں کے بارے میں میری بوگس معلومات بوگس نوٹوں، بوگس ووٹوں، بوگس سندوں، بوگس اشتہاروں، بوگس قوالوں، بوگس حوالوں اور بوگس مثالوں تک محدود تھیں اور میں اپنی بوگس معلومات کی محدود دنیا میں مگن تھا کہ ایک دن اچانک ایک نیا بوگس انکشاف ہوا اور میری "بوگسیات" میں ایک ایسے بوگس کا اضافہ ہوگیا جو نہ سند تھا نہ مثال، نہ اشتہار، نہ نوٹ، نہ ووٹ نہ قوالہ، نہ قوالہ نہ حوالہ ——— بلکہ اچھا خاصا دو پاؤں والا تھا آپ کی اور میری طرح

—— بوگس سے میرا پہلا پہلا یکطرفہ تعارف تصویر کے ذریعہ ہوا جو زندہ دلان حیدرآباد کے کسی ابتدائی مشاعرے کے سوونیر میں چھپی تھی۔ تصویر کے ساتھ ظاہر ہے شاعر کا کلام بھی بطور نمونے کے زیور طبع سے آراستہ کیا گیا تھا۔ لیکن مجھے آراستہ کلام سے زیادہ مزاج سے بے ساختہ تخلص اور حواس باختہ تصویر میں نظر آیا۔ پھر خدا کا کرنا یوں ہوا کہ تھوڑے ہی عرصے بعد کسی مقامی انجمن کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے ملے جلے مزاحیہ مشاعرے وادبی اجلاس میں بوگس سے میرا یک طرفہ تعارف دوطرفہ کارروائی سے گزر کر دوستی میں تبدیل ہوگیا۔ اس روز بوگس کے تعلق سے ایک اور بوگس عقدہ کھلا کہ پورے شاعروں کی بھیڑ میں یہی واحد "آدھا شاعر" ہے میں نے اس وقت تک آدھا تیتر آدھا بٹیر والی کہاوت سُنی تھی لیکن اس روز پہلی بار آدھا شاعر والی عجیب وغریب مضحکہ خیز اصطلاح سنی بلکہ دیکھی —— آدھا شاعر ڈائس پر کھڑا آدھی غزل سنا کر پوری داد، وصول کر رہا تھا بلکہ "قادر الکلام" شاعروں کی موجودگی میں یہ بوگس الکلام "آدھا شاعر" پورا مشاعرہ لوٹنے کی پوری پوری کوشش کر رہا تھا —— اور میں اس آدھے شاعر کو پورے انہماک اور حیرت سے دیکھتا رہا۔ کسی قدر نکلتا ہوا قد، کسی قدر بھاری بھرکم جُثہ، رنگت ایسی کہ اگر کسی حسینہ کے گال پر "تل" کی شکل میں ہو تو خوبصورتی اور حسن میں چار چاند لگ جائیں۔ ہمارے ہاں عموماً سانولی رنگت میں نمک کی آمیزش پائی جاتی ہے لیکن بوگس مجھے پہلا شخص نظر آیا جس کی رنگت میں بھی نمک کی ہلکی سی تہہ نظر آئی۔ یہ اور بات ہے کہ یہ نمک کھانے کا نہیں بلکہ وہ نمک ہے جو اپنی مخصوص بُو کی وجہ سے طبع نازک پر گراں گزرتا ہے۔ غالباً اپنی رنگت کے پکے پن، کو کسی قدر ہلکا کرنے کے لئے بوگس نے گالوں پر داڑھی کا کور (Cover) چڑھا رکھا ہے مگر یہ داڑھی بھی اس قدر خشخشی کہ اس پہ ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے کا گمان ہوتا ہے —— اس جاٹ نما چکنے بُشرے پر آواز اس قدر پاٹ دار کہ اگر یہ شاعر کے بجائے قوال ہوتا تو کم از کم بمبئی کے مشہور قوال عبدالرحمٰن کا پنج والا کو اپنی کو پنچ یا بالفاظ دیگر ساکو بچانا مشکل ہو جاتا —— ایک عرصہ تک یہ بھید میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس اچھے خاصے آدمی نے خود کو بوگس کیوں قرار دے دیا —— چنانچہ راہ ورسم بڑھ جانے کے بعد میں نے ایک روز اس سے پوچھا۔
"تمہیں اپنے بوگس ہونے کا از خود ادراک ہوا یا تمہارے والدین نے تمہیں اپنی بوگس اولاد قرار دیا —؟"

"بات یہ نہیں ہے۔" وہ بڑے فلسفیانہ انداز میں بولا۔ "والدین نے تو مجھے اچھا خاصا نام دیا سید شاہ خواجہ نصیر الدین احمد قادری —"

"یہ تو خاصا ہٹا کٹا نام ہے۔" میں نے تعجب سے کہا۔ پھر پوچھا۔ "اتنے اچھے نام کو بوگس قرار دے دینے کی [illegible] —؟"

وہ بولا — "دراصل میرا ددھیال کٹر سیدوں کا ہے جہاں دو ایک پُشت اوپر پانی کا چراغ جلا کرتا تھا اور خالص ہونے کی لکیر کھائی جاتی تھی مگر اب پانی ملے کیروسین سے چراغ جلتا ہے اور چونا صرف پان میں کھایا جاتا ہے چنانچہ اس ڈر سے میں نے اپنے اصلی نام کو بوگس قرار دے دیا کہ کہیں میری انتڑیوں کا امتحان لینے کے لئے دعوت کے بہانے کوئی تم جیسا سید زادہ ہونے کی لکیر نہ پیش کر دے!"

میں نے برجستگی سے کہا ۔ "گویا تم چونے سے ڈرتے ہو ۔"

بولا ۔ "چونے سے نہیں میں دراصل ملاوٹ اور سیدوں سے ڈرتا ہوں۔ آج ہر چیز میں ملاوٹ کی اس قدر بھرمار ہے کہ خالص چونا اور خالص سید عنقا ہوگئے ہیں ۔ !!"

ملاوٹ کے ڈر سے بوگس نے خاندانی روایات کو خیرباد کہنے میں فرور کامیابی حاصل کرلی لیکن ملازمت کے معاملے میں اسے اپنے والد اور دادا کے نقش قدم پر چلنا پڑا یعنی محکمۂ تعلیمات میں ٹیچر کی حیثیت سے بھرتی ہونا پڑا۔ بقول بوگس کسی زمانے میں اس کے دادا ناظر تعلیمات اور والد مہتمم تعلیمات میں سپرنٹنڈنٹ ہوا کرتے تھے۔ جب مجھے پہلی بار یہ علم ہوا کہ بوگس کسی سرکاری اسکول میں ٹیچر ہے تو یقین جانیے بے حد خوشی ہوئی ایک تو اُردو کے کسی شاعر کو کام دھندے سے لگا دیکھ کر اس قدر خوشی ہوتی ہے کہ اتنی خوشی اس کا مجموعۂ کلام پڑھ کر بھی نہیں ہوتی دوسرے بوگس نے اپنے تخلص کی مناسبت سے اس قدر صحیح محکمہ کا انتخاب کیا ہے کہ جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ محکمۂ تعلیمات سے ویسے بھی برسوں سے بہت ساری بوگس چیزیں وابستہ چلی آرہی ہیں، خاص طور سے تاریخ میں ردوبدل کر کے ہر ریاست کا محکمۂ تعلیمات خاصا نام کما چکا ہے۔ اگر بوگس اسکول میں کوئی اور مضمون پڑھاتا ہے تو اسکول کے انتظامیہ کو چاہیے کہ بوگس کو تاریخ پڑھانے پر مامور کرے کہ موجودہ نصاب میں شامل "بوگس تاریخ" کو بوگس ہی پڑھاتا ہوا بھلا معلوم ہوگا ۔ کبھی کبھی بوگس اپنے تخلص کی وجہ سے عجیب و غریب پیچیدگیاں بھی پیدا کر دیتا ہے مجھے یاد ہے اُردو ہال کا وہ واقعہ کسی ادبی اجلاس کے دوران جب مغرب کی نماز کا وقت ہوگیا تو اجلاس کی کارروائی تھوڑے وقفے کے لئے روک دی گئی۔ چند لمحوں بعد ایک جانی پہچانی پاٹ دار آواز میں اذان بلند ہوئی۔ میری بغل میں بیٹھے ہوئے بڑے میاں نے اپنا بیگ کرسی پر رکھتے ہوئے مجھ سے کہا۔
"ذرا میرے بیگ کا خیال رکھئے، میں ابھی نماز پڑھ کر آتا ہوں ۔"

میں نے بڑے میاں کی بات سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے دوست سے پوچھا ۔ "یہ اذان کون دے رہا ہے ۔ ؟" جواب میں وہ بولا ۔ "لگتا ہے بوگس اذان دے رہا ہے ۔ !" اتنا سننا تھا کہ وہ بڑے میاں دوبارہ اپنی نشست پر بیٹھ گئے اور بڑبڑانے لگے ۔" اب لوگ اذان بھی بوگس دینے لگے پھر نماز کیا خاک صحیح ہوگی ۔"

اپنے تخلص کے سہارے اس قسم کے شوشے چھوڑنے والا بوگس بنیادی طور پر اس قدر امن پسند شہری ہے کہ شہر کے نارمل معمولات میں ذرا سا بھی تغیر دیکھ کر گھبرا جاتا ہے۔ بیٹھا ہو تو کھڑا ہو جاتا ہے، کھڑا ہوا ہو تو دوڑنے لگتا ہے۔ کسی ہوٹل یا دکان کا شٹر، معمول سے ذرا زیادہ آواز کے ساتھ گرے تو بوگس کے ذہن میں فوراً یہ خیال بجلی کی طرح کوند جاتا ہے کہ شہر کے کسی نہ کسی حصے میں ضرور فسادات کی آگ بھڑک اٹھی ہے۔ کہیں نہ کہیں یقیناً بلوا ہوگیا ہے۔ بوگس کی یہ خطرناک سوچ حالیہ عرصے میں شہر میں پھوٹ پڑنے والے فسادات کی دین ہے۔ بوگس اکثر یہ سوچتا ہے حیدرآباد جو ہمیشہ سے صلح و امن کا گہوارہ رہا ہے اس کے ماتھے پر کلنک والے فرقہ وارانہ فسادات کا یہ بدنما داغ کاش

اس کے تخلص کی طرح بوگس ہوتے ۔۔۔ ! تین چار برس پیشتر اس نے ایک فساد اپنی ذات پر بھی جھیلا ہے۔ کسی فسادی کے چھرے نے فسادات کی تلخ نشانیاں اس کے جسم پر بھی چھوڑی ہیں۔ اس حادثے کی خبر سن کر جب میں اس کی عیادت کو گیا تو اُسے پٹیوں میں بندھا پایا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا اور باوجود تکلیف کے ساری روداد اپنے مخصوص بوگس انداز میں سنائی۔ تفصیلات سُن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے تھرائے ہوئے لہجے میں کہا ۔ "تمہارا اس طرح موت کے منھ سے واپس آنا کسی معجزے سے کم نہیں"

وہ بولا ۔ "بس یوں سمجھو، اللہ کی مہربانی، تم جیسے دوستوں کی دعاؤں اور اپنی شاعری کی وجہ سے بچ گیا ۔!"
میں نے حیرت سے کہا ۔ "اللہ کی مہربانی، اور دوستوں کی دعائیں تو سمجھا مگر یہ شاعری کی بات سمجھ میں نہیں آئی"۔
بولا ۔ "یہ بات اگرچہ کہ خود میری سمجھ میں آج تک نہیں آئی لیکن اتنا یقین ضرور ہو گیا کہ کہنے والوں نے شاعری کو جزویست پیغمبری بالکل ٹھیک کہا ہے۔ جب فسادی کا چھرا پہلے ہی وار میں میرا کام تمام کرنے میں ناکام رہا تو اس نے دوسرا بھرپور وار کرنے کے لئے ہاتھ تولا ہی تھا کہ میں بولا ۔۔۔ بھائی جان پہلا وار تو تم غفلت میں کر گئے لیکن اگلا وار کرنے سے پہلے کان کھول کر سُن لو مجھے بوگس حیدرآبادی کہتے ہیں اور میں اُردو کا آدھا شاعر ہوں، آدھی غزلیں سنا سنا کر تمہیں پوری طرح مار ڈالوں گا ۔۔۔ اتنا سننا تھا کہ فسادی چھرا پھینک کر اس طرح بھاگ نکلا جیسے موت اس کے پیچھے لگ گئی ہو ۔۔۔ !"

اس سنگین واقعے کو لطیفے سے زیادہ اہمیت نہ دے کر بوگس نے اپنی انسانیت دوستی کا پرچم بلند کیا۔ اس کی صلح کل طبیعت کبھی یہ برداشت نہیں کرتی کہ دو دوستوں، دو جماعتوں، دو فرقوں کے بیچ اختلافات کی دیواریں کھڑی ہوں، فتنے سر اُٹھائیں، چنانچہ یہ اکثر ایسے نازک موقعوں پر ثالث کی حیثیت سے اپنی خدمات بلا معاوضہ پیش کر دیتا ہے۔ بلکہ اب تو صلح کل ثالثی کی پالیسی کا یہ اس قدر عادی ہو گیا ہے کہ جب بہت دنوں تک دوستوں کے بیچ تنازعات اور اختلافات کی لہر اُٹھتی دکھائی نہیں دیتی، یہ بے چین ہو جاتا ہے، اسے اپنی ثالثی کی پالیسی زنگ آلود ہوتی ہوئی محسوس ہونے لگتی ہے، چنانچہ اپنی پالیسی کی دھار کو آب دار رکھنے کے لئے یہ خود اپنی طرف سے دوستوں کے بیچ اختلافات کے بیج بوتا ہے۔ بوگس کی اس پالیسی سے وہ لوگ خوب واقف ہیں جو اسے قریب سے جانتے ہیں البتہ دور سے جاننے والوں کے لئے یہ صرف بوگس شاعر ہے آدھی غزل کا موجد ۔۔۔ بقول بوگس مزاحیہ شاعری میں آدھی غزل کا یہ کارنر (Corner) اس کی اپنی دریافت ہے۔ ہندوپاک میں آدھی غزل کا یہی اکیلا پیدل بھی ہے اور سوار بھی۔ بوگس کے اس مخصوص کارنر کو میں "پنالٹی کارنر" کا نام دیتا ہوں جہاں سے ہٹ لگا کر یہ اب تک بے شمار کل ہند مشاعروں میں گول کر چکا ہے۔
البتہ آدھی غزل، آدھے ترنم والے اس آدھے شاعر کی دیگر شعبہ ہائے زندگی میں کیا حیثیت ہے، اس پر مسز بوگس، اولاد بوگس اور شاگردان بوگس ہی روشنی ڈال سکتے ہیں ۔۔۔ !
کہتے ہیں بگڑا ہوا شاعر مرثیہ گو ہوتا ہے لیکن جس شاعر کے بگڑنے میں ایک آنچ کی کسر رہ جاتی ہے وہ مقررنگار

بن جاتا ہے اور بوگس اس کی تازہ ترین بوگس مثال ہے۔

جب مجھے پہلی بار یہ علم ہوا کہ بوگس نے یم۔ اے کے ڈسرٹیشن (Dessertation) کے لئے فکر تونسوی کا انتخاب کیا ہے تو میں اس کی چال سمجھ گیا، زندہ ادیب کا انتخاب اس نے محض اس لئے کیا کہ اسے کچھ بھی نہیں کرنا پڑے گا اور فکر تونسوی خود مقالہ تیار کرکے روانہ کردیں گے بلکہ میں نے تو یہاں تک سوچا کہ بوگس سے یہ بھی بعید نہیں کہ جس وقت یونیورسٹی بورڈ اس سے مقالہ طلب کرے گا تو یہ بجائے مقالے کے فکر تونسوی کو بہ نفس نفیس پیش کردے گا ——— لیکن افسوس اس معاملے میں بوگس نرا بوگس ثابت ہوا بلکہ اُلٹا خود کو سعادت مند طالب علم ثابت کرنے کے لئے بڑی دوڑ دھوپ اور عرق ریزی کے بعد فکر تونسوی کی شخصیت اور طنز نگاری پر ایک ایسا مبسوط مقالہ تیار کرکے پیش کردیا جو کسی طرح پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیول (level) سے کم نہیں۔ جسے پڑھ کر سُنا ہے خود فکر تونسوی نے بے ساختہ کہا — "پیارے بوگس! تمہارے اس تھیسس (Thesis) کے طفیل، فکر تونسوی کی زندگی میں پہلی بار خود فکر تونسوی سے تفصیلی ملاقات ہوگئی ——— یار فکر تونسوی تو بڑا کام کا آدمی نکلا اور اسے کام کا آدمی ثابت کیا بھی تو بوگس آدمی نے ——— فکر تونسوی پر تھیسس لکھ کر تم نے فکر سے زیادہ اپنی فکر کو معتبر ثابت کردیا ———"

بوگس نے اپنی اس اولین نثری کتاب کے آخر میں یہ خوش خبری تحریر کی ہے کہ جب اس کتاب کا مکمل ایڈیشن بک جائے گا تب وہ اپنا مزاحیہ مجموعۂ کلام "واہ" شائع کرکے ہم سے "واہ واہ" وصول کرے گا ——— اور میں بوگس سے کہتا ہوں، داد وصول کرنے کے لیے اتنے لمبے انتظار کی قطعی ضرورت نہیں، مجھے پورا یقین ہے کہ اس کی یہ پہلی نثری کاوش جس کسی سلجھے ہوئے قاری کی نظر سے گزرے گی یوں اس کی زبان سے بے ساختہ داد نکل جائے گی —

"واہ واہ بوگس، تم شاعر ضرور آدھے ہو لیکن نثر نگار پورے ہو — !!!"

——

نوٹ :- یہ خاکہ بوگس کی اولین تصنیف "فکر تونسوی — شخصیت اور طنز نگاری" کی رسم اجراء کے موقع پر پڑھا گیا ———

پانی کا، سوئی گیس کا، بجلی کا، فون کا
بل اتنے مل گئے ہیں کہ میں بلبلا اُٹھا — انور مسعود
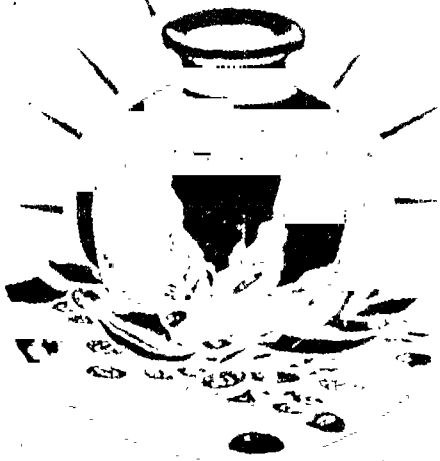
گھڑا پاپ کا پھوٹے گا
کالا دھندہ چھوٹے گا

- جیسے گھن لگ جانے سے کوئی ہرا بھرا پیڑ سوکھ کر ٹھونٹھ ہو جاتا ہے۔ ویسے ہی کالا دھن کسی ملک کی معیشت کو کھوکھلا کر ڈالتا ہے۔
- کالا دھن مہنگائی کی آگ میں تیل ڈالتا ہے۔ اس کی روک تھام میں ہی آپ کی بھلائی ہے۔
- کالے دھن سے نپٹنے کے لئے اشیائے ضروریہ کے قانون، چور بازاری کو روکنے اور اشیاء ضروریہ کی بہم رسانی کے قانون کو سختی سے لاگو کیا جا رہا ہے۔

اس سے سماج اور معیشت کو راحت ملے گی۔

نیا 20 نکاتی پروگرام

تفصیلی معلومات کے لئے اس کوپن کا استعمال کریں

ڈپٹی ڈائریکٹر، ماس میلنگ یونٹ
ڈائریکٹوریٹ آف ایڈورٹائزنگ اینڈ وژول پبلسٹی
بی۔ بلاک، کستوربا گاندھی مارگ، نئی دہلی 110001
نئے 20 نکاتی پروگرام سے متعلق معلوماتی کتابچہ اردو/ہندی/انگریزی میں بھیجیں۔

نام ____________

پتہ ____________

____________ پن کوڈ ____________

برق آشیانوی

چیف منسٹری اور ساس بہو

نمازِ فجر کے ذکر و تلاوتِ قرآن مجید سے فارغ ہو کر ہم حسبِ معمول لیٹے ہی تھے کہ آنکھ لگ گئی۔ ابھی ناک یا
حلق کھول کر ایک خراٹا بھی نہ لینے پائے تھے۔ (ہم نے ناک اور حلق دونوں کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ علم طب کی رو
سے یہ فیصلہ نہیں ہو سکا ہے کہ خراٹا ناک سے لیا جاتا ہے یا حلق سے۔ چنانچہ اس نزاعی مسئلہ کا تصفیہ ہم نے دو
الفاظ کے استعمال سے کر دیا ہے) کہ کچھ تیز تیز آوازوں نے ہمیں بیدار کر دیا۔ یہ تیز تیز آوازیں
ساس اور بہو کی تھیں۔ ہماری بہو اپنی ساس سے لڑ رہی تھی۔ ساس اور بہو کی لڑائی ہمارے سماج کا ایک "اٹوٹ" حصہ
ہے۔ ویسے مغربی ممالک میں ساس اور داماد کی لڑائی فیشن میں داخل ہے۔ یہ بات آج تک ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ ساس
اور بہو میں لڑائی کیوں ہوتی ہے۔ جب کہ بابا آدم اور اماں حوّا کے زمانہ میں ساس اور بہو کا ذکر اس لئے نہیں ملتا کہ
اماں حوّا نہ کسی کی بہو تھیں اور نہ کسی کی ساس۔ اور نہ ہی کوئی جھگڑا ہوا تھا۔ البتہ بھائی بھائی کا جھگڑا روزِ ازل سے شروع
ہو گیا تھا جب کہ دو بھائیوں یعنی ہابیل اور قابیل میں لڑائی ہوئی تھی چنانچہ ورا ثتاً یہ جھگڑا آج تک بھی بھائیوں میں
چلا آرہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک میں ہندو مسلم آپس میں لڑتے رہتے ہیں کیوں کہ ہندو مسلم آپس میں بھائی
ہیں۔ اتنی سی بات لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی اور "موقع پرست" لوگ اس جھگڑے کو "فرقہ وارانہ فسادات" کا نام دیتے
حالانکہ ہمارے "نیتاؤں" نے بیرونی ممالک میں ہمیشہ ہی یہ بیان دے کر بات کو ختم کر دیا ہے کہ فسادات ہمارے ملک کا
"گھریلو معاملہ" ہے۔ چنانچہ لوگ مطمئن ہو گئے کہ یہ بھائی بھائی کا جھگڑا ہے۔ کیوں کہ وہ بھائی ہی کیا ہوئے جو آپس میں
ذرا ذرا سی بات پر نہ لڑ پڑیں۔

غرض ساس اور بہو میں لڑائی ہو رہی تھی۔ مسئلہ نہایت "سنگین" تھا۔ یعنی ایک سماجی مسئلہ ایک سیاسی مسئلے سے
الجھ کر لڑائی کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ بہو کا کہنا تھا کہ ساس نے ٹھیک ایک سال قبل بہو کو پانچ ساڑیاں دلائی تھیں
سال بھر کے استعمال کے لئے تھیں۔ بہو نے اُس کو قبول کر لیا تھا۔ یہ سلسلہ بہو کی شادی کے زمانے سے چلا آرہا تھا
اور اب تک کوئی نزاعی بحث نہیں پیدا ہوئی تھی۔ لیکن آج بہو نے اچانک مطالبہ پیش کر دیا تھا کہ اُسے سال آئندہ

کے لئے پچیس ساڑیاں دلائی جائیں ساس اپنی بہو کے اس مطالبہ کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھی کیوں کہ اس سے گھر کی "فینانس" پر زبردست بوجھ عاید ہونے کا امکان تھا۔ بہو کا استدلال یہ تھا کہ ایک چیف منسٹر پانچ سال کی میعاد کے لئے منتخب کیا جاتا ہے۔ لیکن اس میعاد میں اب تک چار چیف منسٹر ہو چکے ہیں اور میعاد کے اختتام تک قوی اُمید ہے کہ پانچواں چیف منسٹر تخت چیف منسٹری پر جلوہ افروز ہو جائے۔ جب ایک مقررہ میعاد کے لئے ایک چیف منسٹر کے بجائے پانچ چیف منسٹر ہو سکتے ہیں تو ساڑیوں کی ایک سال کی میعاد مقررہ میں پانچ ساڑیوں کے بجائے پچیس ساڑیوں کا مطالبہ کس طرح ناقابل قبول ہو سکتا ہے۔ ساس بے چاری سیاست سے اس قدر ناواقف ہے کہ اس کے خیال میں سیاست کے معنی اخبار "سیاست" کے علاوہ اور کچھ نہیں ہیں۔ اور ساس کو اخبار سیاست سے بیر ہے کیوں کہ بہو گھر کا کام کاج چھوڑ کر اخبار "سیاست" لے کر پڑھنے بیٹھ جاتی ہے۔ حالانکہ ساس نے بہو کے لئے خاص طور پر "بہشتی زیور" اور "تحریری دستر خوان"، منگوا کر پڑھنے کے لئے دیا ہے کیوں کہ لیکن باوجود تاکید کرنے کے بہو ایک وقت کی نماز بھی نہیں پڑھتی اور پکوان سے اتنی ناواقف ہے کہ سالن میں نمک کی مقدار ساس سے پوچھ کر ڈالنے کے باوجود اتنی زیادہ ہو جاتی ہے کہ ساس تو ساس خود بہو بھی اپنے ہاتھ کا پکایا ہوا سالن نہیں کھا سکتی اور چاول میں پانی اتنا کم ڈالتی ہے کہ چاول پوری طرح نہیں گلنے پاتے اور کچے رہ جاتے ہیں اور روٹی پکانا بہو جانتی ہی نہیں۔ نتیجتہً ہوٹل سے سالن منگوا لیا جاتا ہے۔ بہر حال ساڑیوں کا سماجی مسئلہ چیف منسٹری کے سیاسی مسئلہ سے الجھ کر بہت پیچیدہ ہو گیا تھا۔ بہو کا یہ استدلال ساس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ کہ "جب پانچ سال کی ایک میعاد میں ایک کے بجائے پانچ چیف منسٹر بن سکتے ہیں تو ساڑیوں کی ایک سالہ میعاد میں پانچ کی بجائے پچیس ساڑیاں کیوں نہیں دلائی جا سکتیں" آخر بہو نے ریاضی کی مدد سے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے ثابت کیا۔ کہ ایک چیف منسٹر کو پانچ سے ضرب دیا جائے تو پانچ چیف منسٹر ہوتے ہیں۔ چنانچہ پانچ ساڑیوں کو پانچ سے ضرب دیا جائے تو حاصل ضرب پچیس ساڑیاں ہوتی ہیں۔ بے چاری ساس کو یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ ضرب کیا بلا ہوتی ہے۔ اس لئے کہ پچاس سال پہلے ساس پانچویں جماعت میں اس وجہ سے فیل ہو گئی تھی کہ ریاضی میں اس نے ستر میں سے صرف دس نمبر لئے تھے۔ کیوں کہ تمام سوالات ضرب اور تقسیم سے متعلق تھے۔ صرف دو سوال وہ حل کر سکی تھی جو جمع اور تفریق کے تھے جس کے دس نمبر مل گئے تھے۔ چنانچہ آج تک صرف جمع اور تفریق ہی یاد رہ گیا ہے۔ اور بیٹا جب آدھی تنخواہ کو پوری تنخواہ کہہ کر ماں کے ہاتھ میں رکھ دیتا ہے تو اس کو سابقہ سلک میں جمع کر کے حاصل جمع معلوم کر لیتی ہے۔ اور جملہ رقم کو اپنے قلمدان میں مقفل کر کے چابی اپنے پاندان کے "چور خانے" میں رکھ لیتی ہے۔ "چور خانہ" ایک قدیم اصطلاح ہے جس کے معنی "خفیہ خانہ" ہو سکتے ہیں۔ اس کا علم کسی اور کو نہیں ہوتا۔ پھر بہو کو روزانہ گوشت ترکاری کے لئے دس روپے دیتی ہے اور حساب لیتے وقت آٹھ روپے اُنچاس پیسے خرچ ہونے کے بعد ایک روپیہ اکاون پیسے پورے گن کر لیتی ہے۔ پس تحقیق ثابت ہوا کہ ساس اب بھی تفریق کا یہ سوال حل کر سکتی ہے کہ دس روپے میں سے آٹھ روپے انچاس پیسے تفریق کئے جائیں تو حاصل تفریق ایک روپیہ اکاون پیسے برآمد ہوتے ہیں چنانچہ ساس کہہ رہی ہے کہ پرسوں یعنی صرف دو سال کی بات ہے کہ جب تمہارے خسر اپنے نواسے کو ریاضی پڑھا رہے تھے تو یہ سمجھا رہے تھے دو جمع دو چار ہوتے ہیں اور دو ضرب دو بھی صرف چار ہی ہوتے ہیں اس کے علاوہ یہ بھی سمجھا رہے تھے کہ ایک کو پانچ مرتبہ لکھ کر جمع کیا جائے تو پانچ ہوتے ہیں اور ایک کو پانچ سے ضرب دیا جائے تو بھی پانچ ہوتے ہیں اس لحاظ سے پانچ جمع پانچ دس ہوتے ہیں تو پانچ ضرب پانچ بھی دس ہونا چاہیئے۔ پچیس نہیں ہو سکتے۔ اس حساب سے زیادہ سے زیادہ پانچ کی بجائے دس ساڑیاں دلائی جا سکتی ہیں

غرض ساس کو جمع تفریق کے علاوہ ریاضی کا کوئی اور ضابطہ یاد نہیں رہا۔ اس لئے اب بہو جو ضرب کے ضابطہ کی مدد سے مطالبہ کر رہی ہے کہ آئندہ ایک سال کی میقات کے لئے پچیس ساڑیاں دلائی جائیں تو ساس کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے اور اسی مسئلے پر ساس اور بہو میں جھگڑا ہو رہا ہے۔ ہم اس جھگڑے کو پوری دلچسپی بلکہ شوق سے سن رہے ہیں۔ اور اس کو طول دینے کی غرض سے ہم نے اپنی "چپل" اوندھی ماردی ہے کیوں کہ ایک پرانا نظریہ ہے کہ جب دو آدمی لڑتے ہوں اور اس لڑائی کو طول دینا مقصود ہو تو "جوتی" اوندھی ماردی جاتی ہے۔ چنانچہ بقول محمد اسماعیل میرٹھی ؎

جب کہ دو موذیوں میں ہو کھٹ پٹ
اپنے بچنے کی فکر کر جھٹ پٹ

ہم نے دو موذیوں سے بچنے کی فکر میں چپل اوندھی ماردی ہے اور اس پرانے قول میں صداقت پاکر خوش ہو رہے ہیں۔ کیوں کہ چپل اوندھی مارنے کے بعد جھگڑا اور بگڑ گیا ہے۔ چنانچہ بہو نے اپنی پرانی پانچ ساڑیاں لاکر ساس کے سامنے رکھ دی ہیں اور ساس نے بہو کی الماری میں سے پچیس نئی ساڑیاں نکال لی ہیں جو بہو کو ساس کے بیٹے نے اپنی ماں سے چھپاکر لادی تھیں۔ بیٹا یہ دیکھ کر "غپ چپ" باہر نکل گیا ہے اور بہو چراغ پا ہوگئی ہے۔ اور کہہ رہی ہے کہ آپ کو میری الماری میں ہاتھ ڈالنے کا کیا حق ہے۔ ساس نے غصہ میں آکر کہا "اگر تم زیادہ بے ادبی کروگی تو میں تم کو گھر سے نکال دوں گی" بہو طیش میں آکر کہہ رہی ہے کہ ۔ "دیکھئے اگر آپ میرے ساتھ اندرا گاندھی کی طرح سلوک کریں گی تو میں بھی منیکا گاندھی کی طرح پیش آؤں گی"۔ ساس نے جواب دیا۔ "لے لو ۔ جوانی میں ہم نے "مہاتما گاندھی" کا ایک نام سنا تھا۔ یہ دو گاندھی اور کہاں سے پیدا ہوگئے"۔ ساس کے اس جواب پر بہو کو ہنسی آگئی ہے اور وہ بے ساختہ ہنسنے لگی ہے ساس نے سمجھا کہ اس کی باتوں کا بہو مذاق اڑا رہی ہے۔

ہم آنکھیں بند کئے بستر پر لیٹے ہوئے سونے کی ایکٹنگ کر رہے ہیں اور جھگڑے کا مزہ لے رہے ہیں۔ اور دعا کر رہے ہیں کہ جھگڑے کا رخ ہماری طرف نہ پلٹ جائے۔ کیوں کہ ہم نے اپنی بہو کی ساس کو سال میں پانچ ساڑیوں سے زیادہ نہیں لاکر دی تھیں۔ اب اگر وہ سوال کر بیٹھے کہ ہم اپنی چالیس سالہ ازدواجی زندگی میں ہر سال صرف پانچ ساڑیاں کیوں لاکر دیا کئے اور اگر وہ کاغذ پر چالیس مرتبہ پانچ کا ہندسہ لکھ کر جمع کرنے کے بعد حاصل جمع (۲۰۰) برآمد کر کے دو سو ساڑیوں کا مطالبہ کریں گی تو ہم کیا جواب دیں گے وہ چالیس کو پانچ سے ضرب دینا نہیں جانتیں البتہ پانچ کا ہندسہ چالیس مرتبہ لکھ کر حاصل جمع نکالنا جانتی ہیں۔ یہ بات تو ہم نے پہلے ہی بتلادی ہے کہ وہ جمع تفریق ہی جانتی ہیں، ضرب تقسیم سے وہ ناواقف ہیں۔ جہاں تک ان کی عمر کا تعلق ہے اس کو ہمیشہ تفریق کے ضابطہ سے حل کر کے بتاتی ہیں اور اس معاملہ میں جمع کی سخت مخالف ہیں۔ چنانچہ آج کوئی اُن کی عمر پوچھے تو اصلی عمر میں سے پچیس سال تفریق کر کے حاصل تفریق اس قدر صحیح بتادیتی ہیں کہ اگر سوال کے دس نمبر ہوں تو پورے دس نمبر مل جائیں۔

غرض ایک میقات میں چار چیف منسٹروں کا تختہ چیف منسٹری پر چڑھایا جانا اور ختم میقات کے پانچویں چیف منسٹر کے برسر اقتدار آجانے کا امکان ہمارے گھر میں ایک جھگڑے کا سبب بن گیا ہے۔ جس کا کوئی صحیح حل تلاش کرنے کیلئے ہم دلائل میں چراغ لے کر پھر رہے ہیں۔ دعا فرمائیے کہ اس مسئلہ کا "حل" کہیں نہ کہیں مل جائے۔

طالب عرفانی
سرونج (ایم۔پی)

تضمین

دائمی قبض کم ذرا نہ ہوا — کارگر کوئی انیما نہ ہوا
ایک اِسہال بھی کھلا نہ ہوا — "دردِ منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا"

لنگڑے لُولوں کو اور غریبوں کو — شہر کے سارے بدنصیبوں کو
شاعروں کو بھی ادیبوں کو — "جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا"

دھڑ بچائیں کہ اپنے سر کو بچائیں — لائیں تو کیسے تجھ کو گانٹھ کے لائیں
کس کے گھر جاکے اپنا قیمہ کرائیں — "ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا"

ایک بھی شئے نہیں ٹھکانے کی — اُف نحوست غریب خانے کی
وصل کی شب ہے چھت پہ جانے کی — "ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا"

گھر میں لے دے کے اک لگائی تھی — وہ بھی اپنی نہیں پرائی تھی
عمر بھر کی یہی کمائی تھی — "کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا"

آگے بڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں — سر پہ چڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں
پڑھئے پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں — "کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزل سرا نہ ہوا"

٭ ٭ ٭

شفیع منیری
بھوجپور۔ (بہار)

غزل

مفلسی میں آٹا گیلا ہو کے اکثر رہ گیا
دیکھنے بیگم گئیں پکچر تو میں گھر رہ گیا

دونوں بیٹے بھی مرے فرما رہے ہیں شاعری
اور میں بن کر فقط مظلوم شوہر رہ گیا

اُس کے سر کالی بلا تھی اور مجھ کو شوقِ علم
اس لئے یارو سسر کے گھر میں نوکر رہ گیا

اہلِ دولت نے کیا دیدار اس کا اے شفیع
میں سگِ لیلیٰ کے آگے گڑگڑا کر رہ گیا

٭ ٭ ٭

تبصرہ

از :- محمد منظور احمد

رضیہ سلطانہ

(تصویری خاکے)

مطبوعہ : امر چتر لیکھا

قیمت : ۳ روپیہ

اس تصویری خاکے میں رضیہ سلطانہ کی زندگی کے ہم خدوخال کو دلکش اور خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یوں بھی بچوں کے لئے رنگین تصویریں دلچسپی کا باعث ہوتی ہیں۔ اُردو میں ایسے تصویری خاکے کچھ عرصہ قبل ب عنقا تھے۔ جناب خواجہ عبدالغفور قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اُردو پڑھنے والے بچوں کے لئے تصویری خاکوں کا ایک دلچسپ سلسلہ امر چتر کتھا ادارے کے ذریعہ شروع کروایا ہے۔ چنانچہ گذشتہ سال "اکبر" پر ایک تصویری خاکہ شائع ہوچکا ہے۔ جسے اُردو حلقوں ں قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ رضیہ سلطانہ بھی ایک ایسا تصویری خاکہ ہے جس میں رضیہ سلطانہ سے متعلق ہے اور حقیقی تاریخی واقعات کو کہانی کے پیرایہ اور تصویروں کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کی زبان ر اسلوبِ بیان سادہ اور دل پذیر ہے۔

امید ہے کہ اہم تاریخی شخصیتوں کے خدوخال پر مبنی تصویری خاکوں کی اشاعت کا یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا، جو نئی نسل میں ہماری زبان کی ترویج و اشاعت میں ممد و معاون ہوگا۔

٭　٭　٭

ہمالیہ کے دامن میں

مصنف : ابوالفہم وحید علی خاں

"ہمالیہ کے دامن میں" ابوالفہم وحید علی خاں کی ہندی تصنیف "بھارت کی گود میں" کا آزاد ترجمہ ہے۔ جسے کوثر ایجنسی چھتہ بازار حیدرآباد نے اُردو اکیڈیمی آندھرا پردیش کی رقمی اعانت سے شائع کیا ہے۔ مضامین کا یہ مجموعہ بچوں کے معلوماتی ادب میں اضافہ کی ایک احسن کوشش ہے۔

یہ مضامین رپورتاژ کی صورت میں پیش کئے گئے ہیں۔ ان میں ہندوستان کی بعض مشہور تاریخی عمارتوں کے بارے میں معلومات اور تاثرات قلمبند کئے گئے ہیں۔ دنیا کے سات عجائبات میں شامل "تاج محل" اور اجنتہ و ایلورہ کے غاروں پر بھی دلچسپ مضامین ہیں۔ قلعہ اکبرآباد، قطب مینار قلعہ گولکنڈہ اور مندر ہزار کھم ورنگل بھی اس مجموعہ میں شریک ہیں۔ سیاسی آزادی کے حصول کے بعد نئے ہندوستان کی تعمیر و ترقی اور خوشحالی کے لئے جو تعمیری منصوبے پایۂ تکمیل کو پہونچے اُن میں بھاکرہ ننگل ڈیم اور ناگر جنا ساگر قابلِ ذکر ہیں۔ مصنف نے اہمیت کے پیش نظر، ان پر بھی آسان اور قابلِ فہم زبان میں مفید مواد پیش کیا ہے۔

اس کتاب کی قیمت چھ روپے پچاس پیسے رکھی گئی ہے جو کتاب کی ضخامت، کتابت اور طباعت کے لحاظ سے مناسب ہے۔

٭٭

بھوپال میں "یادِ ملا رموزی تقاریب" کا انعقاد

مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی کے زیر اہتمام ۹ر اور ۱۰ر اکتوبر کو ٹیگور بھون بھوپال میں "یادِ ملا رموزی" تقاریب کا کل ہند پیمانہ پر انعقاد عمل میں آیا۔ ۹ر اکتوبر کو جناب اختر سعید خاں کی صدارت میں "ملا رموزی فن اور شخصیت" کے زیر عنوان ایک سمینار منعقد ہوا۔ سمینار کی نظامت کے فرائض جناب فضل تابش سکریٹری مدھیہ پردیش اردو اکیڈیمی نے انجام دیئے اور تالیوں کی گونج میں اعلان کیا کہ ملا رموزی کی غیر مطبوعہ تخلیقات کی اکیڈمی کی جانب سے اشاعت کا انتظام کیا جائے گا۔ ڈاکٹر عزیز انصاری نے اپنے مقالہ میں "گلابی اردو" کے موجد ملا رموزی کی شخصیت اور زندگی کے حالات بیان کیئے۔ پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے ملا رموزی کی نایاب تصانیف اور غیر مطبوعہ کلام کی اشاعت پر زور دیا۔

پروفیسر آفاق احمد نے اپنے مضمون میں کہا کہ جس طرح دلی لکھنو اور حیدرآباد نثر و نظم کے مستند اسکول رہے ہیں، ہم بھی فخر کر سکتے ہیں کہ بھوپال کا اسکول ملا رموزی کی گلابی اردو تھی۔ صدر محفل جناب اختر سعید خاں نے کہا کہ طربناک و فرحت بخش فضا پیدا کر دینا خود ایک بڑا کارنامہ ہے اور جن تحریروں میں ملا صاحب نے مزاح کا پیرایہ اختیار کیا وہ ہمیشہ زندہ رہیں گی ــــ ۱۰ر اکتوبر کو رات میں شب غزل پروگرام میں نیتا مہتا اور راجندر مہتا نے غزلیں سنائیں۔ تقاریب کے دوسرے دن ٹیگور ہال میں محفل طنز و مزاح، برپا ہوئی۔ جس کی صدارت کشمیری شاعر غلام نبی خیال نے کی۔ مہمان طنز و مزاح نگاروں فکر تونسوی یوسف ناظم، مسیح انجم، پرویز یداللہ مہدی کے علاوہ مقامی قلم کاروں جہاں قدر چغتائی، فضل جاوید اور مصطفیٰ تاج نے مضامین سنائے۔ شہر کے سینکڑوں باذوق سامعین نے بڑی تعداد میں شرکت کر کے خاک بھوپال کے عظیم فرزند ادب نقاد اور طنز و مزاح نگار ملا رموزی کو پر خلوص نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔ مکمل دو گھنٹے تک سامعین کو طنز و مزاح کے طلسم میں گرفتار رکھنے والی اس محفل کا آغاز مقامی "طنز و مزاح" نگار جناب مصطفیٰ تاج کے مضمون "پوسٹر" سے ہوا جس میں انہوں نے پوسٹر پر پوسٹر چسپاں کرنے والوں کی ستم ظریفی اور اس سے نمایاں ہونے والے مضحکہ خیز پہلوؤں کی اپنے مخصوص رنگ و طرز میں نشاندہی کرتے ہوئے بار بار سامعین کو قہقہہ لگانے پر مجبور کر دیا۔ اس میں مقامی رنگ کی چاشنی ہونے کی وجہ سے مضمون کو کافی سراہا گیا۔

جناب فضل جاوید کے مضمون کا عنوان تھا "ہمارے بس کی بات نہیں مہمان نوازی" جس میں موصوف نے ایک [illegible]
دع پر نئے نئے زاویوں سے روشنی ڈالی اور مہمانوں کی متعدد اقسام اور ان کی ستم ظریفانہ فرمائشوں کو اس طرح
نقاب کیا کہ سامعین بار بار زیر لب مسکرانے پر مجبور ہو گئے
بھوپال کے کہنہ مشق مزاح نگار جناب جہاں قدر چغتائی کا انشائیہ "العذاب السیل" ان کی مخصوص و پُر مزاح تحریر
یئیہ دار تھا! جس میں انہوں نے تربوز کی خرید اور اس کو گھر تک پہنچانے کی منظر کشی کرتے ہوئے محفل کو بار بار
زعفران زار بنا دیا۔

مزاحیہ ادب کے کئی مجموعوں کے خالق حیدرآبادی نژاد اور بمبئی سے تشریف لائے جناب پرویز یداللہ مہدی نے
مضمون میں "پارٹی" کو تختۂ مشق بنایا۔ اور اس اعلان کے ساتھ اس کو شروع کیا کہ اس پارٹی کے تمام کردار و مقامات
ہیں جن کو اگر کسی نے غلط ثابت کیا تو اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔
موصوف نے بمبئی کے اعلیٰ طبقے کی ایک پارٹی کی عکاسی کرتے ہوئے اس کے شرکاء کے لباس، عمر، کھانے،
ئف، تقریر، موسیقی، زبان، اور لمحہ بہ لمحہ بدلتے ماحول کی ایک ایک جھلک میں اس بے ساختگی اور فن کاری سے نقاب
ائی کی ہے کہ سامعین قہقہوں پہ قہقہے لگانے پر مجبور ہو گئے اُن کے اس ہلکے پھلکے "مزاحیہ" کو کافی پسند کیا گیا۔
متعدد مزاحیہ مجموعوں کے خالق، اور زندہ دلانِ حیدرآباد کے جوائنٹ سکریٹری جناب مسیح انجم نے "بنتا" (گدھا)
موضوع بنایا۔ اور اس کے احاطے میں شاعر، شعر گوئی، جدید شاعری رودم، بحر، نئی نسل، بیوی، ساس، الیکشن، سیاسی
ی گری، اقتدار کا خمار، نیز اس سے محرومی کو لے کر مخصوص حیدرآبادی زبان و بیان کی چاشنی سے مزاح کی گدگدی
نہیں طنز کے کچوکے لگائے کہ سامعین فلک شگاف قہقہوں کے جلو میں کسمساہٹ و نشتریت کی چبھن بھی محسوس کرتے رہے
مشہور طنز و مزاح نگار جناب یوسف ناظم نے "ذرا مسکرائیے" کے عنوان سے اپنا مضمون اگرچہ کافی روانی سے پڑھا مگر
ٹوگرافر سے لیکر تصویر کشی کے متعدد پہلوؤں اور سیاسی و سماجی، تجارتی و ادبی زندگی میں تصاویر کی اہمیت و کردار کو اس
فرد انداز میں اجاگر کیا کہ ہمارے سماج کے بیشتر شعبے اپنے حقیقی مگر مضحکہ خیز خد و خال کے ساتھ واضح ہو گئے اور حاضرین
کی فرمائش پر مسکرانے کے بجائے "نان اسٹاپ" قہقہے لگاتے رہے۔
برصغیر کے معروف کالم نویس اور پرانی پیڑھی کے نمائندہ "طنز و مزاح نگار جناب نکر تونسوی کے مضمون کا عنوان تھا،
مطالعہ گاہ" جس میں موصوف نے مطالعہ اور مطالعہ گاہ ہی نہیں بلکہ مشاعرہ کے مختلف گوشوں پر نشتر زنی کرتے ہوئے
حاضرین کو بھی زیر لب مسکرانے، کبھی قہقہے لگانے اور کبھی اُن کے سوالوں پر غور و فکر کے لئے مجبور کر دیا۔ زبان و بیان پہ
بھرپور قدرت اور بات میں سے بات پیدا کرنے کے فن کا شاہکار یہ مضمون پوری توجہ اور دلچسپی سے سُنا گیا۔
آخر میں مدھیہ پردیش اردو اکاڈمی کے سکریٹری جناب فضل تابش نے معزز مہمانوں اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا!

★★★

روزنامہ آفتاب جدید بھوپال کے
کالموں سے اقتباس۔
★

★ مضمون نگار حضرات مضامین صفحہ کے ایک ہی جانب لکھے ہوئے ارسال فرمائیں

خُرافات

(مراسلے)

* حالیہ شمارہ دیکھنے کو ملا۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل نے پاکستانی طنز و مزاح کا بھرپور جائزہ پیش کیا ہے۔ مضامین و منظومات سبھی اچھے ہیں۔ محمد اسد اللہ کو مراٹھی ترجمہ پگڑی پر مبارکباد۔ شگوفہ کے آرٹ ورک (Art Work) پر مزید توجہ دیں ـــــ بس، یہی چیز کھٹکتی ہے ـــــ ورنہ ماشاءاللہ، سبحان اللہ

عطاالرحمن طارق۔ بمبئی

* شگوفہ پر دن بہ دن نکھار آتا جارہا ہے۔ ادھر بعض سنجیدہ لکھنے والوں نے بھی مزاح کی طرف توجہ کی ہے جو یقیناً صنفِ مزاح کی کشش کا نتیجہ ہے۔ شعیب کے کارٹون مستقلاً شائع کرتے رہیں۔ ان میں بلا کا طنز ملتا ہے۔

ڈاکٹر جلال الدین۔ جدّہ

* شگوفہ کے پچھلے شمارے میں شائع شدہ مضمون "زندہ دلانِ حیدرآباد" نے یہاں مشرقِ وسطیٰ میں ہم ہندوستانیوں کو روزمرہ پیش آنے والے چند لسانی مسائل کی یاد دلادی۔ اور جی میں آیا کہ انھیں قلمبند کرکے قارئین کے سامنے پیش کیا جائے۔ دیکھئے کوشش کہاں تک کامیاب ہے۔

میرے ایک پاکستانی عزیز دوست نے حیدرآبادیوں کے متعلق ایک لطیفہ سُنایا کہ کوئی حیدرآبادی صاحب اپنے ایک پٹھان دوست کے ہاں گئے اور انہیں اپنے لڑکے کی کسی تقریب میں مدعو کیا۔ جواب ملا کہ بھئی معافی چاہوں گا مجھ سے آپ کے لڑکے کی تخریب نہیں دیکھی جائے گی۔

سید نثار احمد، دوحہ۔ قطر

* ادب میں طنز و مزاح بھی اپنا ایک خاص مقام رکھتا ہے ویسے تو ہندوستان میں بہت سے ادبی اور نیم ادبی رسالے نکلتے ہیں لیکن طنز و مزاح کا بار آپ نے اکیلے ہی اُٹھا رکھا ہے۔ دوسرے کو ہنسا دینا بھی ایک اہم کام ہے اور مزاحیہ مضمون کا کمال یہ بھی ہے کہ ہنستے ہنساتے طنز کا تیر بھی چھوڑ دیا جاتا ہے جس کا اثر دیرپا ہوتا ہے۔

صباح الدین۔ علی گڑھ

* ادھر دو تین شماروں میں طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ سلسلہ جاری رکھئے۔ بلکہ مزاح نگاروں پر ہر شمارہ میں مضمون بھی شائع کیجیے۔

عبدالمقیم ـ بلاری

* میں پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ شگوفہ کھلانے میں آپ کو کوئی کمال حاصل نہیں۔ البتہ یہ مصطفےٰ رحمتِ عالمؐ کے جلوؤں اور بے پناہ نوازشوں کا ادنیٰ کمال ہے کہ آپ خلوص و محبت کے کمال سے اپنے دامن میں ہندوستان کے تمامی چوٹی اور داڑھی کے شعراء کو اکٹھا کرکے شگوفہ کھلانے کا کام انجام دے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شگوفہ شہرت کی بلندیوں پر دن بہ دن گامزن ہوتا چلا جارہا ہے۔

عالم تاج پوری۔ (یو۔پی)

R. No. 15822/68 — Postal Regd. No. H. HD 6

SHUGOOFA

Vol. 15 Copy 10 — 31 Bachelor Quarters, M. J. Market, Hyderabad-1 — October 1982 Phone : 57716

HEADING TOWARDS

SILVER JUBILEE

SAGAR SARHADI'S

BAZAAR

★ing : Smita Patil, Naseeruddin Shah,

Farooq Shaik & Supriya Pathak

NOVEMBER 1982

Rs. 3-0(

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

جلد ۱۵ — شمارہ ۱۱

نومبر ۱۹۸۲ء

ایڈیٹر:
سید مصطفیٰ کمال

مجلسِ ادارت:
حمایت اللہ
منظور احمد
مسیح انجم

مجلسِ مشاورت:
راجندر سنگھ بیدی
بھارت چند کھنہ
خواجہ عبدالغفور
نریندر لوتھر
مجتبیٰ حسین

ٹائٹل: شعیب

منیجر: مسیح جلیل

قیمت فی پرچہ: ۳ روپے
زرِ سالانہ: ۳۰ روپے، انفرادی ۲۵ روپے
بیرونِ ہند سے: ۹۰ روپے

طابع و ناشر: [illegible]
مطبوعہ: [illegible] پرنٹنگ پریس، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

خط و کتابت کا پتہ

شگوفہ ۳۱۔ چیمبرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱ فون: 57716

PURANDAS RANCHHODDAS & SONS
کشمیری قوام

اِس تھیلی کے چٹے بٹے

فہرست

طرف بھی جہاں میں رہتا ہوں غلطی سے ایک سڑک بن گئی۔ نام اس سڑک کا بہرحال صحیح رکھا گیا یعنی کرشن چندر مارگ۔ یہ بھی زمین کے گول ہونے کا ثبوت تھا۔

جوشؔ ملیح آبادی نے اپنے ایک شعر میں کہا ہے کہ اگر دنیا میں رسول نہ بھی آتے تو تب بھی ثبوت حق کے لئے صبح ہی کافی تھی۔ میرے لئے بھی دنیا کے گول ہونے کے بارے میں اتنی شہادتیں کافی تھیں لیکن اس عقیدے کو مزید مستحکم کرنے کے لئے ڈاکٹر عبدالستار دلوی بھی نمودار ہوئے ڈاکٹر عبدالستار دلوی میرے مرشد بھائی ہیں۔ مرشد بھائی سے مطلب ہے استاد بھائی۔ وہ اس طرح کہ ڈاکٹر زورؔ مرحوم جو جامعہ عثمانیہ میں میرے استاد رہے۔ ۱۹۶۰ء میں کشمیر سے بمبئی تشریف لائے اور اپنے عنایت نامے کے ذریعے یہ اطلاع دی کہ وہ کسی طالب علم کا زبانی امتحان لینے آ رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے بتائے ہوئے پتے پر پہونچا تو وہاں شرمائے، لجائے، سمٹے سمٹائے ایک خوش پوش نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ معلوم ہوا یہی وہ طالب علم ہیں۔ ڈاکٹر دلوی سے میری یہ پہلی ملاقات تھی۔ میں کافی متاثر ہوا بلکہ مرعوب ہوتے ہوتے بچا۔ وہ پی ایچ۔ ڈی کر رہے تھے اور میں اپنی کم ہمتی اور کم علمی پر نادم تھا۔ اس کے کچھ دن بعد معلوم ہوا کہ جس گورنمنٹ کالونی میں میں رہتا ہوں ڈاکٹر دلوی بھی وہیں رہتے ہیں۔ لیجئے دنیا پھر گول ہو گئی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد مجھ سے یہ کالونی چھوٹی اور میں باندرہ ویسٹ کی ایک عمارت میں منتقل ہوا تو معلوم ہوا ڈاکٹر دلوی بھی اس عمارت میں موجود ہیں۔ کچھ دنیا کے گول ہونے کا اندازہ تو ہو گیا تھا لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ دنیا اتنی گول ہے۔ دنیا کے اس قدر گول ہو جانے کی وجہ ہی سے دنیا میں ان دنوں گول مول باتیں ہو رہی ہیں۔ شاعری تو خیر پہلے بھی گول مول ہوئی تھی ـــ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ ایک اور واقعہ یہ ہوا کہ مہاراشٹرا اردو اکاڈمی کی تحریک پر بمبئی یونیورسٹی میں جو بڑا ہماری نقص تھا اور جس کی شکایت ہمیشہ سننے میں آتی تھی اُسے دور کرنے کے لئے یونیورسٹی میں ایک اردو کرسی قائم ہوئی اور اس چیئر کا نام رکھا گیا کرشن چندر چیئر۔ اور اس چیئر کے لئے منتخب کیا گیا ڈاکٹر عبدالستار دلوی کو۔ یوں تو میں ہر کرسی سے محبت کرتا ہوں لیکن اس چیئر سے میری محبت دُہری ہے۔ وہ اس لئے کہ ایک محترم اور معزز دوست کے نام سے منسوب یادگار کو سنبھالنے اور سنوارنے کا کام سپرد ہوا تو ایک مستعد اور عزیز دوست کے سپرد ہوا۔ غالبؔ نے کیا خوب مصرعہ کہا ہے۔

ع گل پہونچے ہیں خود گوشۂ دستار کے پاس

معلوم نہیں یہ مصرعہ اس جگہ موزوں دکھائی دیتا ہے یا نہیں لیکن چسپاں ہونا چاہئے کیوں کہ مصرعہ ہے بہت اچھا اور اس میں دوسری خوبی یہ ہے کہ حسب معمول اس کا پہلا مصرعہ مجھے یاد نہیں ہے

[illegible]

ہی نہیں، علم و دانش کے اعتبار سے بھی دوسرے شہروں کے مقابلے میں کافی اونچائی پر ہے۔ بمبئی یونیورسٹی میں پتہ نہیں یہ قباحت کیسے رہ گئی اور وہ بھی اتنی لمبی مدت تک کہ وہ اردو شعبے سے محروم تھی لیکن پھر بھی ہم اسے یونیورسٹی ہی کہتے تھے۔ وہ شعر ہی کیا جس میں طرہ نہ ہو۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شعبۂ اردو کے قیام سے بمبئی کی اس دانش گاہ علم کی دراز قامتی کا بھرم اب قائم ہوا ہے۔ میں اسے طرۂ پیچ و خم اس لئے بھی سمجھتا ہوں کہ منزل تک پہونچنے میں راستے کے کئی پیچ و خم سے نمٹنا پڑا۔ بہر حال

کام اچھا ہے وہی جس کا کہ مآل اچھا ہے

(پہلا مصرعہ پھر یاد نہیں آرہا ___ بمبئی یونیورسٹی کی زندگی میں یہ سال ایک یادگار سال کی حیثیت سے یاد رہے گا اسے کوئی ناداں ہی جی سے بھلا سکے گا۔

اصل موضوع پر آنے کے لئے مجھے راستے کے پیچ و خم کی وجہ سے کچھ دیر لگی ورنہ یوں میں کافی تیز چلتا ہوں۔ میں تو یہ کہنا چاہتا تھا کہ ڈاکٹر عبدالستار دلوی اگرچہ عمر میں مجھ سے کم ہیں لیکن سبھی جانتے ہیں کہ بزرگی بہ عقل است۔ اس کا انحصار عقل داڑھ پر بھی ہوتا ہے جو بعض صورتوں میں جلد نکل آتی ہے اور بہت دیر تک مضبوط اور وفادار رہتی ہے۔ ڈاکٹر دلوی اس معاملے میں خوش نصیب ہیں۔ مجھے یہ بھی اعتراف کرنا چاہیئے کہ میں نے اکہرے دُہرے ہی نہیں تہرے ام اے بھی دیکھے ہیں لیکن دوہرا ڈاکٹر ڈاکٹر دلوی ہی کو دیکھا ہے۔ انہوں نے پی ایچ ڈی کی دو ڈگریاں حاصل کیں۔ یعنی یہ تو ایسا ہی ہے جیسے

زہر دیں اُس پہ یہ تاکید کہ پینا ہوگا

کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

اتنی گھنگھور گھٹاؤں کی ضرورت کیا تھی ؛ اس قدر سرد ہواؤں کی ضرورت کیا تھی
میں تو خود بڑھنے ہی والا تھا سوئے میخانہ ؛ اتنی بدمست فضاؤں کی ضرورت کیا تھی

میں تو ڈاکٹریٹ کی ایک ہی ڈگری کے دیدار پر شہید ہونے والا شخص ہوں ہمارے مرشد بھائی کو ستم بالائے ستم سے ہمیں زیر بار کرنے کی ضرورت کیا تھی لیکن ڈاکٹر دلوی نے سوچا ہوگا کہ اردو کے ڈاکٹر تو ہندوستان میں بہت ہیں مگر صوتیات کے ڈاکٹروں کا قحط ہے۔ میری معلومات کے مطابق ڈاکٹر دلوی ہوں گے کوئی پانچویں سوار دں میں۔ صوتیات کے بارے میں میری واقفیت صفر سے کچھ کم ہے اور میں صرف یہ جانتا ہوں کہ اردو شاعری میں صوتی قافیے استعمال کرنے کی اجازت ہے مثلاً ات اور کا قافیہ ب اور ہی ہو سکتا ہے لیکن شاعر چاہے تو لفظ لات کو بھی قافیے کے طور پر استعمال کرسکتا ہے لیکن علم صوتیات کو اس قافیہ پیمائی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہندوستا

میں علم صوتیات کے پی ایچ ڈی کی تعداد میں اتنے کم ہوتے تھے کہ شمار [illegible]۔ ایسی صورت میں ہم اور آپ کہاں جا کر رہتے۔ ڈاکٹر دلوی نے اپنی ان دو بڑی ڈگریوں کے علاوہ اپنے گھر میں ایک اور ڈاکٹریٹ کا شرعی انتظام بھی کر رکھا ہے۔ میں تو جب بھی ان دو ڈاکٹروں کے درمیان بیٹھتا ہوں اپنے آپ کو بے حد مریض محسوس کرتا ہوں۔ میرے مرض کا علاج ان دونوں میں سے کسی کے پاس نہیں ہے

ڈاکٹر دلوی نے جو علمی کام کیا ہے [illegible] اور [illegible] بھی۔ اپنی طالب علمی کے زمانے میں ڈگریاں ہی نہیں تمغے بھی حاصل کئے۔ ۱۹۴۰ء میں جب کہ ہندوستان میں گولڈ کنٹرول آرڈر نافذ نہیں ہوا تھا انہوں نے سینٹ زیویرس سے ایک اصلی سونے کا تمغہ حاصل کیا تھا اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں تعلیمی میدان میں جو تمغے حاصل کئے جاتے ہیں کھیل کے میدان میں حاصل کی جانے والی [illegible] کی طرح رولنگ نہیں ہوا کرتے یہ رولڈ گولڈ کے ہوتے ہیں لیکن ذاتی ملکیت ہوتے ہیں اس لئے توقع کی جا سکتی ہے کہ یہ تمغہ اب تک اُن کے پاس محفوظ ہوگا۔ تمغوں کے معاملے میں چونکہ قناعت کا حکم نہیں ہے اسی لئے ڈاکٹر دلوی نے یونیورسٹی سے وائس چانسلر میڈل بھی حاصل کیا۔ ہو سکتا ہے یہ بھی سونے کا رہا ہو۔ مشکل یہ ہے کہ ڈگریاں تو دکھائی جاتی ہیں لیکن تمغے چھپائے جاتے ہیں فوجیوں کی بات اور ہے۔ وہ تمغوں کی بھی نمائش کرتے ہیں۔ جیسے یہ تمغے نہ ہوں بندوق اور پستول ہوں۔ اسلحہ کے ساتھ ساتھ تمغوں سے بھی لیس رہنا صرف فوجیوں کا حق ہے۔ پی ایچ ڈی لوگ ایسا نہیں کر سکتے۔ ڈاکٹر دلوی صرف پی ایچ ڈی ہی نہیں دوسروں کو پی ایچ ڈی میں منتقل کرنے کے گائڈ بھی ہیں اور اس طرح کے گائڈ نہیں جو محکمہ آثارِ قدیمہ کی زیرِ نگرانی عمارتوں میں پائے جاتے ہیں اور ہر کسی عمارت یا یادگار کی غلط تاریخ بتاتے ہیں۔

اردو چیئر کی ترکیب مجھے پسند نہیں آئی لیکن یونیورسٹی کی زبان میں یہی صحیح ترکیب ہے۔ اردو تو بوریا نشین بھی رہی ہے اور واجد علی شاہ اور بہادر شاہ ظفر کی وجہ سے تخت نشین بھی چلئے لارڈ میکالے کی بدولت یہ کرسی نشین بھی ہو گئی۔ لیکن اردو چیئر کے ساتھ آج کل مشکل یہ ہو گئی ہے کہ اردو کرسیوں کی طرح آرام کرسی نہیں ہے۔ بلکہ اس میں ویسے نرم گدے بھی نہیں [illegible] عام طور پر کرسیوں میں ہوا کرتے ہیں۔ بہر حال اس کرسی کے پیچھے [illegible] ڈاکٹر دلوی کی ذمہ داری نہیں ہے۔ [illegible] وقت خوشی بھی گفتگو ہو جاتی ہے [illegible]

ایک اور بات۔ ہر شخص کی ایک رائے ہوتی ہے۔ ڈاکٹر دلوی کو [illegible] اور یہی وجہ ہے کہ [illegible] ان کے ہاتھ سے [illegible] نہیں جاتی۔

[illegible] جا رہا ہے کہ [illegible] یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر کی حیثیت سے [illegible]

[illegible] اپنے آپ کو سبکدوش کر دینے کا طریقہ ابھی رائج نہیں ہوا ہے۔

(یہ مضمون بمبئی کے ایک [illegible])

جمال قمر چغتائی (بھوپال)

الغلط پھل

آج بھی ہم کو اپنے بچپن کا وہ زمانہ اچھی طرح یاد ہے جب ہم بیمار ہوا کرتے تھے اور حکیم صاحب ہمارے والد کو دوا کے ساتھ پھل ہمیں کھلانے کی ہدایت دیا کرتے تھے۔ جی ہاں یہ اس وقت کی بات ہے جب گیہوں ایک روپیہ من بکا کرتے تھے اور ہمارے سر پر یونین جیک لہرایا کرتا تھا.... پچاس سال سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا مگر آج بھی ڈاکٹر ہم کو مشورہ دیتا ہے کہ ہم اپنے پوتا پوتی کو دوا کے ساتھ پھل ضرور کھانے کو دیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارے ملک میں آج تک پھل دوا کے طور پر استعمال ہوتے ہیں اور ڈاکٹر کے مشورے کے بعد ہی کھائے جاتے ہیں۔ سرکار کے بدل جانے سے پھل کے استعمال کا طریقہ نہیں بدلا کرتا۔ چنانچہ ہم بھی عرصۂ دراز سے پھلوں کے بارے میں سوچتے رہے ہیں۔ لیڈر تو ہیں نہیں جو ملک و قوم کی فکر میں دیش بدیش مارے پھریں۔ ہم نے اس سلسلے میں اتنا سوچا کہ مفکر پھل بن گئے۔ ظاہر ہے کہ ایک مفکر عام آدمی سے مختلف ہوتا ہے جیسے شاعروں میں علامہ اقبال تھے۔

اگر عوام کو ہمارے ملک میں پھل کھانے کو ملتے تو وہ ہماری قدر دانی کرتے نتیجہ یہ ہوا کہ ہم جہاں تھے عمر بھر وہیں رہے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ ہمارا گزر ایک ایسے محلے سے ہوا جہاں تربوز کے انبار لگے تھے۔ آپ چاہیں تو اس خطہ کو سبزی منڈی کہیں یا فروٹ مارکٹ۔ کہتے ہیں کہ ٹماٹر پھل ہے بعض لوگ اس کو سبزی سمجھتے ہیں ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں۔ مگر ہم ہرگز تربوز کو جھگڑے کی وجہ نہ بنائیں گے۔ ویسے ہی ہمارے ملک میں نفاق کیا کم ہے۔ ہاں تو بات ہو رہی تھی تربوز کے انبار کی۔ تربوز بھی پھل۔ انگور بھی پھل۔ پھر خیال آیا خدا نے تربوز اپنے ان غریب بندوں کے لئے پیدا کیا ہے جو ہم ہو۔ ہمارے دور کے سنہرے اصول پر عمل نہیں کرتے سعدی بھی فرما گئے ہیں۔

دوستاں را کجا کنی محروم ــــ تو کہ با دشمناں نظر داری۔ ہماری رائے میں تربوز کا نام [illegible] ہوتا [illegible] سرکاری اسپتالوں میں غریب مریضوں کے منہ تک پہنچتا ہے۔ اور نرس اور ڈاکٹر اسے کھا کر بھی [illegible] ہمارا دور [illegible] ہم نے تربوز کو ہمیشہ [illegible] سے دیکھا ہے [illegible] آزادی کے بعد سے آج تک [illegible]

یہاں تو ہم اور آپ دیکھ رہے ہیں۔ جتنا پھل کا احوال ہم بتائے دیتے ہیں کیونکہ ایک بار ہم اس پھل کو خرید کر عذاب
میں گرفتار ہو چکے ہیں۔ اگر آپ کو ہماری بات پر یقین نہ ہو تو کبھی آزمانے کو کوئی تربوز خرید کر دیکھ لیجئے۔ لیکن شرط یہ ہے
کہ تربوز کو گھر تک لے جانے کے لئے کسی مزدور یا ہاتھ ٹھیلے کا سہارا نہ لیا جائے۔

فرض کیجئے مہنگائی کے اس دور میں آپ نے تین یا چار روپیہ میں ایک بہت بڑا تربوز خرید لیا۔ اس کی قیمت ادا
کرنے کے بعد اتنے ہی گھبرائیں گے جتنا ایک دولہا شادی ہونے کے بعد دلہن سے گھبراتا ہے۔ وہ سوچتا ہے یہ لڑکی میرے
گھر پہونچ جانے کے بعد نہ جانے کیا گل کھلائے گی۔ خدا جانے تربوز اندر سے خراب نکلے پھیکا نہ ہو۔ اگر آپ نے دوسری
باتوں کی طرح اس واقعہ کو بھی مقدر پر چھوڑ دیا تو بھی بات ختم نہ ہوگی۔ سب سے پہلا سوال ہوگا تربوز کو دکان سے گھر
تک لیجانے کا۔ ہمت کر کے آپ تربوز کو بہت احتیاط سے دونوں ہاتھوں سے اٹھانے کی کوشش کریں گے اور وہ تیل
لگے پہلوان کی طرح پھسل جائے گا۔ اور چھش کی ایک آواز کے ساتھ اس کے دو ٹکڑے ہو جائیں گے۔ ایک یہاں گرے گا
ایک وہاں۔ یہ منظر دیکھ کر آس پاس کے لوگ آپ پر ہنس پڑیں گے اور آپ شرم سے پانی پانی ہو جائیں گے۔

آدمی، آدمی کی کمزوری سے ہمیشہ سے فائدہ اٹھاتا آیا ہے۔ بے بسی کے اس عالم میں آپ کو دیکھ کر کوئی چھوٹا غریب
لڑکا کم پیسوں میں آپ کی مدد کرنے کو تیار ہو جائے گا۔ مگر آپ چند پیسے خرچ کر کے مزدوری ہرگز نہ کریں گے۔ جگ کی
لاج کے پیش نظر آپ سوچیں گے لوگ کہیں گے اتنا بڑا تربوز خریدا ہی کیوں تھا جب اس کا بوجھ اٹھایا نہیں جاتا اور یہ
مصرع ذہن میں بے ساختہ گونج جائے گا۔

اسے زندگی کا بھی حق نہیں جو یہ بار غم نہ اٹھا سکے

چلئے آپ نے کسی بھی طرح یہ دونوں لال لال تربوز کے ٹکڑے اپنے دونوں ہتھیلیوں پر رکھ لئے اور ہمت کر کے گھر کی
طرف چل پڑے۔ اس وقت آپ کی وہی شکل ہوگی جو اکثر بارات کے اس مزدور کی ہوتی ہے جو مٹی کی دو ہانڈیاں اپنی
ہتھیلیوں پر رکھ کر باجے گاجے کے ساتھ شہر کے بازار سے گزرتا ہے۔ پھر تربوز کا میٹھا رس آپ کے کپڑوں پر گرے گا
اور لال شہد کی مکھی رس کے لالچ میں آپ کے ساتھ ہو گئی تب آپ کیا کریں گے۔ مکھی کبھی سیدھے ہاتھ کی انگلی پر آ بیٹھے گی کبھی
بائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر کبھی گردن پر۔ تو کبھی ناک پر کبھی آنکھوں کے آگے۔ ایسے نازک وقت میں اگر چپل کا اسٹیپ
جواب دے جائے یا جوتے میں کوئی کنکر چبھنے لگے تو آپ کے سامنے ایک ہی راستہ ہوگا۔ وہ یہ کہ اپنے ہاتھوں
سے بوجھ کو زمین پر اتار دیں۔ یہ کام بھی آسان نہیں ہوگا۔ جب آپ اپنے تھکے ہاتھوں کو نیچے لانا چاہیں گے یہ لال لال
ٹکڑے پھسل کر کہیں دور چلے جائیں گے۔ لیکن گھبرانے کی پھر بھی کوئی بات نہیں ہے راہ گیر آپ کی بے لوث امداد کو
وہاں موجود ہوں گے۔ یہ تو حال ہوا اس ٹوٹے ہوئے تربوز کا۔ اب کچھ سالم تربوز کے بارے میں۔

تربوز خریدنے کے فوراً بعد آپ سوچیں گے کہ کون سا پہلوانی داؤ لگا کر تربوز کو دکان سے اٹھائیں۔ جب کوئی ترکیب
سمجھ میں نہیں آئے گی تو آپ تربوز کو ٹھیک اسی طرح زمین سے اٹھا کر کمر پر رکھ لیں گے جس طرح ایک ماں اپنے دیر
سے بلکتے بچے کو فوراً محبت سے اٹھا کر کمر پر بٹھا لیتی ہے۔ مگر آپ کا بچہ تو تربوز ہے۔ تربوز کے ٹانگیں نہیں ہوتیں جو کمر پر بیٹھ
جائے یہ تو گول وزنی توپ کا گولہ ہے۔ قدم کی ہر دھمک پر کمر سے نیچے آئے گا۔ لہٰذا آپ اپنا دوسرا ہاتھ بھی تربوز والے
ہاتھ کی مدد کے لئے لگا دیں گے جس کا انجام یہ ہوگا کہ آپ کا آدھا جسم اور گردن تربوز والی جانب جھک جائے گا۔
ستم بالائے ستم یہ کہ آپ تو دھوپ سے ہو رہے ہیں اور راستے میں ملنے جلنے والے آپ پر سوالات کی بوچھار کرتے ہیں اور
تربوز کے بارے میں معلومات فراہم کرنے میں مصروف ہیں۔ بہت بڑا ہے کتنے میں خریدا؟

رشید الدین

★

بس آتی ہے پر نہیں آتی

"تمہارے میاں دفتر کس طرح جاتے ہیں؟"
ایک عورت نے اپنی پڑوسن سے پوچھا۔
"دو لاکھ کی گاڑی میں" اس نے جواب دیا۔

قارئین کرام اس سے یہ نتیجہ نہ اخذ کر لیں کہ اس عورت کا شوہر بہت بڑا عہدہ دار یا صنعت کار ہوگا بلکہ وہ ایک دفتر میں صرف اہلکار یعنی کلرک ہے جسے عرف عام میں بابو کہا جاتا ہے اور جب گاڑی کا ذکر کیا گیا وہ کوئی اور نہیں بلکہ سرکاری بس ہے جس کا ماہانہ کرایہ یعنی پاس کی قیمت صرف ۲۲ روپے ۵۰ پیسے ہوتی ہے۔ روز آنہ ایسے کتنے ہی بابو لوگ ان بسوں سے اسی طرح سفر کرتے ہیں اور بعض لوگ بابوؤں کے نام پر خود بھی بغیر پاس کے سفر کرتے ہیں اور پکڑے جانے پر جرمانے ادا کرتے ہیں مگر ایسی نوبت کم ہی آتی ہے کیونکہ بابو لوگ عام طور پر صبح اور شام کے اوقات میں سفر کرتے ہیں اور یہ اوقات اتنے زیادہ رش کے ہوتے ہیں کہ بے چارے کنڈکٹروں کو پاس دیکھنے کا تک مہلت نہیں ملتی اور وہ آپ کے سفید کپڑوں کو دیکھ کر ہی یقین کر لیتے ہیں کہ جب یہ پاس کہہ رہے ہیں تو ان کے پاس پاس ہوگا ہی۔

جب کوئی بس اپنا منزل یعنی اسٹاپ سے نکلتی ہے تو یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ اب آپ اپنی منزل [illegible] پہنچ جائیں گے لیکن ایسا ہونا ضروری بھی نہیں کیوں کہ اکثر بسیں اپنے راہ میں کسی [illegible] مسافروں کو سوار ہونے دیتی ہیں۔ کبھی کوئی مسافر صاحب غلط بس میں سوار ہو جاتے ہیں تو کبھی کسی صاحب [illegible] نہیں ہوتے۔ کبھی کوئی صاحب جلدی میں اپنا بٹوہ گھر ہی پر بھول آتے ہیں [illegible] کبھی [illegible] یعنی الٹا ہو جاتی ہے کہ بعض مسافروں کو اترنا ضروری ہو جاتا ہے

یہ سب سانحات پھر بھی غنیمت ہیں لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ بس میں بیٹھے تھے دفتر جانے اور پہونچ جاتے ہیں کسی پولیس اسٹیشن پر جہاں معلوم ہوتا ہے کہ کسی مسافر کے ساتھ کنڈکٹر کے جھگڑے کی وجہ سے بس یہاں لائی گئی ہے۔ اگر معاملہ یہیں تک محدود رہا تو کوئی بات نہیں مگر صورتِ حال اس وقت عجیب ہو جاتی ہے جب آپ کو گواہی کے لئے پولیس اسٹیشن کے اندر بلایا جاتا ہے۔ جب آپ کو جھگڑے کی کچھ خبر ہی نہیں تو آپ کیا خاک گواہی دیں گے لیکن بس میں بیٹھنے کا کچھ تو جرمانہ ادا کرنا ہوتا ہی ہے۔

اسی طرح یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی کہ آپ بس میں بیٹھنے کے بعد بروقت اپنی منزل کو پہونچ ہی جائیں گے۔ یہ تو بیٹھنے کے بعد کی بات ہوئی لیکن بیٹھنے سے پہلے کی صورتِ حال اس سے بھی زیادہ غیر یقینی ہوتی ہے۔ پہلے تو بس جلدی آتی نہیں اور آتی ہے تو بغیر آپ کے اسٹاپ پر رُکے آپ کا منہ چڑاتے ہوئے فراٹے بھرتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ اور آپ کی آنکھیں پھر کسی دوسری آنے والی بس پر لگ جاتی ہیں۔ اس اثناء میں اسٹاپ پر ہجوم بڑھتا رہتا ہے اور ہجوم کے ساتھ ساتھ آپ کی بے چینی میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ادھر جہاں آپ کھڑے ہوتے ہیں وہاں کی حالت بھی کچھ زیادہ بہتر نہیں کہی جا سکتی۔ ایک طرف سے کوئی موٹے صاحب آپ کو دباتے رہتے ہیں تو دوسری طرف سے کوئی صاحب آپ کو تاکتے رہتے ہیں جو ظاہر ہے جیب کترے کے علاوہ اور کون ہو سکتے ہیں۔ سامنے سے کوئی فقیر دستِ سوال دراز کرتا ہے تو پیچھے سے کسی صاحب کی چھتری کی نوک آپ کی پیٹھ میں چبھتی رہتی ہے۔

اتنے میں جب کوئی بس آکر رکتی ہے تو سارا ہجوم غفیر آنِ واحد میں اس میں منتقل ہونے کی کوشش شروع کر دیتا ہے اور اس کے نتیجہ میں کوئی بھی اندر داخل نہیں ہو سکتا کیوں کہ جب اندر کے مسافر باہر آجائیں تب ہی تو آپ اندر داخل ہو سکیں گے مگر کون اس کا خیال کرتا ہے۔ ایک دھکم پیل جاری رہتی ہے۔ اندر کے مسافر باہر آنے کے لئے بے قرار اور باہر کے مسافر اندر جانے کے لئے بے چین۔ کنڈکٹر کی مداخلت پر باہر ٹھیرے ہوئے مسافر بمشکل تمام اندر کے مسافروں کو باہر نکلنے دیتے ہیں اور جوں ہی آخری مسافر بس کی سیڑھی سے نیچے قدم رکھتا ہے کنڈکٹر گھنٹی بجا دیتا ہے اور بس کسی بھی مسافر کو لئے بغیر فراٹے بھرنا شروع کر دیتی ہے۔ اب بے چارہ کنڈکٹر بھی کیا کرے۔ اندر بس میں جگہ نہیں اور باہر انسانی سروں کا سیلاب۔ کیسے بٹھائے اور کیسے روکے۔ اس لئے وہ یہی بہتر سمجھتا ہے کہ چپ چاپ بس کو آگے بڑھا دیا جائے۔

مگر بعض منچلے اس پر بھی مایوس نہیں ہوتے اور مسلسل بس کے ساتھ بھاگتے رہتے ہیں۔ بعض ڈنڈا پکڑ کر جھولتے رہتے ہیں اور بعض ایک پیر بس میں اور دوسرا ہوا میں لہراتے ہوئے سفر جاری رکھتے ہیں بس والے پیر میں چپل رہتی ہے اور ہوا میں جھولتے ہوئے پیر کی چپل سڑک کی نذر ہو جاتی ہے۔ بعض کو بس والے نیچے کھینچ لیتے ہیں اور بعض کو اندر بیٹھے ہوئے مسافروں کی سفارش پر کنڈکٹر اندر لے لیتا ہے یہ سلسلہ صبح سے شام بلکہ رات دیر گئے تک جاری رہتا ہے اور بس مسافروں کو ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ اگل دیتی ہیں۔ اس دوران بعض لوگ اللہ کو پیارے بھی ہو جاتے ہیں۔ کبھی بس کے سامنے آکر یا کبھی

بس کے پیچھے لٹکتے ہوئے کبھی چڑھتے ہوئے اور کبھی اترتے ہوئے۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ ایسے جوکھم کا سفر لوگ کم ہی کرتے ہوں گے لیکن آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ سب سے زیادہ سفر شہروں میں بسوں کے ذریعہ ہی کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ دیگر سواریوں کے کرائے کچھ اتنے سستے نہیں اور ہمارے ملک کے باشندوں کے مالی حالات اتنے اچھے نہیں۔ لہٰذا تان آکر ہمیشہ بس پر ٹوٹتی ہے اور بس کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ کبھی آتی اور کبھی نہیں آتی بعض اوقات ایک کے پیچھے ایک دو دو بسیں چلی آتی ہیں تو کبھی آدھے آدھے گھنٹے تک کوئی بس ہی نہیں آتی۔ بس کی اس بے بسی کو دیکھ کر ہی بعض لوگ ہمارے شہر میں سیکلوں کو ترجیح دیتے ہیں مگر آج کل سڑکوں پر ٹریفک بھی اتنی زیادہ ہوگئی ہے کہ سیکل پر سفر کرنے کی ایک شریف آدمی میں ہمت نہیں رہی اور جو مجبوری کے تحت ایسا کرتے ہیں وہ صبح گھر سے نکلنے سے پہلے ماں سے دودھ اور بیوی سے مہر بخشوا لیتے ہیں اور جب شام میں گھر پہونچتے ہیں تو خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے ان کی زندگی میں ایک دن کا اضافہ کیا۔

یہ تو تھی بس کے باہر کی باتیں۔ بس کے اندر کا منظر آپ نے ابھی دیکھا نہیں، جب لوگ بھیڑ بکریوں کی طرح اس میں بھر جاتے ہیں تو پھر بس کے پہیئے گھومنے لگتے ہیں۔ اب اتنے سارے لوگوں کے بیٹھنے کا کیا سوال، چند ہی خوش قسمت کو نشستیں ملتی ہیں جن میں غالب تعداد خواتین کی ہوتی ہے اور باقی تمام لوگ کھڑے رہتے ہیں جوں ہی مسافر اندر داخل ہوتے ہیں ہر کوئی یہ چاہتا ہے کہ بس جلد سے جلد چلنے لگے کیوں کہ اندر بلا کا رش اور حبس ہوتا ہے۔ لیکن کنڈکٹر ٹکٹ اِشو کرنے میں لگا رہتا ہے۔ جب خدا خدا کر کے بس چلنے لگتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی صاحب کے ٹفن میں سے سالن کے قطرے آپ کی سفید پینٹ پر گر رہے ہیں۔ ایک صاحب دوسرے صاحب کے مونڈھے پر سے سر لٹکائے اخبار کی سرخیاں پڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں اور ایک صاحبہ اپنی سیٹ پر بیٹھی سوئٹر بُن رہی ہیں جس کی سوئیاں آپ کے جسم کو چبھ رہی ہیں۔ کوئی بچہ کسی خاتون کی گود میں ہمک رہا ہے اور آپ کی عینک اچک لینے کے لئے کوشاں ہے۔ کوئی صاحب بس کی بد انتظامی کا شکوہ کر رہے ہیں اور کوئی صاحب حالات حاضرہ پر تبصرہ فرما رہے ہیں۔ اتنے میں کوئی انقلاب زندہ باد کا نعرہ بلند کرتا ہے اور کنڈکٹر فوراً بس روک کر اسے اتارنے کی کوشش کرتا ہے کہ انقلاب لانے کے لئے بس موزوں جگہ نہیں کسی میدان میں نکل جایئے۔ بعض لوگ ان تمام حماقتوں سے قطع نظر سامنے بیٹھی ہوئی خواتین کے چہرے کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں بعض افراد خواتین کے درمیان بار بار اگلے اسٹیج کے بارے میں استفسار کرتے رہتے ہیں اور کبھی صحیح اسٹیج پر نہیں اترتے۔ یا تو ایک اسٹیج پیچھے اتر جاتے ہیں یا ایک اسٹیج بعد اتر جاتے ہیں اس اثنا میں بعض لوگ مسلسل دوسروں کی جیبوں پر نظر رکھے ہوئے ہوتے ہیں کہ ان کا روزگار اسی سے چلتا ہے۔

لیکن ان تمام مشکلات اور پریشانیوں کے باوجود ہر شہر میں ہزاروں بسیں چل رہی ہیں اور مسافر برابر ان میں سفر کر رہے ہیں۔ برابر بسوں کے ناقص انتظام پر تنقیدیں ہو رہی ہیں اور برابر ناقص سماج کو

سید مصطفیٰ تاج
★
(بھوپال)

پوسٹر

آپ لوگوں نے شہر کی دیواروں پر لکھے ہوئے پوسٹر تو دیکھے ہوں گے ....!
ہاؤ نشان .... کمپنیوں کے اشتہار .... سرکاری سوچنا۔ یونین کی مانگیں ... ڈاکٹروں کی پبلسٹی
سکول اور کالجوں کے لڑکوں کی ناراضگی۔ نوجوانوں کی بے کاری پر اکتاہٹ غرض کہ شہر کی ان کچی
اور صاف ستھری دیواروں کو ان پبلسٹی کرنے والوں نے اس طرح داغ دار بنا رکھا ہے
جیسے عاشق کا کلیجہ ....

یا ہماری بھوپالی زبان میں بھٹیارے کا پاجامہ .... جس پر تیل کے داغ آٹے کی سفیدی،
کیچڑ گندے پانی کے دھبے .... چنگاریوں سے جلے ہوئے روزن، پسینہ پان کی پیک اور بہتی
ہوئی ناک کے سوکھے دھبے۔

کبھی ان دیواروں کو دیکھ کر بازاری پینٹر کا وہ بورڈ یاد آ جاتا ہے جس پر وہ اپنا برش صاف کرتا
کبھی یہ دیواریں پرانے گھر کی چھت کی طرح لگتی ہیں جس پر دیمک اور پانی کے ریلوں نے جگہ
جگہ ہندوستان کا نقشہ بنا رکھا ہے جس میں ملک کی ترقی اور خوشحالی کے اشارے سڑکیں
دریا اور ریلوے لائن صاف نظر آتی ہیں۔

غرضیکہ تاریک رات میں یہ جلے منہ کی دیواریں .... لیکن یہ دیواریں کبھی کسی بد سفر کی ڈائری کا ورق
نظر آتی ہیں .... کبھی پاگل خانے کے اسکول کا بورڈ .... یہ دیواریں کبھی ہم کو ترقی کا راز بتاتی ہیں ....
کبھی ہماری بے بسی اور بے کسی کا مذاق اڑاتی ہیں .... یہ دیواریں ہم کو کبھی قسمت کی [illegible] نظر آتی ہیں [illegible]
[illegible] آزادی کی لڑائی کے آخری دنوں کی نثر کا نمونہ پیش کرتی ہیں .... کہیں ان میں خواجہ حسن [illegible]
[illegible] نظر آتی ہے کہیں [illegible] آزاد کی عبارت .... یہ دیواریں کبھی منصور سے زیادہ جرأت سے

[illegible] جو گردش کرتا تھا۔ جوش مارتا تھا۔ اس لیے رشتوں میں پختگی تھی۔ چاہت اور محبت تھی۔ مگر آج خون میں UTILIZATION کا زہر سرایت کر گیا ہے۔ اس زہر کے نتیجے میں خون بھی سُرخ سے سفید ہو گیا ہے۔ سفید رنگ جو شانتی کا مترادف سمجھا جاتا ہے۔ کیسی کیسی اشانتی پھیلاتا ہے۔ اس کا آپ کو علم ہے۔ خون نے جب سے سفیدی کا چولا پہنا ہے۔ سارے رشتے ناطے UTILIZATION کے گرد گھومتے لگے ہیں۔

اسی سفید خون کی بناء پر وہ بہو بیٹیاں جو گھر کی زینت سمجھی جاتی تھیں۔ آج گلے میں بیگ اور کان پر قلم رکھ کر سڑکوں پر نکل آئی ہیں۔ دفتروں کے چکر لگاتی ہیں۔ کما کر لاتی ہیں۔ اور گھر بار چلاتی ہیں۔ وہ رشتہ جو مرد و عورت کے بیچ ہوتا تھا کسی زمانے میں محبت اور چاہت سے بھرا پُرا ہوتا تھا۔ کیونکہ مرد ایک وقت میں صرف ایک کام کرتا تھا۔ یعنی کماتا تھا۔ اور عورت گھر بار سنبھالتی تھی۔ بار تو آج بھی سنبھالتی ہے۔ مگر گھر کا نہیں۔ کماؤ پوت بن کر سپوت کو جنم دینے سے قاصر ہے۔ اور اگر لوگوں کا بس چلتا تو بار (BAR) کو سنبھالنے پر بھی مجبور کر دیتے۔ آج میاں سے پہلے بیوی گھر سے رخصت ہوتی ہے۔ اور میاں کے آنے کے بعد بیوی آتی ہے۔ کسی کو کسی کا انتظار نہیں۔ کسی کو کسی سے مطلب نہیں۔ پیار کے لیے وقت نہیں ملتا۔ بولنے کے لئے گھڑیاں ڈھونڈی جاتی ہیں۔ بولی جاتی ہے اگر کوئی زبان تو وہ ہوتی ہے سکول کی زبان جو سوائے تلخی کے اور کچھ پیدا نہیں کر سکتی۔ یہ زبان بھی UTILIZATION کی دین ہے۔ کیوں کہ آج کے بیشتر نوجوان اور مرد ان ہی عورتوں کو پسند کرتے ہیں جو کماتی دھماتی ہیں مگر خود چُپ نہیں کرواتیں۔ سسرال والے بھی ایسی عورتوں کو پسند کرتے ہیں۔ مگر صرف UTILIZE کرنے کی حد تک۔ دودھ دینے والی گائے اگر دولاتیں بھی مار دے تو کوئی فرق نہیں پڑتا ایسا ہم نے سُنا تھا۔

مگر UTILIZE ہونے والی ایسی بیویاں اور بہوئیں بھی ہم نے دیکھی ہیں۔ جنہیں شوہر تو شوہر سُسرال والے اور گھر والے بھی بڑے اطمینان سے آنکھیں موند کر۔ سماعت کو کرائے پر اٹھا کر۔ جذبات اور احساسات کو سُلا کر بالکل اسی طرح استعمال کرتے ہیں۔ جیسے بے جان فرنیچر کا استعمال ہوتا ہے۔ جہاں ضرورت ہوئی سجا دیا۔ باقی اللہ اللہ خیر صلا (رہے ہم۔ ہم تو اسی زمرے میں آتے ہیں کہ ہمیں UTILIZE کرنے کا گُر تو ہماری نوکرانی تک جانتی ہے)

اگر ایسے سلوک کے بعد بیویوں۔ بیٹیوں اور بہوؤں کا رشتوں سے اعتماد اُٹھ جائے تو انہیں دنیا سے اٹھا دینے کی تمام تر کوششیں شروع کر دی جاتی ہیں۔ جس طرح ریس میں دوڑنے والا گھوڑا لنگڑا ہو جائے تو اُسے گولی مار کر میٹھی نیند سلا دیا جاتا ہے۔

اب ہماری صرف اتنی دعا ہے UTILIZATION کا یہ لفظ ہم سے بے جان چیزوں سے منسلک ہو کر سفید اور کالے دھن کے جھگڑے کو ختم کر دے۔ رشتے کی گرمی کو پھر سے حیات جاودانی مل جائے۔ ایک بار پھر احساسات جذبات اور اپنائیت بے حسی کی صلیب سے اُتر کر زندگی کے آنگن میں محبت کے پھولوں کی خوشبو پھیلا دے۔ آپ کہیئے آمین۔ ہم کہہ چکے ہیں ثم آمین۔

سلیم مقصود (جدہ)

لڑکیوں کی یونین

آپ نے بے وقوفوں کی یونین، کمزور شوہروں کی یونین اور کرشن چندر کی بموجب گدھوں کی یونین، اور گدھوں کے مالکوں کی یونین کے نام سنے ہوں گے مگر آپ نے لڑکیوں کی یونین کا شاید نہ سنا ہوگا۔ یہ کسی کمپنی، فیکٹری یا سرکاری دفتر کی لڑکیاں نہیں ہیں بلکہ یہ ہمارے ایک رشتہ دار کی اکلوتی بیوی کی نادر الوجود لڑکیاں ہیں۔ جن کی تعداد کبھی ڈیڑھ درجن اور کبھی دو درجن کے قریب نظر آتی ہے خود ہم نے اپنے ان رشتہ دار ممدوح سے صحیح تعداد معلوم کرنی چاہی تو انھوں نے بیزارگی سے کہا کہ "اُن کی تعداد بس اتنی ہے کہ ہر لڑکی مجھے اپنی لڑکی معلوم ہوتی ہے"۔ ان لڑکیوں کی خاص بات یہ ہے کہ ان لڑکیوں نے اپنے گھریلو حقوق کی حفاظت کے لئے گھر ہی میں ایک یونین قایم کرلی ہے۔ پھر اس یونین کی ایک عاملہ (EXECUTIVE BODY) بھی۔ آپ کہیں گے کہ یہ ڈیڑھ درجن یا دو درجن افراد کی یونین کیسی؟ یہ چبھتا ہوا سوال ہم نے اس یونین کی صدر صاحبہ سے بھی کیا تھا۔ تو انہوں نے فوراً جواب دیا تھا کہ "جب دو افراد کی کل جندسیاسی پارٹی ہوسکتی ہے تو ڈیڑھ درجن یا دو درجن افراد کی تو کل یکہ درون خانہ جماعت کیوں نہیں ہو سکتی"۔ ہم نے اس جماعت کی ایک اور لڑکی سے پوچھا۔ "آپ لوگوں کو پارٹی قائم کرنے کا خیال کیوں کر آیا؟" لڑکی نے کہا۔ "اپنے حقوق کی حفاظت بین الاقوامی سطح سے لے کر بیت تک انسان کا پیدائشی حق ہے جب کوئی طاقت اس حق کو غصب کرلینا چاہتی ہے تو پھر اس حق کی حفاظت کے لئے یونین بنانی پڑتی ہے۔ اس کے لئے کسی قسم کی پابندی اور شرط کی ضرورت نہیں ہے"۔ ہم نے پوچھا کیا آپ نے یونین اپنے سرپرستوں کے خلاف بنائی ہے؟ انہوں نے کہا نہیں! ہم نے یہ یونین اپنے سرپرستوں کے خلاف نہیں بنائی بلکہ ان کی مدد کے لئے بنائی ہے"۔ ہم نے کہا کہ آپ کس طرح سے اپنے سرپرستوں

کی مشکلات میں جواب دیا گیا: "جب بھی کوئی مسئلہ گھر میں اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ ہم فوراً حرکت ACTION میں آجاتے ہیں۔ والدین کو دو چار روز کی مہلت دی جاتی ہے کہ وہ خود اس مسئلہ کو باہمی تعاون سے حل کریں جب ان سے حل نہیں ہو پاتا۔ ہم تو پھر ہماری عاملہ مداخلت کرتی ہے۔ اور بعض مسئلے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا حل ابتداء ہی سے مشکل نظر آتا ہے۔ چنانچہ ہمارے والدین خود ہم سے رجوع کرتے ہیں۔ دیگر رشتہ داروں کے مسائل بھی ہم نے متعلقہ فریقوں کی اپیل پر حل کئے بلکہ بعض اوقات محلے اور شہر میں جب کوئی بڑے کرائیز CRISIS ہوتے ہیں تو ہماری مدد حاصل کی جاتی ہے۔ اب تو گھر گھر یونینوں کا قیام ہو رہا ہے۔ ظالم والدین و سرپرستوں کی ڈکٹیٹر شپ کا خاتمہ اب قریب ہے۔ ہماری دیکھا دیکھی لڑکوں نے بھی یونینیں بنانی شروع کی ہیں مگر ان کی یونینیوں کا حال بھی عربوں کی متحدہ تنظیموں جیسا ہے۔ جن کے ارکان اپنی رائے کا اظہار یونین کے اجلاس میں نہیں بلکہ اجلاس کے باہر کرتے ہیں۔ اور جو بائی کاٹ BOYCOTT اور واک آوٹ WALK OUT کا شکار ہو کر آپ ہی آپ ختم ہو جاتی ہیں۔ ہماری یونین میں بائی کاٹ اور واک آوٹ سخت جرم ہیں۔ جو رکن ان حرکتوں کا ارتکاب کرتا ہے اس کا حقہ پانی بند کر دیا جاتا ہے مطلب یہ ہے کہ ایسے رکن سے کوئی بات نہیں کی۔ والدین کو بھی نوٹس دے دی جاتی ہے کہ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر یونین کو سبوتاژ کرنے کی کوشش نہ کریں۔ بلکہ اس معاملہ میں ہمارا تعاون کر کے باہمی تعلقات کو خوشگوار بنائیں۔ ہمارا رکن دو چار دن کی افہام و تفہیم میں فوراً نادم ہو کر پھر سے ہم میں شامل ہو جاتا ہے۔" ہم نے ایکبار اس یونین کی صدر صاحبہ سے انٹرویو کے دوران پوچھا۔ "بھئی! ابھی تو آپ اسکولوں اور کالجوں میں پڑھتی ہیں۔ جب آپ کی تعلیم ختم ہو گی اور آپ سب کی شادیاں ہو جائیں گی تب آپ کی اس یونین کا کیا ہو گا؟ جواب دیا گیا۔ "ہوگا کیا؟ یونین اپنی جگہ برقرار رہے گی۔ آنے والی نسلیں اس ذمہ داری کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائیں گی۔" ہم نے صدر صاحبہ سے ایک اور چبھتا ہوا بلکہ ڈستا ہوا سوال کیا کہ "آپ کی یونین اور آپ کے والدین کے مفادات میں ٹکراؤ تو نہیں ہو جاتا جیسا کہ اکثر قومی یونینیوں کے مفادات اور قوم کے مفادات میں ٹکراؤ ہو جاتا ہے؟" جواب ملا۔ "دیکھئے! دراصل قومی مفادات اور یونین کے مفادات جس طرح الگ الگ نہیں ہوا کرتے اسی طرح ہمارے مفادات اور ہمارے سرپرستوں (والدین) کے مفادات جدا جدا نہیں ہو سکتے۔ یہ علیحدہ مفادات کی اصطلاحات دراصل مفادات فاسد کی پیدا کردہ ہیں۔" ہمارا ایک اور سوال یہ تھا کہ کیا کبھی یونین کے افراد میں پھوٹ ڈالنے کی کوششیں نہیں کی گئیں؟ کیا کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مخالفین کی طرف سے متوازی یونین COUNTER UNION کے قیام کی دھمکی دی گئی ہو؟" صدر صاحبہ نے کھنکتا ہوا قہقہہ لگا کر کہا۔ ہمارے رکن کوئی قومی یونین یا کسی سیاسی تنظیم کے ارکان ہیں کہ خریدے اور بیچے جائیں۔ ہمارے مفادات ہماری یونین سے وابستہ ہیں۔ ہمارے بکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" ہم نے مزید ایک سوال کیا۔ "آپ کی یونین کے انتخابات مدت مقررہ پر آزادی کے ساتھ ہوتے ہیں؟ کیا ان میں کبھی دھاندلی

ہوتی ہیں؟" بکٹ کر بولیں "دھاندلیاں؟ کیسی دھاندلیاں؟" پھر قائد محترمہ نے تیز آواز میں کہا "ایک
سوال قومی تنظیموں اور بین الاقوامی سیاسی اداروں کے پس منظر میں کیوں پوچھتے ہیں؟ ہماری
تنظیم ایک باضمیر تنظیم ہے۔ ہمارا اپنا ایک معیار و مقام ہے ہماری تنظیم کا اور دوسری تنظیموں کا
کیا مقابلہ؟ آپ ہمیں ڈی گریڈ کرنے کی کوشش مت کیجئے۔ اب آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں
دیا جائے گا۔ ہم نے مزید ایک آدھ سوال کرنے کی کوشش کی تو ان کی باڈی گارڈ بولی: "دیکھئے
اگر اور کوئی سوال پوچھا آپ نے تو پھر یاد رکھئے! ہم لوگ جملہ دو درجن یا پھر دو درجن کے قریب ہیں
اور ہماری عددی قوت۔ ہماری بہترین تنظیمی صلاحیت کے خلاف اسے چیلنج سمجھا جائے گا۔ اور اس
چیلنج کا جواب اس طرح دیا جائے گا کہ آپ کے کپڑے پھاڑ ڈالے جائیں گے۔ آپ کے چہرے کو
خوبصورت تراشیدہ ناخنوں سے خراش دار بلکہ خارش دار کر دیا جائے گا۔ آپ کو مجنوں بنا کر
دیگر دفتر (گھر) سے نکال دیا جائے گا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ دو بڑی عالمی طاقتوں کے ایجنٹ
ہیں۔ جن کی خفیہ تنظیمیں گھر گھر پھوٹ ڈالنے اور بلیک میل کرنے میں مصروف ہیں۔" ہم وہاں سے
نکال دیئے گئے۔ مطلب یہ کہ دروازہ کا ایک پٹ کھول کر ہمارے سر کی جڑ میں ہاتھ دے کر ایسی
طاقت سے باہر ڈھکیلا گیا کہ ہم قلا بازی کھا کر سر کے بل سڑک پر جا پڑے۔ وہاں سے ہم نے ان کے
والد بزرگوار کے دفتر کا رُخ کیا۔ یہ بیچارے ایک سرکاری محکمہ کے اپر ڈویژن کلرک ہیں۔ ہم نے
جب ان کی نشست کی جانب قدم بڑھایا تو ایسا محسوس ہوا گویا کسی آدم زاد کو فائلوں کی دیوار میں
چنا جا رہا ہو۔ جناب ممدوح کی چاروں طرف فائلوں کا ڈھیر تھا۔ اور یہ ان فائلوں کے درمیان
سمٹے بیٹھے تھے گویا ہاتھ پاؤں پھیلاتے ہی کوئی فائل ہاتھ پیر کو جھٹک یا چمٹ جائے گی۔ ہماری آمد
پر اُنہوں نے ہماری طرف نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا بلکہ ہماری آہٹ کو کسی خیالی مچھر کی بھنبھناہٹ
سمجھ کر کان کے قریب قلم کو گھمایا اور پھر سامنے رکھی ہوئی فائل میں غرق ہو گئے۔ ہم نے پہلا اشارہ
بے اثر ہونے پر ان کی توجہ کے لئے احتجاجی انداز میں کھنکھارنا بلکہ ہنہنانا مناسب سمجھا۔ ہنہناہٹ
سن کر موصوف نے غیر ارادی طور پر میز کی دراز کھینچی جس میں ریس کے گھوڑوں کا حسب نسب لکھا
رکھا تھا۔ پھر ہماری طرف نظر اُٹھا کر ہمارے سراپے کا جائزہ اس طرح لیا گویا ہمارے وجود کی
تلاش کر رہے ہوں۔ پھر چونک کر بولے "اوہ! آپ؟ آئیے۔ آئیے۔ میں تو سمجھا کوئی گھوڑا۔ اوہ
خیر... جانے دیجئے۔" ہم نے جواب دیا "جی گھوڑا نہیں گدھا حاضر ہے۔ حکم دیجئے" بولے "یار
مذاق چھوڑو۔ بڑی مدت کے بعد آئے ہو۔ بولو کیسے آ گئے؟"

ہم نے کہا "وہ آپ کی لڑکیوں کی یونین کی آج کل شہر میں دھوم مچی ہوئی ہے۔ اس سلسلے
میں اخبار "دو کوڑی" کے لئے انٹرویو لینے آیا تھا" "یار وہ یوز نہیں کروں گا۔ جیسی ایک آدھ سوال
پوچھئے۔" "اب تم بھی بدنام کرو گے۔ شہر والوں نے، محلے والوں نے، اخبار والوں نے سب نے
کر رکھا ہے۔ بلکہ ملک کی ایک بڑی سیاسی جماعت کا تو خیال ہے کہ ان یونین کے [illegible]

ملک کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہوگیا ہے۔ اسے فوراً تحلیل کر دینا چاہیئے۔ اور اس کے تمام ممبروں کی
شادی بڈھے شیوخ سے کردینی چاہیئے تاکہ یہ خطرہ بیرون ملک منتقل ہو جائے۔ کیوں کہ یہ انھیں
ممالک کی کوئی گہری سازش ہے۔" ہم نے انھیں اس موضوع پر گفتگو کرنے پر آمادہ پاکر پہلا سوال
کیا "کیا آپ اس مشہور زمانہ تنظیم کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈال سکیں گے؟" انھوں نے جواب
دیا "جی! اس تنظیم کے اغراض و مقاصد وہی ہیں جو کسی بھی دوسری تنظیم کے ہوسکتے ہیں۔ مثلاً اپنے
حقوق کی حفاظت و تحفظ وغیرہ" ہم نے کہا "حقوق سے آپ کی کیا مراد ہے؟" "مثلاً یہ کہ لڑکیوں کی صحیح
پرورش، ان کی تعلیم و تربیت۔ شادی کے سلسلے میں ان کی اپنی رائے، اظہار خیال کی آزادی۔ ان
کے دیگر مفادات کا تحفظ وغیرہ" ہمارا اگلا سوال تھا "کیا انھیں یہ سب چیزیں تنظیم کے قیام سے قبل
حاصل نہیں تھیں؟" جواب تھا "حاصل تو تھیں۔ مگر ان کی ثانوی حیثیت تھی اب ان کی حیثیت
اولی ہو گئی ہے۔" "اس تنظیم کے قیام سے امور خانہ کی پیش رفت میں کوئی رکاوٹ تو نہیں
واقع ہوئی؟" یہ ہمارا غالباً آخری سوال تھا۔ جس کے جواب میں انھوں نے فرمایا "اکثر رکاوٹ
ہو جاتی ہے۔ حال ہی میں جب ہم عید کی شاپنگ کے لئے مارکٹ گئے تو اس تنظیم کے ارکان
میں کپڑے کے رنگوں اور اس سے میچ کرتی ہوئی لپ اسٹک کے انتخاب میں اختلاف رائے ہوگیا
تین دن تک کوئی قطعی فیصلہ نہ ہو سکا۔ چوتھے دن ہماری بیگم نے سنڈل جاری کر دیا۔ اس پر
بڑا ہنگامہ ہوا۔ تحریک عدم اعتماد پاس ہوئی اور بیگم کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا گھر میں آج کل
انارکی، نراج ہے۔ میں نے عارضی طور پر گھر کے معاملات کی باگ ڈور سنبھال لی ہے۔ کرفیو کا نفاذ
ہے دو سے زائد افراد کے اجتماع پر پابندی ہے۔ مگر یہ لوگ چھپ چھپ کر گھر سے باہر اسکولوں
اور کالجوں میں ہم دونوں کے خلاف مشورے کر رہے ہیں۔ ہمارے جاسوس چاروں طرف
پھیلے ہوئے ہیں! ہمیں ان کی ہر ہر حرکت کی رپورٹ ملتی رہتی ہے۔ خدا جانے آئندہ کیا ہو!" اس
کا مطلب ہے کہ گھر میں بدامنی کی ذمہ دار ہے یہ یونین؟" ہم نے لقمہ دیا۔ "کسی حد تک ایسا بھی ہے
اور کسی حد تک یہ کیفیت ہماری بیگم اور یونین کے مفادات میں تصادم کی وجہ سے بھی ہے۔" ہم موصوف
سے اور سوالات پوچھنا چاہتے تھے کہ فوراً ان کا سپرنٹنڈنٹ دندناتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور
فائلوں کی دیوار کے پیچھے گم ہو گیا۔ موصوف بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور وہ ان ہی فائلوں کی دیوار
کے پیچھے غائب ہو گئے۔ ۵ منٹ، ۱۰ منٹ ہو گئے۔ دونوں کے اس پراسرار انداز میں فائلوں
کے پیچھے غائب ہو جانے پر ہمارے ذہن میں شکوک وشبہات کروٹ لینے لگے۔ پھر سکۂ ہند کے
کڑکڑانے کی آواز آئی۔ پھر سرگوشی میں پوچھا گیا "کیا یہ آدمی ہی مال (رشوت کی رقم) لایا تھا؟"
بتلا دیا گیا (جو یقیناً ہمارے رشتہ دار صاحب کی آواز میں ہی تھا) "جی ہاں یہی آدمی مال لایا ہے گوپال صاحب نے کہلا بھیجا ہے کہ وہ
پانچ سو سے زیادہ فراہم نہیں کرسکتے۔ میں نے پورا مال آپ کے حوالے کر دیا ہے۔ آپ اگر مناسب سمجھیں تو میرا حصہ اور میرے اس آدمی کے
چائے پانی کے خرچے کا لحاظ کریں۔" پھر نوٹوں کی کھڑکھڑاہٹ۔ پھر دوسری آواز "یہ لو تمہارا حصہ۔ اور یہ رہا تمہارے چائے
پانی کا خرچہ" ہم نے اللہ کی شان [illegible] وہاں سے گرتے پڑتے ریس کے گھوڑے کی رفتار سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

انیس احمد خاں (نئی دہلی)

★

خاموش
سرکار کام کر رہی ہے

میں ایک غریب آدمی ہوں۔ غریب تو پورا ہندوستان ہے لیکن میرے ساتھ مشکل یہ ہے کہ غریب ہونے کے ساتھ ساتھ شریف بھی ہوں۔ اسی شرافت کی بدولت آج کل میرا پورا جسم پکے ہوئے پھوڑے کی طرح دکھ رہا ہے۔ ایک ایک عضو سے درد کی لہریں اٹھ رہی ہیں حالت یہ ہے کہ اگر جسم کے کسی حصے کو ہوا کا جھونکا بھی چھو کر گزر جاتا ہے تو دانتوں کی بتیسی زبان کی خیریت پوچھنے لگتی ہے اور مجھے اللہ میاں معہ تمام فرشتوں کے یاد آجاتے ہیں۔ کسی زمانے میں شرافت بازار میں کوڑیوں کے مول بکا کرتی تھی اس لئے میرے ماں باپ نے بچپن میں مجھ میں شرافت کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔ پر آج یہ کس کام کی؟ اس بے کار شے کا فائدہ پچھلے ہفتے مجھے پیٹنے والوں نے جی بھر کر اٹھایا

ہوا یوں کہ اچانک سرکاری راشن کی دکان پر راشن آگیا وہ دکان جو مہینوں سے اپنے چور دروازے کا استعمال کر رہی تھی یکایک صدر دروازے کی طرف سے کھل گئی۔ خلاف توقع بات تھی پورے محلے میں کھلبلی مچ گئی۔ میں نے بھی اپنے تمام کام چھوڑ کر راشن کا تھیلا اٹھایا اور شیطان کی آنت کی طرح لمبی قطار میں لگ گیا۔ پھر یہ کرشمہ بھی ہوا کہ مجھے راشن مل گیا۔ ویسے میں گھر سے اپنے پاؤں میں دو چپلیں پہن کر چلا تھا لیکن راشن کا نمبر آنے تک ایک ہی چپل رہ گئی۔ بھیڑ بھاڑ میں ایک چپل داغِ مفارقت دے گئی تھی۔ اس کے باوجود مجھ پر راشن کے محاذ پر جیت جانے کا نشہ طاری تھا۔ چپل تو دوسری مل جائے گی اس کے لئے راشن کی ضرورت نہیں پڑتی۔ راشن کے لئے کب ہر روز قسمت یاوری کرتی ہے۔ میری خوشی کا [illegible] تھا جب کہ خوشۂ گندم تک پہنچتے پہنچتے میرے پورے وجود کا ادھ بانکپن ہو چکا تھا۔ [illegible] پھٹے کرتے میں اکلوتی چپل باقی تھی۔ قمیص کے تمام بٹن غائب تھے چہرے پر گرد کی تہیں جمی ہوئی تھیں بال بکھرے تھے لیکن سر پر فتح [illegible] کا نشہ چڑھ چکا تھا۔ ان باتوں کی کسے پرواہ تھی اب [illegible]

گھونٹ سے بھرا تھیلا تھا اور مجھے گھر پہونچنے کی جلدی تھی۔ لیکن ابھی گھر بہت دور تھا۔
میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ میں شریف آدمی ہوں۔ اس لئے اخبار پڑوسیوں سے مانگ کے پڑھنے کے بجائے خریدتا ہوں۔ میں تو بس ہر ماہ اخبار والے کا بل ادا کرنے کا گنہگار رہتا ہوں۔ خدا نے مجھے اخبار بینی کی توفیق سے محروم ہی رکھا ہے لہٰذا مجھے کیا معلوم تھا کہ لانگ روٹ پر کوئی بڑا آدمی گزرنے والا ہے۔ پولیس کا زبردست بندوبست تھا۔ کبھی بڑا آدمی گزرنے والا تھا اس لئے وہ ہر چھوٹے آدمی کو شک کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ بعض کا خاندانی شجرہ پوچھا جا رہا تھا اور بعض کی جامہ تلاشی لی جا رہی تھی۔ میں ابھی آدھے راستے میں تھا کہ میں نے دیکھا کہ ایک پولیس والے نے ایک دیہاتی نو بیاہتا جوڑے کو پکڑ رکھا ہے۔ ان کے ساتھ ایک بوڑھا آدمی بھی تھا۔ یہ کسی بھی پہلو سے غیر شریف نہیں لگ رہے تھے۔ شاید اسی لئے پولیس والا ان سے بازپرس کر رہا تھا۔ پولیس والے نے دھاڑ کر لڑکی سے پوچھا۔ "اے لڑکی چپکے چپکے کن لوگوں کے ساتھ بھاگی جا رہی ہے؟"
"سرکار! میں اپنے سسر اور گھر والے کے ساتھ گاؤں جا رہی ہوں؟" لڑکی نے کچھ کانپتے اور لجاتے ہوئے جواب دیا۔
"سرکار" کا لفظ سنتے ہی پولیس والے کا رہا سہا دماغ بھی غائب ہو گیا۔ اس نے لڑکے کی آنکھوں کے سامنے اپنا موٹا ڈنڈا لہراتے ہوئے کہا۔ "ابے .... یہ کون ہیں تیرے؟"
"حضور — یہ میری گھر والی ہے اور یہ میرا باپ"۔
ایک اور پولیس والے نے آگے آکر بوڑھے کی طرف اشارہ کیا۔
"ارے او بڈھو! کیا یہ دونوں سچ کہہ رہے ہیں؟"
"مالک ٹھیک ہی تو ہے یہ میرا بیٹا ہے اور یہ میری بہو ہے"۔ بوڑھا گڑگڑایا تیسرا پولیس والا جو شاید تھانیدار تھا اور ابھی تک خاموش تھا یکایک چیخا
"سالو — پولیس والا سمجھ کر بے وقوف بناتے ہو۔ ارے او جوانو! تینوں سالوں کو تھانے لے چلو۔ دیکھا تم نے — ان تینوں کے بیان آپس میں کتنے الگ الگ ہیں۔
ان تینوں کو دھکیل کر کنارے کھڑے میونسپلٹی کی کتا گاڑی میں بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد ان کی نظر میرے مشتبہ حلیئے پر پڑی۔ میں ابھی ماحول کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ میری طرف جھپٹے اور مجھے گھیر لیا۔
"ابے۔ تلاشی دے" ایک گرج کر بولا۔
"جی۔ جی۔ جی — وہ میرے پاس .... کچھ نہیں ہے" میں نے جان سے بھی پیارا راشن کا تھیلا پیچھے سے لٹکا کر کہا۔
دوسرا دھاڑا "کچھ نہیں ہے تو یہ اپنے سینے سے کیا چپکائے ہوئے ہے"
"جی .... جی .... اے .... کچھ نہیں" میں نے اور زیادہ گھبرا کر کہا۔

تیسرے نے کڑک کر کہا "ابے کچھ نہیں کے باپ کھول کر دکھا اس میں کیا ہے"؟ میری مشکل یہ تھی کہ اگر انھوں نے راشن کا تھیلا کھلوالیا تو اس میں فقط ڈھائی کلو گیہوں دیکھ کر مجھ جیسے شریف آدمی کی عزت خاک میں مل جائے گی۔ پھر یہ پولیس والے ہیں ان کا کیا بھروسہ۔ من چل گیا تو کہیں راشن کا تھیلا ہی نہ دھروالیں۔ شریف آدمی کو اپنی عزت پیاری ہوتی ہے اور غریب آدمی کو اپنا راشن۔ یہاں تو میں دونوں کی نمائندگی کر رہا تھا۔ میری دونوں ہی چیزیں داؤں پر لگی ہوئی تھیں۔ تحفظِ عزت و راشن کی خاطر میں نے ان کے نرغے سے نکل کر بھاگنا چاہا کہ اس وقت چوتھے پولیس مین نے جو پوری گفتگو کے دوران محویت سے بیڑی پھونک رہا تھا راشن کے تھیلے کو جھپٹ لیا۔ اور اسے کھول کر چاروں نے ایک ساتھ جھانکا پھر چاروں میری طرف معنی خیز انداز میں دیکھتے ہوئے بولے "اچھا بیٹا! تو یہ بات ہے۔ راشن کے بہانے پتھراؤ کرنے کے لئے آیا تھا"

"پتھر ۔۔۔ ؟؟؟" میں نے بھی تھیلے میں جھانکا۔ واقعی تھیلے میں گیہوں کم اور کنکر پتھر زیادہ تھے ۔۔۔ "لیکن .... لیکن میں تو یہ گیہوں راشن کی سرکاری دکان سے لایا ہوں"۔ میں نے راشن کارڈ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ابھی پتہ چل جائے گا سالے" پیچھے کھڑے پولیس والے کی آواز میرے کانوں میں آئی اور اس کے ساتھ ہی ایک بھرپور لات میری کمر پر پڑی۔

پولیس والے کچھ زیادہ ہی مستی میں آئے ہوئے تھے۔ وہ مجھے کسی پیر کے چڑھاوے کی طرح نثار کردہ گھونسوں اور لاتوں کے نذرانے پیش کر رہے تھے۔ میں انھیں قبول کرنے کے علاوہ کر بھی کیا سکتا تھا۔

تماشائیوں کی اچھی خاصی بھیڑ لگ گئی تھی اور میں ان تماشائیوں کے درمیان پولیس کے ہاتھوں میں فٹ بال بنا ہوا تھا پولیس کے معاملے میں مداخلت کی جرأت کسی میں نہیں تھی۔ آخر کہیں سے آواز آئی ۔۔ "آپ لوگ یہ کیا کر رہے ہیں"؟

ایک لمحے کو تماشہ رکا اور ایک پولیس والے نے جواب دیا ۔ سبق سکھلا رہے ہیں۔ پھر ایک ٹھونسہ۔

"یہ سراسر ظلم ہے ۔۔" احتجاج کی ایک اور آواز اٹھی "خاموش"! تھانیدار چلایا۔۔ "حرام زادوں کو کسی طرح چین نہیں ہے۔ ہر کام میں میں میخ نکالتے ہیں۔ دیکھتے نہیں سرکار کام کر رہی ہے"

اور وہ چاروں پولیس والے پھر فٹ بال سے کھیلنے لگے!

مجھے نہیں معلوم یہ کھیل کب تک جاری رہا۔ اور فیصلہ کس ٹیم کے حق میں ہوا۔ میری آنکھ تو اسپتال میں جا کر کھلی جہاں مجھے یہ مژدہ جاں فزا سنایا گیا کہ پولیس مزاحمت کے الزام میں مجھ پر مقدمہ قائم کر دیا گیا ہے۔

★★

اقبال شانہ

نان اسٹاپ

رات میرے شہر کے اک کلچرل اسٹیج پر
ہو رہے تھے مائیک پر کوئی صاحب چیخ کر
میں نے پوچھا کیا کوئی پاگل ہے دیوانہ ہے یہ
لوگ بولے جی نہیں موصوف کا گانا ہے یہ
جان میں جان آگئی پورا دہ جب گانا ہوا
میں نے لمبی سانس لی کہ ختم تن دانا ہوا
ہال میں موجود لوگوں نے مچایا پھر یہ شور
"ٹاپ، سنگر ونس مور" "ٹاپ سنگر ونس مور"
لوگ بولے آپ "نان اسٹاپ" گاتے جائیے
فن موسیقی دکھانا ہے دکھاتے جائیے
حکم لوگوں کا بہر صورت بجا لاتے رہے
ایک گانا دیر تک استاد جی گاتے رہے
تنگ آکر آگیا "کنوینیئر" اسٹیج پر
اور بولا ہیں ابھی فنکار باقی بیشتر
ان گلوکاروں کو بھی موقعہ عنایت کیجئے
آپ چھوٹے "سنگروں" کو بھی ذرا سن لیجئے
کھلبلی سی مچ گئی لوگوں میں اس اعلان سے
اور اک آواز ہو کر چیخ کر کہنے لگے
جب تلک سیدھی طرح گانا نہیں گائے گا یہ
ہم نہیں چھوڑیں گے سالے کو کہاں جائے گا یہ

یوسف یکتا

غزل

سر ہے سجدہ میں دل کمائی میں
بندگی بندگی کہاں ہے میاں
سو کی بتی کا بلب بھی ڈم ہے
روشنی روشنی کہاں ہے میاں
بیٹھے بیٹھے ہی ہو گئے مرحوم
زندگی زندگی کہاں ہے میاں
ساٹھ پر پانچ ہو گیا تیور
رخ پہ اب تازگی کہاں ہے میاں
بات یکتا کی ہے بڑی معقول
آدمی آدمی کہاں ہے میاں

مناظر الرحمٰن
★
(سنگھ بھوم بہار)

قصہ میری دُکانداری کا

بازار میں میں نے ایک دکان کھولی تھی۔ کپڑے کی دُکان۔ جس میں روزآنہ تو کیا ہفتے میں دو چار گاہک آجاتے تھے، وہ بھی جو ادھار لیا کرتے تھے۔ ان سے رشتہ داری بھی قائم تھی۔ جو شاید دادا مرحوم کے زمانے سے چلی آرہی تھی۔ وہ لوگ وقت بے وقت آنسو بہانے چلے آتے تھے ساتھ میں کوئی دُکھ بھری داستان لانا نہیں بھولتے تھے۔ میں بھی ان کے دُکھ درد میں شریک ہوتا گر خدا جھوٹ نہ بلوائے یہ سب حضرات قرض ادا کرنے سے ہمیشہ کتراتے اور دور بھاگتے جیسے شیطان لاحول سے ۔ کچھ گاہک تو اس قسم کے تھے جو سال میں صرف ایک بار صورت کا دیدار کراتے اور وہ بھی معذرت کے رٹے رٹائے جملوں اور فقروں کے ساتھ۔

سال بھر کے اندر میرا دیوالیہ نکل گیا۔ مالک مکان کو ایک الماری۔ دو کرسی۔ اور سو روپے کے کپڑے دے کر دکان خالی کر دی۔ میں تو اس بزنس سے تنگ آگیا تھا مگر بزرگوں کی امانت تھی اس لئے کاندھوں پہ لئے پھر رہا تھا۔ بزرگوں کا قول تھا کہ اسی دکان سے ایک بڑے خاندان کی پرورش ہوئی ہے دادا مرحوم نے حج کیا، تین چچا اور پانچ پھوپھی کی شادی کا بار اٹھایا۔ اس لئے آج نہیں تو کل یہ دکان ضرور منافع بخش ثابت ہوگا۔ ساتھ ہی دادا مرحوم اور والد صاحب کے قلمی نسخے اور طغرے جا بجا دکان میں چسپاں تھے۔ کہیں درج تھا "ہمت مرداں مدد خدا"۔ "دولت انسان کو شیطان بنا دیتی ہے"۔ کہیں لکھا تھا "خدا ہر بشر کو رزق دیتا ہے"۔ "آرام حرام ہے"۔ "نا امیدی کفر ہے" قسم کے سیکڑوں اقوال زریں سے ہمت بندھتی، ورنہ کبھی کا چھوڑ چھاڑ کر بھاگ کھڑا ہوتا۔

ان سب باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک کم کرایہ کی دکان کی تلاش کی جو رہائشی مکانات کے درمیان تھی۔ یوں تو دکان کمپرسی کی تھی مگر کام کے لائق تھی اس لئے بغیر حیل و حجت اور پگڑی کے

کچھ روز تو دکان خوب چلی، رہائشی مکانات کے درمیان ہونے کے سبب عورتیں خود اپنی پسند کے کپڑے خریدنے میں آسانی محسوس کرتیں۔ پردے والیوں کی بھی چہل پہل رہنے لگی۔

عورتوں اور لڑکیوں کی چہل پہل اور آمد و رفت نے چند منچلے نوجوانوں کو بھی متوجہ کیا۔ اب وہ بھی خواہ مخواہ خریداری کے بہانے گھنٹوں دکان میں ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ لڑکیوں کے پیچھے پیچھے آتے اور ان کے پیچھے چلے جاتے۔ اُن کی دیکھا دیکھی آوارہ پھرنے والے نے بھی جگھٹا لگانا شروع کیا۔ خرافات میں مذاکرہ اور مشاعرے کا دور چلنے لگا، داد دینے کے لئے خوفناک اور ڈراؤنی شکل کے معزز حضرات بھی آنے لگے۔ جن کی صورت دیکھ کر دل گردے والے بھی خوف کھاتے تھے۔ صبح سے شام تک محفل جمتی، چائے، ناشتہ میرے ذمہ تھا۔ کیوں کہ خدشہ تھا کہ اگر خاطر مدارات میں کمی کردی تو دوسرے دن دکان میں جھاڑو مارنے کی نوبت آجائے گی۔

اچانک عورتوں کی آمد و رفت میں حیرت انگیز طور پر کمی آگئی۔ کئی ایک نے راستہ بدل دیا۔ پڑوسی الگ ناراض رہنے لگے "صاحب آپ کی دکان کی وجہ سے نہ جانے کہاں کہاں سے بدمعاش لفنگے آوارہ لوگ آنے لگے ہیں۔ ہماری بہو بیٹیوں کا چلنا دوبھر ہوگیا ــــ۔ آپ ان لوگوں کا آنا جانا بند کریں یا اپنی دکان . . . " میں حیران اور پریشان کہ "سمندر میں رہ کر مگر مچھ سے بیر کس طرح مول لوں" اسی پس و پیش میں تھا کہ ایک روز پولیس کا چھاپہ پڑا۔ چھاپہ میں کئی بدمعاش ہاتھ آئے باقی بھاگنے میں کامیاب رہے۔ مجھے بھی تھانہ جانا پڑا وہاں اپنی بے کسی اور مجبوری کا رونا رویا، داروغہ جی کو شاید میری باتوں یا داڑھی پر رحم آگیا اور سو روپئے نذرانے کے وصول کر کے رخصت کر دیا۔

دو روز تک دکان نہ جا سکا۔ تیسرے روز جب طبیعت میں میلان اور دل کو ڈھارس بندھی تو دکان کھولا۔ اڑوس پڑوس کی خواتین تعزیت کے لئے آنے لگیں۔ "آپ کی جیل جانے کی خبر سن کر بہت افسوس ہوا" کسی نے کہا "بھیا آج کل تو کینوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے" ایک بوڑھی اماں شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی "بیٹا کہیں زیادہ چوٹ وغیرہ تو نہیں آئی؟ سنا ہے جیل میں بہت مار پڑتی ہے؟" میں سب کے طعنے مہنے برداشت کرتا رہا۔

میرا گرفتار ہونا بھی، سے زیادہ بستی کی عورتوں خصوصاً بڈھیوں کے لئے ایک ناگہانی حادثہ تھا اس لئے انھیں جب بھی فرصت ملتی ہمدردی کے بول بولنے چلی آتی۔ میں بھی اُن کی تھوڑی تسلی میں اپنا کھلا دیتا جس کی وجہ سے چند بوڑھی عورتیں دکان کے آمنے سامنے منڈلانے لگیں خریدتی تو کچھ نہ تھیں مگر ہر کپڑے میں نقص ضرور نکالتی تھیں۔ "سوایہ ٹھیک کپڑا نہیں ہے" "اس کپڑے کا رنگ اتر جائے گا"، "فلاں کپڑا ردی ہے"، "یہ بہت مہنگا ہے" "ہمارے زمانے میں چار پیسے میں تھوڑا اچھا تھان ملتا تھا"

پھر میری شرافت کاروبار میں آڑے آنے لگی۔ عموماً بچے آتے اور کہتے "چاچا چاچا، آنے پیسے

بچے بڑی بلا ہے۔ بچی کہہ رہی ہیں پاپا آنے پر لوٹا دیں گی۔" عورتیں خریداری کرتی تھیں اس لیے
ان کے وعدے پر بیچے جا رہے تھے۔ ہر ماہ قرض ادا ہونے کی آس باندھتا۔ مگر میرا پیسہ وصول
نہیں ہوا۔

ایک روز میں دکان بند کر کے دوسرے کاروبار شروع کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا
کہ جاوید صاحب تشریف لائے اور پوچھا "کیا حال چال ہے؟"

"ٹھیک ہی ہے" میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"واقعی میاں۔ بیٹھے بیٹھے بور ہو جاتے ہوں گے۔ کچھ دل بہلانے کی چیز نہیں ہے؟"

میں چونکا۔ پتہ نہیں کس طرف اشارہ ہے۔ "جی میں سمجھا نہیں"۔

اماں یار۔ یعنی کہ کھیلنے کے لئے کیرم بورڈ، شطرنج وغیرہ۔ کھیلنے دیکھنے کے بہانے لوگ
جمع ہو جائیں گے۔ اور دکان کے کاروبار چمک جائیں گے۔

میں ٹھہرا نرا بے وقوف، دوست کے بہکاوے میں آ گیا۔

پھر میرے بغیر اقرار یا انکار کے وہ شطرنج لانے چلے گئے۔ چند منٹ بعد بغل میں شطرنج دبائے
گنگناتے ہوئے وارد ہوئے۔ "چلو ایک بازی ہو جائے"۔ بساط بچھائی گئی۔ کھیل شروع ہوا۔ کھیل
شروع ہونے سے قبل ہی طے ہو گیا کہ بازی ہارنے والا چائے پلائے گا۔ پہلی بازی میں ہار گیا۔ دوسری
بازی شروع ہوتے ہی ایک گاہک چلا آیا۔ میں اٹھنے ہی والا تھا کہ جاوید پوچھ بیٹھا "کیا چاہئے؟"

سفید لٹھا۔

"وہ تو نہیں ہے" مانو وہی دکاندار ہے۔ گاہک واپس چلا گیا تو کہنے لگا "اماں یار یہ سب
خریدنے وریدنے نہیں آتے۔ صرف دوسروں کا وقت برباد کرتے ہیں۔ میں تو چہرہ دیکھ کر بتا دوں گا
کہ کون خریدنے آیا ہے اور کون نہیں"۔ میں سر ہلا کر رہ گیا اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ گھوڑے کو
آگے ڈھائی چال دی جس سے اونٹ کو خطرہ لاحق ہوا۔ دوسری چال میں اونٹ کو بچایا تو وزیر
بے چارہ ختم ہو گیا اور یہ بھی بازی ہار گیا۔

شطرنج کی بازی روز جمنے لگی۔ دیکھنے والوں کا اضافہ ہوتا رہا۔ صحیح غلط مشورہ دیتے اور چائے
پان میں حصہ لیتے۔ ایک روز سلیم نے یہ خیال ظاہر کیا "یہ کیا فضول کھیل ہے، صرف دو کھلاڑی باقی الو کی
مانند دیکھیں، وقت بھی بہت برباد ہوتا ہے، اس سے اچھا تو تاش کا کھیل ہے۔ وہاں کھڑے تماشائیوں
نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ اور اسی وقت شطرنج کو لپیٹ کر جاوید کے ہاتھوں میں دے دی گئی، اور
تاش کی بازی لگی۔ اس میں بھی چائے کے ساتھ ناشتہ کا اضافہ ہوا۔ دو چار خریدار آتے تو
[illegible] کر اٹھنے سے مزہ کرکرا ہوتا۔

لیکن اس چائے ناشتے سے بھی دوست یار جلد ہی اکتا گئے۔ اور پتہ نہیں کس نا ہنجار نے جوا
کھیلنے کی ترغیب دی۔ ان کا منطق یہ تھا کہ ناشتے میں پیسے تو خرچ ہوتا ہی ہے [illegible]

سرلا جشنے ۔میں چیختا چلاتا رہ گیا مگر میری کمزور آواز ان لوگوں کے کرخت دار آواز میں دب گئی. اس لئے میں خفا ہوکر اوٹ کر کے اپنی کرسی پہ بیٹھ گیا. وہ لوگ فرش پر بیٹھے لمبی لمبی بازی لگانے لگے روز تو میں ملیہ ہونے لگا. پھر پڑوسیوں کو شکایت ہونے لگی. میں سوچ ہی رہا تھا کہ دکان خالی کرا لوں کہ ایک روز پھر پولیس کا چھاپہ پڑا کئی جواری رنگے ہاتھ گرفتار ہوئے۔ مجھے بھی گھسیٹ کر جیپ پر سوار کیا گیا۔ میں چیختا چلاتا رہا۔ لیکن ان پانچ شریفوں کے ساتھ مجھے بھی جیل بھیج دیا گیا۔

چھ مہینے کی قید با مشقت سزا کاٹنے کے بعد جب رہا ہوا تو سیدھے دکان کی جانب چلا کیوں کہ گھر میں میرے لئے جگہ نہ تھی۔ دکان پہنچا۔ دکان کو پہچان ہی نہ سکا. آنکھیں مل مل کر دیکھا۔ تو حجام کی دکان نظر آئی بورڈ پڑھا تو لکھا تھا "ہرفن مولا ہیر کٹنگ سیلون" مالک مکان سے پوچھا کیا ہے؟ جواب ملا بیٹے تم نے تو آٹھ مہینے سے کرایہ دیا نہیں تھا. تمہارے ذمہ پانچسو ساٹھ روپے نکلتا تھا۔ اس لئے دکان کے تمام کپڑے اور فرنیچر اونے پونے فروخت کر دیا جس سے ۵۳۰ روپے ملے۔ باقی تیس روپے کب دو گے؟

{ روزنامہ جسارت کراچی کے کالم سے انتخاب }

سُخن در سُخن

نیا افسانہ علامت کی تجرید اور تجریدیت کی علامت ہے!

خامہ بگوش

ہمارے ایک کرم فرما ایم اے (اردو) کے امتحان کی تیاری کر رہے تھے۔ اُنھوں نے ہم سے فرمائش کی کہ اصناف ادب کے بارے میں ایک ایسا نوٹ لکھ دیا جائے جو امتحانی نقطۂ نظر سے مفید ہو۔ ہمیں ڈاکٹر عبادت بریلوی اور پروفیسر مجتبیٰ حسین کی طرح نصابی تنقید لکھنے کا تجربہ نہیں ہے تاہم ہم نے اردو ادب کی تمام تر مروّجہ اصناف کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اگر ہماری اس کوشش کو پسند کیا گیا تو ہم اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھنے کی کوشش بھی کریں گے۔

غزل: غزل ایک ایسی صنفِ سخن ہے جس میں ہر وہ شخص طبع آزمائی کر سکتا ہے جو افتادِ طبع کے اعتبار سے افتادہ طبع ہو یعنی اس کے پاس وقت لا محدود، ذخیرۂ الفاظ محدود اور ذخیرۂ خیالات محدود تر ہو۔ ہر کام انجام دینے کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ کام انجام دینے والا ضروری صلاحیت رکھتا ہو۔ لیکن غزل کا کام انجام دینے یا تمام کرنے کے لئے اس قسم کی کسی شرط کو پورا کرنا ضروری نہیں ہے۔ ہر وہ شخص آسانی غزل کہہ سکتا ہے جو غزل کہنے کی خواہش رکھتا ہو۔ پُرانے شاعروں نے اس صنف میں اتنا سرمایہ چھوڑا ہے کہ نئے شاعر بغیر کسی دِقت کے بہت کم وقت میں صاحبِ دیوان بن سکتے ہیں۔ پُرانی غزل کو سامنے رکھ کر نئی غزل، نئی غزل کو سامنے رکھ کر جدید غزل اور جدید غزل کو سامنے رکھ کر جدید تر غزل کہنا اتنا ہی آسان ہے جتنا الیکٹرونک کیمرے سے تصویر کھینچنا۔ تصویر کھینچنے والے کو صرف بٹن دبانا پڑتا ہے، غزل کہنے والے کو اتنی محنت بھی نہیں کرنی پڑتی۔ غزل گوشاعروں کی بہت سی قسمیں ہیں، ان میں سے دو اہم ہیں۔ ایک قسم مشاعروں میں پیدا ہوتی ہے اور وہیں کام آ جاتی

[illegible] کے ذریعہ منظر عام پر آتی ہے نقادوں کے ذریعہ پروان چڑھتی ہے اور وقت کے ہاتھوں [illegible] نیاں بن جاتی ہے۔

جس طرح غزل گوئی آسان ہے اسی طرح غزل کی تنقید بھی کافی آسان ہے اگر یقین نہ آئے تو وہ مضامین پڑھئے جو ایک مدرس نقاد نے اس ستم رسیدہ صنف کے بارے میں پے در پے لکھے ہیں۔ اس سلسلے کی آخری کڑی وہ مضمون ہے جو پچھلے دنوں اکیڈیمی آف لیٹرز کے سالانہ اجلاس میں پڑھا گیا تھا اور جس کے نتیجے میں نقاد کو اکیڈمی کی طرف سے تاریخ خواست اجلاس جسمانی تحفظ فراہم کیا گیا تھا۔

افسانہ: غزل کی طرح افسانہ بھی ان لوگوں کا محبوب مشغلہ ہے جنہیں لکھنے کیلئے سوائے کاغذ اور قلم کے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی۔ پرانے زمانے میں افسانے کے لئے بنیادی شرط یہ تھی کہ اس میں کوئی کہانی بیان کی گئی ہو۔ اب افسانہ نگار اور تو سب کچھ بیان کر دیتا ہے، کہانی سے اجتناب کرتا ہے۔ [illegible] صورت حال کے نتیجے میں، تجریدی اور علامتی افسانہ وجود میں آیا جسے علامتی افسانہ بھی کہا جاتا ہے۔ آج کل جو افسانہ لکھا جا رہا ہے وہ بیک وقت علامت کی تجرید اور تجریدیت کی علامت ہے۔ اسی لئے افسانہ لکھنے والا خود بھی اس سے دیسی پیمانے پر محظوظ ہوتا رہتا ہے۔ آج کل کے بعض افسانے نثری نظم کا روپ دھار لیتے ہیں جن کی ہر سطر دوسری سطر سے بے تعلق اور ہر لفظ اپنے دائیں بائیں کے الفاظ سے کشیدہ خاطر نظر آتا ہے۔

ناول: ناول ایک ایسی صنف ادب ہے جسے عموماً عورتوں کے نام سے مرد لکھتے ہیں اور عورتوں سے زیادہ مرد ہی پڑھتے ہیں۔ مرد اگر اپنے نام سے ناول لکھیں تو وہ ناول نہیں رہتا کچھ اور بن جاتا ہے جیسے انتظار حسین نے "بستی" کو ناول بنانا چاہا اور اب وہ طویل مختصر افسانہ بن گیا جس میں طوالت زیادہ ہے اور باقی سب کچھ بہت کم۔

ناول لکھنے کے لئے مطالعہ یا مشاہدے کی نہیں صبر و ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لکھنے والا مسلسل لکھتا رہتا ہے اور کئی کئی رِم کاغذ سیاہ کرتا رہتا ہے۔ اس قسم کے ناول عموماً قلمیں دیکھ کر لکھے جاتے ہیں اور پھر بعض ٹی وی کے ڈرامائی سلسلوں میں پیش کیا جاتا ہے۔

ہمارے ہاں اچھے ناول نگار بہت کم ہیں، اور جو ہیں وہ بھی بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔ وہ افسانے سے کمائی ہوئی شہرت ناول میں لگا دیتے ہیں جس میں ناول اور شہرت دونوں کے خراب ہونے کا امکان رہتا ہے۔ ان افسانہ نگاروں کے لکھے ہوئے ناولوں پر افسانوی مجموعوں کا گمان ہوتا ہے۔ ناول کے ایک باب کا دوسرے باب سے وہی تعلق ہوتا ہے جو کسی مصنف کے ایک افسانے کا دوسرے افسانے سے۔

کہا جاتا ہے کہ اب تک اردو میں اول درجے کا کوئی ناول نہیں لکھا گیا۔ [illegible] [illegible] دعوے کو غلط ثابت کر دکھایا ہے اور وہ بھی اس خوبصورتی سے کہ اب [illegible] [illegible] کو پڑھنے کے بعد [illegible] درجے کے ناول بھی دیکھنے میں آ جاتے ہیں۔

انشائیہ: انشائیہ وہ صنف ادب ہے جس کی ایجاد بارود کی ایجاد سے بھی زیادہ دھماکہ خیز ثابت ہوئی ہے۔ ایک عرصے سے یہی بحث ختم ہونے میں نہیں آتی کہ انشائیہ کسے کہتے ہیں اور
[اس] کا بانی کون ہے۔ ہم پر بھی یہ نکتۂ راز ابھی تک فاش نہیں ہوسکا کہ انشائیہ کسے کہتے ہیں اور
[اس] صنف کا اصل بانی کون ہے صرف اتنا معلوم ہوسکا ہے کہ اس صنف کو سرگودھا کی سرزمین اسی
طرح راس آئی ہے جس طرح آزاد قبائل کے بعض علاقوں کو افیون کی کاشت راس آتی ہے۔ فرق یہ
ہے کہ افیون اسمگل ہوکر ادھر اُدھر بھی جاتی ہے لیکن انشائیہ کی ساری فصل سرگودھا والے اپنے استعمال
میں لے آتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سرگودھا سے باہر انشائیہ لکھا ہی نہیں جاسکتا کیوں کہ اس
کے لئے خاص قسم کی آب و ہوا کی ضرورت ہے۔ اس خیال کی تصدیق اس سے ہوتی ہے کہ انور سدید
کو جب انشائیہ لکھنا ہوتا ہے تو چھٹی لے کر کوٹ ادو سے سرگودھا چلے آتے ہیں اور اگر اس دوران میں
کوئی کام کی چیز لکھنی ہوتی ہے تو چھٹی منسوخ کراکے واپس کوٹ ادو چلے جاتے ہیں۔ نظیر صدیقی اپنے
توضیحیہ مضامین کو اور مشکور حسین یاد اپنے تفریحی مضامین کو انشائیہ قرار دیتے ہیں اور انشائیہ نگار
ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ان دونوں کے یہ دعوے بھی مزاح اور تفریح کی عمدہ مثال ہیں۔

نثری نظم: یہ صنف ان لوگوں کے استعمال کے لئے ہے جو صرف نظم یا صرف نثر لکھنے میں تکلف
محسوس کرتے ہیں۔ یہ بات یوں بھی کہی جاسکتی ہے کہ جو لوگ نثر اور نظم دونوں کے
لکھنے پر قادر نہ ہوں، وہ نثری نظم آسانی بلکہ روانی اور فراوانی سے لکھ لیتے ہیں۔ پہلے زمانے میں بگڑا
شاعر مرثیہ گو بن جاتا تھا۔ اب عام آدمی بھی بگڑ جائے تو نثری نظم کے نقار خانے میں طوطی کی طرح چہچہانے
لگتا ہے ایک نقاد کا ارشاد ہے کہ نثری نظم کے ذریعہ ابھی تک کوئی بڑا تخلیقی کام منظر عام پر نہیں آیا۔
ہماری ناچیز رائے یہ ہے کہ ابھی تک کوئی چھوٹا کام بھی سامنے نہیں آیا فی الحال یہ صنف ادب نیک
والدین اور مستحق دعا ادیبوں کے حصار میں ہے۔

سفر نامہ: پرانے زمانے میں لوگ سفر کرتے تھے تو سفر نامے بھی لکھ دیتے تھے۔ اب سفر نامہ
لکھنے کے لئے سفر کرنے کی شرط اُڑا دی گئی ہے۔ اس کے باوجود بعض لوگ سفر کرنے
کے بعد ہی سفر نامے لکھتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کے سفر نامے طوالت میں ان کے سفر سے بھی آگے
نکل جاتے ہیں۔ پرانے لوگ جو کچھ دیکھتے تھے وہی لکھتے تھے۔ آج کل سفر نامہ میں عموماً وہ واقعات درج کئے
جاتے ہیں جو لکھنے والے کے تصورات میں وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ مثلاً عشق و عاشقی کے معاملات سفر ناموں
میں فلموں سے زیادہ ملتے ہیں۔ ان واقعات کا ہیرو خود سفر نامہ نگار رہتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آج کل سفر
[نامے] افسانے کی جگہ لے رہے ہیں۔ یہ خیال درست نہیں کیوں کہ افسانے میں تھوڑا بہت سچ بھی مل جاتا ہے۔
بعض سفر نامہ نگار اپنے سفر ناموں کو تاریخ اور جغرافیے کی کتابوں کا نعم البدل بنا دیتے ہیں لیکن اکثریت
ان لکھنے والوں کی ہے جن کے سفر ناموں سے یہی معلوم نہیں ہوتا کہ انہوں نے کب اور کہاں کا سفر کیا۔

خاکہ نگاری: خاکہ نگاری اس صنف ادب کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ [illegible] زندہ دلی سے [illegible]

ں پذیر ہونے کی مشق کی جاتی ہے۔ ایک اچھے خاکہ نگار کے لئے ضروری ہے کہ اپنی ذات کو اس
نمایاں کرے کہ وہ شخصیت صرف عنوان کی حد تک نظر آئے جس کا خاکہ لکھنا مقصود ہو۔ اسی لئے بعض
اپنے فضائل بیان کرنے کے لئے اس صنف کا سہارا لیتے ہیں۔

تنقید ایک ایسی صنف ادب ہے جس کا مقصد اور نتیجہ کبھی ظاہر نہیں ہوتا۔ اگر کچھ ظاہر ہوتا
ہے تو صرف اتنا کہ نقاد اپنی پسند کے ادبی گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ہیں اور ناپسندیدہ
وں کے آگے رکاوٹیں کھڑی کر دیتے ہیں۔ تخلیقی تحریریں پڑھ کر لوگ محظوظ ہوتے ہیں اور تنقیدی
یں پڑھ کر حیران بلکہ پریشان ہوتے ہیں۔ لوگوں کو پریشان کرنے کے لئے نقادوں نے کئی طریقے
ر رکھے ہیں، جن میں سب سے بڑا طریقہ یہ ہے کہ وہ دس شعروں کی غزل پر دس صفحات
قالہ ہی نہیں لکھ دیتے بلکہ کسی شاعر کے بارے میں اس کے حجم سے زیادہ حجم کی کتاب بھی تصنیف
دیتے ہیں۔

نقادوں کا مقبول ترین طبقہ وہ ہے جو کتابوں کی تقریبات رونمائی میں مصنفوں اور ان کی
نیف میں ایسی خوبیاں تلاش کر لیتا ہے جن کے موجود ہونے کا مستقبل بعید میں بھی امکان نہیں ہوتا۔

تحقیق ادبی مقبروں کی مجاوری اور شکستہ قبروں پر کتبے لگانے کا کام ہے۔ محقق اپنے گرد و پیش سے
ق بے نیاز ہو کر ماضی کے مزاروں اور کھنڈروں میں اس حد تک منہمک رہتا ہے کہ اسے وقت کے گزرنے
حساس ہی نہیں ہوتا۔ کسی مصنف کی تاریخ وفات معلوم کرتے کرتے وہ خود اپنے یوم وفات کے قریب پہنچ
ہے اور اصل مسئلہ پھر بھی حل نہیں ہوتا۔ کرم خوردہ آب رسیدہ اور سرد و گرم زمانہ چشیدہ کتابوں
، اتنی دلچسپی ہوتی ہے کہ وہ کسی نئی کتاب پر نظر ڈالنے کو اپنی شان تحقیق کے منافی سمجھتا ہے۔ یہی سلوک
کا اپنے عہد کے مصنفوں سے ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک ماضی کا تیسرے درجے کا شاعر زمانۂ حال کے درجۂ
کے شاعر سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک کسی محقق نے اپنے کسی ہمعصر کے بارے میں کچھ
لکھا۔ جب تک کسی ادیب کو مرے ہوئے کم از کم سو سال نہ ہو جائیں محقق اس کی طرف آنکھ اٹھا
بھی نہیں دیکھتے۔ ادیب بیچارے قابل رحم ہیں کہ نقادوں کی وجہ سے ان کی زندگی خطرے میں ہوتی ہے
مرنے کے بعد محققوں کے [illegible] کا مزہ خراب ہوتا ہے۔

زمانۂ حال کے ایک محقق کا دعویٰ ہے کہ موجودہ عہد کے صرف ایک فیصد ادیب اپنی تخلیقات کی وجہ
ے زندہ رہیں گے، باقی ننانوے فیصد ادیبوں کو اس وقت تک کوئی نہیں جانے گا جب تک ان پر تحقیق
یں کی جائے گی۔ ہمیں اس دعوے سے اختلاف ہے کیونکہ ایک فیصد ادیبوں کا تخلیقات کی وجہ
ے زندہ رہنا بھی محال معلوم ہوتا ہے۔

برق آشیانوی

فٹ بورڈ

ایک انگریزی روزنامے میں ایک مراسلہ نظر سے گزرا۔ ویسے تو اس قسم کے مراسلے اردو اخبارو‌ں
بھی شائع ہوئے تھے۔ لیکن اس مراسلے میں مراسلہ نگار کی تحریر میں وہ درد و کرب تھا کہ پڑھ
۔ ہماری آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی بلکہ "جھڑی" جاری ہوگئی (جھڑی دکن میں کئی دن کی مسلسل
ش کو کہتے ہیں۔ معلوم نہیں دیگر اقطاع ہند میں یہ لفظ اس معنی میں استعمال ہوتا ہے یا نہیں) بہت
۔ کے بعد ہمیں خیال آیا کہ اس طرح رونا ٹھیک نہیں کیوں کہ مرزا غالب نے رونے کے بارے میں اہل
ن کو "وارننگ" دی تھی کہ ؎

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ وطن
دیکھنا اِن بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ کسی محلے میں کُتا روئے تو وہ محلہ ویران ہو جاتا ہے۔ لیکن مرزا
لب نے اس شعر میں یہ بات صاف کر دی ہے کہ کُتے کے رونے سے زیادہ آدمی کا رونا منحوس
تا ہے۔ کیوں کہ ایک آدمی کے رونے سے کئی بستیاں ویران ہو جاتی ہیں۔ بس تحقیق ثابت ہوا کہ
ے سے زیادہ خود آدمی منحوس ہے۔ غرض اس شعر کا یاد آنا ہی تھا کہ ہم نے رونا بند کر دیا کیوں کہ ہم
ں چاہتے کہ ہمارے رونے سے بستیاں ویران ہو جائیں۔ سب سے پہلے خود ہمارے اپنے گھر کا خیال
ہ گھر بجائے خود ایک "بستی" ہے جسے خود ہم نے بسایا ہے۔ خدانخواستہ کہیں گھر سے کاروائی کا
از نہ ہو جائے اس لئے رونا دھونا بند کیا اور مراسلہ کو پھر ایک بار غور سے پڑھا لکھا تھا "بسوں میں
ٹ بورڈ پر کھڑے رہنے کی وبا اس قدر عام ہو گئی ہے کہ اس طرح کھڑے رہنے والوں کی تعداد بعض
ت بس کے اندر بیٹھے / بیٹھے والوں کی تعداد سے زیادہ نظر آتی ہے۔ جس کی وجہ سے کئی المناک حادثے

فٹ بورڈ پر کھڑے رہتے ہیں بس میں چڑھنے اور اترنے والے معصوم مسافرین کی جانیں ضائع ہو جاتی ہیں کیونکہ ایک پاؤں فٹ بورڈ پر رکھ کر دوسرا اٹھانا ہی چاہتے ہیں کہ بس چل پڑتی ہے اور چڑھنے والے گر پڑتے ہیں دوسرا پاؤں اٹھانے میں دیر اس لئے ہوتی ہے کہ فٹ بورڈ پر کھڑے ہوئے خوش باش نوجوان اس کی اجازت ہی نہیں دیتے۔ اسی طرح اترنے والے مسافر کا ایک پاؤں بس سے نکل کر نیچے پہونچ جاتا ہے لیکن دوسرا پاؤں فٹ بورڈ پر کھڑے رہنے والوں کی ٹانگوں میں پھنس کر رہ جاتا ہے اور بس چل پڑتی ہے اور اترنے والے کبھی نیچے آ رہتے ہیں اور کبھی بس کے ہی نیچے آ کر پس جاتے ہیں۔ آخر میں یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ فٹ بورڈ پر کھڑے رہنے والوں کے خلاف سخت بلکہ سخت ترین کارروائی کی جائے یہ جو موبائیل کورٹ کی جانب سے دس پانچ روپے جرمانہ کر دیا جاتا ہے اس سے کچھ نتیجہ نہیں نکلتا۔ پھر موبائیل کورٹ بھی برس چھ مہینے میں ایک آدھ دفعہ آنکھیں مل کر اٹھتا ہے اور دو ایک روز اچھل چاکر پھر سال بھر کے لئے گہری نیند سو جاتا ہے۔ چنانچہ ہم نے طے کیا کہ رونے دھونے کے بجائے اس مسئلہ پر سنجیدگی کے ساتھ غور کیا جائے چنانچہ ہم نے سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا شروع کر دیا۔

عوام اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ بس میں فٹ بورڈ مسافروں کے چڑھنے اور اترنے کے لئے بنایا گیا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ فٹ بورڈ "زندہ دل مسافران حیدرآباد" (زندہ دلان حیدرآباد نہیں) کے کھڑے رہنے کے لئے ہے۔ اس کے غلط استعمال کی وجہ سے بنانے والوں کے صحیح مقصد پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ فٹ بورڈ پر کھڑے رہنے میں بڑا لطف آتا ہے۔ اس لئے کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کو مصائب کا شکار ہوتے ہوئے دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہے۔ یہ ایک خاص نفسیاتی مسئلہ ہے۔ اسی جذبے کے تحت روم کا شہنشاہ نیرو آدمیوں کو بھوکے شیروں کے پنجرے میں چھوڑ کر لطف اندوز ہوتا تھا۔ اور آدمیوں کو شیر کا شکار ہوتے ہوئے دیکھ کر قہقہہ مارتا تھا۔ ہر شخص روم کا شہنشاہ نہیں ہو سکتا بالخصوص اس دور میں جبکہ جمہوریت کے نام پر شہنشاہیت ایک شخص کے ہاتھوں سے نکل کر کئی اشخاص کے ہاتھوں میں آ گئی ہے البتہ ہر شخص کو یہ آزادی حاصل ہے کہ فٹ بورڈ پر کھڑا رہے اور لوگوں کے گر کر جان دینے کا تماشہ دیکھے قانونی اعتبار سے فٹ بورڈ پر کھڑا رہنا جرم ہے یہی نہیں بلکہ ہم نے بس کے اندر یہ بھی لکھا ہوا دیکھا ہے کہ تمباکو نوشی جرم ہے لیکن ہر شخص آزادی کے ساتھ سگریٹ یا بیڑی یا چرٹ پی کر بے چارے بس آشیالوی کی ناک میں دھواں بھر سکتا ہے اور بس آشیالوی کو اعتراض کرنے کی جرات نہیں ہوتی۔ بہرحال کھلے طور پر ارتکاب جرم کا نام جمہوریت ہے۔ اور پوشیدہ طور پر ارتکاب جرم کا نام شہنشاہیت ہے۔ کنڈکٹر اس قانون شکنی کے خلاف آواز نہیں اٹھا سکتا کیونکہ اس کا منع کرنا شہنشاہیت کی تعریف میں آ جاتا ہے اور کبھی ایسی جرات کر بیٹھے تو جمہور کی جمہوریت حرکت میں آ جاتی ہے جس کے نتیجہ میں کنڈکٹر کو بس کے باہر پھینک دیا جاتا ہے۔ چنانچہ تنگ آکر خود کنڈکٹر بھی ایک سگریٹ سلگا لیتا ہے۔ اور جمہوریت میں شامل ہو جاتا ہے۔ ہماری اس وضاحت سے سیاسیات کے طالب علم کو جمہوریت کا مطلب سمجھنے میں آسانی ہو گی۔ غرض دوسروں کو مصیبت میں ڈال کر آدمی کو ایک خوشی اور ذہنی فرحت حاصل ہوتی ہے۔ اسی عظیم مقصد کے تحت

نوجوان فٹ بورڈ پر کھڑے ہوتے ہیں۔ اور خوشی محسوس کرتے ہیں۔ فٹ بورڈ پر کھڑے رہنے کی وجہ سے دوسرے مسافروں کو چڑھنے اور اترنے میں جو تکلیف ہوتی ہے وہ دیکھ کر اتنا لطف آتا ہے کہ کبھی پکچر میں سوئمنگ پول کے SWIMING POOL کے منظر سے بھی نہ آتا ہوگا۔ فٹ بورڈ پر تنہا کھڑے رہنے میں اتنی افادیت اور مقصدیت نہیں ہوتی جتنا کہ چند دوست احباب کے ساتھ کھڑے رہنے میں ہوتی ہے۔ خواہ یہ دوستی و احباب بس کے سفر کی حد تک ہی محدود کیوں نہ ہو۔ فٹ بورڈ پر کھڑے رہنے کی وجہ سے کئی مسافروں کو چڑھتے یا اترتے ہوئے جو تکلیف ہوتی ہے وہ دیکھ کر بڑا لطف آتا ہے۔ ان کی وجہ سے کسی مسافر کا بس میں سوار ہونے کی کوشش میں ایک پاؤں بس میں رکھ کر دوسرا پاؤں زمین سے اٹھانے کی کوشش میں بس چل پڑنے کی وجہ سے گر پڑنا کئی دلچسپ اور دلکش نتائج کا باعث ہوتا ہے یعنی کسی کا ہاتھ یا پاؤں ٹوٹ جاتا ہے یا کسی کا کولہا سرک جاتا یا کسی کا سر پھٹ جاتا یا کوئی بس کے نیچے آکر کچل جاتا ہے تو فٹ بورڈ پر کھڑے رہنے والے شہنشاہ نیرو کی طرح خوشی کے نعرے بلند کرتے ہیں تالیاں بجاتے ہیں اور قہقہہ مار کر ہنستے ہیں۔

کچھ عرصہ پہلے مردوں اور عورتوں کے چڑھنے اور اترنے کے لئے ایک ہی راستہ تھا۔ اُن دِنوں فٹ بورڈ پر کھڑے رہنے میں نوجوانوں کو ایک اور لطف آتا تھا۔ اس کو ٹرانسپورٹ کارپوریشن کے انتظامیہ کے غلط اقدام کی وجہ سے ختم کر دیا گیا جو معصوم نوجوانوں کے ابھرتے ہوئے جوشِ جوانی پر ظلم ہے۔ اس پر ماجر الیہود نے اعتراض کیا کہ برق آشیانوی پیرانہ سالی میں بھی ایسی باتیں کرتے ہیں۔ مُلا صاحب کو یہ نہیں معلوم کہ ایک ادیب یا شاعر سماج کی ترجمانی کرتا اور ان کے دماغ سے سوچتا ہے اگر وہ صرف اپنے ہی دماغ سے سوچتا رہے تو ابلاغ و ترسیل کے فن میں ناکام رہے۔ اور برق آشیانوی کے بجائے صرف سید موسیٰ رہ جائے جو نوجوانی میں غزل کے اجزائے ترکیبی اور اعضائے ترغیبی سے اس قدر ناواقف رہا جتنا کہ ملا ماجر الیہود جیل کی ملازمت سے اور زندگی

بی۔ اے۔ پڑھے نوکر ہوئے پنشن ہوئی اور مرگئے

کا خلاصہ ہو کر رہ جاتی بلکہ "مرگئے" کے بجائے "لے غیرتی کے ساتھ زندہ رہے" سے آگے کچھ لکھنا ممکن نہ ہوتا

ہم نے ایک دفعہ بس سے اترتے ہوئے چند نوجوانوں کے فٹ بورڈ پر کھڑے رہنے پر اعتراض کرتے ہوئے کہا "بھئی ذرا فٹ بورڈ سے ہٹ جاؤ۔ ورنہ اترتے وقت بس چل پڑے تو ہم گر پڑیں گے۔ کیوں لوگوں کی جانوں سے کھیلتے ہو"۔ تو نوجوانوں نے ہنس کر کہا "قبلہ

گرتے ہیں "بس سوار" ہی میدانِ جنگ میں

ہماری بات کو سن کر ایک نوجوان نے جو فٹ بورڈ کے استعمال میں ماہر تھے اور پوری مہارت کے ساتھ لٹک کر سفر کر رہے تھے کہا "مولانا آپ نے تصویر کا ایک ہی رُخ پیش کیا ہے"۔ ہم نے کہا۔ "دوسرا رُخ آپ ہی بتا دیجئے"۔ تب انھوں نے کہا۔ "آپ کہتے ہیں کہ فٹ بورڈ پر کھڑے ہو کر ہم دوسروں کی جانوں سے کھیلتے ہیں لیکن یہ نہیں دیکھا کہ اکثر ہم اپنی جان پر کھیل جاتے ہیں۔ اور بعض وقت ہنستے کھیلتے اپنی جان

جان آفریں فٹ بورڈ پر سے قربان کر دیتے ہیں۔ مطلب یہ کہ ہم چلتی ہوئی یا بھاگتی ہوئی بس کے فوٹ بورڈ پر کھڑے رہنے کے لئے دوڑ کر فٹ بورڈ پر ایک پاؤں رکھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو کیا اس میں خود ہماری جان کا خطرہ نہیں رہتا۔ آپ نے اخباروں میں پڑھا ہوگا کہ ہمارے جیسے اکثر سورما کوں نے دوڑتی ہوئی بس میں سوار ہو کر فٹ بورڈ پر کھڑے ہونے کی کوشش میں اپنی جانیں دے دی ہیں۔ ان مرنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ اگر آپ کو اُن سے ہمدردی ہوتی تو آپ ان "شہیدان بس" کی یادگار کے طور پر سٹی بس ڈپو کے سامنے کسی نمایاں مقام پر ایک پلر PILLAR استادہ کرنے کی سفارش کرتے جس پر انگریزی میں یہ عبارت کندہ ہوتی۔

IN MEMORY OF MARTYRS OF THE BUS WHO SACRIFICED THEIR LIVES IN EFFORT TO CATCH THE BUS AND STAND ON THE FOOT BOARD.

کئی نوجوان تو بس پر لٹک کر سفر کرتے ہوئے اپنی جانیں بس پر سے قربان کر دیتے ہیں اگر اتفاق سے جان بچ گئی تو موبائیل کورٹ کے ہاتھوں مال اور آبرو خطرے میں رہتی ہے"! ہم نے ان کی پوری گفتگو سن کر ادباً عرض کیا (ادباً اس لئے کہ نوجوانوں کے سامنے بے ادبی کے ساتھ عرض کرنا اس دور میں جائز نہیں ہے) " میاں یہ سب کچھ فٹ بورڈ پر کھڑے رہنے کی ہوس میں ہے"!

□□

٭ ـــ شفیقہ قادری

زندہ دلانِ حیدرآباد

[میں نے حیدرآباد کے علمی و ادبی اداروں کی خدمات کے عنوان پر حیدرآباد کے ۲۳ مستند اداروں پر کام کیا ہے، یہ مضمون میرے ایم فل کے مقالہ کا ایک (شفیقہ قادری)

(تہذیب کا شہر حیدرآباد، ہر دور میں اپنے علمی، ادبی و ثقافتی کارناموں کے لئے مشہور رہا ہے۔ ہر دور میں یہاں کے دانشوروں، شاعروں اور ادیبوں نے زندگی کے ہر شعبہ میں اپنے وجود کا احساس دلایا ہے۔ پہلے کی طرح اب بھی یہاں مختلف ادارے اور انجمنیں اپنے اپنے انداز سے پوری توانائیوں کے ساتھ سرگرم عمل ہیں۔ انہیں فعال، کارکرد اور مستند اداروں میں سے ایک ادارہ زندہ دلانِ حیدرآباد' بھی ہے۔ جس کی صورت گری کچھ اس طرح ہوئی۔ حیدرآباد میں فائن آرٹس اکیڈیمی کا قیام ۱۹۵۰ء میں عمل میں آیا جو رقص، موسیقی اور ڈرامہ کے میدان میں آج بھی سرگرم عمل ہے۔ ۱۹۶۱ء میں آل انڈیا ریڈیو کی جانب سے ایک مزاحیہ مشاعرہ " زندہ دلانِ حیدرآباد" کے عنوان سے منعقد ہوا۔ اسی سال فائن آرٹس اکیڈیمی کا ایک ادبی شعبہ قائم کیا گیا اور اسے زندہ دلانِ حیدرآباد کا نام دیا گیا۔ جناب حمایت اللہ کی کاوشوں سے ادارہ زندہ دلانِ حیدرآباد پروان چڑھتا رہا۔ ۱۹۶۱ء کے آل انڈیا ریڈیو والے مشاعرے سے ۱۹۶۵ء تک ریاستی سطح پر بڑے پیمانے پر ہر سال مشاعرے ہوا کرتے تھے جس میں زیادہ تر دکنی کلام سنایا جاتا تھا۔ ہر سال ان مزاحیہ مشاعروں کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا رہا۔ ۱۹۶۲ء میں مشہور مزاح نگار مجتبیٰ حسین کی کوششوں سے ارباب ذوق اور زندہ دلانِ حیدرآباد کی طرف سے حیدرآباد میں پہلی کل ہند مزاح نگاروں کی کانفرنس

ہوئی اس کی کامیابی کا سہرا مجتبیٰ حسین کے سر ہے۔ اس کام کو آگے بڑھانے میں حمایت اللہ، حنیف قیصر، مصطفیٰ کمال، مصلح الدین نیر، نامر کرنولی اور رحیم خاں نے ہاتھ بٹایا اور اس ادارے کو اردو دنیا میں متعارف کروایا۔ مزاح نگاروں کی پہلی کانفرنس ۱۴ اور ۱۵ مئی ۱۹۶۲ء کو منعقد ہوئی جو اپنی نوعیت کی پہلی کانفرنس تھی جس میں پہلی مرتبہ ہندوستان کے چوٹی کے طنز و مزاح نگاروں کو اس میں تبادلۂ خیال کرنے کا اور مسائل کا حل تلاش کرنے کا موقع ملا۔ انسان میں ظرافت کا مادہ ایک خداداد عطیہ ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں مزاح نگاروں، شاعروں اور ادیبوں نے اپنے اس جوہر سے شاندار کارنامے انجام دیے ہیں۔ طنز و مزاح نگاری کی شخصیت، اہمیت کی حامل ہونے کے باوجود اس کو ادب اور سوسائٹی میں وہ جائز مقام نہیں دیا گیا جس کا وہ مستحق تھا۔ اس کانفرنس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ مزاح نگاروں کے ساتھ ادب میں اب تک جو ناانصافیاں ہوتی رہی ہیں اس کا سد باب ہو۔ ان کی تخلیقات کی اشاعت کا اہتمام ہو۔ غرض اس مثالی کانفرنس میں نہ صرف ہنسنے اور ہنسانے کا سامان موجود تھا بلکہ موجودہ دور میں مزاح نگاروں کے مسائل بھی زیر بحث رہے۔

حیدرآباد میں یوں تو سنجیدہ ادبی جلسوں اور مشاعروں کے اہتمام کا سلسلہ کئی برسوں سے جاری ہے۔ حیدرآباد کے سنجیدہ مشاعروں میں ایک دو مزاحیہ شاعر شریک رہا کرتے تھے جن میں قابلِ ذکر نام ہیں۔ نذیر احمد دہقانی، مرزا شکور بیگ، علی صاحب میاں، اعجاز حسین کھٹا، سرور ڈنڈا، سلیمان خطیب وغیرہ۔

شہر حیدرآباد میں وقتاً فوقتاً علیحدہ طور پر مزاحیہ مشاعرے بھی ہوتے رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ حیدرآباد میں مزاح نگاروں کی پہلی کل ہند کانفرنس کے بعد ہی سے مزاح نگاروں کی اہمیت واضح ہونے لگی۔ اس کانفرنس کے بعد ہر سال ادبی اجلاس اور کل ہند مشاعرے منعقد ہو رہے ہیں۔ کل ہند پیمانے پر منعقدہ کانفرنسوں اور مشاعروں میں ملک کے صف اول کے طنز و مزاح نگاروں اور مزاحیہ و طنزیہ شاعروں نے شرکت کی۔

پہلی کل ہند کانفرنس میں جن صف اول کے مزاح نگاروں اور شاعروں نے شرکت کی اُن کے نام یہ ہیں۔ کرشن چندر، فکر تونسوی، سلمیٰ صدیقی، پروفیسر غلام ورقت کاکوروی، تخلص بھوپالی، یوسف ناظم، خواجہ عبدالغفور، سرور جمال، احمد جمال پاشاہ، شگفتہ فرحت، دلاور فگار، ہلال سیوہاروی، مجتبیٰ حسین، بھارت چند کھنہ، رشید قریشی، سلیمان خطیب وغیرہ۔ یہ کانفرنس ایک طرح سے عوام کے مذاق کو بلند کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوئی۔ کانفرنس کے موقع پر ارباب زندہ دلان کی جانب سے ایک سوونیر بھی شائع ہوا۔ یہ سہ روزہ کانفرنس بہت کامیاب رہی اور اس کے ساتھ ہی یہ طے کیا گیا کہ زندہ دلان حیدرآباد کو ایک کل ہند ادارے کی حیثیت دی جائے جس کے تحت سالانہ تقاریب کے طور پر مزاحیہ تحریروں پر مشتمل ادبی اجلاس، مزاحیہ مشاعرے اور لطیفوں کی محفل سجائی جائے۔

اس کانفرنس کے کچھ دن بعد اس ادارہ کو باقاعدہ رجسٹر کروایا گیا اور اس کو ایک علیحدہ ادارہ کی حیثیت دی گئی۔ جس کے صدر بھارت چند کھنہ اور معتمد مجتبیٰ حسین تھے۔ ان دنوں نریندر لوتھر صدر، رشید قریشی و حمایت اللہ نائب صدور، طالب خوندمیری معتمد عمومی، مسیح انجم اور یوسف حیدرآبادی نائب معتمد ہیں۔

آزادی کے بعد طنز و مزاح کے لکھنے والوں کی تعداد ملک میں بہت کم رہ گئی تھی۔ ان کا کوئی باضابطہ مرکز نہیں تھا۔ کوئی پلیٹ فارم نہیں تھا۔ حیدرآباد میں زندہ دلان ان کا مرکز بنا۔ ہندوپاک کے ادبی حلقوں میں یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ حیدرآباد کو طنز و مزاح کے میدان میں مرکزیت حاصل ہے۔

اس کانفرنس کی بدولت پہلی دفعہ نثر کو اسٹیج پر پیش کیا گیا۔ جب اس کانفرنس کی سارے ہندوستان میں دھوم مچ گئی تو دوسرے شہروں میں بھی مزاحیہ محفلیں منعقد ہونے لگیں چنانچہ پٹنہ میں جشنِ ظرافت منایا جانے لگا۔ بھوپال میں دو کانفرنسیں ہوئیں۔ چندی گڑھ اور لکھنؤ میں بھی کانفرنسیں ہوئیں۔ زندہ دلان حیدرآباد کی بدولت ملک میں طنز و مزاح کی اہمیت محسوس کی گئی۔ ریڈیو اور ٹی۔ وی۔ سے مزاحیہ مشاعرے ہونے لگے۔

یہ ادارہ سالانہ مشاعروں کی آمدنی سے چلایا جاتا ہے۔ ادارہ کا موجودہ کارپس تیئیس ہزار روپے کے قریب ہے۔ اس ادارے سے زیادہ تر زندہ دلان حیدرآباد کے مزاحیہ شعراء اور ادباء کی مدد کی جاتی ہے۔

شگوفہ

زندہ دلان حیدرآباد کے ترجمان کی حیثیت سے جناب مصطفٰے کمال کی ادارت میں رسالہ شگوفہ نومبر ۱۹۶۸ء سے شائع ہونے لگا جس میں مزاحیہ شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات شامل رہتی ہیں یہ رسالہ پہلے دیڑھ ماہی تھا لیکن دو سال بعد ۱۹۷۳ء میں ماہانہ بن گیا۔ رسالہ شگوفہ میں تازگی، تفریح کے ساتھ ساتھ ادبیت بھی بہت عمدگی سے سموئی گئی ہے۔ ایسے انتشاری دور میں ایک مزاحیہ پرچہ کی سخت ضرورت تھی جس کو رسالہ شگوفہ پورا کرتا ہے۔ اس رسالہ کی مدد سے مزاحیہ ادب کے فروغ کے ساتھ ساتھ مزاحیہ ادب پر بہت کچھ سنجیدہ کام بھی ہو رہا ہے۔ پیروڈی اور ڈرامہ نمبر کے علاوہ مزاح نگاروں کے کئی خاص نمبر بھی شائع کئے گئے ہیں۔ اس رسالہ کے لئے ہندوپاک کے تقریباً سبھی مشہور مزاح نگار لکھتے ہیں۔ ۱۴ سالہ شگوفہ طنز و مزاح کی ادبی تاریخ میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔ یہ پرچہ پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔

زندہ دلان حیدرآباد کا ایک اشاعتی شعبہ بھی ہے۔ اس اشاعتی شعبہ کی جانب سے چار کتابیں نشتر و مرہم (رضا نقوی واہی)، مزاح پرسی (نریندر لوتھر)، گھر کے کانٹے (علی صاحب میاں) اور مزاح شریف (رشید قریشی) شائع ہو چکی ہیں۔ ان کے علاوہ زندہ دلان کے ادارے سے بیس اسکالرشپ شائع ہو چکا ہیں جن کے لئے ادارے نے جزوی مالی امداد منظور کی ہے۔

* *

★ مضامین صاف اور خوش خط، صفحے کی ایک جانب لکھے ہوئے موصول ہونے چاہئیں

محبوب راہی

"گڑبڑگھٹالہ"

"الم غلم" اور "چوں چوں کا مربہ" کی غیر معمولی مقبولیت کے بعد عوامی مقبولیت کے حامل مزاح نگار شاعر پاگل عادل آبادی کا یہ تیسرا مجموعۂ کلام ہے۔ پاگل مشاعروں کے توسط سے ہندوستان گیر شہرت اور مقبولیت کے حقوق اپنے نام محفوظ کر چکے ہیں وہ اپنے دانشمندانہ پاگل پن کا مظاہرہ کرنے کے لئے چاروں کھونٹ گھومتے ہیں کئی آل انڈیائی اور انڈو پاک مشاعروں کو لوٹنے کے جرم میں وہ ملوث ہیں۔ مختلف شہروں میں منعقدہ مشاعروں کو تہس نہس کر کے وہاں اپنی عوامی مقبولیت کا تسلط جما چکے ہیں۔ (میرا شہر بارسی ٹاکلی بھی ان کے زیر نگیں آچکا ہے) ان تسخیر شدہ شہروں میں سات صوبائی راجدھانیاں بھی شامل ہیں دراصل مجھے پاگل کے تازہ شعری مجموعے "گڑبڑ گھٹالہ" پر تبصرہ لکھنا ہے۔ لیکن کیا کیا جائے پاگل اپنے شعری مجموعوں کے مقابلے میں مشاعروں میں کہیں زیادہ مقبول ہیں واقعہ یہ ہے کہ ان کی کتابوں کی مقبولیت بھی مشاعروں کی مقبولیت ہی کی مرہون منت ہے۔ میرا اپنا مشاہدہ ہے بارسی ٹاکلی کے ایک کل ہند مشاعرے میں بڑے بڑے جغادری مشاعرہ بازوں کے چھکے چھڑا کر پاگل نے عوام کے دلوں پر ایسا شبخون مارا کہ اختتام مشاعرہ پر "چوں چوں کا مربہ" کی لوٹ مچ گئی۔ لہٰذا گارنٹی دی جا سکتی ہے کہ اس کتاب کی نکاسی کے لئے بھی انھیں کسی بک سیلر کو مکھن مارنے کی نوبت نہیں آئے گی۔

تو آپ آیئے ایک نظر ڈالتے چلیں پاگل کے "گڑبڑ گھٹالہ" پر۔ بات پھر مشاعرے سے شروع ہوتی ہے۔ دراصل کتاب کا دلچسپ اور معنی خیز سرورق ہی علامت ہے اس بات کی کہ پاگل اپنے فن کے اظہار کے لئے مشاعرہ کو ایک کامیاب اور موثر ترین ذریعہ سمجھتے ہیں۔ پاگل نے "اپنے بارے میں" جو کچھ لکھا ہے وہ ان کی اپنی بات ہے اس لئے اسے داخل بحث کرنا

لاحقی ہے۔ ہر ایک لفظ میں قطب سرشار ایم اے کی اس دلیل کی روشنی میں کہ ــ

"ایک سنجیدہ شخص احمد شریف نے اپنے لئے پاگل تخلص چن کر گویا سماج کے ان تمام کرداروں کو آئینہ دکھایا ہے۔ جو نہایت سنجیدگی کے ساتھ حماقتوں میں جذب ہو گئے ہیں"۔

دیکھیں کہ اس آئینہ میں ہمارے معاشرے کے کن کن کرداروں کے چوکھٹے کس کس روپ میں دکھائی دیتے ہیں۔ ؎

ہر ایک چہرے پہ چہرہ دکھائی دیتا ہے
نظر جو آئے گدھا اس کو شیر نہ سمجھو
جو یہ کہتا ہے بھارت سے غریبی کو ہٹائیگا
وہ لیڈر شیخ چلی کا چچا معلوم ہوتا ہے
بکے نہیں دیوان تو پھر سوچنا کیا ہے
بازاروں میں ردی کے طلب گار بہت ہیں
ملک اور قوم کا خادم یہ حقیر ناچیز
اور کیا آپ سے چندے کے سوا مانگے ہے
بیگم یتیم خانہ چلو چل کے دیکھ لیں
بچوں کی یاد آئی زمانے گزر گئے
امن ہوگا تو دکان کیسے چلے گی اپنی
جھگڑے جتا کے چکا کر ہیں کیا لینا ہے
نماز عشاء پڑھ کے مولانا حضرت
چلے دیکھنے "دو بدن" ہلو ہلو
آج ہر شخص کی داڑھی میں ہے تنکا یارو
چور ہر شخص ہے کس کس کو سزا دی جائے

اس آئینہ خانہ میں تو واقعی ہر شخص کی داڑھی میں تنکا نظر آنے لگا۔ آئیے اب زبان میں پاگل کی شاعری کے خدوخال دیکھیں۔ پاگل نے روزمرہ عوامی بول چال کی زبان کو اپنے فن کی ترجمانی کا وسیلہ بنایا جو بالآخر ان کی عوامی مقبولیت کا ایک نسخہ کیمیا ثابت ہوئی۔ علاقائی بولی کے الفاظ مثلاً دھارکاری، دھنگڑی، آلال منڈی، دو سلے بھئی، تالو، موز، پھکٹ، پٹانا، نکٹا، بھجانا، نیفا، بوم پٹارہ، کھٹارا، جھنیواتی بھوڑا، بدمابوم، لڑائی، ڈزن، مرچی کی ڈھانس، ہولا، بھگا، ڈھٹیاں، خالی پیلی، چھبو، پوتے، کتے، ستیل، گھڑسی، بنڈی وغیرہ نہایت بے تکلفی سے استعمال کئے ہیں۔ پاگل کی شاعری میں عام فہم انگلش الفاظ کچھ ایسے پیوست ہوئے ہیں کہ اردو ہی کا حصہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ مثلاً مٹن، پاکٹ بلیڈ، پوز، پٹ اپ، کچن، کیو، پکچر، آئیڈیا، فائر بریگیڈ، اینڈ وانس بکنگ، مدر، ہکی کلر، اپوزیشن، ہائی پاور، نفٹی پرسنٹ بلف، ایوارڈ، نالج، ڈینجر، جی. جی. وغیرہ طنز کی کاٹ کو تیز کرنے کا باعث ہوئے ہیں۔ گرد ہڑ گھٹالہ کے مزاحیہ اشعار میں جابجا محاورہ بندی، زبان کے چٹخارے اور بیان کی برجستگی کی خوبصورت مثالیں ملتی ہیں۔

میں نے کالے کو کہہ دیا کالا
تو غصے سے لال ہے بھائی
تم ہائے روز گار نے نقشہ بدل دیا
کل تلک جو گل تھے آج مکاللے ہوگئے
سر چھوڑیں گے بے مروتی نہیں تھی
گر خواب مفتی کمسنت کی نہیں تھی

اور اس غزل کی جھنجلاہٹ کا تو جواب ہی نہیں جس

مطلع ہے۔

محفل محفل گلشن گلشن

[illegible] ہے برتن برتن

قطب سرشار لکھتے ہیں ۔۔۔ "شاعر کا ذہنی سفر بڑی تیزی کے ساتھ جاری ہے اور اب پاگل اپنے عبوری دور کو پاٹ چکے ہیں مگر اب بھی "سرعت تاثیر" کا فقدان پایا جاتا ہے۔"

اور میرے خیال میں ایک اور چیز جس کا ان کی شاعری میں فقدان ہے وہ ہے خیال کی وسعت، گہرائی اور گیرائی، پاگل مسائل کی تہوں میں اُترنے سے کتراتے ہیں۔ اُوپر ہی اوپر ڈبکیاں لگا کر کنارہ پکڑ لیتے ہیں۔ طائر فکر کو اونچا اُڑنے نہیں دیتے زمین کے آس پاس "ٹامک ٹوئیاں" مارتے رہ جاتے ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ وہ عوامی شاعر ہیں اور ہر قیمت پر عوامی مقبولیت کے لڈو اپنے ہاتھوں میں رکھنا چاہتے ہیں۔ چاہے اس کے لئے انہیں فن کے مروجہ اصولوں کا خون ہی کیوں نہ کرنا پڑے، قواعد و ضوابط کی گردنیں کیوں نہ توڑنی پڑیں۔ یہ ساری افراط و تفریط پاگل کی سہل پسندی کا نتیجہ ہے ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ تین کتابوں کے مصنف کے کلام میں اکثر مصرعے ساقط الوزن اور خارج از بحر دکھائی دیں جا بجا شتر گربگی اور صحت الفاظ میں اسقام پائے جائیں۔ ثبوت کے لئے یہ اشعار دیکھئے

[illegible] ہے [illegible] شاعر اعظم
[illegible] احسان ہے

نازک کمر پہ جن کی زمانہ فدا ہوا
ہے کم سے کم یہ چار میٹر دیکھ رہا ہوں
بیوی ہے اقتدار میں شوہر اپوزیشن
گھر گھر میں سیاست کا اثر دیکھ رہا ہوں
گھر سے پیسے چُرا لاؤ کچھ دوستو
نئی پکچر لگی ہے چلے آیئے
جسکو کہتے ہیں پاگل ملو بے دھڑک
بے ضرر آدمی ہے چلے آیئے

اور یہ مصرعے دیکھئے:

سُنتے ہی ہو گئی ہے شروع بھونکنے کی جنگ
انہیں ایوارڈ دیجئے ان کی نالج ہے وسیع کتنی
میں ملیشن لے کے جب اپنی نکل جاتا ہوں تفریح کو
"ہر سودائے خلوص کے دھندے ہیں آج کل"

اسی طرح صحت الفاظ سے لاپرواہی بھی ملتی ہے۔ مثلاً قہر اور شہر کو قہر اور شہر بروزن قطر اور نگر اور نظم کو نظم بروزن قسم۔ ہندی اور انگریزی الفاظ کے ساتھ اضافتیں مثلاً غم بادا۔ وعدۂ لیڈر وغیرہ۔ واقعی گڑ بڑ گھٹالہ جس کا اعتراف انتہائی سادگی اور خلوص کے ساتھ پاگل نے بھی کیا ہے ؎

یہ مانا شاعری پاگل کی عین غین سہی
ملی ہے پبلسٹی اس کو مغتبر دیکھو

واقعہ یہ ہے کہ پاگل کو یہ معتبر پبلسٹی ان کے خلوص اور سادگی ہی کی بدولت ملی ہے۔ اس سے [illegible] ان کی سادگی کا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے [illegible] [illegible] کے باوجود شراب کو [illegible] [illegible] نہیں لگاتے ہونٹھ لگانے کے [illegible]

مزدور ہیں لیکن کیا وہ ان ہی سے سنیئے ؎

بن پئے آتا نہیں موڈ ہمیں تو پاگل — کم سے کم جائے اگر ہو تو غزل ہوتی ہے

"گڑبڑ گھٹالہ" میں ستانوے غزلیں (بشمول پانچ دکھنی غزلیں) ایک حمد، ایک نعت شامل ہے۔ اس ہوشربا گرانی کے بے کیف دور میں ایسی چلبلی، چٹخارے دار تفریح کہ ہر شعر پہ قہقہہ نہ سہی کم از کم ہونٹوں پر مسکراہٹ ضرور کھیلنے لگتی ہے پندرہ روپے بھیج کر مصنف کے پتے "اردو محل" کالج کالونی عادل آباد (اے پی) یا ماہنامہ شگوفہ حیدرآباد سے رجوع کیجئے۔ یا پھر سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ اپنے شہر میں ایک آل انڈیا مشاعرہ منعقد کروائیے اور وہاں خود پاگل صاحب سے گڑبڑ گھٹالہ خرید لیجئے لیکن قیمت ادا کر کے۔

خرافات

مراسلے

مکرمی، شگوفہ کے تازہ شمارے میں مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی کے زیر اہتمام منعقدہ سیمینار کی روداد پڑھنے کو ملی۔ آپ نے اچھا کیا کہ ایک اہم خبر کسی ذریعے سے حاصل کرکے شائع کی۔ ملا رموزی کی یاد میں ایک سیمینار کے انعقاد کے لیے اکیڈمی قابلِ مبارکباد ہے لیکن تعجب ہے کہ اس سیمینار میں باہر سے آنے والے طنز و مزاح نگار شریک نہیں ہوئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے انہیں اس ادبی اجلاس کی اطلاع ہی نہیں تھی۔ مہمان ادیب تو شریک نہیں ہوئے۔ لیکن شفیقہ فرحت صاحبہ جو بھوپال ہی میں رہتی ہیں۔ مزاح نگار ہیں اور لیکچرار بھی ہیں وہ بھی نہیں تھیں وہ تو طنز و مزاح کے ادبی اجلاس میں بھی نہیں تھیں۔ یہ کیا بات ہوئی! کیا انہیں دعوت ہی نہیں دی گئی طنز و مزاح کے ادبی اجلاس کی صدارت بھی کشمیری زبان کے کسی غیر معروف شاعر نے کی۔ اس کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔ خود اس اجلاس میں فکر تونسوی شریک تھے۔ ان کی موجودگی میں ایک ایسے شخص کو صدارت سونپنا جس کا مزاح سے کوئی تعلق نہ ہو۔ نہایت ہی معیوب بات ہے۔ اس کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟ ایسا معلوم ہوتا ہے وہاں کوئی کسی بات کی نوٹس ہی نہیں لیتا۔ طنز و مزاح کے ادبی اجلاس اپنی نوعیت اور اہمیت کے اعتبار سے اس لائق ہوتے ہیں کہ ان کے لیے موزوں قد و قامت اور ادبی حیثیت کے صدر منتخب کیے جائیں۔ ہوسکتا ہے اس کوتاہی کی وجہ کچھ اور ہو بہرحال خوشی کی بات ہے کہ بھوپال میں ایک اچھا جلسہ ہوسکا۔

نصیر الدین شیخ، رائے پور۔

مکرمی کمال صاحب! خلوص بیکراں۔

اس دورِ پُر آشوب میں جبکہ آج کا انسان زیر لب تبسم سے بھی محروم ہے آپ "شگوفہ" کے ذریعہ اس کو بھرپور قہقہوں کے مواقع فراہم کر رہے ہیں۔ اس میں دو رائے نہیں کہ "شگوفہ" ہندوستان کا واحد طنز و مزاح کا ماہنامہ ہے جس کو پڑھ کر افسردہ دلوں کو شگفتگی اور نئی توانائی حاصل ہوتی ہے۔ آپ نے اپنے کاندھوں پر طنز و مزاح کا انفرادی بار اُٹھاکر قارئین کو ہجومِ غم میں مسکراکر جینے کا سلیقہ سکھایا ہے۔ خدا آپ کو اپنے عزائم میں کامیاب کرے۔

طالب عرفانی، سرونج مدھیہ پردیش

مکرمی۔ سلام مسنون!

دن بدن شگوفہ کی ترقی سے آپ پر رشک آنے لگا

قطعہ

تم نے پرچہ کمالِ خوبی سے
حیدرآباد سے نکالا ہے
اس کی کوئی کہیں مثال نہیں
منفرد رنگ ہے نرالا ہے!

محبوب مانجھوی۔ بلاسپور

محترمی۔ سلام و خلوص،

"شگوفہ" اپنے ملک کا واحد پرچہ ہے جو طنز و مزاح نگاروں کے خیالات کی ترجمانی کرتا ہے اور ہمت افزائی بھی۔ مبارکباد بھی پیش کرتا ہوں کہ آپ طنز و مزاح کی شمع روشن کئے ہوئے ہیں

قمر الزماں قمر۔ رانچی

محترم مصطفےٰ کمال صاحب

پرچہ اس قدر شاندار ہے کہ تعریف کے لیے الفاظ نہیں۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ مجھ کو ایسے ہوا کہ میرے کالج کے بیشتر ساتھیوں نے اس کا مطالعہ کیا اور قریب ۱۵ طلباء کے بعد پرچہ مجھ کو ملا۔

نشتر سیوانی سیوان بہار

آپ اِس سے واقف ہیں... مگر

ہاں آپ واقف ہیں خاندانی منصوبہ بندی کی ضرورت اور اہمیت سے۔ یقیناً آپ واقف ہیں خاندانی منصوبہ بندی کے کلیدی رول سے جو خاندانی بہبودی اور قومی ترقی میں ادا کر رہا ہے۔

پھر بھی آپ پس و پیش کر رہے ہیں، آپ ذہنی کشمکش میں ہیں، پس و پیش کے لیے وجہ موجود ہے۔ لاکھوں زندہ مثالیں آپ کے لیے موجود ہیں، لاکھوں جوڑے خاندانی منصوبہ بندی کو اپنا رہے ہیں۔ عارضی اور مستقل طریقے ان کی ضرورت کے مطابق۔ وہ خوش حال ہیں صحت مند ہیں۔

آپ بھی ان خوش حال اور صحت مند لوگوں میں سے ایک ہو سکتے ہیں جو قومی ترقی کی راہ میں مشعل بردار ہیں۔

یہ آپ کے فیصلے کا وقت ہے۔ آپ کا فیصلہ، خاندانی منصوبہ بندی اور بہبودی کی سہولتوں سے استفادہ کا، ریاستی حکومت نے جسے تمام آندھرا پردیش میں فراہم کیا ہے۔

خوش آمدید

اسٹیٹ فیملی ویلفیر بیورو

سلطان بازار۔ حیدرآباد

[illegible]

R N 5822/68 SHUGOOFA Postal Regd. No. H. HD 6
Vol Copy 11 31 Bachelor Quarters, M. J. Market, Hyderabad-1 November 1982 Phone: 5771

ہندوستانی بچے ـــــ امریکہ میں!؟

DECEMBER 1982

Rs. 3-00

جلد ۱۵ ـــــ شمارہ ۱۲
دسمبر ۱۹۸۲ء

ایڈیٹر:
سید مصطفیٰ کمال

مجلسِ مشاورت:
راجندر سنگھ بیدی
بھارت چند کھنّہ
خواجہ عبدالغفور
نریندر لوتھر
مجتبیٰ حسین

ٹائیٹل: خواجہ عبدالغفور

مجلسِ ادارت:
حمایت اللہ
منظور احمد
مسیح انجم

منیجر: سمیع جلیل

قیمت فی پرچہ: ۳ روپے
زرِ سالانہ: ۳۰ روپے، افرادی ۲۵ روپے
بیرونِ ممالک: ۹۰ روپے

کتابت: محمود سلیم، عبدالرؤف
طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، حیدرآباد ۲

خط و کتابت کا پتہ:
شگوفہ ۲۲ سینٹرل کمرشیل کامپلیکس، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱ فون 57716

اس تھیلی کے چٹے بٹے — فہرست

بمبئی، حیدرآباد اور دہلی میں سلور جوبلی کے بعد

بہار اور بنگال میں

ریلیز کے لیے تیار

بے جوڑ شادیوں

پر

ایک طنز

ساگر سرحدی کی فلم

بازار

شگفتہ، سمیتا پاٹل ★ نصیر الدین شاہ

فاروق شیخ ★ سپریا پاٹک

★ بھرت کپور ★ [illegible] اور دوسرے

قدم قدم نزاکتؔ
نفس نفس حجابؔ
نظر نظر شرارتؔ
انگ انگ شبابؔ
ایسی ہی تو شگفتہ فیشن پسند
دوشیزاؤں، طالباتؔ
اور خواتین کے لیے
فیشن نگار
دکنؔ روبرو مسجد پتھر گٹی
حیدرآباد ۲۔ فون ۴۱۱۲۷
DECCAN'S

سے کون پیار کرتا اور ان کی شادی کس سے ہوتی۔

امریکہ میں ایک دوسرے پر عملی مذاق کے وار یا دوسروں کی تضحیک کو بطور حق روایتی مزاح مان لیا گیا ہے اور اس حق کو کوئی چیلنج نہیں کرتا۔

امریکیوں کا خیال ہے کہ مزاح کو اسی طرح کاٹا چھانٹا جا سکتا ہے جس طرح ڈی سکشن کر کے مینڈک کو چیرا اور پھاڑا جاتا ہے لیکن وہ متنبہ کرتے ہیں کہ جس طرح اس عمل سے مینڈک مر جاتا ہے اسی طرح مزاح کی روح پرواز کر جاتی ہے۔

ظرافت اور لطافت کی کوئی جغرافیائی حدود نہیں ہوتیں یہ ہمہ گیر اور عالم گیر ہوتے ہیں۔ لیکن لسانی ذہنی شعوری اور سماجی قدریں الگ الگ ہوتی ہیں۔ اسی لئے کسی زبان اور اُس کے بولنے والوں کو کسی خاص ملک کے حدود اربعہ کے پس منظر میں دیکھنا ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ انگلستان کے رہنے والے اپنی بول چال کی انگریزی زبان میں امریکہ کے باشندوں کے شعور و فکر کے اعتبار سے لازماً مختلف ہوتے ہیں۔ کینیڈا اور آسٹریلیا والے وہی انگریزی لکھتے پڑھتے اور بولتے ہیں لیکن طبعی جولانی اور ماحول کی وجہ سے مختلف نظر آتے ہیں۔ محض کسی ایک زبان جیسے انگریزی، فرانسیسی یا جرمن کو پڑھ کر ہم اس کے بولنے والوں کے مزاج کو نہ ہی مزاح کو سمجھ سکتے۔

امریکہ ایک ایسا ملک ہے کہ جہاں یورپ کے ہر خطہ کے اور افریقہ کے لوگ بھی ہجرت کر کے جا بسے ہیں اب تو ہندوستانی پاکستانی بھی بہت بڑی تعداد میں متوطن ہو گئے ہیں اور لسانی اعتبار سے گھل مل گئے ہیں۔ اسی طرح میں نے دیکھا کہ دنیا بھر میں ایک ہی قسم کے خوشگوار حادثات و واقعات دہرائے جاتے ہیں۔ زبان بے شک جدا ہوتی ہے۔ انداز بیان اور ہوتا ہے۔ اسلوب نرالا ہوتا ہے۔ پیش کش مختلف ہوتی ہے ماحول کہیں سازگار، کہیں ناکارہ ہوتا ہے۔ لوگوں کے مزاج اور ان کے مزاح کی حس کہیں تیز کہیں مدھم کہیں مخالفانہ، کہیں حظ و لطف اُٹھانے پر مائل۔ چونکہ امریکہ میں بھانت بھانت کے دیسوں سے بڑی بھاری تعداد میں لوگ آتے ہیں۔ اسی مناسبت سے لسانی نسلیاتی اور عمرانیاتی قسموں پر طنز و مزاح کو بانٹا گیا ہے اور ایک دوسرے پر باقاعدہ چوٹیں چلی جاتی ہیں۔ ادب میں ان کی گروہ بندی بھی اس طرح ہوتی ہے۔ انگلستانیوں کو دیر فہم (ذہنی) آئرش کو متبذل اسکاچ کو خناس، اطالوی کو بے ہنگم، جرمن کو ڈھیٹ، پولش کو کوتاہ فہم، عزرائیلی کو لالچی، سولون کو کاہل پولک کو نیچ میکسن کو متمرد، فرنچ کو جنسیات میں ملوث قرار دے کر اسی قسم کے لطیفے عام کر دیئے گئے ہیں۔

یہ بھی دعویٰ کیا جاتا ہے کہ انگریزی اور فرانسیسی اثر کے تحت بذلہ سنجی اور خوش مذاقی ہر دلعزیز ہیں خالص امریکی انداز بڑی حد تک عریانیت پسند ہے۔ کینیڈین اپنے مزاح کو صاف ستھرا اور تضحیک و تذلیل سے مبرا سمجھتے ہیں

لسانی نسلیاتی اور عمرانیاتی مزاح: یہ امریکہ میں بہت مقبول ہے۔ ہر فرقہ جماعت نسل مذہب قبیلہ اور گروہ کی خامیوں پر چن چن کر لعن طعن لاف گزاف کیا جاتا ہے۔ اور انھیں

طنز و ملامت کا نشانہ بنایا جاتا ہے ان میں یہودی، کالے، گورے اور دُنیا کے مختلف ممالک سے آ کے امریکہ میں بسنے والے سب ہی شامل ہیں جنھیں لتاڑا جاتا ہے۔ لیکن یہ کسی نسلی امتیاز یا بدسلوکی کا مظاہرہ نہیں۔ محض خوش طبعی اور زندہ دلی کی علامات ہیں جس سے وہ شخص ناراض ہوتا ہے نہ غصہ کرتا ہے بلکہ اپنی خوش مزاجی کے ثبوت کے طور پر خود بھی ہنسنے ہنسانے میں شریک ہوتا ہے اور یہ بھی ایک کھلی حقیقت ہے کہ مندرجہ بالا نسلی اور شخصی خصوصیات بن دمن موجود نہیں ہوتیں بلکہ آج یہ سب سے زیادہ ہی ذہین اور عقل مند سمجھے جاتے ہیں اس کی مثالیں مندرجہ ذیل ہیں

عمرانیاتی لطیفے: یہودی، کرسچین اور مارمن نے اپنے محلے کی اپنی اپنی عبادت گاہوں کی تعمیر و مرمت کے خیال سے لطور چندہ خاصی رقم جمع کی۔ انھیں خیال آیا کہ آخر ہم نے اتنی محنت اور عرق ریزی سے اتنا سارا روپیہ اکٹھا کیا ہے تو کچھ اپنا حصہ بھی ہونا چاہیئے۔ کرسچین نے میز پر چاک سے ایک حلقہ بنایا اور کہا کہ میں نے جتنی رقم جمع کی ہے وہ ساری کی ساری اس دائرہ پر اچھال دیتا ہوں۔ جو کچھ اس کے بیچ گرے وہ چرچ کے لئے اور جو باہر گرے وہ خود لے لوں گا چنانچہ یہی کیا گیا اور اس کو کچھ روپیہ مل گیا۔ دوسرے شخص نے کہا میں بھی یہی کرتا ہوں لیکن جو ان لکیروں کے اندر گرے گا وہ میں اپنے لئے رکھ لوں گا اور باہر والی رقم راہ خدا میں صرف کروں گا۔ جب یہودی کی باری آئی تو اس نے کہا مجھے یہ چکر نہیں چاہیئے میں ساری کی ساری رقم اچھالتا ہوں جتنی نیچے گرے وہ سب میری۔ خدا کو جتنی چاہیئے وہ نیچے گرنے ہی نہ دے اور خود رکھ لے۔ ظاہر ہے کہ بے چارگی کے لئے خدا نے کچھ بھی نہیں بتایا اور چندہ کی ساری رقم اسے مل گئی۔

● پولینڈ نژاد پولک کے جوان بیٹے نے باپ سے کہا۔ ہمسایہ کی نوجوان لڑکی مجھے بہت پسند ہے میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ باپ نے کہا ارے ایسی حماقت اور غلطی نہ کرنا وہ تو درحقیقت میری لڑکی اور تمہاری بہن ہے۔ لڑکے نے بات مان لی اور پھر ایک لڑکی کو پسند کر کے باپ کی اجازت مانگی اس پر بھی باپ نے اپنی بات دہرائی اور کہا کہ اسی وجہ سے تم اس سے بھی شادی نہیں کر سکتے۔ محلہ کی دو چار اور لڑکیوں کا اس نے جب کبھی ذکر کیا باپ یہی کہتا گیا کہ وہ بھی میرا ہی نطفہ ہے۔ لڑکے نے اپنی پریشانی کا اظہار ماں سے کیا کہ سب ہی لڑکیوں کو باپ اپنی بتاتا ہے میں کیا کروں۔ ماں نے بڑے اطمینان سے کہا بیٹا تو ان لڑکیوں میں سے جس سے چاہے شادی کر ڈال تو خود اپنے اس باپ کا بیٹا نہیں۔

● پولک کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نہانے کے بعد سب سے پہلا کام وہ یہ کرتے ہیں کہ اپنے جسم سے پہنے ہوئے کپڑے نکالتے ہیں۔ کہتے ہیں پولک پنسل وہ ہوتا ہے کہ جس کے دونوں سروں پر مٹانے کا ربڑ لگا ہوا ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا ڈونٹ بن جائے گا اگر پولینڈ کے اطراف خاردار تار لگا دیا جائے۔

● امریکی مزاح زیادہ تر ستم ظریفی کی تعریف میں آتا ہے۔
ایک شخص کے مرنے پر چرچ کے پادری نے اس کے لئے دُعائے مغفرت کرتے ہوئے بڑی تعریف و توصیف

کی کہ مرحوم بڑے نیک ۔ وفا شعار شوہر بہترین باپ اور ہمسایہ تھے ۔ وہ جتنی تعریف کر رہے تھے اتنی ہی ان کی بیوہ جز بز ہو رہی تھی بالآخر ان سے رہا نہ گیا۔ انہوں نے کہا "کہیں ہم غلط آدمی کو تو نہیں دفنانے چلے ہیں۔

★ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے فرنچ لطیفے ان کے مزاج کے مطابق جنسیات سے متعلق ہوتے ہیں ایک فرنچ مرد کی بیوی کا انتقال ہوا تو ان کے بہت سے قریبی اور عزیز ناکتخدا دوست چلا چلا کر ماتم کر رہے تھے اور واویلا مچا رہے تھے ۔ مرحومہ کے شوہر نے دل جوئی کرتے ہوئے کہا فکر نہ کیجئے میں بہت جلد دوسری شادی کرنے والا ہوں۔

★ مشرقی و مغربی جرمنی کی سرحد پر ایک شخص روزانہ سیکل پر ڈھیر سی گھاس لے جایا کرتا تھا۔ کسٹم والے بڑی احتیاط سے تنکے تنکے کو دیکھتے اور خوب تلاشی لیتے کہ کہیں یہ شخص کچھ اسمگل تو نہیں کر رہا ہے مہینوں آتے جاتے جانچ ہوتی رہی لیکن انھیں کوئی قابل گرفت چیز نہیں ملی۔ بڑے عرصہ تک یہ سلسلہ جاری رہا اور پھر وہ شخص لاپتا ہوا نہیں دکھائی دیا۔ اتفاقاً کسٹم کے ایک عہدہ دار سے بڑے عرصے کے بعد اس کی مڈبھیڑ ہوئی تو اس نے کہا تم جو بھی کرتے تھے وہ تو آئی گئی بات ہو گئی لیکن تم مجھ سے راز میں صحیح صحیح بات بتاؤ کہ تم اس طرح کیا کیا کرتے تھے ؟ اس جرمن نے سادہ سا جواب دیا "سیکلوں کی اسمگلنگ"!

■ اطالوی میاں بیوی نے قلیل پس اندازی اور بچت کے پیش نظر یہ طے کیا کہ جب کبھی بھی محبت کریں ایک ڈبے میں ۱۰۰ لیرا جمع کرتے جائیں گے ۔ یہ سلسلہ بہت دنوں چلا۔ ضرورت کے وقت جب یہ ڈبہ کھولا گیا تو اس میں ۵۰۰ اور ۱۰۰۰ لیرا کے بے حساب نوٹ نکلے ۔ شوہر نے متحیر ہو کر پوچھا یہ کیا ؟ اتنے سارے لاٹ تو میں نے نہیں ڈالے ؟ بیوی نے تنک کر کہا "تم سمجھتے ہو کہ دوسرے لوگ تم جیسے کنجوس اور چھوٹے دل کے ہیں !"

▲▽ سوئیزرلینڈ کے باشندے نے تعلّی سے کہا "اگر میرے پاس شاہ ایران کی ساری دولت ہوتی تو میں اس سے زیادہ ہی امیر ہوتا۔ سوال کیا گیا کہ وہ کیسے ؟ اس نے جواب دیا "خود میرا اپنا روپیہ پیسہ بھی تو شاہ ایران کی دولت میں اضافہ کرتا ہے !

■■ ایک مرفع الحال اور مالدار اسپانش شخص اپنے کھلے لان پر بیٹھ کر مزہ مزہ کے ذائقہ دار کھانے کھا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر ایک غریب اور بہت ہی ناتواں شخص کے منہ میں پانی آ گیا رک کر اس نے کہا " دیکھئے جی میں نے تین دن سے کھانا نہیں کھایا " اس مالدار شخص نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی اس بھوکے نے دُہرایا کہ اس نے تین دن سے کچھ نہیں کھایا۔ اس شخص نے پھر بے اعتنائی کا اظہار کیا اور سنی ان سنی کر دی جب تیسری بار اس غریب نے یہی کہا کہ اس نے تین دن سے کچھ نہیں کھایا تو مالدار اسپانش اپنا کھانا ختم کرتے ہوئے بیزارگی سے بڑبڑایا۔ "ارے یہ کم بخت نہ تو خود کھاتے ہیں اور نہ کسی اور کو کھانے دیتے ہیں !"

★ آئرلینڈ سے آکر بسنے والوں کے متعلق بہت لطیفے ہیں کسی نے دیکھا کہ اس کے آئرش دوست کا ایک رخسار بُری طرح جلا ہوا ہے ۔ اس نے حیرت سے پوچھا۔ یہ کیسے ہوا ؟ آئرش نے جواب دیا۔ یار کل میں کپڑے

استری کر رہا تھا اور گرم گرم استری ہاتھ میں تھی ۔ یکایک ٹیلی فون بجنے لگا اور میں نے استری کو ٹیلی فون کے آلہ کی طرح اپنے کان سے لگا لیا ۔

◪ امریکن نیگرو نے اچانک گھر لوٹنے پر اپنی بیوی کو کسی اور کی آغوش میں دیکھ کر انتہائی غصہ میں بدلہ چکانے کے لئے اپنا پستول نکالا اور اپنی ہی کنپٹی کا نشانہ لینے لگا ۔ بیوی نے حیرت سے کہا ارے یہ کیا غضب کر رہے ہو ؟ امریکن نیگرو نے خاطر جمعی سے جواب دیا ۔ میری فکر نہ کرو میرے بعد تم دونوں کی باری ہے ہوشیار رہنا ۔

✱ ویسٹ انڈیز کے ایک شخص کی جوان لڑکی اپنی بد احتیاطی اور عیش پسندی کی وجہ سے حاملہ ہوگئی ۔ جیسے ہی یہ بات اس کے باپ کے علم میں آئی اس نے اس کے بوائے فرینڈ کا نام اور پتہ پوچھ کر بندوق سنبھالی اور کہنے لگا کہ میں اس کو قتل کر دوں گا اور جب وہ سچ مچ بندوق تان کر اس کو نشانہ بنایا تو اس لڑکے نے رحم کی درخواست کرتے ہوئے مجھے معاف کر دیجئے اگر لڑکی پیدا ہوگی تو میں آپ کو ۲۰۰ ڈالر دوں گا اور لڑکا تولد ہوا تو ۱۰۰۰ ڈالر ۔ اس کا حتمی وعدہ کرتا ہوں ۔ باپ نے بندوق نیچی کر لی اور کہا اگر یہ حمل ساقط ہو جائے تو میں تمہیں ایک موقعہ اور دوں گا ۔

●● ایک برٹش نسل کے امریکن کو دیکھا کہ وہ اپنے چھوٹے لڑکے کو پرام میں بٹھا کر باغ میں گزر رہا ہے اور بچہ ہے کہ زور زور سے بے تحاشہ رو رہا ہے چلا رہا ہے باپ اس کو بار بار پچکار رہا ہے ۔ مرون اپنے آپ پر قابو رکھو اپنے آپ کو سنبھالو ۔ پاس سے گزرنے والی ایک عورت نے یہ تماشہ دیکھ کر تعریفی انداز میں کہا ۔ آپ بڑے پُرسکون اور خاطر جمع فطرت اور خصلت کے لگتے ہیں کہ اپنے بچے مرون کو پچکار رہے ہیں اور خود ذرا بھی غصہ نہیں کرتے ۔ باپ نے کہا مرون تو میرا نام ہے لڑکے کا نام آلی ورہے ۔

♣ ایک فلاگ پول سے لگے ہوئے تین روسی ایک دوسرے کے کندھے پر چڑھے ہوئے ٹیپ سے ناپ لے رہے تھے قریب سے گزرنے والے ایک شخص نے یہ تماشہ دیکھ کر ان سے کہا ۔ ارے بھئی اتنی مصیبت کیوں اٹھا رہے ہو اس فلاگ پول کو اکھاڑ کر زمین پر لٹا دو اور آسانی سے ناپ لو ۔ روسی نے کہا سمجھتے نہیں آپ ۔ ہمیں اس فلاگ پوسٹ کی اونچائی ناپنا ہے لمبائی نہیں ۔

♣ سویڈن نسل کے ایک پیرانہ سال بڈھے کی موت پر وکیل نے اس کی وصیت اس کے بچوں کو سنائی ۔ یہ ہوش و حواس اور دماغی ہوشیاری کی وجہ سے میں نے مرنے سے پہلے اپنی جمع پونجی خرچ کر دی ہے اب کچھ باقی نہیں !

❀ لاس انجلیس کی ایک گھٹیا اور غلیظ سی ہوٹل میں ایک ایکٹر کھانے کے لئے گیا ۔ یہ کسی زمانے میں مقبول و معروف تھا لیکن بدلے حالات میں مفلس ہوگیا تھا ۔ میز پر آرڈر لینے کے لئے جو بیرا آیا تو اتفاقاً وہ کسی زمانے کا ساتھی نکلا جو اپنے زمانے میں کافی مشہور اور مرفع الحال تھا ۔ پہلے ایکٹر نے تعجب سے

اس سے پوچھا "ارے یار تم بھی یہاں"؟ دوسرے نے فخریہ انداز میں کہا" ہاں جی یہاں کام ضرور کرتا ہوں مگر اس سڑی ریسٹورنٹ میں کھاتا پیتا نہیں۔

★★ میکینکن مسز مرفی کا قصہ ہے کہ اس نے چرچ سے واپس ہوتے ہوئے اپنی سہیلی کو بتایا کہ جمی اسکالر کل گھر آرہا ہے۔ سہیلی نے کہا بڑی خوشی کی بات ہے۔ میں نے تو سمجھا تھا کہ وہ ۵ سال کے لئے جیل بھیجا گیا ہے۔ مسز مرفی نے کہا درست ہے لیکن اچھے چال چلن کی وجہ سے اس کو قبل از وقت رہا کیا جارہا ہے سہیلی نے کہا یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے کہ تمہارا لڑکا اچھے چال چلن کا ہے۔

✱ امریکی ریڈ انڈین دراصل امریکہ کے اصلی باشندے ہیں لیکن انھیں مختلف ریاستوں میں جہاں بھی ان کی تعداد معتد بہ تھی رزرویشن کے ذریعہ پابندی لگادی گئی ہے کہ وہ وہیں پر آباد رہیں ان میں بہت ساروں کی زمین پر تیل کے خزانے نکلنے پر مرفہ الحالی بھی ہے اس کے باوجود بعض علاقوں میں پانی کی قلت کی وجہ سے وہ پانی سے غسل بھی نہیں کرپاتے۔ چٹانوں کو آگ سے تپا کر قریب بیٹھ جاتے ہیں اور پسینے سے غسل کرلیتے ہیں ایسے ہی ایک علاقہ کی بڑی اچھی ریسٹورنٹ میں ہم اپنے ایک امریکی دوست کے ساتھ ڈنر کے لئے گئے اور آرڈر دیا۔ برابر کی میز پر ایک امریکی ریڈ انڈین کو دیکھا کہ تھوڑی سی دیر میں ڈنر کے دس بارہ کورس ختم کئے۔ ہمارے امریکی دوست نے خوش مزاجی سے کہا۔ تمہاری بھوک تو بڑی زبردست لگتی ہے کاش کہ تمہاری اشتہا مجھے مل جاتی ریڈ انڈین نے منہ بچلا کر نہایت ہی غصیلی آواز میں کہا"تم گورے امریکیوں سے مجھے سخت نفرت ہے۔ ہماری جنم بھومی میں آکر ہم کو دھکے دے دے کر ہمارا سب کچھ لے لیا اور اب میری بھوک بھی چھین لینا چاہتے ہو۔

▼▼ شرلی ٹیمپل کے آباؤ اجداد ساؤتھ امریکہ سے آکر نیویارک میں بس گئے تھے اس کی شادی شدہ زندگی میں فارغ البالی نہ تھی اس کا شوہر راجر کسی کمپنی میں سیلس مین تھا ایک مرتبہ وہ کچھ عرصہ کے لئے ٹورانٹو گیا ہوا تھا تنگدستی کے ساتھ بوریت بھی تھی ایک دن گھنٹی بجنے پر دروازہ کھولا تو خوش رو نوجوان نے مسکراتے ہوئے اندر آنے کی اجازت مانگی اور بتایا کہ اس کا نام ہنری ہے وہ راجر کو جانتا ہے۔ بڑی دیر تک باتیں ہوتی رہیں بات پر بات نکلتی رہی تکلف کے پردے ہٹتے گئے بالآخر وہ شخص التفات کا سہارا لے کر بہت قریب ہونے لگا اور شرلی کو لالچ دی کہ اس محبت میں قربت پر ۱۰۰۰ ڈالر دے گا۔ مالی اعتبار سے ٹوٹی ہوئی شرلی رقم بہت کم تھا اور اس نے ہاں کہدیا۔ کچھ ہی دنوں بعد راجر لوٹ کر گھر آیا اور پوچھا کیا میرا دوست ہنری آیا تھا۔ اس نے کہا ہاں آیا تو تھا راجر نے پھر پوچھا اس نے تمہیں ایک ہزار ڈالر دیئے۔ شرلی بڑی پریشان تھی کہ اس کا راز کیسے کھل گیا وہ سوچ ہی رہی تھی کہ راجر نے کہا۔ میں نے ٹورانٹو سے اس کے ہاتھ تمہارے لئے ۱۰۰۰ ڈالر بھیجے تھے۔ غریب سادہ لوح شرلی!

ایری زونا کے ڈینس کی ہفتہ وار یافت صرف ۱۰۰ ڈالر تھی اور یہ اسٹاک اکسچینج کے دفتر میں معمولی اہلکار تھا لیکن اس کے رکھ رکھاؤ اور ٹھاٹھ دار زندگی سے ایسے لگتا تھا کہ وہ بہت بڑا افسر ہے نئی سے نئی کار اس کے پاس ہوا کرتی شہر سے دور ایک باغ تھا اور اچھی سے اچھی ہوٹل میں روزآنہ ہی دوستوں کے ساتھ کھانا پینا ہوتا۔ کام میں بھی ہوشیار تھا لیکن اس کو کوئی ایسے مواقع نہ تھے کہ جس سے گمان ہو کہ وہ کمپنی کا پیسہ ناجائز طور پر اڑا رہا ہے۔ اس کے حاکم اعلیٰ نے یہ شب و روز دیکھ کر ایک دن اس سے پوچھ ہی لیا۔ کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے اور اس شان و شوکت کا راز کیا ہے جب کہ وہ خود ۱۰۰۰ ڈالر ہفتہ وار تنخواہ کماتا ہے اور یہ ساری چیزیں اس کو نصیب نہیں، ڈینس نے جواب دیا جی میں خانگی طور پر ہر ہفتہ رافل اور لاٹری چلاتا ہوں حاکم نے متحیر ہو کر پھر پوچھا۔ رافل۔ کاہے کا رافل کس بات کا رافل؟ ڈینس نے جواب دیا میرے ہفتہ وار ۱۰۰ ڈالر کے چیک کا!

میکسیکو کے کلم جانسن کو شہتیر اور لکڑی کاٹنے کے کارخانے میں نوکری ملی۔ کچھ دنوں بعد اس کارخانے کے مالک نے معائنہ موقع پر دیکھا کہ کلم جانسن بڑے آرام سے بیٹھا ہے اور ایک دوسرا ہی شخص ولیمس محنت اور عرق ریزی سے لکڑیاں کاٹ رہا ہے۔ مالک نے پوچھا یہ کیا بات ہے میں نے تم کو نوکر رکھا تھا نہ کہ اس اجنبی کو۔ جانسن نے کہا آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں ولیمس کو ۳ ڈالر فی تختہ کے حساب سے ادا کر رہا ہوں۔ مالک نے بے حد تعجب سے پوچھا۔ میں تو تمہیں صرف ۲ ڈالر معاوضہ دے رہا ہوں اور تم اس کو ۳ ڈالر دے رہے ہو؟ جواب ملا "جی صاحب یہ تو مجھے بھی معلوم ہے لیکن سوچئے تو میں اپنے آپ کو کتنا بڑا باس محسوس کرتا ہوں وہ بھی محض ایک ڈالر کے عوض میں!

ہربرٹ لیاٹن امریکی ہے بیروزگار ہونے کی وجہ سے اس نے گھڑیاں بنانے والے کارخانے کے اشتہار کے جواب میں اپنی ملازمت کے لئے عرضی دی جس کا مشاہرہ ہفتہ وار ۱۰۰ ڈالر تھا اپنی درخواست میں اس نے لکھا کہ اس کو ۲۰۰ روپیہ فی ہفتہ تنخواہ چاہیئے مالک کارخانہ نے انٹرویو کے وقت پوچھا "کیا تم نے اس سے پہلے کسی کارخانہ میں اس قسم کا کام کیا ہے اور تمہیں اس کا کوئی تجربہ ہے درخواست گزار نے کہا "جی نہیں"! "تو پھر تمہاری یہ جرأت کہ بغیر کسی جانکاری یا تجربہ کے تم اتنی بڑی تنخواہ مانگتے ہو؟ ڈینس نے کہا "جی ہاں مجھے یقیناً زیادہ معاوضہ ملنا چاہیئے کہ آپ کے کارخانہ کا کام میرے لئے بہت ہی زیادہ کڑا ہوگا اور مجھے زیادہ ہی محنت و مشقت سے کام کرنا ہوگا۔ کیوں کہ نہ مجھے جانکاری ہے اور نہ تجربہ!

دہلی فی نولا کی ایک شوخ و طرار لڑکی اپنے دفتر سے چھٹی لے کر تفریح کے لئے یورپ گئی اور جب واپس آئی تو بہت سارے قیمتی ڈریس اور ڈھیروں تحفے ساتھ لائی اس کی سہیلی نے پوچھا ارے واہ بڑے ٹھاٹھ ہیں یہ سب کہاں سے لائی ہے اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ میری خوش قسمتی سمجھو کہ جہاز پر ہی ایک متمول انگریز مل گیا اس نے محبت کی خوب پینگیں بڑھائیں اور اس نے مجھ پر ۲۰۰۰ ڈالر نچھاور کر دیئے۔ سہیلی نے اس کی قسمت [illegible]

کی داد دی۔

کچھ عرصہ بعد وہ بھی چھٹی پر گئی اور جب واپس آئی تو وہ بھی اسی طرح شان دار بیش بہا کپڑوں اور تحفوں سے لدی پھندی آئی۔ پہلی سہیلی نے پوچھا۔ لگتا ہے تجھے بھی ایک مالدار شخص مل گیا تھا؟ اس نے کہا۔ مجھے ایک نہیں ملا بلکہ بیس آدمی ملے جن میں سے ہر ایک نے مجھ پر ۱۰۰ ڈالر خرچے۔

ہندوستانی اور پاکستانی جو امریکہ میں بس گئے ہیں ان سے متعلق بھی بڑے دل چسپ لطیفے گھڑے گئے ہیں چند مثالیں کارٹون کی شکل میں الگ پیش ہیں۔*

امریکی مزاح نگار: ہم نے یہاں کے چند مشہور اور منفرد مزاح نگاروں سے راست ربط قائم کر کے ان کی تخلیقات اور جدت طرازیوں کا مطالعہ کیا ہے۔ جس کی مختصر روئیداد حسب ذیل ہے!

I. WOODY ALLEN پیروڈی لکھتے ہیں۔ مضحک واقعات قلم بند کرتے ہیں۔ اور ہر وقت یہی کہتے ہیں کاش میں وہ نہ ہوتا کہ جو میں ہوں۔

II. MERVYN J. HUSTON ناول نگار ہیں۔ لیکن ان کی ظرافت پر انہیں STEPHEN LEACOCK AWARD ملا ہے۔ یہ کتاب کا نام "GOOPHEWS DON'T PAY TAXES" ہے

III SAMLAVENSEN امریکہ کے مزاح نگار کی حیثیت سے کافی مقبول ہیں۔ خوش مذاقی اور فراست ان کی تخلیقات میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ جس کی وجہ سے ہنسی اور انبساط کے ساتھ دماغی تربیت بھی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ یہ قلم چلاتے ہوئے معاشرہ پر طنز کے وار بھی کرتے ہیں۔ ٹی وی پر یہ گل فشانی کرتے ہیں۔ "YOU DON'T HAVE TO BE IN WHO IS WHO TO KNOW. WHAT IS WHAT" ان کی بے حد دل چسپ تصنیف ہے۔ نیویارک شہر کے تعلیمی بورڈ کے یہ TEACHER EMARATUS ہیں۔

IV ARTHUR BLOCK کا مزاح بالکل نئے انداز کا ہے۔ جس میں فکر و دانش نصیحت اور فضیحت کے عناصر ملتے ہیں۔

"MURPHY'S LAW & OTHER REASONS WHY THINGS GO WRONG" میں انہوں نے PARKINSON LAW - PETER PRINCIPLES اور COLE'S LAW (گوبھی) وغیرہ کچھ اس طرح پیش کئے ہیں کہ اس کو معجزوں کی کتاب کہا جانے لگا ہے۔ اور ان کے مشاہدات و منقولات کو مرفی کا قاعدہ اور قانون کہا جاتا ہے۔ ان کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

اگر کوئی کام بگڑ جائے تو اس کو سرہانے کی کوشش اس کو بدتر کر دیتی ہے۔ اگر تم مخالف کو ہم رائے نہ کر سکو تو اس کو الجھن میں مزید ڈال دو کسی بے وقوف سے حجت نہ کرو۔ لوگ اس میں اور تم میں فرق نہ کر سکیں گے امریکی کو کبھی یہ نہیں پوچھنا کہ کسی چیز کی کیا قیمت ہے صرف یہ سوچتا ہے کہ اس کی خریدی میں کتنی بچت ہو رہی ہے۔

---

* یہ کارٹون سالنامہ میں شامل کئے جا رہے ہیں (ادارہ)

بالخصوص عورتیں۔ جو آدمی خود کچھ نہیں کرتا اس کے لئے کوئی بھی کام ناممکن نہیں ہوتا۔ بلند و بالا مرتبہ پر بیوقوف کی مثال اس آدمی کی ہے کہ جو کسی اونچے پہاڑ پر بیٹھا ہے اس کو ہر چیز چھوٹی نظر آتی ہے اور وہ خود سب کو چھوٹا دکھائی دیتا ہے۔

سارے کام بگڑ جانے پر بھی کوئی مسکراتا رہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس نے کسی اور کو مورد الزام ٹھہرانیکا تصفیہ کر لیا ہے۔

کسی مسئلہ کا حل ڈھونڈتے وقت اگر اس کا حل پہلے سے معلوم ہو تو بڑی سہولت ہوتی ہے۔

کسی مسئلہ کا حل، اس مسئلہ کی نوعیت ہی کو بدل دیتا ہے یا نیا مسئلہ کھڑا کردیتا ہے کوئی تجربہ ناکام نہیں ہوتا ناکامی بھی ایک طرح کی منفی کامیابی ہے۔

دوست آتے جاتے رہیں گے لیکن دشمن جمے رہیں گے دشمنوں کی کمی ہے تو دوستوں سے مہربانی کرتے رہیئے۔

V MISS FRAN LEKAWITZ بھی اچھی طنز نگار ہیں۔ تبصرہ نگاروں کا کہنا ہے کہ جو صبح نیند سے ہشاش بشاش بیدار نہیں ہوتے انھیں METROPOLITENLIFE کو پڑھکر دن کی شروعات کرنا چاہیئے یہ بنکنگ، موسم، موسیقی، خوراک سب ہی موضوعات پر قلم برداشتہ لکھتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ زندگی فنون لطیفہ کی آئینہ دار ہے اور اس کی عکاسی کرتی ہے نہ کہ اس کا الٹ۔

VI. ART BUCHWARD یہاں کے سب سے زیادہ ہر دلعزیز صحافی اور مزاح نگار ہیں۔ ان کی چالیس سالہ صحافتی تخلیقات پر پلٹزر اوارڈ دیتے ہوئے پلٹزر بورڈ نے بتایا کہ ان کا مزاح شراب کی طرح ہے کہ وہ جتنی پرانی ہوتی ہے اتنی ہی پسندیدہ ہوجاتی ہے۔

ان کی تخلیقات کے منجملہ حسب ذیل بہت مقبول ہیں۔

1, DOWN THE SEINE, UP THE POTOMAC, WITH ART BUCHWALD.

2, THE ESTABLISHMENT IS ALIVE & WELL IN WASHINGTON.

3, I AM NOT A CROOK.

4, WASHINGTON IS LEAKING.

پانچ سو سے زیادہ رسائل ان کی تخلیقات شائع کرتے ہیں اور ان کا کالم پانچ سو سے ہزار الفاظ پر مشتمل ہوتا ہے جس سے صرف گدگدی ہی نہیں ہوتی بلکہ لوگ سوچ بچار میں پڑجاتے ہیں ان کے کالم کا مستقل عنوان ہے۔ CAPITOL PUNISHMENT۔ یہ امریکہ کی زندگی پر نشتر چلاتے ہیں۔ عنوان ہوگا HONEY MOON IS OVER۔ لیکن امریکہ کے صدر ریگن کی معاشی پالیسی کی ناکامی اصل موضوع ہوگا۔ ALL PROPHET AND LOSS کے تحت کمپیوٹر پر قلم چلائیں گے۔ عنوان ہوگا ZEROBASE LUNCHEON

[illegible]

ہنسنے ہنسانے کا کارخانہ - کامیڈی ورکشاپ : ریڈیو ٹی وی اور اپنی ساری تصنیفات میں یہ بانگ دھل
امریکہ کے تین مشہور کامیڈین کہہ رہے ہیں "دن میں ایک بار
ضرور ہنسئے اور ڈاکٹر کو دور رکھیئے" LAUGH FACTORY, COMEDY WORK SHOP کے نام سے ایک ادارہ
قائم کیا گیا جس کی طرف سے امریکہ کے BUGS BUNNY COMICS کے خالق GARY POOLE اور VINCE DONATO کے اشتراک
سے ایک کتاب لکھی ہے۔ جس میں اُنھوں نے بتایا ہے کہ صرف ہنس ہنس کر بیماریوں کا علاج بآسانی کیا جاسکتا ہے۔ FEEL
"HOW TO LAUGH - ان کی کتاب کا نام ہے۔ GREAT ENTER PRIZES INCOR DORATED
AND BE WELL" - جس میں اس طرح کے لطیفے اور کارٹون جمع کئے گئے ہیں کہ جن سے ایک خاص قسم کی اعصابی کسرت
یا ورزش ہوتی ہے جس سے ہنسی کے رگ و ریشے پھڑک اُٹھتے ہیں اور چہرہ سے پژمردگی دور کردیتے ہیں۔ VINCE
DONATO - اس مقولہ کے قائل ہیں کہ دل کھول کر ہنسنے سے بڑھ کر کوئی دوا ہے نہ علاج یہ ہر قسم کے وٹامن سے بہتر
ہے میامی کے DR. GILBERT FAUST کا کہنا ہے کہ تمام ڈاکٹر اس بات سے متفق ہیں کہ مریض اگر ہنسنے کے موڈ کو
اپنالیں تو ان کی بیماریاں فوراً رفع دفع ہوسکتی ہیں۔ ہنسی کو اس قدر متعدی ہونا چاہیئے کہ اس کی تاثیر کبھی کم نہ ہو نفسیات
کے ماہرین بھی بتاتے ہیں کہ کھل کھلاکر ہنسئے تو دماغی اُلجھنیں خود بخود دور ہو جاتی ہیں۔ ظرافت اور مزاح کی حس رکھنے والے
طویل العمر ہوتے ہیں۔ صحت مند رہتے ہیں اور ان کا دماغی توازن قائم و برقرار رہتا ہے DR. RANDOLPH DREIKERS
شکاگو میڈیکل اسکول میں نفسیات کے پروفیسر ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ مریض اگر اپنی صحت کے تعلق سے نفسیاتی طور پر اپنے
دل و دماغ کو پرسکون بنالے اور خاطر جمعی سے کام لے تو اس کی بیماری خود بخود بھاگ جائے گی وحشت ناک اور خوفزدہ کرنے
والی باتوں پر ہنس کر ٹالنے کی کوشش کی جائے تو ہمارے دماغ سے پریشانی نکل جاتی ہے۔

امریکہ کے ان چوٹی کے ڈاکٹروں نے کچھ ہدایتیں، اصول اور تجاویز پیش کی ہیں جن پر عمل کیا جائے تو محض ہنسی
جو ساری بیماریوں کی دوا قرار پائی ہے آپ کو صحت مند رکھ سکتی ہے۔

۱۔ اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھیئے کہ آپ کے اطراف اور آپ کی صحبت و محفل میں ایسی کوئی بھی بات ہو جو ہنسنے ہنسانے
پر آپ کو مائل کرسکتی ہے تو اس کو اپنا لیجئے۔ محفوظ کر لیجئے۔ اس طرح خوشگوار اثر قبول کرنے کی صلاحیت کو تازہ دم رکھیئے
۲۔ مضحکہ خیز واقعات وقوع پذیر ہوتے ہی رہتے ہیں ان سے غافل نہ رہیئے ان سے لطف اندوز ہونے کا سلیقہ پیدا
کرنے کی کوشش کیجئے ایسے لوگوں کی صحبت میں رہیں جو خوش مذاق اور زندہ دل ہیں تو بذلہ سنجی اور لطافت کی باتوں کی
طرف انہیں وقتاً فوقتاً مائل کرسکتے ہیں۔ اور ان کی خوش گفتاری سے اپنے آپکو بھی تازہ دم رکھ سکتے ہیں حتیٰ کہ یہ موڈ
نہ صرف مستقل بلکہ متعدی بن جائے گا۔

۳۔ ہنسنے کا نظام العمل : اپنی دن بھر کی مصروفیات میں کچھ وقت ہنسنے ہنسانے کے لئے مقرر کردیجئے جس میں آپ

ان سے توتلی باتیں سنئے، ان کی معصومانہ حرکتیں دیکھئے اور اُن سے لطف اندوز ہوئیے۔ جس طرح لوگ اپنی صحت بنانے کے لئے جسمانی ورزش کسرت اور یوگا کے لئے وقت مقرر کر لیتے ہیں اسی طرح اس تجویز پر بھی بالالتزام عمل کیوں نہیں کیا جا سکتا؟

۴۔ قدرت کی طرف سے معطیہ نعمتوں پہ نظر رکھئیے ان پر ایسے وقت اظہار تشکر کیجئے جب اضمحلال ہو افسردہ دلی یاسیت اور قنوطیت کا دورہ پڑے۔ طبعیت از خود بحال ہو جائے گی

۵۔ چھوٹی سی چھوٹی غیر اہم اور بہ ظاہر ہنسنے ہنسانے کی بات نہ بھی ہو تو کھل کھلا کر اور قہقہہ لگا کر ہنسنے کی کوشش کیجئے۔ نقلی ہنسی اصلی بن جائے گی۔

۶۔ ذہن نشین کر لیجئے کہ کھل کھلا کر ہنسنا غیر مہذب ہے نہ ثقافت سے دور۔ ہنسی کی میکانکس اسی طرح ہے کہ جیسے سردیوں کی صبح میں موٹر کار بڑی مشکل سے اسٹارٹ ہوتی ہے۔ لیکن ایک بار مشین چالو ہو جاتا ہے تو اس میں خود بخود طاقت آجاتی ہے اور وہ چل پڑتی ہے۔ اسی طرح دل و دماغ میں گرمی لائیے آنکھوں میں روشنی اور چمک ان سے چہرے کے اعصاب کھل جاتے ہیں تو پھر پورے جسم کی مشنیری ہر قسم کے حادثات اور واقعات کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہوجاتی ہے۔ مسکرائیے ہنسئے اور قہقہے لگائیے۔

"کس طرح ہنسیں اور بیماریوں سے محفوظ رہیں": ان کی ایک اور تصنیف ہے جس میں ایسی اعصابی ورزشیں بتائی گئی ہیں کہ جن سے انسان خود بخود ہنسی کی طرف مائل ہوجاتا ہے اور دلپذیر قہقہہ کھڑی ہوجاتی ہے۔

کسرت اور ورزش

اپنی آنکھیں جس قدر کھول سکتے ہیں کھول لیجئے۔ ابرو جتنا اوپر چڑھا سکتے ہیں چڑھا لیجئے۔ منہ کھول ڈالئے تاکہ ناک اور ٹھوڑی کے ساتھ جڑی ہوئی رگیں کھل جائیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنی زبان ہونٹوں کے باہر نکال لیجئے۔ اس پوز میں پانچ دس سکنڈ رہیے۔ سارا اعصابی تناؤ دور ہو جائے گا رگیں اور شریانیں کھل جائیں گی۔ اس طرح نہ صرف ہونٹوں پہ ہنسی کھیلنے لگے گی بلکہ سارا چہرہ مسرت و انبساط سے دمکنے لگے گا اور دل و دماغ ہشاش بشاش ہو جائیں گے۔

ڈاکٹر ڈیتا ٹو کا مقولہ بہت صحیح ہے کہ خدا نے ہمیں سب سے بڑی نعمت ہنسنے ہنسانے کی صلاحیت کی شکل میں دی ہے اور ہم کو اس کا بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیئے ان کا دعویٰ ہے کہ ان کے مشورے پر عمل کر کے ہر شخص زندہ دلی کا مرقع بن سکتا ہے اور اپنی خوش دلی سے دوسروں کو بھی خوش و خرم رہنے کی ترغیب و تحریص دے سکتے ہیں خوش گوار ماحول اور پر مسرت فضا پیدا کر کے روزمرہ کو لطف و انبساط سے بھرپور بنا سکتا ہے ان کی تصنیف HOW TO LAUGH AND BE WELL میں حسب ذیل عنوانات کے تحت بڑی دلچسپ اور قابل عمل تدابیر کی وضاحت کی گئی ہے۔

"جذبات اور حسیات سے انسان کس قدر متاثر ہوسکتا ہے"۔
"دواؤں کے علاج معالجہ کا ہنسنے ہنسانے سے تعلق"۔
"ہنسی سے کس طرح جذباتی ہیجان دور کیا جاسکتا ہے"۔
"مسکرانے سے شگفتہ اور کیمیاوی تاثرات"۔
"ہنسی کی تھراپی ۔ THERAPY"۔
"ہنسی کے نفسیاتی فوائد"۔
"سماج کو متاثر کرنے والے معاشرتی فائدے"
"محض ہنسی سے علاج معالجہ"۔ وغیرہ وغیرہ ۔

مطالعہ اور مشاہدہ نے یہ ثابت کیا ہے کہ ہنسنے ہنسانے کا مواد نئی تراش خراش ایجاد و اختراع سے ہی نہیں بنتا بلکہ پرانی شراب نئی بوتل والی بات صادق آتی ہے۔ پرانی باتیں نئے انداز نئے اسلوب اور نئی ترکیب سے بیان کی جائیں تو وہ پرانی نہیں کہلاتی ہیں۔ لطیفہ نہ کبھی باسی ہوتا ہے نہ سڑتا ہے۔ جنہوں نے پہلے سنا ہو وہ بھی ازسرنو محظوظ ہوسکتے ہیں۔ راگ الاپ، سُر، خیال سب ہی کچھ موسیقی کی راسائیں ہیں۔ ہر گائک انھیں کے سہارے محفل کو گرماتا ہے سامعین کو محظوظ کرتا ہے۔ یہ کبھی نہیں کہتا کہ اگر یہ راگ آپ نے پہلے سنا ہے تو مجھے روک دیجئے۔

ہنسی کا کارخانہ : اس ادارہ نے حسب ذیل کتب شائع کی ہیں۔
۱۔ لطیفے کس طرح بیان کرنا چاہیئے۔ (کچھ تفصیلات آگے ملاحظہ فرمائیے)
۲۔ کیا کہنا چاہیئے اور کیا نہ کہنا چاہیئے (کچھ تفصیلات آگے ملاحظہ فرمائیے) ۳۔ LAUGH YOUR "A." OFF A سے مراد ہے Anxiety اور اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ دماغی خلش اور ذہنی الجھن کو کس طرح دور کیا جاسکتا ہے۔ ۴۔ لطیفے کس طرح مرتب کئے جائیں اور اپنی صلاحیت سے کس طرح کام لیا جائے۔ ۵۔ اپنے شب و روز کس طرح روشن اور منور بنائے جاسکتے ہیں۔ ۶۔ مزاحیہ قصّے کہانیوں کے ٹیپ سنتے رہیں اور ان سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت کو ابھاریں۔

مقبول جرائد کے جو مستقل عنوانات ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ امریکہ میں مضحکات کتنے پسند ہیں۔
"باوردی (فوجی) مزاح۔ قابل نقل منقولات۔ روزمرہ کی زندگی میں لمحات مسرت۔
قہقہہ بہترین علاج۔ کیمپس کا مذاق۔ انفرادی جھلکیاں۔ یادگار لمحات۔
کھیل کے میدان سے۔ بچوں کی زبان سے۔ اپنا پسندیدہ چٹکلہ۔
مہمان میزبان وغیرہ وغیرہ۔
ان موضوعات کے تحت مختصر واقعات بطور حکایات لکھ کر بھیجے جائیں تو خاطر خواہ انعام ملتے ہیں۔

نمبر ۱ سے [illegible] گوئی کے ضمن میں جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں ان کا ملخص :-

کہنا ہو اس کے لئے قبل از [illegible] اری از بس ضروری ہے ورنہ دوران تمہید ہی بوریت شروع ہو جاتی ہے۔ اور [illegible] قم یا مقرر الجھن میں پڑ جا[illegible] [illegible] یا خاکساری کا شائبہ بھی نہیں ہونا چاہیئے ورنہ سُننے والوں کا دماغ کے زیر اثر لطیفہ اور مزاح قبول [illegible]۔

کبھی یہ نہ کہا جائے کہ شاید یہ آپ کا سُنا ہوا ہو اس کے ساتھ ہی کھوج کھاج کر لوگ اپنے دماغ پر اسی قسم کی اور واقعہ مرتسم کر لیتے ہیں اور اس کو باسی کھوسی سمجھ بیٹھتے ہیں۔

اندازِ بیان سے یہ ظاہر ہونا ضروری ہے آپ راست گوئی اور اخلاص سے کام لے رہے ہیں محض تفنع اوقات لئے کوئی بات نہیں دُھرا رہے ہیں۔

گہرائی فکر اور تبحر اسلوب کو جِلا دیتے ہیں ان کے بغیر دھندلا اور پھیکا پن آجاتا ہے۔

سادہ بیانی خوش کلامی نمک مرچ اور مسالہ سے زیادہ متاثر کن ہوتے ہیں۔

برابری کی سطح سے مخاطب سے متکلم ہونا چاہیئے اس کی تضحیک کرنے پر لطف اندوزی نہیں ہو سکتی۔

عامیانہ سطح پر گفتگو بیان اور لطیفہ کو گھٹیا بنا دیتی ہے۔ اندازِ بیانِ ایسا نہ ہو کہ سامعین سمجھیں کہ مقرران مخزانہ اور مشفقانہ توجہ کا طلبگار ہے۔

ابتداء سے ہی یہ واضح کر دیا جانا ضروری ہے کہ مقرر غیر ضروری طوالت کا علم بردار ہے موقعہ موقع سے کا اظہار ضروری ہے کہ بس اب ختم کر رہے ہیں وہی بات کہیئے جس پر آپ خود بھی ہنسنے پر مائل ہوں نہ کہ ایسی جو آپ کے متعلق کہی جائے تو آپ مغلوب الغضب ہو جائیں۔

یہ جان رکھئے کہ جو اپنے آپ کو ہر وقت ظریف ظاہر کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے وہ مسخرہ بن جاتا ظریف نہیں رہتا۔

کچھ نہ کچھ کہنے کا لزوم۔ دماغ میں کچھ نہ کہہ سکنے کا احساس اور ظرافت پیدا کرنے کا شوق ہر قسم کی حکمت عملی باوجود مخبوط کر دیتے ہیں۔

یہ نہ بھولئے کہ آپ خود اپنی نکات سے مطمئن رہتے ہیں لیکن ناقد اپنی رائے کو زیادہ مستحکم سمجھتا ہے۔

نمبر (۲) سے متعلق DO'S اور DONTS کے تحت بہت ساری ہدایتیں دی گئی ہیں ان کا اختصار حسب ذیل ہے:

- مزاح بیانیہ اور واقعاتی ہونا چاہیئے توضیحی تفسیری نہیں۔
- مختصر اور کم بیانی میں زیادہ مزاح ہوتا ہے طوالت اور لفظی ہیر پھیر میں نہیں۔
- موقع محل پر منطبق ہونا ضروری ہے غلط مقام سے گریز لازمی ہے۔
- تسلسل قائم رکھا جائے بیانیہ کا اگلا حصّہ پہلے نہیں بلکہ اپنی جگہ پر۔

۵۔ فی الفور اور ماحول سے لگاؤ ضروری ہے بدبیریا بے محابہ نہیں۔

۶۔ سامعین کی فہم و ذکاء سے میل کھانا لازمی ہے عقل و دانش سے ماورا نہیں۔

۷۔ بلا جھجک اور حاکمانہ بیان پر مشتمل ہو نہ کہ ندوس اور احساس کمتری کا مظہر۔

۸۔ مذاق سلیم سے لگاؤ چاہیئے گرانی نہیں۔

۹۔ ذہانت اور حاضر جوابی کا مرقعہ نہ کہ گول مٹول۔

۱۰۔ حکایتی انداز رواں دواں نہ کہ بیاں۔

۱۱۔ الڑکھاپن ضروری ہے نہ کہ گھسا پٹا۔

۱۲۔ بلا تمہید و طباق نہ کہ طول طویل تعارفی انداز میں۔

۱۳۔ مثبت اور بامعنی نہ کہ منفی اور لایعنی۔

۱۴۔ شیریں بیانی اور خوش کلامی نہ کہ کھردراپن لئے ہوئے۔

۱۵۔ ساحرانہ اور مسحرانہ نہ کہ اوچھا اور بے اثر۔

۱۶۔ مدلل ہونا ضروری ہے بے ربط نہیں۔

۱۷۔ لطیف اور سادہ نہ کہ کثیف اور بوجھل۔

۱۸۔ تال اور سر میں رہے بے سرانہ ہو جائے۔

۱۹۔ کڑ ہاکڑ ہا یا ترشا ترشایا نہ کہ محض تانا بانا۔

۲۰۔ ردعمل پر دھیان ضروری ہے سامعین کی بے توجہی کا باعث نہیں ہونا چاہیئے۔

۲۱۔ گہرائی اور گیرائی نہ کہ سپاٹ پن۔

گپ سازی: ان ہی لوگوں نے بتایا ہے کہ اور بازیوں کی طرح گپ بازی بھی ہے اور جس طرح بازیاں جاتی ہیں گپیں بھی کچھ کی کچھ شکل اختیار کرلیتی ہیں لیکن فی الحقیقت ان کا میدان اتنا وسیع ہے کہ اس کے کھلاڑی کبھی ہارتے نہیں اور نہ سبکی اٹھاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ گپ بازی کے لئے گپ سازی ضروری ہے جس کے لئے اور کارخانوں کی طرح گپ سازی کا کارخانہ بھی لازمی ہے۔ اور لطف یہ کہ ان کارخانوں میں نہ ہڑتال ہوتی ہے نہ اجرت و معاوضہ بڑھانے کا مطالبہ نہ بونس کی مانگ۔ عوام کے مطالبات سے نپٹنے کے لئے انہیں ہمیشہ اور ہمہ تن مصروف رہنا پڑتا ہے۔ گپ سازی اور لطیفہ سازی کے کارخانے مسلسل مصروف رہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک بار اس کا نسخہ ہاتھ آجائے اور عمل و عملیات کا دور ہوجائے تو اس کارخانے میں تعطل پیدا نہیں ہوتا البتہ جس طرح دیگر مصنوعات کے لئے خام مال درکار ہوتا ہے اسی طرح ان میں بھی کچھ اڑتے اڑائے واقعات کو حاصل کرکے ان میں افواہیں، خیالی پرواز، پوتے، مبالغے اور جھوٹ سچ کی

کر کے دماغی مشینوں سے ان کو مضبوط بنایا جاتا ہے ملمع چڑھایا جاتا ہے رنگ برنگی نمائشی کور چڑھائے جاتے ہیں اور انہیں مقبول عام بنانے کے لئے بازار میں لایا جاتا ہے اور پھر یہ گردش میں آجاتے ہیں۔ البتہ ان کو تازہ بہ تازہ اور گرماگرم رکھنا پڑتا ہے کہ کہیں باسی ہو کر لطف ظرافت نہ کھو بیٹھیں۔

کہا جاتا ہے کہ گپوں اور لطیفوں چٹکلوں کا خام مال کلبوں شراب خانوں کانفرنسوں جوئے خانوں کھیل کود کے میدانوں سے رساک ٹیبل پارٹیوں چائے خانوں سے حاصل کیا جاتا ہے جہاں گپ سازی کے کارخانوں کے نمائندے اپنی آنکھیں اور منہ کھولے منہ پھاڑے ہمہ تن گوش رہتے ہیں اور اِدھر اُدھر سے ٹِٹ بِٹس جمع کرتے ہیں جن کو فیکٹری میں دھو دھلا کر صاف کر کے اجلا بنا کر مختلف مقامات پر پہونچایا جاتا ہے جن کی فوری طلب نہ ہو ان کو تہہ خانوں میں بند ڈبوں میں محفوظ کر لیا جاتا ہے کہ وقت ضرورت ان سے کام لیا جا سکے۔

امریکہ میں اس قسم کی لطیفہ سازی کی ہوا چلتی ہے جو زمانہ حالات اور موسم کے اعتبار سے اپنا رُخ بدلتی رہتی ہے چنانچہ کسی زمانے میں ویت نام کوریا اور پورٹوریکین کے باشندوں کو نشانہ بنایا جاتا تھا۔ اسکاٹ آئرش انگریز اور یہودی بھی اسی طرح مرکز توجہ تھے لیکن اب تو نسلی اور عمرانی لطیفوں کی گرم گرم ہوائیں چل رہی ہیں۔

جن کارخانوں میں خواتین کارگزار ہوتی ہیں وہاں پر نمک مرچ لگا کر چٹ پٹا بناتے ہیں ان کا دخل بہت زیادہ ہوتا ہے یہ یاد رہے کہ ان فیکٹریوں میں تحقیق اور تنقیص کے محکمے بھی ہوتے ہیں جو کوالٹی کنٹرول کرتے ہیں۔ کبھی متروک اور نامقبول باتوں کو نئے انداز میں پیش کرنے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ ان محققین کی نظر اس پر بھی رہتی ہے کہ کون سا لطیفہ کس ریاست یا کس ملک پر چسپاں ہوتا ہے اور کہاں زیادہ مقبول ہوگا تاکہ حسب ضرورت اس کو وہیں پر برآمد کر دیا جائے اور باہر کی کوئی بات ہو تو اس کو درآمد کرنے میں کسی قسم دریغ نہیں کیا جاتا اس لئے کہ اس کا کوئی کاپی رائٹ نہیں ہوتا۔

ہالی وڈ اور ہماری فلمی دنیا میں اس قسم کی گپ سازی بہت عام ہے ہر لمحہ کچھ نہ کچھ نئی بات گھڑ لی جاتی ہے اور اس کا انتظار کیا جاتا ہے کہ وہ جڑ پکڑ لے اور امر واقعہ بن جائے۔ اس کی مثال یہی ہے اسلحہ گولا بارود اور جنگی ہتھیار بنانے والے کارخانے اس بات سے غیر متعلق اور غیر جانبدار ہوتے ہیں کہ وہ فروخت کے بعد دفاع اور مزاحمت کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں یا جارحانہ کارروائیوں کے لئے۔ اسی طرح ایک بار گپ چھوڑ دی جائے تو وہ کسی کے لئے باعث انبساط ہے کہ دل شکنی کا اس سے انھیں کوئی واسطہ نہیں۔

امریکہ میں اخباری خبروں کو لے کر مذاق اڑانا اور اس کے مضحک پہلو کو سنجیدگی کے ساتھ پھیلانا ایک بہت بڑا فن بن گیا ہے۔ چنانچہ ہماری موجودگی میں جارجیا کے گورنر لسٹر میڈاکس نے پریس کانفرنس میں بتایا کہ جیلوں اور پاگل خانوں کے انتظامیہ کو سدھارنے اور ان کے مکینوں کو بہتر زندگی فراہم کرنے کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہماری کوشش یہ ہے کہ ان کے مکینوں کو داخلہ دینے سے پہلے اس

بات کی جان میں ضروری ہے کہ وہ نیک سادہ لوح اور صاف ستھرے انسان ہیں۔ یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ مخبوط الحواس قسم کے لوگوں پر پتھر برسائے جاتے تھے انھیں کوئی سہارا دیا جاتا تھا نہ وہ رحم و کرم کے مستحق سمجھے جاتے تھے ان کا مذاق بھی اڑایا جاتا تھا انھیں پاگل خانوں میں رکھا جاتا تھا دھیرے دھیرے لوگ اس فلسفہ کے قائل ہوتے گئے کہ یہ مجبور محض ہیں زمانے کے ستائے ہوئے ہیں ان کے ساتھ ہمدردی ضروری ہے ان کا باقاعدہ علاج ہو تو یہ سدھر سکتے ہیں چنانچہ انھیں پاگل خانوں میں نہیں دماغی علاج کے دوا خانوں میں رکھا جانے لگا ہے۔

اسی طرح چوری ڈکیتی حتیٰ کہ قتل کے ملزموں کو بھی سزاً جیل خانوں میں تنگ و تاریک کمروں اور کال کوٹھریوں میں بند کیا جاتا تھا بلکہ انھیں جسمانی سزا بھی دی جاتی ہے برخلاف اس کے اب ان کو سزا نہیں بلکہ ان کی سدھار پیشِ نظر رہتی ہے ان کے دماغ کا علاج کیا جاتا ہے کہ جرائم کے سرزد کرنے کے محرکات کو دور کیا جائے تاکہ وہ پھر سے اچھے شہری بن سکیں۔ ان حقائق اور بدلتے اصولوں کے تحت گورنس کے بیان کا ظریفانہ تجزیہ اس طرح کیا جاتا ہے کہ چاہے جیل خانہ ہو کہ پاگل خانہ ہو اس کے اندرونی حالات اس وقت تک نہیں سدھر سکتے کہ جب تک ان میں داخلہ ایسے ہی لوگوں کو نہ دیا جائے ا. جو عقل کے مارے نہ ہوں جن کی سوجھ بوجھ ٹھیک ہو جو اچھے برے کی پہچان رکھتے ہیں جنھوں نے جرم تو کئے ہیں لیکن اچھے کردار کے حامل ہیں۔ اگر سماج دشمن نکمے آوارہ غنڈے فاتر العقل لوگوں سے پاگل خانے یا جیل خانے بھر دیئے جائیں تو اندر کا ماحول کسی طرح سازگار نہیں رہ سکتا گندگی رہے گی بدانتظامی ہڑ بونگ آپس میں مار پیٹ عدول حکمی کا دور دورہ رہے گا۔ اس لئے یہ لازم ہے کہ عہدہ داران متعلقہ اور سماج سیوک ان دونوں اداروں کے لئے اچھے سے اچھے لوگوں کا انتخاب کریں محض پیش کردہ رپورٹ کے پیشِ نظر انھیں ٹھونس نہ دیا جائے بلکہ باقاعدہ انٹرویو لیا جائے اس کے خاندان کے متعلق مواد فراہم کیا جائے اس کی دماغی صلاحیتوں کا امتحان لیا جائے اس کی علمی ادبی قابلیت کو پرکھا جائے اور جب تک وہ خاص معیار پر نہ اتریں ان کو داخلہ نہ دیا جائے ورنہ سارے جنونی پاگل یا خطرناک مجرموں کا اڈا بن جائیں گے۔

رکروٹنگ کے وقت اس بات کا بطور خاص لحاظ رکھا جائے کہ کم عمر اور نوجوان منتخب کئے جائیں تاکہ وہ اچھا نمونہ بن سکیں اور آئندہ کی آزاد زندگی میں کامیاب و بامراد ثابت ہوں۔ اگر وہ فاتر العقل یا مجرم نہ ہوں تو انھیں سمجھایا جائے کہ ان کو داخلہ خود ان کی بہبودی کے لئے دیا جا رہا ہے۔ ان کی حوصلہ افزائی کی جائے کہ وہ رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کریں تاکہ قوم کا دیس کا بھلا ہو۔

یہ بھی تجویز منظور ہونی چاہیئے کہ جیل ہو کہ پاگل خانہ ان کے مکینوں کے وقتاً فوقتاً امتحان اور ٹسٹ ہوتے چاہیئے ان کی فکر و فراست ان کی چابکدستی ہاتھ کی صفائی چالاکی کس درجہ پر ہے اس کا اطمینان کیا جانا ضروری ہے۔ اور اگر یہ محسوس ہو کہ ان کی دماغی حالت بدتر ہو رہی ہے یا ان کی مجرمانہ ذہنیت اور عادتیں نہیں سدھر رہی ہیں تو انھیں فوراً خارج کر دینا چاہیئے تاکہ اندر کا ماحول گندہ اور بے قابو نہ ہو جائے ہاں انھیں یہ تنبیہ

ضرور کی جا سکتی ہے کہ ان کے عادات و اطوار ٹھیک ہو جائیں تو انھیں واپس لے لیا جائے گا۔ یہاں پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اس طرح کی باریکیاں پیشِ نظر ہوں تو بہت کم لوگوں کو داخلہ ملے گا۔ یہ معترض حق بجانب ہیں لیکن حکومت کو اور ٹیکس بھرنے والوں کے لئے یہ اطمینان ضروری ہے کہ روپیہ پیسہ ضائع نہیں جا رہا ہے اور کارکردگی بہتر ہوتی جا رہی ہے۔ ورنہ آج کل یہ خبریں آتی ہیں کہ فلاں جیل میں زنا اور اسی قسم کے دیگر سنگین جرائم وقوع پذیر ہو رہے ہیں اور حکومت غفلت برت رہی ہے۔ اور حالات بے قابو ہوتے جا رہے ہیں

خواجہ عبدالغفور

بہت پنپ سکا نہ اردو کے زار ہو خواجہ
مگر تم اہل زباں کا وقار ہو خواجہ
مزاح و طنز نگاروں کے قافلہ سالار
لطیفہ ساز و ظرافت نگار ہو خواجہ
شگوفہ زار، سمن زار، لالہ زار کے بعد
مزاح و طنز کا تم اعتبار ہو خواجہ
صریر خامہ سے رقصاں ہوئے گل و گلزار
کہ حرف حرف نوید بہار ہو خواجہ
سنائی دیتی ہے اکثر جو دامنِ شب میں
حسِ مزاح کی دھیمی پکار ہو خواجہ
شکارگاہِ ظرافت کے گرچہ ہو نگراں
خبر اُڑی ہے کہ اب خود شکار ہو خواجہ
مبالغہ ہے اگر یہ کہوں کہ ایک ہو تم
کہ ایک شخص کے اندر ہزار ہو خواجہ
تمہارا قرض چکا دیں یہ ہو نہیں سکتا
وہ خوش نصیب ہیں جن پر ادھار ہو خواجہ

ہے ریس کورس کی مانند جادۂ اُردو
قلم کی دوڑ میں کاغذ سوار ہو خواجہ
ہو برشگال کہ گرما ہر ایک موسم میں
ہمیشہ معتدل و خوشگوار ہو خواجہ
وہ فلم ہو کہ سیاست، سماج ہو کہ ادب
ہر ایک شعبہ میں بجا ستار ہو خواجہ
سفر مدام سفر بمبئی تا حیدرآباد
بتاؤ کس کے لئے بے قرار ہو خواجہ
ہجوم شوق سر رہگزار "جب" سے ہے
نہ آس پاس نہ قرب و جوار ہو خواجہ
رکے نہ قافلۂ "زار" سَمَا دمِ آخر
قدم قدم پہ نیا مرغ زار ہو خواجہ
ہنسی مذاق جلیل اک بہانہ ہے گویا
کہ غم زدوں کے لئے غم گسار ہو خواجہ

رشید عبدالسمیع جلیل

کانٹوں میں کھینچ کے آئے گی سُرخی گلاب کی

جوہر سیوانی

کیسے سیاہ ہوگئی ڈاڑھی جناب کی — شاید بکھر گئی ہے سیاہی خضاب کی
اسمگلری کا پیشہ ہے داڑھی کی آڑ میں — باقی رہی نہ کوئی ضرورت نقاب کی
جیسے ملے جہاں سے ملے مال اینٹھ لو — کیا چھیڑتے ہو بحث عذاب و ثواب کی
شرکت مشاعرے کی تو اک ضمنی بات ہے — تُو ہم کو کھینچ لائی ہے شامی کباب کی
شاید بدل گیا ہے نظام امتحان کا — 'ودیارتھی' کو چھوٹ ملی ہے کتاب کی
سورج کو ایک لال سا مُرغا نگل گیا — تعبیر تو بتائے کوئی میرے خواب کی
پی کر شراب بزم میں انشا غفیل ہے — یہ شان ہے سخنورِ جدّت مآب کی

مائک پہ پھر بلائے گئے جوہر ظریف
سنجیدہ شاعروں نے جو محفل خراب کی

اکائیاں

یوسف اعظمی

اردو ہے جس کا نام اسے جانتے ہیں ہم
اس کو ہر ایک سانس میں گردانتے ہیں ہم
کہتے ہیں اس کی دھوم تھی سارے جہان میں
اب تو بقا کے واسطے گھر مانگتے ہیں ہم

زہر کا چل رہا ہے کاروبار
سُرخیاں بیچتے ملے اخبار
لُوٹنا تو میا لیا ہم نے
کتنی پیاری ہے اپنی یہ سرکار

★

احساس میرے عہد کا کانٹا بنا رہا
تخلیق کے قدم سے لہو پھوٹتا رہا
مکروہ چہرگی کی سیاست کو دیکھ کر
ابلیس کا گناہ بھی شرمندہ ہوگیا

ساری ہوا ہوا ہے، گریباں کھلے کھلے
باہیں ڈھلی ڈھلی ہوئی بے آستین ہیں
شفاف پیرہن سے بدن کا ظہور ہے
بلّور ٹوٹ جائے تو کس کا قصور ہے

غزلیں

رؤف رحیم

مصیبت میں بھی جو سسرال کو جایا نہیں کرتے
وہ احمق ہیں جو مالِ مفت بھی کھایا نہیں کرتے

ہمارے ملک کے لیڈر بہت خود دار ہیں یارو!
سوائے ووٹ لینے وہ کبھی آیا نہیں کرتے

جو پندرہ سال سے پچیس ہی پر آپ اٹکی ہیں
کم از کم آئینہ سے جھوٹ فرمایا نہیں کرتے

خضاب اچھا کرو، اچھا کرو میک اپ مگر سُن لو
کبھی گزرے ہوئے دن لَوٹ کر آیا نہیں کرتے

ہر اک لیڈر بناتا ہے یہاں اک پارٹی اپنی
عوامی دَور میں اب کوئی گھبرایا نہیں کرتے

کبھی تو مُنہ سے پھوٹو، کچھ تو بولو، کیسی خاموشی؟
جو غم کھاتے ہیں کیا وہ گالیاں کھایا نہیں کرتے

بہن کے گھر نہ جانا چاہیئے قلّاش حالت میں
جھگڑ کر باپ سے سسرال کو جایا نہیں کرتے

تمھارا چیخنا، چلّانا بیگم بے دقوقی ہے
گرجتے ہیں جو بادل مینہہ برسایا نہیں کرتے

انھیں مہمان کہئے، اہلِ خانہ کہئے، کیا کہئے؟
جو آجاتے ہیں اک دن آٹھ دن جایا نہیں کرتے

غزل کہتے ہیں محنت سے چھپاتے ہیں سلیقے سے
بذریعہ چاپلوسی بزم میں گایا نہیں کرتے

بھلا ہو شاعری کا، چائے خانے، سینما گھر کا
ہم آدھی رات سے پہلے تو گھر جایا نہیں کرتے

ہم اپنی شاعری میں مال آپس کا گلاتے ہیں
سب اک حمام کے ننگے ہیں شرمایا نہیں کرتے

رحیم اب کوستا کیوں ہے تری تقدیر کھوٹی تھی
جو قسمت میں لکھا ہے اس پہ پچھتایا نہیں کرتے

○

اقبال ہاشمی

کئی جھگڑوں کا میں سمبل رہا ہوں
کہیں گندم، کہیں چاول رہا ہوں

میں ایوانوں میں کب سے چل رہا ہوں
کہیں جوتا، کہیں چپل رہا ہوں

مرا رُتبہ ہے پانی پت سے بڑھ کر
میں بستی کا عوامی نل رہا ہوں

مری ڈگری تو گھر میں سڑ رہی ہے
سڑک پر کب سے بھجئے تل رہا ہوں

نئے وعدوں کے دودھوں میں نہا کر
بڑی تیزی سے پوتوں پھل رہا ہوں

کوئی اشعار نہ میرے چرالے
یہی غم ہاشمی ہے، گل رہا ہوں

بہزاد فاطمی

واہی کی ستم ظریفیاں

رضا نقوی رضاؔ جب پہلی بار عظیم آباد کی بساطِ سخن پر جلوہ گر ہوئے تو اہلِ بزم نے کھلے دل سے استقبال کیا۔ سنجیدہ شاعری کے پلیٹ فارم سے فکرِ رسا کے انجن کو سبز بتی بھی دکھائی گئی اور اُن کا ادبی سفر بغیر کسی ہچکولے کے دیر تک جاری رہا۔ پھر ایسا ہوا کہ جھٹکے کے ساتھ پٹری بدل گئی اور رضا نقوی ایک نئے روپ کے ساتھ اسٹیج پر واہیات کی جھنڈی ہاتھوں میں لئے نمودار ہوئے۔ اس نئے روپ نے واہی کی "دستارِ فضیلت" سے نوازا اور مجمع نے "انقلاب زندہ باد" کے نعرے سے خیر مقدم کیا۔ اس دل بدلی کے پس پردہ کچھ راز ہائے سربستہ بھی ہیں جنہیں آپ چاہیں تو سخن ہائے ناگفتنی کہہ لیں لیکن میں اس دستاویز کے ذریعہ ان باتوں کو بہ ثباتِ عقل و ہوش، بلا جبر واکراہ اور بلا کسی ترغیب و تحریص کے قلم بند کرنا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ سند رہے اور (آئندہ لکھنے والوں کے لئے) وقت پر کام آئے الکبد۔ راقم الحروف۔

راویانِ صادق کا حلفیہ بیان ہے کہ واہی کے وطن عزیز کھجوا میں (جو اب کھنڈر میں تبدیل ہو کر انقلاباتِ زمانہ کی زندہ تصویر ہے) عشرہ محرم بڑی دھوم سے منایا جاتا تھا، ان کے یہاں کی مجلسوں میں عظیم آباد کے ایک معروف کہنہ مشق مرثیہ نگار مرزا ممتاز حسین نہرؔ ہر سال ذاکری کے لئے آیا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ مختلف موقعوں پر بزمِ مقاصدہ میں مولانا مصطفےٰ جوہرؔ اپنی عالمانہ اور فن کارانہ قصیدہ گوئی اور قصیدہ خوانی کے جوہر دکھائے۔ ان بزرگوں کے فیضانِ صحبت کا یہ اثر ہوا کہ واہی نے رمزِ شاعری اور لفظ و معنی کے باہمی رشتہ سے بخوبی شناسائی حاصل کر لی۔ اس تعلیمی اور تربیتی پس منظر کے ساتھ ۱۹۳۱ء میں پٹنہ کالج جیسے اہم ادارے سے بہ حیثیت طالب علم وابستہ ہوئے تو پھر سے لوگ آتے ہی گئے کارواں بنتا ہی گیا۔

بہت جلد نوجوانوں کی ٹولی بن گئی جس میں ہر ادبی محفل پر چھا جانے کی صلاحیت تھی۔ اسی دوران کچھ ایسے تاریخ ساز سانحے رونما ہوئے جن سے اس امر کی نشاندہی ہوئی کہ رضا جیسے بہ ظاہر سنجیدہ کم سخن اور متین نوجوان کی شریانوں میں بے پناہ ظرافت کے جرثومے بھی وافر مقدار میں پوشیدہ ہیں۔ یہ حیرت انگیز انکشاف اس وقت ہوا جب کالج کے ایک سینئر پروفیسر (جنھیں طلبہ کی پیش رونسل ایک مخصوص لقب چن چن سے یاد کرتی تھی) کی شان میں کچھ مدحیہ اشعار بہ لسانِ رضا سامعہ نواز ہوئے۔ ایک شعر بہ طورِ نمونہ ملاحظہ کیجئے ؂

ہے فقط وضع کی تفریق یہ کچھ اور نہیں
کبینس کو سوٹ پنھا دیجے "چن چن" ہو جائے

ایک بار اپنی بستی ہی میں لندن پلٹ ایک عزیز سے نوک جھونک ہوگئی واقعہ صرف اتنا تھا کہ صاحب موصوف اپنے خاص صاحبی انداز اور سراپا مغربی لباس میں ملبوس دیہات کی گلیوں میں چہل قدمی فرما رہے تھے۔ ایک منچلے کی رگِ ظرافت پھڑکی اور اس نے تانگے والوں کے مخصوص لب و لہجہ میں ایک نعرہ ماردیا، "ألبت!" (البتہ کا مخفف)۔ پھر کیا تھا۔ اُدھر سے LET US HAVE A DUAL کا آستین چڑھاؤ چیلنج سرزد ہوا۔ DUAL کی نوبت تو نہیں آئی لیکن رضا (داہی) کو زورِ دستیٔ طبع دکھانے کا نادر موقعہ ہاتھ آیا۔ "نعرۂ البت" کا خیر مقدم کرتے ہوئے ظریفانہ شاعری کے ترکش سے ایسے ایسے تیر و تفنگ چلائے کہ غنیم کو ہتھیار ڈالنے کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ "اس سانحۂ جانکاہ" میں پھینکے گئے تیروں میں سے ایک تیر اکزیبٹ (EXHIBIT) کے طور پر پیش کرتا ہوں ؂

صاحب کو جو پتلون سے باہر ہو کرانا
بس ماردو اک نعرۂ مستانہ کہ "البت"

واقعات کے تسلسل میں یہ سانحہ بھی اپنی نوعیت کے لحاظ سے خاصہ دل چسپ ہے۔ ایک نوجوان دوست "باری کے بخار" کی طرح وقفہ وقفہ سے مرضِ عشق میں مبتلا ہو جایا کرتے تھے۔ ایک اُپلے (گوبھٹے) اور دودھ والی اپنے کاروباری رشتے سے اُن کے یہاں جایا کرتی۔ نہ جانیں "شیر سیال" کے کھنکتے ساغر دل اور گوبھٹے کی جھاڑن سے آٹی ہوئی زلفِ مشکیں میں کون سی کشش تھی کہ مرضِ کہنہ کا ایک زبردست دورہ پڑا گھر والے اس تازہ دورے سے پریشان تھے۔ لیکن داہی کو تشخیصِ مرض میں کوئی دشواری نہیں ہوئی! انہوں نے اپنے دوست کو وارننگ دی ؂

کبھی جب عشق لے جائے گا پھسیّا کے دامن پر
بٹھائے گی وہ کھونٹی پہ کھلائے گی کبھی گوبر

اس نظم میں سات شعر تھے۔ لہٰذا اشعار کی تعداد اور ردیف کے ایک لفظ "گوبر" کی وجہ سے نظم "ست گوبرا" کے نام سے دوستوں میں مشہور ہوئی۔ اس بر وقت وارننگ کا مریضِ عشق پر کیا اثر ہوا یہ تو میں نہیں جانتا۔ اتنا ضرور جانتا ہوں کہ مدت تک عزیز موصوف کا اصلی نام "ست گوبرا" کی تہہ میں روپوش ہو گیا۔
ظرافت کے پوشیدہ جرثومے کبھی اور فعال ہو جاتے تو اکثر واقعات عزیزانِ خاص اور دوستانِ ہم نوا

بھی واہی کے حملوں سے محفوظ نہ رہتے۔ یحییٰ نقوی (مقیم پاکستان) کی شب عروسی پر شاندار نظم اس امر کی شاہد ہی کرتی ہے۔ اس نظم کے صرف متفرق مصرعہ ہی ذہن کے کسی گوشے کو کریدنے سے مل سکتے ہیں وہ بھی اس شرطِ لازمی کے ساتھ کہ صرف بزمِ احباب ہی میں پیش کئے جائیں۔ اسی طرح شرف عظیم آبادی (مقیم پاکستان) کی تقریب شادی پر ایک طویل مثنوی "منارِ سخن" اُس دور کی یادگار تصنیف ہے۔ مزیدار بات یہ ہے کہ اُس کے بعض حصّے یحییٰ نقوی (واہی کی مندرجہ بالا ستم ظریفی کے شکار) کی کاوشِ فکر کا نتیجہ ہیں۔ اس مثنوی کی نقل غالباً پروفیسر سید حسن کے پاس اب تک محفوظ ہے۔

واہی کی قوت اختراع کا ذکر میں اپنے ایک مقالے (مطبوعہ شگوفہ حیدرآباد) میں کرچکا ہوں۔ اِس سلسلے میں سہیل عظیم آبادی کا بھی ایک بیان سن لیجئے:

اس دور کی سب سے دلچسپ شرارت پنچایتی شاعری تھی۔ کہیں مشاعرہ ہونا طے پایا طرحی یا غیر طرحی پنچایت بیٹھی۔ شرکت کا فیصلہ کیا گیا۔ پنچایتی غزل تیار کی گئی۔ ایک ایک دو دو مصرعے سب کے۔ اس غزل میں بڑی بڑی صنعتیں برتی جاتیں۔ ہر مصرعہ بلند آہنگ و خوبصورت۔ بندش چست لیکن خوبی یہ کہ ایک مصرعہ کو دوسرے مصرعہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اور شعر بالکل بے معنی۔ غزل پڑھنے کی خدمت مظفر نقوی کیف کے سپرد تھی جو ہم لوگوں میں سب سے کم عمر تھے (مظفر چند سال قبل کراچی یونیورسٹی میں صدر شعبۂ انگریزی رہ کر ریٹائر ہوئے) وہ بڑے اعتماد کے ساتھ مشاعرے میں سناتے۔ سمجھنے والے دم بخود رہ جاتے کہ یہ کیا ہے اور بے سمجھے داد دینے والے جھوم جھوم کر داد دیتے۔ پنچایت ایک طرف بیٹھی لطف اندوز ہوتی اور داد دینے والوں کی سخن فہمی کی داد دیتی۔۔۔" (مطبوعہ شاعر لوپٹنہ۔ اختر اورینوی نمبر)

اب خود حضرتِ رضا واہی کا اعترافی بیان ملاحظہ ہو:۔

"بزمِ سخن اور بزمِ ادب کے جلسوں میں ایسی نظمیں لکھی اور پڑھی گئیں جو صنعت معریٰ عن المعنیٰ میں تھیں ان نظموں کی تخلیق عموماً پنچایتی ہوتی تھی۔ جعفادری شعرا کا جمگھٹا رہتا لیکن ہر شعر پہ داد ملتی۔ اسی طرح ایک بے معنی نظم پڑھی گئی اور پڑھنے والے نوجوان کو انعام میں ایک کپ ملا۔ اس کپ پہ ہم لوگوں نے "بنام حماقت کنم نامزد" کندہ کرا دیا۔ ایک بار لکھنو کے ایک شاعر نانک لکھنوی تشریف لائے۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ اُردو نہیں جانتے اور ہندوستان گیر شہرت کے مالک ہیں۔ اُن کے اعزاز میں ایک مشاعرہ ہوا۔ ہم لوگ بھی مدعو کئے گئے۔ چلتے وقت رائے ہوئی کہ نانک صاحب کی شان میں اسی قسم کا قصیدہ کہا جائے۔ چنانچہ مشاعرہ گاہ تک پہونچتے پہونچتے اختر (اختر اورینوی) اور دوسرے دوستوں نے مل کر تیس بتیس شعر کا ایک قصیدہ لکھ مارا۔ اختر نے تشبیب کے اشعار لکھے اور میں نے مدحیہ۔ مطلع تھا:

خوشا وہ موسم رنگیں جو ہو بیگانۂ فطرت
خوشا وہ منظر گیتی بنے جو قاتۂ فطرت

اختر نے بھرے مجمع میں اس قصیدے کو بڑے آب و تاب سے پڑھا۔ ہم لوگوں کا یہ عالم تھا کہ منہ پہ رومال رکھے ہنسی ضبط کئے گردن جھکائے بیٹھے تھے اور مجمع ہر شعر پہ جھوم رہا تھا۔۔۔"

واہی کے مدحیہ اشعار کا سراغ لگانا اب دشوار ہے۔ نمونہ کے طور پہ ایک شعر پیش کرتا ہوں ؎

وہ نانک شعر گر نانک، حدیث مختصر نانک
وہ نانک جس میں خوابیدہ ہے ظلمت خانۂ نظر

یہ تو صرف مشاعروں کی بات ہوئی۔ واہی کی ستم ظریفیوں کا دائرہ عمل بہت وسیع رہا۔ بعض مقامی اور غیر مقامی رسالوں اور پرچوں کو بھی بے معنی نظمیں اور غزلیں دوسرے مشہور شعرا کے ناموں سے چھپوا کر چکمے دیتے رہے۔ ایک دفعہ اُس دور کے چار مشہور اور سربرآوردہ شاعروں پہ نظر انتخاب پڑی۔ ہوش عظیم آبادی کے عملی تعاون سے چار ہم طرحی غزلیں بڑی محنت سے صنعتِ معرا عن المعنی میں لکھی گئیں۔ ان غزلوں کی خوبی یہ تھی کہ ان میں کی ہر غزل فرداً فرداً ان شعرا کے مخصوص لفظی اور ظاہری آہنگ سے مطابقت رکھتی تھیں۔ یہ چاروں غزلیں ایک مقامی اخبار کے یوم جمہوریہ نمبر میں ایک نوٹ کے ساتھ چھپ گئیں۔ اختر اورنیوی نے ان غزلوں کو دیکھا تو جمیل مظہری صاحب سے شکایت کی:۔

"جمیل بھائی! آپ نے اتنی اچھی غزل کہی اور ہمیں کبھی سنائی نہیں"۔

"کون سی غزل"؟

"یہ دیکھئے! یوم جمہوریہ نمبر"۔

"آپ ہی پڑھئے"۔

اختر صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں پڑھنا شروع کیا ؎

"یہ خودی خدا نہیں ہے، یہ دھواں ہے نقشِ پا کا

پڑھتے جاتے ہیں اور ہر شعر کی تعریف بھی کرتے جاتے ہیں۔ ادھر جمیل صاحب آنکھیں بند کئے سگریٹ پی رہے ہیں اور سنتے بھی جاتے ہیں۔ جیسے ہی غزل ختم ہوئی۔ جمیل صاحب کے منہ سے ہنسی کا ایک زبردست فوارہ چھوٹا "بھق"، جس کی کچھ چھینٹیں اختر صاحب کے کپڑوں کو بھی داغدار کر گئیں۔

"میں اس ہنسی کا مطلب نہیں سمجھا"!

"اور میں ان اشعار کا مطلب نہیں سمجھ سکا جو ابھی آپ اس قدر لحن سے تعریف کر کے پڑھ رہے تھے"۔

"تو پھر؟"

"ارے بھائی! یہ بے معنی غزل میری نہیں ہے۔ کسی نے مذاق کیا ہے"۔

اختر صاحب بھی بلا کے ذہین تھے۔ فوراً سنبھل گئے۔

"میں غزل کی نہیں، نشستِ الفاظ، خوبصورتی بندش اور نادر تشبیہوں کی تعریف کر رہا تھا"۔

آپ کو یاد دلا دوں کہ اختر صاحب "پنچایت" کے ایک سرگرم اور نمایاں کارکن تھے۔

چند سال پیشتر کی بات ہے۔ کسی رسالے میں دورِ جدید کے ایک شاعر کی غزل شائع ہوئی تھی "یہ بے ہنر کا لکھا، بے ہنری کا لکھا"۔ طبیعت متحرک ہوئی تو واہی کے موٹے قلم نے مندرجہ ذیل گلکاری کے نمونے دکھلائے ؎

خطِ تجریدِ میں آشفتہ سری کا لکھا ÷ یوں ہے جیسے بشر کالجری کا لکھا

وہ ادب ہو کہ سیاست کا بیابانِ جمود
زنگِ آئینہ بنا، بے بصری کا لکھا

عہدِ ششدر نگ میں ابلاغ کا ترسیل سے بُعد
نقش بر آبِ سخن، بے ہنری کا لکھا

مرکزِ ثقل سے تا نقطۂ پرکارِ جنوں
رُخِ مشہود پہ شاہد نظری کا لکھا

رہزنی دردِ تہہ جام سے ابھرے جس دم
عصرِ نو پر ہو عیاں راہبری کا لکھا

ایک آتش کدۂ فکر ہے سردابِ خیال
اک معمہ ہے زوالِ بشری کا لکھا

خرد آشوبِ تمنا ہے نمودِ ہستی
نقشِ تقدیر بنا بے اثری کا لکھا

میرے اشعار ہیں سرچشمۂ تفہیم جدید
آپ سمجھیں نہ انھیں بے خبری کا لکھا

تفہیمِ جدید کی روشنی میں مندرجۂ بالا اشعار کی شرح کے لئے ـــ

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

آخر میں ایک اور واقعہ کی تفصیل سے پہلے داہی کا بیان سن لیجئے :

" غالباً ۶۸ ـ ۱۹۶۷ء کا زمانہ تھا۔ اُن دنوں بہاء الدین صاحب پبلک سروس کمیشن کے ممبر تھے ہفتہ میں دو تین بار اُن سے ملاقات ہو جاتی تھی ..... ایک دن شب خون کا تازہ پرچہ میرے پاس تھا۔ بہاء الدین صاحب نے پرچے کو دیکھا۔ کچھ پلے نہیں پڑا تو رسالہ کو پھینک کر افسوس کرنے لگے لیکن فوراً ہی ان کی طبعی بذلہ سنجی عود کر آئی اور کہنے لگے کہ آؤ ایسی ہی بے تکی اور بے معنی ایک نظم ہم لوگ بھی لکھ کر تضیع اوقات کریں۔ چنانچہ اُن کے ٹیبل پر سے کاغذ کا ایک ٹکڑا اٹھا کر میں نے لفظ "جیش" لکھا اور اس کے بعد مہمل گوئی شروع ہو گئی۔ بہاء الدین صاحب نے بھی میرا ساتھ دیا۔ تین چار منٹ میں نظم مکمل ہو گئی۔"

یہ نظم مناظر عاشق ہرگانوی کو داہی کے یہاں کچھ ردّی کاغذات کے مدفن میں مل گئی۔ اُنہوں نے مذاق یہ کیا کہ "شاعر کا نام مخفی رکھ کر چند مشہور اہلِ قلم حضرات کے پاس تجزیے کے لئے بھیج دی"۔ اس کے بعد پوری نظم، موصولہ تجزیوں کے ساتھ اپنے دو ماہی رسالے "کوہسار" جنوری ۷۹ء کے شمارے میں چھاپ دی۔ ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد نے بڑی خوبصورتی سے تجزیے کی زحمت سے خود کو بچالیا "میں اس انداز کی علامتی شاعری کا کوئی اچھا طالب العلم نہیں ہوں۔ اس لئے میری رائے اس ضمن میں کوئی اہمیت نہیں رکھے گی"۔ ظہیر غازی پوری نے محض اتنی سی بات ثابت کرنے کے لئے کہ " زیر نظر نظم بے ترتیب مصرعوں پر مشتمل معمولی درجہ کی بیانیہ نظم ہوتے ہوئے بھی معنوی رابط سے یکسر عاری و خالی ہے"۔ ایک لمبا چوڑا تجزیہ لکھ مارا۔ شمس الرحمٰن فاروقی کو یہ نظم پڑھ کر اس لئے "خاصی ہنسی" آئی کہ اُن کے انداز کے مطابق یہ نظم ترقی پسند طرزِ ادا کی پیروڈی ہے"۔ "اگر ایسا نہیں ہے" تو ان کے خیال میں "شاعر نے اگر جدید نظم کی پیروڈی لکھنے کی کوشش کی ہے تو وہ سراسر ناکام ہے"۔ آخر میں اُنہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ "مجموعی اعتبار سے یہ ایک دلچسپ مزاحیہ نظم ہے"۔ کرامت علی کرامت ایک طویل تجزیے کے بعد جس نتیجہ پر پہونچے اُنھیں کے الفاظ میں سنئے "پوری نظم کے مطالعہ سے میرے ذہن میں جو مجموعی تاثر ابھرا ہے وہ یہ ہے کہ نظم سطحی اور اوسط درجے کی ہے۔ تحت الشعور اور لاشعور کی عمیق تہوں سے تجربات کو ابھار لانے کی اہلیت اِس

نظم موضوع دینہ نہیں۔ اس نظم کو پابند فارم میں پیش کیا جاتا تو شاید بہتر ہوتا۔" ڈاکٹر عبدالمغنی اپنے تجزیے کی ابتداء اس طرح کرتے ہیں" یہ نظم سوچ سمجھ کر لکھی گئی ہے۔ لہٰذا اس میں ارتقائے خیال کی کوشش معلوم ہوتی ہے شاعر کے پیش نظر کسی خاص موضوع کا اظہار ہے۔ چنانچہ وہ ایک ترتیب کے ساتھ اپنے نقوش و علائم استعمال کرنا چاہتا ہے۔ اس سلسلے میں اس نے کئی خیال انگیز تصویریں بنائی ہیں" اس کے بعد"مبہم اور متنوع استعاروں" کی نشاندہی کے بعد رقم طراز ہیں"ان استعاروں کی فراوانی سے بھی ارتقائے خیال اور تنظیم ہیت میں مدد ملتی ہے۔ استعاروں کی موضوع سے مناسبت، پھر ان مناسب موضوع (۹) استعاروں کی کثرت، دونوں مل کر نظم کے مخصوص ہیولے کی ترتیب کرتے ہیں۔ استعارات و علایم کے علاوہ آہنگ میں بھی ایک بے روک بہاؤ ہے۔ مسلسل روانی اور نغمگی ہے جس سے لطف آفرینی کے علاوہ جذبے کی ہمواری کا بھی احساس ہوتا ہے" اس قدر لکھنے اور مختلف زاویے سے پوسٹ مارٹم کے بعد ایک پر لطف بات کا اظہار ان لفظوں میں کرتے ہیں" شاید یہ نظم جدید علامتی نظم ہے جس میں صرف اشارات و علامات ہوتے ہیں مطالب و مقاصد نہیں ہوتے۔ اگر واقعی ایسا ہے تو میں کہوں گا کہ فنی طور پر یہ کوئی باقاعدہ نظم نہیں ہے، صرف چند تصویروں کا مجموعہ ہے جس میں ترتیب کی ایسی کمی ہے کہ ابتدا اور وسط کو انتہا سے کوئی تعلق نہیں"۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ نظم ایک اچھی کوشش ہے لیکن کامیاب کوشش نہیں"۔ ڈاکٹر عنوان چشتی نے اپنی رائے کا اظہار ایک دلچسپ نظم کے ذریعہ کیا جس کا اقتباس ہے :-

تجزیہ کس کا کروں۔
تبصرہ کس پہ لکھوں
نہ کوئی فکر، نہ جذبہ، نہ خیال
وہی ترسیل کا رونا ہے یہاں
چند لفظوں کا بچھونا ہے یہاں

لفظوں کے شکن در شکن بچھونے کی نرمی اور سرور آفریں گرمی کا لطف آپ بھی اُٹھائیں۔ اور واہی کی ستم ظریفی کی داد دیں۔ نظم حاضر ہے:-

اے غم دوست!
آہ! اے دوست!
یہ رنگین مرادوں کا ہجوم
ایک عالم ہوا جس حلقۂ رنگین میں اسیر
دشتِ احساس میں ترسیل کو روتا ہے گیا
درد اُٹھ اُٹھ کے بتاتا ہے ٹھکانا جس کا
اسی حلقہ کے قریں
آہ اے قلب حزیں!

تیری دھڑکن بھی اسی حلقہ کی پابند رہی
کیا کہوں چپ کے سوا
آہ اس مرغِ گرفتار کی سوزش اے دوست!
پھڑپھڑانے کا بھی موقعہ نہ ملا ہو جس کو
اسی حلقہ کے قریں
قید خانے کا مکیں
سعیِ بسیار پہ بھی گنبدِ بے در نہ کھلا
پر نہ کھلا
جیسے پیچاک میں شاہیں ہو گرفتارِ ازل
جیسے مومن کی غزل
جیسے گرداب میں اک تازہ کنول
نغمے بیتاب ہیں آواز کہاں سے لاؤں
جس سے آسودگیِ قلب و نظر ممکن ہو
ہائے وہ طاقتِ پرواز کہاں سے لاؤں
زور کرتا ہوں تو گرتا ہی چلا جاتا ہوں
ہو نقاہت کا برا
میرے محبوب اگر ایسے میں تو آ جاتا
پھر تو اس حلقۂ رنگین سے گزر جاتا میں
تیرے مضبوط اِرادوں کا
سہارا لے کر

سرپٹ حیدرآبادی

بیدار بخت آخر، خوابیدہ بخت نکلے | بالائے تخت جو تھے، سب زیرِ تخت نکلے
چمچوں کی چاپلوسی، ہم کو ڈبو ہی دیتی | کشتی سے اپنی، خود ہی ہم کر کے جست نکلے
کہنے کو سیکڑوں تھی، تعداد دوستوں کی | جن میں سے ففٹی پرسنٹ مطلب پرست نکلے
تھا عاشقوں سے اُن کو، ہر ہر قدم پہ خطرہ | سی آئی ڈی کا کر کے وہ بندوبست نکلے
زندہ نہ رہنے دیتی، لوگوں کی خود پرستی! | اچھا ہوا کہ خود بھی ہم خودپرست نکلے
مامور دفتروں میں جو جو بھی بیویاں تھیں | شوہر انھیں کے تھے وہ جو گھر گرہست نکلے
ٹھیرا نہ بالمقابل مستی میں کوئی میکش | جس دن گرٹمبہ پی کر، ہم ہو کے مست نکلے
تبلیغ ترکِ مے کا انجام دیدنی تھا | خود شیخ میکدے سے، ساغر بدست نکلے
پیکر میں دوستی کے، پوشیدہ دشمنی تھی | الفاظ پُر سکوں تھے، لہجے کرخت نکلے
کرتے ہیں بعدِ مُردن، توقیر اہلِ فن کی | اربابِ علم و دانش، مردہ پرست نکلے

سرپٹ ہیں ہماری رفتار ہی نے مارا
اپنی تباہیوں کے، ہم سرپرست نکلے

○

کریک بتیاوی

اب رہیں گی گھر میں آ کر اُن کی اُمی جان بھی | جان لیوا ہے مری بیگم کا یہ فرمان بھی
"انڈیا" کی نقل سازی دیکھ کر حیران ہیں | جرمنی، برطانیہ، سوڈان بھی جاپان بھی
ہو نہیں سکتا کبھی ممکن نہیں ممکن نہیں | ایک ہی انسان کو سرطان بھی ہذیان بھی
آسماں سے باتیں کرتی ہے گرانی آج کل | بن گئی ہے اک قیامت آمدِ مہمان بھی

پختگی آئے گی کیسے اُن کے شعروں میں کریک
ناک کا جب قافیہ وہ باندھتے ہیں کان بھی

فرحت زیدی
(اسکٹ)

حواسِ ہفتہ

طبّی نقطہ نظر سے کہا جاتا ہے کہ انسان کے جسم میں اشد ضروری صلاحیتیں پانچ ہوتی ہیں جنھیں حواسِ خمسہ کہتے ہیں یعنی دیکھنے، سننے، سونگھنے، چکھنے اور چھونے کی صلاحیتیں۔ نہ جانے کیوں ہمارے حکماء و عقلاء نے چلنے پھرنے کی صلاحیت کو انسانی زندگی اور جسمانی ضروریات میں شامل نہیں کیا جب کہ آج کی تیز رفتار دنیا میں یہی وہ صلاحیت ہے جس کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ آج کی دنیا میں جو جتنا چالو ہو اُسی کا سکہ سب سے زیادہ چلتا ہے۔ یہاں تک کہ سو برس پہلے ہی چچا غالب نے بھی لہو کو نصیحت کی تھی کہ موصوف صرف رگوں میں دوڑنے پھرنے کے قائل نہیں ہیں بلکہ جسم کی قید سے آزاد ہو کر لہو کو آنکھوں سے بھی ٹپک پڑنا چاہیئے۔ شاید اسی لئے چچا کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے بعد کی نسلوں نے سائنس کے ہر شعبے میں ترقی کی رفتار کافی تیز کردی۔ اور جن شعبوں میں سب سے زیادہ ترقی کی ان میں رفتار کی ترقی نمایاں ہے۔ چچا غالب کے پالکی اور فینس کے دور سے نکل کر ہم سائیکل، کار، ریل اور ہوائی جہاز کو پیچھے چھوڑتے ہوئے راکٹ اور اسپوتنک کے دور میں پہونچ چکے ہیں۔

ذرا ٹھہریئے! میرا سمند خیال بلکہ طائر خیال تو آسمان کیا خلاؤں میں پرواز کرنے لگا حالانکہ بیچارے کو سوچنا چاہیئے تھا کہ وہ روس اور امریکہ جیسے ترقی یافتہ اور امیر ملک کے باسی کا طائر خیال نہیں بلکہ ہندوستان جیسے غریب ملک کے ایک معمولی شہری کا طائر خیال ہے۔ جہاں کے کروڑوں عوام کو راکٹ کیا معمولی کار پر چڑھنا بھی نصیب نہیں۔ تو لیجئے ہمارا طائر خیال آسمانوں سے زمین پر آرہا۔ لیکن اُسے کچھ نہ کچھ زمانے کا ساتھ دینا ہی ہے کہ رفتار ہی زندگی کی علامت ہے۔ لہذا اس طائر خیال بلکہ سمندِ خیال کو چالو رہنے کے لئے زمین پر طرار سے بھرنے والی لیکن سب سے سستی اور کم خرچ سواری سائیکل نظر آئی۔ سائیکل کا جتنا رواج ہمارے ملک میں ہے شاید ہی کسی

اور ملک میں ہو۔ یہ بیچاری یوں تو ایک ناچیز سی سواری ہے لیکن اب یہ ہماری چھٹی صلاحیت یعنی چلنے پھرنے کے جذبہ ولا ینفک یعنی ساتویں صلاحیت بن چکی ہے۔ کسی نے دولت کے لئے کہا ہے ؎

اے زر تو خدا نیست ولیکن بخدا
ستار العیوب و قاضی الحاجاتی

اگر میں اس شعر میں بصد معذرت صرف ایک لفظ کی ترمیم کردوں تو کیا غلط ہوگا۔ یعنی ؎

سائیکل تو خدا نیست ولیکن بخدا
ستار العیوب و قاضی الحاجاتی

کوئی شخص لنگڑا کے چلتا ہے، سائیکل پر بیٹھنے کے بعد وہ بڑے فراٹے سے سائیکل چلانے لگے گا اور قطعی لنگڑا معلوم ہوگا۔ کسی کی پینٹ پیچھے سے پھٹی ہوئی ہے، لیجئے سائیکل پر بیٹھ گیا۔ اب یہ سائیکل ستار العیوب ہوئی یا نہیں ہمارے ایک بزرگ ایک دوسرے محلہ میں رہتے تھے موصوف کے پاس ایک کار بھی تھی۔ برسات کا زمانہ تھا ایک شب خوب جم کر بارش ہوئی۔ دوسرے دن بھی بارش ہو رہی تھی اگرچہ وہ طوفانی رفتار نہ تھی۔ دیکھا تو وہ بزرگ بنیاین اور پاجامہ پہنے سائیکل پر سوار چلے آرہے ہیں۔ معلوم ہوا موصوف کا بنگلہ ذرا نشیب میں تھا چنانچہ سارے بستی کا پانی بنگلہ کے کمپاونڈ میں بھرا ہوا ہے۔ کار بھی آدھی ڈوب گئی ہے اور ایسے میں سائیکل ہی وہ قاضی الحاجات تھی جو موصوف کو ہم تک لے آئی تھی تاکہ ہم لوگ جاکر کار کو ڈھکیلتے ہوئے اپنے محلہ میں لاسکیں۔ یہ تو صرف ایک واقعہ تھا ورنہ سائیکل کے قاضی الحاجات ہونے میں کیسے شبہ ہوسکتا ہے۔ ہما و شما سبھی کے وقت پر کام آتی ہے اور اس کی بروقت، بامحل اور انمول خدمات کے سبھی معترف ہیں۔ کم از کم ہمارے ملک میں یہ روزمرہ کی ضرورت کی ایسی چیز ہے جس سے ہر انسان براہ راست یا بالواسطہ اس کا مرہون احسان ہے۔ لہٰذا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس کا شمار زندگی کی ساتویں ضروری صلاحیت یعنی حواس سبعہ یا حواس ہفتہ میں کیا جاسکتا ہے۔

میرا یہ دعویٰ شاید کچھ برس قبل قابل قبول نہ ہوتا لیکن آج کل تو جسے دیکھئے سائیکل سوار نظر آتا ہے بلکہ بعض نوجوان تو اسے اپنے جسم کا ایک جزو ہی سمجھتے ہیں۔ راستے میں کتنی ہی بھیڑ ہو، راستہ خواہ کتنا ہی بھیڑ، دشوار ناہموار اور ناقابل گزر ہو یہ حضرات سائیکل سے اترنا ایک غیر ضروری عمل یا کسر شان سمجھتے ہیں۔ لگتا ہے انھیں بھی سائیکل کی سیٹ سے جڑ دیا گیا ہے یا شاید یہ پیدا ہی مع سائیکل کے ہوئے تھے۔ ایسے نوجوانوں کو ہم جنتریوں پر نظر آنے والے قوس کے نشان کا ماڈرن ایڈیشن بھی کہہ سکتے ہیں۔ قوس میں کمر تک انسانی جسم گھوڑے کی گردن سے جڑا ہوا ہوتا ہے، یہاں انسانی جسم سائیکل سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔ اور اس ماڈرن قوس کو تلاش کرنے کے لئے آپ کو کہیں دور نہ جانا ہوگا۔ گھر سے باہر نکلئے چند ہی قدم پر آپ کو راستے کے عین درمیان میں سائیکل پر سوار ایک پیر زمین پر ٹکائے ہوئے نظر آجائیں گے جو کسی دوسرے ماڈرن قوس سے محو گفتگو ہوں گے۔

ان میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ راستہ کے کنارے پر کبھی نہ ہوں گے۔ دوسرا کوئی سائیکل سوار، رکشہ یا کار بھی گزرے یہ راستے سے ہرگز نہ ہٹیں گے۔ اگر آپ نے گھنٹی یا ہارن بجایا یا بصد ادب زبانی استدعا کی تو جواب ملے گا۔ "کیا گاڑی چھوٹ رہی ہے؟ سائڈ سے نکال کے لے جاؤ۔" (خواہ سائڈ سے نکالنے کے لئے جگہ ہو یا نہ ہو اس سے بحث نہیں)۔

ایسے نوجوانوں کو جب مجبوراً کسی مکان یا دوکان کے اندر پیدل جانا ہی پڑتا ہے تو سائیکل کو باہر اس طرح کھڑی کرتے ہیں کہ سائیکل کی شان استادگی سے ہی آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ کوئی ماڈرن نوجوان اندر گیا ہے۔ اس سلسلے سے آپ کو غور کرنے کی قطعی ضرورت نہ ہوگی بلکہ آپ مجبور ہوں گے اس کا اعتراف کرنے کے لئے کیوں کہ سائیکل اس انداز سے کھڑی ہوگی کہ آپ کو اندر جانے کا راستہ ہی نہ مل سکے گا اور اگر کہیں نوجوانوں کا کوئی دستہ کسی مکان یا دوکان کے اندر گیا ہے تو آپ کے حق میں یہی بہتر ہے کہ آپ اگلے چوراہے پر جاکر ان کے باہر نکلنے کے منظر سے محظوظ ہوں۔ اکثر اوقات یا تو یہ حضرات دوکاندار یا صاحب خانہ سے تو تو میں میں کرتے ہوئے باہر آئیں گے یا پھر دوکان کا سامان لوٹتے ہوئے یا مکان پر ڈھیلوں کی بارش کرتے ہوئے پسپا ہوں گے۔ اور اگر جملہ ممدوحین کی خوش قسمتی سے (جن میں آپ بھی شامل ہیں) ایسا کچھ نہ بھی ہوا تو مختلف زاویوں سے کھڑی سائیکلوں کو لے کر سوار ہونے کے دوران کم از کم ایک آدھ سائیکل کا گرنا یا سوار کا ٹکرانا اور لڑھکنا تو یقینی ہے اور ظاہر ہے ان سبھی حالات میں آپ کا قریب رہنا اخلاقاً، عملاً یا حادثتاً آپ کو بھی ملوث کر سکتا ہے جس کے بعد آپ کے ٹوٹ پھوٹ کی ذمہ داری خود آپ پر ہوگی۔

آپ ذرا غور کیجئے تو سائیکل ایک شیطانی سواری ہے جو قدرت کے قوانین سے بغاوت کرتی ہوئی مخلوق لگتی ہے۔ کیوں نہ ہو اسے خدا نے نہیں بلکہ حضرت انسان نے تخلیق عطا کی ہے۔ قدرت کے تخلیق کردہ ملبے جسم والے جانور چار پیر رکھتے ہیں جیسے گھوڑا، ہاتھی، شیر، بکری وغیرہ بسیکڑوں پیروں والے کیڑے مکوڑے بھی پائے جاتے ہیں۔ جن مخلوقات میں پیروں کی تعداد سب سے کم ہوتی ہے یعنی دو عدد، ان میں حضرت انسان آتے ہیں۔ یا پھر میاں ڈارون کے اجداد بندر، اور مرغی بطخ اور دوسرے پرندے۔ لیکن ان دو پیروں والے جانوروں کو بھی اپنا وزن سنبھالنے کے لئے پیر افل بفل دئے گئے ہیں۔ مگر کیا کہنا سائیکل کا کہ اس کی ٹانگیں آگے پیچھے ہوتی ہیں یہ بغیر سہارے کے کھڑی بھی نہیں رہ سکتی لیکن جب چلتی ہے تو اپنے سر پر ایک انسان کو لاد کر چلتی ہے۔ ویسے اس کی تخلیق تو ہوئی تھی ایک ہی انسان کو لاد کر چلنے کے لئے لیکن ہمارے ملک میں اب سائیکل فیملی سواری بنتی جارہی ہے جس پر بہ یک وقت میاں بیوی اور دو بچے (سائیکل کی تنگ دامانی کے پیش نظر ہی حکومت نے فیملی پلاننگ کے تحت بچوں کی تعداد تین سے دو کر دی ہے) مع سامان کے جھولوں کے سفر کر سکتے ہیں۔

سائیکل کو شیطانی سواری کہنے پر ممکن ہے بہت سے سائیکل سوار خفا ہو جائیں (جن میں ایک میں بھی ہوں گا)

حالانکہ جو لوگ اسے تخلیق کرتے یا ہم تک پہونچاتے ہیں وہ خفا نہ ہوں گے صرف مسکرا کر رہ جائیں گے کیوں کہ وہ لوگ تو اس پر سوار ہوتے نہیں وہ تو چار پہیوں والی کاروں پر سوار ہوتے ہیں۔ لیکن کیا آپ نے کبھی کسی جانور یا آدمی کا بغیر سر کا بچہ پیدا ہوتے دیکھا ہے؟ سائیکل بغیر سر کے یعنی بغیر سیٹ کے پیدا ہوتی ہے۔ آپ کسی دوکان پر جائیں سائیکل کی قیمت آپ کو بغیر سیٹ کے بتائی جاتی ہے۔ سیٹ زوائد (ACCESSORIES) میں شمار کیجاتی ہے۔ شاید یہ اس لئے بھی ہے کہ سائیکل بنانے اور بیچنے والے حضرات کو سائیکل کے استعمال کا تجربہ نہیں ہوتا۔

اب سائیکل صرف آمد و رفت کا ہی ذریعہ نہیں رہی بلکہ اب تو یہ سیاحی، اور کرتب بازی کا بھی ذریعہ بنتی جارہی ہے۔ اکثر نوجوان سائیکل سے پورے ہندوستان کا چکر لگا چکے ہیں اور ایک ملائیشین ہوین سانگ نے تو سائیکل پہ پوری دنیا کی سیاحی کر ڈالی ہے۔ کوئی جیالا ہفتہ دس دن تک مستقل سائیکل چلاتا رہتا ہے اسی پہ کھانا، اسی پہ نہانا اسی پہ کپڑے بدلنا سب کچھ کرلیتا ہے۔ سرکسوں میں بھی سائیکل کے دو تین قسم کے تماشے ضرور ہوتے ہیں۔

غرض یہ کہ سائیکل کی ترتیب و تخلیق جیسے بھی ہو، اسے استعمال کرنے والے جتنا غلط اور مختلف النوع طریقے سے بھی اسے استعمال کریں، یہ ہے بڑے کام کی چیز۔ اور بھلے ہی کسی میٹریا میڈیکا یا اَلقَانُونْ فی الطِّبّ (طب کے موجد بو علی سینا کی تصنیف) میں اس کا ذکر نہ ہو لیکن میں اسے انسان کی ضروری صلاحیتوں میں سے ایک یعنی حواس ہفتہ ماننے پر مُصر ہوں۔ بتائیے آپ کو ہے کوئی اعتراض؟۔ نہیں ہے نا! یہ تو مجھے پہلے ہی معلوم تھا۔

∆∇

جہانگیر انس (رانی پور)

فلمیریا

ایک دفعہ میں نے ایک ڈاکٹر سے پوچھا "دُنیا کی سب سے خطرناک اور لا علاج بیماری کون سی ہے؟" ڈاکٹر نے اپنے سنہرے فریم کے چشمے کو ناک پر سے ہٹاتے ہوئے جواب دیا "کینسر ——!"

اب میں ڈاکٹر سے یہ کیسے کہتا کہ "حضور والا"! آپ کتابی ڈاکٹر ہیں۔ جدید دور کے نئے امراض کے معاملے میں آپ بالکل صفر ہیں ورنہ آپ ہرگز کینسر کو خطرناک اور لا علاج مرض نہیں کہتے ۔ آیئے میں آپ کو بتاؤں کہ آج کے دور کی سب سے خطرناک اور لا علاج بیماری کا نام "فلمیریا" ہے۔ جس کے جراثیم ہیضہ اور پلیگ کے جراثیم سے بھی زیادہ خطرناک ہیں۔ اور یہ ایک ایسی چھوت کی بیماری ہے جس میں آفس کے بابوؤں سے لے کر چپراسی تک ، جج صاحب سے لے کر محرر تک ، پروفیسر سے لے کر طالب علم تک ، دادی اماں سے لے کر پوتی تک ، غرضیکہ بچے جوان اور بوڑھے سبھی مبتلا نظر آتے ہیں ۔ عالم یہ ہے کہ اسکول میں ماسٹر لڑکوں کا سبق بعد میں سُنتا ہے پہلے پوچھتا ہے "ڈسکو" کسے کہتے ہیں ؟"

بھائی کے گھر میں قدم رکھنا ہی ہے بہن ہانک لگاتی ہے " ارے چنو ! "دیپک" میں آج راج ببّر کی نئی فلم لگنے والی تھی لگی کہ نہیں ؟

صبح شوہر نامدار سبزی لانے کے لئے تھیلی اُٹھانے بھی نہیں پاتے کہ بیوی صاحبہ حکم دیتی ہیں کہ سروج ٹاکیز میں کونسی فلم چل رہی ہے ذرا پتہ لگاتے آئیے گا" -

حد تو یہ ہے کہ ٹیکسی میں سوار ہو جایئے تو قبل اس کے کہ "کہاں چلوں" ڈرائیور پوچھتا ہے "سنا ہے کہ بپ کمار کی کوئی فلم "مزدور" بن رہی ہے کیا یہ سچ ہے"؟

ساڑھے دس بج چکے ہیں آفس کے لئے دیر ہو رہی ہے کہ " رکشا والے سے کہا جاتا ہے " بھی ذرا تیز چلاؤ "

رکشاوالا رکشا کی رفتار تیز کرنے کے بجائے اپنی زبان کی رفتار تیز کرتے ہوئے کہتا ہے "فیروز خان نے قربانی" میں دل خوش کردیا ہے" اور یہ بات اس انداز سے کہی جاتی ہے جیسے فیروز خاں رکشہ والے کا کوئی خاص رشتہ دار ہے۔

چند دنوں قبل کی بات ہے کہ میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا کہانی لکھنے میں مشغول تھا کہ اتنے میں پڑوس کا ایک کمسن لڑکا میرے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے گھبرا کر کہا "مجھے آپا نے بھیجا ہے"۔

"آپا نے بھیجا ہے؟"

میرے اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ اس کی آپا نے اسے کیوں بھیجا ہے؟ بھلا آپا کو مجھ سے کیا کام ہوسکتا ہے۔ پھر خیال آیا کہ ہوسکتا ہے یہ لڑکا غلطی سے میرے پاس آگیا ہو۔ لہٰذا میں نے تشفی کے لئے پوچھا "تمہاری آپا نے تمہیں کس کے پاس بھیجا ہے؟"

"آپ ہی کے پاس"

اب تو میرے ماتھے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمکنے لگے اور اس کے ساتھ ہی وہ تمام فلمیں ذہن کے پردے پر نظر آنے لگیں جن میں ہیروئن اور ہیرو کے درمیان "پل" کا کام کمسن بچوں نے انجام دیا ہے۔ میں نے سوچا شاید کسی کو مجھ پر پیار آگیا ہے۔ میں نے لڑکے سے بڑے پیار سے پوچھا کیوں بھیجا ہے تمہاری آپا نے؟

خیال تھا کہ وہ جھٹ سے کوئی خط پاکٹ سے نکال کر دے گا یا آپا کا کوئی پیغام سنائے گا لیکن معاملہ اس کے برعکس تھا۔ لڑکے نے کہا "آپا نے پوچھا ہے کہ کیا سنجے دت نے واقعی ریکھا سے شادی کرلی ہے"۔

میرے ارمانوں پر اوس پڑگئی میں نے قہراً وجبراً جواب دیا "مجھے اس قسم کی کوئی اطلاع نہیں ہے اور نہ ان سب باتوں میں مجھے دلچسپی ہے"۔ میرا جواب لے کر وہ روانہ ہوگیا اور میں پھر کہانی لکھنے میں مشغول ہوگیا۔ مگر کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی۔ وہ لڑکا چند منٹ بعد پھر آدھمکا۔ اب کی دفعہ میں نے بے رُخی سے پوچھا "اب کیا بات ہے؟"

اس نے کہا "آپا نے پوچھا ہے دلیپ کمار اور اسماء کا معاملہ کیا ہوا"۔

دل میں آیا اسے ڈانٹ کر بھگا دوں پھر خیال ہوا لڑکا تو حکم کا بندہ ہے میں نے اسے ٹالنے کی غرض سے کہا "اپنی آپا سے جاکر کہدو میں فلمی دنیا کا رپورٹر نہیں ہوں"۔ لڑکا چلا گیا اور میں پھر کہانی لکھنے میں مصروف ہوگیا لیکن آپا بھی فلیریا کی پرانی مریضہ تھیں آسانی سے پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھیں۔ ابھی چند منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ آپا کا ہرکارہ پھر آتا ہوا دکھائی دیا میں دور ہی سے غصہ میں دھاڑا "اب کیا پوچھا ہے تمہاری آپا جان نے؟"

لڑکا قریب آکر بولا "آپا نے کوئی اچھا سا فلمی رسالہ مانگا ہے"۔ میرے پاس کوئی فلمی رسالہ نہیں تھا البتہ ایک مذہبی رسالہ سامنے ہی رکھا ہوا تھا میں نے اسی رسالہ کو دے دیا اور اسے تاکید کردی کہ اب یہاں آئے

لڑکا رسالہ لے کر چلا گیا اور چند منٹ کے بعد پھر وہ آدھمکا۔ اس دفعہ وہ رسالہ واپس کرنے آیا تھا فلیریا کا مریضہ کو بھلا بھی رسالہ پڑھنے کی فرصت کہاں تھی۔ لڑکا رسالہ واپس کر کے خاموشی کے ساتھ چلا گیا۔ یرا ذہن بھی ماؤف ہو گیا تھا۔ تازہ دم ہونے کے لئے میں نے کپڑے تبدیل کئے اور مکان میں تالہ لگا کر شنکو ہوٹل چلا گیا۔ اتفاق سے ہوٹل میں میرا رازدار دوست اکرم مل گیا۔ جب میں نے اسے سارا ماجرا سنایا تو وہ میرا مذاق اڑانے لگا "یار تم نرے گدھا ہو۔ اتنے میں بیرا نے نزدیک آکر سلام کیا اور اس سے پہلے کہ سے آرڈر دیا جائے پوچھنے لگا "یہ "شکتی" کیسی فلم ہے صاحب سنا ہے خوب چل رہی ہے"!

ابھی اس نے اپنی بات ختم نہیں کی تھی کہ ہوٹل کے منیجر نے اسے آواز دے کر پوچھا "شکتی کا ٹکٹ لایا کہ نہیں"؟

ٹکٹ نہیں ملا صاحب"۔

"صاحب کے بچے ٹکٹ نہیں ملا تو بلیک اسے لے لیا ہوتا"؟

دل چسپ بات یہ ہے کہ ایک ہوٹل میں ہی نہیں اگر آپ حجام کے پاس جائیے تو حجام آپ کی "حجامت" ود میں بنانے گا پہلے فلم کا ذکر کرے گا۔ دھوبی کے پاس جائیے، سفر میں رہیئے، یہاں تک کہ جیل خانہ اور سپتال میں بھی غرضیکہ ہر جگہ آپ کو فلم کے متعلق ہی سننے کو ملے گا۔ عزیز واقارب آپس میں ملتے ہیں تو خیر خیریت ود میں پوچھی جاتی ہے پہلے کسی نئی فلم کے متعلق اظہار خیال ہوتا ہے طلباء سے جہانگیر بادشاہ کا اصلی نام پوچھا جاتا ہے تو فوراً جواب ملتا ہے "دلیپ کمار" ہنسی خوشی کی محفل ہو یا ماتم کا موقعہ ہر جگہ فلم کا چرچا سنائی دیتا ہے۔

غرض کہ یہ فلیریا کا مرض جس رفتار اور جس شدت کے ساتھ پھیل رہا ہے اسے دیکھتے ہوئے یہ بات سانی سے کہی جاسکتی ہے کہ وہ دن دور نہیں جب کہ ملک میں ہر طرف فلم ہی فلم ہوگی۔ لوگ دفتروں میں کام نے کی بجائے فلم دیکھا کریں گے۔ اسکولوں اور کالجوں میں پڑھائی کی بجائے فلم دکھائی جائے گی اس وقت چھے سے اچھا طبیب اگر چاہے کہ یہ مرض دور ہو جائے تو یہ ناممکن ہوگا۔ البتہ یہ ہوگا کہ معالج دوسروں کے علاج ی فکر میں خود ہی ایک روز فلیریا کا مریض ہو جائے گا۔

۵۵

اسمٰعیل اثر (دکن)

میں کیا کھائی، مائی!؟

پڑوسن — آج کیا جی پکائے خالہ بی!
کل تو مرغی کی باس آتی تھی
ہو جی خالہ تمھارا پیٹ پھٹو
ہمنا نئیں دے کو کھالیے ناجی

خالہ بی — اللہ ماں ایک مرغی میں کاٹیوں
پاڑ کیا سات کے ٹکڑاں بانٹیوں
میرا کیا پانچ بس سلامت رہو
بیٹیاں ان کیچ خالی بھرتے جو
کنڈے بھر بھر کو کورتے رہتیں
پھر بھی ہنڈیاں کو گھورتے رہتیں
کیا میں بیٹیاں کی بولوں ماں کانی
مرغی بولے تو ان کی ردحانی
کب بی نئیں کھائے سرکا لڑگئے گے
سب ہی ہنڈی کو بچہ ہوندے پڑ گئے گے
پاداں لے کو ہٹیا بڑا پیٹا
منجلا اچھا بھرک کو ایک کو پا
چھوٹے بیٹے کا ودچ اک رونا
کھا کو اٹھو رے کتو ابی ہونا
بیٹی مدت کے بعد آکو ہے
ساس کے گھر میں اچھا کھا کو ہے

پوٹیاں میں جو کچھ بھرے بیا
کھاتے جاتی ہے بولتے کیا
دو بچے جوش کو بھاڈالے
باقی بیٹے میاں دبا ڈالے
یا اللہ میں کیا کھائی مائی گے
نام کو ذرا ہنڈی چاٹی گے

رویندر کمار روی

گیت

ہر دل کا جو سپنا تھا صدیوں سے ساکار ہوا
دھن بھاگ وہ ہم لوگوں پر جن کا یہ اُپکار ہوا
جھوٹ کا ڈیرا کل تھا جہاں پر آج وہاں آبادی ہے
گاندھی سیتو بن جانے سے گنگا تٹ گلزار ہوا
کل تک تھی اسٹیمر ناؤ اب ہر ایک سواری ہے
اب کیا ہے لو آج چکاچک سب کا کاروبار ہوا
پار اُتاریں گے لوگوں کو رکشا، بس، تانگے والے
نہیں کہے گا کل سے کوئی "میرا بیڑا پار ہوا"
اُچھل اُچھل دل سینے میں مجھ سے کہتا ہے اے روی
کل تک میلوں دوری تھی اب پاس ہی کو سے پار ہوا

محمد طارق (کھولاپور مرادآباد)

نیکی کی تلاش

میرے پاس خدا کا دیا اور بندوں سے لیا بہت کچھ ہے۔ ویسے اپنی پونجی میں سے اگر خدا کا دیا نکال دوں تو میری دولت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی اور بندوں سے لیا دضع کر دوں تو یقیناً میں ہندوستان کے ادنیٰ غریبوں میں شمار کیا جانے لگوں گا۔ اس لئے میں نے ہمیشہ خدا کا دیا اور بندوں سے لیا کے فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے دولت کمائی اور کبھی خدا کو حاضر ناظر جان کر اُس میں سے بندوں کا لیا وضع کرنے کی جرأت نہیں کی۔ اس لئے میرا شمار اب شہر کے مالدار ترین آدمیوں میں ہونے لگا ہے۔ آپ بھی آزما کر دیکھ لیجئے نسخہ اچھا ہے!

میری بیوی ہمیشہ مجھے کہتی ہے کہ اتنی دولت جمع کر کے کیا کروگے۔ کسی نیک کام میں پیسہ صرف کرو وہی آخرت کی زندگی میں کام آئے گا۔

اور میں ہمیشہ سوچتا ہوں پیسہ کتنی عظیم چیز ہے جس سے دنیا کی زندگی تو سنورتی ہی ہے آخرت کی زندگی بھی بنائی جاتی ہے۔ لیکن میں اپنی دنیاوی زندگی ہی سنوارتا رہا اوپر کی زندگی کی کوئی فکر ہی نہیں کی۔

اس وقت میں جوان تھا۔ سوچا کرتا تھا" ابھی تو میاں عیش کے دن ہیں، دولت جمع کرو اور مزے لوٹو، جب عمر کچھ ڈھل جائے گی تو دولت لُٹا لُٹا کر نیک کام کر لینا جن کی دنیا کو ہمیشہ سے ضرورت رہی ہے۔ اوپر کی زندگی با آسانی سنور جائے گی۔

اب شباب کی عمر ڈھل چکی تھی۔ بیوی کا اصرار بڑھ گیا تھا کہ دھڑا دھڑ نیک کام کرنا شروع کر دو۔ کیا پتہ تم کب مر جاؤ۔ آج کل تو موتیں "بجلی کی طرح" ہو گئی ہیں جن کا کوئی بھروسہ نہیں ابھی شہر برقی قمقموں سے جگمگاتا نظر آئے گا اور دوسرے ہی پل تاریکی میں ڈوب جائے گا بالکل اسی طرح زندگی کا حال ہو گیا ہے اس لئے کہتی ہوں "فٹافٹ" نیک کام شروع کر دو کچھ میرے نام سے کچھ اپنے نام سے۔ اس بات کا خیال رکھتے ہوئے

کام ایسے ہوں جن کا ثواب تا قیامت ملتا رہے "
اپنی بیوی کے منہ سے یہ جملہ سن کر بے ساختہ میرے لبوں پر تبسم پھیل گیا تھا۔ کیوں کہ ذہن میں اس کے لئے اچانک عجیب خیال کلبلایا تھا۔ میری بیوی کس قدر بزنس مائنڈ رکھتی ہے۔ آخرت کے دھندے میں بھی تھوڑا پیسہ لگا کر زیادہ کمانا چاہتی ہے۔ بیٹی ہے ایک بڑے بزنس مین کی ——!
بہر حال میں بھی پکا بیوپاری ہوں اپنی بیوی کی بات سے متفق ہو گیا۔ اور سوچنے لگا کہ مجھے کونسا نیک کام کرنا چاہیئے —— "مسجد تعمیر کروا دوں!؟"
مگر شہر میں تو بہت ساری مسجدیں مصلیوں کے لئے ترس رہی ہیں ایک ویران مسجد اور بڑھ جائے گی تو کیا فائدہ؟
"اسکول کھول دوں"
ایک کمیٹی بنانی پڑے گی۔ صدر، نائب صدر، سیکریٹری اور ممبران پر مشتمل ——!
نتیجہ کیا ہوگا ——؟
کرسیوں کے لئے لڑائی جھگڑے شروع ہو جائیں گے۔ بچوں کی تعلیم کا نقصان ہوگا، ویسے آج کل تعلیم سے کوئی اخلاقی فائدہ تو ہو ہی نہیں رہا ہے ——
اسپتال کی تعمیر کیسی رہے گی؟! میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔
جواب ملا غریب فضول آ آ کر مریں گے یا مارے جائیں گے۔ مالدار تندرست ہو ہو کر نکلیں گے —— کیوں کہ نرسیں ڈاکٹر، کمپونڈر تمام کے تمام دولت کے پجاری ہیں۔
"یتیم خانہ!" اچانک ایک خیال بجلی کی طرح کوندا۔
"ٹھیک رہے گا یتیم خانہ!؟"
"ہوں —— "میرے اندر کے آدمی نے جو ہمیشہ دور کی کوڑی لاتا ہے ایک لمبی ہوں کے بعد مجھ سے کہا شہر میں یتیموں کی تعداد بڑھ جائے گی، بچوں کو زبردستی یتیم بنایا جائے گا، کچھ خوشی خوشی یتیم ہونے کا دعویٰ کرنے لگیں گے۔ جوان بھی یتیم بن کر آئیں گے، اور بوڑھے بھی یتیم خانے کی چوکھٹ پر آکر اپنے پوپلے پوپلے منہ سے کہیں گے، ہمیں بھی بھرتی کر لو ہم بھی عرصے سے یتیم ہیں کوئی کہے گا میں دس برس سے یتیم ہوں، کوئی کہے گا میں پندرہ برس سے اور کوئی کہے گا صاحب میں تو بس آج کل میں یتیم ہونے والا ہوں میرا نام ویٹنگ لسٹ میں لکھ لیجئے۔
پھر اس کے بعد حق منوانے کے لئے یتیم خانے کے سامنے نعرے لگائے جائیں گے۔ ہڑتالیں ہوں گی۔ جلوس نکالے جائیں گے ——
ہشت ——! بیکار ہے، فضول، بکواس۔ ہر نیک کام نے اپنی افادیت لیڈروں کے دعدوں کی طرح کھو دی ہے۔ میں کونسا نیک کام کروں —— تمام نیک کاموں کی پاکیزگیاں ختم ہو چکی ہیں۔ بدنیتیاں اُن میں اس طرح ملا دی

حتیٰ ہیں جس طرح شہد میں گڑ ۔ دودھ میں پانی وغیرہ وغیرہ ۔

ایک دانشمند کی طرح سوچنے اور سمجھنے کے بعد ایک کام مجھے بھا گیا۔ جس میں کسی قسم کی ملاوٹ مجھے نظر نہیں آئی۔ جس پہلو سے بھی دیکھو نیک ہی نیک۔ خالص نیک ۔ میں نے اس پر عمل کرنے کا فیصلہ کرلیا ۔

دوسرے دن میں نے آبادی سے کچھ دور ایک کھیت خریدا اُسے چاروں طرف سے فنسنگ کروائی ۔ پینٹر کے ہاں جاکر ایک بڑا سا بورڈ لکھواکر اُسے کھیت کے دروازے پر لگا دیا۔ بورڈ پر جلی حرفوں میں "خوش آمدید" اور اس کے نیچے "عمدہ قبرستان"۔ اور اس کے نیچے ایک نوٹ تھا :۔

"یہاں بغیر معاوضہ کے بہترین قبریں دی جاتی ہیں۔ آئیے اپنے مُردوں کو یہاں دفنائیے ــــ اور خود بھی یہیں دفن ہونے کی کوشش کیجئے"

ڈھول کا پول

بیلن نظام آبادی

بارہ بیچے کو سب مل کو کر رئیں رے سسترول
اچھے خاصے لوگوں کی ہے نیت ڈانواں ڈول
چوبارے پو بیٹھ کے بیلن سب کی پوتی کھول
تک دَھنا دھن بول رے بیلن تک دَھنا دھن بول

ماڑیاں چھوڑیں جھونپڑیوں پو ٹیکس بڑھاریں
اوندھے چھتے کا ماں کر کو آئی سو پونجی گنواریں
گھر میں چولھا ٹھنڈا ہے باراں میں پی ریتی کھاریں
کھول رے ڈھول کا پول

گلی گلی بھاشن ہیں لیڈر کے صبح و شام...
بھائیاں بھائیاں لڑ لے رئیں اِک بھولو جھاک کا ماں
کھانے کو تو دِک نئیں ہے یہ کاٹے کے اوندھے کا ماں
بھر لے کو پھیر رئیں کشکول

پاشو میاں کی شادی میں کیا ٹھاٹ ہے کیا آرائش
سیکل سے تو گر کو پڑے ہیں اسکوٹر کی خواہش
ہندسے پڑھنے آتا نئیں ہے سیکو کی فرمائش
ہے پورا اِنے بغلول

سیدھی ہے یا اُلٹی ترقی شیخ گھڑو ہی جانے
سوئی لوٹ کا چکر نہیں تھا گیا میں چکر لانے
چکر لاتے تک تیل کے بھاؤ میں بڑھ گئے پھر آٹھ آنے
ہے سب کا ڈبّہ گول

چوروں کا بھوت

قمر الزماں قمر

چوروں کا جب گروہ مچانے لگا اودھم
ناکوں میں سارے اہلِ محلہ کے آیا دم
چوروں کا بھوت سب کے دماغوں پہ چھا گیا
پہرے کا انتظام بالآخر کیا گیا!
کل شب کو شور و غل جو پڑوسی کے گھر ہوا
لاٹھی لیے میں ہاتھ میں باہر نکل پڑا
پوچھا جو میں نے اُن سے کہ کیا بات ہے جناب
کہنے لگے کہ چور کا دیکھا تھا میں نے خواب
اُٹھ کر اُتاری کھونٹی سے تلوار آب دار
کھینچا اُسے میان سے باہر بہ اضطرار
تلوار کو تھما دیا بیگم کے ہاتھ میں
اور خود میان لے کے نکل آئے ساتھ میں
منظر یہ تھا کہ دوڑتے پھرتے تھے شان سے
الفاظ چور چور تھے جاری زبان سے
پوچھا حضور! ہاتھ میں یہ کیا ہے آپ کے
بولے کہ توبہ! خوف سے ہم ہوش کھو گئے

جمال احمد فردوسی (سماچار بھارتی پٹنہ)

سخاوت فدو میاں کی

کسی بزرگ نے بڑی اچھی اور تجربہ کی بات کہی ہے ؎

شادی بھی عجب شئے ہے اے لالۂ صحرائی
لے والی کا "بودم" بھی پٹھا نظر آتا ہے

یہ حقیقت ہے کہ شادی کے بعد ٹھیک اسی طرح بیوقوف یا الّو بننا پڑتا ہے۔ انسان کی تمام ہوشیاری ختم ہو جاتی ہے اور وہ بیچارہ ناچار و بے بس بیوی کی فرمابرداری میں مصروف رہتا ہے یعنی اپنی زندگی کو وقف کر دیتا ہے۔ بہت سے ایسے خوش قسمت انسان بھی ہوتے ہیں جنھیں بیوی کی باربرداری کے علاوہ سسرال کی باربرداری کا بھی موقع نصیب ہوتا ہے اور وہ سسرال بھی لائق قدر اور قابل رشک ہوتا ہے جسے ان تمام اوصاف سے خریدا داماد مل جائے۔ لیکن اس طرح کے داماد آج کل آؤٹ آف مارکیٹ ہیں۔ شاذ و نادر ہی ایسے بدنصیب مل پاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے داماد کی تلاش کرنا قطب جنوبی کی مہم سر کرنے کے برابر ہوتا۔ بہر طرہ یہ ہے کہ ڈاماہوی [illegible] کافی گراں ہو گئی ہے۔ ایک معمولی درجہ کے داماد کی قیمت کم از کم ۱۰ ہزار روپے ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ لڑکوں کی مختلف شرائط بھی ہوتی ہیں۔ جیسے لڑکیوں کا حسین ہونا، پڑھا لکھا ہونا، باسلیقہ ہونا، خواہ لڑکا اچھا ہو یا کانا۔ مگر لڑکی کے رنگ کا گورا ہونا ناک نقشہ درست ہونا لازمی ہے۔

لیکن جس داماد کی قیمت پچاس ہزار یا اس سے زیادہ ہوتی اس طرح کی شرائط کا خیال نہیں رکھا جاتے۔ لڑکی چیچک داغ کی ہو یا کھونا گرا، بدسلیقہ ہو یا بدصورت، نرگسی آنکھ، ستواں ناک، کتابی چہرہ، صراحی دار گردن، ککڑی جیسی پتلی کمر وغیرہ کی کوئی شرط نہیں ہوتی۔ اس قسم کے داماد بڑے نیک صفت ہوتے ہیں۔ انھیں محض روپے سے مطلب ہوتا ہے کسی عیب سے نہیں۔ وہ صورت اور سیرت کی تمام خامیوں کو نظرانداز کر کے نہایت خاکساری اور چابکدستی سے بیوی کی

کی جی حضوری میں گذر بسر کرنے میں مشغول رہتے ہیں۔

لیکن ہم ایک ایسے خوش قسمت سسرال سے واقف ہیں جسے فدو میاں جیسا داماد بے شان وگمان مل گیا یا قدرت نے آسمان سے ٹپکا دیا۔ ویسے سسر کو اپنی لڑکی کی شادی کی کوئی خواہش نہ تھی۔ مگر فدو میاں جیسا ارزاں ترین داماد مل جائے اور شادی سے انکار۔ یہ تو سراسر اللہ میاں کی ناشکری ہوتی۔ سسر نے چند ناز نخرے، مختلف مجبوریاں جتا کر فوراً شادی کے لئے حامی بھرلی۔ فدو میاں نے باراتیوں کی خاطر داری کے لئے کوئی تکلف کرنے پر زور نہ دے کر سادہ ناشتہ پر ہی اکتفا کر لینا بہتر سمجھا اور سسر کو بھی اچھا موقع ہاتھ آیا۔ بس چٹ منگنی اور پٹ بیاہ ہو گیا۔

سُنتے ہیں کہ جو داماد کوئی فرمائش نہیں کرتا یعنی جن لڑکوں کا کوئی ڈیمانڈ نہیں ہوتا انھیں نیک خو، نیک صورت بیوی [illegible] لیکن نیک سیرت بیوی قدرتی طور پر مل جاتی ہے۔ بدقسمتی فدو میاں کی۔ کہ بیوی کے روپ میں قدرت کی طرف سے انھیں اس نیکی کا کوئی بونس نہیں مل پایا۔ بلکہ بڑی زور دار، آرام طلب، شوہر کے دل پر حکمرانی کرنے والی بیوی نصیب میں آئی۔ فدو میاں کی زندگی بیوی کی غلامی میں گزرنے لگی۔ قلیل آمدنی کے باوجود اخراجات کے دہانے کھول رکھے تھے۔ بیوی شاہ خرچ تھیں۔ میاں کی سخاوت کا جائز فائدہ اٹھا رہی تھیں۔ اگر کسی دن کوئی کوتاہی سرزد ہو جاتی یعنی چپل کی کیل ٹھکوانا۔ بچوں کی پھلیاں دھونا وغیرہ وغیرہ تو موسلا دھار برس پڑتیں۔ گھنٹوں بعد کہیں تھمتیں۔

پھر ایک دن ایسا آیا کہ فدو میاں کا میکہ سُسرال میں تبدیل ہو گیا۔ سسرال والے یکے بعد دیگرے بالترتیب آئے اور جم گئے۔ سب سے پہلے فدو میاں کی ایک چہیتی سالی جو بہنوائی اور بہن سے ملنے آئیں اور یہاں چوتھے دن چوتھے بچے کی ماں بن گئیں۔ بہر کیف فدو میاں اپنی سخاوت و دریا دلی کی عظمت کو برقرار رکھنے کے لئے ان کے تمام اخراجات برداشت کرنے لگے پھر دیگر سالیاں، ساس، سُسر وغیرہ بھی مبارکباد کے بہانے قیام پذیر ہوئے۔ سُنتے ہیں کہ نئے شادی شدہ لڑکوں کے لئے سسرال جنت ہوتی ہے اور واقعی وہ جنت اٹھ کر فدو میاں کے گھر آگئی۔ موسم بہار آگیا اچھی خاصی چہل پہل۔ ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں روز نئی نئی رنگ برنگی محفلوں کا انعقاد ہوتا۔ شام غزل۔ شام افسانہ کا منعقد ہونا۔ یہاں تک کہ چھلّہ کافی تزک و احتشام اور خوب دھوم دھام سے تاریخی طور پر منایا گیا اور یہ تمام اخراجات بھی فدو میاں کے ناتواں کندھے پر۔ بیچارے مرتے کیا نہ کرتے۔ بیوی کے گھر والے جو ٹھہرے۔ بہر حال ان کی آرزو یہی تھی کہ جس طرح بھی ہو سالیاں خوش رہیں۔

لیکن برداشت کی حد ہوتی ہے۔ اس قافلے نے سیکڑوں سسرالی قافلے کے ریکارڈ توڑ ڈالے۔ بالآخر بھائی فدو کا بجٹ فیل ہو گیا۔ ہزاروں روپے کے مقروض ہو گئے۔ اس بوجھ کی تاب نہ لا کر بُری طرح کراہ اُٹھے۔ اس کراہ کا تھوڑا اثر ضرور ہوا۔ اور تمام قافلے والے رخصت ہونے کے لئے بوریا بستر گول کرنے لگے۔ بھائی فدو نے انھیں اخلاقی طور پر کہا کہ۔ بھائی صاحب دو چار دن اور سہی۔ دل ابھی بھرا نہیں۔ اتنا کہنے جیسے وہ اکھڑ۔ قافلے کا کوچ سفر دو چار دنوں کے لئے کیا پندرہ دنوں کے لئے ملتوی ہو گیا۔

فدو میاں بے چارے کی بیچارگی پر شیطان کو ترس آیا اور اس نے ایسا " لگاکر سسرال اور میکے کے مابین جنگ چھڑ گئی۔ سرد جنگ تو کئی روز سے چل رہی تھی۔ اب باقاعدہ مقابلہ ہونے لگا۔ منہ کی توپ سے باتوں کے بھاری بھرکم گولوں کا تبادلہ ہونے لگا۔ بھرپور حملہ شروع ہوا۔ مغلظات کا وہ گولہ جس پر جاکر گرتا۔ وہ قدرے پُرسکون ہوجاتا۔ فدو میاں کا بلڈ پریشر ہائی۔ وہ اسپتال میں داخل۔ اس جنگ میں دونوں فریقین اپنے آپ کو فدو میاں کے ہمدرد اور خیرخواہ ثابت کرنے کے لئے دلیل پہ دلیل پیش کر رہے تھے۔ میکے والے۔ باوجود سینکڑوں نقصانات کے فتح یاب ہوئے۔ اور فدو میاں گئے اسپتال۔ گھر میں حقہ تمباکو بند، فاقہ کشی کی نوبت۔ سسرال والوں نے اسپتال جاکر عیادت یا تیمارداری کرنے کی بجائے گھر کی راہ لی۔

aa

اشعار

ساغر شولاپوری
(شولاپور)

احباب میرا ساتھ کچھ ایسا نبھائے ہیں
سب یار مِل کے بھیک کے رستے پو لائے ہیں

بیمار تھا تو کرتی میں آیا نہ کوئی پاس
مرنے کے بعد لاش پو رونے کو آئے ہیں

روز ملتیں مجے رستے پو نرالے لوگاں
کبھی اُجلے کبھی گورے کبھی کالے لوگاں

کچھ یتیم خانے کے ناماں پو اُٹھا کو چندے
پیٹ بھرنے کے نوبے دھندے نکالے لوگاں

مجیب الرحمٰن بزمی
(رائچور)

جادو کسی کے حُسن کا چلتا دکھائی دے
زاہد ہتھیلیوں کو مَسلتا دکھائی دے

احساسِ بونگی پہ پشیماں وہ کیوں نہ ہو
بیگم کا قد جب اس کو نکلتا دکھائی دے

پھر کون تیری سمت نگاہیں اُٹھائے گا
سورج ہی جب شباب کا ڈھلتا دکھائی دے

بزمی غمِ فراق کا مارا ہے، کیوں نہ وہ
تاریک شب میں چھت پہ ٹہلتا دکھائی دے

اسمٰعیل ذبیح (سرونج)

دل لگانا، گنگنانا، ناچنا کچھ بھی نہیں — عصرِ نو میں رونے دھونے کے سوا کچھ بھی نہیں
مرنے والوں کی دعاؤں کا صلہ کچھ بھی نہیں — نام پر ان کے درود و فاتحہ کچھ بھی نہیں
تیل مصنوعی بٹر میں سوپ گھی میں ڈالڈا — اس زمانے میں میاں خالص رہا کچھ بھی نہیں
روپ انسان بنتے بنتے ہر دن بدلتا ہے ذبیح — آج اس کے سامنے بہروپیا کچھ بھی نہیں
چاہیئے پوری پراٹھا اور نہ حلوہ چاہیئے — ڈھونڈتی ہے ہر نظر جس کو وہ مرغا چاہیئے
ایک ایٹم بم ہی کافی ہے مری فریاد کا — قصرِ استبداد کے ڈھانے کو اور کیا چاہیئے
عشق میں فاقہ کشی ہو جانے کا اب غم ہے فضول — پیٹ بھرنے کے لیے بس دل نچانا چاہیئے
آدمی چارا نہ پائے بھوک میں تو غم نہیں — دیش میں لیکن ہمارے بھائی چارا چاہیئے
کس خطا پہ ضبط فرمائی بیاض اس نے ذبیح — تم کو میری پولیس سے یہ تو پوچھا چاہیئے

ممتاز حسین فہیم
آکولہ (مہاراشٹر)

جدید فرہنگ

آپ بیتی :۔ خود ستائی کا ایک ذریعہ۔
اخلاق :۔ زمانۂ قدیم کا ایک زیور جس کا استعمال آج کل ممنوع ہے۔
اسپتال :۔ انسانی سلاٹر ہاؤس
آشیانہ :۔ ایک پناہ گاہ جو ہمیشہ بجلیوں کی زد میں رہتی ہے۔
اناج :۔ پیٹ کا ایندھن۔
آنسو :۔ عورت کا سب سے کارگر حربہ جس سے وہ مرد کو زیر کرتی ہے۔
انقلاب :۔ غریبوں کے لئے مہنگائی پیام۔
ایمان :۔ جسے بیچ کر بے تحاشا نفع کمایا جا سکتا ہے۔
ایمرجنسی :۔ ایک دور جس میں بہت سے لیڈروں نے بعد بسکیاں دینا چھوڑ دی تھیں۔
بینک :۔ ایک ادارہ جو دوسروں کا پیسہ سود پر چلاتا ہے۔
پارسا :۔ لائسنس یافتہ ریاکار۔
پارلیمنٹ :۔ سیاسی اکھاڑہ۔

پاگل خانہ :۔ انسانی کباڑی ہاؤس۔
پٹرول :۔ ایک ایندھن جس کے بغیر کار والے بیکار اور بس والے بے بس ہیں۔
پولیس :۔ مجرموں کی سرپرست۔
پیار :۔ ہوس کا خوبصورت نام۔
تقدیر :۔ بے وفا محبوبہ۔
ٹوئسٹ :۔ ایک قسم کا اعضاء شکن ڈانس۔
جج :۔ قانونی کتابوں کا قیدی۔
جہیز :۔ مال غنیمت۔
جیل :۔ مجرموں کی درسگاہ۔
حیا :۔ زمانۂ ماضی کا ایک فیشن۔
خدا :۔ ایک ممتحن جو ہمیشہ بندوں کے امتحان لیا کرتا ہے۔
خلوص :۔ ایک جذبہ جو اس دنیا میں نہیں پایا جاتا
خیرات :۔ جنت کی آس میں غریبوں کو دیا جانے والا ایک ٹکڑا۔
چمچہ :۔ چڑھتے کو چاروں طرف سے گھیرے رکھنے والا شخص۔

چِتنا :۔ ایک سواری جو چتا تک پہنچاتی ہے۔
دعا :۔ بے بس انسان کا آخری سہارا۔
دل :۔ خواہشات کی تجوری۔
دلآزاری :۔ ایک گناہ، جسے آج کل ثواب کا درجہ حاصل ہے۔
دماغ :۔ ویسٹ بکس، جس میں لوگ اوٹ پٹانگ مشورے پھینک جاتے ہیں۔
دوست :۔ رنگا سیار۔
رشوت :۔ محنتانہ۔
ریفریجریٹر :۔ بیوی کا ایک نعم البدل۔
زمانہ :۔ ایک گرگٹ جو خطرناک رنگ بدلتا ہے
سالا :۔ جونک۔
سگریٹ :۔ مل کی چمنی۔
سود :۔ ایک بیماری جو سرطان کی طرح بڑھتی ہے
شراب :۔ بے وقوف بنانے والی ٹانک۔
شک :۔ ایک لاعلاج مرض۔
صبر :۔ مجبوری اور بے بسی کا نام۔
ضمیر :۔ ایک ایسی عدالت جہاں جھوٹ بولنا ممکن نہیں۔
علم :۔ ایک جھنگ، جس کا نشہ دھیرے دھیرے چڑھتا ہے۔
عورت :۔ ایک فتنہ، جو آدم کی پسلی سے پیدا ہوا تھا۔
فرشتہ :۔ ایک محرّر، جو اعمالنامے قلم بند کرتا ہے۔
فیشن :۔ ایک متعدی بیماری۔
قبر :۔ آخرت کی پہلی منزل۔
قبرستان :۔ مردوں کی کالونی۔
کالج :۔ ایک کارخانہ، جہاں شریف بدمعاش ڈھلتے ہیں۔
کرسی :۔ ایک تیز اثر نشہ۔

لیڈر :۔ دعووں کی صلیب پر عوام کو لٹکائے رکھنے والا شخص۔
مہر :۔ زرِ ضمانت۔
میک اپ : ملمع کاری۔
ناخن :۔ بغیر لائسنس کا ایک ہتھیار۔
وظیفہ :۔ خیرات
وکیل :۔ شیطان کا ارضی نمائندہ۔
ہوس :۔ ایسا دریا جس کا کوئی کنارہ نہیں۔
یاد :۔ گڑے مردے اکھاڑنے کی عادت۔

■□

بال کی کھال

تبصرہ از: ڈاکٹر سید عابد حسین

ہنستے ہنستے

مصنفہ برق آشیانوی

برقِ سمادی اور برقِ آشیانوی کے درمیان ایک باریک فرق یہ ہے کہ آشیانوی برق کے لئے ابھی تک سائنس داں کوئی ایسا برق کش ایجاد نہیں کر پائے ہیں جو آپ اپنے سر پر فٹ کر کے برقی صدمے سے محفوظ رہنے کی تدبیر کر سکیں۔ آسمانی برق کی جلوہ ریزی سے قبل کچھ گھٹا اٹھتی ہے۔ آندھی چلتی ہے۔ طوفان آتا ہے۔ جل اور جلال کے ورد کا کوئی موقعہ ملتا ہے لیکن یہ آشیانوی بجلی تو بس ایسی ہے کہ جیسے ہم آپ فائرنگ اسکوئیڈ کے سامنے چہل قدمی کا حکم لے رہے ہوں۔ چنانچہ اسی قریبی رینج سے برق صاحب نے پھر فائر کیا ہے اور دعویٰ یہ ہے کہ یہ سب کچھ ہنگامہ ہے ہنستے ہنستے۔

یہ "ہنستے ہنستے" برق آشیانوی صاحب کا تازہ ترین مجموعۂ مضامین ہے جس کو کھولتے ہی یہ دھمکی نظر آتی ہے۔

یہ طنز و مزاح کے ادیب و شعرا
دنیا سے بھی جاتے ہیں تو ہنستے ہنستے

دراصل آج کل کے رسائل کی طرح یہ مجموعہ بھی برق صاحب کے مضامین کا ایک خاص نمبر ہے اور اسے آپ اپنی سہولت کے لئے "آفات نمبر" کا نام دے سکتے ہیں ابتداء بیماری اور تیمارداری سے ہوتی ہے۔ پھر جان بچا کر لکھنؤ جا نکلتے ہیں لیکن سوتے جاگتے وہاں بھی جان کی خیر نہیں۔ اس کے بعد جان کے عذاب کا ذکر ہے اور وہ بھی کاتب تقدیر کے ہاتھوں۔ دنیا کو خیرباد کہہ کر درویشی کی ٹھانی تو درویش نمبر سات سے ملاقات ہو گئی۔ لیکن ہوشیار یہ درویش اور کوئی نہیں فرشتۂ اجل کے سفیر خصوصی ہیں اور مجموعے کا اختتام قاضی کے ذکر پر ہوتا ہے جن کے بارے میں یہ انکشاف [illegible] ہے کہ جس طرح "فانی" کو "فنا" سے نسبت ہے اسی طرح "قاضی" کو "قضا" سے علاقہ ہے۔ پھر پانی کی قلت اور پنشن اور صداقت نامہ فوتی کی بات بھی موجود ہے۔ چنانچہ برق صاحب کے مزاج کا یہ برقی عنصر پورے مجموعۂ مضامین میں بڑی خوبی سے پھیلا ہوا ہے ہاں اگر آپ خالص مزاح کے شائق ہیں تو پھر بسود کی نانی اماں (سارو لیس) کے تذکرے، کلام غالب

کی [illegible] کے ساتھ انگلش میڈیم طلباء کی
ایک [illegible] کو بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔

کتاب کے دوسرے صفحے پر تحریر ہے: "قیمت مجلد مع ڈسٹ کور۔ دس روپے"۔ ایک ماہر نے ہمیں بتلایا ہے کہ یہ دراصل جلد اور ڈسٹ کور کی قیمت ہے۔ لہٰذا کتاب بر نفس نفیس مفت پڑتی ہے۔ لہٰذا قارئین سے درخواست ہے کہ وہ قطار میں آئیں۔ ان کی سہولت کے لئے مصنف نے اپنے مکان کا پتہ صاف حروف میں درج کر دیا ہے۔

برق صاحب کا یہ مجموعہ ان کے مزاحیہ اسلوب کی کس طرح نمائندگی کرتا ہے جس طرح ان کا نشان [illegible] دفتر سے انھیں طبقۂ شرفا سے متعلق ہونے کا سرٹیفکیٹ دلوا سکتا ہے۔

گلستان کی کہانیاں (امیر حسن نورانی)

[illegible] کے کملر صاحب ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو [نئی] دہلی نے اشاعتی پروگرام کے بارے میں لکھا ہے کہ [انسائ]کلوپیڈیا، اردو لغت، اصطلاح سازی اور [درس]یات کی تیاری کا کام ہو رہا ہے۔ یقیناً بیورو کے [یہ م]نصوبے اردو زبان و ادب کی ترقی میں ممد و معاون [ثاب]ت ہوں گے لیکن ان بڑے منصوبوں کے ساتھ ساتھ [بچو]ں کے ادب کا فروغ بھی غیر معمولی اہم کام ہے جو ترقی [ارد]و بیورو انجام دے رہا ہے۔ یہ کام دو طرح سے [ضروری] ہے (۱) ایک تو یہ کہ بچوں میں مطالعہ کا شوق پیدا ہو (۲) اور یہ کہ ان کے اخلاق و کردار کی تعمیر میں گلستان [کی کہ]انیاں مفید ثابت ہوں گی۔

[جن]اب امیر حسن نورانی کی مرتبہ گلستان کئی حیثیتوں سے مفید ہے۔ کہانیاں دلچسپ، عام فہم اور آسان زبان میں لکھی گئی ہیں اور بچوں کی ذہنی اور اخلاقی تعمیر میں اکسیر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ غالب نے آم کے بارے میں کہا تھا کہ میٹھے ہوں اور خوب ہوں۔ گلستان کی کہانیاں مزے میں پرلطف اور تعداد میں خاصی ہیں۔

بچوں کی کہانیوں کا یہ سلسلہ جاری رہنا چاہئے

(طیب انصاری)

بچوں کی مسکان

(سیدہ فرحت)

ترقی اردو بیورو نئی دہلی کی یہ دوسری کتاب ہے جسے سیدہ فرحت نے بڑے ہی انہماک اور دلچسپی سے ترتیب دیا ہے۔

بچوں کے لئے ابتدائی حصہ میں عام موضوعات پر نظمیں شامل ہیں۔ بچوں کا مشاعرہ اور یادوں کے دیپ علیحدہ علیحدہ نظمیں ہیں آخر میں قوالیاں بھی شامل ہیں۔ علمی، اخلاقی اور قومی نقطۂ نظر سے نظموں کا انتخاب بہت اچھا ہے۔

ان دونوں کتابوں کے مطالعہ کے دوران جو بات کھٹکتی ہے وہ صفحات کے انگریزی زبان میں نشانات ہیں۔ بیورو کے ارباب مجاز اس جانب توجہ دیں تو یہ بد مذاقی دور ہو سکتی ہے۔

ہر دو کتب کی اشاعت کے لئے [illegible] اور مرتبین سیدہ فرحت اور امیر حسن نورانی ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں۔

(طیب انصاری)

ریزۂ خیال (انشائیوں کا مجموعہ)

ڈاکٹر کمال الدین

قیمت ۹ روپیہ

کتب نمولی۔ لال باغ۔ دربھنگہ

ڈاکٹر سید محمد حسنین کی سفارش کے ساتھ یہ ڈاکٹر کمال الدین کے انشائیوں کا مجموعہ ہے' ریزۂ خیال۔! اس مجموعہ مضامین میں کل اٹھارہ مضامین ہیں اور ڈاکٹر کمال نے جنبش قلم سے قاری کے دانت دیکھنے یا گننے کی کوشش کی ہے۔ مگر میرا یہ خیال ہے کہ انھیں "بمشکل کمال" فقطی پرسنٹ کامیابی نصیب ہوئی ہے اور ابتدائی دور میں یہ کامیابی بہت کافی ہے ان کا حوصلہ بڑھانے کے لئے۔

ڈاکٹر حسنین استاد اُردو ہونے کے ساتھ ساتھ نقاد بھی ہیں انہوں نے پیش لفظ لکھ کر مصنف کی پیٹ خوب ٹھونکی ہے۔ ڈاکٹر کمال کا یہ پہلا کارنامہ ہے جو منظر عام پر آیا ہے ان کے مضامین میں مزاح اور طنز کا امتزاج بہرحال ہے اور بڑا ہلکا اور شگفتہ۔ البتہ زبان کی شیرینی کو کتابت کی تلخی پی جاتی ہے۔

(طیب انصاری)

انسان کو ایک پل کیلئے بھی حقیقی سکون میسر نہیں ہر شخص چاہے امیر ہو یا غریب کسی نہ کسی الجھن اور پریشانی میں مبتلا ہے ایسے انتشار اور کشمکش کے دور میں کوئی چند لمحوں کیلئے بھی دلچسپی کا سامان مہیا کرسکتا ہے تو یہ بہت بڑا کارنامہ ہے آج کل آپ شگوفہ کے ذریعہ حسن خوبی سے انجام دے رہے ہیں۔

منظور وقار، گلبرگہ۔

(مُراسلے)

اکتوبر کا شمارہ دیکھا۔ بالزسر تاج شگوفہ میں مسلسل شائع ہو رہی ہیں۔ "بڑے بے آبرو ہوکر" افسانوی رنگ کا اچھا مضمون ہے۔ ایک اور خاتون مزاح نگار حلیمہ فردوس کا مضمون "بیٹھے ہی بیٹھے" بھی پسند آیا۔ مسیح انجم اور محمد سید اللہ مہدی ایک عرصہ کے بعد شگوفہ میں نظر آئے۔ لال یاد آیا۔ اکتوبر کے شمارہ کا قابل ذکر مضمون "ہوئے کرکٹ بن کے رسوا" بہت خوبصورت ہے۔ فیاض احمد فیضی کو مبارک۔ بہ حیثیت مجموعی شگوفہ کا یہ شمارہ انتخاب لگتا ہے۔ خدا کرے یہ معیار قائم رہے۔

سعید احمد، نئی دہلی

جہاں دنیا گول ہے وہاں فٹ بورڈ اور لونی شیخ، یوٹی لائزیشن، العذاب الیحل وغیرہ کی موجودگی صحت مند ہے۔ مجھے کہنے دیجئے کہ اکثر و بیشتر شگوفہ کا نثری پورشن خوب تر ہوتا ہے اور اس کا راز آپ کی حالات شناسی ہے، آپ خوب قارئین کے ذوق کی قدر کرتے ہیں بہت بہت مبارکباد! دعا و تمنا ہے کہ سالنامہ ۸۳ء خوب مرغوب ہو۔

صابر بہاری، رانچی

شگوفہ کا معیار دن بدن بڑھتا جارہا ہے۔ ہمارے حلقے میں یہ پرچہ اتنا مقبول ہے کہ دوسرے دن ہی نظام آباد بک اسٹال پر سب کا پیاں ختم ہو جاتی ہیں اور میں خود میرے دوستوں سے مانگ کر پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔

اقبال شانہ، نظام آباد۔

آج چاروں طرف تفکرات اور الجھنوں کا بازار گرم ہے۔ ۴۴

نامور مزاح نگار

یوسف ناظم

کے مضامین کا مجموعہ

قیمت ۶/ روپے

بتوسط:

شگوفہ حیدرآباد

اتحاد، یکجہتی اور سخت محنت

ہمارا نصب العین

آندھرا پردیش مقدس مسجدوں، مندروں، گردواروں

چرچوں اور گرجا گھروں کی سرزمین ہے۔

یہاں کے عوام مذہبی تہوار اور عیدیں مل جل کر مناتے ہیں۔

اس ریاست کے عوام جاتراؤں، میلوں اور عرسوں میں

تیاز مذہب و ملت شرکت کرتے ہیں۔

آئیے ہم اس اتحاد و یکجہتی کو مستحکم بنائیں اور ہر ایک

ب کی فلاح کے لیے کام کریں۔

(ڈی۔آئی۔پی۔آر۔اے۔پی)

(DIPR/101)